جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

۸ر

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہیئے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت بے ساختہ زبان پر
آتے ہیں مگر کیا ہمیشہ اس کا جواب صحت درست اور حسب دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے
ماءاللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے
ماءاللحم دوآتشہ
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام
laham

مزدوروں کا جلوس
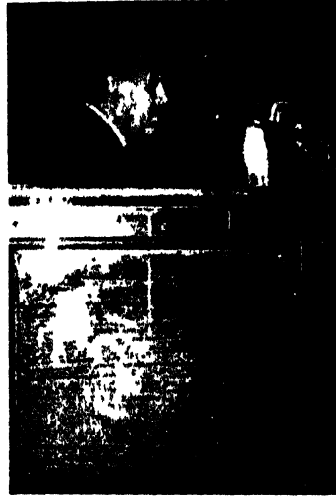
صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان: کراچی میں مزدوروں کے اجتماع سے خطاب

صدارتی کابینہ کا پہلا اجلاس - راولپنڈی

انقلاب کی پہلی سالگرہ پر خادمان ملک کو اعزازات
ڈاکٹر محمد سمیع: ستارۂ امتیاز

وزیر قانون جناب محمد ابراہیم:
بنیادی جمہوریتوں کے بارے میں پریس کانفرنس

یادگاری ٹکٹ یوم انقلاب ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہئے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسب دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کرسکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے
ماء اللحم
laham
ماءُ اللحَم دوآتشہ
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

غذائیت سے بھرپور مفید ڈالڈا -
آج ضرور لے کر آیئے !
جی ہاں ! میں ضرور لاؤں گا ۔ مجھے معلوم ہے کہ بیگم کو ڈالڈا برانڈ وناسپتی پر اتنا کیوں اصرار ہے ۔ یہ واقعی ایک مفید غذا ہے، کیونکہ یہ خالص نباتاتی روغنیات سے ماہرین کی زیرِ نگرانی انتہائی صفائی اور احتیاط سے تیار کیا جاتا ہے، اور اس میں وٹامن اے اور ڈی بھی شامل کئے جاتے ہیں ۔ یہ ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار ہوتا ہے اور مُہر بند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب ہوتا ہے ۔ بیگم کو ڈالڈا کی یہ سب خوبیاں معلوم ہیں جبھی وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ اتنی خوبیوں کے باوجود ڈالڈا کی قیمت بہت مناسب ہے، اور یہ کم خرچ بھی ہے ۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے !
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
گذشتہ ایک پشت سے مشہور
ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے !

جسم میں تازگی

جلد ۱۲

شمارہ ۱۲

جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

مدیر : رفیق خاور

نائب مدیر : ظفر قریشی

سرورق : ہمارا کسان : جمہوریت کی اصل اساس رنگین عکس : (بابی جوزف)

چندہ سالانہ : پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ : ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی آٹھ آنے

بابائے ملّت — جمہوریت کا اوّلین نقیب

رئیس احمد جعفری

قائدِ اعظمؒ کی یاد ہم سب ہر سال ان کے یومِ ولادت اور یومِ وفات پر مناتے ہیں، اسلئے کہ قائدِ اعظم پاکستان کے خالق تھے، لیکن وہ کون دن ہے جب قائدِ اعظم یاد نہیں آتے؟ جس کی یاد نے دلوں میں نشیمن بنا لیا ہو بھلا اسے کوئی بھول سکتا ہے؟

قائدِ اعظم زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گے، اگر چاند اور سورج، پہاڑ اور سمندر، زمین اور آسمان مر سکتے ہیں تو قائدِ اعظم بھی فنا ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ نہیں ہو سکتا تو قائدِ اعظم بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو زندگی ہی میں مر جاتے ہیں، کچھ وہ ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں، قائدِ اعظم کا شمار انہی لوگوں میں ہے جو بظاہر موت سے ہمکنار ہوئے، لیکن حقیقتہً حیاتِ دوام کے منصب پر فائز ہو گئے۔

ذرا تصوّر تو کیجئے، ایک غلام ملک ہے جس کی آبادی تقریباً چالیس کروڑ ہے۔ یہ ملک مجموعۂ اقوام و ملل ہے، ملک کی سب سے بڑی اکثریت جو ۳۰ کروڑ کی آبادی رکھتی ہے، بیدار ہے، شعورِ سیاسی سے بہرہ ور ہے، قوّتِ عمل سے بھرپور ہے، صنعت و حرفت کے میدان میں سب سے آگے ہے۔ تعلیم و سائنس کی دنیا میں سربلند ہے، سیاست و معیشت کے زمین و آسمان کی مالک ہے، دولت و ثروت کی کوئی حد اور کمی نہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے اس پر آغوشِ شوق کی طرح کھلے ہوئے ہیں، وہ جدوجہد کرتی ہے، لڑتی ہے، مورچے سر کرتی ہے، آقا قوم اس سے لرزتی ہے، دنیا کی دوسری بڑی اور ترقی یافتہ قومیں اس کا لحاظ کرتی ہیں، اور بالآخر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں اسے آزادی کی پہلی اور بہت بڑی قسط وصول ہو جاتی ہے، چند صوبوں کے علاوہ ہر صوبہ میں وہ اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے، اور گورنران صوبہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ وعدہ کر لیتے ہیں کہ — تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر!

اکثریت کی صوبائی وزارتوں کے معاملات و مسائل میں، فیصلوں میں، پالیسیوں میں نہ گورنر مداخلت کرتے ہیں، نہ وائسرائے، نہ وزیرِ ہند، نہ ملکِ معظم، حالانکہ انڈیا ایکٹ میں صاف اور واضح طور پر یہ بات مرقوم ہوتی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے گی۔

اس ملک میں کئی اقلیتیں ہیں، لیکن کسی اقلیت کی تعداد، لاکھوں سے متجاوز نہیں، ہاں ایک سب سے بڑی اقلیت — مسلمان — ہے جس کی تعداد آٹھ کروڑ سے متجاوز ہے، لیکن یہ اقلیت ہر اعتبار سے پسماندہ ہے، تعلیم میں پیچھے، صنعت و حرفت میں پس رو، سیاست سے ناواقف، سرکاری ملازمتوں کا دروازہ بڑی دیر تک کھٹکھٹانے کے بعد ذرا سا کھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے، یہ وہ اقلیت ہے جس نے ایک ہزار سال تک اس دیس پر عدل و انصاف، اور رواداری کے ساتھ حکومت کی تھی، لیکن آج یہ اقلیت صرف غبارِ کارواں بن کر رہ گئی تھی نہ اس کی کہیں پوچھ تھی، نہ اس کا کوئی مقام تھا۔ اس کی فریاد صدا بہ صحرا بن کر رہ جاتی تھی، اس کے مطالبات کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اسے جو تحفظات دئیے گئے تھے وہ صرف زینتِ قرطاس تھے، یہ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتی تھی، اور زیرِ لب کہہ اٹھتی تھی، — کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں!

مایوسی، افسردگی اور اضمحلال کے اس عالم میں، ایک لمبا تڑنگا، دبلا پتلا، مردِ کہن سال میدان میں آیا، اور اس نے نعرہ لگایا۔

'پاکستان — مسلمان پاکستان کے سوا کسی چیز پر قناعت نہیں کر سکتے!'

یہ نعرہ برحق ہونے کے باوجود کتنا اجنبی، کتنا نامانوس، اور کتنا ناممکن تھا!

جس قوم کو ملازمت نہیں مل سکتی، حقوقِ عامہ نہیں مل سکتے، تحفظات نہیں مل سکتے، وہ پاکستان لے گی؟ — ایک نیا ملک، ایک آزاد اور خود مختار ملک؟ جس کی اپنے ملک میں کوئی پوچھ نہیں، وہ اقوامِ عالم کی صف میں پہلو بہ پہلو بیٹھے گی؟ — مگر یہ آرزو والے

نظیریؔ خندہ می آید!

لیکن خندۂ استہزا اور قہقہۂ استحقار کے اس ہنگامہ میں طوفان کی کڑک اور بادل کی گرج کی طرح نئے الفاظ میں، نئے عزم کے ساتھ وہ مطالبہ مانئے ہوئے تیوروں میں پھر گونجا:

"پاکستان ——— یہ مسلمانوں کا واحد اور ناقابلِ مفاہمہ مطالبہ ہے!"

یہ آواز اس مرتبہ صدا بہ صحرا نہیں ثابت ہوئی، اس نے اثر کیا، اس کا نتیجہ نکلا۔

اس آواز میں، اس نعرہ میں، کچھ ایسی صداقت تھی، کچھ ایسا خلوص تھا، کچھ ایسا ولولہ تھا کہ بہت جلد واقعی یہ مطالبہ ساری مسلمان قوم کا مطالبہ بن گیا۔ وہ قوم جسے آقایانِ فرنگ ہیچ سمجھ رہے تھے، برادرانِ وطن کی نظر میں جس کی کوئی اہمیت نہ تھی، دفعتہً ایک زندہ اور فعّال قوم بن گئی اور یہ مردِ کہن سال اس بکھری ہوئی، منتشر اور آوارہ قوم کا شیرازہ بند اور قائدِ اعظم بن گیا۔

اور بالآخر ایک روز دنیا نے سن لیا کہ پاکستان عالمِ وجود میں آگیا!

ایک نیا ملک!

دنیا کی آزاد، خود مختار اور ترقی یافتہ قوموں میں ایک نئی قوم کا اضافہ ہوگیا، ایک نئے ملک کا اضافہ ہوگیا، یہ ملک، جو ایک ہی شخص کے خلوص اور عزمِ بے کراں کا نتیجہ تھا، دُنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک تھا۔! دوستوں نے اور دشمنوں نے، حامیوں نے اور مخالفوں نے اس نئے ملک کو سخت ترین موانع اور مشکلات کے ہوتے ہوئے، عالمِ وجود میں آتے دیکھا، اور ششدر رہ گئے ——— این چہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب؟ ——— قوموں اور ملتوں کی تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیداری خواب بن جاتی ہے، اور خواب بیداری۔ مسلمانوں کے یہ دونوں دور گزر گئے، ایک وہ جب ان کی بیداری خواب میں تبدیل ہو چکی تھی، ایک وہ جب ان کا خواب بیداری بن گیا تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے بھی قائدِ اعظمؒ نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ آسانی سے اپنی قوم کے ڈکٹیٹر بن سکتے تھے۔ شاہِ بے تاج تو تھے ہی، اور پاکستان بننے کے بعد اگر وہ چاہتے تو تاجِ شہریاری زیبِ سر کر کے بادشاہت کا اعلان کر دیتے۔ اگر چاہتے تو ہر نظام اور آئین کو معطل کر کے آمرِ مطلق بن جاتے، قوم، دل سے (نہ کہ بہ نوکِ سنگین) انہیں بادشاہ ہی بنا لیتی اور ڈکٹیٹر بھی۔

لیکن قائدِ اعظم نے ایسا نہیں کیا!

قائدِ اعظم اپنی طبیعت، مزاج، اور اصول کے لحاظ سے کٹر جمہوریت پسند تھے، زندگی کے ہر دور میں انہوں نے جمہوریت کا پرچم سربلند رکھا، وہ طبعاً آئین پسند آدمی تھے، جمہوریت کے حفظ و بقا کے لئے انہوں نے بڑی سے بڑی قوت سے ٹکر لی، مقابلہ کیا، مصائب برداشت کئے۔ لارڈ ولنگڈن جیسے فرعون مزاج گورنر سے انہوں نے ایسی شاندار ٹکر لی کہ مخالف بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوگئے، بمبئی میں کانگرس نے اس دلیرانہ کارنامہ کی یادگار میں جناح میموریل ہال تعمیر کرایا جو آج تک موجود ہے۔ یہ ہال جب تعمیر ہوا تو قائدِ اعظم پیرس میں تھے، مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں تار دیا۔

"قوم نے پیغامبر کی زندگی ہی میں اس کی قدر بھی کر لی!"

جمہوریت ہی کے تحفظ کے لئے، بعد میں انہوں نے کئی مرتبہ لارڈ لنلتھگو، لارڈ ویول اور لارڈ اٹیلی سے ٹکر لی۔ کانگرس انہیں اپنا صدر بنانے کو تیار تھی، انگریز حکومت ہر بڑے صوبہ کی گورنری ان کی خدمت میں پیش کرنے کو آمادہ تھی، لیکن قائدِ اعظم نے حفظِ جمہوریت کے لئے جو کچھ کیا تھا وہ کسی صلہ کی تمنا اور انعام کی آرزو میں نہیں کیا تھا، انہوں نے اپنے ضمیر کی رہنمائی میں گام فرسائی کی تھی، کانگرس کی صدارت یا کسی بڑے صوبہ کی گورنری اس کی قیمت نہیں بن سکتی تھی۔ انہوں نے جاہ و منصب کی طرف کبھی نگاہِ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا، اپنے کام میں لگے رہے۔

قائدِ اعظم قوم کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ان کے کمالات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسی قوم کو، جس کی پسماندگی حدِ تصور سے

ماورا تھی، اور جو سیاسی شعور سے یکسر محروم تھی، بہت مختصر مدت میں جمہوریت کا رمز آشنا کر دیا۔ پاکستان اتنا بڑا ملک، کسی بغاوت کا، کسی شورش کا، کسی خانہ جنگی کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ جمہوریت کا نتیجہ ہے، جمہوریت کی فتح ہے۔

دنیا میں کوئی نیا ملک جغرافیہ کے صفحات پر اور نقشۂ عالم پر اس طرح نہیں ابھرا جس طرح پاکستان۔ آئرلینڈ برطانیہ سے الگ ہوا لیکن کتنے خون خرابہ کے بعد؟ امریکہ نے برطانیہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکا، لیکن کتنے ہولناک کشت و خون کے بعد؟ انڈونیشیا نے آزادی کا پرچم لہرایا اور ہالینڈ سے گلو خلاصی حاصل کی، لیکن کتنی خفیہ اور علانیہ تحریکوں کے بعد؟ پاکستان عالمِ وجود میں آیا، لیکن جمہوری اقدار اور روایات کے ساتھ۔

جمہوریت قائدِ اعظم کو اتنی محبوب تھی کہ گو قوم ان کے کسی اقدام پر نکتہ چینی نہیں کرتی تھی، گو ان کے اصحاب و رفقا ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے، لیکن کوئی چھوٹے سے چھوٹا۔ اور بڑے سے بڑا معاملہ ایسا نہیں تھا جس کا فیصلہ انہوں نے بطورِ خود کر لیا ہو، ہر معاملے میں وہ اپنی ورکنگ کمیٹی سے استصواب کرتے تھے، ضرورت ہوتی تو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ طلب کرتے تھے، اور زیادہ معاملہ اہم ہوتا تو عام سشن منعقد کرتے تھے، مگر ممکن نہ تھا کہ قوم کی منظوری، ساتھیوں کی تائید، رفقا کے مشورے، اور نمائندگانِ ملت کی اجازت کے بغیر وہ کوئی قدم اٹھا لیں۔ گاندھی جی سے تصفیہ ہو رہا ہو یا وائسرائے سے فیصلہ کن گفتگو ہو رہی ہو، یا سر کرپس سے معاملات و مسائل زیرِ بحث ہوں، یا کابینہ وفد کی تجاویز پر غور ہو رہا ہو، ہر معاملہ کا آخری فیصلہ قائدِ اعظم کر سکتے تھے لیکن نہیں کرتے تھے۔ وہ ساری صورتِ حال اپنی ورکنگ کمیٹی کے سامنے ——— وہ ورکنگ کمیٹی جو ملت کے معتمد ترین نمائندوں پر مشتمل تھی ——— رکھ دیتے تھے، اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیتے تھے۔ جو فیصلہ وہ کرتی تھی، اس کی اطلاع اصحابِ متعلقہ کو دے دیتے تھے، عام اس سے کہ وہ فیصلہ قائدِ اعظم کی مرضی کے مطابق ہوا ہو یا ان کی مرضی کے خلاف۔ محرمانِ اسرار اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے کئی فیصلے ایسے ہوئے ہیں جن کے ساتھ قائدِ اعظم کی رائے نہ تھی لیکن قوم کے نمائندوں کی رائے سے وہ اپنے آپ کو الگ نہ رکھ سکتے تھے۔ قوم نے جب ایک فیصلہ کر لیا، تو اب اختلاف یا اپنے اقتدارِ عامہ کی بنا پر تخویف، تہدید یا ترغیب سے کام لینے کا کوئی سوال نہ تھا، قوم ان کے ساتھ تھی وہ قوم کے ساتھ تھے۔

پاکستان بننے کے بعد بھی ان کی یہ روش قائم رہی، بلکہ اپنے اس مسلک میں وہ اور زیادہ سخت ہو گئے، سرکاری طور پر انہوں نے "قائدِ اعظم" کا خطاب اس وقت تک نہیں استعمال کیا، جب تک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے باقاعدہ اسے منظور نہیں کر لیا۔

اپنے رفقا اور متبعین کو وہ برابر اس کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ عوامیت اور جمہوریت کے راستہ سے گریز نہ کیا جائے۔ ایک آمر کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر اسے قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہے تو اس کا اقتدار ہر وقت معرضِ خطر میں ہے، صرف اس کا اقتدار ہی نہیں ملک کی سلامتی بھی ہر وقت معرضِ خطر میں ہے، اور جسے قوم کا اعتماد حاصل ہو، اسے آمر بننے کی ضرورت کیا ہے؟

جمہوریت دشمنوں نے جمہوریت کے نام پر پاکستان کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا، پاکستان تباہی سے دوچار ہو رہا تھا، پاکستانی قوم خانہ جنگی میں مبتلا ہوا چاہتی تھی، جمہوریت دم توڑ رہی تھی، قوم کی آواز کوئی وزن نہیں رکھتی تھی، چند موقع پرستوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، اور وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی تھی۔

یہ حالات تھے، جب ایک شخص، فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں، قائدِ اعظم کے پاکستان کو بچانے کے لئے میدان میں اترا، وہ فوج کے بل پر آیا تھا، مارشل لا اپنے ساتھ لایا تھا، جنرل فرانکو کی طرح ملک کے سیاہ و سفید کا غیر مسئول طور پر مالک بن سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی اس نے اپنی سب سے پہلی تقریر میں جمہوریت کی بحالی کا قوم کو یقین دلایا، قوم نے اس پر اعتماد کیا، اور اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک سال کی مختصر سی مدت میں جمہوریت کا پہلا مرحلہ تکمیل کے قریب ہے۔ یونین اور پنچایت سے جمہوریت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کے بعد دوسرا مرحلہ آئے گا۔ جب قوم کو وہ قوت واپس دے دی جائے گی جو موقع پرست سیاست دانوں نے اس سے چھین لی تھی۔ یہ مرحلہ ہو گا آئین سازی کا۔ قوم کے صحیح نمائندے یہ آئین بنائیں گے اور پھر ملک میں جمہوریت کے شادیانے بجیں گے!

پاکستان زندہ باد!

نیا افق

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان)

پاکستان میں چند ہفتوں کے اندر یونین کونسلوں کے انتخابات ہوں گے اور یہ انتخابی ادارے، جن کا انتخاب حق رائے دہندگی بالغان کی بنا پر عوام کریں گے عنقریب کام شروع کر دیں گے۔ یہی وہ واحد مقصد ہے جس کے لئے ہم انقلاب کے بعد ان بارہ ماہ کے دوران برابر سرگرم کار رہے ہیں۔ کیونکہ یہ عوام کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بہترین اور مفید ترین ذریعہ ہے۔

اب مفاد پرست اشخاص سیدھے سادے دیہاتی لوگوں کو یہ دھوکہ نہیں دے سکیں گے کہ فلاں پیسے والے سیاسی کھمبے یا زمیندار کو آنکھیں بند کرکے ووٹ دے دو۔ اب جمہوریت عوام کے گھر تک پہنچا دی گئی ہے اور وہ اس قابل بنا دیئے گئے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے گھر یا خاندان کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح جمہوریت کے ذریعے اپنے گاؤں یا محلہ کا بھی انتظام کریں، اور اسے ترقی دیں۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ ہمارے عوام ان مردوں اور عورتوں کو اپنے نمائندوں کی حیثیت سے چنیں گے جن کی اچھائی، دیانت داری اور قابلیت سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں۔ بنیادی جمہوریتیں آزاد قوم کے افراد کو قومی و معاشرتی فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا شاندار موقع دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کی بدولت جو ادارے وجود میں آئیں گے ہمارے عوام ان میں شریک ہونے کے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے اور پاکستان کی عظیم تر بہبود کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ کام میں لائیں گے۔

(۲۷ - اکتوبر: قوم سے نشری خطاب)

"پندِ پیرِ دانا"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

صاحبو! جنگِ آزادی کے بعد ہمارے ملک پر پھر ایک سخت آزمائش کا وقت آیا ہے۔

پہلے ہم نے انگریز کی سیاسی غلامی کے خلاف انقلاب برپا کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان بن گیا۔ آج ہم نے انگریز ہی نہیں بلکہ پورے مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہونے پر کمر باندھلی ہے اور یوں مکمل آزادی کی طرف ایک اور قدم بڑھایا ہے۔

ذہنی آزادی حاصل کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بہت سے لوگوں کو اپنی ذہنی یعنی روح کی غلامی کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ عام آدمی کو تو ویسے ہی سوچنے کی فرصت نہیں ملتی مگر کچھ پڑھے لکھے نوجوان بھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اصل میں ان کے سوچنے سمجھنے کا طرز ابھی تک غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوا۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے اچھے اچھے لوگ پاکستان کے نام سے ہی بدکتے تھے اور اس نام کا مذاق اڑاتے تھے مگر وہ بن کر رہا، ممکن ہے آج بھی بنیادی جمہوریت کے نام اور ڈھانچے سے کچھ لوگ حیرت زدہ ہوں لیکن میری بوڑھی آنکھیں صاف دیکھ رہی ہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کے رواج کے بعد پاکستان صحیح معنوں میں آزاد ہونے والا ہے۔ بنیادی جمہوریت کی اسکیم ایک انقلابی اسکیم ہے اور صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ صدر ایوب خاں نے صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں کیا بلکہ ذہنی انقلاب پر بھی کمر باندھی ہے۔ یہ ایک مہم ہے اور اس مہم کی وجہ سے ہماری قومی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں پیش آ رہی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں اچھی لگتی ہیں، کچھ بری لگتی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔ چونکہ انقلاب اصل میں تبدیلی کا دوسرا نام ہے اسلئے اسے سمجھنے اور برتنے کے لئے بہت سی باتیں جاننی ضروری ہیں۔

میں کوئی سیاست داں نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی اردو زبان کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے لیکن میری عمر نوّے سے اوپر ہے پاکستان بھر میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جنہوں نے ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ دیکھا ہو۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ میں نے مغربی سیاست اور مغربی طور پر سوچنے کا زہر آہستہ آہستہ پھیلتے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہر ناقص اور جھوٹی تعلیم کا بوجھ کس طرح لادا گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہم جمہوریت کے نام پر کس طرح للچائے گئے اور کس طرح انگریز نے ہماری انقلابی قوت کا دھارا اسمبلیوں کی طرف موڑ دیا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں نے اسّی برس میں ہر طرح کے بڑے لوگوں کو جانا اور پرکھا ہے، میں نے سرسید احمد خاں کے ساتھ کام کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ غدر کے بعد جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ کتّوں اور بلّیوں سے بدتر تھی اگر اس وقت سرسید نے انگریز کے ہتھیار اسی کی ڈھالوں پر نہ روکے ہوتے تو آج مسلمان قوم کا نام نشان تک نہ ہوتا۔ اس وقت انگریز اور ہندو چکی کے دو پاٹ بنے ہوئے تھے مگر سرسید قوم کو ان دو پاٹوں کے بیچ سے صاف بچا کرلے گئے۔ مجھے علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کی دوستی کی عزت بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن میں ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ ایک نے پاکستان کا خواب دیکھا دوسرے نے اس کی تعبیر پوری کر دکھائی لیکن اصل میں ابھی قائدِ اعظم کا کام شروع ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ میں آپ کو نہایت دیانت سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال اور جناح صرف جغرافیائی پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انگریز اور ہندو کی حکومت سے الگ ایک ملک بنا لیا جائے جہاں لوٹ کھسوٹ بے ایمانی، چور بازاری، ظلم، جبر جو کچھ کریں مسلمان کریں اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔ نہیں، ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اعلیٰ مقصدوں کے پورا کرنے کے لئے ایک آزاد زمین مل جائے اور بس۔ اور مسلمانوں کا اعلیٰ مقصد وہ نہیں تھا جو ارسطو چاہتا تھا یا جو افلاطون بتا گیا

سے ہے یا جو برٹش پارلیمنٹ بتا دے بلکہ انہیں اپنے ملک اور پوری دُنیا کے لئے ایک نہایت بلند اور عظیم نظریۂ حیات کو ترتیب دے کر اسے اپنے عمل سے ایک مثال بنا کر سب کے سامنے پیش کرنا تھا۔

افسوس کہ پاکستان نام کا ایک ملک تو بن گیا مگر پاکستانی قوم نہیں بن سکی۔ قوم باتوں سے نہیں بنتی۔ اسمبلیوں میں تقریروں سے نہیں بنتی، پمفلٹوں کے پروپگنڈے، ریڈیو کی تقریروں سے نہیں بنتی۔ روز کی نئی وزارت بنانے سے نہیں بنتی۔ روز ایک پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں چلے جانے سے نہیں بنتی بلکہ ملک میں کام کرنے سے بنتی ہے۔ کام اور صرف کام۔

نوجوانو! مجھے معاف کر دینا اگر کام کا لفظ زیادہ برا لگا ہو۔ تم زیادہ تر باتیں کرنا جانتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ دو چست فقرے بول کر، ایک زوردار قہقہہ مار کر ملک اور قوم کی خدمت ہو جاتی ہے۔ مگر میں پُرانے زمانے کا آدمی ہوں۔ میں نے زندگی میں صرف کام سیکھا ہے، اور کام کیا ہے۔ میں کام کو زندگی سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کون سا کام کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اب میں تم سے سقراط اور افلاطون کی باتیں کیا کروں؟ تم نے تو ان کی کتابیں پڑھی ہوں گی میں نے ان کو پڑھا بھی ہے اور اپنے زمانے میں بڑے بڑے سقراط اور افلاطون بھی دیکھے ہیں۔ میٹھی زبان کے افلاطون، ڈنڈے مارنے والے افلاطون، سو مجھ سے کتابی باتوں کی امید نہ رکھنا میں کام کی بات کروں گا۔

صاحبو!

کام ابتدا سے چلتا ہے کسی کام کی مثال لو۔ تم دیکھو گے کہ اسے کرنے سے پہلے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پانچ برس کے بچے کو اسٹیج پر تقریر کے لئے کھڑا کر دو تو وہ کیا بولے گا۔ یہ مثال آسان ہے۔ مگر غور کے قابل ہے۔ اب جمہوریت کے معاملے پر غور کرو۔ یہ ایک سیدھا سادا لفظ ہے۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنے آپ پر خود حکومت کریں۔ اب یہ بھی سب جانتے ہیں کہ سبھی آدمی روزمرہ کی حکومت کا کاروبار نہیں چلا سکتے بلکہ کاروبار نمائندوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے اور یہ نمائندے بالغ لوگوں کے عام ووٹ سے چُنے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو بات بہت سیدھی سادی ہے لیکن اب غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں اب تک اس اصول پر عمل ہی نہیں ہوا۔ بجائے اس کے کہ عوام اپنے نمائندے چُنیں، نمائندے عوام پر اپنے آپ کو لاد دیتے تھے، الیکشن کا وقت آتا تھا تو لیڈر لوگ نعرے لگا کر، لالچ دے کر، دھونس ڈال کر جھوٹے وعدوں کے سبز باغ دکھا کر ووٹ لینے آ جاتے تھے۔ ان کے ایجنٹ روپیہ اور موٹریں لئے گھومتے تھے اور تم لوگ ان لوگوں کو ووٹ دیتے تھے جنہیں تم نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھنے کی امید تھی۔ خیر یہ تو جمہوریت کا غلط استعمال تھا اب سنو کہ خود اس جمہوریت میں برائی تھی۔ یہ جمہوریت اس کام کی طرح تھی جسے کرنے والے نے سیکھا نہ ہو اور اسے کام کرنے کی آزادی مل گئی ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں انگریزی پارلیمنٹ کی مثال ضرور یاد آئے گی لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا نہیں ہوئی تھی یہی حال باقی اور مغربی قوموں کا ہے۔ وہاں سینکڑوں برس کی تعلیم سائنس کی ایجادات، فلسفے کے رواج اور ہزاروں طرح کے کشت و خون کے بعد وہ صورت پیدا ہوئی تھی جسے جمہوری حکومت کہا جاتا ہے اور آج تو وہ بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں سے ختم ہو چکی ہے۔ مثلاً امریکہ میں وزیر اعظم ہوتا ہی نہیں۔ وہاں ایک طرف تو سب لوگ مل کر ایک صدر چُن لیتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے اپنے حلقے سے امریکن کانگرس اور سینیٹ میں نمائندے بھی بھیجتے ہیں۔ روس اور چین میں اور ہی طرح کی حکومت ہے۔ وہاں صرف ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اور صرف اسی کے نمائندے حکومت کرتے ہیں۔ وہاں مخالف پارٹی ہوتی ہی نہیں۔ فرانس میں بھی کئی دفعہ دستور بدلا جا چکا ہے۔ غرض یہ کہ دنیا بھر کے ملک سینکڑوں برس سے اپنے اپنے مزاج کے موافق جمہوری حکومت کے تجربے کرتے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح کی جمہوریت ہمارے ملک میں چل رہی تھی وہ کوئی آسمانی چیز نہیں تھی بلکہ ایک ایسا طریقہ تھا جو ہمیں غلامی کی میراث کے طور پر ملا تھا۔ باقی دنیا اس چکر سے خاصی آگے نکل چکی تھی مگر ہم اسی میں مبتلا تھے، حالانکہ وہ ہمیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس کی بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک تو ہمارے لیڈر اوپر ہی اوپر سے حکومت کرنا چاہتے تھے اور عوام کے آگے جوابدہی کے لئے تیار نہیں تھے اور دوسری وجہ یہ کہ ہمارے عوام کو تعلیم کی کمی نے اس قابل ہی نہیں رکھا تھا کہ وہ ایک آدمی کو بے جانے بوجھے صرف اخباری خبروں کے ذریعے پہچان لیں۔ وہ تو جیسی ہوا آتی تھی اسی کے ساتھ بہہ جاتے تھے۔ نہ تو انہیں اتنی مہلت ملی تھی کہ تعلیم حاصل کریں اور پھر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اپنی مرضی کا کام کریں نہ اُن کے لئے کوئی پنچایتی یعنی چھوٹے پیمانے پر حکمرانی کی تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔

صاحبو! دماغ میں طاقت دو طرح آتی ہے۔ تعلیم سے اور تجربے سے۔ تعلیم پیسے اور محنت سے حاصل کی جاتی ہے، تجربہ عمر گذارنے اور کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تعلیم کا معاملہ یہ ہے کہ پاکستان میں سو میں سے اسّی آدمی دیہات میں رہتے ہیں اور زیادہ تر ان پڑھ ہیں۔ انہیں تعلیم ملی ہی نہیں۔ جو شہروں میں ہیں وہ بھی زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ وہ صرف تجربے کو کام میں لاسکتے ہیں۔ لیکن تجربہ وہاں چلتا ہے جہاں اس کا موقع ہو۔ اب میں اتنا عمر رسیدہ اور تجربہ کار آدمی ہوں لیکن اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم برطانیہ کے فلاں آدمی اور امریکہ کے فلاں آدمی میں سے ایک کو اپنے تجربے کے بل پر چن لو تو میں کیا جواب دوں گا۔ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا۔ نہ تو میں ان کے ساتھ رہا ہوں نہ انہیں دیکھا ہے نہ انہیں پرکھا ہے، زیادہ سے زیادہ میں نے ان کا نام سن لیا ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مجھے ان میں سے ایک آدمی چننا ہی پڑا تو میں اس کے کسی ایجنٹ، اس کے کسی اخبار، اس کے کسی پروپگنڈے کی وجہ سے ایسا کروں گا لیکن اپنی عقل استعمال نہیں کر سکوں گا کیونکہ میں اس سے بہت دور رہتا ہوں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس کا کام نہیں دیکھا۔ مختصر یہ کہ میں اسے نہیں جانتا۔ ہاں اگر مجھ سے میرے شہر یا میرے محلے کے دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا جائے تو میں اطمینان کے ساتھ ایک کو چن لوں گا۔ مجھے اپنے محلے کا تجربہ ہے، اپنے شہر کو جانتا ہوں میں ان لوگوں کی اگلی پچھلی باتیں جانتا ہوں۔ میں ان کی لیاقت سے واقف ہوں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کون کس کام کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

اب یہ باتیں کہنے کو تو آسان ہیں لیکن ان کو سچا ثابت کرنے میں تو بے ایمانوں کے لئے سخت خطرے تھے۔ وہ کیسے دیہاتیوں اور شہریوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں خود کام کا موقع دیتے اس طرح ایک تو عوام کو اپنا کھوٹا کھرا پرکھنے کا تجربہ ہو جاتا دوسرے بڑے بڑوں کے اختیارات کم ہو جاتے تھے۔ اب یہی سوچو کہ اگر کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی نہر بنانی ہے یا کسی سڑک کی مرمت کرانی ہے تو ضلع کے بڑے افسر یا کسی بڑے آدمی کے عزیز یا دوست تک پہنچنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے تو سو طرح کے احسان جتاتا تھا۔ پھر گھمانے پھرانے کے بعد ضلع یا شہر جاتا تھا اور عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ کام پھر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح بڑے لوگوں کی دھونس قائم رہتی تھی اور عام لوگ ان کے محتاج رہتے تھے۔ مگر پھر انہی عام لوگوں سے وہی خاص لوگ ووٹ مانگنے آجاتے تھے۔

اب بنیادی جمہوریتوں کا زمانہ آیا ہے۔ یہ طریقہ بہت سیدھا سادا اور مضبوط ہے پہلے ہزار پندرہ سو آدمی ایک نمائندہ چنیں گے پھر ایسے دس چنے ہوئے آدمی ایک انتظامی حلقہ یا پنچایت بن کر اپنے چھوٹے سے علاقے کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔ ان کے ذمے اپنے گاؤں کی ترقی کے کام ہوں گے۔ امن امان، آپس کے جھگڑے قضیے، مویشیوں کے جھگڑے یہ سب خود وہ طے کریں گے۔ چھوٹے موٹے ٹیکس بھی وہ خود لگائیں گے۔ ان کے ساتھ حکومت کے افسر بیٹھیں گے۔ ان کے ساتھ ماہر لوگ جیسے انجینئر، ڈاکٹر، وکیل غرض کہ جس طرح کے فنی ماہروں کی ضرورت ہوگی وہ بھی نامزد کردئے جائیں گے تاکہ یہ نہ ہو کہ فنی ناواقفیت کی وجہ سے فیصلے غلط ہوں۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ حکومت کرنے کا تربیتی اسکول ہے۔ یہ ذمہ داریوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کا موقع ہے۔ اپنا کام خود کرو اور بڑے کاموں کی تربیت لو۔ یہ سبق وہ لوگ نہیں دیتے جو خود غرض اور حکومت سے چمٹے رہنے کے شوقین ہوتے ہیں کیونکہ کسی کو کوئی کام سکھا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھر اسے سکھلانے والے کے بغیر بھی کرلے گا۔ یہ سبق صرف ایک ایسا آدمی دے سکتا ہے جس کو سب کی بھلائی منظور ہو، اور جو یہ چاہتا ہو کہ اس کی قوم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ جائے۔ یاد رکھو جنرل ایوب خاں نے یہ کام ایسا عجیب و غریب کیا ہے کہ نہ صرف اس ملک کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں بلکہ پوری دنیا کے دانشمند اور ہر ملک کے اخبارات پکار پکار کر ان کی نیک نیتی، ایمانداری اور عقلمندی کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج تک ہزاروں فوجی حاکم گذرے ہیں۔ مگر کسی نے اپنی طاقت کو اپنی قوم میں بانٹ دینے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ جنرل ایوب خاں اگر چاہتے تو مدتوں فوج اور
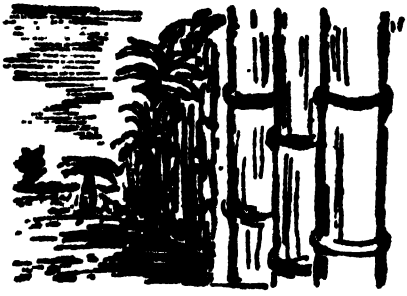
سول افسروں کے ذریعے کام چلائے جاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا وہ ایک سچے اور وعدے کے پکے آدمی ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے مارشل لا لگاتے ہی جو وعدہ کیا تھا اسے اس سے بھی زیادہ بہتر طریقے پر پورا کر دکھایا ہے جس کی توقع ان سے کی جاتی تھی۔ انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کے نام سے ایک بے نظیر اسکیم بنا دی ہے۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ آپ خود سوچئے کہ ایک اکیلا تھانیدار، ایک اکیلا تحصیلدار، ایک اکیلا ڈپٹی کمشنر حکومت کرتا اچھا لگتا ہے یا وہ دس دس بیس بیس آدمیوں کے مشورے سے جو کام کرے گا وہ زیادہ مفید ہوگا۔ اس طرح تھانیدار یا تحصیلدار یا ڈپٹی کمشنر آپ کے حاکم نہیں رہیں گے بلکہ آپ کے ساتھی اور افسرانِ اجلاس کی طرح کام کریں گے مجھے یہ کونسلیں صاف طور پر کام کرتی نظر آرہی ہیں، ان میں بحثیں ہوں گی۔ کبھی کبھی کج بحثیاں اور فضول باتیں بھی ہوں گی مگر یہ سب کچھ ضروری ہے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے مگر پھر مل کر کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اس میں اور بہت کچھ ہوگا۔ ممکن ہے کچھ بڑے لوگ پھر اپنے اثر رسوخ سے ان کونسلوں میں آجائیں مگر کب تک چلیں گے۔ ان کی بے ایمانی بالکل آپ کی نظر کے سامنے ہوگی آپ اسے ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں پکڑ سکتے ہیں۔ ہر ایک ہزار آدمیوں میں ایک آدمی کو پہچان لینا اور چن لینا بہت آسان ہے۔ اپنے گاؤں کی بات، اپنے محلے کی بات اپنے گھر کی سی بات ہوتی ہے۔ اتنے تھوڑے آدمیوں میں ایک برادری کا سا رشتہ ہوتا ہے۔ یہاں آدمی چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ اب یہ آپ صاحبوں کا کام ہے کہ جہاں تک ہو سکے سچے اور ایماندار آدمیوں کو چنئے تاکہ اس بار پھر آپ ایک نئی الجھن میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپ کے امیدوار آدمی آپ کے اپنے علاقے کے ہوں گے۔ آپ ان کو جانتے پہچانتے ہوں گے، یہ ضلعوں سے گاؤں میں نہیں آئیں گے۔ کوٹھیوں سے محلوں پر نہیں اتریں گے یہ آپ کے آس پاس کے آدمی ہوں گے، اب اگر آپ ان میں سے بھی کھوٹے کھرے کو نہ پہچان سکے تو پھر آپ کا خدا حافظ ہے۔

یاد رکھئے یہ پورے نظامِ حکومت میں ایک بڑی تبدیلی کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہاں ٹھوکر نہ کھائیے گا۔ ابھی ملک کا دستور بننے والا ہے۔ دستور بنانے والے آپ کی جانچ پرکھ کے نتیجوں کو سامنے رکھیں گے اگر آپ نے اس بار بھی اپنے ووٹ بیچے، اگر آپ اس بار بھی ووٹ چاہنے والوں کے ایجنٹوں سے دھوکہ کھا گئے تو آپ دنیا بھر میں بدنام ہونے کے ساتھ ساتھ تباہی کی طرف چلے جائیں گے۔ میں حکومت کے خوف سے بے پرواہ ہو کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر حکومت کا کوئی آدمی بھی آپ کو دھمکی دے تو اس کے خلاف کھڑے ہو جائیے اور کسی کے دباؤ میں نہ آئیے مجھے جنرل ایوب خاں کی ذات پر پورا اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی عہدے دار کے خلاف جانبداری کی سچی شکایت ان تک پہنچ گئی تو وہ اسے فوراً سخت سے سخت سزا دیں گے۔ آپ کو کسی قسم کا لالچ ہونا چاہئے نہ خوف۔ خوف لالچ سے بدتر ہے۔ اگر آپ کو ڈر ہو کہ کسی عہدے دار کی شکایت سے آپ کو نقصان پہنچے گا تو نقصان آپ ہی کا ہے، اس طرح ساری عمر آپ کی شکایت دور نہیں ہوگی آخر کبھی تو آپ کو بے خوفی سے بھی کوئی بات کرنی ہے۔ یوں مجھے اطمینان ہے کہ انتخابات میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو پھر بھی اچھے آدمی چننے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔

آخر میں ایک اور بات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جن بے ایمان اور غدار سیاست دانوں کو نئے قانون کے ماتحت کالی فہرست میں رکھا جا رہا ہے وہ ان کونسلوں اور پنچایتوں کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں گے اور پھیلوائیں گے۔ آخر ان کی حکومت چھینی گئی ہے۔ ان کے جرموں کے پردے چاک کئے گئے ہیں ان کی نفع خوری ختم ہو گئی ہے اجارہ داریاں ٹوٹ گئی ہیں، ان جیسے ان کے بہت سے ساتھی ہیں، وہ خود بھی چاہیں گے کہ بنیادی جمہوریتیں چلنے نہ پائیں اور ان کے ہمدرد بھی یہی چاہیں گے۔ اس کے لئے وہ ہزاروں ترکیبیں کریں گے، ان سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں اَن پڑھے لکھے لوگوں سے بھی ایک بات کہوں گا۔ مانا کہ آپ نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور آپ لوگوں میں سوچنے سمجھنے کا مادہ ہے لیکن خدارا اس مرتبہ آزاد

قوموں کی طرح ۔ دیکھئے سوچیئے کہ یہ کتنا بڑا کام ہے کہ حکومت کی بنیادیں گاؤں اور محلّے میں رکھی جا رہی ہیں۔ یہ بنیادیں کتنی گہری کتنی مضبوط اور کتنی چوڑی ہیں ان پر جو عمارت قائم ہوگی وہ کتنی شاندار اور عظیم ہوگی۔ آپ کا فرض ہے کہ اس عمارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹائیں اور زبانی، تحریری اور عملی طور پر اس مہم میں حصہ لیں۔ یہ مہم عوام کے لئے ہے ایک آدمی یا چند آدمیوں کے لئے نہیں۔ ہمیں اپنی نیتیں صاف رکھنی چاہئیں۔ ہمیں اپنے ارادے مضبوط اور اپنے حوصلے بلند رکھنے ہیں۔ اس مہم کے پیچھے سچائی اور دیانتداری ہے۔ ایک آدمی نے صاف صاف ایک بات کی ہے۔ آیئے اسی جیسی سچائی سے اس کا جواب دیں۔ اس میں پیچیدگیاں نہ پھیلائیں بلکہ کام کریں اور کام کئے جائیں یہاں تک کہ عوام کو اعلےٰ درجے کے چناؤ کا پورا تجربہ ہو جائے۔ اعلےٰ درجے کے کام کرنے کی تربیت ہو جائے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ انقلاب آسانی سے نہیں آتا اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور ایمانداری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔

میں ملک کے ہر طبقے سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مہم میں حصہ لے۔ میں افسروں، تاجروں، امیروں، غریبوں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، دانشوروں، مزدوروں، کسانوں سب سے اپیل کرتا ہوں کہ جس طرح انہوں نے پاکستان قائم کرنے کے لئے آپس کے سب اختلافات بھلا کر اپنے دن رات ایک کر دئے تھے اسی طرح بنیادی جمہوریتوں کو کامیاب بنانے کے لئے جان کی بازی لگا دیں میں خاص طور پر ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس موقع کی اہمیت سمجھیں اور کام پر لگ جائیں۔ ان پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں وہ قوم کے ذہن کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ ہمیں اس موقع پر بہت بڑی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ آزاد ملکوں میں تو یہ تک ہوا ہے کہ ادیبوں اور صحافیوں نے خانہ جنگیوں تک میں عملی حصہ لیا ہے یہ موقع خالص ادب اور اشتہاری ادب پر بحث کا نہیں ہے کوئی اچھا جذبہ یا کوئی اچھا کام کسی کو غزل کہنے یا افسانہ لکھنے سے نہیں روکتا۔ لیکن چونکہ تمام اچھا ادب عام انسانوں کی مسرت اور اعلےٰ مقاصد تک پہنچنے کے لئے ہوتا ہے اسلئے آپ لوگوں پر فرض ہے کہ خالص ادب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عام خوشحالی کے لئے بھی کام کریں۔ قدرت نے آپ کو اچھے دماغ اور تیز قلم دئے ہیں، آپ کو چاہیئے کہ عوام اور خواص کو ان کی ذمہ داریاں پُراثر لفظوں میں بتائیں تاکہ آپ کا خلوص دوسروں کے دلوں تک پہنچے اور آپ کے خیالات کے خزانے سے سب فائدہ اُٹھائیں۔

آخر میں مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ آج میرے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت چھائی ہوئی ہے آج میں ایک گھنے تناور درخت کی جڑیں پیدا ہوتا دیکھ رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسے نیک اور عظیم کام میں شریک ہو گیا ہوں جس کی آرزو میں میرے بہت سے پیارے ساتھی رخصت ہو چکے ہیں ۔

"نالوں کا جواب آخر!"

شاہد احمد دہلوی

انگریز کی جمہوریت کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ اور انگریز نے یہی جمہوریت ہم پر لاد دی تھی۔ سو سال کے انگریزی راج نے ہمیں بہت سی ایسی چیزیں دیں جنہوں نے ہمیں ایسی دنیا میں پہنچا دیا جو ہماری اپنی دنیا سے بالکل الگ تھی، اور اس طرح ہمارے ذہن و دماغ میں الجھنیں اور پیچ پیدا ہو گئے۔ اور کچھ ہماری حالت ایسی ہو گئی کہ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ سوچنے لگے ہم انگریز کی طرح اور رہتے تھے ہم اپنے دیس میں۔ اپنے ہمیں غیر سمجھتے تھے اور غیروں کے لئے تو ہم تھے ہی غیر۔ بات یہ ہے کہ جو جمہوریت آج ہم انگریز کے ہاں دیکھتے ہیں وہ اس طرح پیدا نہیں ہوئی کہ ایک روز قانون بنا اور دوسرے دن جمہوریت رائج ہو گئی۔ بلکہ آج کی جمہوریت کی ایک تاریخ ہے کئی سو سال میں جا کر انگریز نے اسے سیکھا ہے اور آج وہ بھی اس سے بد دل ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں جمہوریت قانون کے ذریعہ ملی ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ انگریز اپنی حکومت پر آزادی کا پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ ڈھونگ رچایا اور اگر پاکستان سے پہلے کی پچاس سال کی تاریخ دیکھئے تو یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ انگریز انتخاب کے پردے میں ایک خاص طبقہ کی سرپرستی کرتا رہا اور وہ لوگ انگریز کے اشاروں پر ناچنے والے تھے۔ پھر بھی اس نے اسمبلیوں کو پوری آزادی نہیں دی تھی کیونکہ اسے اپنی حکومت کے جانے کا خطرہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ اسمبلیوں اور عوام میں رشتہ ہوا اور اس میں پہلی مرتبہ عوام کے نمائندوں کو اسمبلیوں میں جانے کا موقع ملا۔ لیکن یہ اسمبلی چاہے صوبہ کی ہو یا مرکز کی صرف بات چیت کرنے کی جگہ تھی۔ اور اس طرح ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو عمل سے دور ہوتا گیا۔ یہی انگریز کی جیت تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے لئے صرف دو راستے تھے۔ یا تو اس بوجھ کو اتار پھینکیں یا اسے اٹھا لیں۔ اگر بوجھ اتار پھینکتے تو دوسرا کوئی راستہ سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہمیں مجبوراً بوجھ اٹھانا پڑا اور وہی طبقہ جو انگریز کے زمانہ میں اسمبلیوں پر چھایا ہوا تھا ہمارے ہاں کی اسمبلیوں پر بھی چھا گیا۔ اس کی عادتیں نہیں بدلی تھیں تقریر کرنے اور جھوٹ کو سچ کر دکھانے میں یہ ماہر تھا اور اپنی کرسی کو ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا اس کا شیوہ تھا اور اس کے نتیجہ میں ہمیں وہ تماشا دیکھنا پڑا جو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ سیاسی پارٹیاں بنیں۔ ووٹ بیچے، نمائندے چنے گئے۔ جوڑ توڑ ہوئے، وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں اور ہر وزیر نے موقع کو غنیمت جان کر فائدہ اٹھایا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سب لٹیرے نہیں تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ جو ایسے نہ تھے وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور جو ایسے تھے وہ بے شمار۔ اور پھر کرسیوں کے کھیل میں ملک کا برا حال ہو گیا۔ شیشوں کی دیواروں کے پیچھے یہ کھیل ہو رہا تھا اور عوام کو اس کی خبر نہیں تھی جو کھیل میں شریک تھے وہ عوام کے نمائندے تھے اور عوام سے ان کو کوئی ہمدردی نہیں تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آٹھ کروڑ انسانوں کی جانیں تین سو آدمیوں کے ہاتھ میں آگئی ہیں اور ان تین سو کی باگ تیس آدمیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ تیس آدمی ایک آدمی کے اشارہ پر ناچ رہے ہیں اور وہ آدمی دوسرے آدمیوں کے حکم کا تابع ہے اور وہ دوسرے آدمی اس ملک اور قوم کے ہمدرد نہیں۔ اور اسی لئے ۱۹۴۷ء سے لے کر گزشتہ سال تک ہر میدان میں ہم ذلیل ہوتے گئے۔ مونچھوں والے جرم کرتے رہے اور داڑھی والے پکڑے جاتے رہے۔ قصور گنے چنے آدمیوں کا تھا اور سزا پورے ملک کو بھگتنی پڑی۔ خزانے خالی ہو گئے۔ ساکھ ختم ہو گئی۔ عزت جاتی رہی۔ دوسروں نے ہمارا مضحکہ اڑایا اور ہم بے چارے عوام خراب حالات اور اس سے بھی بڑھ کر
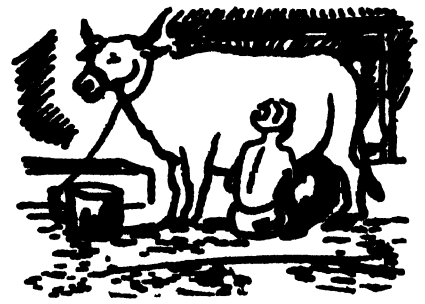
روحانی عذاب کا نشانہ بن گئے۔ پھر خدا نے ہماری فریاد سنی اور ۷ اکتوبر کو نئی صبح چمکی۔ اندھیرے چھٹ گئے۔ چونکہ پچھلے نو سال میں بڑے دعوے کئے گئے تھے نئے نئے منصوبے بنے تھے زوردار تقریریں ہوئی تھیں اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا عوام ان دعووں سے گھبرا چکے تھے۔ منصوبوں سے بیزار تھے اور تقریروں کو تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ دل سے حالات کی تبدیلی چاہتے تھے اور انقلاب کا انھوں نے اسی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن وہ آس لگاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ بے یقینی کے مریض تھے، مایوسی ان کی فطرت بن گئی تھی۔ نئی حکومت کو بھی انھوں نے اسی شک و شبہ سے دیکھا مگر رفتہ رفتہ ان کے دل کو یقین آتا گیا۔ نئی حکومت جو کہتی رہی کرتی رہی اور اس لئے آج تک کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کی نہ ہو۔ نئی حکومت کو بنے ہوئے صرف ایک سال ہوا ہے اور اس ایک سال میں مہاجروں کی جھونپڑیوں کی جگہ پکے مکان نظر آتے ہیں، کاشتکار زمین کے مالک ہیں تنزا نہ بھر پور ہیں ساکھ قائم ہو گئی ہے۔ دوسرے ملکوں میں ہمارا مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ ہماری عزت کی جاتی ہے۔ قانون کو عوام کے لئے زیادہ کارآمد بنا دیا گیا ہے۔ حکومت کی مشینری سے نااہلوں، بدکرداروں کو نکال دیا گیا ہے۔ اس کے کام کو تیز کرنے کا طریقہ رائج کر دیا گیا ہے۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور اسمگلنگ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آخر یہ سب کچھ پچھلے نو سال میں کیوں نہیں ہوا تھا ایک سال میں کیسے ہو گیا؟ پچھلے نو سال میں ہم نے اپنے نمائندے حکومت کرنے بھیجے تھے ہم نے اپنا ووٹ کا حق استعمال کیا تھا کہ اسمبلیوں میں جا کر وہ بے کار ہو گئے اپنے وعدوں سے پھر گئے یا وہ ہمارے نمائندے نہیں تھے۔

یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب کے لئے ہمیں انگریزی جمہوریت کو پرکھنا پڑے گا۔ ہمیں اس جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں جو انگلینڈ کے ملک میں رائج ہے۔ لیکن جو جمہوریت کی شکل اس نے ہمیں سونپی تھی اس میں سیاسی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتی تھیں اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ چار حلقوں میں انتخاب کیا جائیگا۔ اور ان چار حلقوں میں بیس ہزار ووٹ ہیں اور چار سیاسی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں تو ان کی صورت کچھ اس طرح بنتی ہے:

	حلقہ ۱ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ ۲ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ ۳ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ ۴ کل ووٹ ۵ ہزار
سیاسی پارٹی	۱ ۱۸۶۰ ووٹ	۱ ۵۰۰ ووٹ	۱ ۱۰۰۰ ووٹ	۱ ۱۲۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی	۲ ۱۴۰۰ ووٹ	۲ ۲۰۰۰ ووٹ	۲ ۱۸۰۰ ووٹ	۲ ۴۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی	۳ ۱۲۴۰ ووٹ	۳ ۱۵۰۰ ووٹ	۳ ۲۰۰۰ ووٹ	۳ ۸۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی	۴ ۵۰۰ ووٹ	۴ ۱۰۰۰ ووٹ	۴ ۲۰۰ ووٹ	۴ ۲۶۰۰ ووٹ

اسی طرح اگر حلقہ ۱ سے سیاسی پارٹی ۱ کا نمائندہ آئے اور حلقہ ۲ سے ۲ کا، ۳ سے ۳ کا اور چار سے ۴ کا تو ان کو ملا کر کل ووٹ ۸۴۶۰ ملے۔

اور ۱۱۵۴۰ اُن کے خلاف پڑے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چار آدمی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچے یہ اکثریت کے نمائندے نہیں۔ پھر انتخابات میں جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے۔ سب سے بڑی بات جو ہمارے ملک میں ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی اکثریت اپنے حقوق نہیں جانتی وہ ووٹ دیتے اور نمائندے چننے کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اس لئے حالات کو اتنا دخل نہیں جتنا اس بات کو دخل ہے کہ جمہوریت کے لئے ان کی تربیت نہیں ہوئی۔ انھوں نے جمہوریت کی منزلیں طے نہیں کیں۔ ان پر یہ لادی گئی ہے۔

آیئے اب خود اپنے ملک کے حالات کو دیکھیں۔ ہمارے ہاں پچاسی فیصد

آبادی تعلیم سے محروم ہے۔ ان پر پرانے جاگیرداری نظام کا گہرا اثر ہے۔ اس پندرہ فیصد آبادی میں سے جو پڑھے لکھے ہیں صرف تین فیصد وہ لوگ ہیں جو تجارت، صنعت میں اور عہدوں پر قابض ہیں اور باقی بارہ فیصد ان کے اثر میں ہیں۔ اس لئے جب بھی پرانے طریقہ پر انتخاب ہوتے تھے صرف تین فی صد آبادی کے لوگ اس میں کامیاب ہوتے تھے اور اسی لئے جنھیں ہم اپنا نمائندہ سمجھتے تھے وہ اصل میں تین فیصد آبادی کے نمائندے ہوتے تھے اُنہی کے لئے کام کرتے تھے اور اُنہی کا فائدہ سوچتے تھے پھر ان کی آپس میں قابلیں چلتی تھیں تجارت کے مالک عہدوں اور زمین کے جاگیرداروں کے مخالف تھے صنعت کے قابض باقی تینوں کے دشمن تھے اور عہدوں کے والی باقی سب کو اس طرح آپس میں کرسیوں کا کھیل ہو رہا تھا۔ اور عام اُن کی طبقاتی رقابتوں کی چکی میں پس رہے تھے۔ یہ تھی وہ جمہوریت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے ہم سے بہت پہلے اسے خیرباد کہدیا تھا۔ اٹلی نے اسے ملک بدر کر دیا تھا۔ روس نے اسے دیس نکالا دیدیا تھا مصر نے اسے ختم کر دیا۔ سپین میں وہ مرگئی۔ انڈونیشیا نے اُسے بھلا دیا۔ اس لئے نہیں کہ وہاں کی اکثریت جاہل تھی۔ بلکہ اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ ناقص ہے۔ انگلستان میں یہ موجود ہے مگر کچھ برس پہلے کے انتخابات نے اس کا بھرم بھی کھول دیا ہے۔ اس میں لیبر پارٹی کو زیادہ ووٹ ملے تھے مگر کنزرویٹو پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تھی کیونکہ اس نے ۶۰ نشستیں زیادہ حاصل کی تھیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اقلیت کی اکثریت پر حکومت ہے اور جمہوریت کا بنیادی نظریہ "اکثریت کی حکومت" ختم ہوگیا۔

اُنہی تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے صدر ایوب خاں نے کہا تھا کہ "ہم ایسی جمہوریت قائم کریں گے جسے عوام سمجھ سکیں اور چلا سکیں"۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی جمہوریت کونسی ہو سکتی ہے جسے عوام سمجھ سکیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں آباد ہے۔ ہمارے ہاں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہیں۔ ریڈیو اور اخبار کی آسانیاں سب کو حاصل نہیں اس لئے ہمارے عوام شہری زندگی سے ناواقف ہیں اُنھیں صحیح طور پر سیاسی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ ہر چیز کو دور کی بات سمجھتے ہیں اور ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ عوام صرف وہ چیز سمجھتے ہیں جس کا ان سے تعلق ہو۔ اس لئے اگر انھیں جمہوریت سے واقف کرانا ہے تو ان کا جمہوریت سے تعلق پیدا کرنا ہوگا اور ایسی ہی جمہوریت کو وہ چلا سکتے ہیں پہلے عوام شہروں سے دور ہیں۔ اس لئے جمہوریت کو گاؤں میں لے جایئے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں سب سے بڑا یہ ہے کہ عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ ہر اُس شخص سے اچھی طرح واقف ہوں گے جو انتخابات میں حصہ لے گا اور زرعی اصلاحات کے بعد ان پر بیرونی اثرات بھی نہیں ہوں گے جو اُن کی رائے کو مسخ کر سکیں اس لئے کونسل میں وہی لوگ آئیں گے جو واقعی اس کے اہل ہوں گے، جو لوگوں کے ہمدرد ہوں گے اور ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔

آیئے اب ذرا دیکھیں کہ بنیادی جمہوریت کس طرح کام کرے گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر بالغ، باہوش کو ووٹ دینے کا حق ہوگا اور ہر ایک کو انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی ہوگی۔ اس یونین کونسل میں ایک ہزار سے پندرہ سو تک آبادی کے لئے ایک نمائندہ ہوگا۔ اور کونسل میں ایسے دس نمائندے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی یہ کونسل دس گاؤں کی آبادی کے لئے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ چالیس گاؤں کی ایک کونسل ہو یعنی رقبہ اہم نہیں، آبادی اہم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ حکومت علاقوں کے اوپر زور نہیں دینا چاہتی۔ پچھلی حکومتوں کا زور علاقوں پر اس لئے ہوتا تھا کہ زمیندار اپنے رسوخ اور اثر کو زیادہ سے زیادہ استعمال کر سکیں۔ اب زور آبادی پر ہے انسانوں پر ہے۔ کیونکہ مشکلیں انسانوں کو پیش آتی ہیں۔ وہی اپنی مشکلیں سمجھ سکتے ہیں اور وہی اپنے حل تلاش کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایک ہزار سے پندرہ سو

ملک کی آبادی میں ہر شخص ایک دوسرے سے واقف ہوتا ہے سب کی برائیاں اور اچھائیاں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لئے مختصر آبادی کو صحیح فیصلہ کرنے کی آسانی ہے اور اس طرح مفید اور بے لوث آدمیوں کا نمائندہ بننا ممکن ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یونین کونسل میں بہتر لوگ نمائندے بن کر آئیں گے۔ پھر اس کے علاوہ دس نمائندوں کے ساتھ پانچ نامزد ہوں گے۔ جن کی تعداد نمائندوں سے آدھی ہے اس لئے کونسل کی نمائندہ حیثیت قائم رہتی ہے۔ ان پندرہ ممبروں میں سے ایک صدر اور ایک نائب صدر چنا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صدر اور نائب صدر عوام کے اعتماد کے آدمی ہوں گے۔ یہ کونسل اپنے حلقہ کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کا کام کرے گی۔ سڑکیں بنائے گی، اسکول تعمیر کرے گی، نظم و ضبط قائم رکھے گی۔ اور چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرے گی اور اپنے خرچ کے لئے ٹیکس وصول کرے گی اور اسی کے نمائندے تھانہ، تحصیل، کونسل کے انتظام میں مدد کریں گے۔ اور اس طرح جمہوریت جڑوں سے شروع ہو کر درخت کی آخری شاخ تک پہنچے گی اور اس ملک میں پہلی مرتبہ نیچے سے بڑھ کر اوپر تک کوئی چیز آئے گی ورنہ ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ اوپر سے ہر چیز تھوپی گئی ہے۔ اور پہلی مرتبہ عوام میں یہ شعور پیدا ہوگا کہ یہ ملک ان کا اپنا ہے، اس کے چلانے کی ذمہ داری ان کی ہے اس کو بہتر بنانا ان کا فرض ہے اور اس کو ترقی دینا ان کا مقصد ہے۔ عوام کو آج تک اس ملک پر کوئی حق نہیں تھا۔ اس کی کوئی ذمہ داری ان کی نہیں تھی۔ اور آزادی ملنے کے باوجود، انھوں نے کبھی آزادی کا سانس نہیں لیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ سورج نکلا ہے پہلی بار ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں اور ان کی نظروں میں آس پاس کی چیزیں صاف ہوئی ہیں۔ ایک نئے دور اور ایک روشن مستقبل کا آغاز ہے۔ ہم پاکستانی اسے خوش آمدید کہتے ہیں ؎
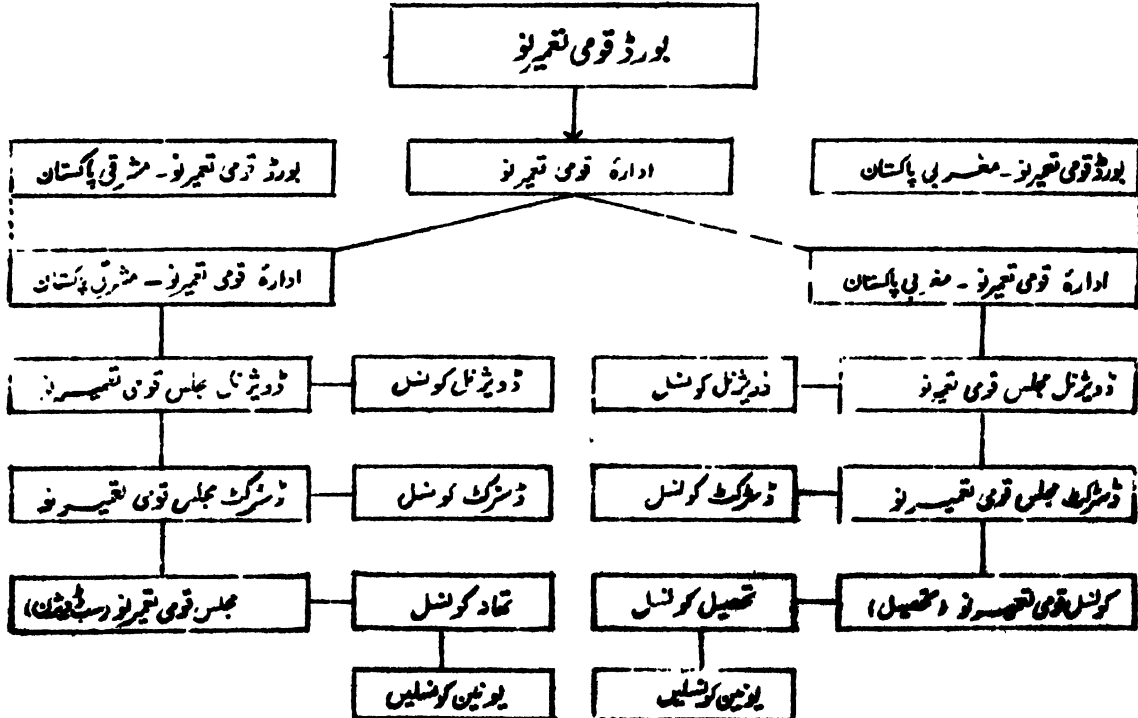
طُرّے باز خاں سے نیک محمد تک

ابنِ انشا

یونان کی کہانیوں میں ایک پہلوان کا نام آتا ہے جس کی طاقت کا بھید بس اتنا تھا کہ دھرتی کو نہیں چھوڑتا تھا جب تک اس کے پاؤں دھرتی کو چھوتے رہیں، دنیا کی کوئی طاقت اس کو ہرا نہیں سکتی تھی۔ دشمن نے اس کو مارا، دھرتی سے اس کے پاؤں اکھاڑ کر ــــــ دھرتی سے جدا کر کے۔ یہی حال میں اپنا سمجھتا ہوں، عام لوگوں کا بھی۔ لکھنے والوں کا بھی۔ شعر و شاعری میں میں خود چاند تک پہنچا ہوں بلکہ آجکل جو راکٹ اس کا چکر لگا رہے ہیں، اکثر ان سے بھی آگے نکل گیا ہوں لیکن عام زندگی میں میں نے زمین کو نہیں چھوڑا۔ اس کی مٹی کی سوندی باس مجھے نفیس سے نفیس عطر سے زیادہ عزیز رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ میں گاؤں میں بڑھا پلا۔ ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ خود کھیت میں کام کرتا رہا ہوں۔ قسمت اچھی تھی، پڑھ لکھ گیا بلکہ سولہ جماعتیں شاندار طریقے پر پاس کر گیا لیکن اب بھی افلاطون کے فلسفے کی نسبت زیادہ دلچسپی مجھے اس سے ہے کہ میرے گاؤں کے لوگ کس حال میں ہیں۔ وہاں جو سڑک بن رہی تھی کہاں تک پہنچی ہے۔ بنجر اور ریتلی زمین قابلِ کاشت بنی کہ نہیں۔ گاؤں کے بعد اپنے علاقے اور اپنے ملک کے متعلق یہی بات سوچتا ہوں۔ تب کہیں باہر کا، ایران توران کا ذکر آتا ہے۔ چاند اور مریخ تو بہت دور ہے۔

پھر میرا سوچنے اور بات کرنے کا انداز بھی سیدھا سادا ہے۔ اگر کوئی شخص آکر لمبی چوڑی پیچ دار بات کہے یا خوبصورت لفظوں کے طوطا مینا بنائے تو میں فوراً ٹوک دیتا ہوں: "بھائی میری سمجھ میں نہیں آیا، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف کہہ" لوگ تھوڑی دیر کو مجھے سادہ لوح سمجھ لیتے ہیں لیکن اس میں میرا کیا جاتا ہے۔ دھوکے اور بل، فریب کا امکان تو نہیں رہتا نا۔

یہ سب کچھ لکھنا اس لئے ضروری معلوم ہوا تاکہ آپ جان لیں اس مضمون کا لکھنے والا کس قسم کا آدمی ہے۔ میں زیادہ غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ مجھے محنت کر کے کھانے والوں اور ملک کی خوشحالی اور ترقی میں عملی حصہ لینے والوں سے زیادہ محبت ہے۔ بہ نسبت نکمے احدیوں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والوں اور عیش کرنے والوں کے۔ کسی چیز کا برا بھلا پرکھنے کے معاملہ میں بھی میری یہی کسوٹی ہے۔ آپ نے انقلاب کا نام لیا تو میں یہی پوچھوں گا: کیا مطلب؟ یہ بات نہیں کہ مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے۔ بہت آتے ہیں۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نظام بدلا ہے یا محض حکومت۔ اگر محض حکومت بدلی ہے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یوں بھی دس سال میں دس حکومتیں آئی ہیں۔ ہاں نظام بدلا ہے تو ایک بات ہے۔ پھر یہ بتاؤ اس سے فائدہ کس کو ہوا۔ اگر امیر لوگ اور امیر، اور غریب لوگ اور زیادہ غریب ہوتے ہیں تو اس انقلاب کو سلام۔ ادیب لوگ ویسے بھی تانا شاہ ہوتے ہیں، ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ کسی چیز کو اچھا یا بہت اچھا کہہ دینے سے ان کی شان میلی ہونے کا ڈر رہتا ہے

لہٰذا مجھے بھی انقلاب نے رفتہ رفتہ منوایا۔ انقلاب کے اعلان کے دن آدھی خوشی ہوئی چلو وہ لوگ ختم ہوئے جنہوں نے ملک کو تماشا بنا رکھا تھا اور تباہی کی طرف لئے جا رہے تھے۔ باقی آدھی کے لئے کچھ انتظار کرنا پڑا:

چور بازاری ختم ہوئی
مالِ ناجائز درآمد کرنے والے پکڑے گئے۔
ٹیکس چوری، رشوت ستانی، بدعنوانی ختم!

خوب۔ بہت۔ بڑی اچھی باتیں تھیں لیکن انقلاب کا منصب اور مقصد ان سے کچھ اونچا تھا۔ اصل خوشی اسی وقت ہوئی جب زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا، جاگیرداریاں ختم ہو گئیں۔ بڑی زمینداریاں چھوٹی رہ گئیں بے زمین لوگوں کو، موروثی کاشتکاروں کو زمین کے مالک بننے کی خوش خبری ملی۔ یہ تھا انقلاب کا میٹھا پھل۔ خرابی کی جڑ پر کلہاڑا لگانا چاہیئے۔ پتے چھانٹ دینے سے کچھ نہیں ہوتا کسی پھوڑے کا سارے جسم میں زہر پھیل رہا ہو تو نشتر لگانا ہی پڑتا ہے۔ آپریشن کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بغیر پھانسی گولی کے یہ سب کچھ ہو گیا۔ اب تو جو بوئے گا وہ کاٹے گا جس کے ہل بیل، اسی کی فصل۔ دیکھتے ہیں پھر جانبداری برت گیا۔ میرے سامنے میرا گاؤں رہا لیکن میرے گاؤں میں سارے پاکستان کی پچاسی فیصدی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ ان پچاسی میں شاید ایک فیصدی ہوں گے جو بہت اونچے ہیں۔ شاندار حویلیوں اور سینکڑوں مربعوں والے۔ میں ان کی نمائندگی نہیں کرتا نہ سہی، باقی چوراسی کی تو کرتا ہوں۔

اب جو بنیادی جمہوریتوں کا اعلان ہوا اور ایک صاحب اس کی خبر لے کر آئے تو میں نے حسب معمول سادگی سے پوچھا: جمہوریت؟ کیسی جمہوریت؟ وہ حیران رہ گئے کہ یہ شخص بظاہر پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اور ایسے سوال کر رہا ہے۔ میں نے کہا: "بھائی، میں لفظی معنی نہیں پوچھ رہا۔ یہ جاننا چاہتا ہوں اس کا عملی روپ کیا ہوگا۔ لوگوں کی نمائندگی کیسے ہوگی۔ ان کی آواز کہاں تک سنی جائے گی۔ کہیں یہ وہ طرے باز خاں والی جمہوریت تو واپس نہیں آ رہی جو ابھی پچھلے سال ختم ہوئی ہے۔" کہنے لگے: "طرے باز خاں کون؟" میں نے بتایا کہ وہ ہمارے علاقے سے اسمبلی کے ممبر تھے۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن ان کا طرہ گز بھر اونچا ہوتا تھا، سارے ممبروں کے طرے اس کے سامنے ہیچ تھے لہٰذا ان کا یہ نام پڑ گیا تھا بلکہ ہمارے علاقے کے بعض لوگ اس امر پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔ کہنے لگے: "آپ کو ان کے طرے سے کیا شکایت تھی بھائی؟" میں نے کہا: "طرے سے نہیں تھی کیونکہ وہ تو میں بھی خوب سا کلف لگا کر بلند کیا کرتا تھا اور کسی شادی میں جاؤں تو اب بھی اسی آن بان سے جاتا ہوں، مجھے تو ان کی ذات کے بعض پہلوؤں پر اور جس طریقے سے وہ ممبر منتخب ہوئے اس پر اعتراض تھا۔" کہنے لگے: "وہ کیا۔" میں نے کہا: "معلوم ہوتا ہے پوری کتھا سنانی پڑے گی۔ طرے باز خاں صاحب ہمارے نمائندے کہے اور سمجھے جاتے تھے لیکن ہمارا گاؤں بلکہ ارد گرد کے گاؤں بھی ہمیشہ ان کی شکل دیکھنے کو ترستے رہے۔ آخر آخر میں جو وہ نائب وزیر بنے ہیں تب ان کی تصویر اخباروں میں ضرور دیکھی۔ الکشن کا حال یہ تھا کہ ایک میلہ سا لگ رہا تھا۔ موٹریں گاؤں گاؤں دوڑی پھر رہی تھیں۔ کیمپ سے تھوڑی دور دیگیں چولہوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور پلاؤ کی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پلاؤ تو مخالف امیدوار زبان دراز خاں نے بھی پکوایا تھا لیکن اس میں بوٹیاں کم تھیں۔"

میرے دوست [illegible] کر بولے۔ "یہ کیا نام ہوا زبان دراز خاں؟" میں نے کہا: "ایسے معاملوں میں اصل نام نہیں پوچھا کرتے۔ یہ ایک صاحب تھے بڑے ہی چرب زبان۔ [illegible] تقریر کرتے تو معلوم ہوتا ان سے بڑا ہمدرد لوگوں کا کوئی نہیں ہوگا۔ بچارے عوام [illegible] ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی لیڈری کے پردے میں دنیا بھر کو لوٹا۔ اپنے بیٹے کو سڑک کی بسوں کا ٹھیکہ دلا دیا تھا۔ کچھ مربعے بھی اپنے حق میں زیادہ لے رکھے تھے۔ روز نئی پارٹی بدلتے تھے۔ طرے باز خاں کے ساتھ بڑی چوٹ تھی لیکن قسمت سے رہ گئے۔ لیکن میں الکشن کا حال کہہ رہا تھا۔ ادھر طرے باز خاں صاحب کے ایجنٹوں نے شہر سے ایک مولوی بلا کر جلسہ کر رکھا تھا، ادھر زبان دراز خاں صاحب خود تھے اور مزید کچھ پاس کے ضلع کے نامی گرامی بھانڈ اور نقلیے منگا کر لوگوں کی تفریح طبع کا

پاک جمہوریت

ہمارے ملک کی ۹۰ فیصد آبادی دیہات میں بسی ہوئی ہے۔ قومی تعمیر نو کے سلسلے میں بنیادی جمہوریتوں کا قیام ایک حوصلہ مندانہ اقدام ہے۔ اس کے ذریعے دیہات سے کام شروع کیا گیا ہے تاکہ ہمارے عوام ملک کی تعمیر کے کاموں میں حصہ شریک ہو کر اپنی بہبود کی راہیں پیدا کر سکیں
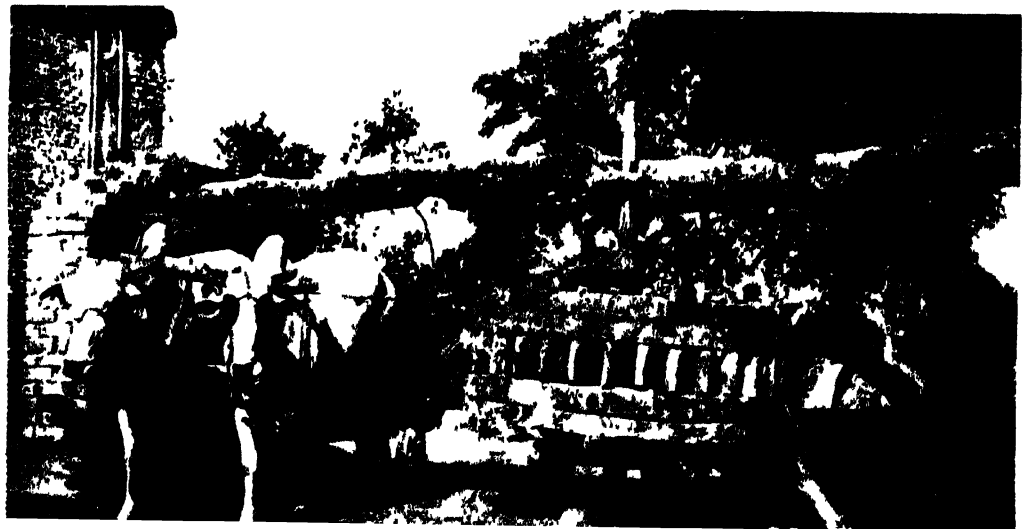
سامان کر رکھا تھا۔ دیہات کے لوگ بچارے سادہ طبیعت کے ہوتے ہیں۔ دونوں امیدواروں کے چلتے پرزے لوگ پھرکی کی طرح یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ کسی سے رشتہ نکالا، کسی کو برادری کا واسطہ دیا، ایسے بھی ووٹر تھے جنہوں نے صرف یہ دیکھا کہ گھی کس کے پلاؤ میں زیادہ تھا۔ ایسے بھی تھے جو نوٹ دیکھ کر ووٹ دینے پر راضی ہوئے۔ خیر لاؤڈ اسپیکروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"طرہ باز خاں کا نام یاد رکھنا۔ ان کے بکس پر طرے کا نشان ہے۔"

"آپ کا قیمتی ووٹ زبان دراز خاں صاحب کو ملنا چاہیئے۔ ان کے بکس پر گراموفون کا نشان دیکھ لیجئے۔"

خیر یہ چہل پہل، یہ موج میلہ ختم ہوا طرہ باز خاں ممبر بن گئے۔ اس سال یہ بڑی نہر ابھی نکل رہی تھی۔ ہمارے گاؤں والے چاہتے تھے کہ اس کی ایک شاخ ہمارے ہاں بھی آئے اور جو زمینیں اس وقت بنجر پڑی ہیں، کام کی ہو جائیں۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کو مڈل بنوانے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی لہٰذا گاؤں والے وفد بنا کر خان صاحب کی تلاش میں نکلے۔ ہمارے چاچا جی بھی اس وفد میں تھے۔ بیس میل دور خاں صاحب کے گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا وہ تو زیادہ تر شہر میں رہتے ہیں۔ فقط سال میں دو تین بار شکار کھیلنے آتے ہیں، خیر یہ وفد اگلے دن ریل کے ٹکٹ کٹا شہر پہنچا۔ کوٹھی پر بڑا سا پیتل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ دروازے پر ہی تھے کہ دو خاص الخاص پلے ہوئے کتوں نے استقبال کیا۔ بلکہ ایک تو خلوص کے مارے وفد کی ٹانگوں سے بھی لپٹ گیا۔ پہچان گیا ہوگا میرے آقا کے علاقے کے لوگ ہیں۔ ایک مالی نے رحم کھا کر چھڑایا۔ بہت دیر انتظار کیا آخر خان صاحب کی لمبی چمکیلی موٹر آئی لیکن زن سے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ یہ لوگ کھڑے درخواست کا کاغذ ہلاتے رہ گئے۔ اندر پیغام بھجوایا تو جواب ملا: "فرصت نہیں، یہ بھی کوئی ملنے کا وقت ہے۔"

ان صاحب نے پوچھا: "کیا کوئی اور اچھا امیدوار نہ تھا ان دونوں کے سوا؟"

میں نے کہا: "تھا کیوں نہیں، اپنے چودھری نیک محمد کو گاؤں کے لوگوں نے امیدوار کھڑا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کتنے اچھے آدمی ہیں۔ علاقے کی خوشی اور غم میں شریک رہتے ہیں۔ ان کو جاننے والے ہزار دو ہزار آدمیوں نے انہیں ووٹ بھی دیئے۔ یعنی دو تین گاؤں جن کو ان کی خوبیوں کا علم تھا، ان کے پیچھے تھے۔ لیکن اتنا بڑا حلقہ تھا اور دوسرے دونوں امیدواروں نے لالچ اور دھونس دونوں ہتھکنڈے استعمال کئے۔ یہ بچارے رہ گئے بلکہ ضمانت ضبط ہوتے بچی۔"

وہ صاحب بولے: "تو خوش خبری سن لو، اب کے چودھری نیک محمد کامیاب ہوں گے۔ ان کے دشمن ان کے آگے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام ہی کچھ ایسا ہے۔ یونین کونسل سے بات شروع ہوتی ہے۔ ایک ہزار سے لیکر پندرہ سو تک کا حلقہ ایک آدمی چنے گا۔ کونسل میں دس آدمی ہوں گے۔ یوں سمجھو دس پندرہ ہزار کی آبادی یعنی چند گاؤں میں ایک کونسل۔ قصبوں اور شہروں میں بھی یہی حساب رہے گا۔ دس پندرہ ہزار آبادی کے قصبے میں ایک، بڑے شہروں میں زیادہ کونسلیں رہیں گی۔ اس سے اوپر تحصیل، ضلع، کمشنری وغیرہ کی کونسلیں ہوں گی۔ جن میں نیچے سے درجہ بدرجہ اوپر تک آدمی جائیں گے اور متعلقہ افسران کے مشوروں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ بنیادی جمہوریت ہے۔ یہ مکان اوپر تک جائے گا لہٰذا اس کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی معمار دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دے تو دیوار آسمان تک ٹیڑھی ہی جائے گی (بشرطیکہ وہ آسمان تک پہنچ سکے) بنیاد مکان کے بننے سے پہلے ہی مضبوط ہو سکتی ہے بعد میں نہیں جیسا دو تین سال ہوئے کراچی کے ایک ٹھیکیدار نے کیا تھا۔ اس ٹھیکیدار نے مہاجرین کے لئے کوارٹر بنائے۔ بن گئے تو معلوم ہوا، کفایت کے خیال سے اس نے نیو کھودی ہی نہیں بلکہ زمین سے اینٹوں کی چنائی شروع کر دی تھی۔ شکایت ہوئی تو اس نے کہا: "معاف فرمایئے گا بھول ہو گئی اب ٹھیک کئے دیتا ہوں۔" اس نے دیوار کے نیچے سے زمین کھودی اور اس میں عمارتی مسالہ بھر دیا۔ لیجیے صاحب، بنیاد بن گئی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مرحلہ پر دیوار میں مضبوطی تو کیا آ سکتی ہے، ان کا رہا سہا

زور بھی بکھر گیا ہوگا۔ خیر پرانے دور میں اسی طرح کی لیپا پوتی رہی لیکن اب یہ بات نہیں۔ نئی یونین کونسلیں اپنا کام تو خیر کریں گی ہی۔ سڑکوں، راستوں کا بنانا، گاؤں، محلے کی صحت، صفائی۔ روشنی کا انتظام، جرائم کی روک تھام۔ چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ جس کا اختیار قانون نے کونسلوں کو دیا ہو، وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ اعلیٰ سطح پر نمائندگی کے لئے تربیتی مرکزوں کا کام بھی دینگی۔ ایک ڈیڑھ ہزار کے حلقے میں لوگ سوچ سمجھ کر اچھا آدمی چنیں گے، اور وہ کام کرے گا۔ کیوں نہ کرے گا۔ اس کا اپنا بھلا اسی میں ہے، اس کا اپنا گھر اسی کونسل کے علاقہ میں ہے۔ یونین کونسل کا صدر اور تحصیل کی کونسل کا خود بخود ممبر بن جائے گا لہٰذا وہاں آواز پہنچے گی۔ وہاں سے ضلع کی کونسل کے لئے، کمشنری کی کونسل کیلئے راہ کھلی ہے۔ علاقہ کی ترقی پر جو بھی خرچ ہوگا اس کی منظوری میں اس کا دخل رہے گا اور وہ کہہ سکے گا کہ نہر میرے علاقے میں بھی آنی چاہیئے۔ میرے گاؤں کا پرائمری اسکول، مڈل اسکول بننا چاہیئے۔ طرہ باز خاں کا دور ختم ہوتا ہے، چودھری نیک محمد کا دور شروع ہوتا ہے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس نہیں جائے گا۔ کنواں پیاسے کے پاس آگیا ہے۔ یہی جمہوریت کی اصل روح ہوتی ہے اپنی مدد آپ، اپنے فیصلے آپ، اپنی حکومت آپ

سازِ صد آہنگ

آغا صادق

آزادی اک بادل

اس بادل کو ہر کھیتی پر چھا جوں جل برسانے دو

آزادی اک پیڑ

پیڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم سب کو ستانے دو

آزادی اک نغمہ

اس نغمہ کی سریلی دھن پر سب کو ساز بجانے دو

آزادی اک نور

اس کی جوت سے ہر بستی میں امن کے دیپ جلانے دو

آزادی آئینہ

آئینے میں سب کو اپنی بانکی چھب دکھلانے دو

آزادی اک پھول

پھول کی بھینی بھینی مہک کو روش روش مہکانے دو

آزادی اک چشمہ

اس چشمے سے سب پیاسوں کو من کی پیاس بجھانے دو

آزادی پیمانہ

پیمانے سے ہر ساغر کو پورا حصہ پانے دو

آزادی اک خواب

خواب کو ایک حقیقت کا اب روپ دھار کر آنے دو

حقیقی جمہوریت — ایک نعمتِ عظمیٰ

ابو الجلال ندوی

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانہ سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کا ایک گروہ برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ ساری دنیا میں نہیں تو ہندوستان میں از سرِ نو اللہ اور رسولؐ کے آئین کو بالادستی حاصل ہو جائے۔ عوام نے اپنے خون کی قربانیاں دے کر، جان و مال اور عزت و آبرو بھینٹ چڑھا کر، اعزہ و اقارب اور وطنِ مالوف سے ناتا توڑ کر، اپنا سب کچھ کھو کر تحریکِ پاکستان کو کامیاب کر دیا لیکن صحیح نہج پر قائم ہونے کی بجائے خطۂ پاک میں دس گیارہ برس ایسی حکومتیں فرماں روا رہیں جنہوں نے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عوام سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم مایوسی کا شکار ہو گئی لیکن ۸ راکتوبر ۱۹۵۸ء اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ شدت سے ۲۷ - اکتوبر کا آفتاب حضرت یعقوب بن کر پکار اٹھا کہ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا کرتے مگر کافر لوگ" (یوسف ۸۷) دستِ غیب نے قومی مفاد کو ذاتی اغراض پر بھینٹ چڑھانے والے گروہِ بالا دست پر حملہ کیا اور ایک پرامن و بے خون انقلاب سے آنِ واحد میں ملک کی کایا پلٹ دی۔ چنانچہ پاکستان کے ایک ایک شہر کے گلی کوچے پکار اٹھے کہ خود پرستوں کا دور گیا اور خدا پرستوں کا دور آیا۔ قوم نے سمتِ کعبہ کی طرف چلنے کے لئے احرام باندھ لیا۔ اب عنقریب بنیادی جمہوریتیں برسرِ کار آ... نمائندے جو کچھ عرصہ بعد مرکزی مجلسِ شوریٰ کو چنیں گی اور از سرِ نو حق و انصاف کا بول بالا ہو گا۔ وذالک علی اللہ بیسیرہ

لیکن ایسا ہمہ گیر انقلاب محض نیک خواہشوں سے انجام نہیں پایا کرتا۔ اس کے لئے انتہائی جدوجہد اور عزم و ارادہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے قاید کتنے ہی پرخلوص اور پیکرِ عزم و عمل کیوں نہ ہوں — اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور ان کے رفقائے کار سے زیادہ ان اوصاف کا مظہر اور کون ہو گا؟ — جب تک جمہور اپنے نیک ارادوں اور ذوقِ عمل سے تعمیری کاموں میں پورا پورا تعاون نہ کریں ہمارا کارواں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسلام کی حکومت پہلے افراد کے دل میں متمکن ہوتی ہے، پھر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے ذریعے معاشرہ پورے کا پورا اسلام کا محکوم بنتا ہے۔ اس کے بعد اولوالامر کو موقع مل سکتا ہے کہ وہ اسلامی آئین کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں۔ حصولِ آزادی کے لئے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جو کچھ کیا گیا اس سے زیادہ قوی جدوجہد کے بغیر ہم اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول سے معذور ہی رہیں گے۔ پہلے ہمارا مقابلہ اغیار سے تھا۔ اب ہمیں خود اپنے اندرونی نقائص کے خلاف جنگ کرنی ہے جو نسبتہً شدید تر ہے۔ اور اس کے لئے بعض بنیادی حقائق کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ ہم انہیں شمعِ راہ بنائیں اور ملی عروج و ترقی کے مدارج زود تر اور بوجہ احسن طے کر لیں۔

اس سلسلہ میں اقوامِ کہن کی تاریخ، جیسی کہ قرآن مجید میں مذکور ہے، خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ پرانی قوموں کے حالات قصہ ہائے پارینہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور طبائع بالعموم ان کی فرسودگی سے گریز کرتی ہیں پھر بھی اربابِ نظر جانتے ہیں کہ یہ محض قصص و حکایات نہیں بلکہ ان کی تہہ میں زندگی کے حقائق اور اصلیتیں پنہاں ہیں۔ آئیے ہم ان پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

طوفانِ نوح اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ محض ثروت کو معیارِ فضیلت و سرداری قرار دینا تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اس طرح ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے جو آج بھی ہمارے لئے وہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ مخدوم و مطاع ہونے کا حق صرف زرداروں ہی کو ہے۔ دیگر افراد اس کے حقدار نہیں۔ حقیقی جمہوریت میں یہی مناسب و لازم ہے کہ اس میں محض شرطِ زر نہ ہو بلکہ دوسری خوبیوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

زر پرستی کی طرح جباری بھی، جس نے ہمارے زمانہ میں ڈکٹیٹرشپ کے نام سے شہرت حاصل کی ہے، معاشرہ میں بنیادی خرابی کا باعث ہے۔ بنو عاد یا ہود، پنج ہر آمرا و فرماں روا کو جبار دیکھنا چاہتے تھے جو دوسروں پر استبداد روا رکھے۔

ایک اور قوم۔ صالح یا ثمود۔ کا نظام حکومت ایک طرح کی جمہوریت تھا۔ معلوم نہیں اس کے اولوالامر خود بخود قوم کے رہنما بن گئے تھے یا لوگوں نے ان کا انتخاب کیا تھا، بہرحال ان کے "شہر میں نو سردار تھے جو زمین میں خرابی پھیلاتے تھے اور سدھار تے نہ تھے" (نمل ۴۸)۔ ثمود نے کہا "کیا ہم اپنے درمیان سے ایک واحد بشر کا اتباع کریں؟ ایسا کریں گے تو ہم گمراہی اور حماقت میں مبتلا ہوں گے" (قمر ۲۴) اس سے معلوم ہوا کہ ثمود کے نزدیک

(۱) اکثریت کی رائے واجب الطاعت تھی، اقلیت کی نہیں (یہی تصور عہد جدید میں بھی ہے)

(۲) ان کے امرا اخلاقی محاسن سے متصف نہ تھے، بلکہ مسرف (حد سے گزر جانے والے "بدعمل") تھے مصلح نہ تھے۔ ان کے حکام جیسے بھی ہوتے قوم اُن کو بخوشی مان لیتی تھی، کوئی احتجاج نہ کرتی تھی۔

نوح، ہود، اور قوم صالح کا زمانہ بادشاہوں کے زمانے سے پہلے گزرا۔ سب سے قدیم بادشاہ جس کا ذکر قرآن میں ہے، قوم ابراہیم کا بادشاہ ہے۔ (امرافیل، لقب نمرود؟) اس کے نزدیک ضروری تھا کہ رعیت کے ہر فرد کا وہی مذہب ہو جو اس کا تھا۔ غرور بادشاہی نے اسے اپنا مسلک بدلنے کی اجازت نہ دی۔

مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی بدترین حکومت فرعونی حکومت تھی، لیکن قرآن مجید کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرعونی راج عہد جدید کی بعض محبوب ترین حکومتوں کے مشابہ تھا۔ فرعون الوہیت کا مدعی تھا، دوسرے اس نے یہ کہا تھا "کیا مصر کا ملک اور یہ نہریں جو میرے تلے بہتی ہیں میری نہیں؟ (زخرف ۵۱)

قرآن اگرچہ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر شخصی حکومتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن آئینی حیثیت سے اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص واحد کسی ملک یا قوم کا بادشاہ ہو۔ حضرت موسیٰ کے الفاظ میں مسلمانوں کی پوری قوم کو ملوک ہونا چاہیئے۔ ("اللہ نے تم سب کو ملوک بنایا ہے" مائدہ ۲۰)

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہمارے موجودہ حکمرانوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ "تمام جمہوری نظاموں کا مضمر تصور یہ ہوتا ہے کہ اصل حکومت و بالادستی صرف عوام کا حق ہے اور وہی اپنے حکمران ہوتے ہیں" یہی حضرت موسیٰ کی تعلیم تھی جس کی بنا پر فرعون حضرت موسیٰ اور ان کے معتقدین کا دشمن ہو گیا تھا۔ قرآنِ پاک میں حکومت سے متعلق جتنی آیتیں ہیں ان میں (الذین آمنوا) مخاطب ہیں کہیں کسی بادشاہ یا اولی الامر کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن نہ تو کسی فرد کو مسلمانوں کا آمر مانتا ہے نہ کسی جماعت کو۔ مسلمان من حیث الکل خدا کے محکوم ہیں اور خدا کے بعد اپنے حاکم آپ ہیں۔

فرعون کا نظام حکومت، جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے، بالکل پارلیمانی تھا۔ اس کی پارلیمان کا قرآنی نام الملؤمن قوم فرعون ہے (اعراف) یہ معلوم نہیں کہ ملاء فرعون کے افراد نامزد ہوتے تھے، یا منتخب کئے جاتے تھے۔ لیکن دربار فرعون میں ہر امر مشورۃ باہم سے طے ہوتا تھا۔ آخری منظوری یا نامنظوری کا اختیار فرعون کو تھا۔

دربار فرعون میں فرعون کے علاوہ جو لوگ مشورہ میں حصہ لیتے تھے ان میں سے تین شخصوں کو ہم جانتے ہیں (۱) مومن آل فرعون خاندان فرعون کا نمائندہ، یہ شخص حضرت موسیٰ سے عقیدت رکھتا تھا۔ مگر اپنے ایمان کو اس نے مخفی رکھا تھا (۲) قارون یہ اپنے وقت کا بڑا دولتمند اور قوم موسیٰ کا ایک فرد تھا۔ غالباً اپنی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے ملا فرعون میں داخل تھا۔ (۳) ہامان قوم فرعون کا نمائندہ، محکمہ تعمیرات کا افسر۔ باقی افراد اس قدر اہم نہ تھے کہ ان کا ذکر قرآن میں آتا۔

فرعونی حکومت جو توراۃ، انجیل اور قرآن کی بدولت دنیا کی بدترین حکومت سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ عہد کی بہترین جمہوریتوں سے

بہتر تھی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ حکومت کی بنیاد قومی نمائندوں کے مشورہ باہم پر قائم ہونے اور اکثریت کے فیصلے کو واجب العمل قرار دینے سے کوئی حکومت اچھی اور خدا کی پسندیدہ حکومت نہیں بن جاتی بلکہ ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ارکانِ حکومت میں ہامان و قارون جیسے افراد داخل نہ ہونے پائیں۔ مجلس شوریٰ میں جو بات بھی طے پائے اسے امر رشید بھی ہونا چاہیئے۔ آئین ساز مجلس اگر کوئی ایسی بات طے کرتی ہے جو خدا کے آئین سے ٹکراتی ہو۔ یا رشید یعنی مناسب و برحق نہ ہو تو ایسے امر کی اتباع اور فرعونی حکومت کے اتباع میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

بنو اسرائیل شخصی حکومتوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا اس لئے پسند کرتے تھے کہ ان دنوں کی تمام قومیں ایک نہ ایک بادشاہ کی تابع تھیں۔ چنانچہ انہی کی استدعا پر طالوت بادشاہ بنے جو پہلے قدیم ترین مسلمان بادشاہ تھے۔ ان کے بعد حضرت داؤد اور پھر حضرت سلیمان کو خدا نے بادشاہی سے نوازا۔ یہ دونوں بزرگ خود صاحب الہام تھے۔ ان تین بادشاہوں کے زمانے میں بتوسط انبیا خود ذات باری کی بنو اسرائیل پر حکومت تھی۔ ان کی مثال سے ظاہر ہے مسلمانوں کے حکام علم اور جسم کے لحاظ سے ممتاز ہوں۔ علم سے مراد الٰہی شریعت اور مصالح امت کا علم و فہم ہے۔ اور جسم سے مراد عمدہ صحت اور ہر ذمہ داری کو اٹھا سکنے کی تاب و تواں ہے۔ لہٰذا ہماری بنیادی جمہوریتوں کے لئے ایسے لوگ منتخب ہونے چاہئیں جو اپنے حلقے کے لوگوں کے مفاد کا بہترین فہم رکھتے ہوں، اس کی موثر و احسن طریق پر ترجمانی کر سکیں اور دیانت داری سے اس کا تحفظ بھی کر سکیں۔

اسلامی حکومت کیا ہے اور کیونکر قائم کی جا سکتی ہے، قرآن، حدیث، فقہائے امت کے اقوال اور مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کو سامنے رکھ کر اس باب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ عام مسلمانوں کے سیدھے سادہ فہم کو مدنظر رکھتے ہوئے بالاختصار یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم پر تین اطاعتیں فرض ہیں۔

(۱) اللہ کی اطاعت (۲) رسولؐ کی اطاعت (۳) اولوالامر کی طاعت یعنی ان احکام کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب جو صریحاً کتاب اللہ میں وارد ہیں، حضور صلعم کے ارشادات پر عمل جو درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہے کیونکہ آپ کی طرف جو حدیثیں منسوب ہیں، بشرط صحت وہ قرآن ہی کی تشریحات ہیں۔ اور وہ قوانین جو کتاب و سنت پر غور کر کے فقہائے اسلام نے مستنبط کئے ہیں ان پر صحتِ اجتہاد کی شرط کے ساتھ عمل۔ واجب الطاعت اولی الامر کو "الذین آمنوا" میں سے ہونا چاہیئے جیسا کہ منکم کی شرط سے ظاہر ہے۔ ہر وہ شخص اولی الامر نہیں ہو سکتا جو غیر آئینی طریقہ سے خود بخود آمر بن گیا ہو۔

"مسلمانوں کا امر آپس میں مشورہ کرتا ہے" (شوریٰ) اولوالامر جن کی طاعت ہر مسلمان پر واجب ہے، یہی اصحاب شوریٰ ہیں، جن کے لئے بعض شرائط درکار ہیں۔

اسلامی حکومت کا سنگِ بنیاد ہے ان الحکم الا للہ یعنی فیصلے کا حق نہیں مگر اللہ کو۔ اللہ نے جو امر، نہی یا اجازت نازل فرما دی اس میں کسی رد و بدل کی اجازت نہ کسی امیر کو دی جا سکتی اور نہ کسی مشیر کو۔

اللہ نے بعض امور کو بندگان خدا کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے جن کو وہ باہمی مشورہ سے طے کر سکتے ہیں۔ (امرھم شوریٰ بینہم (شوریٰ ۳۸)) لہٰذا اسلامی معاشرے کی بنیادیں دو ہیں: فتویٰ اور شوریٰ۔ قرآن و حدیث سے احکام استنباط کرنے کے قواعد و ضوابط فقہائے اسلام نے صدیوں غور و فکر کے بعد منضبط کر دیئے ہیں۔

سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل شوریٰ چنے کیسے جائیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ایک ایک فرد سے رائے لی جائے۔ امت کے چند نمائندوں ہی سے رائے پوچھی جا سکتی ہے۔ قرآن نے اصحاب شوریٰ کا انتخاب اور طریق انتخاب ہماری بصیرت اور صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ پیروانِ رسول میں جو لوگ اصحاب حل و عقد اور فکر و تدبر والے ہیں وہ اتفاق آراء سے جس طریقۂ انتخاب کو پسند کر دیں اسے سبیل مومنین قرار دے کر قبول کر لینا چاہیئے۔ متعدد آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے مشیر و امیر ہونے کا حق صرف ایسے افراد کو ہے جو ایمان دار اور عابد ہونے کے ساتھ دیگر اخلاقی فضائل سے متصف ہوں اور اخلاقی رذائل ان میں نہ پائے جاتے ہوں۔ تمام رذائل سے پاک، تمام فضائل سے متصف،

افراد تو مشکل ہی سے ملتے ہیں پھر بھی ہم اس بات کا لحاظ رکھ سکتے ہیں کہ تا امکان اخلاقی اور دینی حیثیت سے نسبتہً بہتر افراد کو امت کے مشیروں کی حیثیت سے چنیں کیونکہ اولوالامر یعنی اصحاب شوریٰ کی طاعت ہم پر واجب ہے اور آثم و کفور کی کسی رائے کو ماننے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو علم و فضل سے زیادہ تقویٰ محبوب ہے۔

(۱) اللہ محبوب رکھتا ہے متقین کو۔

(۲) اللہ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور محبوب رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔

(۳) اللہ محبوب رکھتا ہے بھلے کام کرنے والوں کو۔

(۴) اللہ محبوب رکھتا ہے صابروں (حق کی خاطر دشواریاں جھیلنے والوں) کو

(۵) اللہ محبوب رکھتا ہے توکل کرنے والوں کو (ان کو جو ہر کام میں اللہ پر اعتماد رکھتے ہیں)

(۶) اللہ محبوب رکھتا ہے انصاف کرنے والوں۔

(۷) اللہ محبوب رکھتا ہے ان کو جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صف باندھ کر ایسی جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیواریں ہوں۔

قرآن کے مطابق نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ضروری معاملہ میں مشورے دینا بڑا کارِ ثواب ہے جس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا ویسا ہی ہے جیسے خود کو جہاد کے لئے پیش کرنا۔ ایک حدیث ہے۔ "ہم امیر نہیں بناتے اس کو جو امارت چاہتا ہے۔" اس حدیث کو عمال حکومت اور صدر مملکت و وزراء سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔ ان کاموں کے لئے ایسے لوگ چنے جاسکتے ہیں جو ان عہدوں کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر خواہش نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کو مشیران قوم تلاش کریں گے، لیکن مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے خود کو پیش کرنا ایک طرح کا مجاہدانہ عمل ہے۔

موجودہ زمانے کی مجالس شوریٰ عموماً پارٹی سسٹم پر قائم ہوتی ہیں۔ لیکن اسلام تحزب و تشیع کا روادار نہیں ہے۔ "یقیناً جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ٹولیاں بن گئے (اے محمد) تمہارا ان سے کوئی ناتا نہیں ہے (انعام ۱۵۹)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف آرا کی صورت میں فیصلہ کیسے ہو؟ کثرت آرا کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ قرآن میں جہاں جہاں اکثرھم کا لفظ آیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حق کو عموماً ابتدا میں شخص واحد نے پیش کیا، اقلیت نے قبول کیا، اکثریت نے مدتوں حق سے نفرت کی مگر بالآخر اکثریت کی آنکھیں کھلیں اور اس نے اقلیت کی رائے کو قبول کیا۔ اسلامی انداز کے شوریٰ میں رائے دینے والوں کی تعداد نہیں گنی جاتی بلکہ دلائل و مصالح کا وزن معلوم کیا جاتا ہے۔ مگر دلائل کو تولے کون؟ اگر ہم نے انہی لوگوں کو مشیر ہونے کے لئے چنا ہے جو خدا کے محبوب ہو سکتے ہیں یعنی متقی اور مقسط (خدا ترس و منصف مزاج) تو دلائل و مصالح کا وزن پوری مجلس خود محسوس کرے گی۔ اسلامی تاریخ کا ابتدائی دور ہم کو یہ طریقہ بتاتا ہے کہ مشیران ملت ایک متقی انسان کو ملت کا امیر چن لیں، پھر اس کی اطاعت پر پوری امت سے بیعت لی جائے۔ یہی متقی تر انسان اصحاب شوریٰ کی رایوں کو سن کر انہیں قرآن و حدیث کے ترازو پر تولے گا، اور دلائل و مصالح کی بنا پر مختلف فیہ آرا میں سے ایک کو ترجیح دیگا۔ اس کے بعد وہ اولوالامر کا حکم بن جائے گی جس کی طاعت ہم پر اسی طرح ہوگی جیسے خدا اور رسولؐ کی طاعت۔ بشرطیکہ وہ کسی قطعی فرمان خدا و ارشاد رسولؐ سے متصادم نہ ہو کیونکہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں بنیادی جمہوریتوں کا تصور اور لائحۂ عمل دونوں اسلامی نظریات اور قرآنی تعلیمات سے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ ان میں نہ جباری ہے نہ قہاری، نہ زر پرستی پسند رہے نہ مصنوعی مراعات پر کسی طبقہ کو دوسرے طبقوں کو فوقیت حاصل نہیں بلکہ ہر بات میں ایک خوشگوار توازن اور عوام کے بہترین مفاد کو پیش نظر رکھ کر نہایت عمدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ جدید ترین، پرخلوص ملی تجربہ اس کامیابی سے ہمکنار ہو جس کی اس سے توقعات وابستہ ہیں اور جس کے امکانات اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

*

وہ اداسیاں — یہ شگفتگی

عبدالرؤف عروج

فضا تمام صنم خانۂ تغیّر ہے
زبانِ عصر پہ افسانۂ تغیّر ہے

لہو لہان سمن زار میں نے دیکھے ہیں
دل و نگاہ کی تقلیب یاد ہے مجھ کو
ہزاروں زخم ہیں گلزار میرے سینے میں
ہوس کا دشنۂ تعزیر یاد ہے مجھ کو
نہ کوئی عقدہ کشا تھا نہ کوئی حلقہ شکن
وہ زلف و دام، وہ زنجیر یاد ہے مجھ کو

مجھے خبر تھی، ہوس کا مآل کیا ہوگا
شکستِ روح کے نغمے سنے نہیں میں نے
پریدہ نور چراغوں کے سرد بالیں پہ
سوادِ جبر کی راتیں گذار دیں میں نے
ستم نژاد حقائق کی داستانیں تھیں
بساطِ محفلِ دوشیں پہ جو کہیں میں نے
شدید یاس کی گھڑیاں قبول کیں میں نے
مئے نشاط بہ پیمانۂ تغیّر ہے

فضائے جبر عجیب و غریب تھی کتنی
دل و نظر کی تباہی قریب تھی کتنی

شکارِ شامِ فسوں گر، عروسِ صبح کے خواب
علاجِ تشنگیٔ دل، لہو بجائے شراب
بہ نوکِ خار پریشاں، سمن کدوں میں گلاب
حیات نذرِ جہنم، حیات صرفِ عذاب
کہیں یہ صرفِ تسلی، کہیں یہ صرفِ عتاب
خطوطِ چہرۂ جمہوریت تھے نقش بر آب

وراثتوں کا تصور محیطِ دانش و ہوش
پسِ خیالِ معیشت تباہیوں کا خروش
غبارِ علم میں سب جہالتیں روپوش
ہر ایک تاجرِ شہد و نبات، زہر فروش
یقینِ آمدِ فردا شکارِ تہمتِ دوش
کمالِ آگہی و آگہی اذیت کوش

اداسیوں سے ہراساں، شگفتگی کی امنگ
دل و نگاہ کی وسعت، دل و نگاہ پہ تنگ
ابھرتے ڈوبتے خاکے، سراب زنگا رنگ
ہر اک انارکلی زیرِ بارِ تختۂ سنگ
ہر اک فرید کی ملتانیاں فغاں آہنگ
ہر اک لطیف کی کافی، تباہِ شورشِ چنگ

وہ جبرِ اہلِ سیاست، وہ قیدِ بے الزام
وہ سطحِ ساز پہ جانسوز ہچکیوں کا خرام
وہ موجِ زہر بنامِ شراب جام بہ جام
وہ ملکیت سے سراسیمگی سی گام بہ گام
وہ ذہن و فکر پہ پہرے، دل و نگاہ غلام
وہ مضطرب سے تقاضے، وہ مشتعل سے عوام
پکارتے تھے حقائق کوئی جدید نظام
مگر مسافتِ زلف و صلیب تھی کتنی

سمومِ وحشتِ سوزاں، دمِ گلاب ہوئی
جنوں کے ہاتھ سے تشکیلِ انقلاب ہوئی

ضمیرِ سینۂ تہذیب جگمگا اٹھا
شبِ حیات کی تابانیوں کے دن آئے
فسونِ یورشِ غم کو نگاہ توڑ گئی
متاعِ عیش کی ارزانیوں کے دن آئے
کوئی غریب سرِ کوچۂ سبا سے کہے
پھر آج اس کی سلیمانیوں کے دن آئے

نہیں وہ علم کے پیرانِ تسمہ پا باقی
نہیں وہ جہل کی بے مائیگی عیارِ ہنر
کراں سے تا بہ کراں روشنی کے سیل رواں
افق افق کی جبیں پر کرن کرن جھومر
سمٹتے پھیلتے احساس کی فصیلوں سے
ابھر رہے ہیں اجالوں کے رایت و لشکر

ہر ایک موڑ پہ کلیاں، ہر ایک راہ میں پھول
صبا کی چال میں رفتارِ یار دیکھو تو

شررکدوں کو ملا پیرہن شگوفوں کا
ذرا رفاقتِ جشنِ بہار دیکھو تو
ہر ایک کنج مہکتا ہے بوئے یاراں سے
جمالِ تمکنتِ آشکار دیکھو تو
فروغِ جلوۂ صبر و قرار دیکھو تو
سکوں پذیر ہر اک موجِ اضطراب ہوئی

وفا سرشت تقاضے، اصول ہو کے رہے
دل و نظر کے فسانے قبول ہو کے رہے

نظامِ جبر کی وحشت فروز راتوں میں
تمدنوں کے اُجالے بکھر کے رہتے ہیں
سکوتِ یاس کی صرصر زدہ فضاؤں سے
صبا خرام زمانے گذر کے رہتے ہیں
کرشمہ سازیِ حالات کا بھنور کیسا
یقیں کنار سفینے ابھر کے رہتے ہیں

گماں کی رات میں لیکر یقیں کی قندیلیں
نظامِ تازہ کی تنویر مسکرائے گی
ہر ایک دشت میں کہسار میں خرابے میں
قلم اٹھائیں جو آرٹ توان کے ذہنوں میں
چناب دیس کی ہر نہر مسکرائے گی

کرٹے کی تال ہو یا پائلوں کی چھم چھم ہو
سلونے سانورے رمتے بہار گائیں گے
ہر ایک فصل کا نغمہ، ہر ایک فصل کے گیت
ہلوں کے ساز پہ مردانِ کار گائیں گے

زمین بھول گئی کام دیوتاؤں کو
سلگتے کھیتوں کے دیپک ملار گائیں گے

ہزاروں رنگ اڑائے گی پھولتی سرسوں
لذیذ آم کے باغوں میں بور مہکے گا
شمیم بیز حسین زعفران زاروں تک
جمالِ جادۂ سرو و چنار لہکے گا
ترانے رقص کریں گے ضعیف ہونٹوں پر
کٹیں گی دھان کی فصلیں الاؤ دہکے گا
قیامِ امن کا بڑھتا قدم نہ بہکے گا
ہوس کدے میرے قدموں کی دھول ہو کے رہے

بنامِ فکر و فنِ عصر تاب آیا ہے
سلامِ ارضِ وطن انقلاب آیا ہے

دل و دماغ، خیال و نظر، یقین و شعور
یہ سب غلام تھے جمہوریت کے سائے میں
شیوخِ پاک شریعت، کبارِ دین و طریق
حریصِ نام تھے جمہوریت کے سائے میں
اُبھرتی ڈوبتی پیہم قیادتوں کے ہجوم
خیالِ خام تھے جمہوریت کے سائے میں

عوام، صاحبِ فردا ہیں آج ان کے حضور
لہو نچوڑتی جمہوریت کو بار نہیں
مفاد کوش سیاست کے ہر اشارے پر
رخ اپنا موڑتی جمہوریت کو بار نہیں
طلسمِ ہر نگۂ سرگ ساز کھل کے رہا
دلوں کو توڑتی جمہوریت کو بار نہیں

مجاہدانہ صداقت کے دلبرانہ خلوص
پیامِ عظمتِ جمہور لے کے آئے ہیں
نئی حیات کا پرتو ہے تیرہ ذہنوں پر
نئی حیات تھی پُر نور لے کے آئے ہیں
پئے وطن نئی جمہوریت کے قالب میں
علاجِ قیصر و فغفور لے کے آئے ہیں
ہم اپنے عہد کا دستور لے کے آئے ہیں
جنوں بسوئے غزل، کامیاب آیا ہے

صلیب و طوق، نہ زنجیر و دار کے دن ہیں
قیامِ خیمۂ جشنِ بہار کے دن ہیں
فضا میں پرچمِ زلفِ خیال لہرائیں
تمام حوصلۂ اختیار کے دن ہیں
یہ رنگ رنگ تجلی، یہ رنگ رنگ سماں
جمالِ تمکنتِ روزگار کے دن ہیں
زمانہ چھیڑ رہا ہے سرودِ عشرتِ نو
مغنیانِ ہنر آشکار کے دن ہیں
فضا میں کیف، ہوا میں شراب کی تاثیر
طرب فروز، دلِ بیقرار کے دن ہیں
حنائی ہاتھوں کی مشعل کے ساتھ ساتھ چلو
جنوں کی لغزشِ مستانہ وار کے دن ہیں
میں آج آئینۂ شعر لے کے نکلا ہوں
فروغِ جلوۂ حسنِ نگار کے دن ہیں
عروج کوئی درِ دل پہ دے رہا ہے صدا
یہی تو عظمتِ مردانِ کار کے دن ہیں

پیغامِ سحر

باقی صدیقی

رات ڈھلی، تارے مُرجھائے، خوابوں نے پَر تولے
صبح کی دیوی جاگ اٹھی کرنوں کی زلفیں کھولے

چرخ نے اپنی پلکوں سے تاروں کے آنسو جھٹکے
منزل کی آواز پہ لپکے راہی بھولے بھٹکے

مست صبا کے جھونکوں سے شبنم کے موتی ٹوٹے
کوئل کی شہنائی سُن کر جاگ اُٹھے گل بوٹے

شاخوں کے جھولے لہرائے، پتے ہوش میں آئے
غنچوں نے منہ کھولے، کلیوں نے دامن پھیلائے

چنچل کرنوں کی آہٹ سے مست نظارے جاگے
تاریکی کا اندھا لشکر بھاگا آگے آگے

دُور افق سے پہلی کرن کے ساتھ صدا یہ آئی
جس نے سفر جاری رکھا ہے اُس نے منزل پائی

★

منظر منظر

احمد ظفر

لمحوں کے چراغ جلتے جلتے
افسانۂ غم سنا رہے تھے
سانسوں کے چراغ بجھ رہے تھے
آنسو تھے کہ جگمگا رہے تھے
ٹوٹے ہوئے تارِ سازِ دل کے
ویرانیٔ دل بڑھا رہے تھے
ہر نقشِ حیات مٹ رہا ہے
حالات ہمیں بتا رہے تھے

دیکھا تو بہار کا سماں تھا
لیکن یہ بہار بھی خزاں تھی
لمحوں میں چھپے ہوئے تھے آنسو
بے تابیٔ دل کہ بیکراں تھی
آنکھوں سے نہاں رہا اُجالا
تاریکیٔ شب کہ درمیاں تھی
وہ رات بھی ٹل گئی کسی طور
وہ رات کہ باعثِ فغاں تھی

جب شمعِ مزار جل رہی تھی
اب شمعِ بہار جل رہی ہے
سینے میں مچل رہے ہیں طوفاں
آنکھوں میں ہنسی مچل رہی ہے
جب بادِ سموم چل رہی تھی
اب بادِ مراد چل رہی ہے
بدلا ہے کچھ اس طرح سے منظر
ہر چیز یہاں بدل رہی ہے

تاریخ کے موڑ پر

جلیل حشمی

صلیب دوش پہ اپنے اٹھائے چلتے تھے
وہ زخم تھے کہ لہو میں نہائے چلتے تھے

رواں تھے چشمۂ خورشید کی طرف ہم لوگ
مگر قدم بہ قدم ساتھ سائے چلتے تھے

ٹپکتا جاتا تھا راہوں میں قطرہ قطرہ لہو
ہم اپنے زخموں سے نظریں چرائے چلتے تھے

تڑپ تڑپ کے گرے تیر کھا کے ظلمت کے
ہتھیلیوں پہ جو شمعیں جلائے چلتے تھے

قسم اٹھاتے تھے ہم جن کی رہنمائی کی
وہ آستینوں میں سورج چھپائے چلتے تھے

ترس چکی تھیں نگاہیں کرن کرن کے لئے
اک آس تھی کہ افق سے لگائے چلتے تھے

ہمارے بخت نے کی یاوری کہ دھند چھٹی
اور ایک مردِ جواں نے ہمیں صدا دے کر

بڑے خلوص سے اک رہگذار پر موڑا
چلے تھے چند قدم ہی تو اور تھا منظر

نہ ظلمتوں کا سماں اور نہ تیرگی کا نزول
جراحتوں کے نہ وہ رنگ اور نہ رقصِ شرر

جہاں کرن بھی نہ ملتی تھی بھیک میں ہم کو
وہاں کی خاک سے پیدا ہیں لاکھ شمس و قمر

اس انجمن میں ضیا رتاب ہیں چراغِ غزل
جہاں سخن کو ترستے تھے ہم زباں رکھ کر

چھڑا ہوا ہے وہاں نغمۂ حیات جہاں
سکوتِ مرگ تھا پہرے تھے دل کی دھڑکن پر

نظر نظر میں فروزاں ہیں عزم کی شمعیں
قدم قدم پہ نشاں کھل رہے ہیں رفعت کے

دلوں میں تازہ امنگیں، نکھار چہروں پر
ضیائیں پھیلی ہیں خاکِ وطن کے ذروں سے

صبح دلآویز

صہبا اختر

اُفق پاکستان پر حقیقی جمہوریت کا طلوع جو جلوہ ہائے گوناگوں خیبر کی چٹانوں سے پدما کے کناروں تک بکھیر رہا ہے اور ہر مرد وطن دوست کے دل میں رنگا رنگ احساسات پیدا کر رہا ہے۔ وہ حقیقتہً جنت نگاہ ہیں۔ اس نظم میں انہی کی عکاسی کی گئی ہے۔ (مدیر)

لو کُہر میں لپٹی ہوئی ظلمت کے جگر میں
یکبار ہوا دشنۂ خورشید ترازو

آئی مری محبوبہ خوش رنگ کی صورت
اک صبح دلآویز ہمہ گل ہمہ خوشبو

چہرے پہ دوپٹے کو بنائے ہوئے ہالہ
آنکھوں میں چھپائے ہوئے سو بولتے جادو

ہر گام بہ اعجازِ خرام ایک چراغاں
ہر انگ سے اڑتے ہوئے ہر رنگ کے جگنو

ہر ذرّۂ زرکار ہدف بننے کو بیتاب
گو نیم کشیدہ ہے کمانِ خمِ ابرو

یہ صبح ہے مجروح بہاروں کی مسیحا
جو زرد فضاؤں کو بنا دے گی حنا رو

پھر پاک زمینوں پہ گہربار ہوئے ہیں
دوشیزہ گھٹاؤں کے مہکتے ہوئے گیسو

شمشاد و صنوبر کی کمر میں ہیں حمائل
رقاص ہواؤں کے لچکتے ہوئے بازو

بادل کی گرج ہے کہ یہ بوندوں کی چھما چھم
یہ طنطنۂ جوش ہے یا نغمۂ یاہو

سننا تو ذرا مطربۂ بادِ صبا نے
سُر ساز کے چھیڑے ہیں کہ موسیقیٔ نذرو

خوشحال کی آواز کہ اقبال کا اعجاز
افسانہ و افسوں کی فضا وجد میں ہر سو

کہتا ہے کوئی سلسلۂ ریگِ رواں سے
آ پھر نمِ شبنم سے کریں غسل لبِ جو

ہر ساعتِ منحوس ہوئی موت کا پیوند
تقدیر کے بُرجوں میں نہ کیتو ہے نہ راہو

کل تک جو سیہ چشم و سیہ بخت رہے ہیں
اب صندلی رمنوں میں نہ بھٹکیں گے وہ آہو

ہاں ختم ہوئی سطوتِ فرعون نژاداں
باقی نہیں آثار رفیقانِ ہلاکو

ہر "خوشۂ گندم" سے ملے گی وہ مسرت
غربت کے ستم ہوں گے نہ افلاس کے آنسو

اب بھوک نہ ہوگی کسی محنت کا نتیجہ
اب قسمتِ مزدور نہ چھینیں گے جفا خو

"سلطانیٔ جمہور" کی تجدید میں مصروف
پدما کے کناروں پہ کبھی برسرِ "کے ٹو"

بنگال کے ملاح کہ پنجاب کے دہقاں
سلہٹ کے جواں مرد کہ خیبر کے بلاجو

ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۶۰ء

افسانہ

چودھری

ابوسعید قریشی

تو پھر بات پکی ہو گئی نا چودھری جی !

چودھری کے لفظ سے مولا بخش کے چہرے پر ستر سال کی آندھیاں اور بگولے، ستر سال کے ساون اور سیلاب، جاڑے اور گرمیاں ستر سال کے سورج اور چاند سب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ اُس کے تانبے سے گالوں کے مسام لاوا اُگلنے لگے اور ماتھے کی جھریاں برسات کے ندی نالوں سی چمک اٹھیں۔ "چودھری" اس کی ذات نہیں تھی۔ اِک زمانہ تھا کہ وہ سچ مچ کا چودھری تھا۔ اُس کی مرضی کے بغیر گاؤں کے کھیتوں سے کوئی بٹیر بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ بھُس کا تنکا، گندم کی بالی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ تھانیدار تو کیا بڑے صاحب کو بھی آنے سے پہلے پوچھنا پڑتا۔ اُس کا گاؤں، امن پور ایک نمبر کا گاؤں تھا۔ آس پاس کی بستیوں میں اگر کسی کو ضامن کی ضرورت پڑتی تو سیدھا چودھری کے پاس آتا۔ مگر اب کہاں۔ اب تو وہی بات تھی کہ چور اُچکّا چودھری .... اور چودھری کے پیٹ سے ایک بڑا سا تبرّہ ابھرا۔ مگر حقّے کی منہال نے اُس کے خیالات کا راستہ روک لیا۔ چودھری مولا بخش نے ایک ایسا کش لگایا کہ دھوئیں کے ساتھ حقّے کے پیٹ سے پانی بھی منہ میں آ گیا۔ اُسے زور کا اچھو آیا۔ کھانسی رکی تو اُس نے آنکھیں سکیڑ کر تھانیدار کی طرف یوں دیکھا جیسے ٹڈی دل آ رہا ہو۔

تھانیدار چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی عمر کوئی بیس اکیس سال ہو گی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی جو مونچھوں کی کالی لکیر سے ابھی "لھنڈی" جا رہی تھی۔ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے بھی آیا تھا وہ ایک مرتبہ۔ خیر خیریت پوچھنے۔ دستور کے مطابق گاؤں والوں نے تھوڑا راشن۔ گڑ، گھی، اور مرغیاں ــ ساتھ کرنا چاہا، انکار کر دیا۔ مولا بخش نے اُسی دن اپنی گھر والی سے کہا تھا کہ چودھرانی یہ نیا تھانیدار ہے تو لونڈا سا پر آدمی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ چودھری کو اپنی بات پھر یاد آ گئی۔ اور اُس نے کہا:

"وقت آنے پر دیکھا جائے گا نا میاں۔ تم کیوں ابھی سے حیران ہوتے ہو ؟"

"اچھا تو پھر اجازت"

"گھونٹ لسی کا تو پیتے جاؤ نا پتر جی۔ گرمی ہے۔ کہو تو ستو گھول دوں"۔

"بڑی مہربانی ہے چودھری جی آپ کی۔ پیاس نہیں کچھ ایسی۔ ضرورت ہو گی تو ٹھنڈی بوتل ساتھ ہے"۔ اس نے اپنی سائیکل کی ٹوکری میں رکھی ہوئی تھرمس کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھولئے گا نہیں اور باقی بھائیوں کو بھی یہ ساری باتیں سمجھا دیجئے"۔

"جھوٹ کیوں بولوں۔ جان خدا کو دینی ہے۔ باتیں تو سب معلوم ہیں" مولا بخش نے کہا۔ کچھ اور لوگ بھی آئے تھے کہنے کہ اس میں سب کی بھلائی ہے۔ فلم بھی دکھائی تھی۔ ریڈیو پر نظام دین اور چودھری بھی ہر روز یہی باتیں کرتے ہیں"۔ اس نے حقّے کا ایک اور کش لگایا، اور عادتاً نے تھانیدار کی طرف کر دی ــــ

"پر باتیں ہی ہیں نا بادشاہو۔ گھگھو گھوڑے نیانوں کو پرچاتے ہیں نا موتیاں والیو۔ یہ نہیں سوچتا کوئی کہ گھر گھر میں تو اسکول بنا ہے۔ دس لونڈے امن پور کے تو کالج میں پڑھتے ہیں اُدھر شہر میں۔ اور پھر اپنا نظام دین ریڈیو والا دنیا جہان کی سناتا ہے۔ ابھی

کل ہی کہہ رہا تھا کہ چاند کی سیر کو تیار ہو جاؤ بھتی پنچو۔ ایک سال کی بات ہے اور چاند اور اپنی زمین کے بیچ ہوائیاں چھوٹا کریں گی جیسے اپنے اسٹیشن اور لاہور تک مسافر گاڑیاں چلتی ہیں سو باتیں تو بہت ہیں میاں جی۔ پر اصل بات تو وہ ہے تم جانو جو پکی ہو۔ چٹکی چٹکی تو کتنے لئے پھرتے ہیں اپنی جھولی میں۔ دق سل کا دارو۔ آؤ نتروں نکھتروں کے بیٹے! پر باؤ جی۔ ٹھگی سب ٹھگی!"

"اب کے ٹھگی نہیں ہوگی چودھری جی۔ خاطر جمع رکھو۔ جہاں اتنے تعویذ گنڈے کئے، اتنے وید طبیب دیکھے، نسخے گھرل کئے۔ ایک کو اور آزمالو۔ اللہ شفا ہی دے گا۔"

"چلو تمہاری خاطر یہ بھی کر دیکھیں گے۔ پر ہوگا وہی۔"

"اچھا چودھری جی۔ تو خدا حافظ۔"

"چلتے ہو خیر سے۔ میں تو کہتا تھا کہ گرا ہیں کھا جاتے دو، روکھی مسّی ہے۔ آم کا اچار اور لسّی۔"

"اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے چودھری جی۔ بیسنی روٹی تو بادشاہ بھی شوق سے کھاتے تھے۔ آم کے اچار پر تو پانی بھر آتا ہے میرے منہ میں۔ لیکن پھر آؤں گا کبھی۔ ایک ضروری کام سے واپس پہنچنا ہے ایک بجے۔"

"اچھا تو اللہ بیلی!"

تھانیدار کی روانگی کے بعد چودھری مولا بخش سوچنے لگا کہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ علاقے کا حاکم جس کو چاہے باندھ دے، جس کو چاہے چھوڑ دے۔ اور سائیکل! ایک پیادے کو بھیج دیتا تو دس موٹریں آجاتیں۔ اور الٹا احسان موٹر والوں پر ہوتا۔ ابھی پار سال جو آیا تھا.... چودھری نے ایک بڑی سی گالی دی۔ اپنے ملکوں کی گاڑی کو یوں لئے پھرتا تھا جیسے باپ کا مال ہو۔ سچ کہتے ہیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یا پھر زمانہ بدل گیا ہے۔ سبھی کہتے ہیں۔

اس کو وہ زمانہ یاد آگیا جب "انقلاب زندہ" کے نعرے لگا کرتے تھے، گاؤں گاؤں میں میجر بیٹھا تھا اور خاکی کپڑوں کو دیکھ کر لوگوں کے اوسان خطا ہو جایا کرتے تھے۔ اور ایک یہ دن بھی تھے کہ تھانیدار خود انقلاب کے گن گاتا پھر رہا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا آخر۔ انگریز تو چلا گیا۔ پھر انقلاب کیسا؟ ایک وزارت ٹوٹی اور دوسری آئی۔ یہی نا؟ ٹوٹتی بنتی وزارتوں کے تصور سے چودھری مولا بخش کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھینس اپنی زنجیر سمیت بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اور گاؤں والے اس کو گھیرے میں لا کر پکڑنے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ الیکشن کہتے تھے اس کو۔ سارے گاؤں کو ہانک کر لے گئے تھے۔ مال گاڑی میں مویشیوں کو ڈھوتے ہیں جیسے۔ ڈالو فلانے .. کو پرچی! اور بدمعاشوں کی بن آئی تھی۔ زلدو اور ساتجے اور.. .. نے تو کپڑے بدل بدل کر دس دس پرچیاں ڈالی تھیں۔ سیاں بھئے کوتوال۔ .. اور اب بھی ہانکا ہوگا۔ ڈالو فلانے کو پرچی! ایک سال آرام سے گزر گیا تھا۔ چخ چخ نہ بک بک۔ اب کہتے ہیں پھر آؤ۔ ایک جمہوریت سے ناک میں دم تھا اور اب تو اللہ جانے کتنی ہوں گی۔ اور پرچی اب کے بھی اُسی کے ڈبے میں جائے گی جس کو تھانے دار چاہے گا۔ ہم کو اپنی کھیتی باڑی کرنے دو بھائی۔ ہمارا بڑھاپا کیوں خراب کرتے ہو۔ ایسی تیسی ایسی چودھرائیت کی۔ اور چودھری مولا بخش نے جو اُس وقت حقہ تازہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ چھوڑے کو رہٹ کے تالاب میں شراب سے غوطہ دیا اور الیکشن کے دھندوں اور ممبری کے امیدواروں، سب کو غرق کر دیا لیکن ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے لمس سے اس کو پھر نوجوان تھانیدار یاد آگیا۔ اس کے چہرے پر اور نیلی کالی آنکھوں میں کچھ ایسی ٹھنڈک تھی، سچائی تھی کہ ٹھگی سے اُس کا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بھولے پن کو دیکھ کر تو ٹھگ بھی ٹھگی سے توبہ کر لے۔ لیکن جوڑی رک گئی اور رہٹ کی ٹک ٹک کے ساتھ ہی چودھری کے خیالات کا تار بھی ٹوٹ گیا۔ اُس نے گردن گھما کر بیلوں پر نظر ڈالی۔ بیلوں کی جوڑی اور چودھری کے درمیان "ٹنڈوں" کی مالا اُبھرتے چاند کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور اس سے دودھ کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ جب سے اس نے "ٹینڈیں" بدلی تھیں، پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں گیا تھا۔ "کھال" "مونہوں مونہہ" بھرا نظر آیا تھا۔ کھیتوں نے جی بھر کے پانی پیا تھا۔ اور پہلے سے دوگنی فصل ہوئی تھی —— یہ سب نئی ٹنڈوں کا صدقہ ہے چودھری مولا بخش نے شفقت بھری نظروں سے مٹی

کے نئے کوزوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کوزے کرمو کمہار نے امن پورہ ہی کی مٹی سے بنائے تھے۔ چکنی جاندار مٹی! اس کی چکناہٹ کے تصور سے ستر سالہ چودھری کو گاؤں کے بچے یاد آگئے جن کے سر گرمیوں میں گھٹا دیئے جاتے۔ وہ ان کے سروں میں پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ان کے ہونٹوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ بیلوں کی جوڑی پھر چل پڑی۔ شاید وہ ایک ثانیہ ہی کو رُکی تھی۔ رُکی بھی تھی کہ نہیں۔ رُکتی کوئی چیز نہیں ہے چودھری نے کہا" جو ٹھہر یا سو کھٹیا! سورج، زمین، آسمان، چاند، نہریں، دریا، سب چلتے ہیں۔ اُس کا رہٹ بھی چل رہا تھا۔ اور رہٹ کے اُدھر شیشم کے سایوں میں چلتی ہوئی پکی سڑک پر تھانیدار کی سائیکل پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سڑک دیہاتی امداد والوں نے گاؤں کے چھوروں سے ہی بنوائی تھی۔ اللہ بھلا کرے اُن کا۔ دھول نہ دلدل! —— چودھری نے انھیں دعا دیتے ہوئے کہا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سہارے رہتے تو اللہ جانے کب باری آتی —— سڑک کے موڑ پر سائیکل کی لال بتی کا لشکارا سا پڑا۔ اور پھر سائیکل آنکھ سے اوجھل ہوگئی۔

اور جیسے الیکشن بھی وہیں کہیں سڑک کے موڑ پر ہی کھڑا تھا۔ دن یوں گزرتے گئے جیسے رہٹ کے ڈولچے۔ ایک کے پیچھے دوسرا۔ اور ستر سالہ چودھری الیکشن پنڈال کے باہر کھڑا اس سوچ میں ڈوب گیا کہ جانے کون سی جوڑی دن اور رات کے اس رہٹ کو چلا رہی ہے، تھکتی ہی نہیں، رکتی ہی نہیں!

" تو آپ آگئے چودھری جی"۔ کسی نے چودھری مولا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چودھری نے مڑ کر دیکھا۔ تھانیدار کے چہرے پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ رہٹ کے ڈولچوں سے بہتا ہوا دودھ سا چمکتا تازہ پانی۔

" سرکار کا حکم بادشاہ ہو! گولی کس کی اور گہنے کس کے۔ ہم تو نوکر ہیں"۔

" آپ کے حکم کا زمانہ ہے چودھری جی! نوکر تو ہم ہیں"۔ تھانیدار نے چودھری کی بات کاٹی۔

" کیوں شرمندہ کرتے ہو موتیاں والیو؟ حکم کرو کس کو ڈالنی ہے پرچی"۔

" جس کو آپ کا جی چاہے"۔ تھانیدار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

" لو اور سنو!" چودھری بوکھلا گیا۔ " یہ بھی کبھی ہوا ہے"۔

" اس کا تو مجھے پتہ نہیں۔ پر اب ہو رہا ہے۔ اب جائیے اندر دیر نہ کیجئے"۔

چودھری کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی —— نوجوان آدمی ہے نا۔ اُس نے سوچا۔ مذاق کر رہا ہے۔ ورنہ ہوگا وہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تھانیدار کہیں جا چکا تھا۔

اچھا یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ چودھری نے اپنے آپ سے کہا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی —— ابھی الگ الگ ہو جائے گا۔ دیر ہی کتنی ہے —— اس قنات کے اس طرف پاؤں رکھنے کی تو بات ہے۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ چھورا کتنے پانی میں ہے —— اُس نے اپنی ستر سالہ داڑھی پہ ہاتھ پھیرا —— کل کے لونڈے اب ہم کو بنانے لگے۔ بعد کو آنکھیں نہ ملانی پڑیں اس لئے کھسک گیا۔ کوئی بات نہیں پتر جی —— تو بھی یہیں ہے اور چودھری مولا بخش کو بھی کہیں نہیں جانا۔ دس بیس سال تو ابھی مرتا نہیں۔ ہوں گی باتیں!

لیکن قنات کے اُس طرف صرف رنگ رنگ کے ڈبے پڑے تھے۔ اُن میں ایک ڈبہ اُس کے بھتیجے کا بھی تھا جس نے ابھی پچھلے سال بی۔ اے پاس کیا تھا اور ہائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اور اب یونین پنچایت کی ممبری کا اُمیدوار تھا۔ اُس کے مقابلے میں زمیندار کا لڑکا تھا۔ جو دن رات موٹر اڑاتا پھرتا تھا۔ سنا تھا کہ لاٹ صاحب تک پہنچ ہے، لیکن اس کے باوجود چودھری اسکول ماسٹر کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی آواز آئے گی چودھری ادھر نہیں، اس ڈبے میں۔ لیکن وہ نہ ہوا جس کی اُسے توقع تھی۔ اُس نے اطمینان سے اپنی پرچی ڈالی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اُس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ تھانیدار کی نیت پہ شک کرنے پر اسے دفعتاً سخت ندامت کا احساس ہوا۔ لیکن وہ ہے کہاں؟ —— ہاں یہ وہی تو تھا۔ پٹواری سے بات کر رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر اب بھی وہی مسکراہٹ تھی جو چودھری نے

پہلے دن دیکھی تھی۔ چودھری ہچکچاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ لیکن اُس سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

"کہئے چودھری صاحب۔ ووٹ ڈال آئے؟"

"جی ہاں" چودھری نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"کسی نے دباؤ تو نہیں ڈالا؟"

"جی نہیں موتیاں والیو!"

"اچھا تو اجازت — پھر ملاقات ہوگی"

"ایک کام تھا ذرا"

"حکم کیجئے"

"جی۔ ذرا اِدھر آجاتے"

"خیریت؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے — بات یہ تھی میاں جی کہ غلطی ہوگئی تھی ایک۔ اُس کی معافی مانگنی تھی"

"کیسی غلطی چودھری صاحب؟"

"بس جی اب کیا بتاؤں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا میاں جی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی ویسا ہی تماشہ ہوگا، پہلے جیسا۔ پر یہ تو ——"

"بات ہی اور نکلی!" تھانیدار نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے"

"بس بس یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سترا بہترا ہوگیا ہوں نا میاں جی! معاف کرنا، موٹی سی بات بھول گیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں"

"شکر ہے کہ آپ کو یقین آگیا۔ آپ بزرگ ہیں، جہاندیدہ ہیں، اب آپ نوجوانوں کی رہنمائی کیجئے۔ اور اُنھیں اپنے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیجئے"

یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ موتیاں والیو! اللہ تمھیں لمبی عمر دے! پر یہ تمہارا زمانہ ہے؛ نوجوانوں کا زمانہ ہے۔ ہم بڈھوں کو تو اب اللہ اللہ کرنے دو۔ اللہ تمھیں خوش رکھے"

تھانیدار کے دانت چمک اٹھے!

اور بڈھے چودھری کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں!

★

بُت ٹوٹتے ہیں

انور عنایت اللہ

خان صاحب بشیر الدین پہاڑی جھاڑیوں سے بچتے بچاتے آہستہ آہستہ وہاں پہنچے تو بوڑھے برگد پر دونوں اُلوؤں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ "خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ آج یہاں بڑا دلچسپ تماشہ ہونے والا ہے۔" بڑے اُلو نے فلسفیانہ انداز میں ایک آنکھ بند کر کے دوسری سے غور سے خان صاحب کی چمکتی ہوئی چندیا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ چھوٹے اُلو کو راز و نیاز کی باتوں میں کچھ زیادہ دخل نہیں تھا۔ وہ ان دنوں بڑے اُلو کی تربیت میں تھا۔ دونوں اس ویرانے میں دور سے اُڑ کر آئے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے فضل دین بھی وہاں آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد خان صاحب بشیر الدین نے بڑی نفاست سے دو انگلیوں کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ رکھا، مُٹھی بند کی اور پھر بند مٹھی سے منہ لگا کر زور کا ایک کش لینے کے بعد کھوئے کھوئے سے انداز میں سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔ ندی میں اب بھی گھاٹ سے قریب ایک کشتی کھڑی تھی جس نے کبھی خان صاحب کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور دور اُفق سے قریب زرد سا چاند بادلوں کے سفید گالوں میں پھنسا آگ کا ایک بڑا گولا لگ رہا تھا۔ سامنے فضل دین اب بھی غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر خان صاحب نے آہستہ سے کہا۔ یوں جیسے بے خیالی میں اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ "تو ماسٹر ظہیر کے بھی اب پر نکل آئے ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" فضل دین نے فوراً لقمہ دیا۔ "کیا بتاؤں سرکار — پچھلے مہینے شہر سے جنرل صاحب دورہ پر آئے تھے۔ سب سے پہلے ظہیر ماسٹر ہی نے ان سے ملاقات کی۔ دو گھنٹے وہ فوجی افسروں کے ساتھ رہا۔ مجھے یقین ہے اس نے آپ کے خلاف ضرور زہر اُگلا ہوگا۔" دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ خان صاحب نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لیا اور انگلیاں چٹخائیں۔ یہ اضطراب کی نشانی تھی۔ چہرہ پر جھنجھلاہٹ کے بھی آثار اُبھر آئے تھے۔ فضل دین نے مالک کو خاموش دیکھا تو آہستہ سے کہا:

"وہ آپ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم سب کو نہ دھروا دے۔ میں نے سنا ہے ظہیر ماسٹر کے فوجی افسروں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ سنا ہے اب وہ آپ کی جگہ لینے کے خواب دیکھنے لگا ہے — مجھے تو ڈر لگ رہا ہے سرکار — اور پھر سلمان صاحب —!" وہ رُک گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ خان صاحب کو بیٹا بہت عزیز تھا۔ لیکن آج اس کا ذکر بھی تو ضروری تھا۔ ظہیر ماسٹر کی لونڈیا تو اسے لے ڈوبی تھی اور بڑے میاں کو ہوش ہی نہیں تھا۔

"سلمان کو فوجیوں سے نفرت ہے فضل دین۔" خان صاحب نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تم اطمینان رکھو۔ وہ ہمارے ساتھ ہے — لیکن فتنہ تو ظہیر ماسٹر ہے۔"

"جی ہاں سرکار — دسمبر میں سنا ہے بنیادی جمہوریتوں کے لئے انتخاب ہوں گے — اس میں ظہیر ماسٹر بھی ایلکشن لڑیں گے — توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ اب ٹٹ پونجئے بھی سیاست میں حصہ لیں گے۔" فضل دین نے کہا۔ خان صاحب کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہوں۔

"سنو فضل دین۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے ہم لوگ بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں نہ میں زبان کھول سکتا ہوں اور نہ انتخابات میں حصہ لے سکتا ہوں۔ تم نے پچھلے بارہ سال میں ہمیشہ بڑی وفاداری سے میرا ساتھ دیا ہے جس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ پچھلے سال بھر سے ملک میں جو باتیں ہو رہی ہیں ان سے نہ تمھارا کبھی بھلا ہوگا اور نہ میرا — لیکن اب خدا کے فضل سے ایسے آثار پیدا ہو گئے ہیں کہ ہمیں ایک بار اور ملک اور ملت کی خدمت کا موقع ملے گا — چونکہ میں ان انتخابات میں حصہ نہیں

لے سکتا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم الیکشن لڑو۔"

"میں ـــــ ؟ یعنی میں ؟" فضل دین نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی سمجھ میں غالباً یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ بھلا الیکشن کیسے لڑ سکتا ہے۔ اس کی تو گاؤں میں پنساری کی دوکان تھی۔ یوں تو وہ دسویں فیل تھا۔ خان صاحب کی رفاقت میں اس نے انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ لیکن الیکشن لڑنے کے لئے تو اور صفات ضروری تھیں۔ مثلاً علاقے میں رسوخ، اخراجات برداشت کرنے کی قوت، چرب زبانی، وغیرہ، وغیرہ۔ وہ تو ان باتوں سے محروم تھا۔ یہ صحیح تھا کہ جب سے خان صاحب بشیر الدین اس پر مہربان ہوئے تھے اس کے لئے آمدنی کے کئی نئے دروازے کھل گئے تھے۔ اس کے لئے بشیر صاحب کا وجود ایک بڑے سایہ دار درخت کا سا تھا۔ خود اس کی خدمات بھی کم نہیں تھیں۔ خطرہ صرف اسے مول لینا پڑتا۔ راتوں رات وفادار ساتھیوں کی مدد سے غلّہ وغیرہ سرحد کے پار پہنچانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ خان صاحب کا زیادہ وقت تو مزے میں کراچی میں گذرتا۔ ہر ماہ وہ ایک آدھ دن کے لئے دولت آباد آتے اور چپکے چپکے آمدنی کے نت نئے ذرائع ڈھونڈ نکالتے۔ یہ سلسلہ تو بڑی پابندی سے ۷ راکتوبر ۵۸ء تک جاری رہا۔ پھر انقلاب کیا آیا سارا کاروبار ماند پڑ گیا۔ خان صاحب چپکے سے گاؤں لوٹ آئے اور گوشہ نشینی کے دن گذارنے لگے۔ شروع شروع میں تو فضل دین بھی خاصا سہما ہوا رہا۔ لیکن جب کئی مہینے گذر گئے اور فوجیوں نے نہ خان صاحب بشیر الدین کا رُخ کیا اور نہ فضل دین ہی کی باری آئی تو اُن کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اب خان صاحب روزانہ شام کو ویرانے میں سیر کو نکلتے۔ موقع دیکھ کر فضل دین بھی ندی کنارے اِن پہاڑیوں میں پہنچ جاتا اور پھر دونوں اگلے وقتوں کی باتیں کرتے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے، انقلابی حکومت کی اصلاحات کا مذاق اڑاتے اور اُس دن کا شدت سے انتظار کرتے جب یوں ہوگا کہ پاکستان کو دوبارہ اس کے اُن سچے خادموں کے حوالے کر دیا جائے گا ـــــ جو ۷ راکتوبر ۵۸ء تک بے لوث خدمات انجام دیتے رہے تھے اور بار بار نت نئی وزارتیں بنا کر بیرونی دنیا میں ملک کا بول بالا کرتے رہے تھے اور اس کا ثبوت پیش کرتے رہے تھے کہ ہم صحیح معنوں میں ایک زندہ قوم ہیں!

"جب ظہیر ماسٹر الیکشن لڑ سکتا ہے تو تم بھی لڑ سکتے ہو فضل دین!" خان صاحب نے فضل دین کو خاموش دیکھا تو کہا۔ "میں نے پچھلے بیس سال سے بھاڑ نہیں جھونکا۔ سیاست ہمیشہ میرے گھر کی لونڈی رہی ہے۔ میں نے مصلحتاً سیاست سے کنارہ کشی کر لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب ظہیر ماسٹر جیسے ٹٹ پونجیئے ہم پر حکومت کر سکیں گے۔"

"جی ہاں۔ سنا ہے اب حکومت گنواروں کے ہاتھ میں دی جائے گی۔ ہی ہی ہی ہی!" فضل دین نے مالک کو خوش کرنے کے لئے قہقہہ لگایا۔

"میں نے بھی سنا ہے فضل دین ـــــ سب سے نچلی منزل ہوگی یونین کونسل۔ اس کے بعد مغربی پاکستان میں تحصیل کونسل ہوگی اور مشرقی پاکستان میں تھانہ کونسل۔ تیسری منزل ہوگی ضلع کونسل۔ اس کے بعد ڈویژن کونسلیں آئیں گی ـــــ یہ ہے بنیادی جمہوریتوں کا ڈھانچہ۔ یہ لوگ اس ترقی یافتہ دنیا میں ہزاروں سال پرانا نظام رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں فضل دین ـــــ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا ـــــ ورنہ ہمارا پیارا ملک تباہ ہو جائے گا ـــــ سنو فضل دین ـــــ!"

انھوں نے فضل دین کو اپنے قریب کر لیا، اور اپنے موٹے دستے کی چھڑی کا سہارا لے کر سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھانے لگے۔ بوڑھے برگد پر یکایک چھوٹے اُلو نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟ ملک کا غم تو انھیں اب بھی کھائے جا رہا ہے!"

"شی! ـــــ چپ چاپ تماشہ دیکھو۔" بڑے اُلو نے مشورہ دیا۔ اب رات کی سیاہی چپکے سے بڑھ گئی تھی اور بیمار سا چاند اب بھی بادلوں میں پھنسا ہوا تھا۔ یکایک دور سے انجن کی چیخ سنائی دی جو چند لمحوں تک فضا میں تیرتی رہی۔ جب تک خان صاحب بشیر الدین بولتے رہے، فضل دین خود سے سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ سر ہلا کر اس بات کا ثبوت دیتا جاتا کہ تمام باتیں اس کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔ فضل دین جس طرح چپکے سے ندی کے کنارے کنارے یہاں آیا تھا اسی طرح لوٹ گیا۔ خان صاحب بشیر الدین نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اس پگڈنڈی پر ہو لئے جو نشیب میں دور آبادی تک چلی گئی تھی۔

اُن کے جانے کے بعد بوڑھے برگد پر چھوٹے اُلو نے ٹھنڈی سانس لی۔ یکایک دو سائے پہاڑی ٹیلوں کے پیچھے سے نکلے اور چاند کی دھیمی روشنی میں آ گئے تو وہ بُری طرح سے چونک اٹھا۔

"کیوں؟ ڈر گئے؟" بڑے الو نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ـــ یہ دونوں تو بڑی دیر سے یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ دنیا بےحد عجیب ہے برخوردار ـــ اُس طرف جنگلی چوہے کو کیوں گھور رہے ہو؟ شکار کے لئے تو رات پڑی ہے ـــ خبردار منہ نہ کھولنا ورنہ فوراً یہ دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔" چھوٹا الو بڑی فرمانبرداری سے اس سڈول جسم والی حسین لڑکی کو دیکھنے لگا جو ایک ٹیلے پر جا بیٹھی تھی اور اب ساڑی کے پلو سے کھیلنے لگی تھی۔ حمیدہ خاموش تھی۔ سلمان نے بےچینی سے سگریٹ سلگایا۔ حمیدہ نے ماچس کی کانپتی روشنی میں دیکھا اُس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔ حمیدہ خود بھی مضطرب تھی لیکن اس نے اپنے جذبات پر اب قابو پا لیا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" حمیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔ یہ بات پیت ضروری تھی ورنہ یہ معنی خیز خاموشی پاگل کر دیتی۔

"سوچ رہا ہوں ـــ کاش ہم آج اِس طرف نہ آتے" سلمان نے جواب دیا۔

حقائق سے اس قدر گھبراتے ہو؟ ـــ دیکھ لیا نہ سلمان؟ ـــ میرے بابا کے خلاف کیسی سازشیں ہو رہی ہیں؟ اسی لئے کہتی تھی کہ تمھیں اس قدر بےتعلق نہیں رہنا چاہیئے۔ میں جانتی ہوں تم شاعر ہو۔ تمہیں ان بکھیڑوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن سلمان! ہم ایک بڑے نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ آج جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اس پر ہمارے مستقبل کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ اس سے بےتعلقی غلط ہے۔ اسی لئے آج کئی دنوں سے سمجھا رہی ہوں۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ باطل کی قوتیں اب بھی تاک میں ہیں"

حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ سلمان خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ چہرہ سے لگ رہا تھا جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہو۔ حمیدہ نے بیٹھے ہی بیٹھے داہنا ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ کی چوڑیاں یکایک جھنجھنا اٹھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ سے کہا۔

"سلمان! ـــ یہاں آؤ ـــ میرے پاس" آواز میں پیار تھا اور اس دھیمی سی روشنی میں اس کا گورا سڈول بازو بےحد حسین لگ رہا تھا۔ سلمان آگے بڑھا تو حمیدہ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا ـــ پیار سے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور اسے یوں بہلانے لگی جیسے وہ ننھا منا سا بچہ ہو

"سنو سلمان! آج میں تم سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے اکثر مارشل لا کی سختی سے مخالفت کی لیکن یہ نہیں سوچا کہ ہر خطرناک بیماری کا علاج خطرناک ہوتا ہے۔ اور یہ مارشل لا اتنا سخت ہے کب؟ تم نے دوسرے ملکوں کے خونی انقلابوں کو نہیں دیکھا۔ خیر تو ہمارے سیاستدانوں نے جس قسم کی دھاندلی ملک میں شروع کر رکھی تھی اس کا علاج مارشل لا ہی تھا تمھیں وہ تمام یاد ہے جب ہم دونوں ان ہی پہاڑیوں میں دور تک نکل گئے تھے اور تم نے کہا تھا۔ ایسا نظام کس کام کا جس میں جمہوریت کو دخل نہ ہو ـــ میں خاموش ہو رہی تھی۔ لیکن آج پوچھتی ہوں ـــ ہمارے ملک میں جمہوریت تھی کب؟ ـــ اگر جمہوریت ہوتی تو ایک بڑے معقول وزیراعظم کی وزارت کبھی توڑی نہیں جا سکتی تھی حالانکہ پارلیمنٹ میں انھیں اکثریت حاصل تھی"

اس پر سلمان نے فوراً کہا۔ "تم نے یہ بھلا دیا کہ اس کے بعد جب بھی کوئی وزیراعظم بنا اسے اکثریت حاصل ہو گئی"

حمیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں سے یوں لگا جیسے سلمان کے اس جواب سے خوش ہوئی ہو۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے ـــ ہمارے ملک کا تو قرینہ ہی یہ ہو گیا تھا کہ چڑھتے سورج کو سلام کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سیاست داں طبقہ ازل سے ابن الوقت رہا ہے۔ اس نے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور دیکھی اسی کا ساتھ دیا۔ عوام کو ان لوگوں نے ہمیشہ بےتعلق رکھا۔ اس لئے صحیح رائے عامہ بھلا کب پیدا ہوئی؟" حمیدہ کی باتیں غالباً سلمان کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ جہاں کے عوام تعلیم سے بے بہرہ ہوں وہ بھلا ملک کی سیاست میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں"

"یہی تو میں بھی کئی دنوں سے سمجھا رہی ہوں جناب ـــ اب بنیادی جمہوریتوں کی اہمیت تمھاری سمجھ میں آ جائے گی۔ ہمارے عوام کی محدود صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ایک ایسا طریقہ رائج کیا جا رہا ہے جس کی رو سے وہ پہلی بار براہِ راست حکومت کے انتظامی امور میں حصہ لے سکیں گے چونکہ ہمارے یہاں آبادی کا پچاسی فی صد حصہ دیہاتوں میں بسا ہوا ہے اس لئے یہ تجربہ دیہاتوں سے شروع ہو گا۔ ملک میں نمائندہ حکومت کے قیام کے سلسلے کی اسے پہلی منزل سمجھو۔ اس کے لئے بقراطِ وقت ہونے کی ضرورت نہیں بس اپنے حلقے کے معاملات کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیئے"

حمیدہ یکایک رک گئی کیونکہ ایک کشتی اب قریب آگئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی ہوئی چاندنی میں اس کا مٹیالا بادبان ہوا کے تھپیڑوں سے مقابلہ کر رہا تھا اور دور سے اب مانجھی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جو بڑا اداس نغمہ الاپ رہا تھا۔

حمیدہ اور سلمان کا بچپن اسی ویرانے میں گزرا تھا جب دونوں ان پہاڑوں میں رنگ برنگی تتلیوں اور حسین جنگلی پھولوں کی تلاش میں گھنٹوں ادھر اُدھر مارے مارے پھرا کرتے۔ حمیدہ مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی تھی۔ اس نے اسی سال ضلع کے کالج سے بی۔ اے پاس کر لیا تھا۔ سلمان زمیندار کا بیٹا تھا۔ خان صاحب بشیر الدین کو ہمیشہ سے سیاست سے دلچسپی رہی۔ جب زمینداری چلی گئی تو سیاسی گتھیاں اور پیچیدہ ہوگئیں۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ بیٹا ان کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے ملک کی سیاست میں حصہ لے اور پاکستان کا وزیر اعظم بن جائے۔ پچھلے دس سال میں ملک کا ہر سیاستدان وزیر اعظم بننے کا ہی تو خواب دیکھا کرتا تھا۔ سلمان کو یہ مشغلے ایک آنکھ نہ بھاتے۔ اس نے پچھلے سال فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ شعر و شاعری کے دائرے سے نکل کر وہ کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے مطلق تیار نہ تھا۔ وہ تو اپنے باپ کو فرشتہ سمجھتا لیکن ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جو باتیں سنی تھیں اس سے اس کے جذبات بری طرح سے مجروح ہوئے تھے۔ اسے آج پتہ چلا تھا کہ اس کا باپ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ اُس نے اب تک اس علاقے میں غیر قانونی درآمد برآمد کی صرف کہانیاں ہی سنی تھیں لیکن آج اسے ثبوت مل گیا تھا کہ یہ داستانیں فرضی نہیں تھیں۔ اُن کی پُشت پر خود اس کا صاحبِ اثر، بارسوخ باپ تھا۔ جواب موقع دیکھ کر ایک بار پھر سر اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ حمیدہ کے تمام خدشے صحیح ثابت ہوئے تھے۔

دونوں اپنے خیالوں میں کھوئے نہ جانے کب تک بیٹھے رہے۔ حمیدہ کا چہرہ پُرسکون تھا لیکن سلمان مضطرب تھا۔ اُس کے باغی بالوں کی ایک ننھی سی لٹ پیشانی پر آگئی تو حمیدہ نے پیار سے یہ لٹ ہٹا دی۔ سلمان نے چونک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بوڑھے برگد پر دونوں اُلوؤں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ اِدھر حمیدہ کہہ رہی تھی۔ ہمارے یہاں جمہوریت بےچاری کو تو آزادی سے کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس کی بنیاد ہمیشہ کمزور رہی کمی گئی۔ جب زمین پر رہنے والے لاکھوں عوام اور آسمان پر رہنے والے پیشہ ور سیاست دانوں کے درمیان کوئی رابطہ باقی نہ رہا تو یہ ڈھانچہ زمین پر آرہا۔ سیدھی سی بات ہے سلمان! ایک دیہاتی کے لئے سیاست دانوں کے گروہ میں سے کسی کو چننا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ ان سے مطلق واقف نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اسی سے کہا جائے کہ اپنے دیہاتی بھائیوں میں سے کسی کو نمائندہ چنو تو وہ یقیناً صحیح نمائندہ چنے گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں غلطی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے انقلابی حکومت نے ملک بھر میں بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا فیصلہ کیا جس کے تحت عنقریب ملک بھر میں انتخابات ہونے والے ہیں۔"

"۔۔۔ جس کے لئے عادل آباد والوں نے تمہارے والد کو نامزد کیا ہے اور جن کے مقابلے میں ہمارے والد" خان صاحب بشیر الدین، رئیسِ اعظم عادل آباد، سابق رکن پاکستان نیشنل اسمبلی، فضل دین جیسے بدمعاش کو کھڑا کر رہے ہیں تاکہ اس کی آڑ لے کر دوبارہ ملک کی سیاست میں دخل دے سکیں۔" سلمان نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"دیکھ لیا نا؟" بڑے اُلو نے آہستہ سے کہا۔ "یہی ہوتا ہے میاں اس دنیا میں۔ لیکن دیر یا سویر حق کی قوتوں کے آگے باطل کی طاقتوں کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ارتقاء کا سلسلہ رک جائے یہ دنیا ختم ہو جائے"

"لیکن اب ہوگا کیا؟" چھوٹے اُلو نے بےچینی سے پوچھا۔ بڑے اُلو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ غور سے سلمان کو دیکھ رہا تھا۔ سلمان نے یکایک اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب یہ نہیں ہوگا حمیدہ! بخدا میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ چلو، مجھے فوراً اپنے والد کے پاس لے چلو۔ میں ان کی کھلی حمایت کروں گا۔ دیکھتا ہوں خان صاحب بشیر الدین میں مجھ سے مقابلے کی تاب ہے یا نہیں اب دیکھتا ہوں فضل دین کیسے الیکشن لڑتا ہے"۔

اُس نے حمیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت سخت ہوگئی اور دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اُس ویران پگڈنڈی پر ہو لئے جو چاند کی سنہری روشنی میں سفید لکیر سی نظر آرہی تھی اور بل کھاتی ہوئی ظہیر ماسٹر کے گھر تک چلی گئی تھی جہاں اس علاقے کے کئی بارسوخ لوگ، ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں بعض اہم فیصلے کرنے کے لئے جمع تھے۔ چاند اب بھی تاریک بادل کے ایک بڑے ٹکڑے کے پیچھے چھپا ہوا تھا لیکن بادل کے چاروں طرف تیز روشنی کا ایک ہالہ بن گیا تھا اور اب سنہری چاندنی آسمان پر پھیل گئی تھی۔

پھر دھان کے خوشے لہرائے

یونس احمد

بادل کی گرج کے ساتھ ساتھ کلثوم کا دل بھی دھڑک اٹھتا تھا۔ نیا گھر، نئی فضا، نئے چہرے، نئے در و دیوار، ہر چیز نئی۔ اس کے دل میں اس وقت جو بیتابی تھی اس کا اظہار بھی وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ کرتی بھی کیسے۔ اسے تو اس گھر میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اگر جرأت کر کے ساس یا نند سے کچھ کہتی بھی تو فوراً بے شرم ہونے کا خطاب مل جاتا۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے کفیل میاں کا انتظار کرنے لگی۔ آج خلافِ معمول اسے کھیت سے لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ بہت دیر تک تو کلثوم اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ بارش کی وجہ سے شاید وہ کہیں رک گئے ہونگے۔ لیکن جب ایک ایک پل بھاری ہونے لگا تو اس کی بیقراری بھی بڑھنے لگی۔ سب تو رہ رہ کر بجلی بھی تڑپ اٹھتی تھی۔ ایک بار بجلی کچھ اس تیزی سے لہراتی ہوئی آئی کہ اس کے حلق سے چیخ نکل جاتی مگر وہ بڑی مشکل سے ضبط کر سکی۔ پدما میں بھی طغیانی آگئی تھی۔ اس کی بیتاب لہروں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

رات بیحد تاریک تھی۔ اماوس کی رات سے بھی زیادہ تاریک اور بھیانک۔ مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازوں سے فضا اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ کلثوم نے لالٹین کی دھیمی روشنی کو اور تیز کر دیا۔ اس کا کمزور دل برابر دھڑک رہا تھا۔ یکایک بادل اس زور سے گرجا کہ گاؤں کے کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے۔ اور کلثوم نے جلدی سے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ پھوس کی چھت دو ایک جگہ سے ٹپکنے لگی تھی۔ صحن بھی پانی سے ڈوب گیا تھا۔ اب اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ برے برے خیالات۔ ”خدانخواستہ وہ...... نہیں نہیں چودھری اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا۔ چند پیسوں کے لئے اس سے ایسی ذلیل حرکت سرزد نہیں ہو سکتی...... تو پھر ...... وہ کہاں رہ گئے۔ میرے خدا“ اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ مگر کہاں، کوئی بھی تو نہیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے صحن میں آگئی۔ بارش تھم گئی تھی۔ مگر بھیانک اندھیرا ابتک اسے کاٹے کھا رہا تھا۔

کلثوم پھر کمرے سے اندر گئی اور اب اس نے لالٹین کو چوکھٹ پر رکھ دیا ابھی وہ مڑنے ہی والی تھی کہ کانوں میں آواز آئی ”کلثوم“!

آواز جانی پہچانی تھی۔ اس نے فوراً لالٹین اٹھالی۔ صحن میں پانی اب تک کھڑا تھا۔ ”آج تو تم بہت پریشان ہوئی ہوگی“ لیکن کلثوم چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ کفیل میاں نے کلثوم کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور کہا۔ ”چلو نا“ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

کلثوم نے پھٹی ہوئی چادر دیتے ہوئے کہا۔ ”بارش میں بھیگ گئے ہو۔ جسم پونچھ لو اس سے۔“

”ہی ہی ہی“ کفیل میاں کو ہنسی آگئی۔ ”کلثوم تم کتنی اچھی ہو۔ تمہیں دیکھ کر میں اپنا سارا دکھ درد بھول جاتا ہوں۔ آج ہی کی بات ہے، خیر چھوڑو۔“

”کیا بات ہے؟“ کلثوم نے چٹائی بچھاتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لئے...“

”ارے پگلی کچھ بھی نہیں۔ تم تو فوراً پریشان ہو جاتی ہو۔“ کفیل میاں نے چٹائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ضرور کوئی بات ہے۔ اسی لئے تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔“ کلثوم نے سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

”وہی چودھری آج پھر مل گیا تھا۔“

”کیا کہا اس نے؟“ کلثوم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"پہلے کھانا کھالو پھر بتاؤں گا۔" کفیل میاں نے سمجھاتے ہوئے کہا

"نہیں پہلے بتا دو۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گا۔ کوئی بات تم سے چھپاتا تو نہیں ہوں"

"کمینہ۔ بدذات۔"

"ارے رے، تم تو گالی بھی دینے لگیں۔ دیکھو کوئی سن نہ لے۔

دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ کلثوم پھر پوچھ بیٹھی۔" ہاں کیا کہہ رہا تھا وہ چودھری؟"

"وہی پرانی باتیں۔ کہنے لگا اس بار اپنی فصل کسی اور کے ہاتھ بیچی تو کھیت جلا ڈالوں گا۔"

"بڑا آیا کھیت جلانے والا۔" کلثوم کو غصہ آگیا تھا۔

"جانتی ہو میں نے کیا جواب دیا اسے۔ میں نے کہا۔ دیکھا جائے گا۔"

"پھر چودھری نے کیا کہا؟"

"میرے سامنے وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ کہنے لگا۔ کھیت میں آگ نہ لگا دوں تو میرا نام رفیق الدین چودھری نہیں۔ سپاہی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ روپے سے سب کو خرید سکتا ہوں۔"

کلثوم نے لالٹین کی روشنی دھیمی کر دی۔" سچ مچ اگر اس نے آگ لگا دی تو؟"

"فکر نہ کرو کلثوم۔" اور یہ کہہ کر اس نے کلثوم کو لالٹین کی دھیمی روشنی میں غور سے دیکھا۔ کلثوم کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سچ مچ جادو گھل مل گیا تھا۔

اس بار کفیل میاں کے کھیت میں دھان کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ ہوا میں جھومتے ہوئے خوشوں کو دیکھ کر اس کا دل بھی جھوم اٹھتا تھا۔ اس نے ایک دن کلثوم سے کہا۔" اس بار ہماری فصل بہت اچھی ہوئی کلثوم۔ اب تو گھر کی چھت پر ٹین ڈلوا کر رہوں گا۔ تمہیں برسات میں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جانتی ہو میں نے کیا سوچا ہے؟"

"کیا سوچا ہے بھلا؟" کلثوم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"شہر جا کر تمہارے لئے ساریاں لاؤں گا۔ خوبصورت چوڑیاں اور ٹیکہ بھی۔"

"مجھے نہیں چاہئیں یہ چیزیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم پیسے جمع کرنا سیکھو۔"

"دل کی آرزو بھی تو کوئی چیز ہے کلثوم۔ شادی کے موقع پر تمہیں کچھ نہ دے سکا تھا۔ میں نے شادی سے پہلے خدا سے دعا کی تھی کہ اس بار فصل اچھی ہوئی تو اپنی ہونے والی بیوی کے لئے بہت کچھ لاؤں گا۔ خدا نے میری دعا سن لی۔" کفیل میاں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور کلثوم ایکدم سے شرما گئی ـــــ بالکل نئی نویلی دلہن کی طرح۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فوراً جھک گئیں۔ بڑے سلیقے سے اس نے سر پر آنچل رکھا۔

"یہ تو تمہارے ہی قدم کی برکت ہے کلثوم کہ فصل اتنی اچھی ہوئی۔ ورنہ پچھلے کئی سال سے برابر فصل کسی نہ کسی وجہ سے تباہ ہو جاتی تھی۔ کبھی پہاڑوں سے سیلاب آجانے سے کھیت بہہ گیا، کبھی خشک سالی آگئی کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میں سچ مچ کتنا خوش قسمت ہوں۔ بس کل پرسوں سے کٹائی شروع ہو جائے گی۔ جی چاہتا ہے ابھی سے ناچوں، گاؤں۔ خوشیاں مناؤں۔ میرے دل میں کتنی آرزوئیں بھری پڑی ہیں۔ کتنے سہانے سپنے دیکھتا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ یکایک چونک پڑا۔

"اوہ، سورج نکل آیا۔ آج تو بہت دیر ہو گئی جانے میں۔" اور وہ جانے ہی والا تھا کہ اس کو راجو چاچا کی آواز آئی۔" ایں راجو چاچا! اور اس وقت؟" کفیل میاں چونک پڑا۔

"کیا بات ہے راجو چاچا؟" کفیل میاں نے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"کفیل غضب ہوگیا!"

"غضب ہوگیا؟ کیا ہوا؟" کفیل پریشان ہوگیا۔

"تمہارے کھیت پر کسی نے آگ لگادی۔"

"آگ!" کفیل میاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی لیکن تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ رفیق الدین چودھری کی تصویر اس کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان آرزوؤں کا کیا ہوگا جو سینے میں پرورش پا رہی تھیں اس وعدے کا کیا ہوگا جو اس نے اپنی کلثوم سے کیا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ رفیق الدین چودھری سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پاس دولت تھی۔ وہ اپنی دولت سے کیا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس دولت کے بل پر ہی تو وہ الیکشن لڑا اور کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ وہ تو ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ میں اپنی دولت سے سارا ملک خرید سکتا ہوں۔ کفیل میاں نے جوانی کے نشہ میں آکر اس کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا نتیجہ اب اس کے سامنے تھا۔ اب دھان کے خوشے راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے اب اس کی تمنائیں برف کا تودہ بن گئی تھیں۔

ایک سال کے بعد——

"راجو چاچا، راجو چاچا" کفیل میاں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

"میں سمجھ گیا بیٹے۔ میں سمجھ گیا۔ کمائی خوب اچھی ہوئی ہے۔ کیوں؟"

"ہاں راجو چاچا میں نے پھوس کی چھت بدل کر او پر ٹین ڈلوا دیا ہے۔ کلثوم کے لئے شہر سے ساڑیاں، چوڑیاں اور ٹیکہ بھی خرید لایا ہوں۔"

"شہر گئے تھے تم۔ مجھے بتایا ہوتا بیٹے؟"

"کیوں چاچا؟"

"دیکھو نا کتنے دنوں سے چشمے کی یہ کمانی ٹوٹی پڑی ہے۔"

"جلد ہی پھر جاؤں گا چاچا۔ اس بار ضرور لا دونگا۔ اور ہاں سنو شہر میں رحمان سے بھی ملاقات ہوتی۔"

"کچھ بتایا اس نے کب آرہا ہے؟ وہ تو بالکل بھلا بیٹھا اپنے باپ کو۔" راجو چاچا کی آواز بھرا گئی۔

"چاچا پریشان نہ ہوں۔ جلد آنے والا ہے۔ اس سے بہت دیر تک عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔"

"عجیب عجیب باتیں! مطلب؟"

"چاچا وہ تو بالکل بابو معلوم ہوتا ہے۔ شہر کا بابو۔ ڈاڑھی تو پہلے ہی نہ تھی اب مونچھیں بھی غائب ہیں۔"

"کلجگ ہے بیٹے کلجگ ہے۔ شہر کی ہوا خوب راس آئی اسے۔ ہاں کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"چاچا اس کے پاس ایک کتاب تھی۔ اس نے مجھے ہوٹل میں بٹھا کر سب سنایا۔"

"کیسی کتاب؟ ہوگی بائیسکوپ کی کوئی کتاب۔ شہر جا کر بالکل تباہ ہوگیا وہ تو۔"

"نہیں چاچا بڑے ہی کام کی کتاب تھی۔ ہمارے ہی فائدے کی باتیں لکھی ہوئی تھیں اس میں۔"

"بیوقوف نہ بنا مجھے کفیل۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا چال چلن بگڑ گیا ہوگا جب ہی تو گاؤں نہیں آتا ہے۔ شہر کی ہوا ہی ایسی ہے۔"

"چاچا قسم خدا کی ایسی کوئی بات نہیں۔ رحمان بھائی جلد گاؤں آرہے ہیں اور انتخاب میں حصہ لیں گے۔"

راجو چاچا کو ہنسی آگئی۔ بولے۔ "معلوم ہوتا ہے شہر کی ہوا تمہیں بھی لگ گئی ہے۔ پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگے۔"

کفیل نے راجو چاچا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چاچا، رحمان بھائی نے بتایا ہے کہ ہماری نئی حکومت نے گاؤں میں کونسل کی طرح کا ایک

طریقہ چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب چودھریوں کی دال نہیں گلے گی اور وہ اپنی دولت سے گاؤں والوں کو خرید سکیں گے۔"

"اس کا فائدہ" راجو چاچا نے سوال کیا۔ اب ان کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی تھی۔

"اس کے فائدے بہت ہیں چاچا۔ گاؤں والے اپنے معاملوں کا خود ہی فیصلہ کریں گے۔ عدالت اور پولیس کا کام بھی یونین کونسل ہی کے سپرد کیا جائے گا۔"

یہ سن کر راجو چاچا کی باچھیں کھل گئیں۔ ان کے چہرے کی تھکن ایک دم سے غائب ہو گئی۔ کہنے لگے۔ "ہاں ہونا تو یہی چاہئے تھا بیٹے کفیل۔ مگر ہم گاؤں والوں کو ہمیشہ بیوقوف بنایا گیا۔ ہم گاؤں والے اپنے اچھے برے کو خوب پہچانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر گاؤں ڈوبا تو ہم ڈوبیں گے۔ ہمیں تو برابر سبز باغ دکھایا جاتا رہا اور ہماری زندگیاں بد سے بدتر ہوتی گئیں۔" یہ کہہ کر راجو چاچا چلم بھرنے لگے۔

"چاچا ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے" کفیل میاں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کہو کہو۔ آج تو تم بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔"

"راجو چاچا گاؤں کے سردھرے آپ ہی ہیں۔ ہم تو آپ ہی کو اپنا سردار چنیں گے۔"

"ہی، ہی، ہی" راجو چاچا کو زور سے ہنسی آ گئی۔ "بیوقوف کہیں کے۔ پنچ اگر چاہے تو ٹھیک ہے۔"

کفیل نے چلم پھونکنا شروع کیا۔ جب گڑگڑی تیار ہو گئی تو اس نے کہا۔ "لو چاچا پیو۔ آج تو دو کش میں بھی لگاؤں گا۔"

"بتاؤ آجکل رفیق الدین چودھری کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ کیا بات ہے؟ ملاقات ہوئی تم سے؟"

"کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اسے تو اپنی بے ایمانی سے کمائی ہوئی دولت پر گھمنڈ ہے۔ وہ کسی نہ کسی روپ میں انتخاب ضرور لڑے گا۔"

راجو چاچا نے زور کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہنھ! دولت۔ میں کروں گا اس کا مقابلہ۔"

یکایک پیپل کے بڑے بڑے پتے کھڑکے اور زور کی ہوا چلنے لگی۔ کفیل نے سر اٹھا کر اپنے کھیت کی طرف دیکھا۔ دھان کے خوشے ہواؤں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے دوبارہ زندگی ملی ہے۔ اسے اب رفیق الدین چودھری کا ڈر نہ تھا۔ اب تو کھیت کسانوں کے تھے۔ گاؤں گاؤں والوں کا تھا۔ دھان کے خوشوں میں ان کی آرزوئیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سرسراہٹوں میں ان ہی کے گیت چھپے ہوئے تھے جو ہواؤں کے ساتھ فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

کفیل میاں کی نگاہیں دھان کے خوشوں سے ہٹ کر کسی اور کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ بیتاب ہو گیا۔ اس نے راجو چاچا کی گڑگڑی کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا چاچا میں چلا۔ کلثوم انتظار کر رہی ہوگی۔"

"ہاں بیٹے جاؤ۔ بہت دیر ہو گئی ہے" اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی کی اڑان دھان کے خوشوں تک جا پہنچی۔ اور ساتھ ہی یہ خوشے بھی لہرانے لگے۔

ستاروں کی آخری منزل

محمد عمر میمن

اور جب کھیت جاگیں گے تو......؟ راجے کی ماں ایک نئی شلوار پہنے گی اور راجے کی بہن، ؟ ایک شوخ رنگ کا لہنگا پہن کر بڑے فخر سے گاؤں کی مٹیاروں کے ساتھ مل کر کمر پر مٹکا دھرے ندی پر پانی بھرنے جایا کرے گی۔ اور خود راجے کو ایک نئی نویلی، لجاتی شرماتی، جوانی کی حدت سے سرشار دلہن ملے گی جو اس کے جیون میں اپنے دھڑکتے، پرنور وجود سے ہر سو اجالا بکھیر دے گی، جو اس کے لئے اپنی جوان کوکھ سے ایک لڑکے کو جنم دے گی — یہ لڑکا جوان ہو کر اپنے باپ کی جگہ لے لے گا، اور یہ کہانی یونہی دہرائی جاتی رہے گی۔

یکایک بوڑھے کسان کو خیال آیا، آنے والی سردی سے بچنے کے لئے اس کے بوڑھے اور لاغر جسم کو ایک عدد پتوہی یعنی صدری کی بھی تو ضرورت ہے — لیکن یہ تو جب ہوگا کہ کھیت جاگیں گے۔ کیا یہ کھیت کبھی جاگ بھی سکیں گے؟

گرمی اور بڑھ گئی، چلچلاتی دوپہر میں بوڑھا کسان کھیت کی جلتی زمین کے سینے کو چیرتا رہا۔ دم بھر سستانے کو بیلوں کی جوڑی کو اس نے ہل سے جدا کیا اور کھیت کے کنارے پرانے برگد کی پرسکون گھنیری چھاؤں میں آ کر بیٹھ گیا، اپنی جوانی سے لے کر آج اپنے بڑھاپے تک گرمی کے شدید حملوں سے دم بھر بچنے کے لئے وہ یہاں اس برگد کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھتا آیا تھا۔ آج بھی جب منہ اندھیرے سے کھیت میں ہل چلاتے چلاتے اس کے ضعیف بازو شل ہو گئے اور بھوک کی شدت سے اس کا جسم نڈھال ہو گیا تو وہ بوڑھے برگد کی آغوش میں آ بیٹھا، اور جیسے برگد بھی تو اب اسے پہچاننے سا لگا تھا، اسے کبھی اعتراض نہ ہوا۔ کسان یہاں کیوں آتا ہے، زندگی بھر کا ساتھ جو تھا۔

اس نے بیلوں کے آگے چارہ ڈال کر سامنے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ راجے کی ماں دھیمے قدموں سے سر پہ 'ڈولا' دھرے، سنبھلتی سنبھلتی آ رہی تھی۔ کوئی دم میں وہ وہاں آ پہنچے گی، کسان کی بھوک چمک اٹھی، اس نے بے صبری سے ہانک لگائی۔

"راجے دی ماں! چھیتی کر چھیتی۔ کیہہ ہولی ہولی چل رہی ایں۔"

بڑھیا نے جو یہ سنا تو زندگی کی ان پرپیچ پگڈنڈیوں پر جنم جنم سے چلتے ہوئے اس کے تھکے تھکے سے قدم بجلی کی سرعت سے آگے بڑھنے لگے، جیون مرن کے ساتھی کی پکار تھی یہ، وہ اب کیوں دھیمے چلتی؟ یکایک اسے محسوس ہوا وہ گاؤں کی ان پتلی پتلی ناگن کی طرح بل کھاتی پگڈنڈیوں پر جوانی میں اپنے گبھرو کے لئے کھانا پہنچانے، چنگھاڑتی آندھی، چیختے طوفان سے بھی زیادہ تیز چلی ہے۔ وہ خوب سمجھتی تھی، گاؤں کی ایک لجاتی شرماتی گوری کے لئے گبھرو کا تصور کس قدر خوبصورت ہوتا ہے۔ جوان ہوتے ہی وہ اس تصور میں گم رہنے لگتی ہے۔ اس کی زندگی کا یہ رنگتا ہوا خواب کبھی نہ کبھی ضرور پورا ہوگا جب وہ ندی پر گاؤں کی دوسری اٹھکھیلیوں کے دن اور ہنس بولنے کے دن والی ساتھنوں کے ساتھ اپنی گاگر میں پانی بھرنے جا رہی ہوگی تو، ندی کے کنارے، جانے کن اجنبی دیسوں کی خاک چھانتا ہوا اور چہرے پر سفر کی صعوبتوں کے آثار لئے آجائے گا اور دھیمے سے کہے گا۔

"ڈھولوں اور ماہیوں کی روح! پردیسی کو اوک بھر پانی تو پلا دے۔"

اس کی آواز میں بہتے نیلگوں پانیوں سے کہیں زیادہ ٹھنڈک ہوگی، اسے سنتے ہی وہ شرم سے کٹ کٹ جائے گی، پھر پس منظر میں اپنی سہیلیوں کی مدھم سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ لئے وہ چور نظروں سے اجنبی کو، اپنے جیون کی مہار تھامنے والے کو دیکھتے ہوئے اپنی مٹکی کو اجنبی کی اوک پر جھکا دے گی۔ اور پھر اس کا یہ اجنبی مسافر اس کی زندگی کی مہار ہاتھ میں تھامنے والا اسے بہت دور محبت کی سہانی بستیوں کی طرف لے جائے گا۔

وہ سوچتی رہی، چلتی رہی، تیز تیز قدموں سے۔ جونہی وہ نزدیک پہنچی، بھوکا کسان اپنے لہجے میں پھوٹتی شفقت کی سی ملائمت لئے بولا۔

"اب ذرا جلدی آجایا کرو۔ جانتی ہو اب مجھ میں وہ دم نہیں رہا۔ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔"

وہ بولنے کی بجائے مسکرا دی۔ ساس کی مسکراہٹ بالکل ایسی تھی جیسے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرن دریا کی درمیانی موج پر چمک رہی ہو۔ بڈھے نے بڑی بے صبری سے سامنے دھری ڈلیا سے جوار کی دو موٹی موٹی روٹیاں نکالیں اور پیاز کی ایک ڈلیا کے ساتھ جلدی جلدی چبا چبا کر نگلنے لگا۔ بڑھیا نے جو یہ دیکھا تو دھاڑی۔ "میاں ہولی ہولی کھا۔ روٹی بھج تے نہیں چلّی۔" اس کے لہجہ میں کڑا پن تھا لیکن اس میں محبت کا ایک بیکراں سمندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

کسان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ تو تیزی سے کھاتا رہا۔ معاً اس کے ذہن میں یادیں کلبلانے لگیں، جوانی کے وہ دن جب اس کے بانہوں کی مچھلیاں تنی ہوئی تھیں، بھری بھری ہوئی تھیں اور اب وقت گزرنے کے ساتھ لٹک گئی تھیں۔ چہرے پر بے شمار جھریاں ابھر آئی تھیں۔ پہلے وہ سارا سارا دن بغیر تھکے کئی بیگھے زمین جوت لیتا تھا۔ اور باجرے کی اتنی اتنی موٹی چار روٹیاں کھا لیتا تھا۔ مگر یہ تو زمانے کا ازل ہی سے دستور رہا ہے۔ پرانے چراغ جھلملا کر گل ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے نئے چراغ آجاتے ہیں۔ پرانے انسان مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ چکر تو یونہی چلتا رہے گا۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے، چند ہی دن میں نکما ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے کمزور کاندھے ہل کا بوجھ نہ اٹھا سکیں گے۔ اور اس کی جگہ اس کا راجے لے لے گا۔ یہ کہانی یونہی نسل بعد نسل دہرائی جاتی رہے گی۔ یہی جوار باجرے کی روٹیاں کنبے کا ہر کسان کھاتا رہے گا، اور یونہی سارا دن کھیت میں ہل چلاتے، تھک کر سستانے برگد کی ٹھنڈی آغوش میں آ گرے گا، اور یہ کھیت، کسان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے گندم کی نفیس سبز سنہری بالیوں، اور مکئی کے کنوارے کنوارے بھٹوں کو جنم دیتے رہیں گے۔ کسان کبھی فنا نہ ہو گا، گو اس کا جسم، منوں مٹی تلے دب کر سڑ گل جائے مگر اس کی روح نئے نئے کسانوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی رہے گی، یہ کھیت کسان کی زندگی ہیں، اس کی روح اس کے مالک اور ان کی محبت سے لبریز آغوش میں دھرتی کے یہ لال چین کی نیند سوتے رہیں گے۔

بوڑھے کسان کا ذہن کافی دیر ایسی خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ پیاز کی گٹھی اور باجرے کی روکھی پھیکی خشک روٹیوں کو چبا کر نگلنے کی سکت تو کب سے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ اٹھا، مگر اس کا جوڑ جوڑ ہل گیا، بمشکل وہ کنوئیں کی مینڈھ تک پہنچا۔ جہاں ڈول بھر پانی اس کی بڑھیا نے پہلے ہی سے نکال رکھا تھا۔ اس ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ پی کر اس نے اپنی جلتی روح کو تسکین دی، پھر اس کے چھینٹے اپنے جھلسے ہوئے چہرے پر ڈالے اور بڑھیا کی طرف منہ کر کے کہا۔

"اچھا راجے کی ماں، اب ڈولا لے کر چلی جاؤ۔ وقت کم ہے۔ میں دیگر ویلے آؤں گا۔"

بڑھیا نے ڈولا اٹھایا اور "ذرا سویرے آجائیو" کہتی ہوئی بل کھاتی پگڈنڈی پر ہو لی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے دھاڑا۔

"ہونہہ سویرے آجائیو! یہ کھیت پھر میرا باپ آکر واہے گا۔"

وہ بیلوں کو ہانکتا ہوا جلدی جلدی کھیت میں آپہنچا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس آگ برساتی گرمی کے بعد وہ اس قابل نہ رہ سکے گا کہ آئندہ سال کھیت میں کام کر سکے۔ اس نے ایک نگاہ، بھرپور اور معنی خیز نگاہ کھیت پر ڈالی — وہ کھیت جو چند مہینوں میں گندم کی نرم نرم سرسبز و شاداب بالیوں کو جنم دینے والا تھا۔ دیکھا تھوڑی زمین اور باقی ہے۔ پھر آدھا دن بھی تو پڑا ہے، وہ دن ڈھلتے تک اس حصہ کو بھی جوت لے گا ہل کے جوئے میں بیلوں کی جوڑی جوت کر وہ پھر جلتی دوپہر میں کھیت میں ہل چلانے لگا۔ زندگی کی حرارت قائم رکھنے کے لئے یہ کس قدر ضروری ہے۔ اگر کھیت میں ہل نہ چلے تو زندگی کے سارے ہنگامے، ساری شوخیاں یکدم ختم ہو جائیں۔

ہل چلتا رہا، زمین کی چھاتی پھٹتی چلی گئی، کچی کچی دھول اڑاتی راہوں پر آنے جانے والے بیلوں کی سریلی نغمہ ریز گھنٹیاں گونجتی رہیں، مگر وہ تمام خارجی باتوں سے بے خبر۔ اپنے تصورات کی حسین دنیا میں کھویا رہا۔

اگر اس سال بارش وقت پہ ہوئی تو فصل بڑی اچھی ہو گی اور پھر کم از کم بتیس من گندم اور اٹھارہ من مکّی پیدا ہو گی اور وہ راجے کی ماں کو ایک نئی شلوار دلائے گی اور راجے کی بہن کو؟ ایک شوخ رنگ کا لہنگا۔ راجہ بھی تو ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے، اس کی شادی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ آخری عمر

سے، یہ خوشی بھی تو وہ دیکھ لے۔ اور ہاں اپنے لئے بھی تو اُسے سردی سے بچنے کے لئے موٹے جھوٹے کپڑے بنانے ہی ہیں۔ پچھلے سال بارش بھی تو بہت ہوئی تھی اور کچے مکان کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ اب کی اس کا بھی تو بندوبست کرنا ہے۔

بوڑھا کسان سوچتا ہی رہا۔ فصل کا انحصار بارش پر ہے، اور چار زندگیوں کا، اس کے جنم جنم کے پیاسے خوابوں کا انحصار فصل پر ہے۔ ہل چلتا رہا۔ اس کے خیالات ہل کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں حسین مستقبل کے خواب بنتے رہے، وہ مستقبل، جس پر خود اسے قابو اور اختیار نہ تھا۔ اور جب بیل رک گئے، دوپہر ڈھل گئی، آفتاب کی تمازت گھٹنے لگی اور آفتاب دور مغرب میں پچھلے پیپل کے جھنڈ کے لامتناہی سلسلوں کے عقب میں روپوش ہو گیا، ناگن کی طرح بل کھاتے کچے راستوں پر کھیتوں سے واپس گاؤں کی طرف جاتے بیلوں کی سریلی گھنٹیاں بج اٹھیں تو بوڑھے کسان کے خیالات کا تانتا ٹوٹا اور اُسے محسوس ہوا۔ ارے کھیت تو کب کا جُت چکا، شام بہت پہلے ہی ڈھل چکی ہے اور اب تو رات کا طلسمی اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ تب اُس نے کاندھوں پر ہل رکھا اور آگے آگے ادھر کے کچکدار بید سے بیلوں کو ہانکتا مضمحل مضمحل اور تھکا تھکا سا گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ نیم روشن، کثیف اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ اب ٹھیک، عبداللہ کی چوپال کے سامنے نکل آیا۔ پیپل کے پیڑ سے لگی چوپال جگمگی، سرمئی دھندلکوں کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ٹمٹماتی لالٹین کی لَو اس قدر مدھم تھی کہ چوپال کا صرف ایک ہی گوشہ روشن تھا جہاں گاؤں کے تھکے ماندے کسان دن بھر کی کسل دور کرنے یہاں چلے آئے تھے اور عبداللہ کے پاس بیٹھے جنم بھر کی بے کیفی کو حقے کی گڑگڑاہٹ میں سمو دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے ہی ٹوٹی کرسی پر زمیندار فضل محمد کا پٹھو، لال محمد، بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف یہ کسان، یاس اور پژمردگی کے کتنے ہی آثار لئے، تھکے تھکے سے، عبداللہ کے بچھائے ہوئے کھیس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اگر ان میں کوئی مسرور تھا تو صرف لال محمد جو زمیندار کا جاسوس، اس کے گوداموں کا رکھوالا اور اس کا لگان وصول کرنے والا تھا۔ اس سے گاؤں کے تمام کسان ڈرتے تھے۔ وہ جاسوس تھا۔ اگر زمیندار کے خلاف کبھی کوئی بات سنتا تو فوراً زمیندار سے جا لگاتا! کسی بچی مسئلے پر کوئی نوجوان بے باک کسان اس سے اُلجھ جاتا تو وہ اس وقت تو چپ سادھ لیتا مگر غلہ اور لگان اٹھا کرتے وقت ساری زندگی کی رہی سہی کسر نکال لیتا۔ آج بھی کسان اس کے آگے دم سادھے بیٹھے تھے۔ کہیں ان کی زبان سے کوئی الٹا سیدھا لفظ نہ نکل جائے ورنہ لال محمد فصل پر سارا قصہ ہی پاک کر دے گا!

بوڑھا کسان چوپال کے نزدیک اپنا دامن بچاتا نکل گیا۔ لال محمد کے آگے سہمے ہوئے کسانوں کو دم سادھے دیکھ کر اُسے محسوس ہوا، کیا ہم زندگی بھر زمیندار کے آگے بھینٹ چڑھتے جائیں گے؛ وہ دن کب آئے گا جب غلہ ہمارا ہوگا اور ہم آزاد ہوں گے، کسی کے تابع نہیں؟ مگر اُسے اپنے ان سوالوں کا جو روز ہی اس کے ذہن میں ہجوم کیا کرتے تھے، حسب سابق کوئی جواب نہ مل سکا۔ بوڑھے کسان نے جانے کتنی بار سوچا تھا۔ کاش اس کا راجہ بھی پڑھ سکتا! کاش اس کے اپنے گاؤں میں کوئی اسکول ہوتا جہاں گاؤں کے آوارہ بچے پڑھ سکتے! کاش اس کا گاؤں بھی صاف ستھرا ہوتا! یہاں کوئی اسپتال ہوتا۔ گندگی کے ڈھیروں پر پلنے والے اس بوڑھے کو گندگی سے شدید نفرت تھی۔ اس نے اپنے بچپن میں بارہا سوچا تھا، اگر کبھی وہ اس گاؤں کا زمیندار ہو گیا تو یہاں خوبصورت، صاف ستھری پکی گلیاں بنوا دے گا، اپنے بھائیوں کے آگے اپنے خزانے کا منہ کھول دے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کے آگے اس کا ذہن رک جاتا۔ اس کے آگے اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اور کیا بھلائی کی جا سکتی ہے۔ جب ایک بار وہ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ شہر گیا تھا تو صاف ستھری سڑکیں دیکھی تھیں۔ اور شہر کی چمکتی فضا نے اسے اس درجہ متاثر کیا تھا کہ وہ بے اختیار اپنے باپ سے لپٹ کر پوچھ بیٹھا تھا۔

"کیوں چاچا۔ ساڈا پنڈ ایہو جیہا کیوں نہیں؟" اور اس کا باپ اپنے احساس کی ساری تلخی سے بولا تھا۔

"اسیں زمیندار دے زر خرید جو ہوئے!" اور اس دن سے اس کے دل میں زمیندار کے ساتھ نفرت سی ہو گئی تھی۔

بچپن، جوانی کے آگے اور جوانی بڑھاپے کے آگے سرنگوں ہو چکی تھی! اب نہ وہ رنگ تھا، نہ وہ ولولہ، اور بوڑھا کسان آپ ہی آپ بڑبڑا گیا تھا۔

"یہ گاؤں اس وقت تک نہیں سدھر سکتا جب تک وہ آزاد نہ ہو جائیں۔ اور ان کی آزادی زمیندار کے آگے زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے، اُسے ہتھکڑیاں لگی ہیں جس کی چابی زمیندار کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر کیوں نا وہ اس ہتھکڑی کے آہنی حلقے کو زمیندار کے سر پر دے ماریں۔ مگر یہ کس قدر مشکل ہے! اور غلاموں کو یہ سب نہ سوچنا چاہئے۔" سوچتے ہوئے وہ اس روح فرسا حقیقت کو بھول جانے کی سعی کرتا۔

بوجھل قدموں سے وہ چلتا رہا۔ اس کا ذہن خیالات کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھا۔

کھیت جُت گئے، بیج پھیلا دیئے گئے، آبیاری ہوتی رہی۔ اس سال وقت پہ بارش بھی حسبِ ضرورت ہوئی، پیاسی زمین نے دل کھول کر پانی پیا اور پھر اپنی سنگلاخ کوکھ سے حسین نرم نرم سبز سبز گندم اور مکئی کے پودوں کو جنم دیا جن میں پھر ملائم گندم کی سنہری بالیاں اور موٹے موٹے بھٹے پھوٹ آئے اور ہوا کے لطیف دوش پر جھک جھک کر مسرّت سے لہلہانے لگے، اٹھکھیلیاں کرنے لگے، مسکرانے لگے، گیت گانے لگے، مترنم پرکیف نغمات جن میں ایک کسان کی محنت، خون اور پسینے سے ترتیب دی ہوئی موسیقی سے لبریز دھنیں تھیں۔ کسان کی روح اور زندگی تھی۔

وہ مسکرایا۔ فخر سے سر کو جنبش دی، گندم کی سنہری بالیاں مسکرا دیں خوشی و انبساط سے اور کسان کی مسکراہٹ سے پودوں کی مسکراہٹیں ہم آہنگ ہوگئیں۔ مسرت سے سرشار ہو کر کسان ایک شوخ اور جوان گیت گنگنا اٹھا، گندم کی بالیاں محوِ رقص ہوگئیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ فطرت کے اس بے پایاں حسن میں ڈوب گیا۔ اور کسان نے سوچا۔

اس دن جلتی دوپہریں، عالمِ بیداری میں، دیکھا ہوا وہ خواب ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا، اب راجہ کی دلہن بھی آئے گی اور راجہ کی بہن شوخ نگوں کا لہنگا بھی پہن سکے گی، اور اس کا راجہ — جوان راجہ پھر دھرتی کا سینہ چیر کر اگلے سال اناج اگائے گا، اور وہ خود سکھ چین سے زندگی کے باقی ماندہ دن خدا کی عبادت میں صرف کر دے گا۔

پھر مسرت کے انوکھے جذبے سے سرشار ہو کر اس نے اپنی مضطرب، منتظر بانہیں پھیلا دیں — بیس تیس گندم کے قد آور پودوں کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

اوہ! گندم کے سبز پودو! تم ہی میری زندگی ہو، ایک کسان کی زندگی، اس کا سرمایۂ حیات، اس کی جاگیر، اس کی روح، اس کی خوشی، اس کا غم اور اس کے خدا! میں نے تمھیں اپنے لہو سے سینچا ہے، اپنے سرخ لہو سے تمہیں جنم دیا ہے، تمھیں پیدا کیا ہے!

اور گندم کی ریشمیں بالیں مسرت سے کسان کی بانہوں سے یوں لگ گئیں جیسے بچہ کسی کی خاطر، شفیق ماں کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے آغوش میں سما جاتا ہے، جہاں حیات کی خوشیاں ہیں۔ اور جہاں زیست کا کوئی غم، کوئی خوف اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ محبت اور بے لوث جذبۂ محبت سے لبریز آغوش!

بہت بھولے ہو، تم خوشی کے گیت گا رہے ہو، ذرا دھیمے دھیمے، کوئی سن نہ لے، ورنہ اپنے پودوں کی محبت میں جو تمہارے خون سے پروان چڑھ کر بھی تمہارے اپنے نہیں، زمیندار کے لوگ تمہیں دھر لیں گے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ لیکن نادان ہو، اپنے پاؤں میں پڑی ان غلاموں کی بیڑیوں اور ہاتھوں کی ان آہنی ہتھکڑیوں کو نہیں دیکھتے، یہ تو وہ آہنی بیڑیاں ہیں جنھیں زمیندار کے ہاتھوں نے صدیوں کی محنت کے بعد خود تمہارے لئے تیار کیا ہے۔ دن رات کچے لوہے کو بھٹی کی دہکتی ہوئی آگ کے تیز شعلوں میں بڑی محنت سے ان ہاتھوں نے ہی پکایا ہے اور پھر تیشے سے سرخ لوہے کو کاٹا ہے اور جب زنجیریں اٹوٹ ہوگئیں تو انھیں تمہارے جسموں کے گرد لپیٹ دیا گیا ہے۔ اب دن رات تیز و تند ریتی کو لے کر انھیں گھسو گے تو بھی یہ نہ ٹوٹیں گی، اب تو تمہاری نظروں پہ بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے، اور کچھ دنوں کے بعد تو تمہارے یہ نغمے بھی چھین لئے جائیں گے جو اپنی تخلیق کی اس حسین تکمیل کو دیکھ کر تمہارے لبوں پہ آکر رس بن جاتے ہیں۔ آج تمہارے دیس کی ہر کنواری کا دل شدتِ اندوہ سے مرجھا رہا ہے، آج کوئی اجنبی دور دیس سے گاؤں میں ندی کے کنارے کھیتوں سے چور — مغرور مٹی اپنے ننھے پاؤں پہ لئے آتا ہے تو کسی کی غزالیں آنکھیں نہیں چونکتیں اور نہ کسی کا آنچل اڑتے جلیب سے عنبریں ہوتا ہے۔ بس ان منتظر آنکھوں میں تو بڑی اداسی رچی ہوتی ہے، اتنی اداسی جس میں دنیا کی ساری خوشیاں بھی ڈوب جائیں تب بھی سطح پہ ہلکی سی جنبش نہ ہو۔ بس ایک گہرائی ہے، اتھاہ گہرائی۔ تم نے اس وقت ہی کیا کر لیا تھا جب گاؤں کی کتنی گوریاں — شاداں، رجاں، تاجی، اور کتنی ہی اور اجنبیوں کے آگے اپنا دل رکھ آئی تھیں اور اس کے بدلے زمیندار کی ہوس کا نشانہ بنی تھیں۔ جب تم چپ تھے اور تمھارے ساتھی بھی۔ اور اب تو کوئی گوری کسی اجنبی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ کہیں محبت کے جرم میں زمیندار کے ہاتھوں اپنی عصمت ہی نہ بھینٹ چڑھا آئے۔ جانتے ہو؟ یہیں پنجاب کی ایک بیٹی ہے اس کا دل چھین لیا گیا تو اسی زمین نے وارث شاہ کو جنم دیا۔ جس نے ہیر کے ایک ایک آنسو کو سنہری حرفوں میں پرو کر دنیا کے آگے رکھ دیا۔

لیکن جب آج اس غریب دھرتی کی کتنی بیٹیاں اداس ہیں، کتنے دامن خالی ہیں، کتنی آنکھیں اپنی بے بسی پر آپ ہی اشکبار ہیں تو کوئی آگے نہیں بڑھتا، مجبور و بے بس کسان، تم سے تمہارے گیت بھی چھین لئے جائیں گے!

پھر درانتی لے کر کھیتوں کی کٹائی شروع ہوئی، میدانوں میں کٹے ہوئے پودوں کے اونچے اونچے ڈھیر لگا دیئے گئے، اور پھر چاندنی راتوں میں، سرمئی دھند میں لپٹی ہوئی گلابی سردیوں میں، گیت گا گا کر ان کسانوں نے مکئی کے بھٹوں اور گندم کے خوشوں سے دانے الگ کئے، کتنی عجیب بات تھی! گندم جسے کسان اُگاتا ہے خود اس سے محروم رہ جاتا ہے اور اس کے حصہ میں تو صرف جوار اور باجرے کی روکھی پھیکی روٹیاں ہی آتی ہیں جن کو نگلنے کے لئے لعابِ دہن بھی ناکافی ہوتا ہے!

پھر جب دانے الگ ہو گئے اور ہر طرف بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے تو ایک صبح زمیندار کے کارندے آگئے جن میں لال محمد پیش پیش تھا۔ یہ صبح دوسری صبحوں سے کس قدر عجیب تھی، جب گاؤں والے ایک انجانے خوف سے کانپ کانپ گئے تھے، جانے اب کونسی افتاد پڑنے والی تھی۔ صبح ہی صبح یوں منہ اندھیرے زمیندار کے کارندوں کی صورت دیکھنا یقیناً کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا ہے بادشاہو؟" حیرت و خوف کے ملے جلے احساس سے کسان چلّا اٹھے۔ بھولے کسان یہ صبح تو ان کی زندگی میں بارہا آئی تھی، اور جب دانے ڈھیروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو یہ صبح ضرور آتی ہے اُن کی آواز لرز گئی۔ "زمیندار فضل محمد خاں کا حصہ ان دانوں سے الگ کر دو" یا بہ الفاظ دیگر اپنی زندگی کی بھینٹ دیدو، زمیندار کا حصہ الگ کرنے کے یہی تو معنی تھے۔ حصہ الگ کر کے ان کے اپنے پاس کیا رہ جائے گا؟ محض چند دانے، جو حیات کی اس حرارت کو قائم رکھنے کے لئے اتنے ہی ناکافی تھے جتنا لامتناہی تپتے ریگستان میں کہیں اُگا ہوا کوئی کھجور کا تنہا درخت! کسانوں کے چہروں پر بے بسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ انھیں محسوس ہوا، ان کی خوابیدہ تمنائیں، ان کے خواب کم از کم اس جنم میں تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے جن کی پرورش برسوں سے وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کرتے آئے ہیں۔ بے بس کسان! غلامی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے، خاموش خاموش بغیر کسی احتجاج کے اپنے گاڑھے پسینے اور خون سے سیراب کردہ دانوں میں سے زمیندار کا حصہ الگ کرنے لگے جو سب پر مقدم ہے، اور بوڑھے کسان نے سوچا۔ اب اس کا راجے زندگی بھر کنوارا ہی رہ جائے گا، اور راجے کی بہن شوخ رنگوں کا لہنگا نہیں پہن سکے گی، اس کے نحل آرزو میں تا زیست باد سموم کے طوفانی جھکڑ ہی چلتے رہیں گے۔ اس کے گاؤں میں کوئی اسکول نہ کھل سکے گا بے بس کسان اپنی فصل سے زمیندار کا حصہ الگ کرنے لگا، اور کسان نے سوچا۔ جس طرح ایک کسان کے مرنے پر اس کی روح دوسرے کسان کا روپ دھارے گی کیا اسی طرح غلامی کی یہ زنجیریں نسل در نسل اناج اُگانے والے کسان کے گلے میں طوق بن کر اترا کریں گی، جوں جوں یہ کہانی دہرائی جاتی رہے گی کیا اسی طرح کنبے کے ہر کسان کو غلامی کی زنجیریں ورثہ میں ملا کریں گی؟ کیا کسان کبھی آزاد نہ ہوگا؟ جانے کب یہ نظام بدلے گا۔ جانے یہ کھیت کب جاگیں گے؟ وہ گنگنانے لگا: "ہر چیز زمانے دی بدلدی اے۔ کیوں نہ ساڈی لے سرکار بدلے"

رات کے بے شمار آنسو نورانی صبح کے کشکول میں ایک ایک کر کے ٹپک جاتے! ... شب کے ظلماتی طلسم اور سکوت کو توڑنے سورج کی جبین سے کرنیں پھسلتی ہیں اور اندھیروں کے سینے میں دور تک اترتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اندھیرے کسمساتے ہیں، گھبراتے ہیں، تڑپتے ہیں اور کرنوں کے اس نورانی غبار میں کائی کی طرح چھٹ جاتے ہیں! لیکن یہ کیا تماشہ ہے، ان کی زندگی کی اس ٹہری ہوئی شب تار کو کوئی سحر آ کر نہیں توڑتی!

آج نہیں تو کل، بوڑھے کسان نے سوچا، صبر و ضبط کے یہ بند ٹوٹ ہی جائیں گے، اور ساتھ ہی کسان کی گردن سے اس کی غلامی کی یادگار، اس طوق کو بھی اتار پھینکیں گے، جب کسان آزاد ہوگا، اس کی فصل اس کی اپنی ہوگی، جب زمیندار فصل لینے نہ آیا کریں گے، زمین اس کی ہوگی، اور کھیت اس کے ہوں گے، شاید جلد ہی کوئی زلزلہ آئے۔ اور موجودہ نظام کی ساری بنیادوں کو ہلا دے!

دھرتی کے لال! دھرتی کے پتھریلے سینے پر اپنے کھردرے ہاتھوں سے طرح طرح کے نقش و نگار، کیسے کیسے نادرِ روزگار شاہکار بنانے

والے کسان! تمہارے کھیت اب جاگ گئے ہیں۔ کھیت تمہارے ہیں، زمین تمہاری ہے، وہ زلزلہ آگیا ہے جس کے ساتھ ہی ساسی کی تمام آلودگیاں منہدم ہوگئی ہیں۔ وہ صبح طلوع ہوگئی ہے جس کا تمہیں انتظار تھا، یہ یاس کیسی، یہ کوئی ڈھکوسلہ نہیں، یہ تو پر امید اور نورانی مستقبل کا سندیسہ ہے، مشرق کی طرف تو ذرا دیکھو۔۔۔ کیسا اجالا پھوٹ رہا ہے، تمہارے لہو کی سرخی رنگ لے آئی ہے۔

اور جب زمین کے پُرنم کناروں کو چومتی ہوئی، افق کے سرمگیں دریچوں سے جھانکتی ہوئی سحر، ساحل سمندر کے نزدیک کسی پر شکوہ محل میں محوِ خواب بہاروں کی جمیل دوشیزہ کی طرح آنکھوں میں مستی اور خمار لئے، جوان انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوئی تو۔۔۔ اس کے جلو میں، جنم جنم سے دُکھے، ان طویل اور کٹھن راستوں پر محوِ خرام کسانوں کے لئے کتنے ہی دلفریب رنگ تھے، سرخ، شہابی، جوان، شوخ، نارنجی!
آج چوپال میں بڑا شور ہے۔ یہ کیسی خوشی صدیوں بعد آج جنم جنم کے پیاسے کسانوں کے چہروں سے پھوٹ رہی ہے، آج ٹوٹی کرسی پر لال محمد کی بجائے بوڑھا کسان بیٹھا ہے، اس کے چہرے پر مسرت کی دبی دبی آگ ہے۔
وہ سب کہہ رہے ہیں، "بادشاہو! ہم تو تمھیں اپنا سردار بنائیں گے"۔
بڑی آوازیں ہیں، ۔۔۔ بہت شور ہے، نقرئی، تیز، بھاری، بوجھل، مدھم، ہلکی سی آوازیں ۔۔۔ ذرا زمیندار کے پرشکوہ محل کی طرف بھی تو دیکھو۔۔۔ وہاں کیسی تاریکی پھیلی ہوئی ہے، یاس و حسرت کے کتنے ہی ماتمی دھندلکے تیر رہے ہیں۔
عبداللہ جلد جلد حقہ بھر رہا ہے اور آوازوں کے اس سرور انگیز شور سے بہت دور ٹوٹی کرسی پر بیٹھا کسان مسرت کی دبی دبی آگ اپنے جھریوں بھرے چہرے پر لئے سوچ رہا ہے۔ اب اس کے راجہ کے لئے وہ گاؤں کی سب سے الہڑ سب سے خوبصورت گوری لائے گا۔ اب راجہ کی بہن بھی شوخ رنگوں کا لہنگا پہن سکے گی اور راجہ کی ماں نئی شلوار ۔۔۔ اور اگر جیسا کہ یہ کہتے ہیں انہوں نے ہی اپنا سردار بنا لیں گے تو وہ سب سے پہلے گاؤں میں ایک اسکول کھولے گا۔ شہر کو جانے والی کچی سڑک کو پختہ کرائے گا، وہ دس چنے ہوئے آدمیوں کی پنچایت کا سربراہ ہوگا، اس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی، وہ اپنے علاقے میں کوئی جھگڑا نہ ہونے دے گا، وہ اپنے گاؤں کی ترقی کے لئے کام کرے گا، امن قائم رکھے گا، ہسپتال کھلوائے گا، آپس کے جھگڑے، مویشیوں کے جھگڑے وہ خود ہی مل کر پنچایت کے ساتھ طے کرے گا۔۔۔ وہ سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا یہاں تک کہ شام ڈھل گئی اور گاؤں کی طرف آتے مویشیوں کی ترنم ریز گھنٹیاں گرد سے اَٹے کچے راستوں پر گونجنے لگیں۔

اب تمہارے گاؤں کی کوئی ساجاں، شاداں، یا سکینہ زمیندار کی ہوس پر بھینٹ نہیں چڑھیں گی، اندھیرے کنوؤں میں اپنی عصمت، اپنی ناموس نہ بیچیں گی، ۔۔۔ اب تو وہ ندی کنارے اجنبی دیسوں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے، تھکے تھکے سے، ننگے قدموں پر سفر کی گرد لئے آنے والے ان مسافروں کا انتظار کیا کریں گی جو اُن سے آکر پانی مانگیں گے اور ان کی جھکتی ہوئی مشکیوں کے ساتھ ہی اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجائیں گی ۔۔۔ اور پھر وہ اجنبی کو دیکھ کر چونکا کریں گی اور ان کے آنچل کا مہکتا ہوا شعلہ بوئے حبیب سے عنبریں ہوجائے گا، ان منتظر آنکھوں میں بڑی مسرت ہوگی، اور اب تو ایک بار پھر اُن کی محبت کچے گھڑے کے سہارے ندی کی طوفانی موجوں سے لڑنا سیکھ گئی ہے، وہ ساحل تک کنارے تک ضرور پہنچے گی ۔۔۔ انھیں اب اپنی منزل دکھائی دینے لگی ہے ۔۔۔ اور کسی کے رہنما ہاتھ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس منزل کو پہنچنے والے راستہ پر ڈال بھی دیا ہے۔

ڈرامہ:

رات اور مسافر

آغا ناصر

کردار:

کسان ——— بوڑھا آدمی
مہاجر ——— ادھیڑ عمر
بیروزگار ——— ۲۲ سال کا نوجوان
شاعر ——— جوان

پہلا منظر

وقت:- ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے
مقام:- کسی ویرانے میں ایک پرانی سرائے کے کھنڈرات۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پہ گہرا اندھیرا ہے۔ پس منظر میں موسلا دھار بارش کے صوتی اثرات اور بادلوں کی گرج جاری ہے۔ بجلی کی چمک سے یکبار اسٹیج جگمگا اٹھتا ہے تو ایک پرانی حویلی کے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ جھکی ہوئی کڑیوں کے ایک سائبان کے تلے کسان بالکل ساکت کھڑا ہے، یوں جیسے پتھر کا بت۔ دالان کے مغربی حصہ سے مہاجر داخل ہوتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ بارش سے اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ وہ اپنی جیب سے ایک سیلی ہوئی موم بتی نکال کر سائبان کے مشرقی کونے کے قریب پڑے ہوئے بڑے سے پتھر پر رکھتا ہے اور ماچس سے موم بتی کو آگ دکھلاتا ہے، چند لمحوں کی کوشش کے بعد موم بتی جلنے لگتی ہے اور اس کی مدھم روشنی سارے اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ کسان جس کے سر اور داڑھی کے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید ہیں چونک کر مہاجر اور موم بتی کی طرف دیکھتا ہے۔

کسان:- کون ہے!

مہاجر:- (چونک کر) ارے یہاں بھی کوئی ہے — میں تو تمہیں پتھر کا بت سمجھا تھا۔

کسان: پتھر کا بت؟ ٹھیک ہی سمجھا تم نے (ٹھنڈی سانس لیکر) تم کون ہو؟

مہاجر:- مسافر۔ بارش سے بچنے کے لئے اس چھت کے نیچے آگیا ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔

کسان:- اعتراض؟ کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں تو خوش ہوں کہ رات گذارنے کو ایک ساتھی مل گیا (وقفہ) تم غلط سمجھے۔ میں اس حویلی کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو خود تمہاری طرح بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگیا تھا۔

مہاجر:- چلو اچھا ہی ہے (اچانک ایک نوجوان آدمی بھاگتا ہوا مغربی دالان کی طرف سے اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کا لباس بوسیدہ ہے، سر کے بال الجھے ہوئے ہیں۔ شیو بڑھا ہوا ہے)۔

بیروزگار:- معاف کیجئے گا۔ میں بغیر اجازت یہاں چلا آیا۔ در اصل بارش بہت تیز ہے۔ میں نے دور سے ان کھنڈرات میں یہ روشنی دیکھی تو بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑا۔

کسان:- تم نے اچھا ہی کیا۔ کون ہو تم؟

بیروزگار:- مسافر! (کسان اور مہاجر بڑبڑاتے ہیں "مسافر!") — اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟

کسان:- ہم بھی مسافر ہیں، تمہاری ہی طرح۔ بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگئے ہیں۔

بیروزگار:- خوب اتفاق ہے (ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر مایوسی کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتا ہے) تو پھر آیئے آرام سے زمین پر ہی بیٹھ جائیں۔ یہاں تو پتھر تک بھی نہیں ہیں بیٹھنے کے لئے — اور رات بہت لمبی ہے اور بارش بہت تیز۔

مہاجر:- ٹھیک ہے (مہاجر اس پتھر کے قریب جاتا ہے جہاں موم بتی جل رہی ہے۔ وہ اپنی جیب سے ایک اور موم بتی نکال کر جلاتا)

میری جیب میں اتفاق سے دو موم بتیاں تھیں۔ جب میں چلا تھا تو میرے بچوں نے کہا تھا ہمارے لئے کچھ لے کر آنا۔ میں نے سوچا موم بتی سے سستی اور کوئی چیز نہیں جسے دیکھ کر بچے خوش ہو جائیں۔

کسان:۔ تو تم اپنے گھر جا رہے تھے۔

مہاجر:۔ گھر! گھر!! (مہاجر اسٹیج کے درمیان میں آتا ہے اور نوجوان کے کاندھے کا سہارا لیکر زمین پر بیٹھ جاتا ہے) گھر — میرا ایک گھر تھا چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں نیم کا ایک بڑا پرانا درخت تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ درخت میرے دادا نے اسوقت لگایا تھا جب وہ بچے تھے۔ اور ہمارے مکان کی ڈیوڑھی کے سامنے بہت سی چھوٹی چھوٹی کیاریاں تھیں۔ میرا گھر! ہاں میرا ایک گھر تھا، اس کی چہار دیواری مٹیالے رنگ کی تھی لیکن جب میری شادی ہوئی تھی تو میرے باپ نے اس پر گہرا نیلا رنگ کرا دیا تھا۔ اور جب ہم نے اپنا مکان چھوڑا تو وہ گہرے نیلے رنگ کا نہیں رہا تھا۔ بارشوں اور دھوپ نے اُسے ایسا کر دیا تھا جیسا آسمان۔ آسمان جیسا رنگ تھا میرے گھر کی دیواروں کا (اس کے چہرے سے کرب کے آثار ہویدا ہیں) آسمان جیسا رنگ لیکن آسمان نے میرا گھر چھین لیا۔ اور اب ہم آسمان کی چھت کے تلے سوتے ہیں — میں، میری بیمار بیوی، میرے دونوں بچے۔ میرا گھر مجھ سے چھن گیا اور میں — (اس کی آواز رُندھ جاتی ہے)۔

کسان:۔ (بڑی عقیدت سے) تم مہاجر ہو؟

مہاجر:۔ ہاں — اور . . . تم کون ہو؟ تمہارے پاس گھر ہے۔ ہے نا؟

کسان: گھر! ہاں۔ شاید — ایک چھوٹا سا جھونپڑا — لیکن اتنی بڑی زمین پر اگر سر چھپانے کو ایک جھونپڑا مل بھی گیا تو کیا ہوا؟ میں اپنے گھر، اپنے گاؤں، اپنی زمین اور اپنے کھیتوں میں رہنے کے باوجود ان سب سے دُور ہوں!

مہاجر۔ تم کسان ہو؟

کسان۔ ہاں، میں کسان ہوں۔ لیکن میرے کھیت کہاں ہیں، میرے بیلوں کی جوڑی کہاں ہے؟ کبھی وہ سب میرے تھے۔ نہر سے لے کر امرودوں کے باغ تک سارے کھیت، سب میرے تھے۔ میرے باپ نے خود مجھے بتایا۔ لیکن وہ ساری زمین، وہ سارے کھیت ایک ایک کر کے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے! صرف ہمارے ہی نہیں، بہت سے اور لوگوں کے کھیت بھی! وہ سب ایک ہی آدمی کے قبضہ میں چلے گئے اور وہ زمیندار بن گیا دن گزرتے گئے۔ موسم آتے رہے جاتے رہے۔ فصلیں بوئی جاتی رہیں اور کٹتی رہیں۔ (تھوڑی خاموش رہنے کے بعد) سب کچھ بھول گئے — ہونہہ! (طنزیہ) بھول گئے — بھولا کیسے جا سکتا ہے۔ اپنے کھیت گنوا کر، اپنی زمین دوسرے کے قبضہ میں چلے جانے کے بعد کون بھول سکتا ہے؟ اس مٹی میں میرے آبا و اجداد کا پسینہ گرا ہے۔ مجھے اس مٹی سے اسی قدر محبت ہے جتنی اپنے خون سے! پھر انھیں بھلایا کیسے جا سکتا ہے، میرے کھیت، میری زمین (مضطرب سا ہو کر) مگر نہیں نہیں، میرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کسان ہوں لیکن میرے پاس کوئی کھیت نہیں! میں بوڑھا ہو گیا لیکن بیلوں کی ایک جوڑی خریدنے کی تمنا اب بھی میرے دل میں اُسی طرح ہے جیسے — کسی معصوم بچے کو چاند چھونے کی آرزو!

بیروزگار۔ سب کی کہانی ایک ہی ہے۔ صرف عنوان مختلف ہیں۔

مہاجر۔ تم؟ میرا مطلب ہے تم؟

بیروزگار۔ میں — میں آپ دونوں سے بہت چھوٹا ہوں۔ میرا اور آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پھر بھی — پھر بھی میں کہوں گا کہ قسمت نے میرے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا مذاق کیا ہے۔ جب میں ہوش سنبھالا (چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا ہے) ہاں جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے ملک کی فضا میں انقلاب کے نعرے گونج رہے تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد ہو جانے کی لگن تھی جو ہر انسان کے دل میں تھی۔ اور پھر مجھے اس چھوٹی سی عمر میں وہ دولت مل گئی جس کی تمنا اپنے دل میں لئے میرے آبا و اجداد مر گئے تھے۔ ہمیں آزادی مل گئی۔ وقت کی ڈور پکڑ کر میں عمر کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اور آج —

کسان۔ آج؟

بیروزگار۔ آج اس بات کو پورا ایک سال ہو گیا کہ اپنی تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوں! شہر شہر، قصبہ قصبہ میں نے

ملازمت کی تلاش کی، اپنے اس ملک میں جسے صدیوں
کی غلامی کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن ....

مہاجر۔ تو تمہیں نوکری نہیں ملتی؟

بیروزگار۔ میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے نا۔ میں رشوت نہیں
دے سکتا تھا۔ مجھے نوکری کیسے ملے؟ (تینوں مایوسی سے
ایک دوسرے کے چہروں کو تکتے رہتے ہیں) تمہیں گھر نہیں
ملا، تمہیں کھیت نہیں ملا، مجھے نوکری نہیں ملی! ہم کس
قدر بدقسمت ہیں! (بڑے جوش کے ساتھ) ہم نے اندھیرے
کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ہم تاریکیوں کی گود کے پالے ہوئے
ہیں۔ ہم ظلمتوں .. (اچانک شاعر داخل ہوتا ہے۔ اس
کے بال بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ باہر بارش اسی طرح ہو رہی
ہے لیکن آنے والے کا لباس خشک ہے)

شاعر۔ بس خاموش رہو۔

دوسرے۔ (تعجب سے) کون؟ تم کون ہو؟

شاعر۔ میں بہت دیر سے تمہاری گفتگو سن رہا ہوں۔ تم سب یا
تو پاگل ہو یا احمق۔

بیروزگار۔ لیکن تم کون ہو؟

شاعر۔ شاعر

کسان۔ تم شعر کہتے ہو؟

شاعر۔ نہیں۔

مہاجر۔ (ہنستا ہے) تم کیسے شاعر ہو؟

بیروزگار۔ ایسا ہی شاعر جیسے یہ کسان ہے لیکن اس کے پاس نہ
کھیت ہیں نہ بیلوں کی جوڑی۔

مہاجر۔ (مسکرا کر) تو تم شعر کیوں نہیں کہتے شاعر؟

شاعر۔ کس کے لئے کہوں؟ (بیروزگار کی طرف اشارہ کر کے) اس نے
بالکل ٹھیک کہا۔ میں ایسا ہی شاعر ہوں جیسا یہ کسان ہے۔
میں نے تم سب کی کہانیاں سنی ہیں۔ میں دیر سے اس دیوار
کے پیچھے کھڑا تم لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اسی لئے تو میرے
بھیگے ہوئے کپڑے خشک ہو گئے ہیں تو دوستو میری کہانی بھی
تم سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں مایوس
نہیں ہوں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔

کسان۔ کاہے کا؟

شاعر۔ انقلاب کا!

بیروزگار۔ جو کبھی نہیں آئے گا۔

شاعر۔ نہیں جو ضرور آئے گا اور جب وہ آئے گا تو (کسان سے)
تمہیں تمہارے کھیت واپس مل جائیں گے (مہاجر سے) تم
اپنا کھویا ہوا گھر پالو گے (نوجوان سے) تمہیں ملازمت
مل جائے گی۔ اور پھر میں گیت لکھوں گا۔ انقلاب کا گیت!
عوام کے گیت!

مہاجر۔ (مایوسی) کے ساتھ یہ محض شاعری ہے!

شاعر۔ نہیں یہ شاعر کا تخیل ہے ــــ ایسا تخیل جو حقیقت کا روپ
دھار کر جلد ہی تمہارے سامنے آجائے گا۔

بیروزگار۔ دن بدل جائیں گے؟

شاعر۔ ہاں۔

مہاجر۔ مجھے میرا گھر مل جائے گا؟

شاعر۔ ہاں۔

کسان۔ مجھے میرے کھیت مل جائیں گے؟

شاعر۔ ہاں، انتظار کرو۔ انتظار کرتے رہو۔ جب رات کا اندھیرا
بہت بڑھ جائے تو صبح ہو جاتی ہے۔

مہاجر۔ اندھیرا۔ (پتھر پر رکھی ہوئی دونوں موم بتیاں بھڑک کر
گل ہو جاتی ہیں۔ اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پس منظر
میں بارش کے صوتی اثرات اسی طرح جاری رہتے ہیں)

سب۔ اندھیرا ــــ اندھیرا!

شاعر۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ہاں اندھیرا ہو گیا۔ لیکن یہ اندھیرا
عارضی ہے۔ صبح ضرور ہو گی۔ بادل چھٹ جائیں گے اور
سورج طلوع ہو گا۔ اور پھر میں اس طلوع ہوتے سورج
کی چمکیلی دھوپ میں بیٹھ کر گیت لکھوں گا۔ ابھرتے ہوئے
سورج کا گیت، طلوع ہوتی ہوئی صبح کا گیت!

مہاجر۔ بارش بند نہیں ہوئی۔ اور اب کوئی موم بتی بھی نہیں!

کسان۔ اور رات بہت باقی ہے۔

بیروزگار۔ اور اندھیرا بڑا مہیب ہوتا جا رہا ہے!

شاعر۔ (قہقہہ لگاتا ہے) اندھیرا۔ اندھیرے سے نہ ڈرو ساتھیو!
اندھیرے کی کوکھ سے جنم لینے والی صبح کا انتظار کرو ــــ
(جس سمت سے آیا تھا اسی سمت کو لوٹ جاتا ہے۔ آواز

آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے) انتظار کرو۔ انتظار کرتے رہو۔ (پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

دوسرا منظر

وقت۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد

مقام۔ وہی پرانی حویلی کے کھنڈرات

جب پردہ اٹھتا ہے تو حویلی کے دالان میں چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ پس منظر میں نیلا آسمان چمک رہا ہے۔ دالان کی ایک منڈیر پر شاعر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ مشرقی جانب سے بوڑھا کسان آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور چتکبرے بچھڑوں کی جوڑی کو ہانکتا چلا آ رہا ہے۔ دالان کے سامنے آ کر وہ بچھڑوں کو روکتا ہے۔ پھر مسکرا کر شاعر کی طرف دیکھتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے۔

کسان :۔ تم گیت لکھ رہے ہو؟

شاعر :۔ (چونک کر) کون ۔۔ کون ہو تم!

کسان :۔ مجھے پہچانا نہیں تم نے؟

شاعر :۔ مجھے کچھ کچھ خیال ہے ۔ تمہیں دیکھا ہے کہیں

کسان :۔ کوئی طوفانی رات یاد کرو۔ جب تم بارش سے بچنے کے لئے اس حویلی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ تقریباً ایک سال پہلے۔

شاعر :۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ اور یوں بھی رات کے اندھیروں میں ملنے والے جب صبح کی روشنی میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں ہیں۔

کسان :۔ تم سچ مچ شاعر ہو (پلٹ کر دوسری طرف دیکھتا ہے) ارے یہ کون آ رہا ہے؟

شاعر :۔ کوئی مسافر ہوگا (آنیوالا قریب آ جاتا ہے۔ یہ وہی مہاجر ہے لیکن اب اس کے چہرے پر اضطراب کی جگہ سکون نے لی ہے)

کسان :۔ آؤ آؤ میرے بھائی!

مہاجر :۔ ارے! یہ بھی یہاں موجود ہے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہم آج پھر مل گئے۔

کسان :۔ لیکن ہمارا ایک اور ساتھی آج موجود نہیں ہے۔ جانے کس حال میں ہوگا بیچارہ (موڑ سے نوجوان کی آواز آتی ہے وہ دوڑتا ہوا اسٹیج کی مشرقی جانب سے حویلی کے دالان میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بال ترشے ہوئے ہیں اور وہ سفید پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے ہے)

نوجوان :۔ میں آ گیا، میں آ گیا دوستو!

کسان :۔ تم نے میرے بیلوں کی جوڑی دیکھی (بچوں کی طرح کلکاریاں مارتا ہے) یہ دیکھو یہ میرے بیل ہیں جن سے میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاؤں گا۔

نوجوان :۔ تمہارے کھیت؟

کسان :۔ ہاں مجھے میرے کھیت مل گئے، میری زمین مل گئی، میری قسمت بدل گئی۔

مہاجر :۔ اور تم نے میرا نیا گھر دیکھا ہے (بیقرار سا ہو کر) بالکل ویسا ہی گھر، میرا وہی گھر جو کھو گیا تھا۔ تم نے نہیں دیکھا نا؟ میرے ساتھ چلو میں تمہیں دکھاؤں گا (اور جیب سے ایک پڑیا نکالتا ہے) اور تم جانتے ہو اس میں کیا ہے۔ نیلا رنگ! میں اپنے گھر کی چہار دیواری پر نیلا رنگ کراؤنگا۔ اور تمہیں معلوم ہے میرے چھوٹے بچے نے کل اس کے کچے آنگن میں نیم کا ایک پودا لگایا ہے۔ اور ڈیوڑھی کے سامنے بہت سی چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا دی ہیں!

نوجوان :۔ مبارک ہو تمہیں تمہارا نیا گھر اور تمہیں تمہارے کھیت اور بچھڑوں کی یہ جوڑی!

کسان :۔ مگر تمہاری ملازمت کا کیا بنا؟

نوجوان :۔ مجھے ملازمت مل گئی۔ اب میں بے روزگار نہیں ہوں۔ میں اپنی ملازمت پر قریب کے گاؤں میں جا رہا ہوں۔

مہاجر :۔ کیا کام کروگے تم؟

نوجوان :۔ مجھے گاؤں کے رہنے والوں کو ایک بڑا اہم منصوبہ سمجھانے کا کام سپرد ہوا ہے۔ یونین پنچایتیں کیا ہیں اور کیا کریں گی۔ ہماری انقلابی حکومت نے بنیادی جمہوریتوں کا منصوبہ کیوں بنایا۔ یہی اور اسی قسم کی اطلاعات اور تفصیلات سمجھانا میرا کام ہوگا۔

کسان :۔ ہم سب خوش قسمت ہیں۔ لیکن تم میں سے کسی نے بھی اس کا حال نہیں پوچھا (شاعر کی طرف اشارہ کرکے) یہ وہی شاعر ہے جس نے اس رات انقلاب کی پیشینگوئی کی تھی اور اب یہ ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کرتا ہے!

نوجوان :۔ شاعر! (شاعر سر اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھتا ہے) تم مجھے پہچانتے ہو نا شاعر؟

شاعر :۔ میں کسی کو نہیں پہچانتا!

نوجوان :۔ بتاؤ کون ہوں میں؟

شاعر :- مسافر، جو چند لمحوں کے لئے بستانے اس پرانی حویلی
کے دالان میں آ بیٹھتا ہے۔

نوجوان :- بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ؟

شاعر :- نہیں۔

مہاجر :- شاعر! مجھے میرا گھر مل گیا (شاعر خاموش رہتا ہے)

کسان :- مجھے میرے کھیت مل گئے شاعر! (شاعر خاموش رہتا ہے)

نوجوان :- تم کیا کر رہے ہو شاعر؟

شاعر :- میں شعر لکھ رہا ہوں

نوجوان :- کس کے متعلق ؟

شاعر :- اس کے کھیتوں کے متعلق، اس کے نئے گھر کے متعلق
اور اس منصوبہ کے متعلق جس کے لئے تم کام کر رہے ہو۔

نوجوان :- مگر تم تو ہمیں پہچانتے بھی نہیں ؟

شاعر :- اس سے کیا ہوتا ہے ؟ میں تمہیں نہیں جانتا تو کیا ہوا۔ ان
کھیتوں کو جانتا ہوں جو اس کے ہیں، اس گھر کو جانتا ہوں
جس کا یہ مالک ہے، اس منصوبہ سے واقف ہوں جس
کے لئے تم کام کر رہے ہو۔ میں انہیں کے متعلق لکھنا ہوں
چونکہ یہ سب زندہ رہیں گے۔ تم مر جاؤ گے اور یہ زندہ
رہیں گے!

مہاجر :- لیکن شاعر ـــ

شاعر :- میرا وقت برباد نہ کرو۔ مجھے گیت لکھنے دو۔

کسان :- مگر شاعر۔

شاعر :- اگر تم اسی طرح باتیں کرتے رہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

نوجوان :- (کسان اور مہاجر سے) اسے تنگ نہ کرو، اسے کام
کرنے دو۔ اس کا کام ہم سب سے اہم ہے۔ اسے
سکون کی ضرورت ہے۔ صدیوں بعد اسے سکون ملا ہے
اسے تنگ نہ کرو۔ آؤ ہم یہاں سے چلیں۔ اسے کام کرنے دو
(تینوں شاعر کی طرف دیکھتے ہیں جو اسی طرح منڈیر پر بیٹھا
گیت لکھنے میں مصروف ہے۔ اور پھر حویلی کے دالان
سے نیچے اتر کر ایک طرف چل دیتے ہیں۔ شاعر سر اٹھا کر
دور جاتے ہوئے تینوں آدمیوں کی طرف دیکھتا ہے۔
اور اس کے ہونٹوں پر بڑی میٹھی مسکراہٹ پھیل جاتی
ہے ـــ پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

اوفو کراچی، دسمبر ۶۵۹

رپورتاژ:

اجالے کی طرف

عنایت اللہ

۲۳۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح طلوع ہو چکی تھی۔

اس صبح میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ قید کا ایک اور دن شروع ہو چکا تھا۔ اس صبح میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ کوئی دلکشی بھی نہیں تھی۔ زنداں کی ہر صبح کی طرح یہ بھی عام قسم کی صبح تھی۔ قیدیوں کی بارکوں اور کوٹھڑیوں کے دروازے کھل چکے تھے اور وہ روزمرہ کی مشقت پوری کرنے، جوڑی جوڑی، جیل کے کارخانے کی طرف جا رہے تھے۔ سر جھکے ہوئے تھے۔ جیسے ضمیر نے کوئی ناگوار سا بوجھ بڑی مشکل سے اٹھا رکھا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ، نہایت ہی آہستہ چلے جا رہے تھے۔ جیسے اسی کوشش میں ہوں کہ وقت آگے نکل جائے اور وہ پیچھے رہ جائیں۔ سامنے جیل کی دومنزلہ ڈیوڑھی پر پاکستان کا سبز جھنڈا عجب شانِ بے نیازی اور معصومیت سے اکتوبر کی خنک ہواؤں سے کھیل رہا تھا۔

قیدیوں کے انبوہ میں سے کچھ چہرے اوپر کو اٹھے۔ نگاہوں نے غیر ارادی سے انداز میں جھنڈے کو دیکھا اور نگاہیں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پتھروں کی اونچی دیواروں میں وہی روزمرہ والی، صدیوں پرانی، ہیبت تھی۔ ان کی بلندی وہی تھی اور اس بلندی کا نفسیاتی اثر وہی تھا۔ باہر کی دنیا کی گہما گہمی کی مختلف آوازیں ، ملوں کی طرف مزدوروں کے بھاگتے ہوئے قیدیوں کی آوازیں، ان کے آزاد قہقہے، سائیکلوں کی گھنٹیاں اور کسی ہوٹل کے لاؤڈ سپیکر کے اُگلے ہوئے فلمی گانے جیل کی فضا میں سے تیرتے ہوئے گزر رہے تھے جس طرح صحرا کے اوپر سے بادلوں کے ٹکڑے بن برسے اڑے جا رہے ہوں۔ یہ آوازیں چند ہی قدم سے آ رہی تھیں جیل کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی سڑک اور قریبی آبادی سے — لیکن ان دیواروں کا نفسیاتی اثر یہ تھا جیسے یہ آوازیں قیدیوں تک کوسوں دور سے — برسوں دور سے — آ رہی تھیں، افق کے اس پار سے۔

قیدی روزمرہ کی مشقتوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کے کام کرنے کے انداز میں کام کم اور مصروفیت زیادہ تھی۔ وہ کام سے کم اور وقت سے زیادہ نبرد آزما تھے۔

کوئی تین ماہ سے یہ افواہیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ یوم انقلاب کے موقع پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ قیدی کی زندگی میں خوشگوار افواہ کو اسی قدر دخل ہے جس قدر پیاسے صحرا نورد کی مسافت میں سراب کو۔ تھکا ہارا، پیاس کا مارا مسافر فریب کے تعاقب میں طویل، بہت ہی طویل مسافت طے کر جاتا ہے۔ پانی ملتا تو نہیں، نظر تو آتا رہتا ہے۔ افواہیں بے بنیاد ہی سہی لیکن قیدی ان کے نیچے بنیادیں خود تعمیر کر لیتے ہیں۔ آزاد دنیا میں افواہ پروپیگنڈا یا عملی مذاق کی خاطر پھیلائی جاتی ہے لیکن جیل میں افواہ پھیلانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وقت کو کسی فریب یا جھوٹی سچی امید سے بہلا کر چلتا کیا جائے۔ جب افواہ جیل میں گھومتی ہے تو قیدی اپنی اپنی امید، ابتلا اور عقل کے مطابق اس میں قطع و برید اور ترمیم کر کے اسے قابل یقین بنا لیتے ہیں۔ ان کی ایڈیٹنگ قابل تحسین ہوتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ افواہ کا مصنف اکثر خود بھی اپنی ہی پھیلائی ہوئی افواہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ایک افواہ مکمل طور پر ٹھنڈی ہو جائے اسی میں سے ایک اور شوشہ نکلتا ہے جو ایک اور افواہ کے روپ میں ہوا کی طرح جیل بھر میں گھوم جاتا ہے۔ اور اس طرح قیدی اپنے آپ کو امیدوں، جھوٹی تسلیوں اور افواہوں پر زندہ رکھتے ہیں۔

اب عام معافی کی افواہ جو پھیلی تو ہر ایک قیدی نے اسے مصدقہ خبر کا درجہ دے دیا اور اس میں نت نئے اضافے کرنے لگے۔ سرکاری طور پر قیدیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، عادی اور اتفاقیہ۔ لیکن عام معافی کی افواہوں نے قیدیوں کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک

مارشل لا، سے پہلے کے سزا یافتہ اور دوسرے مارشل لا کے نفاذ کے بعد کے ـــ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افواہوں میں یہ ترمیم ہوگئی تھی کہ، راکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد کے سزا یافتہ قیدیوں کو کوئی معافی نہیں ملے گی کیونکہ ان کے مقدمات دیانتدارانہ، غیر جانب دارانہ اور منصفانہ فضا اور ماحول میں سنے اور پرکھے گئے ہیں لیکن مارشل لا، سے پہلے کے قیدیوں کے متعلق انقلابی حکومت کو یقین ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور اُن کے مقدمات میں سیاسی شعبدہ بازیاں کارفرما رہی ہیں۔ بہت سارے بے گناہ آدر بیشتر کی سزائیں جرائم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ قیدیوں کا خیال تھا کہ نئی حکومت معاشرے کے کونے کونے کو چھان رہی ہے۔ لہٰذا قیدیوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

اگست کے آخر تک عام معافی کی اس افواہ کو قیدیوں نے "سرکاری اطلاع" کا درجہ دے دیا تھا۔ جیل کے اندر اخباروں کی مانگ بڑھ گئی تھی اور اَن پڑھ قیدیوں نے لکھے پڑھے قیدیوں سے اخباریں پڑھوا پڑھوا کر ادھ موا کر دیا تھا۔ ہم "بی کلاس" کے قیدیوں کو ہر قدم پر اس سوال کا جواب دینا پڑتا تھا۔ "بابو صاحب! کوئی نئی خبر؟" میں نے ایک دن قیدیوں کے ہجوم میں بیٹھے کہہ دیا ـــ "ارے جاہلو! یہ محض افواہیں ہیں۔ ابھی کوئی سرکاری اطلاع نہیں آئی" میرا یہ کہنا تھا کہ قیدی جیسے مجھ پر ٹوٹ پڑے ـــ

"بابو صاحب" ایک نے کہا۔ "آپ کو یوں نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ آپ تو تعلیم یافتہ ہیں آپ نے مارشل لا، کی توہین کر دی ہے"

ان پندرہ بیس قیدیوں نے (جن میں سوائے ایک دو کے اَن پڑھ تھے) مجھے قائل کر لیا کہ "جنرل ایوب قیدیوں کو نہیں بھولے گا" یہ سب مارشل لا، سے پہلے کے سزا یافتہ تھے۔ جب وہ مجھے یکے بعد دیگرے اپنے دلائل دے رہے تھے تو مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر ان قیدیوں کو نظر انداز کر دیا گیا تو بے انصافی ہوگی۔ گو مجھے امید تھی کہ قیدیوں کی توقعات کے مطابق ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا لیکن میں اپنے طور پر سوچ رہا تھا کہ اگر، راکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی اس سیاست گزیدہ مخلوق کو انقلابی حکومت نے بھی نظر انداز کر دیا تو؟ جب یہ قیدی مجھ پر دلائل کی بوچھاڑ کر رہے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک ہجوم میں کھڑا سنگسار کیا جا رہا ہوں۔ وہ تیزی سے، غصے سے اور بلند آواز سے بول رہے تھے ـــ "تم کیا سمجھتے ہو بابو کہ میں جو عمر قید بھگت رہا ہوں کیا میں واقعی قاتل ہوں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"قاتل کوئی اور تھا۔ گاؤں جانتا ہے کہ قاتل نمبردار کا بیٹا تھا لیکن جھوٹی گواہیوں، بناوٹی مشیر ناموں اور فرضی برآمدگیوں کے جال میں مجھے الجھا کر عمر قید دلائی گئی ...." اس پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ گھونٹ سا نگل کر بولا۔ "میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں نے گھر اور اپنی برادری کی پرچیاں فلاں ممبر کے نام نہیں ڈالی تھیں۔ میرے گھر کی پانچ پرچیاں تھیں اور برادری کی چالیس" اس کے بعد جب اس نے اس داستانِ خونچکاں کی تفصیلات سنائیں۔ تو کئی بار جی چاہا کہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، روک دوں اُسے کیونکہ وہ بول رہا تھا اور میرے اعصاب متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں قانون کی شاہ رگ سے خون ٹپک رہا تھا۔

"میں ایک ہی نہیں بابو!" اُس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر چونکا دیا۔ "پاکستان کی تمام جیلوں میں جا کے کال کوٹھڑیوں اور بارکوں کو نہ دیکھو۔ قیدیوں کے سینے چیر کے دیکھو۔ میں ایک ہی نہیں جانے کتنے بے گناہوں کو اُن لیڈروں اور وزیروں نے پابہ زنجیر کر کے ان کے بچوں کو بھوکا رلایا ہے اور ان کی عورتوں کی کسمپرسی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، پرچیوں والے جرم، میں کون جانے کتنے 'مجرموں' کو پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔ بعض بھلے مانس اور شریف لوگوں کو ڈکیتی اور اغوا وغیرہ کے جھوٹے مقدموں میں گرفتار کر کے سالہا سال کے لئے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے"

"مارشل لا کیوں لگایا گیا ہے؟" ایک اور قیدی نے اشتیاق سے پُر لہجے میں پوچھا ـــ "فرعونیت کو ختم کرنے کے لئے" دوسرے قیدی نے جواب دیا۔

"ہم جو بھگت چکے ہیں۔ بھگت چکے ہیں ...." ایک اور نے کہا۔ "اب انصاف کا وقت آگیا ہے۔ ہمیں اس یوم انقلاب پر رہا کر دیا جائے گا"

"یہ حکومت خدا اور قرآن کی ہے"

اور ایک قیدی جسے میں شکل و شباہت کی مطابقت سے بدّھو سمجھ رہا تھا، بولا "ہم یقیناً بخشے جائیں گے بابو صاحب! کیونکہ ہم 'طلوعِ اسلام' سے پہلے کے لوگ ہیں۔"

اور میں بھی عام معافی کی افواہ کو سچ ماننے لگا۔ میرے پاس صرف ایک دلیل تھی وہ یہ کہ ان مظلوم محبوسین کو جس ضربِ کلیم کا انتظار تھا اس کا دھماکہ انھوں نے ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سن لیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ان قیدیوں کا انقلابی حکومت پر یہ اعتماد کہ "جنرل ایوب ہمیں نہیں بھولے گا" مجھے قائل کر رہا تھا کہ یہ خبر گو افواہ ہے لیکن اس میں جان ہے، اس کے نیچے بنیادیں ہیں اور اس میں خدا کا ہاتھ بھی ہے۔

مارشل لا، سے پہلے کے قیدی مطمئن تھے لیکن ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے بعد کے سزا یافتہ سر جھکائے ہوئے الگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایک حد تک مطمئن تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی۔ یا کم از کم انھیں یہ تسلّی تھی کہ انھیں اپنے گناہوں کی سزا ملی ہے اور سزائیں جرائم کی شدت و نوعیت کے مطابق ملی ہیں۔

ماہ ستمبر کے آخر تک جیلوں میں ہنگامہ بپا ہونے لگا تھا حالانکہ کسی طرف سے اس افواہ کی سرکاری تائید نہیں ہوئی تھی نہ کوئی جیل کا افسر تائید کی ذمہ داری لے رہا تھا لیکن قیدی جانے کہاں کہاں کے حوالے دے دے کر عام معافی کی افواہ کو سرکاری حیثیت دے رہے تھے۔ اکتوبر کے آغاز میں ایک اردو اخبار نے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے خبر شائع کر دی کہ انقلاب کی پہلی سالگرہ پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ لیکن خبر کا متن کچھ اس قسم کا تھا کہ اسے مصدقہ یا یقینی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا "معتبر ذرائع" کوئی قیدی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ بھی ہو اس خبر نے جیل میں وہ اودھم مچایا کہ قیدی رات بھر ناچتے اور گاتے رہے۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا: "سرکاری اعلان عنقریب کر دیا جائے گا" اور قیدیوں نے "عنقریب" کی انتہائی میعاد کا تعین شروع کر دیا۔ بعض نے کہا عنقریب کا مطلب ہوتا ہے ایک ہفتے تک۔ اور بیشتر دس روز کہہ رہے تھے۔ ایک قیدی نے منطق اور علم کے زور پہ دلیل دیتے ہوئے کہا۔ "گاؤں میں جب کوئی نزع کی حالت میں ہوتا ہے تو دوسرے گاؤں میں یوں اطلاع بھجوائی جاتی ہے کہ فلاں "موت القریب" (قریب الموت) ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطلاع بھجوانے کے فوراً بعد وہ مر جاتا ہے لہٰذا 'عنقریب' اور 'موت القریب' کی مدت میں اگر کچھ فرق ہے تو زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دن کا ہوگا۔" آخر قیدیوں نے سر جوڑ کے فیصلہ کیا کہ ایک ہفتے تک سرکاری اعلان ہو جائے گا۔

اب "عنقریب" کے انتظار کی تلخیاں شروع ہو گئیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دس دن بھی گذر گئے۔ "عنقریب" کی میعاد طویل تر اور عام معافی کی افواہیں گرم تر ہوتی گئیں۔ جب ۲۰ر اکتوبر تک کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا تو بعض چہرے مرجھانے لگے۔ مایوسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بعض قیدی بحث مباحثے میں الجھنے لگے۔ ایک وہ تھے جو مارشل لا، میں کیڑے نکالنے لگ گئے تھے اور زیادہ تعداد ان کی تھی جو ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔

"مجھے ایک بات کا جواب دو" یہ ایک قیدی کی آواز تھی۔ "ہمیں کیوں معاف کر دیا جائے؟ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو کیوں بخش دیا جائے؟ کیا ہم نے بھی کسی کو بخشا تھا؟" "لیکن تم تو بے گناہی میں دس سال کی سزا بھگت رہے ہو" دوسرے نے حیرت سے پوچھا۔ "تم ایسی بات کیوں کہتے ہو؟"

"میں پوچھتا ہوں چند بے گناہوں کی خاطر گناہگاروں کو بھی کیوں چھوڑ دیا جائے؟" اس نے متانت سے جواب دیا۔ "میں بے گناہ ہی سہی، مجھے مارشل لا، معافی نہ دے نہ سہی، میں صرف ایک بات پہ خوش ہوں کہ ملک سے بے ایمانی اٹھ گئی ہے اور مارشل لا، والوں نے پرچیوں کی منڈی بند کر دی ہے۔ میں خوش ہوں دوستو! میں بہت ہی خوش ہوں مجھے جس نے جیل بھجوایا ہے وہ آج خود مجرم ہے۔ پولیس ہتھکڑیاں لیے اس کے پیچھے گھوم رہی ہے۔ مارشل لا، والوں نے اس کی بادشاہی ہم مزارعوں پر بانٹ دی ہے..... اب آئے پرچی لینے!"

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ جیلوں میں بہت سے قیدی "الیکشن زدہ" تھے ہزارہا انسانوں کو "غلط امیدوار" کو ووٹ دینے

یا کسی حریف سیاسی پارٹی سے متعلق ہونے کے جرم میں پھانسا گیا اور انھیں سزائیں دلوائی گئی تھیں۔ گو اس وقت کے قانون میں ایسے کسی جرم اور دفعہ کا ذکر نہیں آتا لیکن تعزیراتِ پاکستان میں سیکڑوں اور دفعات جو موجود تھیں جسے جیل نہیں بھجوایا جاتا تھا اس کے پیچھے پٹواری کو ڈال دیا جاتا تھا۔ پٹواری کا بستہ مداری کی پٹاری سے کیا کم ہوتا ہے۔ اس میں سے جہاں جیتا جاگتا کبوتر نکل آتا ہے وہاں لوہے کے گولے اور سنگینیں بھی نکل آیا کرتی ہیں۔
۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو ختم ہونے والے دور میں بستے کی مسمریزم تھی۔

جیل میں قیدی ووٹوں کے نام سے یوں گھبراتے تھے جیسے بچے چیچک کے ٹیکے لگانے والے کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ ان حادثات کی تفصیلات بہت طویل ہیں اور بے حد تلخ۔ اُن پرچیوں پر جانے کتنی خونچکاں داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ مارشل لا سے پہلے کی دیگر دھاندلیوں کی صحیح اور مکمل تصویر دیکھنی ہو تو جیل میں جا کے دیکھئے۔ ایک ایک انسان اور انسان کا ایک ایک خط عریاں نظر آئے گا۔

جب بنیادی جمہوریت کی خبریں آنے لگیں تو میں نے بعض قیدیوں کو اداس اور یاس آلود لہجے میں کہتے سنا: "ہم خوش تھے کہ مصیبت ختم ہوئی، مارشل لاء والوں نے پھر ووٹوں کا قصہ اٹھا لیا ہے۔" وہ بنیادی جمہوریت کے نام کو صرف اس لئے ناپسند کرتے رہے کہ اس میں ووٹوں کا ذکر تھا لیکن انھیں انقلابی حکومت پر اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ مارشل لاء کی ہر چیز کو پسند کرنا چاہتے تھے۔ آخر انھوں نے 'بی کلاس' کے قیدیوں سے کرید کرید کر پوچھنا شروع کر دیا کہ 'بنیادی جمہوریت' کیا ہے۔ وہ اس میں اچھے پہلو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ پرچیوں کے مارے ہوئے اَن پڑھ دیہاتی قیدی ساری بات سمجھنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کر رہے تھے۔ وہ رہ رہ کے یہی سوال پوچھتے تھے۔ "کیا یہ پرچیاں پہلے کی طرح ڈالی جائیں گی؟ کیا دیہات میں پھر موٹر کاریں جائیں گی اور پرچیوں کی خاطر قرآن اور رسولؐ کے نام پہ جھوٹے وعدے دیئے جائیں گے؟ کیا اب بھی دیہاتیوں کو ڈرا دھمکا، بہلا پھسلا اور سبز باغ دکھا کر پرچیاں لی جائیں گی؟ کیا اب بھی پرچیوں پر برادریوں میں خون خرابے ہونگے؟ کیا اب بھی ووٹوں کے پیسے وصے جائیں گے جو وزارت بننے کے بعد ٹیکسوں اور دوروں کے ذریعے پورے کرلئے جائیں گے؟ کیا اب بھی جو آدمی اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دے گا رات اس کی گائے چوری ہو جائے گی؟"

"اور بابو صاحب! کیا پھر سَن چھپن والا جمہوریہ بن جائے گا؟"

"اور بابو صاحب! کیا مارشل لاء ہٹ جائے گا؟"

"یہ تو بہت بُرا ہوگا بابو صاحب!"

جب انھیں یقین دلایا گیا کہ ایسا نہیں ہوگا اور وہ جسے جی چاہے ووٹ دیں گے اور جسے ووٹ نہیں دیں گے وہ خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیگا، تو قیدیوں کے مرجھائے ہوئے چہرے مسرت سے کھِل اٹھے۔ ان میں جو بنیادی جمہوریت کے تصور اور افادیت کو سمجھ گئے وہ بہت ہی خوش اور مطمئن تھے اور جو نہ سمجھ سکے وہ اسی پہ مطمئن تھے۔ اور ان کے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔ کہ وہ اپنے ووٹ کا صحیح اور جائز استعمال کر سکیں گے اور بے خوف و خطر کر سکیں گے۔ ان کا کامیاب امیدوار پہلے کی طرح ہمیشہ کے لئے ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جائے گا بلکہ اس نئے طرزِ حکومت میں وہ کسی بھی وقت اپنے نمائندے کا گریبان پکڑ سکیں گے۔

"اور بابو صاحب! ۲۷ راکتوبر کو عام معافی ملے گی؟"

"بھئی! ابھی تو کچھ علم نہیں۔"

کھِلا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔

۲۰ راکتوبر کی صبح قیدیوں کے ہجوم میں کئی چہرے اداس تھے۔ 'عنقریب' کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ عام معافی کی سرکاری اطلاع نہیں آئی تھی۔

۲۳ راکتوبر کی صبح طلوع ہوئی۔ قیدی جاگ اٹھے تھے، امیدیں اونگھ رہی تھیں۔ قیدی روزمرہ کی مشقت پوری کرنے جوڑی جوڑی جارہے۔ سامنے پاکستان کا سبز جھنڈا بے نیازی اور معصومیت سے جھوم رہا تھا۔ قیدیوں کے جلوس میں سے کچھ چہرے ذرا اوپر

اُٹھے، نگاہوں نے غیر ارادی سے طور پر جھنڈے کو دیکھا اور نگاہیں جھک گئیں۔ یوم انقلاب میں صرف چار روز باقی تھے جن میں سے ایک نہایت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ عام معافی کی افواہ محض بے جان افواہ بنتی جا رہی تھی۔ ابھی تک سرکاری اعلان نہیں ہوا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا کہ جیل میں یکلخت ہڑبونگ مچ گئی۔ قیدیوں کی چیخوں اور نعروں سے جیل کی دیواریں اور سلاخیں ہلنے لگیں۔ قیدی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے اور پاگلوں کی طرح چیختے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جیل میں بغاوت ہو گئی ہے۔ جسے قابو میں نہ لایا جا سکے گا۔ معلوم ہوا ایک اردو اخبار نے چار کالمی سرخی دی ہے کہ انقلاب کی پہلی سالگرہ پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ اس معافی میں، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد کے سزا یافتہ بھی برابر کے شریک تھے لیکن یہ خبر بھی اسٹاف رپورٹر کی تھی۔ سرکاری اطلاع ابھی تک نہیں آئی تھی۔

شام قیدیوں کی گنتی ہو رہی تھی کہ ایک بار پھر جیل کے در و دیوار ہل گئے۔ وہ ادھم کہ جیل کے وارڈروں نے بھی گنتی چھوڑ کر لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ کسی نے آ کر خوش خبری سنادی تھی کہ دفتر میں سرکاری چٹھی آ گئی ہے۔ چٹھی میں لکھا تھا کہ دس سال سے کم والے جن قیدیوں کی سزا مع جیل کی معافی کے، نصف گزر گئی ہو انہیں ۲۷ اکتوبر کو رہا کر دیا جائے، سزائے موت کے قیدیوں کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی جائے اور جو قیدی ابھی نصف سزا پوری نہ کر چکے ہوں (عمر قید والے بھی) انہیں دو مہینے فی سال کے حساب سے معافی دی جائے۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو جیل کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ فضا سے یاس اور نا امیدی ڈھل چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہیبت ناک دیواریں اور سیاہ کالی سلاخیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ عجیب سرگرمی تھی۔ ساری جیل میں میلے کا سماں تھا۔ قیدی کھانا اور سونا تک بھول گئے تھے۔ جدھر دیکھو تین تین چار چار کی ٹولیاں بیٹھی یا کھڑی نظر آتی تھیں اور رہائی کے بعد کے پروگرام بن رہے تھے۔ کوئی بچوں سے جلد از جلد ملنے کے لئے بے تاب تھا تو کوئی سب سے پہلے سسرال پہنچنا چاہتا تھا۔ جن کی شادیاں قید کی وجہ سے التوا میں پڑی ہوئی تھیں ان کا رنگ ہی نرالا تھا۔ بعض کسی پیر فقیر کے مزار پر جانا چاہتے تھے اور کوئی سب سے پہلے "ایوب پارک" کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مارشل لاء کا شکریہ ادا کرنے کا یہ موزوں ترین طریقہ تھا۔ جن کے ابھی چار چار، پانچ پانچ سال باقی تھے اور وہ رہ جائیں گے جا رہے تھے وہ رہ رہ کے آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ اور ۷ اکتوبر ۵۸ سے پہلے کے سزا یافتہ قیدی جنہیں اپنے جرم کا بھی کوئی علم نہ تھا زار و قطار رو رو کر خدا، رسول اور انقلابی حکومت کی دریا دلی اور انصاف پسندی کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

سب سے زیادہ قابلِ غور عادی مجرم یعنی جرائم پیشہ تھے۔ میں نے ایسے تین چار قیدیوں سے بات کی تو اُن کا جواب دراَئندہ پروگرام سن کر حیران رہ گیا۔ تقریباً سب نے کہا۔ "جس نے ہم پہ مہربانی کی ہے ہم اس پر مہربانی کریں گے۔"

"مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"آج سے ہم جرائم کا پیشہ ترک کر رہے ہیں۔" انہوں نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "جب تک یہ حکومت قائم رہے گی ہم کسی گھر میں چوری نہیں کریں گے، نہ کوئی جیب کاٹیں گے۔" وہ اور کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انہیں سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کہیں۔ اظہار کی راہیں مسدود تھیں۔ اگر کوئی ماہر نفسیات ہوتا تو یہ دو ہی فقرے سن کر مجرم کی نفسیات اور اصلاح کے فلسفے کو تہہ کر کے رکھ دیتا۔

رہائی میں صرف دو دن باقی تھے لیکن گذرتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک قیدی کہہ رہا تھا "دو برس نہایت اطمینان سے گذار دئے ہیں، یہ دو دن مشکل سے گذر رہے ہیں۔" آخر ۲۷ اکتوبر کی صبح طلوع ہوئی۔ رہا ہونے والے قیدیوں نے نماز شکرانہ ادا کی اور انقلابی حکومت کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر جیل کے دو تو آہنی دروازے کھول دئے گئے اور قیدی "پاکستان زندہ باد" "فیلڈ مارشل ایوب خاں زندہ باد" "قائد اعظم زندہ باد" اور "انقلابی حکومت زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے باہر نکلے اور اس زندگی میں باعزت شہریوں کی طرح داخل ہو گئے جہاں اب انصاف ہے، مضبوط اور اٹل قانون ہے، جمہوریت ہے اور جہاں اب وہ ۷ اکتوبر ۵۸ سے پہلے والے دور کی بے اطمینانیوں اور بے انصافیوں کے خطرات سے آزاد ہوں گے۔

فارھنس تمام خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ!
اپنے دانتوں
اور مسوڑوں کو
صاف کرنے کے لئے...
فارھنس استعمال کیجئے۔
برش سے صرف دانتوں ہی کو صاف کرنا کافی نہیں۔آپ کا دنداں ساز آپکو بتائیگا
کہ مسوڑوں کی صفائی بھی اُتنی ہی اہم ہے۔پختہ مسوڑے صحتمند دانتوں کی بنیاد ہیں۔ہر روز
فارھنس سے اپنے دانتوں اور ساتھ ہی مسوڑوں کو بھی برش کے ذریعہ صاف
کرنے کی عادت ڈالئے۔اِس سے آپ کی مسکراہٹ میں وہ دلفریبی پیدا ہوجائے گی
جو آپ کی روزمرہ کی زندگی میں ایک نیا اعتماد پیدا کردے گی۔
اَب پاکستان میں آسانی کے ساتھ مِل سکتا ہے۔
بڑے سائز کا ٹیوب۔قیمت ۲ روپے ۲ر آنے۔چھوٹے سائز کا ٹیوب۔ایک روپیہ ۶ر آنے ۶ پائی۔
اِس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔
تیارکنندگان
ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
ویسٹ وھارف۔کراچی۔
ZWT
DS 1001
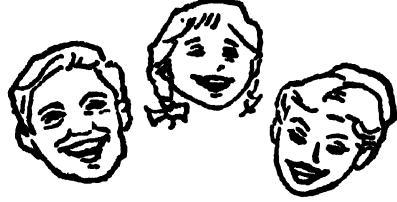
لہلہاتی کھیتیوں کے محافظ
جب کبھی فصل خراب ہوئی، کاشتکار نے "شومئی قسمت" کا گلہ کیا اور
یہ کبھی نہ سوچا کہ کم پیداوار کا باعث "شومئی قسمت" نہیں بلکہ
پودوں کی بیماریاں اور وہ مہلک کیڑے ہیں جو فصلوں کو تاراج کرتے ہیں۔
محکمۂ تحفظ نباتات کے دوش بدوش برماشیل نے بھی ان گنت تجربوں اور مظاہروں کے ذریعہ یہ بات کاشتکاروں
پر واضح کر دی ہے کہ "شیل ایگری کلچرل کیمیکلز" ہی ان کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے بہترین محافظ ہیں۔
پاکستان کیلئے غیر ملکی زر مبادلہ بچانے میں بھی شیل کی تجربہ گاہوں سے نکلی ہوئی مصنوعات کو بڑا دخل ہے کیونکہ یہی مصنوعات
کیڑوں کا قلع قمع کر کے فصلوں کو تباہ کاریوں سے بچا رہی ہیں اور اسطرح ملک میں غلہ کی پیداوار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا حصّہ ہے
BSP 7 59

جب سے امی نے مجھے
گلیکسو دینا شروع کیا ہے

زچگی کے بعد آپ کی
صحتیابی...

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس مکلوڈ روڈ - کراچی

مدیر: رفیق خاور

نئے دارالحکومت کو روانگی

ماہ نو

نومبر ۱۹۵۹ء

قیمت فی کاپی ۸۰ ـ

قدرت اللہ شہاب — احمد ندیم قاسمی — انور عنایت اللہ

جلیل قدوائی — صہبا اختر — طاہرہ کاظمی

یونس احمر — ضمیر اظہر — اشرف صبوحی

اللہ بخش یوسفی — شفیع عقیل — عبداللہ خاور

غذائیت سے بھرپور مفید ڈالڈا
آج ضرور لے کر آئیے !
جی ہاں ! میں ضرور لاؤں گا. مجھے معلوم ہے کہ بیگم کو
ڈالڈا برانڈ وناسپتی پر اتنا کیوں اصرار ہے. یہ واقعی ایک مفید غذا
ہے، کیونکہ یہ خالص نباتاتی روغنیات سے ماہرین کی زیر نگرانی انتہائی صفائی
اور احتیاط سے تیار کیا جاتا ہے' اور اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" بھی شامل کئے
جاتے ہیں. یہ ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار ہوتا ہے اور مہر بند ڈبوں میں خالص
اور تازہ دستیاب ہوتا ہے. بیگم کو ڈالڈا کی یہ سب خوبیاں معلوم ہیں' جبھی
وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ اتنی خوبیوں کے باوجود ڈالڈا کی قیمت بہت مناسب ہے'
اور یہ کم خرچ بھی ہے.
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے !
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
گذشتہ ایک پشت سے مشہور
ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے !

لاہور کی یہ شاندار مسجد آج تین صد سال گزر جانے کے بعد بھی اپنی عظمت اور خوبصورتی کے لحاظ سے لاثانی ہے۔ یہ پرشکوہ عمارت آثار قدیمہ کے ماہروں کی رائے میں فن تعمیر کی نزاکتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ شاندار عبادت گاہ اور علوم کا قدیم گہوارہ شہر لاہور کے لئے باعث فخر ہے۔ اس کا طرز عمارت و ساخت سیاحوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔

——اور اس وسیع و متنوع ملک میں آپ جہاں کہیں بھی سیاحت کو نکلیں گے آپ کا سفر نہایت خوشگوار رہے گا اور آپ کی موٹر کار بخوبی چلتی رہے گی اگر آپ کالٹیکس پٹرول و دیگر اشیا استعمال کریں۔
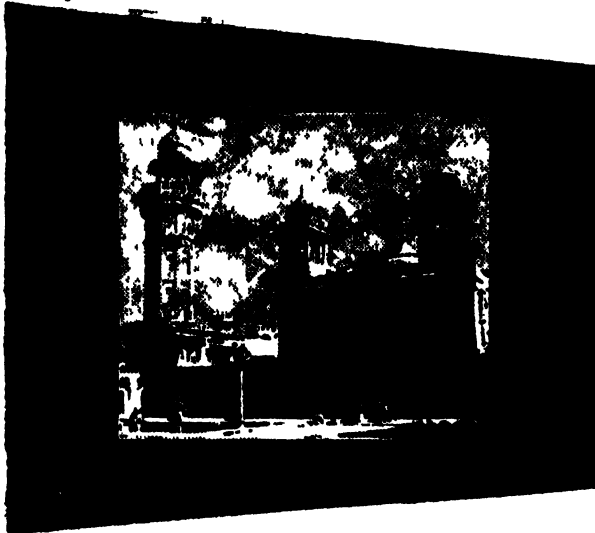
کالٹیکس کی بدولت سیاحت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے

جی ! میں کپڑے گھر ہی میں
دھوتی ہوں !
New
SUNLIGHT
SOAP
نئے سن لائٹ
سے یہ
اور بھی آسان ہو گیا ہے !
نئے سن لائٹ صابن میں ایک نیا
جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے جو سفید کپڑوں کو
پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور
رنگین کپڑے اور بھی خوشنما ہو جاتے ہیں آپ کے
تمام کپڑے نئے سن لائٹ صابن میں
دھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے
نیا سن لائٹ استعمال کیا جائے
تو کوٹنے پیٹنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا
مل جاتا ہے۔ بس آپ کپڑوں کو
نیا سن لائٹ لگا کر ذرا سا مل دیجئے
اور پھر نچوڑ ڈالئے ۔ لیجئے سارا میل نکل گیا،
اور کپڑے بلور کی طرح صاف و شفاف ہو گئے
نیا سن لائٹ صابن
نتھے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے !
S. 21—193 UD

جلد ۱۲

نومبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور   نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بنیادی جمہوریتیں

(صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان کے تاثرات)

•

جب تک ہمارے دل میں خدا کا خوف اور عوام کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک نہ ہم اچھے انسان بن سکتے ہیں نہ اچھے مسلمان اور نہ اچھے پاکستانی ہی۔ جب ہزاروں لاکھوں انسانوں نے جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دے کر اس ملک کو حاصل کیا تھا اس وقت ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ یہاں آکر صرف چند لوگ یا چند خاندان پھلیں پھولیں اور قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ یہ ملک آپ نے حاصل کیا تھا، یہ ملک آپ کے لئے بنا تھا۔ اس لئے آپ کو آگے بڑھنا، اسے چلانا اور زندہ رکھنا ہے۔ پچھلے سال جب انقلاب آیا تھا تو شاید کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال گزرا ہو کہ حکمرانوں کی ایک ٹولی چلی گئی، شاید اب یہ نئے لوگ ساری عمر حکومت پر قبضہ جمائے بیٹھے رہیں گے۔ مگر میں نے اسی روز آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ملک میں صحت مند اور اچھی قسم کی جمہوریت قائم کرنے کے لئے جلد از جلد اقدامات کئے جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اب انشاءاللہ بہت جلد اس سال کے آخر تک سارے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کر دیا جائے گا۔

بنیادی جمہوریتوں کا یہ نظام ہم نے دوسرے ملکوں کے تجربات اور اپنے ملک کے حالات دونوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا ہے۔ جمہوریت کے سلسلے میں ہمیں دوسروں کی اندھا دھند نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنے ملک کے حالات اور اپنے عوام کی افتادِ طبع کے مطابق کام کرنا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں میں ہم نے تین باتوں کو خاص طور پر مدّنظر رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ جمہوریت اوپر سے عوام کے سروں پر نہیں تھوپی جائے گی بلکہ اس کی بنیاد بالکل نیچے کی سطح سے شروع کر کے اوپر تک منزلیں تعمیر کی جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ عوام کو اپنا نمائندہ چننے کے لئے دور نہیں جانا پڑے گا۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر دیہات میں، تیس چالیس ہزار یا ایک لاکھ کی آبادی میں سے ایک اچھا نمائندہ چننا بہت مشکل ہے۔ ایسے انتخابات میں ایک عام رائے دہندہ کو اتنا تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ جس آدمی کو ووٹ دے رہا ہے، وہ ہے کیسا آدمی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے الکشنوں میں جو ووٹ پڑتے تھے وہ دباؤ یا ناواقفیت کی وجہ سے پڑتے تھے یا پھر ناجائز طریقوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے تھے۔ لیکن بنیادی جمہوریتوں میں ایسی کوئی بات قطعی ممکن نہیں ہوگی۔ اب صرف ہزار پندرہ سو آدمی ایک نمائندہ چنیں گے۔ اتنے چھوٹے سے حلقے میں لوگ ایک دوسرے کو ضرور جانتے پہچانتے ہوں گے۔ اور الکشن کے موقع پر ہر ایک کو معلوم رہے گا کہ وہ جس کو آدمی ووٹ دے رہا ہے وہ اچھا آدمی ہے یا برا۔ اس طریقے سے جو جمہوری نظام قائم کیا جائے گا وہ عوام کا حقیقی معنوں میں نمائندہ ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کی تیسری خاص بات، اور بڑی اہم بات، یہ ہے کہ اب جو کونسلیں قائم ہوں گی وہ سیاسی دباؤ اور دھواں دھار تقریریں کرنے والے سیاسیئین کے وجود سے آزاد ہوں گی، جو ماضی میں ہماری اسمبلیوں کی خصوصیت بن گئے تھے۔

اب جو کونسلیں تشکیل پائیں گی وہ اپنے دیہات یا وارڈ کی [illegible] عمل جماعتیں ہوں گی جو [illegible] کے ساتھ

ترقیات عامہ کے کام میں ہاتھ بٹائیں گی۔ ان کونسلوں کی خاص ذمہ داری ترقیات عامہ کے مسائل ہوں گے۔ ان کونسلوں کو جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں ان میں خاص طور پر صحت، تعلیم، زراعت، اور سماجی بہبود کے عملی کام ہیں۔ یہ بہترین ذریعہ ہے جس کے ذریعہ رائے عامہ کو حکومت سے اور عمال حکومت کو عوام سے نزدیک تر لایا جائے گا۔ اگر ان کونسلوں نے اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بخوبی سرانجام دیئے تو ملک کے ہر گاؤں اور ہر گاؤں کا باشندہ حکومت کے کام میں برابر کا شریک ہو جائے گا۔ عمومی تخمینہ یہ ہے کہ کوئی (۸۰۰۰۰) نمائندگان بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں کام کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے حکومت کی مشینری کے (۸۰۰۰۰) کل پرزے ہوں گے جو خود عوام مہیا کریں گے۔ اگر یہ مشینری بھی اب صحیح طرح کام نہ کرے — یعنی یہ کہ اس نوعیت کی جمہوریت بھی کامیاب نہیں ہوئی — تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے۔ مگر مجھے پکا یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ نظام ضرور کامیاب ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری بڑی حد تک اب خود آپ پر ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے اس لئے اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے کہ آپ پر اس نمائندہ یا اُس نمائندہ کو ہی ووٹ دینے یا نہ دینے کا دباؤ ڈالا جاسکے گا۔ یعنی انتخابات بالکل آزادانہ ہوں گے اور قطعی منصفانہ۔ کسی سرکاری افسر کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ الکشنوں پر اپنا اثر ڈال سکے۔ اس لئے اب یہ آپ کا اور صرف آپ کا کام ہے کہ ایسے نمائندے اپنے لئے چنیں جو دیانت دار ہوں، بے غرض ہوں اور خدمت خلق کے جذبہ سے ہی متاثر ہوں۔ اب آپ کو چاہیئے کہ ایسے آدمیوں کا انتخاب کریں جو آپ کی پرخلوص نمائندگی کرسکیں اور ان پر آپ جب بھروسہ کریں تو وہ اس بھروسہ پر پورا اتر سکیں۔

یونین کونسلیں جو اب بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت قائم کی جائیں گی وہ اس عظیم جمہوری نظام کا سنگِ بنیاد بنیں گی۔ یونین کونسلوں ہی سے نمائندے تحصیل کونسل اور تھانہ کونسل میں جائیں گے۔ اور اسی طرح ڈسٹرکٹ کونسلوں اور ڈویژنل کونسلوں میں۔ یہ نمائندے تمام ان کاموں میں جو تعمیر وطن سے متعلق ہوں گے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ یونین کونسلوں میں معاشرہ کے تمام مفید عناصر کو مناسب نمائندگی حاصل رہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں عوام اپنے حلقے سے نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہیں مگر وہ بوجہ تکلف آگے نہ بڑھیں یا انھیں یہ گمان ہو کہ اب بھی الکشنوں کا کھیل پرانے رنگ میں ہی ڈوبا ہوا رہے گا۔ ان بعض لوگوں میں خواتین بھی ہوسکتی ہیں جو زیادہ بہتر حالات میں واقع نمائندگان کے مقابلہ پر برابری کے ساتھ مقابلہ کرنے کے وسائل نہ رکھتی ہوں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یونین کونسلوں کو ایسے حضرات و خواتین کی موجودگی کے فوائد سے محروم نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے طریقۂ نامزدگی کا بھی اصول طے کیا ہے۔ مگر یہ بات بالکل [illegible] صاف سمجھ لینی چاہیئے کہ ان نامزدگیوں کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو یونین کونسلوں میں حکومت [illegible] بٹھایا جائے۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ جنھیں خصوصی علم و تجربہ ہو انھیں بھی ترقیات عامہ کے کاموں میں، جو ان یونین کونسلوں کے علاقوں میں کئے جائیں گے شریکِ کار کیا جاسکے تاکہ وہ بھی اس سلسلے میں مفید خدمت انجام دے سکیں۔

اب تک جو نظام حکومت چل رہا تھا وہ ورثہ تھا ایک غیر ملکی دور حکمرانی کا جو اس کے اپنے مقاصد کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ اس نظام کو اس طرح بدلنا ہے کہ وہ ہماری آزاد قوم کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ ہم درجہ بدرجہ مرکزیتِ اختیارات کو صوبوں، ڈویژنوں اور اضلاعی حکام کے سپرد کر رہے ہیں۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر ہر علاقے کے لوگوں کے اپنے مسائل وہیں کے وہیں حل ہو جایا کریں گے۔ لوگوں کو اپنے فوری اور بڑے ضروری مسائل کے حل کے لئے لاہور، راولپنڈی کراچی یا ڈھاکہ کے چکر لگانے اور دور دراز کے تکلیف دہ سفر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اب ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کے کمشنر صاحبان ہی اپنے اختیارات استعمال کریں گے اور اس سلسلہ میں ان نمائندوں سے مشورہ کرتے رہیں گے جو یونین کونسلوں کے واسطے سے ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کونسلوں میں آئے ہوئے ہوں گے۔

میں اس نظام جمہوریت کو جس قدر زیادہ اپنے ذہن میں سوچتا ہوں اتنی ہی مجھے یہ اُمید بندھتی ہے کہ میرے ملک کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ مجھے ان بنیادی جمہوریتوں میں اس بات کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ عوام اپنی بھلائی اور فلاحِ ملک کے کاموں میں اپنے حق کو صحت مندانہ اور مفید طریقہ پہ پورا ہوتے دیکھ سکیں گے۔ لہٰذا ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کے اس نظام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

بنیادی جمہوریتوں کا قیام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک وسیلہ ہے ایک نصب العین کا۔ نصب العین ہے ملک کی تعمیرِ نو۔ جیسے ہی ملک میں بنیادی جمہوریتوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا ملک کی تعمیرِ نو کا کام دراصل شروع ہو جائے گا۔ ہم نے اس سال میں جو کچھ بھی کیا ہے دراصل تمہید ہے اُن بہت سے بڑے کاموں کی جنھیں ہمیں مکمل کرنا ہے۔

(اقتباس تقریر لائل پور ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

پاک جمہوریت
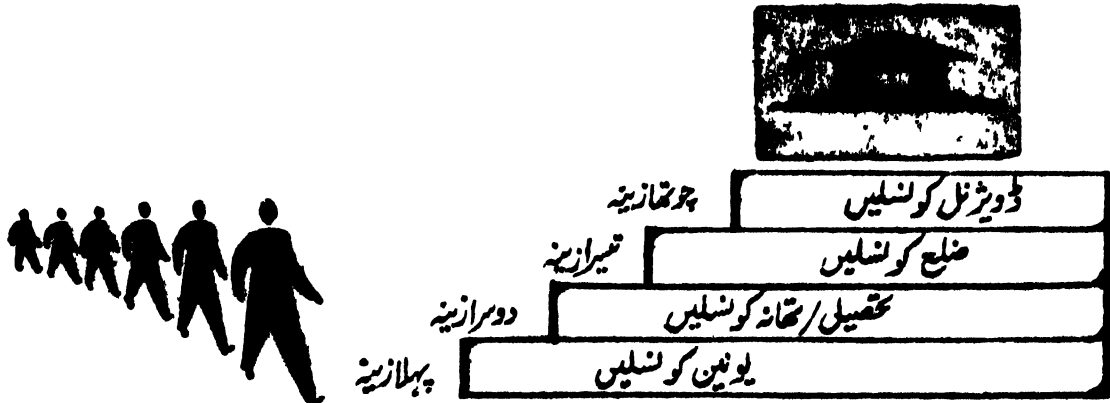
پرانی حویلی

صہبا اختر

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
یہی حویلی سنا ہے خوش رنگ و مشکبو تھی
یہی حویلی جو آج بوسیدہ ہو چکی ہے
سنا ہے اپنے مکین کی طرح خوبرو تھی
یہی حویلی کہ آج جز خاک کچھ نہیں ہے
سنا ہے آفاق میں کبھی اس کی گفتگو تھی
سنا ہے اِس کے دراز سائے نشہ اثر تھے
سنا ہے ہر خشت اِن در و بام کی سبو تھی
مگر لیاقت کے خون کے بعد یہ حویلی!
شہید خونیں کفن کی صورت لہو لہو تھی

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
اِسی حویلی میں رات کے شہریار کھیلے
اسی حویلی کے گوشۂ تیرگی میں چھپ کر
زمین کی قسمتوں سے جاگیردار کھیلے
اِسی حویلی کے ایک اک نقش مضمحل سے
ہزار، عزت مآب، دیوانہ وار کھیلے
اِسی حویلی میں چھپ کے جمہور کے شکاری
مرے وطن کی مسرتوں کا شکار کھیلے
اسی حویلی میں وہ سیاست سے کھیل کھیلا
کہ جیسے شطرنج گھر کی باندی سے زار کھیلے

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
ہمارے پرچم کی سربلندی پہ طعنہ زن تھی
وہ خستہ دیوار جس کے اندیشے لازمی تھے
شکستگیِ قریب سے خطرۂ وطن تھی

وہ موجِ زہراب جانے کتنوں کی موت بنتی
جو اس کی مسموم خواب گاہوں میں موجزن تھی

تھے اس کے اوراقِ شب پہ تحریر وہ اندھیرے
کہ جس سے پیشانیِ مورّخ بھی صد شکن تھی
مگر حویلی کی مرگ آشام ظلمتوں سے
الجھ پڑی وہ سحر کہ خود شعلہ پیرہن تھی

عطا ہوئی ہے اُسے بھی بارے زبان صہبا
وہ حلقۂ ملک دوست جو کم سخن رہا ہے
کسان، مزدور، اہلِ فن، علم دوست شہری
وطن سے بے لوث عشق جن کا چلن رہا ہے
وہ سب کے سب جمع ہو رہے ہیں نئے افق پر
نئے ستاروں کا حسن رہ رہ کے چھن رہا ہے
عوام، سلطانِ دورِ جمہورِ پاک ہوں گے
عوام، جن کو عزیز پیارا وطن رہا ہے
بہ تیشۂ عزم کہنہ جمہوریت کے بدلے
"چہار منزل" کا اک نیا قصر بن رہا ہے

★

صبحِ امید

محمد صادق شاذ

وہ پو پھٹی گجر بجا !
گجر کے ساتھ ہی وطن کا بختِ خفتہ جاگ اٹھا
مجاہدوں کے نعرہ ہائے پرخروش کی صدا!
سوادِ پاک سے اٹھی
فضاؤں میں بکھر گئی
حیات بے کراں سے تازہ دم مرا وطن ہوا
شباب کی رگوں میں خونِ گرم موجزن ہوا
پکارتا ہوا یہ وقت کا نقیب آگیا !
نشانِ منزلِ وطن بہت قریب آگیا !
خزاں گئی چمن کھلا
چمن کا ذرہ ذرہ نورِ زیست سے چمک اٹھا
خدا کا شکر ہے کہ دورِ انحطاط کٹ گیا
ہوا کا رُخ پلٹ گیا
غموں کا ابر چھٹ گیا
کہ ملتِ غیورِ پاک کو زعیم مل گیا
جو منتشر تھے اُن کو رہبرِ عظیم مل گیا
ہوا ہے ابر خیمہ زن
چمن میں کاروانِ شاہدِ بہار آگیا
وطن کے اوج پر وطن کا غمگسار آگیا
ہوائیں سنسنا اٹھیں
فضائیں مسکرا اٹھیں
وطن کی دل گرفتہ روح کو قرار آگیا !
وطن میں دورِ انقلابِ خوشگوار آگیا !

★

بنیادی جمہوریتوں کی چار منزلیں

اللہ بخش یوسفی

برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت ختم ہونے کے بعد ملت پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں اور وہ ہر طرح تہی دست اور تہی دامن ہو گئے۔ ترقی اور فلاح کی سب راہیں ان پر مسدود نظر آتی تھیں کہ سر سید نے افق پر نمودار ہو کر ملت کو صحیح رہنمائی دی اور اسے ترقی کی راہ پر ڈال دیا اور ملت کی کشتی کا پتوار اس طرح سنبھالا کہ یہ سفینہ ڈوبنے سے بچ گیا۔

ایک صدی تک ملت اپنی بقا کے لئے جدّوجہد کرتی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف محاذوں پر مخالف قوتوں سے نبرد آزما رہی۔ اس نے اپنی انفرادیت اور بقا کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کی اور جیسی جیسی کٹھن منزلیں اس نے طے کیں وہ تاریخ کا بڑا ہوشربا باب ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے قائداعظم کی انتھک اور مخلصانہ کوششیں اور ملت کا جوشِ عمل ایک نئے شعور کا سبب بنا رہا اور بالآخر پاکستان کے وجود میں ہمارا قومی نصب العین حاصل ہو گیا۔ لیکن بانئ پاکستان کے ذہن میں جو تصورِ حکمرانی تھا اسے اُن کی اچانک وفات کے باعث پوری طرح بار آور ہونے کی مہلت نہ مل سکی۔ صرف ایک قطعۂ ارض حاصل کر لینا بجائے خود اتنا بڑا مقصد نہ تھا جتنا یہ نصب العین کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی سرزمین میسر آئے جہاں کی قوم کے لئے ایک مامن اور ان کی ملی حیات اور معاشری و معاشی بہبود کا گہوارہ ہو، جہاں وہ اپنی قومی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں اور اپنی ثقافت کو محفوظ رکھ سکیں جہاں ہر فرد کو زندگی کے مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں، جہاں معاشری انصاف ہو اور زندگی صحیح اسلامی نہج پر گامزن ہو۔

قائداعظم کی وفات کے بعد عوام کو ترقئ وطن کے جذبے سے پُرخلوص لگاؤ باقی رہا لیکن اسی زمانے سے ایسے عناصر نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا جن کے سامنے نہ مفادِ ملت تھا نہ خدمتِ وطن کا جذبہ بلکہ سیاسی آدمیوں کی جنگ زرگری تھی یا معاشرہ کے دوسرے عناصر کی قوم دشمن سرگرمیاں جس نے ملک کو تباہ کر دیا اور ہم ساری دنیا کے لئے مایۂ تضحیک بن گئے۔ ملک کی اس بارہ سالہ تاریخ میں ہمیں اپنے "رہنماؤں" کی ان کوششوں کا نمونہ دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے صرف اپنی اغراض کے لئے کیں اور اُسے نام دیا گیا "جمہوریت" کا۔ وہ کروڑوں انسانوں کو اسی بنا پر فریب دیتے رہے اور ملک ہر شعبہ میں تباہ ہوتا رہا۔

مگر یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور پچھلے سال ۸ اکتوبر کو جب مؤذن میناروں سے اللہ کی بڑائی کا اعلان کر رہے تھے ایک نئی صبح اس ملک میں طلوع ہوئی۔ ایک مردِ مجاہد نے ملک کے افق پر نمودار ہو کر ان ابن الوقت زعماء کے ہاتھ سے اقتدار سلطنت چھین لیا اور اس قابلیت اور جرأت کے ساتھ کہ ایک قطرۂ خون بھی نہ بہنے پایا۔ یہ ایک انقلاب تھا پُرامن اور ہمہ گیر، مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل خلافِ معمول۔ اس انقلاب کا سہرا جنرل محمد ایوب خاں کے سر ہے۔ قیادت سنبھالتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ملک اہلِ ملک کا ہے۔ اور یہ عوام ہی کی ملکیت رہے گا۔ اس وقت جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف تطہیر کا عمل ہے اور جمہوریت (جو عوام کا فطری حق ہے) انہیں بہت جلد واپس مل جائے گی اس وعدہ پر وہ اپنے دوسرے وعدوں کی طرح، بالکل کھرے اور سچے ثابت ہوئے۔ چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا انہوں نے اعلان کر دیا ہے اور اس کے لئے انتخابات اور تشکیل کا عمل اب صرف چند روز کی بات ہے لیکن جمہوریتوں کے قیام سے قبل انہوں نے ملک کو ان تمام عناصر سے بھی پاک کر دیا جو جمہوریت کو عملاً بے معنی بنا رہے تھے۔ سیاسی جماعتوں کا خاتمہ، زمینداری کی تنسیخ اور معاشرے و انتظامیہ کی دوسری خرابیوں کو دور کر دینا ان کی دوراندیشی اور عملی سیادت کی روشن نشانیاں ہیں۔ کیونکہ زمینداروں کے چنگل، سیاسی آدمیوں کی ریشہ دوانیوں اور انتظامیہ کی تطہیر کے بغیر

صحیح جمہوری نظام کا کوئی بھی عمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔

اب اس سلسلہ میں یہ پوچھا جاتا ہے کہ پچھلے جمہوری نظام اور ان بنیادی جمہوریتوں میں فرق کیا ہے۔ یہ فرق بہت بڑا اور بنیادی ہے۔ "بنیادی جمہوریت" کے الفاظ بجائے خود انقلابی تصور کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جمہوریت کا آغاز اوپر سے شروع ہوتا تھا۔ اب اس تعمیر کا کام بنیاد یعنی عوام سے شروع کیا گیا ہے۔ بالخصوص دیہات کے عوام جو ملک کا ۸۰ فی صد حصہ ہیں اور پاکستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے مصداق ہیں۔ پہلے مکان کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے بعد اس کی بنیادیں بنانے کی سعی کی جاتی تھی! اب پہلے بنیادیں رکھی جائیں گی بعد میں اس پہ عمارت تعمیر ہوگی۔ سابقہ جمہوریت میں رائے دہندہ اپنے حالات سے مجبور تھا اور دوسروں کے اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ اب وہ آزادانہ طریقہ پر اپنی رائے کو استعمال کر سکے گا۔ زرعی اصلاحات اور دوسرے قوانین کے تحت چونکہ عوام کو زمیندار اور سرمایہ دار سے نجات مل چکی ہے اس وجہ سے اب اسے کسی کے اشاروں پر اظہار رائے کی ضرورت یا مجبوری باقی نہیں رہی اور رائے دہندگی چونکہ حق رائے دہی بالغان کے اصول پر ہوگی۔ اس لئے ملک کے ہر بالغ باشندہ کو اپنی سمجھ اور عقل سلیم کے مطابق اظہار رائے کا حق حاصل ہوگا اور وہ اسے آزادانہ استعمال بھی کر سکے گا۔

اس سلسلہ میں جنرل محمد ایوب خاں نے ۱۲ جون ۱۹۵۹ء کو بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا اعلان کر دیا ہے۔ اس جمہوری نظام کو انہی چار منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) **یونین کونسلیں**: ایک یا ایک سے زاید دیہاتی آبادیاں جن کے بالغوں کی تعداد ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک ہوگی۔ باہم مل کر اپنی یونین کونسل کے نمائندوں کا انتخاب کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر حلقۂ انتخاب میں رائے دہندگان ان لوگوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں گے جو کنبیت کے امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں گے۔ اب وہ بہ آسانی معلوم کر سکیں گے کہ امیدوار کس قابلیت و اہلیت کا مالک ہے اس کی گذشتہ زندگی کیسی گذری۔ اس کے عادات و اطوار کیا ہیں۔ اسے اپنے علاقہ یا رائے دہندوں اور ان کے مفاد سے کس قدر دلچسپی ہے۔ وہ ان کی نمائندگی کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اور ان کے حقوق و مفاد اس کے ہاتھ میں محفوظ رہ سکیں گے یا نہیں۔ اور اب رائے دہندگان چونکہ جدید اصلاحات کی برکت سے ہر طرح کی دھونس سے آزاد ہو چکے ہیں اور اب وہ کسی زمیندار، سرمایہ دار، یا جماعت کے سامنے بے بس و مجبور بھی نہیں اس وجہ سے آزادانہ اظہار رائے کا انہیں پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ ہر یونین کونسل دس ارکان پر مشتمل ہوگی۔

ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے افراد بھی ہوں جن کی قابلیت و اہلیت یا تجربہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو لیکن وہ لوگ انتخابات کی جھنجھٹ میں الجھنا پسند نہ کرتے ہوں۔ یا بعض خاص طبقے مثلاً مستورات، یا مزدوروں وغیرہ کی نمائندگی اس یونین میں نہ ہو سکتی ہو تو اس کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ چند نشستیں بذریعہ نامزدگی پُر کر دی جائیں گی۔ لیکن ان نامزدگان کی تعداد یونین کی کل تعداد کے ۱/۳ سے زائد نہ ہوگی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دس ارکان کی یونین کونسل میں صرف تین ارکان نامزد کئے جا سکیں گے۔ یہی یونین کونسلیں حقیقت میں بنیادی جمہوریتیں ہیں اور حکومت کی باقی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کی جائے گی۔ شہری آبادیوں کو بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ یہ کونسلیں اپنا صدر خود منتخب کیا کریں گی۔

(۲) **تحصیل یا تھانہ کونسلیں**: جب ابتدائی یا یونین کونسلیں بن جائیں گی تو مغربی پاکستان میں تحصیل وار اور مشرقی پاکستان میں تھانہ وار کونسلیں مرتب ہوں گی۔ ان کونسلوں کے لئے عام انتخابات نہ ہوں گے بلکہ یونین کونسلوں کے صدر ہی ان کے رکن متصور ہوں گے۔ اور جہاں میونسپل کمیٹیاں موجود ہوں گی وہاں ان کے صدر بھی رکن سمجھے جائیں گے۔ یہ کونسلیں بیشتر امور ترقیات عامہ سے متعلق ہوں گی اس وجہ سے ان کا تعلق ان محکموں کے افسروں سے بھی رہے گا۔ اس لئے حکومت نے اتحاد و یکجہتی اور باہمی طور پر مل جل کر کام کرنے کے خیال سے فیصلہ کیا ہے کہ ان کونسلوں میں ان محکموں کے افسروں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ تحصیل یا تھانہ کونسلوں میں امور ترقیات عامہ سے متعلق افسروں کو نامزد کیا جائے گا لیکن ان کی تعداد منتخب ارکان کے نصف سے زائد نہ ہوگی۔

(۳) **ضلع کونسلیں**: اس کے بعد تیسری منزل میں "ضلع کونسلیں" مرتب ہوں گی ان کونسلوں میں ضلعوں کی ترقیاتی پالیسیاں طے ہوں گی۔ اور چونکہ اس کام میں حکومت اور عوام دونوں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ اس لئے دونوں کے اراکین کی تعداد ان کونسلوں میں نصف نصف کی بنیاد پر رکھی جائے گی یعنی نصف سرکاری اور نصف غیر سرکاری یا عوامی نمائندے ہوں گے، اور جن میں یونین کونسلوں کے ارکان شامل ہوں گے۔

(۴) ڈویژن کونسلیں۔ اس سکیم کی چوتھی منزل ڈویژن کونسل ہوگی۔ جو ہر ڈویژن میں قائم کی جائے گی۔ اس کے اراکین میں بھی ضلاعی کونسل کی طرح سرکاری اور غیر سرکاری اراکین اسی نصف نصف کی نسبت سے ہوں گے۔ اور ہر ڈویژن کا کمشنر اپنی ڈویژن کونسل کا صدر ہوگا۔

اس طرح ابتدائی بنیادی کونسلیں جن کے سپرد انتظامی معاملات میونسپلٹی سے متعلق کام عدالتی اور پولیس کا نظام نیز ترقیات عامہ وغیرہ جیسے اہم امور ہوں گے۔ درجہ بدرجہ تحصیل ضلع یا ڈویژن کونسلوں میں دکھائی دینے لگیں گی۔ ان کے منتخب اراکین وہی ہوں گے جنہیں رائے دہندوں نے جان پہچان اور رسوخ سمجھ کر منتخب کیا ہوگا۔ اور جن کے ساتھ حکومت ایسے ہی افسروں کو نامزد کرے گی جو ہر حیثیت سے امور ترقیات عامہ اور قومی ترقی یا تعمیر نو میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ اور ہر یونین کونسل کو چند ٹیکس عائد کرنے کے بھی اختیارات دے دئے جائیں گے اور انہیں سرکاری مطالباتِ زر وصول کرنے کے اختیارات بھی حاصل رہیں گے یقین کیا جا سکتا ہے کہ یونین کونسلیں عوام کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوں گی اور ان پر تعمیر شدہ عمارت ملک و قوم کی ترقی کی مستقل ضمانت ہوگی۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ملک کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والوں نے اگر صدر مملکت یا پارلیمنٹ کے انتخابات کے لئے بالواسطہ طریقۂ انتخاب پسند کیا۔ تو ہو سکتا ہے انہی اداروں سے کام لیا جائے اور یہ بہت ہی موزوں حلقہ ہائے انتخاب قرار دئے جا سکتے ہیں۔

غرض اس طرح حکومت کے کاروبار میں شرکت کرنے کا ایک عملی موقع فراہم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ عوام کا کام ہے کہ وہ اس نظام سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی سعی کریں۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے حلقوں میں جو نمائندے چنیں انہیں اچھی طرح جانچ لیں۔ ان کو دیانت دار مفید خلائق اور مخلص محب وطن اور ملک و معاشرہ کے مفاد کا بے غرض امین ہونا چاہئے۔ صحیح لوگوں کے انتخاب پر ہی اس نظام کے کامیاب ہونے کا انحصار ہے اور یہ جمہوری نظام دراصل ایک بہت بڑے کام۔ یعنی ملک کی تعمیرِ نو کا سنگِ بنیاد ثابت ہوگا۔

★

"ماہِ نو" کی اشاعت خاص

جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

انقلابی حکومت کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ ملک میں سیاسی جماعتیں توڑنے کے بعد معاشرہ اور انتظامیہ کی تطہیر کی جائے گی اور اس کے بعد جمہوری نظام بحال کر دیا جائے گا۔ انقلابی حکومت نے یہ وعدہ پورا کر دکھایا اور آج ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کرنے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ تعمیرِ ملت کے اس اہم کام کی تفصیل عوام تک پہنچانے کے لئے "ماہِ نو" کی اگلی اشاعت ایک خصوصی اشاعت ہوگی جس میں بتایا جائے گا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور اس کی عملی شکل اس ملک کے لئے کس طرح موزوں ہے۔ اس کے بعد ملک کو دستوری نظام حکمرانی کے لئے کس طرح تربیت دی جائے گی اور ان اقدامات میں عوام کی بہبود اور ہمہ جہتی ترقی کے کیا کیا امکانات مضمر ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا جائے گا کہ جمہور کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا اور ہم ان سے کس طرح عہدہ برآ ہو کر ملک کو ایک فلاحی مملکت بنا سکتے ہیں۔ اس خصوصی اشاعت کے لئے مشتہرین اور ایجنٹ صاحبان فی الفور توجہ کریں۔ (ادارہ)

ادیب اور قومیت

قدرت اللہ شہاب

میں "ادیب اور قومیت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز دو حصّوں میں کرنا چاہتا ہوں:
پہلے تو میں پاکستان کے علاقائی و ثقافتی سیاق و سباق میں قومیت کی بنیاد و ہیئت کی تشریح کرونگا اور پھر اس سیاق و سباق میں ادیب کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو واضح کروں گا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہ کرنا چاہئے کہ اس تمام مدت کے دوران ہمارے پاس جس چیز کی سب سے زیادہ کمی رہی وہ ایک قوم نہ ہونے کا احساس ہے۔ غالباً دنیا میں ہمارا واحد ایسا ملک ہے جہاں جمہور کو اکثر یہ یاد دہانی کرنا ضروری ہوتا ہے کہ محب وطن ہونا اچھی بات ہے اور اس نیک مشورہ پر جمہور کچھ ناراضگی بھی محسوس نہیں کرتے ! - ان کے اس عجیب و غریب رویہ کی تاریخی وجوہ ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے وقتی کوئی شخص پاکستانی کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہم میں سے بیشتر سب سے پہلے تو مسلمان، اور پھر ہندوستانی اور اس کے بعد بنگالی، پنجابی، سندھی، اور پٹھان وغیرہ، کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب ہم نے برصغیر میں اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا اعلان کیا تو ہمارے اس اعلان کی بنیاد علاقائی نہیں بلکہ مذہبی و روحانی تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد ہمیں فوری طور پر اپنی روحانی قوم پرستی کو علاقائی قوم پرستی میں منتقل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلے ۱۲ سال کی بے اصولی سیاست کے تماشے نے اسے اور زیادہ دشوار بنادیا تھا۔ لیکن اب ہمیں حقیقتوں کو تسلیم کرنا چاہئے۔ علاقائی لحاظ سے ہمارا ملک دو دور دراز حصوں میں منقسم ہے۔ لسانی اور ثقافتی اعتبار سے دیکھئے تو ہمارے یہاں بہت سی زبانیں اور ثقافتیں ہیں۔ لہذا ہماری قومیت ان خطوطات پر مبنی نہیں ہوسکتی۔ ہماری قومیت کی واحد اور تنہا بنیاد مذہب ہے اور یہ مذہب اسلام ہے۔ خواہ ہمارے ذاتی خصائل کے لئے اسلام مناسب ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ان مستعار ثقافتوں سے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہیں ہم آہنگ ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ہماری غیر ملکی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ بحیثیت قوم کے ہم اسلام سے فرار نہیں کرسکتے۔ ہم اس سے جتنا دور ہونگے اتنا ہی زیادہ ہم انتشار کے غار میں گرتے جائیں گے اس لئے اگر ہم کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ایسا نہ بھی کریں تب بھی قومی یگانگت اور بقا کے خالص دنیاوی مقصد کے لئے ہم اسلام کو اپنی مملکت کی بنیاد اور امتیازی حیثیت سے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ پاکستان کے سیاق و سباق میں اسلام کے لئے یہ پہلی دلیل ہے اور اس سے وسیع تر اور اعلیٰ تر سیاق و سباق میں دوسری دلیل یہ ہے کہ ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو !
جدا دیں ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وسیع معنوں میں ہمارے نجی اور قومی معاملات میں مذہب کو تسلیم کرنے کی تیسری وجہ بھی ہے اور اس کا تعلق فلسفۂ جنگ سے ہے۔
[illegible] لفظ جنگ کے استعمال پر بلاوجہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان اپنی معجزنما ترقیوں کے باوجود ابھی تک جنگ کا [illegible] ہے۔ انسانی ذہن اور ثقافت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جنگ کے ادعا اور مقاصد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ابتدائی دور میں [illegible]، بستیوں، یا عورتوں پر جنگیں ہوئیں۔ جیسے جیسے انسان وسیع النظر ہوتا گیا علاقوں اور ملکوں کی جنگ ہونے لگی۔ مزید ارتقاء کے بعد صرف قومیت جنگ کا باعث نہ رہی بلکہ اعلیٰ قومی سیاسی و اقتصادی گروہوں میں رقابت جنگ کا سبب بنی۔ اب ہم ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں جنگ صرف نصب العین کی بنا پر چھڑے گی۔ لیکن انسانی ترقی کا یہی انجام نہیں۔ انسانی بصیرت مادی نصب العین سے بلند ہوکر ہی

جس کا بلند ہونا یقینی ہے آخری جنگ ایسی تہذیبوں کے درمیان چھڑے گی جو مادی دنیا کے بجائے روحانی دنیا میں انسان کے فرائض سے متعلق مختلف تصورات کی حامل ہوں گی۔ اس فیصلہ کن جنگ میں اسلامی تہذیب جو اہمٹ روحانی اقدار کی حامل ہے ایک عظیم فریق کی حیثیت سے شریک ہوگی۔ آج ان ہی اقدار کو مضبوط کرکے ہم اس آخری جنگ میں حصہ لے سکیں گے۔ جو ہو سکتا ہے ۱۰ سال بعد، پچاس سال بعد، یا مستقبل کی اَن گنت صدیوں بعد، جو ابھی وقت کی گود میں پوشیدہ ہیں، لڑی جائے مگر ۹ کروڑ انسانوں کی قوم اپنے وسائل اور شاندار صلاحیتوں کے باوجود اس اہم مقصد کو نظر انداز کر دے یا انسانی تقدیر پر اپنی مہر لگانے میں ناکام رہے تو تاریخ کا فیصلہ قطعی ہمارے خلاف ہوگا۔ جسے معاف نہیں کیا جا سکے گا۔

اس طرح ہماری قومیت کی تشکیلِ جدید ایسی ہی ہے جیسی کہ ایک نگینہ کی ہشت پہل تراش خراش اور جو قوس قزح کی طرح ہفت رنگ لیکن خود ایک ٹھوس ہیرے کی طرح شفاف و چمکدار ہوگی۔

یہ کام چار باتوں پر منحصر ہے پہلے تو ہمیں آزادی سے قبل کے جذباتی و نفسیاتی ماضی سے نکلنا ہے دوسرے یہ کہ ایک مشکل جغرافیائی صورت حال پر قابو پانا اور ایک ایسی سرزمین سے اپنے کو وابستہ کرنا ہے جو ۱۱۰۰ میل کے درمیانی فصل کے باوجود ایک ہی سرزمین کا ٹکڑا ہے تیسرے ہمیں بے شمار علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے تانے بانے سے یک رنگی ثقافت کو جنم دینا ہے جو اپنی گوناگونیوں کے باوصف رنگا رنگ اور نہایت شاندار ہو۔ چوتھے ہمیں اپنی قومیت کے عناصرِ قوت کو اسی طرح بروئے کار لانا ہے کہ وہ ملت کے ناگزیر دھارے کی معاون بن جائیں۔ میں اسے ناگزیر اس لئے کہتا ہوں کہ اسلام میں قومیت کا مفہوم تمام سیاسی تصوروں اور نظاموں کے مقابلہ پر سب سے زیادہ آفاقیت کو محیط اور بے شمار صلاحیتوں کا حامل ہے۔

اس چہار پہلو کام کی تکمیل صرف ایک سیاسی و انتظامی عمل ہی نہیں بلکہ درحقیقت ایک تخلیقی عمل ہے اس لئے ادیب اس چیلنج اور اس کو قبول کرنے کے وسیع بلکہ لامحدود میدان میں اتر کر اپنا غیر معمولی کردار ادا کر سکتا ہے۔

ہر ادب بنیادی طور پر یا تو بڑی حد تک ذات کے متعلق یعنی داخلی ہوتا ہے یا بڑی حد تک ماحول کے متعلق یعنی خارجی ہوتا ہے۔ مصنف کی فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے جو اسے بدیہی اور کلی حیثیت دیتی ہے مصنف کی عظمت اس امر میں ہے کہ وہ اپنی روح کے اندرونی تجربوں اور اپنے ماحول کے بیرونی اثر کو سچائی اور حسن کی اعلیٰ تر حقیقتوں میں بدل دے۔ ایک دوشیزہ کی زلفوں کی آب و تاب، اس کی حسین آنکھوں کی چمک، اس کے اعضاء کا تناسب، اور اس کے وجود کی مہک، ادب کے وجدان اور تخلیق کے لئے غالباً کافی ہیں۔ لیکن یہ ادب اسی وقت کوئی مقصد اور کوئی رُخ رکھ سکتا ہے جب اس میں اس ماحول کا بھی لحاظ رکھا جائے جس میں وہ پیدا ہوا اور سانس لے رہا ہے۔ لیکن اگر شاعر کے خوابوں کی یہ دوشیزہ ایسی معاشرت سے تعلق رکھتی ہے جہاں اعلیٰ امارت کے پردوں نے اسے غریب مداحوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے تو یقیناً وہ ایسے ادب کو جنم دے گی جس میں طبقاتی فرق اور ناانصافیوں پر خاص زور دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ دوشیزہ ظلم و جور کے ایسے معاشرہ میں پرورش پا رہی ہے جس میں اس کا بہ آسانی اغوا کیا جا سکتا ہے اور اسے محلوں اور شاہی حرم کی کنیز بنا کے رکھا جا سکتا ہے تو بے شک وہ انارکی اور بغاوت کے ادب کو جنم دے گی۔ ہاں اگر اس کے برخلاف اس کی زندگی اور معاشرہ کے حالات اسے اپنا حسن بازار میں فروخت کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ لازماً معاشرتی انصاف اور اصلاح کا ادب پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔ غالباً ادب مقصد اور رُخ کے اس حس کے بغیر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے اور یہ ادب ایک اچھا ادب بھی ہو سکتا ہے لیکن لازماً یہ بڑا ادب نہ ہوگا۔

لہٰذا مقصد و منہج کے اس جذبہ پر پاکستان کے مصنفین کو پورے خلوص اور حقیقت پسندی کے ساتھ توجہ دینا چاہیئے۔ ہم طبعی اور مابعد الطبعیات کی زندگی کے متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا ہے۔ مستقبل کے قاری کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ آج کا مصنف اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ *

★

* (مباحثہ رائٹرز گلڈ۔ ڈھاکہ)

غزل

احمد ندیم قاسمی

میں ہوں، یا تو ہے خود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اُجالا دل میں
چاندنی میں چمک اٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنّا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسّم بن کر
آگیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

تجھ سے مل کر بھی تمنّا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دُنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

چھا گئی ضبطِ فغاں پر کبھی یوں شدّتِ غم
گونج اٹھے شورشِ زنجیر سے زنداں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

سالک
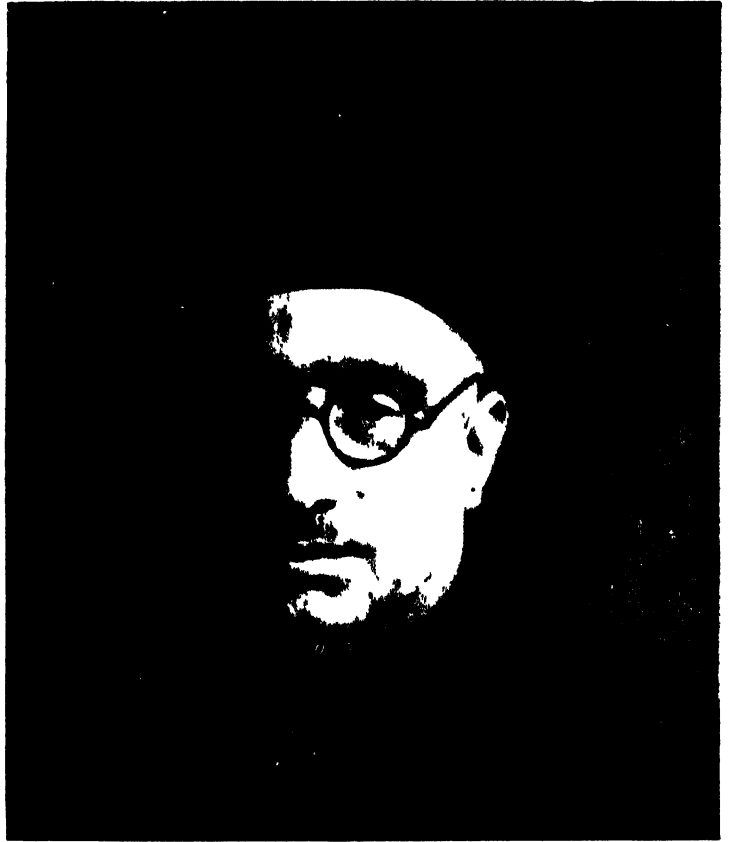
مسلم ٹاؤن لاہور
۲۴۔ اپریل

عزیز مکرم۔ السلام علیکم۔

خط ملا۔ سوالات کا جواب لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تبصرہ ذکرِ اقبال پر نظر سے گزرا تھا۔ شکریہ۔

آپ نے کسی "انجمن خدام الصوفیہ" کا نام اور اسکے رسالے کا نام "انوار الصوفیہ" چھپا ہوا دیکھا ہے یا نہیں ہے۔ صوفیا لکھنا درست نہیں۔ صوفیہ یا پھر ہو ایک تو سر صحت کا موجود ہے کو صحیح یہ بھی نہیں۔ آپ کسی مستند ادیب یا عالم کی کتاب میں صوفیا نہیں پائیں گے۔ صوفیہ البتہ جا بجا ملے گا

"ہامی بھرنا" ہاں کرنے کو کہتے ہیں۔ اور خالص دہلی کا اردو محاورہ ہے اسلئے اس میں جائے شک کا کوئی دخل نہیں۔ ہامی بھرنا حمایت کرنے کو نہیں کہتے۔ صرف "ہاں کرنے" میں آمادگی ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔

آپ نے جن حضرات سے دریافت کیا۔ اور جنہوں نے صوفیا اور حامی بھرنا کو درست بتایا وہ زبان سے بے خبر ہیں۔

سالک

عکس تحریر
(خط بنام شفیع عقیل)

مغلیہ مصوری

۲ ۱

۴

۳

۱- طاؤس (قلم: استاد عبدالصمد ، عہد اکبری)

۲- دربار شاہجہاں

۳- اشرف زمانی بیگم زوجہ بہادر شاہ ظفر } (مختصر شبیہ نگاری)

۴- ایک مغل شہزادی (اٹھارویں صدی) }

بہ یادِ رفتگاں :

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

(چند یادیں)

شفیع عقیل

یہ سنہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا اور، میں اور مجید لاہوری سڑکوں پر بیکار گھومنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ کوئی خاص دلچسپی، مقصد صرف گھومنا تھا۔ بے ارادہ اور وہ بھی پیدل۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ابھی شام ہی تھی اور رات بھیگنے میں خاصی دیر تھی۔ اس لئے نہ کلفٹن جا سکتے تھے اور نہ نیٹی جیٹی کے پُل پر بیٹھ کر سمندر کی خنک ہوا سے لطف اندوز ہو سکتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ ہم چند منٹ گھومے اور تھک گئے۔ اور یہ گھومنا بھی صرف بندر روڈ تک ہی محدود رہا۔ اس بے کیفی کو دیکھتے ہوئے طے یہ ہوا کہ مولانا سالک کے پاس چلا جائے۔ کچھ لطیفے ہوں گے اور کچھ باتیں سنیں گے۔ پرانے یاروں کے قصے چلیں گے اور بیتی یادیں دہرائی جائیں گی۔ اور اس طرح وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر سالک صاحب کے پاس جانے کا محض یہی ایک مقصد تھا۔ اس وقت نہ تو ہم علم کے موتی رولنا چاہتے تھے اور نہ ادبی مسائل پر گفتگو سننے کا اشتیاق تھا۔ مجید کا تو معلوم نہیں، لیکن میرا یہی تصور تھا۔ اور جہاں تک مجھے اندازہ ہے اس وقت مجید بھی اسی موڈ میں تھے — لیکن ہاں، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا، کہ اس سے پہلے میں مولانا عبدالمجید سالک سے کبھی نہیں ملا تھا! بارہا ان کے تذکرے ضرور ہوئے، کئی بار اُن کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی اور سینکڑوں دفعہ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنے مگر ان سے ملاقات ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ جہاں تک ان کی تحریروں کا تعلق تھا وہ تو اس زمانے سے پڑھتے آرہے تھے جب وہ "مولانا عبدالمجید سالک" کم اور "عبدالمجید سالک بٹالوی بی۔ اے" زیادہ تھے۔ تاہم اُن کی تحریروں سے دلچسپی اور اُن کی شخصیت کا احترام دل میں بہت تھا۔ ان سے دو چار بار مراسلت بھی ہو چکی تھی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت ان کے پاس جانے کا پروگرام بے مقصد اور اچانک تھا۔ جب ہم سالک صاحب کے پاس جا رہے تھے، عین اسی وقت ایکا ایکی مجید کو نہ جانے کیا یاد آگیا کہ بولے: "تم مولانا کے پاس چلو — میں ابھی آتا ہوں۔"

اس وقت مجید سے یہ پوچھنا قطعی لاحاصل تھا کہ انھیں کیا کام یاد آگیا ہے؟ کیونکہ عام طور پر ان کے کام اچانک اور ایسے ہی موقعوں پر یاد آجایا کرتے تھے۔ اور ان کے متعلق دریافت کرنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔

ان دنوں مولانا عبدالمجید سالک لاہور سے کراچی آئے ہوئے تھے اور ان کا قیام نگار ہوٹل میں تھا۔ وہ جب بھی کبھی کراچی آئے ان کا قیام ہمیشہ نگار ہوٹل ہی میں ہوا اور یہ بھی ان کی وضع داری کی ایک دلیل تھی۔ خیر، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مجید تو اچانک یاد آنے والے کام کے سلسلے میں چلے گئے۔ اور میں نگار ہوٹل میں پہنچ گیا۔ سالک صاحب ایک ہی روز پہلے کراچی پہنچے تھے اور اُن کے کمرے کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ ان کے حلیہ کے بارے میں میں نے طرح طرح کی باتیں سوچ رکھی تھیں۔ نام کے ساتھ مولانا ہونے کی وجہ سے میرا خیال تھا کہ ان کی بڑی سی داڑھی ہوگی، مونچھیں کی لبیں کٹی ہوں گی اور قرأت کے انداز میں باتیں کرتے ہوں گے۔ سرسید اور حالی کی تصویریں دیکھنے کے بعد ان کے متعلق یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے یاد کئے ہوئے نمبر والے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ذرا بھاری اور بارعب آواز آئی: "کون —؟ اندر آجائیے —!"

لیکن جونہی میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو ایک لمحہ کے لئے تو کچھ سٹپٹا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کمرے کا نمبر بھول کر کسی دوسرے کمرے میں آ پہنچا ہوں۔ کیونکہ اس وقت کمرے میں جو صاحب سامنے بیٹھے تھے وہ میرے تصور کے بالکل خلاف تھے۔ نہ ان کی لمبی لمبی داڑھی تھی، نہ مونچھیں، اور نہ مولویانہ طرزِ تکلم ـــــ درمیانہ قد، جسم قدرے بھاری، رنگ گندمی اور خط وخال موزوں، آنکھوں میں چمک اور چہرے پر بشاشت، داڑھی صاف اور مونچھیں بہت چھوٹی، سر پر چھوٹے چھوٹے اُلٹے بال جن کی سفیدی اور سیاہی آپس میں دست وگریباں، آنکھوں پر سفید شیشوں کی عینک اور کلّے میں نہ ہونے کے برابر پان، کشادہ پیشانی اور گول چہرہ۔ یہ تھے مولانا عبدالمجید سالک۔ ان کا یہ سراپا میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ ململ کا سفید کرتہ اور سفید شلوار پہنے کہنی کا سہارا لئے چارپائی پر یوں نیم دراز تھے جیسے گندم کا کوئی بہت بڑا بیوپاری ابھی ابھی چڑھتے بھاؤ سودا کر کے فارغ ہوا ہو!

انھوں نے لیٹے لیٹے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر ذرا مسکرا کر بولے :ـــ "بیٹھئے!"

اور پیشتر اس کے کہ وہ میرا نام، یا میرے آنے کا سبب، دریافت کرتے، میں نے جلدی سے اپنا تعارف کرا دیا میرا نام سنتے ہی وہ اور بھی خندہ پیشانی سے بولے : "اچھا ـــــ تو آپ ہیں شفیع عقیل!"

اس وقت انھوں نے 'اچھا' اور 'شفیع عقیل' کے الفاظ کو خاصا کھینچ کر ادا کیا تھا۔ "وہ ٹرک کہاں رہ گیا۔؟" انھوں نے پوچھا۔ ٹرک سے ان کی مراد مجید لاہوری سے تھی۔ ضرورت سے زیادہ موٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجید کو عام طور پر ٹرک کہا کرتے تھے۔ اور ٹرک بھی جس میں مٹی بھری ہوئی ہو۔ انھوں نے مجھ سے یہ سوال کرنے کے ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے ناک دبائی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت تھی۔ باتیں کر رہے ہوں یا تنہائی میں بیٹھے ہوں، کوئی ادبی مسئلہ زیرِ بحث ہو یا محض لطیفے ہو رہے ہوں، وہ اپنے دائیں ہاتھ سے درمیان میں کبھی کبھی ناک کو چھوتے اور یا پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے فضا میں اس طرح لکھنے لگتے جیسے باقاعدہ کتابت کر رہے ہوں۔ اس طرح فضا میں لکھنا بھی اُن کی عادت میں شامل تھا۔ بلکہ ایک بار تو میں نے پوچھا بھی کہ۔ "مولانا! آپ یہ فضا میں اس طرح کیا لکھتے رہتے ہیں۔؟"۔ جواب میں ہنس کر بولے۔ "بس عادت سی ہو گئی ہے۔" اور پھر لمحہ بھر رُک کر خود کہنے لگے، "میں سمجھتا ہوں میرا خط لکھنے سے اتنا پختہ اور صاف نہیں ہوا جتنا اس طرح فضا میں لکھتے رہنے سے ہوا ہے۔" بہرصورت اس وقت وہ فضا میں نہیں لکھ رہے تھے انھوں نے ہاتھ سے مُنہ صاف کیا اور پھر میرا جواب سُنے بغیر بولے : "اچھا تو شفیع صاحب ـــــ اور سنائیے؟"

بھلا میں کیا سناتا ـــــ؟ میں تو خود سننے گیا تھا اور وہ بھی لطیفے۔ مگر مجید کے نہ ہونے سے وہ پروگرام یونہی رہ گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ نہ ان سے بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور نہ قہقہہ مار کر ہنس سکتا تھا۔ لہٰذا ہوا یہ کہ میں عقیدت، احترام، اور رعب میں کرسی پر یوں بیٹھا رہا، جیسے کسی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا دیا ہو اور اب وہی آ کر اٹھائے گا۔ سالک صاحب اس دوران برابر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور میں درمیان میں کبھی ہنس دیتا اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ہنسنا کب شروع کروں اور سنجیدہ کب سے ہوں۔ بہرحال مجید کو نہ آنا تھا اور نہ آئے۔ میں نے جوں توں کر کے، جس طرح بھی بن پڑا وقت گزارا، اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ اِدھر شام ہوتی اور اُدھر میں اور مجید نگار ہوٹل جا دھمکتے۔ پھر سالک صاحب کی باتیں ہوتیں اور ہم۔ کبھی پیالک قصہ چھڑا ہوا ہے تو تھوڑی دیر بعد کہیں اور کا ذکر ہو رہا ہے تاثیر کی باتیں ہو رہی ہیں، پطرس کے لطیفے سنائے جا رہے ہیں، حفیظ کے معرکوں کی داستانیں دہرائی جا رہی ہیں۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے تذکرے چھڑ جاتے یا سالک صاحب کی صحافتی زندگی کی کہانیاں چل نکلتیں تو وقت کا احساس تک نہ رہتا۔ لطیفے پر لطیفہ ہو رہا ہے، چٹکلے پر چٹکلا چلا آ رہا ہے، اور جملے پر جملہ کسا جا رہا ہے لیکن مجال نہیں کہ پاسِ ادب ہاتھ سے چلا جائے۔ سالک صاحب اپنی وضع داری کو کبھی نہ بھولتے تھے۔ رکھ رکھاؤ کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ وہ چھوٹوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی وضع داری میں کبھی فرق نہ آیا۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے حلقہ میں صفِ اوّل کی ادبی شخصیتیں شامل تھیں، پطرس، تاثیر، حفیظ، صوفی، مہر، مجید ملک، چغتائی، تاج، سبھی لوگ تھے لیکن یہ لوگ "نیاز مندان لاہور" میں شریک ہوتے ہوئے بھی سالک صاحب کے نیاز مند رہے۔ اور یہاں

کے بڑے ہونے کی دلیل تھی ۔۔ بڑے ادیب یا فنکار تو بہت ہوتے ہیں لیکن ایسے فنکار یا ادیب جن کی شخصیت بھی بڑی ہو بہت کم ہوتے ہیں۔ سالک صاحب کی ادبی اور علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت بھی بڑی تھی ۔۔۔ اور اسی بڑی شخصیت کی دلکشی تھی کہ شام ہوتے ہی، بڑی باقاعدگی سے میں اور مجید ان کے پاس پہنچ جاتے ۔۔ ادھر ان کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ہی صبح اٹھتے اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر پہلے وقت میں جو کام ہوتا اس سے فرصت پا لیتے اور سیدھے نمکدان کے دفتر آ جاتے۔ گرمیوں کے دن، دوپہر کا وقت، "نمکدان" کا دفتر اوپر کی منزل میں تھا۔ مولانا کا سانس چڑھا ہوا ہوتا، آتے اور اپنی بھاری آواز میں السلام علیکم کہہ کر شیروانی ایک طرف ٹانگ دیتے۔ چھڑی دیوار سے ٹیک جاتی، جناح کیپ میز پر رکھ دیتے اور دفتر میں بچھے ہوئے تخت پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر نیم دراز ہو جاتے۔ نیچے ایرانی کے ہوٹل سے ایک ٹھنڈا سوڈا منگوا کر پیتے اور پھر ان کی لچھے دار باتیں شروع ہو جاتیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے مصری کی ڈلیاں چبائے چلے جا رہے ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی تازہ لطیفہ ہوتا، کوئی نہ کوئی نیا واقعہ سناتے۔

سالک صاحب کا طنز بڑا دھیما مگر تیز ہوتا تھا۔ اور اس دھیمے پن کی وجہ ان کی ذات تھی۔ ان کے لہجہ تک میں دھیما پن تھا۔ دراصل وہ میانہ روی اور آہستہ روی کے قائل تھے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی وہ جلد باز نہ تھے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کے چند اصول تھے جن کی سختی سے پابندی کرنا، ان کا ایمان تھا۔ دوستی ہو یا دشمنی، ان کے ہاں جلد بازی نام کو نہ تھی۔ وقت کو دیکھ کر بات کرتے اور حالات کو سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے۔ ان کی نظر جس قدر گہری تھی اتنی ہی محتاط بھی۔ یہ قرینہ ان کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ادب اور سیاست میں بھی وقت اور حالات کو دیکھ کر اپنے لئے راستہ کا تعین کیا دراصل وہ وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرتے رہنے کی عملی دانش سے واقف تھے اور یہ خصوصیت ان کی تحریر و تقریر میں بھی موجود تھی۔ چنانچہ وہ طنز بھی کرتے تھے تو بڑا دھیما دھیما میٹھا میٹھا ۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کراچی کے ایک تاجر نے اپنے گھر پر مشاعرے کی مخصوص نشست کا انتظام کیا۔ کھانا بھی تھا اور کھانے کا انتظام ایک کھلے لان میں میزوں پر کیا گیا تھا۔ جونہی کھانے کے لئے بلایا گیا یار لوگ اس طرف لپکے۔ مجید کھانے میں بہت تیزی دکھایا کرتے تھے۔ میں اور سالک صاحب ایک طرف کھڑے کھا رہے تھے کہ اتنے میں مجید آئے۔ ان کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جو اس وقت بھی بھری ہوئی تھی اور وہ خاصا کھا بھی چکے تھے۔ وہ جلدی سے میری طرف بڑھے اور بولے۔

"شفیع کھانے میں کیا کیا ہے ۔؟" پیشتر اس کے کہ میں مجید کو کوئی جواب دیتا سالک صاحب ہاتھ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولے: "یہ لوگ بچ گئے ہیں" اور مجید تلملا کر رہ گئے۔

سالک صاحب نے اس وقت کی حکومت کی ایک باقاعدہ ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب ان کا قیام مستقل طور پر کراچی ہی میں ہو گیا تھا۔ رامچندر ٹمپل روڈ پر انھوں نے ایک فلیٹ پگڑی پر لے لیا تھا۔ اور اب وہیں محفلیں جمنے لگی تھیں عقیدت مندوں، دوستوں، اور ملنے والوں کا یوں تانتا بندھا رہتا تھا جیسے کسی مشہور معالج کا مطب ہو۔ ایک آتا اور دوسرا جاتا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی اور مجید کہیں گھومنے کا پروگرام بناتے یا پھر مشورہ دیتے ۔ "مولانا! آج کوئی فلم دیکھیں ۔؟" اور کبھی کبھار سالک صاحب بھی فلم دیکھنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس سلسلہ میں میری بدقسمتی نے جو مجھے پکارا تو ایک روز ان کے ساتھ میں بھی فلم دیکھنے چل دیا۔ مجید کہنے لگے۔ "شفیع توں وی چل۔"

لہٰذا "میں وی چل دیا" لیکن جب وہ ایک پرانے اور تیسرے درجے کے سینما کے پاس جا کر رک گئے تو بڑی پریشانی ہوئی وہاں ایک نہایت نامعقول قسم کی نام نہاد سائنسی فلم چل رہی تھی۔ میں نے کہا بھی کہ:

"فلاں سینما میں اچھی فلم چل رہی ہے"۔ لیکن مجید اور سالک صاحب دونوں کا کہنا یہ تھا کہ۔ "یہی دیکھتے ہیں۔ سائنس کی فلم ہے معلوماتی ہو گی"۔ معلوم نہیں اس میں مجید کے ذوق کو زیادہ دخل تھا یا سالک صاحب کی پسند کو لیکن ہوا یہ کہ فلم کے دوران مجید اور سالک صاحب دونوں بڑی محویت سے فلم دیکھتے رہے اور میں بیٹھا دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی کبھی مجید نے میرے سامنے فلم دیکھنے کا ذکر چھیڑا، میں وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔

غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ پطرس پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں اتفاق سے ایک دن سالک صاحب کے فلیٹ میں پانی نہیں آیا تھا۔ گھر میں بڑی پریشانی تھی۔ لیکن شام کو دیکھا تو پطرس مرحوم اپنی کار میں پانی کا ایک بڑا سا گھڑا رکھے چلے آ رہے ہیں۔ ملازم نے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

کلمۂ حصر

محمد اقبال سلمان

"ہی" ایک کلمہ ہے، جسے قواعد اردو میں کلمۂ تخصیص کہتے ہیں۔ مختلف موقعوں پر جن مختلف معنوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، ذیل میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ صرف، فقط کے معنوں میں۔ غالب:

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بانداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

۲۔ مطلق، قطعاً کے معنوں میں۔ جلال:

ناصح بتائیں کیا ہمیں چپ لگ گئی ہے کیوں
جس کا جواب ہی نہیں یہ وہ سوال ہے

۳۔ بلاشبہ، یقیناً کے معنوں میں۔ "تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اٹھائی جائے" (رویائے صادقہ)

۴۔ بالآخر، آخرکار کے معنوں میں۔ داغ:

در وازے پر آ ہی گئے وہ میری صدا سے
ملتا تھا بہت غیر کی آواز کا انداز

۵۔ فوراً، بلاتاخیر کے معنوں میں۔ "میں درگاہ سے شہر میں آیا۔ آتے ہی میں نے فصد کھلوائی" (نادراتِ غالب)

۶۔ تاکید کے معنوں میں، جیسے، نہ حامد ہی آیا نہ محمود؛ زید ہی نے کہا تھا، عمرو ہی گیا تھا۔ محزوں:

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی بھیجا
حیف محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

۷۔ کم کو مزید کم اور زیادہ کو اور بھی زیادہ کر کے دکھانے کے لئے نیز مبالغے کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے وہ بڑا ہی عالم ہو، وہ بہت ہی شریر ہے۔ "یاد رکھو! مردم آزادی بہت ہی بُری چیز ہے" (امراؤ جان ادا)

ہی ضمائر و اسماء کے ساتھ:

جب "ہی" ضمائر، اسمائے اشارہ اور بعض دوسرے حروف کے متصل واقع ہو، تو عموماً اپنی الگ شکل میں باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے ماقبل میں مدغم ہو جاتا ہے بعض صورتوں میں دوسرے کلمے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بظاہر اس کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جن الفاظ میں کسی نہ کسی شکل میں "ہی" پایا جاتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

یہی۔ اصل میں "یہ ہی" تھا۔ اب الگ الگ نہیں بولتے۔ اشارۂ قریب ہے، پر زور دینے کے لئے "خصوصاً یہ" یا "ایسا ہی" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ داغ:

گر یہی قسمیں ہیں تو مجھ کو یقین   آپ کے سر کی قسم بس ہو چکا

وہی۔ "وہ ہی" کا مخفف۔ "یہ ہی" کی طرح "وہ ہی" بھی متروک ہے۔ "خاص کردہ" یا "صرف وہ" کے معنی دیتا ہے۔ مومن:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نظم میں کبھی "وہ ہی" بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مومن:

نہیں اس کے خواں سے کوئی تلخ کام
وہی اشتہا بخشے، وہ ہی طعام

اُسی۔ "اِس ہی" کا مخفف۔ اسمِ اشارۂ قریب (اس) اور اسم اشارۂ بعید (اُس) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ الگ الگ لکھنا بولنا قریباً متروک ہے۔ امیر:

ہو رو آنسوؤں کا قحط اگر ہے
اِسی دن کے لئے خونِ جگر ہے!

غالب:

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

اُنھیں۔ بکسر اول و دوم و سکون یائے معروف۔ یہی کی ہائے ہوز، ہائے مخلوط سے اور یائے معروف، یائے معروف و نونِ غنہ سے بدل کر بعید اسم اشارۂ قریب جمع (اِن) اور اسم اشارہ بعید جمع (اُن) کے حصر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تعظیماً واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی جگہ "اُن ہی" کا استعمال غیر فصیح ہے۔

(الف) انھیں "ان کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں آنے تھے۔ اُنھیں کے ہاں اترے تھے" (نادراتِ غالب)

(ب) اِنھیں۔ امانت لکھنوی:

سر شکِ دیدہ ہائے تر سے دھو ڈالوں گا عصیاں کو
اِنھیں چشموں سے اے دل آبرو محشر میں پانی ہے

"اُنھیں" جب یائے مجہول سے پڑھا جائے، تو "اُن کو" کے معنی دیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی:

اُنھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں اُن کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر!

مجھی (مجھ ہی)، ضمیر واحد متکلم (مجھ) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ ذوق:

یا تو یا رب دوستی تجھ کو بہت بے باک ہو
یا مجھی کو موت آ جائے تو قصہ پاک ہو

تجھی (تجھ ہی)، ضمیر واحد مخاطب (تجھ) کے حصر کے معنی دیتا ہے۔ خواجہ میر درد:

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہمیں (ہم ہی) بفتح اول و کسر دوم و سکون سوم۔ ضمیر جمع متکلم (ہم) کے حصر کے لئے مستعمل ہے۔ داغ:

ہمیں تھے وہ جو کبھی تھے خزانۂ عرفاں ہمیں ہیں اب کہ جو ڈھونڈو تو ہم میں خاک نہیں

کبھی نظم میں "ہم ہی" بھی لے آتے ہیں، جیسے:

وصول دمبا دم اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اگر یائے مجہول کے ساتھ پڑھا جائے، تو اس کے معنی ہوں گے: ہم کو۔ غالب:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

تُمھیں (تم ہی) بضم اول و کسر دوم و سکونِ سوم۔ ضمیر مخاطب (تُم) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ غالب:

جو بات بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

تمھیں (بیائے مجہول "تم کو" کے معنی دیتا ہے۔ "انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہونا ہے" (آبِ حیات)

سبھی۔ "سب ہی" کا مخفف ہے اور "سب" کے حصر کے لئے آتا ہے۔ میر درد

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

کہیں: "کہاں ہی" کا مخفف ہے۔ متعدد معنیوں میں مستعمل ہے، لیکن زیادہ تر "کسی جگہ" کے معنی دیتا ہے۔ جلال لکھنوی:

اُٹھے جو بزم یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

وہیں: "وہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اسی جگہ، اسی مقام پر۔ حالی:

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں
جمادات کی طرح پابند میں ہیں

یہیں: "یہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اسی جگہ، اسی مقام پر۔ ناسخ:

جسم خاکی کو یہیں چھوڑیں عدم کی راہ لیں
اب وطن کو چلیے گردِ وشتِ غربت جھاڑ کر

جونہیں، جونہی، جوہیں: اکیلا "جوں" حرفِ تشبیہ ہے[1]، لیکن جب اس کے ساتھ "ہی" مل جائے، تو حرفِ شرط بن جاتا ہے۔ حالی:

جونہی کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود ان کا دل رہنمائی

یُونہیں، یُونہی: (یوں ہی) یہ لفظ "یُہیں" (بضم اول و کسر دوم و سکون سوم) بھی بولا جاتا ہے۔ اساتذہ نے اسے زمین اور قرین کے قافیہ میں نظم کیا ہے۔ بعض کے نزدیک "یونہی" یا "یوں ہی" صحیح ہے اور "یونہیں" غلط، لیکن اکثر اہل علم کے نزدیک ترجیح "یونہیں" کو حاصل ہے، کیونکہ حرفِ علت پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں نون غنہ کا اضافہ اردو میں عام ہے۔ اسی طرح، ایسیں:

---

[1] ذوق: جوں سبزۂ دمیدہ تہِ سنگ ہمارا سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

یونہیں گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کبھی (کب ہی) کب (ظرف زمان) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ کسی وقت۔ غالبؔ:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تبھی[1] (تب ہی) اسی وجہ سے، اسی سبب سے۔ خواجہ میر دردؔ:

یوں وعدے ترے دل کی تسلی نہیں کرتے
تسکین تبھی ہووے گی جب آن ملے گا

جبھی[1] (جب ہی) اسی لئے، اسی واسطے۔ جلیلؔ:

بتوں کے ذکر سے رکتی نہیں زباں کم بخت
جبھی تو اپنی دعا میں اثر نہیں آتا

یہ کلمات ہیں، جن میں "ہی" شامل ہے۔ ان کے علاوہ ایک لفظ "آپ" بھی ہے، جس کے متصل "ہی" واقع ہو۔ تو مخفف صورت "آپی" بن جاتی ہے۔ داغؔ نے کہا ہے:

لن ترانی سے غرض کیا حسنِ عالم سوز کو
ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر

لیکن ادھر کچھ مدت سے مخفف صورت کا استعمال صرف زبانوں پر رہ گیا ہے۔ تحریر میں مکمل شکل "آپ ہی" کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔

<u>"ہی" کا محل استعمال:</u>

قواعد زباں کی رو سے "ہی" مندرجہ ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے:

(الف) (حرفِ جار) سے پہلے، مومنؔ:

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں سے باتیں سنا نہ کرتے ہم

(ب) میں (علامتِ ظرف) سے پہلے۔ ناسخؔ:

ہر بچھ کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں؟

(ج) نے (علامتِ فاعل سے پہلے، جیسے:

تم ہی نے داغؔ نہ اے نہیں اٹھائے ستم
یوں ہی سلف سے مرے یار ہوتی آئی ہے

یہ قاعدہ صرف ضمیر مخاطب، ضمیر غائب اور ضمیر جمع متکلم پر عاید ہوتا ہے۔ ضمیر متکلم واحد کی صورت میں ہی کا استعمال علامتِ

---

[1] تب اور جب حروفِ شرط میں بھی شمار ہوتے ہیں اور اسماء موصولہ میں بھی۔

فاعل کے بعد ہوگا۔ مثلاً " میں نے ہی لکھا تھا"۔ "میں ہی نے" لکھنا اور بولنا غلط ہے۔

(ک) پہ اور پر (حرفِ ربط) سے پہلے۔ اکبر الٰہ آبادی:

اے دوست! مجھے تو ہے خدا ہی پہ بھروسا
دشمن کو مبارک ہو میری گھات میں رہنا

(ل) تک (حرفِ انتہا) سے پہلے — "جو کچھ راستے کی صعوبتیں اور نخرا بیاں تھیں، وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں" (نیرنگِ خیال)

(م) کو (علامت مفعول) سے پہلے "حالانکہ تم بالتخصیص مسلمانوں ہی کو ملزم ٹھہراتے ہو" (ابن الوقت)

(ن) کا، کے، کی (حرفِ اضافت) سے پہلے، جیسے:

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

مختصر یہ کہ "ہی" کا استعمال اس لفظ کے بعد ہونا چاہیئے، جس کی تخصیص، تاکید یا حصر مطلوب ہو۔ اس صورت میں حروفِ ربط "ہی" کے بعد آ سکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔ اسی طرح دو منفی جملوں میں "ہی" کو حرفِ نفی کے ساتھ نہیں لایا جا سکتا، جیسے "کسی شخص کو نجی، خاندانی، گھریلو یا اس کے مماثل امور میں مستبدانہ مداخلت کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی اس کی عزت اور شہرت پر حملہ کیا جائے گا"۔ یہاں دوسرا منفی جملہ یوں ہونا چاہیئے: "نہ اس کی عزت اور شہرت ہی پر حملہ کیا جائے گا"۔

بعض کے نزدیک "نہایت" کے بعد ہی کا استعمال جائز نہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نہایت کے معنی ہیں "بہت ہی" اور "نہایت ہی" کے معنی ہوں گے "بہت ہی ہی"۔ یہ استدلال صحیح نہیں۔ اساتذہ کی نظم و نثر میں "نہایت ہی" برابر استعمال ہوا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد "محصنات" میں لکھتے ہیں:

"بیاہ تک مبتلا کی زندگی نہایت ہی فکر سے گزری"۔

بہادر شاہ ظفر کا ایک مقطع ہے:

زمیں نہایت ہی تھی یہ مشکل ظفر ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھائے دہن بنا کر زمیں پہ گو ہر فلک پہ اختر

★ ★ ★

ہمارے سامنے جو کام ہے اس کو انجام دینے کے لئے ہمیں یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا قدرتی عوامل ہمیشہ مہربان نہیں ہوتے اور نہ عالمی حالات ہی ہمیشہ سازگار ہوتے ہیں لیکن ہم ایک جفاکش اور تنومند قوم ہیں جو مشکلات سے نہیں جھکتی۔ ہمیں معجزات کی بھی توقع نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے کہ جو لوگ جی لگا کر کام کرتے ہیں وہ اپنی محنت کا پھل ضرور پاتے ہیں۔

(جنرل محمد ایوب خان: قوم سے نشری خطاب
بہ سلسلہ دوسرا پنجسالہ منصوبہ)

افسانہ

"مہمانِ عزیز"

انور عنایت اللہ

وہ چپکے سے ڈرائینگ روم میں آیا اور اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس کوئی نہیں تھا، اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ سِل وآنا اب بھی بڑی فرمانبرداری سے باہر اس کی منتظر تھی!

شام ہو گئی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے قبل از وقت تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ بڑی بی اب تک غالباً اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آئی تھیں۔ ملازم باورچی خانے میں تھے۔ گھر پر ایک عجیب پراسرار سکوت چھا گیا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ یہ کوٹھی شاہراہ عام پر نہیں تھی بلکہ ایک گلی میں تھی ورنہ آج سِل وآنا کی فکر اسے علیحدہ ستاتی۔ اب امجد کو کم از کم اس کی طرف سے مکمل اطمینان تھا۔ اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی، وہ چپکے سے اپنے کمرے کی خاموش فضا میں لوٹ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کچھ دیر اور صبر سے حالات کا انتظار کرنا ہوگا۔ دریچہ کے قریب ایک آرام کرسی پر وہ بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دارومدار تھا۔

اسے کراچی آئے آج دس دن ہو رہے تھے اور اب تک وہ سِل وآنا کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لئے آخر کیا انتظام کرے۔ کراچی پہنچتے ہی خود اس کے قیام کا مسئلہ دردِ سر بن گیا تھا۔ عارضی طور پر اپنے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لینے کے بعد اس نے سِل وآنا کی خاطر فوراً مکان کی تلاش شروع کر دی۔ فی الحال اسے اپنے ایک گوانیز شناسا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں ٹھہرایا اور پھر دن بھر کراچی کی سڑکیں ناپنے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ کراچی میں مناسب کرایہ پر بغیر پگڑی یا پیشگی کرایہ ادا کئے معقول گھر مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ہوٹل بھی بس غنیمت ہی تھا اس کے باوجود خاصا مہنگا تھا۔ چنانچہ جب دو دن گذر گئے اور حالات حوصلہ شکن نظر آنے لگے تو امجد نے فیصلہ کر لیا کہ کل شام کو وہ یقیناً کسی نسبتاً سستے ہوٹل کا رخ کرے گا۔

شام کو اپنی ذہنی الجھنوں سے بچنے کے لئے وہ ایلفی پر نکل آیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عموماً شام کو بادل بھی گھر آتے لیکن بارش شاذ و نادر ہی ہوتی۔ مہینے کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اس کے باوجود دوکانوں میں خاصی بھیڑ تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے کتابوں کی ایک دوکان پر پہنچا اور پل بھر کے لئے رک کر رنگ برنگے سرورق کی نئی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک کتاب اٹھا کر یونہی ورق گردانی شروع کی ہی تھی کہ یکایک کسی نے بڑی محبت سے اسے لپٹا لیا۔

"تم یہاں کہاں امجد؟ کب آئے بھئی؟ کہاں ٹھہرے ہو؟" نو وارد نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ آج تقریباً نو سال کے بعد دونوں دوست ملے تھے۔ رفیق اسے کافی ہاؤس لے گیا۔ کافی کا آرڈر دے دیا گیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ امجد نے اپنی بپتا سنائی تو رفیق نے کہا: "اماں یار۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ تم تنہا ہو۔ اگر بیوی بچے ساتھ ہوتے تو پھر یہ مسئلہ دقت طلب تھا۔ میری رائے میں تم علیحدہ مکان کرائے پر لینے کا خیال فوراً دماغ سے نکال دو ——— ایں خیال است و محال است و جنوں۔ میں تمہیں آج ہی ایک کمرہ دلوا دیتا ہوں جہاں تم پئینگ گیسٹ بن کر مزے میں رہ سکتے ہو۔ مہمانی کا یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ اب تک میں بھی ایک بہت ہی معقول جگہ پئینگ گیسٹ تھا۔ بقول شخصے مالکن ایک معمر خاتون ہیں صرف ڈھائی سو روپے لیتی ہیں۔ کشادہ ہوادار صاف ستھرا کمرہ ہے۔ معقول فرنیچر ہے۔ کھانا بہت عمدہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گھریلو ماحول ہے بس تم آج ہی میری جگہ آ جاؤ۔" اس نے ایک سگریٹ امجد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جگہ!۔ تم کہاں جا رہے ہو؟" امجد نے پوچھا۔

"ارے بھئی معاف کرنا۔ یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ کل میں ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ میں بیگم زیدی سے تمہاری شرافت کی پُر زور سفارش کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں رکھ لیں گی۔ دراصل ان کا دنیا میں کوئی نہیں۔ خاصی بڑی کوٹھی ہے۔ کرایہ پر اس لئے نہیں دیتیں کیونکہ اکثر کرایہ دار ستاتے ہیں۔ بڑی بی نے ایک کمرہ "مہمانوں" کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ عموماً ایک سے زیادہ گیسٹ نہیں رکھتیں۔"

چنانچہ اس طرح بیگم زیدی سے تعارف ہوا اور امجد کی رہائش کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلی ہی رات کو کھانے کے بعد باتوں باتوں میں چوروں کا ذکر آ گیا۔ پچھلے دنوں اس محلے میں چوری کی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ اس کی وجہ سے بیگم زیدی خاصی خائف تھیں۔ کہنے لگیں "رات کو بڑا پھاٹک اور صدر دروازہ میں خود اپنے ہاتھ سے بند کرتی ہوں۔ نوکر یوں تو پرانے ہیں لیکن یہاں مجھے اس وقت تک چین سے نیند نہیں آتی جب تک خود یقین نہ کر لوں کہ دروازے بند ہیں۔ ذرا آپ بھی اس کا خیال رکھئے گا۔ اگر رات کو کبھی دیر سے آنا ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔ میں جاگتی رہوں گی۔ ویسے بھی مجھے راتوں کو بہت کم نیند آتی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھئے۔ میں ان معاملوں میں خود بے حد محتاط ہوں۔ آپ اچھا سا کتا کیوں نہیں پال لیتیں؟ بڑا وفادار اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے!" امجد نے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا۔

"جی؟ کتا؟؟؟ ارے نہیں میاں۔ انتہائی نجس جانور ہے۔ جس گھر میں ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔ نہیں نہیں میاں۔ اگر مجھے دنیا میں کسی چیز سے نفرت ہے تو کتے سے۔ چھوٹے کتوں سے گھن آتی ہے۔ بڑوں سے روح کانپتی ہے۔ نہیں نہیں بھئی کتے وتے کی علت نہ میں نے کبھی پالی اور نہ ارادہ ہی ہے۔ کئی سال ہوئے۔ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر میرے پیئنگ گیسٹ تھے۔ دو دن تو وہ بڑے معقول طور پر رہے۔ لیکن تیسرے دن نہ جانے کہاں سے ایک کتے کا پلہ لے آئے۔ انتہائی ذلیل۔ سیاہ فام۔ کریہہ شکل۔ کہنے لگے مجھے کتوں سے عشق ہے۔ میں نے اسی دن انہیں چلتا کیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ خدا کے فضل سے کسی کتے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس طرف کا رخ کرتا۔"

بڑی بی سے کتوں کے خلاف اتنی لمبی چوڑی تقریر سن کر امجد کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس نازک موضوع پر وہ کسی اور دن، جب حالات زیادہ حوصلہ افزا نظر آئیں، تبادلۂ خیال کرے گا۔

چنانچہ پہلی رات جوں توں کٹ گئی۔ دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد دفتر جانے سے پہلے امجد، ڈاکٹر برگانزا کے یہاں گیا، سِل دانا کی مزاج پرسی کی۔ ڈاکٹر کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، اپنی مشکلات بیان کیں اور دس بارہ دن کی مہلت اور مانگی۔ سِل دانا ایک طرف بیٹھی بڑی سنجیدگی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ دراصل وہ کتوں کی اس نسل سے تھیں جو انسان کی ذہانت کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی۔ سِل دانا کو یوں تو امجد کی شکل پسند تھی لیکن اپنی نسلی عادتوں سے مجبور اسے یقین کامل تھا کہ امجد ضرورت سے زیادہ خبط الحواس تھا۔ ورنہ آخر وہ اسے اس اجنبی گھرانے میں چھوڑ کر خود لاپتہ کیوں رہتا۔ اب تو مجبوری تھی۔ امجد نے آگے بڑھ کر پیار سے تھپتھپایا تو اس نے کوئی خاص لفٹ نہیں دی۔ وہ ایک عجیب بیگانہ انداز سے منہ کھولے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں "عجیب مالک ہو تم میرے۔ مجھے غیروں کے یہاں چھوڑ کے اب آئے ہو مسکین صورت بنائے؟ جاؤ ہم نہیں بولتے!"

دفتر میں دن بھر امجد کا مطلق جی نہ لگا۔ سِل دانا کا مستقبل رہ رہ کر اسے ستا رہا تھا۔ بڑی بی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ حشر تک سِل دانا کے داخلے کی اجازت نہ دیں گی۔ دن کسی نہ کسی طرح کٹ گیا۔ شام اپنے ساتھ تمام تر اداسیاں لے آئی۔ وہ دفتر سے نکلا اور نہ جانے کب تک صدر کی پُر رونق سڑکوں پر کھویا کھویا سا ادھر ادھر بھٹکتا پھرا حتیٰ کہ اندھیرا ہو گیا۔ وکٹوریا روڈ سے وہ ایک گلی میں مڑا تو آگے چل کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کے پچھواڑے اسے کئی کتے نظر آئے جو بڑے ذوق و شوق سے ہڈیاں کھا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کتوں کو دیکھتے ہی یکایک برق رفتاری سے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ پل بھر کے لئے رک گیا، اپنی ٹھوڑی کھجائی اور کچھ سوچ کر

ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل کے مالک نے ایک خاصے معقول خوش پوش صاحب بہادر کو اپنے گندے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا تو قدرے حیرانی اور خوشی کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہوٹل غریب مزدور قسم کے گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ریڈیو گلا پھاڑ رہا تھا اور دوسری طرف گاہکوں نے زور زور سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ امجد نے ہچکچاتے ہوئے موٹے مالک سے سرگوشیوں میں باتیں کیں اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کی جیب میں کاغذ کا ایک پیکٹ تھا جس میں تلا ہوا ایک چاپ تھا!

امجد سیدھا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں پہنچا۔ وہاں سے ٹہلانے کے بہانے سے سل وانا کو لیا اور اسے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ گھر سے ذرا دور رک کر اس نے بڑی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ محلہ خاصا پرسکون تھا۔ گھر پر حسب معمول سکوت چھایا ہوا تھا۔ بڑی بی اور نوکروں کا زیادہ وقت گھر کے اندر گذرتا۔ وہ کتیا کو صدر دروازے تک لے گیا، جیب سے چاپ نکالا اور عین دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر چاپ رکھ دیا۔ تلے ہوئے گوشت کی بو ناک میں پہنچی تو سل وانا کے معدے کا منہ کھل گیا اور اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ امجد نے چپکے سے اسے اجازت دے دی۔ سل وانا نے وہیں آرام سے بیٹھ کر چاپ کھا لیا اور ساتھ ہی اس دروازہ کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جہاں یہ نعمت ملی تھی۔ جب ہڈی کی باری آئی تو امجد نے چپکے سے زنجیر تھام لی اور اسے گھسیٹتا واپس ڈاکٹر برگانزا کے یہاں لے گیا۔

اب روز یہ اس کا معمول ہو گیا کہ دفتر سے سیدھا صدر جاتا، اسی ہوٹل سے تلا ہوا چاپ خریدتا، ڈاکٹر کے یہاں جاتا۔ سل وانا کو ساتھ لیتا۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو اپنے یہاں لے جاتا۔ دور ہی سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ میدان صاف ہے، کتیا کو صدر دروازہ تک لے جاتا۔ اسے سیڑھیوں پر بٹھا کر چاپ کھلاتا اور واپس ڈاکٹر کے یہاں پہنچا دیتا۔

سل وانا کی یوں تو امجد کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اسے اپنے مالک کی یہ ادا خوب بھاتی۔ وہ روزانہ بےچینی سے شام کا انتظار کرتی۔ دن کو جب بھی وہ آنکھیں بند کرتی، وہ فراخدل دروازہ اس کے ذہن میں ابھرتا جہاں سے روزانہ اسے ایک مزیدار چاپ ملتا۔ دسویں دن تک سل وانا کے ذہن میں وہ دروازہ کچھ اس طرح مرتسم ہو گیا تھا کہ اس کے تصور کے ساتھ اسے چاپ یاد آتا اور بے اختیار اس کی رال ٹپکنے لگتی۔ اب وہ بڑی سنجیدگی سے اپنے نوجوان صاحب ذوق مالک کے بارے میں رائے بدلنے کی سوچ رہی تھی۔ حالات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اتنا احمق نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک سمیت نظر آتا۔

دس دن تو مزے میں گذر گئے۔ گیارہویں دن پانچ بج گئے تو بھوک سے سل وانا کی بےچینی میں اضافہ ہو گیا۔ آج نہ جانے امجد کو کیوں دیر ہو رہی تھی۔ وہ عموماً پانچ بجے تک آ جاتا۔ خدا خدا کر کے چھ بجے امجد صاحب تشریف لائے اور سل وانا کی جان میں جان آئی۔ آتے ہی حسب معمول اس نے چند لمحے ڈاکٹر اور ان کی بیگم سے گفت زیادہ کی شنید کم۔ پھر سل وانا کو پیار سے تھپتھپایا، اس کی زنجیر کھولی اور دونوں ٹہلنے نکل پڑے۔

آج سل وانا کو راستہ بھی معمول سے زیادہ طویل لگا۔ خدا خدا کر کے شام کے دھندلکے میں دور سے وہ دلکش دروازہ نظر آیا تو سل وانا خوشی سے جھوم اٹھی، پیار سے غرائی اور پھر اس نے زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ خلاف معمول آج امجد نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ بڑے پھاٹک سے کوٹھی میں داخل ہو کر امجد نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد آج زنجیر کے ساتھ ساتھ کتیا کے گلے کا پٹہ بھی کھول دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ تیزی سے دم ہلاتی ہوئی آگے بڑھی اور بند دروازہ پہ رک گئی کیونکہ خلاف معمول آج چاپ کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اس نے ادھر ادھر سونگھ کر دیکھا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ آخر تھک کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور دم سے فرش صاف کیا اور

چپ چاپ صبر کے ساتھ سیڑھیوں پر منہ لٹکائے پنجوں پر سر رکھے بیٹھ گئی۔ غالباً گوشت اندر کہیں تلا جا رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ انتظار کر لوں گی!۔ اس نے آنکھیں بند کئے سوچا۔

امجد دور کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زنجیر اور پٹہ پودوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دیا اور چپکے سے سِل وانا کے کان میں صبر سے یہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کرنے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا۔ ڈرائینگ روم میں حسب توقع کوئی نہ تھا۔ بڑی بی غالباً اپنے کمرہ میں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ روزانہ مغرب کے بعد، سڑک کی دوسری طرف، اپنی ہم عمر ایک دوسری بڑی بی کے یہاں جاتیں۔ اس نے بیچینی سے گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا، دریچہ کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دارومدار تھا!

اُسے سِل وانا پر مکمل بھروسہ تھا۔ نہ جانے وہ کب تک یوں ہی خاموش بیٹھا اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ آسمان پر بادل اب بھی منڈلا رہے تھے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ یکایک حسب توقع بڑی بی کی چیخ سنائی دی تو وہ تیزی سے اٹھا اور ڈرائینگ روم میں جا پہنچا۔ بیگم زیدی عین اس وقت صدر دروازہ اندر سے بند کر رہی تھیں۔ انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ تیزی سے مڑیں۔ "امجد صاحب۔ کتا!" وہ چیخ پڑیں۔

"جی۔ ؟ کیا فرمایا؟؟" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"دروازہ پر اتنا بڑا خوفناک کتا بیٹھا ہے" وہ تیزی سے بولیں۔

"کتا؟۔ یہاں؟۔ ٹھہریئے۔ میں دیکھتا ہوں" یہ کہتے ہوئے امجد تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ جوں ہی دروازہ کے قریب پہنچا، بیگم زیدی تیزی سے ڈرائینگ روم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر سہمی سہمی نگاہوں سے صدر دروازہ کو دیکھنے لگیں۔ امجد نے باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر لیا اور چند لمحوں کے بعد دوبارہ لوٹ آیا۔ بیگم زیدی اب بھی خاصی سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ کتا ہی ہے لیکن عجیب لیچڑ قسم کا ہے۔ وہ تو ہلتا ہی نہیں" اس نے اطلاع دی۔

"لیکن۔ عجیب مصیبت ہے۔ مجھے تو باہر جانا ہے۔ بیگم شمسی انتظار کر رہی ہوں گی۔ اسے مار کر کیوں نہیں بھگایا آپ نے؟"

"اجی۔ السا شین ہے۔ یوں تو پالتو نظر آتا ہے۔ لیکن سنا ہے۔ اس نسل کے کتے بدتمیزی مطلق پسند نہیں کرتے۔ میں نے شوں شا کیا تو بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے راستہ بھٹک کر اس طرف آ گیا ہے۔ غالباً تھک کر سستا رہا ہے۔ آیئے۔ کچھ دیر یہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ مجھے یقین ہے دس پندرہ منٹ سستا کر چلا جائے گا۔" امجد نے تسلی دی۔ یہ بات بڑی بی کی سمجھ میں آ گئی اور دونوں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ جب پندرہ بیس منٹ گذر گئے تو امجد اٹھا اور ایک بار پھر اٹھ کر باہر گیا اور چند لمحوں کے بعد لوٹ آیا۔

"کیوں؟۔ گیا وہ؟" بڑی بی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ تو ہلتا ہی نہیں۔ میں نے پتھر اٹھا کر مارنے کی کوشش کی تو پیار سے دم ہلا کر اٹھا اور ایسی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ میرا تو دل پسیج گیا۔ وہ تو بے حد معصوم ہے بیگم زیدی۔ مجھے تو بیمار نظر آیا۔ مجھے یقین ہے پالتو ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ موسم خراب ہے۔ پڑے رہنے دیجئے باہر۔ صبح خود ہی چلا جائے گا۔" امجد نے سادگی سے سفارش کی۔ بنیادی طور پر بیگم زیدی رحم دل تھیں ویسے پالتو جانور انہیں پسند تھے سوائے کتوں کے۔ اس وقت غالباً وہ امجد کی لفاظی سے متاثر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ اس پر امجد نے فوراً کہا:

"ارے۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ کو بیگم شمسی کے یہاں جانا ہے۔ چلئے۔ میں پہنچا آتا ہوں۔ گھنٹہ بھر بعد خود آپ کو لے آؤں گا۔" یہ تجویز بیگم زیدی کو پسند آ گئی۔ دونوں باہر نکلے تو سِل وانا نے بڑی پرامید نگاہوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بی سہمی

امجد کے پیچھے پیچھے باہر نکلیں۔ امجد نے ایک بار پھر شوں شاں کیا۔ لیکن اس چھیڑ چھاڑ کا کتیا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور زبان نکالے مسکراتی رہی۔

"دیکھ لیا نا آپ نے؟— بے حد مسکین ہے۔ مجھے تو لگتا ہے بیچاری ستم رسیدہ ہے۔ دیکھئے۔ بالکل کچھ نہیں کرتی" یہ کہہ کر امجد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو فوراً بڑی بی نے اس کا بازو تھام لیا "نہیں نہیں امجد صاحب — کہیں حملہ نہ کر دے" انہوں نے روکا۔ "ارے نہیں بیگم زیدی — یہ تو بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہ بھوکی نظر آ رہی ہے۔ دیکھئے لمبی زبان باہر لٹک رہی ہے" امجد نے ہمدردی جتائی۔ بڑی بی دور سے خاموش کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ بِل دانا بھی دلچسپی سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بڑی بی امجد سے زیادہ معتبر نظر آئیں۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر کے باورچی کو آج ہو کیا گیا؟ آج امجد صرف زبانی جمع خرچ پر کیوں تلا ہوا تھا؟ — اس نے بیزاری سے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر ایک ٹانگ سے کان کھجانے لگی۔

"مجھے بھی بھوکی لگ رہی ہے" بیگم زیدی نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو اسے کھانے کو کچھ دے دوں۔ شاید کھانا کھا کر یہ چلی جائے" امجد نے ایک نئی تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کے دل پر کتیا کی بیکسی کا اثر ہونے لگا تھا۔ انہوں نے حامی بھر لی۔

جب وہ گھنٹہ بھر بعد ڈرتے ڈرتے پھاٹک میں داخل ہوئیں اور انہیں کتیا نظر نہیں آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ وہ خوش خوش ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو امجد کو منتظر پایا۔

"آپ خود ہی آ گئیں؟ میں آپ کو لینے آنے ہی والا تھا — میں ابھی اسے بھگاتا ہوں —۔ کمبخت یہاں یوں سو رہی ہے جیسے اس کے باوا کی میراث ہے" امجد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ — یہاں سو رہی ہے؟ — کون؟" بڑی بی نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ گھبرائیے نہیں — بے حد مسکین کتیا ہے۔ کتوں سے میری بھی جان نکلتی ہے۔ لیکن خدا کی قسم — یہ تو بھیڑ ہے بلکہ بھیڑ سے بھی زیادہ بے ضرر — وہ دیکھئے۔ پیٹ بھر کھانا ملا تو اس کونے میں کتنے آرام سے سو رہی ہے —۔ شی — اٹھ بھی — موسم خراب ہے تو کیا ہوا۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ چل نکل یہاں سے!"

امجد نے دوبارہ شوں شاں شروع کر دی۔ اس بدتمیزی کا بِل دانا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بیزاری سے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ "عجیب نامعقول انسان ہے — اتنی دیر بعد کھانا دیا اور اب چین سے سونے بھی نہیں دیتا — سونے دو بھئی — کیوں ستاتے ہو؟" — پنجوں پر سر رکھے وہ دوبارہ سکڑ کر سو گئی۔

"میرا خیال ہے اسے سردی لگ رہی ہے" بیگم زیدی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی ہاں جی ہاں" امجد نے خوش ہو کر فوراً کہا "سنا ہے اس نسل کے کتے بے حد نازک ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ حساس۔ سنا ہے فوراً نمونیا ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ تو کتیا ہے بیچاری۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو — یعنی اگر آپ اجازت دیں تو رات بھر بیچاری یہیں پڑی رہے۔ باہر بارش کے آثار ہیں" اس نے ڈرتے ڈرتے تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کو ہچکچاتے دیکھا تو اس نے فوراً کہا "صبح یہ نہ بھی گئی تو پولیس اور اخبار کی مدد سے اس کے سنگدل مالک کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تو یہ کسی بڑے گھرانے کی پالتو کتیا نظر آتی ہے"

اب کے امجد کی ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور بِل دانا کو گھر کے اندر رات گزارنے کی اجازت مل گئی۔

دوسرے دن امجد نے بِل دانا کے فرضی مالک کی تلاش شروع کر دی۔ حسب توقع اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں ایسی مسکین، اتنی بے ضرر، اس حد تک معقول کتیا کو کیسے گھر سے نکال دیا جاتا؟ — بیگم زیدی نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کے اصلی مالک کا پتہ نہیں چلتا کتیا یہیں رہے گی۔ غالباً انہیں بِل دانا بہت پسند آ گئی تھی۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

ماہ نو کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

بنگلہ افسانہ:

"زندگی ہے یا کوئی....."

علاء الدین الآزاد

مترجم: یونس احمر

بہت پہلے بادل چھٹ گئے تھے۔ لیکن جب شام کو نیرو گملے میں پانی دینے کے لئے آئی اور زینے کے پاس ایک خالی جگہ پر نظر پڑی تو اس کا جی یکدم سے اداس ہوگیا۔ بہت دیر تک وہ چپ چاپ ہاتھ میں بالٹی لئے کھڑی رہی۔

اگرچہ پھول کا گملہ چھوٹا اور بہت ہی معمولی سا تھا لیکن اس کے لئے نیرو ہمیشہ فکرمند رہتی۔ دوسروں کے لئے تو یہ بہت ہی معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن جو قرینے سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں انہیں اس کی اہمیت معلوم ہو سکتی ہے۔ کوئی چیز حقیر اور چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، لیکن دل میں اگر اس کی عزت ہے تو پھر یہی چھوٹی سی چیز بڑی بن جاتی ہے۔ نیرو کا دل بھی ایسا ہی تھا ـــــ بڑا ہی نازک، نرم اور حساس! اس کے دل کو کوئی بات ناگوار گذرتی تو وہ کمرہ بند کرکے دیر تک روتی رہتی اور اس طرح دل کا بار ہلکا کرتی۔

کل جو واقعہ پیش آیا کوئی اتنا سنگین واقعہ نہ تھا۔ کالج سے واپسی میں ظہیر کو کچھ دیر ہوگئی تھی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں اس نے برآمدے کے اوپر قدم رکھا ہی تھا کہ پھول کا گملہ جوتے سے ٹکرا گیا اور گر پڑا۔ اس نے گملے کو جھٹ سے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"کون ہے؟" آواز سن کر اندر سے نیرو نے پوچھا۔

"میں، میں ہوں" ظہیر نے جواب دیا "نیرو ذرا تم بھی آکر دیکھو"

ظہیر کی گھبراہٹ کا اندازہ لگا کر نیرو پریشان ہوگئی۔ خالہ اماں کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی؟ چار دن پہلے وہ عیادت کو گئی تھی۔ مرض نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ اسی دن سے نیرو گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی عالم میں آکر پوچھا ـــــ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے!"

"وہ دیکھو" ظہیر نے انگلی کے اشارے سے دکھاتے ہوئے کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اس کی آنکھوں نے ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھ لیا تھا۔ مٹی بکھر گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی چیختے ہوئے آ دھر گئی اور بولی ـــــ "کیسے ٹوٹا؟ کس نے توڑا اسے؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تو ظہیر مجرم کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ بولا "قصور میرا ہی ہے۔ مجھے ذرا ہوشیاری سے چلنا چاہئے تھا لیکن اب کیا کیا جائے۔ نیا گملہ لا دوں گا ـــــ کل ہی!"

نیرو خاموش رہی۔ کتنی خوشامدیں کرنے کے بعد وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر سے رجنی کے تین چار بیج لائی تھی۔ بہت دنوں تک گملے کی حفاظت کرتی رہی، پانی دیتی رہی، تب جا کر پودا ابھرا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ظہیر کا کوئی قصور نہیں پھر بھی وہ اس سے روٹھ ضرور گئی۔

بچپن ہی سے نیرو کی طبیعت اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے مگر خانہ داری سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ البتہ گھر کی زینت بڑھانے میں اس کی طبیعت خوب لگتی تھی۔ ماہانہ ڈھائی سو تو ملتے تھے ظہیر کو، اس کے باوجود وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا لیتی اور ان پیسوں سے گھر کو خوب سجاتی۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ ایک حصے میں مکان کی بیوہ مالکہ خود رہتی تھی، دوسرا حصہ نیرو کے قبضے میں تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمرے سے نکل کر کھلی ہوئی چھت تھی۔ صحن بھی کہہ لیجئے اسے۔ برآمدہ کوئی بڑا اور کشادہ نہ تھا تاہم اس میں تقریباً پندرہ گملے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھولوں کے

پودے بھی مختلف قسم کے تھے۔ جن میں دیسی بھی تھے اور ولایتی بھی۔ دروازوں اور دریچوں پر خوب صورت پردے لٹکتے تھے۔ بیٹھک میں بید کی کرسیوں کے بیچ میں ایک تپائی بھی تھی جس پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ دو الماریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ دیوار پر ایک آرٹسٹ سے تین طرح کے لینڈ سکیپ بنوائے گئے تھے۔ سونے کا کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔ پلنگ کے اوپر کئی گدے بچھے ہوئے تھے۔

نیرو اکثر کہتی۔ "محض پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سلیقہ سب سے بڑا آرٹ ہے۔" چنانچہ گھر دیکھ کر ہر آدمی اس کے سلیقہ کی داد ضرور دیتا تھا۔

ظہیر کی عمر ستائیس سے زیادہ نہیں ہوگی اس کے باوجود اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ورثہ میں کچھ نہ ملا۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اسلئے شہر چلا آیا۔ دنیا کے گرم و سرد چکھے، تب جا کر وہ آدمی بنا تھا۔ اس نے مسلسل جان توڑ محنت اور کوشش کی۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے مقابلہ میں آکر اپنی جگہ خود بنائی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ خانہ داری کی طرف سے نیرو کی بے پروائی فطری ہے وہ بعض اوقات پنجرے میں بند پنچھی کی طرح ہانپ اٹھتا۔ وہ اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دل شکنی کا بہت خیال تھا اسے۔ کیونکہ دنیا میں وہی تو اس کے لئے ایک سہارا تھی، وہی تو اس کی کل کائنات تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی بن ماں کی بچی تھی۔ خالہ نے اس کی پرورش کی۔ دونوں ایک دوسرے سے وہیں ملے تھے —— وہ بھری برسات کا دن! اس دن کو یاد کرکے ظہیر خلاء میں بھٹکنے لگتا، اس کی آنکھوں تلے کتنی تصویریں ناچ اٹھتیں۔

ظہیر کا ساتھی محفوظ بھی اکنامکس میں دوسرے پارٹ کا امتحان دے رہا تھا۔ جس دن گورنری راج کا اعلان کیا گیا اسی روز وہ اپنی کتابیں لیکر محفوظ کے گھر آ گیا تھا۔ محفوظ نے اُسے خوش آمدید کہا۔ اُس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اُسے اپنے گھر میں جگہ نہ دیتا کیونکہ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ لیکن اس نے ظہیر کی پریشانی کو دور کرتے ہوئے کہا تھا —— اگر میرے والدین کو تمہارے کرتوتوں کا علم ہوا تو انہیں صدمہ پہنچے گا۔ میں ان سے جھوٹ بولوں گا کہ تم امتحان میں میری مدد حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آ گئے ہو۔ میری باتوں کا انہیں ضرور یقین آ جائے گا۔"

یہ سن کر ظہیر کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

محفوظ کو ہنسی آ گئی۔ "اس میں احسان کی کیا بات ہے۔"

ظہیر دن بھر کمرے میں بند، کتابوں میں غرق رہتا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات اُبھرتے لیکن کسی ایک سوال کا بھی اسے جواب نہ ملتا۔ دوسرے دن شام کو وہ گھر سے باہر نکلا تھا اور رات کے بارہ بجے جب کچھ سر گراں گھر لوٹا تو اس کی آنکھوں نے ایک لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے منہ سے یہ آواز نکلنے ہی والی تھی —— "کون، مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے سوچا —— "میں یہاں مہمان ہوں اسلئے ممکن ہے کوئی لڑکی مجھ سے شرما کر بھاگ رہی ہو۔"

وہ گیٹ بند کرکے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے ٹھیس لگی اور منہ سے "اُف" نکل گئی۔ وہ بڑی مشکل سے کمرے کے پاس آیا۔ اس نے پاؤں کی انگلی کو غور سے دیکھا۔ اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ایک دم سے اس کا دماغ معطر ہو گیا "رجنی" کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ اس نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کون سو رہا ہے اُدھر؟ محفوظ؟ سونے دو اُسے۔ وہ میز کے قریب آ گیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی تیز کر دی۔ پلنگ کے پاس پھولدان رکھا ہوا تھا اور اس میں رجنی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ایک طرف کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور پاس ہی کھانا ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ بچھونے کے اوپر جو چادر تھی اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی بچھائی گئی ہو۔

زخم کی ٹیکلی بھول کر ظہیر بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اتنے میں دروازے کے باہر روشنی نظر آئی پھر آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز!

کچھ دیر کے بعد دس گیارہ سال کا ایک بچہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک شیشی دیتے ہوئے بولا۔ "ڈیٹول ہے، زخم دھو ڈالئے اس سے۔ اور پھر کھانا کھا کر سو جائیے۔"

ظہیر حیران رہ گیا! اس بچے کو کس نے یہاں بھیجا؟ اس نے لڑکے کو آواز دی "میاں ذرا سننا"

"کہئے" لڑکے نے کہا "جلدی کہئے مجھے نیند آرہی ہے"

ظہیر نے پوچھا "کیسے معلوم ہوا تمہیں کہ میری انگلی میں چوٹ لگی ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم" اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔

تھوڑا بہت کھانے کے بعد ظہیر جب سونے کے لئے گیا اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور دریچے سے سرد ہوائیں بھی آرہی تھیں۔ ظہیر کو نیند آگئی۔ تاریکی، بارش، ہوائیں —— فضا کیسی سحر آلود بن گئی تھی!

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بیحد خوش تھا۔ کتنے دنوں کے بعد اُسے پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور بستر بچھونے سے کود پڑا۔ ایں یہ کیا! اس کی زخمی انگلی میں پٹی کس نے باندھ دی تھی؟ اُسے اس گھر کے درو دیوار پُراسرار نظر آنے لگے۔

اس دن بھی وہ حسب معمول شام کو باہر گیا مگر پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس آگیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دریچے سے جھانکا۔ خواب تو نہیں ہے یہ؟ لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی اس کی کتابوں اور بچھونے کو درست کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ ظہیر چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے آہٹ محسوس کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بھاگ جانا ہی چاہتی تھی کہ ظہیر نے اس کو روک لیا اور پوچھ بیٹھا "تم کون ہو؟ تم؟"

لڑکی نظریں نیچی کر کے بولی "دیکھئے کوئی آجائے گا۔ مجھے جانے دیجیئے" اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں کیونکہ اسی دن دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ لڑکی کمرے سے چلی گئی۔

نیرو نے اس کی اداس اور پژمردہ زندگی کو جو رس اور رنگ بخشا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ اس کی نگاہیں ہر وقت اُسے سکھی دیکھنا چاہتی تھیں۔ گملہ خرید کر لا دینے کی بات اُسے یاد تھی۔ دوسرے ہی دن وہ بازار گیا۔ دکان سے پلٹ ہی رہا تھا کہ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور فریاد سنائی دی —— "بابا دیا کیجئے۔ مجھ پر نہیں میرے بچوں پر۔ خدا تمہیں سکھی رکھے گا"

ظہیر سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اکنی اس کی طرف پھینکی اور رکشا پر بیٹھ گیا لیکن اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ اس کی فریاد برابر اس کے کانوں میں آتی رہی اور گذشتہ شام کا ایک دردناک واقعہ اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ گذشتہ شام کو وہ پیدل گھر جا رہا تھا۔ عثمان غنی روڈ کے موڑ پر آیا ہی تھا کہ دیوار سے لگ کر بیٹھے ہوئے ایک شخص پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی نگاہیں ظہیر کو برابر گھور رہی تھیں۔ ظہیر اس کے پاس آیا اور کھڑا ہو گیا لیکن پھر چل پڑا۔ اس شخص نے پکارا۔ ظہیر کو بُرا معلوم ہوا۔ وہ رُکا نہیں وہ شخص دوڑتا ہوا ظہیر کے پاس آگیا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا اور کہا "میں پیسے نہیں لوں گا"

"پھر؟"

اُس شخص نے پھر گہری نظر سے ظہیر کو دیکھا اور یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کہتا تھا "مجھے پہچان نہ سکے۔ ہاں کیسے پہچانو گے مجھے میں انسان کہاں ہوں؟"

ظہیر حیران رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ وہ بہت دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد یکایک بول اُٹھا "ارے تم؟ تم ماجو؟"

"تو تم پہچان گئے مجھے۔ ہاں میں ہوں ماجو۔ رتن پور کا معتیر الدین" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا "ظہیر میں جانتا ہوں کہ زندہ نہیں رہوں گا لیکن مرنے سے پہلے زندگی حاصل کرنے کی لگن ہی ڈھاکہ لے آئی ہے۔ آگیا ہوں۔ تین دن ہسپتال گیا مگر داخل نہ ہو سکا۔ مجھے نکال دیا گیا"

بچپن کی بہت سی باتیں یاد کر کے ظہیر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں سا جو کہہ رہا تھا —— یکایک اپنے ایک ایم ایل اے دوست کی بات یاد آگئی۔ ان کا پتہ یاد تھا۔ ان کے گھر کے برآمدے میں پڑا رہا۔ ایک دن اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ پہچان تو گئے مگر بولے —— "مجھے فرصت

مطلق نہیں ہے۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔"

ظہیر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

ماجو کہتا گیا — "بعد میں تمہارا خیال آیا۔ اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم کالج میں پروفیسر ہو گئے ہو۔ لیکن گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ میں یہاں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اب کیا کروں کہ تم آ گئے۔ ظہیر مجھے بچا لو۔ ہسپتال میں داخل کرا دو — شہر میں تمہاری عزت ہے!" اتنا کہنے کے بعد وہ ہانپنے لگا۔

ظہیر نے کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں! مگر آج تو وقت نہیں ہے۔ کل صبح نو بجے داخل کرا دوں گا۔"

ماجو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں جانتا تھا تم یہ کام کر دو گے۔" اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ "بچ گیا تو قرضہ اتار دونگا بھائی۔"

"پریشان نہ ہو ماجو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ سوچ رہا ہوں آج کی رات تم کہاں گذارو گے؟"

"کہاں گذاروں گا۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو؟"

"میرا مکان چھوٹا سا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو ڈھاکے میں مکان کتنی مشکل سے ملتا ہے۔ کس طرح بس ہم میاں بیوی کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے۔"

یہ کہنے سے پہلے ظہیر کے ضمیر نے ملامت کی تھی لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ اس مریض اور گندے آدمی کو دیکھ کر نیرو پریشان ہو جاتی۔ ماجو نے اپنے دوست کے دل کی گہرائی کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے کہا "نہیں میں تم لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہیں رات گذار دوں گا۔ البتہ سویرے ٹھیک وقت پر آ جاؤ — آؤ گے نہ؟

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" ظہیر نے کہا۔ "ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔ ویسے گھر پہنچ کر میں تمہارے لئے جگہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اگر گنجائش نکل آئی تو فوراً آ کر لیجاؤں گا۔ اچھا جاتا ہوں۔"

اور وہاں سے رخصت ہونے کے بعد ظہیر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ وہ تو اس کے لئے کمرے میں نہ سہی برآمدے میں جگہ نکال سکتا تھا۔ اس نے نیرو کو تیار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن گلدان ٹوٹ جانے کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کا جو پردہ گر چکا تھا اس کی وجہ سے یہ واقعہ اس کے ذہن سے دور ہو گیا۔

اور جب ظہیر کا رکشا نواب پور روڈ سے عثمان غنی روڈ کے موڑ تک آ گیا تو سڑک کے بائیں جانب لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے دیکھا ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی ہے۔ اور کچھ لوگ اس کے کفن دفن کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔

ظہیر تھوڑی دیر تک رکشا پر چپ چاپ بیٹھا رہا پھر نیچے اترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا لاش کے پاس آیا۔ اس نے چادر اٹھائی۔ چہرے کو دیکھا بھیڑ میں سے ایک شخص نے پوچھا۔ "صاحب آپ پہچانتے ہیں اسے؟" لیکن وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "نہیں، نہیں۔ میں نہیں پہچانتا۔ اسے نہیں پہچانتا۔" یہ کہہ کر وہ رکشا پر بیٹھ گیا۔ گھر واپس آ گیا — مگر گم صم! میز پر کھانا لگا کر نیرو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جوڑے کو پھولوں سے سجایا تھا۔ گلے میں ہار تھا اور ساڑی بھی نئی تھی — دونوں نے پہلے ہی سے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ظہیر نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا اس کے بعد دونوں گملے رکھے اور کچھ کہے بغیر وہ خواب گاہ میں چلا گیا اور کسی نہ کسی طرح جوتے اتار کر بچھونے پر لیٹ گیا۔

نیرو اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ اور ظہیر کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی — "کیا درد ہے؟ منہ ہاتھ دھو لیں۔"

ظہیر نے اس کی طرف دیکھا اور ایک درد بھری آواز میں کہا۔ "نیرو ذرا دیکھنا میری آنکھوں سے خون تو نہیں ٹپک رہا ہے؟"

"نہیں تو" یہ کہہ کر نیرو نے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "مگر جسم تپ رہا ہے۔ کیوں؟ کیا بخار ہے یا کوئی اچانک صدمہ ہوا ہے۔ چلو۔ کوئی بات نہیں۔ اٹھو جلدی۔"

ظہیر کچھ نہ کہہ سکا صرف نیرو کو خاموش نگاہوں سے دیکھ کر بچھونے سے اٹھ بیٹھا۔

★

افسانہ:

حکیم روشن دین

منظور عارف

حکیم روشن دین جب فوت ہوئے تو اُن کے احباب نے اللہ تعالیٰ سے اُن کی تین بیواؤں اور نو بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمانے کی دُعا کی اور چلے گئے۔ مرحوم ایک درمیانہ درجہ کے حکیم اور بے ضرر سے انسان تھے تعلیم معمولی تھی اس لئے اکثر و بیشتر سنی سنائی باتوں پر ایمان لے آتے اور اُن پر سختی سے عمل بھی کرتے۔ ویسے پابندِ صوم و صلوٰۃ بھی تھے اور کبھی کبھی امامت بھی کرتے۔

حکیم صاحب سرخ و سفید رنگت، میانہ قد اور دُہرے بدن کے آدمی تھے۔ اُن کی پہلی شادی بیس برس کی عمر میں جب قاضی احمد دین کی بڑی لڑکی سلطانہ سے ہوئی تھی تو اُن کے والد بقیدِ حیات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم صاحب اُن دِنوں ذرائع آمدنی سے اگر بالکل نہیں تو کافی حد تک بے نیاز تھے۔

سلطانہ نہ تو زیادہ خوبصورت تھی نہ پڑھی لکھی اور نہ گھریلو کام کاج ہی میں ہوشیار۔ البتہ شریف تھی، جوان تھی۔ شادی سے پہلے نہ سلطانہ نے حکیم صاحب کو دیکھا تھا نہ حکیم صاحب نے سلطانہ کو۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کے والد سلطانہ کے والد کو زبان دے چکے تھے اس لئے نیک فرزند کی حیثیت سے حکیم صاحب کو یہ رشتہ منظور کرنا پڑا۔ اُن کی پہلی تین لڑکیاں ساجدہ، زینب اور کلثوم اُن کے والد کی زندگی ہی میں پیدا ہوئیں۔ حکیم صاحب نے کچھ روایتی آرزوئیں خواہ مخواہ اپنے دِل میں پال رکھی تھیں۔ نہ جانے کیوں انھیں لڑکیوں کی پیدائش سے نفرت تھی۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اکثر ایک لڑکے کی پیدائش کی آرزو کا اظہار کرتے۔ معلوم نہیں یہ اُن کے حقیقی جذبات تھے یا محض دوسری شادی کرنے کا بہانہ۔ ساجدہ کے بعد زینب اور زینب کے بعد کلثوم کی پیدائش نے انھیں سلطانہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ جب اُن کے والد فوت ہوئے تو وہ ایک سال تک نہایت سنجیدگی سے مطب کی طرف توجہ دیتے رہے۔

ایک روز ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو، جس کے جسم پر بہت بُری طرح خارش تھی لے کر حکیم صاحب کے مطب میں آئی۔ حکیم صاحب اُس وقت پچیس برس کے لگ بھگ تھے، اور داڑھی بھی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو دیکھنے کے بعد اُسے پینے اور مالش کرنے کی دوا دی اور ساتھ ہی غذا میں پرہیز کی بھی ہدایت کی۔ ابھی تک حکیم صاحب نے لڑکی کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ صرف ہاتھ ہی دیکھے تھے جنھیں دیکھ کر انھیں معلوم ہو گیا کہ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ لڑکی کو ایک روز پیشتر بخار ضرور ہوا تھا۔ مگر اب اتر چکا تھا۔ اِس کے باوجود احتیاطاً اُس نے پینے کی دوا مانگی۔ حکیم صاحب نے اُس کی نبض دیکھنے کے بعد اُس کی زبان دیکھنا چاہی۔ لڑکی نے جب چہرے سے نقاب ہٹائی تو حکیم صاحب کو گویا اپنے کسی پرانے خواب کی تعبیر مل گئی۔ وہ بڑی دیر تک اُس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ لڑکی نے شرما کر نقاب ڈال لی اور کھڑے ہو کر آہستہ سے بولی "دوا نہیں دیں گے آپ؟" حکیم صاحب کچھ سٹپٹا گئے اور کہنے لگے "ہاں، ضرور، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں خود بیمار ہو گیا ہوں!" اس عجیب جواب پر لڑکی مخمصہ میں پھنس گئی اور اُس نے جھٹ بھائی کا ہاتھ تھام لیا اور دوا کے پیسے پوچھنے لگی۔ حکیم صاحب اپنی ترنگ میں کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ کہنے لگے۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہو۔ خیر اگر لینے ہوئے تو بعد میں لے لوں گا۔ لڑکے کو ابھی کچھ روز اور دوا لینے بھیج دیا کرو اگر ساتھ لے آیا کرو تو بہتر ہے"۔ لڑکی چپ چاپ دُکان سے باہر نکل گئی۔ البتہ ایک بار اُس نے مڑ کر ضرور دیکھا۔ یہ فریدہ اور حکیم صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

حکیم صاحب کو اب واقعی عشق کا بخار چڑھنے لگا اور وہ فریدہ کے خیال میں کچھ ایسے محو رہنے لگے کہ سلطانہ مکمل بے توجہی اور تغافل کی نذر ہو گئی۔ سلطانہ اکثر سوچتی کہ اُس کا قصور کیا ہے۔ آخر کیوں حکیم صاحب نہ اُس کی طرف توجہ دیتے ہیں نہ بچوں کی طرف۔ وہ کیوں ہر وقت

گھومتے گھومتے رہتے ہیں۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ انھیں فریدہ سے محبت ہوگئی ہے، جو اُس سے زیادہ حسین اور زیادہ ہوشیار تھی۔ آخر اُس نے ایک روز حکیم صاحب سے وجہ پوچھ ہی لی۔ حکیم صاحب ہرگز نہ بتاتے اگر فریدہ کے والد اپنی لڑکی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دینا منظور نہ کر چکے ہوتے چنانچہ حکیم صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں جو ازروئے "اسلام" نہ صرف جائز بلکہ اُن کے معاملہ میں تو فرض ہے! سلطانہ بہت چیخی چلائی مگر انھوں نے سنی اَن سنی ایک کردی۔ ان کی دلیل ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ انھیں نرینہ اولاد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سلطانہ کو یہ زہر پینا ہی پڑا۔ اور حکیم صاحب کی شادی فریدہ سے ہوگئی۔ اُنھوں نے اپنے والد کے اندوختہ سے اپنے مکان کی ساتھ والی چھوٹی سی حویلی بھی مہنگے داموں خرید لی اور بیچ کی دیوار ہٹا کر دونوں حویلیوں کو ایک کر دیا۔

سلطانہ گو دل میں بے حد کڑھتی مگر شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے اُسے فریدہ کی خدمت کرنا ہی پڑتی۔ اُس کی حیثیت بالکل نوکرانیوں کی سی ہو چکی تھی۔ فریدہ کی شادی کو لگ بھگ آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور ساجدہ اب قریب قریب چھ برس کی تھی۔ اس لئے گھریلو معاملات کی کچھ نہ کچھ شُدھ بُدھ رکھنے لگی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اداس دیکھ کر اکثر اُس کا گھٹنا تھام کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھتی رہتی۔ بعض اوقات عجیب عجیب سوال کرتی۔ "ماں، ہمالے گھل میں ابا کیچھ لے آئے ہیں۔؟ یہ عولت کون ہے۔ یہ مجھے گھُولتی ہے مگل ابا کے چھات بیچ بیچ کے باتیں کلتی ہے، ماں ابا اُچھ کے چھات کھیلتے ہیں۔ میلے چھات کیوں نہیں کھیلتے۔ ماں کلچھوم کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتے۔ جلینب لوتی ہے تو اُچھ کو مالتے ہیں۔ ماں تمہالے چھات کیوں نہیں کھیلتے؟" اور ماں اُسے سینے سے لگا کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ ساجدہ رونی صورت بنا کر پھر سوال کرنا شروع کر دیتی۔ "ماں تم لوتی کیوں ہو؟" ماں دل پر قابو پاکر جواب دیتی۔ "نہیں بیٹی، دیکھو، میں تو ہنس رہی ہوں۔ میں کب روتی ہوں۔" ماں اسے اپنے سامنے بٹھا لیتی اور ہنسنے کی کوشش کرتی۔ "ماں، یہ عولت کون ہے؟" وہ پھر سوال کرنا شروع کر دیتی۔ ماں جواب دیتی۔ "بیٹی وہ تمہاری نئی ماں ہے ان کی بات مانا کرو۔ ابا مٹھائی لا کر دیں گے۔" یہ بات ساجدہ کی سمجھ میں نہ آتی۔ "نہیں ماں میلی ماں تو تم ہو۔ یہ تو مجھے گھُولتی ہے۔ مالنے کو دولتی ہے۔ ابا کے چھامنے بلاتی ہے تو ابا کہتے ہیں۔ بھاگ جا منحوچ۔ ماں منحوچ کیا ہوتا ہے؟"

"منحوس اچھی لڑکی کو کہتے ہیں" اور ماں پھر رونے لگتی۔

حکیم صاحب کی دوسری شادی کے بعد چاند دسویں بار ڈوب چکا تھا۔ آج فریدہ نے اپنی حالت کچھ ایسے الفاظ میں حکیم صاحب کو بتادی تھی کہ عصر کی نماز کو مسجد جاتے انھیں سلطانہ سے پہلی بار نرمی کے ساتھ بات کرنا پڑی۔ "سلطانہ فریدہ کا خیال رکھنا۔ میں جاتے ہوئے یوسف صاحب سے بھی ملوں گا۔ اُن کی بیگم بھی آجائیں گی۔ ضرورت پڑی تو مجھے مسجد سے بلا لینا۔" حکیم صاحب کے یہ بول سلطانہ کے کانوں میں رس گھول گئے۔ اس نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ خدا اس کے شوہر کو فریدہ کے بطن سے چاند سا بیٹا عطا کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر اُس کے شوہر کی یہ آرزو پوری ہوگئی تو وُہ اس کی طرف ضرور توجہ دیں گے اور پھر بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹیاں بھی اُنھیں پیاری لگیں گی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی فریدہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فریدہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ سلطانہ اودوائن کی طرف پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ اور اس کے پاؤں دابنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ آخر اُس نے خاموشی توڑی "فریدہ، میں دل سے دعا کرتی ہوتی کہ خدا تمھیں خوبصورت بیٹا عطا کرے۔ اُسے میں پالوں گی، میں کھلاؤں گی، میں سلاؤں گی۔ میں اُسے بالکل اپنا بیٹا سمجھوں گی۔" فریدہ اگر آج مجبوری کی حالت میں نہ ہوتی تو اُس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیتی اور کہتی تم بکواس کرتی ہو۔ جھوٹ کہتی ہو۔ اس میں ضرور تمہاری کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ جنسی یا اقتصادی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ کیوں کہ آج اُسے سلطانہ کی مدد کی ضرورت تھی۔ سلطانہ جواب نہ پاکر خاموش ہوگئی، اور پاؤں دابتی رہی۔

یوسف صاحب کی بیگم، محمودہ کے آنے نے اس خاموشی کو توڑا۔ محمودہ نے داخل ہوتے ہی ہنس ہنس کر باتیں کرنا شروع کردیں۔ محمودہ ایک زمانے میں بیحد زندہ دل تھی مگر گیارہ برس میں سات بچّوں کی پیدائش اور اُن کی پرورش نے اُسے جسمانی طور پر اتنا کمزور اور ذہنی طور پر اتنا تھکا دیا تھا کہ اب جب کبھی اُسے ہنسنے کا موقع ملتا تو ایسا لگتا گویا اس کے ہونٹ ہنس رہے

ہوں اور آنکھیں حیرت سے تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ محمودہ کے شوہر یوسف صاحب اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ فارسی کے ایم۔ اے تھے اور بی۔ ٹی بھی۔ معلم ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں انکساری اور عادات میں سادگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اُن کی آمدنی سات بچوں کی پیدائش اور اُن کی اچھی پرورش کی متحمل نہ تھی مگر بچارے لوگوں کے سامنے قدرت کی دین کہہ کر اور قدرت کو رازق ثابت کرکے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر لیتے۔ قدرت تو واقعی پیدائش کے بعد سب کو رزق دیتی ہے اور یوسف صاحب کے بچوں کو بھی وہ رزق پہنچا رہی تھی۔ مگر اُس نے یوسف صاحب کے دِلوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کردی تھی۔ اس لئے کہ اُس نے یوسف صاحب کو عقل اور تعلیم دونوں نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔ اور اُن کے سامنے ان کے والد کی مثال بھی پیش کردی تھی۔ جسے اُس نے اُن کی بساط اور خواہش کے مطابق صرف دو بچے عطا کئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ یوسف اور ثمینہ۔ اگر یوسف صاحب کے والد فیاض محمد خاں چاہتے اور شادی شدہ زندگی کی احتیاطیں نہ کرتے تو قدرت اپنے اٹل قوانین کے تحت انھیں ضرور اولاد کی کثرت کی سزا دیتی۔ بچوں کو رزق تو ملتا مگر فیاض محمد خاں کی زندگی ضرور عذاب بن جاتی اور پھر اولاد پر مصیبتیں نازل کرنا بھی قدرت کی طرف سے والدین کے لئے ایک منتخب سزا ہے۔ اگر فیاض محمد خاں کی اور اولاد ہوتی تو آج ثمینہ گریجویٹ اور یوسف صاحب ایم۔ اے، بی۔ ٹی نہ ہوتے۔ ثمینہ کو آپریٹو بنک کے ایک انسپکٹر کی بیوی تھی اور گیارہ برس کی شادی کے بعد اب وہ صرف دو بچوں کی ماں تھی۔ روبینہ اور ناصر۔ پیارے پیارے۔ خوبصورت۔ صاف ستھرے مہذب بچے۔ بیگم یوسف کو جب کبھی ثمینہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو اُسے اُس کی صحت اور اُس کے بچوں کی پرورش پر رشک آتا۔ ایک بار تو اُس نے ثمینہ سے پوچھ بھی لیا تھا "تمہارے ہاں اور بچے کیا اب نہیں ہوں گے"؟ بھابی کے اس سوال پر ثمینہ کچھ شرما سی گئی تھی مگر اُس نے جواب ضرور دیا تھا۔ "آدمی اگر سمجھ دار ہو اور جانتا بھی ہو کہ خاندان کو کتنی حد میں رکھا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" بیگم یوسف اس جواب پر حیران رہ گئی تھیں اور اسی حیرت کے عالم میں انھوں نے پوچھ لیا تھا۔ "مگر روبینہ کے ابا......" اور ثمینہ نے بات کاٹ دی تھی۔ "وہ اور ہم دونوں ہمخیال ہیں جبھی تو ایسا ہے"۔ بیگم یوسف جو کم تعلیم یافتہ تھی۔ اور یہ غلط تصور لئے ہوئے تھی کہ یہ سب کرشمہ قدرت ہے اس سوال سے مطمئن نہ تھی چنانچہ ایک بھرپور سوال کر دیا "کارخانہ قدرت میں دخل"؟ اِس پر ثمینہ نے فوراً جواب دیا تھا۔ "قدرت ہم پر بہت مہربان ہے۔ وہ میرے دو بچوں کو تمہارے سات بچوں جتنا رزق بہم پہنچا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں ذہنی سکون بھی حاصل ہے۔" اس پر بیگم یوسف خاموش ہوگئی تھیں۔ آج اس کے گھر ثمینہ آئی ہوئی تھی۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ۔ اس لئے محمودہ کو اطمینان تھا کہ اس موقع پر اس کے بچے بھاگے بھاگے حکیم صاحب کے گھر اُدھم مچانے نہیں آدھمکیں گے۔ اسی خیال سے آج محمودہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اور فریدہ کو بھی ہنسا رہی تھی۔ ایک لطیفہ تو اس نے ایسا سنایا کہ فریدہ بھی اپنی غیر حالت بھول کر بے تحاشا ہنس پڑی اور چونکہ ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں بل نہ پڑ سکتے تھے، اس لئے بچہ پیدا ہوگیا۔ محمودہ نے فریدہ کو سہارا دیا اور سلطانہ نے بچہ کو۔ مگر سلطانہ نے جب دیکھا کہ لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ تو اُس نے ڈر کے مارے خاموشی سے یہ خدمت محمودہ کے سپرد کردی اور خود فریدہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئی۔

حکیم صاحب کو جب اِس کی اطلاع ملی تو وہ اُس رات گھر نہ آئے۔ علی الصبح مطب میں چلے گئے۔

دوسری رات جب آئے تو بچی کی صورت تک نہ دیکھی۔ رسماً فریدہ کی طبیعت پوچھی اور سلطانہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر الگ کمرے میں جا کر سو رہے۔ کچھ روز بعد جب فریدہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تو اس نے حکیم صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ "سلطانہ منحوس ہے، اس گھر میں اُس کی موجودگی بُرا شگون ہے"۔ مگر حکیم صاحب چونکہ رائے عامہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے سلطانہ کو گھر سے نکالنا بھی خلافِ مصلحت سمجھا۔

فریدہ اپنے حسن اور اپنی چالاکیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین سال تک حکیم صاحب جیسے سادہ مزاج انسان کا دل اپنے دل میں لئے رہی۔ اس مدت میں اس کی دو لڑکیاں اور پیدا ہو چکی تھیں۔ ہاجرہ اور فاطمہ۔ فاطمہ کی پیدائش نے حکیم کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ اب انھیں فریدہ کی ہر بات میں بناوٹ کی بُو آنے لگی تھی۔ اوّل اوّل تو انھوں نے بے رخی اختیار کی۔ پھر مکمل تغافل برتنا شروع کر دیا۔

کراچی میں بین الاقوامی یوم اطفال

صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان،
بچوں کی سلامی

تفریحی کھیل، پریڈ اور دیگر مظاہرے

مرکزی تقریب۔
جنرل محمد ایوب خان، لفٹننٹ جنرل برکی اور چند مہمان

لڑکوں کی پریڈ

اس تغافل کی تاب، نہ لاکر فریدہ بات بات پر سلطانہ سے جھگڑ پڑتی۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کو اپنی دونوں بیویوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس لئے سلطانہ بھی اب فریدہ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگی۔ حکیم صاحب مطب سے جب تھک تھکا کر گھر آتے۔ تو بچہ بچیوں کے شور غل سے اُن کے کان گویا پھٹنے لگتے۔ بعض اوقات تو وہ اُنھیں اتنا پیٹتے کہ بے ہوش ہونے لگتیں! فریدہ اور سلطانہ چپ چاپ رہتے بیٹھی رہتیں کیونکہ دونوں کو معلوم تھا کہ زبان کھولی نہیں اور طلاق کی نوبت آئی نہیں! کثرت اولاد کا اکثر یہی انجام دیکھا گیا ہے۔

ایک روز حکیم صاحب کے مطب میں ایک دیہاتی بڑھیا میلے کچیلے کپڑے پہنے داخل ہوئی اور درد ناک صورت بنا کر ان کی منت سماجت کرنے لگی کہ وہ اُس کے بیمار شوہر کو دیکھنے اس کے گاؤں چلے چلیں۔ حکیم صاحب نے اس کی حالت سے اندازہ تو لگا لیا کہ فیس تو برائے نام ہی ملے گی مگر اُن کی خدا ترسی کی ایک شہرت تو تمام ہو چکی تھی۔ اس لئے انکار بھی نہ کر سکے۔

حکیم صاحب جب بڑھیا کے ہمراہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں داخل ہوئے تو صحن میں ایک انتہائی لاغر، سفید ریش، بزرگ چارپائی پر پڑا کھانس رہا تھا۔ ان کے بالکل قریب ہی ایک اور چارپائی پڑی تھی حکیم صاحب اس کے اوپر بیٹھ گئے اور بیمار کی نبض دیکھنے لگے۔ پھر زبان، آنکھیں، پیٹ اور پسلیاں دیکھیں اور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ بڑھیا کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ اس لئے ہاتھ جوڑ کر اُن کے قریب زمین پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رو رو کر التجا کرنے لگی کہ وہ خدا کے لئے اُس کے شوہر کو کسی نہ کسی طرح بچا لیں ورنہ وہ اور اُس کی بیٹی دنیا میں بالکل بے سہارا رہ جائیں گی۔ اس پر بیمار نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں کہنے لگا۔ "بے سہارا تو تم اس وقت سے ہو گئی تھیں جب تمھاری آنکھوں کے سامنے تمھارے چار لڑکوں نے ایک ایک کر کے دم توڑ دیا تھا۔ میرے دم کا کیا بھروسہ۔ دو روز اور جی لوں گا۔" حکیم صاحب نے اسے تسلی دی اور کہا کہ خدا نے چاہا تو اُن کی دوا سے بیمار کو ضرور شفا حاصل ہوگی۔ بڑھیا کو اچانک کچھ یاد آیا اور اُس نے آواز دی "بیٹی۔ چائے تیار ہوئی یا نہیں؟" آواز سنتے ہی ایک نوجوان، سرو قد اور حسین و جمیل لڑکی قدرے پھٹے مگر صاف کپڑے پہنے اور دونوں ہاتھوں میں پرانی ٹرے تھامے سامنے کے کمرے سے نمودار ہوئی۔ حکیم صاحب نے اُس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے! لڑکی نے سلام کیا اور ٹرے اُن کے سامنے چارپائی پر رکھ کر ماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئی، اور ایک تنکے سے کچی زمین پر الٹے سیدھے خطوط کھینچنے لگی۔ حکیم صاحب چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ لڑکی پر بھی ازرہ اخلاق نظر ڈال لیا کرتے تھے اچانک انھیں کچھ سوجھا اور کہنے لگے۔ "مائی تم بالکل فکر نہ کرو۔ چچا میاں انشاء اللہ بالکل تندرست ہو جائیں گے میرے بارے میں سب جانتے ہیں۔ دوسروں کا دکھ میرا دکھ ہے۔ اور دوسروں کا آرام میرا آرام ہے۔ اور پھر تم تو بہت مظلوم ہو تمہاری اور چچا میاں کی مدد کرنا تو میرا فرض ہے۔ خدا کے لئے میری فیس یا دوا کے پیسوں کا خیال ہرگز اپنے دل میں نہ لانا ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔ مجھے تم اپنا ہی سمجھو اور روز میرے مطب سے دوا لے جایا کرو۔ کہو تو میں خود روز چچا میاں کو دیکھنے آجایا کروں۔ یا پھر کسی اور کو.... بلکہ اس کو، کیا نام ہے اس کا؟" بڑھیا بولی "جی زرینہ" حکیم صاحب کو زرینہ کا نام اُس وقت سے یاد تھا جب اُس کی ماں نے اُسے آواز دی تھی وہ کچھ تو چھپانا چاہتے تھے اور کچھ اس نام کا لطف لینا۔ چنانچہ انھوں نے دہرایا۔ "زرینہ۔ اچھا۔ اچھا۔ ہاں تو بیشک زرینہ کو بھیج دیا کرو۔ مگر دوا کے استعمال میں ناغہ نہ ہونا چاہیئے"۔

اس کے بعد زرینہ نے روزانہ ان کے مطب میں آنا شروع کر دیا۔ زرینہ تین میل سے چل کر آتی اس لئے حکیم صاحب اُسے آرام کرنے کے بہانے بٹھائے رکھتے جس روز مطب میں اور کوئی مریض نہ ہوتا حکیم صاحب، موقع کو غنیمت جان کر اُس کے قریب جا بیٹھتے اور اس سے نہ صرف اظہار ہمدردی کرتے بلکہ ہر قسم کی امداد کا وعدہ کرتے۔ ایک روز انھوں نے زرینہ سے پوچھا۔ "زرینہ میرے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، میں اچھا آدمی ہوں یا بُرا؟" زرینہ نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں"۔ انھوں نے دوسرا سوال کر دیا۔ "نہیں، بلکہ تمہارے دل کو میں اچھا لگتا ہوں یا بُرا؟" زرینہ خاموش رہی۔ بھلا اس مہمل اور بے محل سوال کا وہ کیا جواب دیتی۔ حکیم صاحب نے اصرار کیا۔ "بتاؤ۔ سچ سچ بتاؤ۔ اگر بُرا لگتا ہوں تو صاف صاف کہہ دو" زرینہ خاموش رہی۔

حکیم صاحب سمجھے۔ الخاموشی نیم رضا۔ اب حکیم صاحب نے اپنا راستہ تیار کر لیا تھا، کہنے لگے۔ "زرینہ مجھے تم سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے۔ بے پناہ۔ میں ہر وقت تمھارے ہی متعلق سوچتا رہتا ہوں۔" زرینہ نے اپنا سر اور بھی جھکا لیا۔ آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور بالکل بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ حکیم صاحب نے پھر پوچھا۔ مگر وہ خاموش ہی رہی۔ اس پر حکیم صاحب نے کہا، "کیا میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی غلطی کی ہے؟" زرینہ نے زبان کھولی "میں کیا کہہ سکتی ہوں"۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور پھر حکیم صاحب کی طرف دیکھا! اور سلام کر کے مطب سے باہر چلی گئی۔ حکیم صاحب، دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور اُس کے خیال میں کھوئے رہے۔

دوسرے ہی روز حکیم صاحب زرینہ کے گاؤں گئے اور اس کی ماں سے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ ماں فوراً مان گئی۔ اب زرینہ حکیم صاحب سے پردہ کرنے لگی۔ اگر زرینہ کا والد ذرا بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا تو اُن کی شادی میں کوئی دیر نہ لگتی۔ مگر زرینہ کے والد کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ زرینہ کے والد کی وفات کی وجہ سے حکیم صاحب کی شادی بھی پورے ایک برس تک رکی رہی۔

ایک برس کے بعد جب حکیم صاحب اور زرینہ کے نکاح کا دن مقرر ہو گیا تو انھوں نے اپنی دونوں بیویوں کو بلایا اور ان سے اپنی ہونے والی تیسری شادی کا ذکر چھیڑا۔ دلیل، زرینہ اولاد کی خواہش کے سوا کچھ نہ تھی۔ سلطانہ، جو ایک بار پہلے بھی یہ زہر پی چکی تھی، زیادہ سدِ راہ ثابت نہ ہوئی۔ مگر فریدہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس پر حکیم صاحب کو وہی حربہ یاد آیا۔ جس کے استعمال کا حق مرد کو ہر وقت حاصل ہے۔ مگر انھوں نے قدرے احتیاط سے کام لیا۔ اور فریدہ کو اجازت دی کہ اگر وہ ناخوش ہے تو وہ طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ طلاق کا نام سنتے ہی فریدہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

زرینہ کے نکاح کی رسم نہایت ہی خاموشی اور سادہ طریقہ پر ادا ہوئی۔ اور جب وہ لاکھوں آرزوؤں اور لاکھوں تمناؤں کے ساتھ حکیم صاحب کے گھر میں داخل ہوئی تو اُن کی چھ لڑکیوں اور دو بیویوں نے اڑی اڑی رنگت اور خاموش نگاہوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

اب کے بھی چاند جب دسویں بار ڈوبا تو حکیم صاحب کی مراد پوری نہ ہوئی۔ زرینہ نے حکیم صاحب کی معمولی سی بے رخی سے اندازہ لگا لیا کہ اُس کا حشر بھی سلطانہ اور فریدہ کا سا ہونے والا ہے۔ وہ ہر وقت اسی خیال میں کھوئی رہتی۔ چونکہ وہ گاؤں کی رہنے والی تھی اس لئے اس کے سوچنے کا طریقہ شہریوں کے طریقے سے مختلف تھا۔ ایک روز وہ دیر تک سوچتی رہی تو اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اور بہت خوش ہوئی۔ اُسی روز اُس نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی ماں کو اپنے پاس بلانے کا پیغام بھیجا جس کا علم حکیم صاحب کو نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنی ماں کے سامنے ایک تجویز پیش کی اور اُس کی ماں نے اُسے یقین دلایا کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔

ایک صبح حکیم صاحب نماز کے لئے اٹھے تو زرینہ بھی ایک قہقہہ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حکیم صاحب نے سبب دریافت کیا تو وہ فوراً سنجیدہ ہو گئی آنکھیں مل کر کلمہ پڑھا۔ اور اپنا خواب بیان کیا کہ اُس نے خواب میں دو ایک شاخ پر گلاب کا ایک پھول دیکھا ہے مگر جب وہ اُسے توڑنے کے لئے دوڑی تو دو مرتبہ بُری طرح گری اور اُس کے پاؤں میں دو بڑے بڑے کانٹے چبھے مگر تیسری بار وہ پھول کے قریب پہنچ گئی اور پھول توڑ لیا۔ اس پر وہ خوش ہو کر اس زور سے ہنسی کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ حکیم صاحب نے کافی دیر تک سوچنے کے بعد اُس سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے ضرور اس کی تعبیر پوچھیں گے۔ زرینہ نے اُسے اپنے گاؤں کے دو مشہور تعبیر بتانے والوں کے نام بتائے حکیم صاحب نماز سے فارغ ہو کر سیدھے اس کے گاؤں گئے اور تعبیر بتانے والوں سے جا کر ملے۔ دونوں نے فیصلہ دیا کہ جس عورت نے یہ خواب دیکھا ہے اُس کی دو لڑکیاں ہوں گی۔ اور اُس کے بعد اُسے خدا بیٹا دے گا۔ گرنے اور کانٹے لڑکیوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور پھول بیٹے کی طرف۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایسے اچھے اور واضح خواب بہت کم خوش نصیب دیکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بیحد خوش ہوئے اور اسی خوشی میں ڈیڑھ برس بعد جب زرینہ کے بطن سے دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو انھیں ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ سلطانہ اور فریدہ حیران تھیں کہ زرینہ نے حکیم صاحب پر کیا جادو کر دیا ہے۔

سلطانہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ ناصر۔ جو عمر میں اُس سے چھوٹا تھا۔ ناصر کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بہن اور حکیم صاحب کو اپنے ساتھ جہلم سے راولپنڈی لے جانے کو خود چلا آیا تھا۔ اُس نے حکیم صاحب کی بہت منت سماجت کی کہ وہ ضرور چلیں۔ چنانچہ حکیم صاحب نے وعدہ کر لیا کہ وہ عین شادی کے دن پہنچ جائیں گے۔ وہ فی الحال اپنی بہن کو لے جائے۔ حکیم صاحب دنیا دکھاوے کو شادی کے دن راولپنڈی پہنچ گئے۔ برات گئی اور دلہن بھی آگئی۔ رات تک لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حکیم صاحب کے لئے رات بسر کرنے کو ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں پلنگ بچھا دیا گیا۔ اُن کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے دودھ ضرور پیا کرتے۔ سلطانہ کو اس کا علم تھا۔ اس لئے جب وہ دودھ سے بھرا گلاس تھامے اُن کے کمرہ میں داخل ہوئی تو حکیم صاحب کی نظر بلا ارادہ اس کے چہرے پر پڑ گئی۔ بھائی کا بیاہ تھا سلطانہ نے کیا کچھ سنگھار نہ کر رکھا تھا۔ بھڑکیلا لباس۔ ہونٹوں پر سرخی، گالوں پر سرخی۔ آنکھوں میں کاجل۔ وہ کوئی حکیم صاحب کو دکھلانے بن ٹھن کے تھوڑا آئی تھی۔ اس کے بھائی کا بیاہ تھا۔ حکیم صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطانہ اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حسین تھی مگر کئی برس پہلے۔ حکیم صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس رات دلہن ناصر کے گھر نہیں اُن کے اپنے گھر آئی ہے۔ وہ سوچنے لگے سلطانہ سے کیا بات کریں۔ ...

• دوسرے روز حکیم صاحب۔ واپس چلے گئے۔ سلطانہ دس روز تک، بھائی کے گھر رہی اور پھر ناصر اُسے حکیم صاحب کے گھر چھوڑ آیا۔ حکیم صاحب ذہنی طور پر بیحد پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ ناصر کی شادی کے چھ ماہ بعد تک تو انھیں کوئی شدید بیماری لاحق نہ ہوئی تھی مگر اُس کے بعد وہ مسلسل تین مہینے بستر پر ایسے پڑے کہ چلنا پھرنا تو درکنار اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اب کے جب زرینہ نے پھر ایک لڑکی کو جنم دیا تو اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور زرینہ کے خواب کا پھول تیسرا کانٹا بن کر اُن کے سینے میں ایسا چبھا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے سب سے بولنا بند کر دیا تھا۔

ایک روز جب سلطانہ نے پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے دوسری جگہ رکھنے کے لئے دو ہاتھوں میں اٹھائے تو گھڑے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور وہ بے ہوش سی ہو کر گر پڑی۔ حکیم صاحب جس چارپائی پر پڑے تھے وہ صحن ہی میں بچھی تھی۔ فریدہ اور زرینہ جھٹ اُس کے پاس پہنچیں۔ اور اُس کے اوپر چادر اڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بات شک کی حد سے گزر کر یقین تک پہنچی تو فریدہ خوشی سے پکاری "لڑکا ہے"۔ زرینہ نے سلطانہ کو سنبھالا اور فریدہ بچے کو کمرے میں لے گئی۔ حکیم صاحب نے پہلی بار اپنی بڑی لڑکی سلمیٰ کو اشارے سے مسکرا کر بلایا۔ ان کی آواز بیحد نحیف ہو چکی تھی اس لئے کان میں کہا۔ "بھائی کا خیال رکھو"

آج لڑکے کی پیدائش کا تیسرا دن تھا۔ اور حکیم صاحب کی تینؔ بیویاں اور نوؔ بچے اُن کے پلنگ کے دائیں بائیں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب کی زبان بند ہو چکی تھی۔ پہلے انھوں نے ایک نظر نومولود پر ڈالی۔ دوسری نظر سب پر۔ پھر دونوں ہاتھ ہلنے لگے۔ آخری ہچکی لی، اور آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موند لیں۔

حکیم روشن دین مرحوم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اُن کے احباب و اعزا خدا سے ان کی تینؔ بیواؤں اور نوؔ بچوں کو صبر جمیل عطا فرمانے کی دعا کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ◆

★

خاکہ:

پنکھے والے حافظ جی

اشرف صبوحی

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازاروں اور پنڈت کے کوچے، نیاریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انہیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سننے کو ہزاروں باتیں سنیں۔ ایک ہی دن یا کسی نے کہا، ہم نے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتے سے آنے والوں نے کلکتے میں بھی دیکھا۔ مگر ہم نے تو سارے دن دوپہر شام انہی گلیوں اور انہی بازاروں میں پنکھا ہلاتے اور رکھیرتے دیکھا۔

لوگ انہیں مجذوب کہتے تھے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے پہنے ہوئے۔ لیٹھے کا انگرکھا۔ بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک بر کا پاجامہ۔ اُجلا بے داغ۔ پاؤں میں گول پنجے کی جوتی۔ البتہ سر سے ننگے۔ ٹوپی پگڑی کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستر برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ ہاڑ کے معمولی تھے۔ دُبلے پتلے۔ بال کھچڑی۔ چاول زیادہ اور دال کم۔ رنگ گندمی تھا کسی قدر میلا۔ صورت نورانی۔ چھوٹی سی ڈاڑھی لبیں کتری ہوئیں۔ چہرے پر متانت۔ نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانہ کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجذوب پرست انہیں بھی چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہ بھی پتھر مارنے اور گالیاں بکنے لگتے۔ لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانے دار تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور تھانے دار۔ اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی اس لئے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا۔ جو انہیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانے دار کو بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی لیکن رعب داب ان کا بدستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نور اللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچے کے آگے ٹیڑھی پر کئی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانے دار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا وزیر بیگ۔ وزیر بیگ بڑے اڑکے آدمی تھے۔ شیر کا سا چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی گول ڈاڑھی کے ساتھ لال۔ آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر تھانیدار بھی مہندی لگاتے تھے مگر مرزا کے مقابلے میں ان کا جثہ بہت حقیر تھا اس لئے یاروں نے ان پر پھبتی اڑائی تھی کہ لال مرغے ہیں ایک اصیل ایک تیتری۔ بہر حال ان دونوں کا گٹھ جوڑ اتھا جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچے کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں اُدھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لئے ایک مونڈھے پر ہو بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ کرتے۔ نیچی نگاہیں کئے مؤدب انہیں دیکھا کرتے۔

محلے اور بازار کے شیر جب ان کے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی نہ صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے نہ کوئی حرکت ایسی کہ لڑکے بالے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دُکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے۔ ہم نے اس کے متعلق کچھ سنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت ان کی شوریدہ مزاجی ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے اس لئے علانیہ نہ ان کا پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا۔ افسوس جس سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانیدار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے

بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔

لڑکپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے گزرے۔ میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دئے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیدی گوہر کے پوتے تھے۔ محلّے میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے "کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" نانا نے کہا۔ "محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے"۔ کہنے لگے "آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے ان کا بچپن بھی دیکھا ہے بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بڑے شریر تھے۔ مُلّا جی ان کی خوب ٹھکائی کیا کرتے مگر ذہن ایسا اچھا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا"۔

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں۔ لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا پھر ان کا دل کس طرح اُلٹا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سیّد کا تھان ہے۔ جمعرات کی جمعرات اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوال یا مناجاتی آ بیٹھتا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ سیّد کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیر جی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے یہاں کچھ کچے مکان اور کچھ کچے کھنڈر تھے اسی النگ میں شاہ گنج کی طرف چلو تو ان کچے ڈھابوں کے پار سفید گھوڑے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان۔ لڑکے گیڈی گلی ڈنڈا۔ گیند چڈی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق پر کسی سید صاحب کا گزر سمجھنا چاہئے۔ وہیں سہرے لٹکائے جاتے۔ کھیلیں بتاشے ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو ملتی چھڑکاؤ ہوتا اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی پٹتی۔ کسی کسی کے سر کبھی کبھی سید صاحب بھی آ جاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو اُدھر ہرگز نہ جانا۔ ہم بھی کچھ ڈر سے اور اس لئے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔

اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا "مشہور تھا کہ تھان والے سیّد کوئی بڑے جلالی ہیں۔ جب بگڑ جاتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصّے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ تخولی پہلوان نے منع کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا ایسا پٹخنا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا۔ دھتو دھنوا ایک نٹنی تھی بڑی شہدن خلیفہ کلن نے اس کو ڈال لیا تھا۔ کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لوٹن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے لیکن بچے کب مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیونکہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ مُلّا جی نے ہم کو منع کر رکھا تھا اور چونکہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا۔ جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مُلّا جی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی جمعرات تھی۔ ہم کو موقع ملا جا پہنچے۔ یہ حافظ جی بھی آ گئے ایک عورت نے برفیوں کا دونا چڑھایا۔ حافظ جی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے یار اس پر ہاتھ مارنا چاہئے۔ میں نے کہا اگر تم نے یہ دونا اُچک لیا تو صبح کو اتنی ہی برفیاں اور کھلاؤں گا۔ بولے اچھا ٹھہرو۔ ذرا سوختہ ہو جانے دو۔

چنانچہ ہم پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور سوختہ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور نو بجتے بجتے آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ان دنوں آج کل جیسا حال تو تھا نہیں کہ آدھی آدھی رات تک گلی کوچے چلتے رہیں۔ عشا کی نماز کے بعد گلی میں کون چلتا پھرتا تھا۔ ان کے چراغ بھی ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ حافظ جی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور جاتے ہی طاق پر جھپٹا مارا۔ برفیوں کے دونے پر ہاتھ پڑنا تھا کہ طاق کے اندر سے ایک پنجہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ حافظ جی "شیر شیر" کہتے ہوئے طاق کی حد کے باہر آ کر گر پڑے اور ہم بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ رات بھر مجھے بخار چڑھا رہا۔ حافظ جی پر کیا گزری کچھ خبر نہیں۔

صبح کو جب میرا بخار اترا اور مجھے ہوش آیا تو گھر میں چرچا سنا کہ حافظ جی کا برا حال ہے۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے مانتے ہی نہیں لاکھ دفع منع کیا کہ سید صاحب کے تھان پر بچوں کا کام نہیں۔ اب مزہ آیا اور جائیں۔ معلوم ہوا کہ جب مولا بخش پڑھئی صبح کی نماز پڑھنے جا رہا تھا تو اس نے

حافظ جی کو بیہوش پڑے ہوئے دیکھا بڑی مشکل سے اٹھا کر مسجد میں لے گیا۔ نماز کے بعد ملا جی نے بہتیرا پڑھ پڑھ کر پھونکا مگر حافظ جی کو ہوش نہ آیا۔ آخر ان کے گھر والوں کو خبر کی۔ بیچارے رات بھر پہلے ہی پریشان رہے تھے۔ سنتے ہی بے اوسان ہو کر بھاگے ہوئے آئے اور ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لے گئے۔

پیر جی سنگھاڑا، پیر جی پھنڈے، سید حسن، مولوی نیک عالم، فراشخانے میں اخوند جی ان دنوں یہی دو چار آدمی جھاڑ پھونک کرنے والے تھے اور سفلی کرنے والوں میں امیر بیگ یا بھگت کمہار کسی نے فلیتے کی دھونی ناک میں دلوائی۔ تعویذ دئیے نقش لکھے کسی نے ڈورو بجائے سارے کرتوت کئے مگر حافظ جی نے آنکھ نہ کھولی۔ چار دن کے بعد آنکھ کھلی تو نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ بالکل گم صم نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی پروا لیٹے ہیں تو لیٹے ہیں کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔ کچھ پوچھو تو جواب نہیں۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑچڑھے فقیر آیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں وہ بھی آ گئے۔ گھڑچڑھے فقیروں کی صدا جو حافظ جی کے گھر والوں کو پہنچی تو حافظ جی کو پکڑ ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا "مائی یہ تو میراں کی جھپیٹ میں آ گیا ہے۔ پیران کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائے گا"

حافظ جی کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں تھا۔ دُکھڑا پیٹنے والی عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ ماں بیچاری سے جس طرح بنا ماما کی ماری پیران کلیر لے گئی۔ طبیعت میں ایک قسم کی وحشت جو چلی آتی تھی۔ وہ تو جاتی رہی لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے۔ پھر ایک مرتبہ سنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف نکل گئے۔ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کر لیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آ گئے۔ لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا۔ نہ گھر کے کام کے تھے نہ باہر کے۔ چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا۔ پانی پلا دیا پی لیا۔ ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں بلا سے۔ پھٹ گئے تو پھٹ جائیں، نہ نہانا نہ دھونا نہ نائی نہ دھوبی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے۔ ان کے آتے ہی یکایک حولدار ہو گئے۔ ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے ان کا خیال رکھنا شروع کیا۔ جمعہ کے جمعہ ان کا خط بنولتے نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے۔ دیوانے تو البتہ نہیں ہیں لیکن دن رات پنکھا ہلاتے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے۔ ہم تو بھئی ایسی باتوں کے قائل نہیں"

کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر کہ ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں مجھ کو بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر اِلو کھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلّی دروازے سے جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی عملداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا حاکم سمجھتے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ نہ تھا۔ مجھے ان سے ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھتا لیکن آواز سننے میں نہیں آئی۔

ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور ٹھیٹھ گرمی کا موسم۔ خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا کہ سنوں کہتے کیا ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ تو کیا یاد رہتے۔ یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو ان کے صاحب نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔ واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجئے اللہ والوں میں ان کا کیا درجہ ہوگا۔

"دور ہو دور، اور نیلے دلفریب دور دور! تو نے مکار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندہ مجبور ہوں۔ اپنی خوشی ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس تک لے سکوں۔ میں آزاد نہیں پابند ہوں۔ اپنی مرضی سے

کچھ نہیں کرسکتا۔ ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش بر آواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آجائے۔ آہ اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی طرح اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لئے کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اگر میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ نہ کروں اور اس رہ گزار سے آگے بڑھنا میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹالوں جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں اور ان پتھروں کو دور نہ کردوں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کرسکتے۔

لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں میں دیوانہ ہی سہی کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان اگر میاں اپنے اندر مجھے جذب کرلیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے۔ لیکن نہ میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر۔ جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو جس نے اپنے مالک کی پکاریں سنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دور ہو دور! مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر۔ میں ان بالوں کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینہ میں دیکھوں جس کی نجانے کونسی ادا پیا کو بھاتی ہے جس کی ترو تازگی چند روز کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ جا میرا منہ کیا دیکھتی ہے بتا۔ آخر میں کس امید پر اس پیکر فانی کو لباس فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پرشور ذرات بے چین ہو رہے ہیں۔ میں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی پھرتا تجھ کو اور تیری فتنیات کو دعوت دیتا کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما۔ لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل، پچھل پائی! تو مجھے طعنے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے، آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں جن سے عنقریب جبری طور پر یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے مجھ کو جدا کیا جائے گا، اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے قبضے سے باہر ہونے والا ہے۔ تیرے میکدے کے متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے بھی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند کرلیتا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں۔ میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلادوں۔ جانتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں کہ محبت و یکجائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا۔ تو ہنسے گی اور سب روئیں گے۔

غرض میں نے جدھر نظر اٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اٹھاتا ہوں تیری ہر شے میں مکار سوا کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں۔ لیکن ایک ایسی دلفریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور فنا کی افسردگی موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس لئے مجھ کو چین نہیں۔ مجھے تو خوشی کی جگہ ملال امن و عیش کی جگہ بیقراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب میں حافظ کو کیا کہوں۔ تجھ کو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزلِ جاناں بتاتے ہیں۔ منزلِ جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزلِ جاناں کو سلام لیکن نہیں منزلِ جاناں کو اس سے زیادہ دغابازی کا گھر ہونا چاہئیے۔ عشق و ہوس کا امتحان آخر کس طرح ہوتا۔ کیوں! پتہ کی سن کر گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو منزلِ جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی لگی ہم کو بھی اپنا ٹھنی پن دکھانے۔ اپنی آرائش و دلکشی کے لحاظ سے تو منزلِ جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملا کر کہتے ہیں کہ تو منزلِ جاناں، منزلِ جاناں، منزلِ جاناں۔ لیکن منزل جاناں کہنے کے بعد یہ بھی دیکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کرلیں سر کیسا جھکالیا۔ انہیں فوراً یاد آگیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن و سکون اور راحت و آسودگی کے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اٹھو اسباب سنبھالو۔ کمر باندھو۔ سفر کی تیاری کرو۔ یہ جرس کیا ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے ؎

اے غافلو! دم اتنا نمط آئے جائے ہے

سوچو کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جائے ہے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

دھوپ چھاؤں

طاہرہ کاظمی

(۱)

دھوپ روز آتی ہے
اوٹ سے پہاڑوں کی
سُرخ آتشیں تھالی
روز یوں اُبھرتی ہے
جیسے زندگی اُبھرے
چوٹیاں پہاڑوں کی
دھوپ میں نہاتی ہیں
پتھروں کے سینے میں
دھوپ آگ بن بن کر
جذب ہوتی جاتی ہے
تند، گرم دھاتوں کا
کھولتا ہوا لاوا
سرد قلبِ گیتی میں
کروٹیں بدلتا ہے

(۲)

گرم اور سنہری دھوپ
جنگلوں میں جاتی ہے
مدتوں پُرانے پیڑ
اپنی جڑ کے پنجوں پر
اٹھ کے سانس لیتے ہیں
تاکہ سرد شریانیں
زیست کا لہو پائیں
مسکرا کے خود رو پھول
گردنیں اٹھاتے ہیں

(۳)

دھیمے دھیمے قدموں سے
دھوپ شہر آتی ہے
شہر کے مناروں سے
سیڑھیاں لگاتی ہے
شہر کے نظاروں میں
روشنی لٹاتی ہے

(۴)

صبح اپنے آنچل میں
رنگ بھر کے لاتی ہے
پیڑ جاگ اٹھتے ہیں
سُرخ چمپئی گلنار
پھول شاخساروں میں
آگ سی لگاتے ہیں
اودے اودے غنچوں کے
بوجھ سے لدے کچنار
جھوم جھوم جاتے ہیں
شب کی نیند کے ماتے
پھول آنکھ ملتے ہیں
کاسنی رسیلے پھول
سرخ پیلے نیلے پھول
بند بند غنچوں کی
دلنواز رعنائی
رس بھرے ہوئے ڈنٹھل
بوجھ سے جھکے ڈنٹھل
سبز کرکرے پتے
شاخ شاخ کلیوں پر
سُرخ مکھیوں کی گونج
پھول پھول کے اوپر
سرد اوس کے قطرے
کانپتے سیہ بھونرے
سرو کی قطاروں میں
ننھی ننھی چڑیوں کی
میٹھی میٹھی آوازیں
نرم مخملیں سبزہ
ہر روش پہ خوابیدہ
ہر خبر سے بے پروا

(۵)

دھوپ سے بھرے دالان بھی
داغ داغ رہتے ہیں
لمبے لمبے پیڑوں کے
سائے رقص کرتے ہیں
دھوپ چھاؤں بنتی ہے
سائے جال پھیلائے
دھوپ کی تمازت کو
سرد کرتے رہتے ہیں

(۶)

رات اپنی چادر میں
نرم نرم یادوں کی
چھاؤں لے کے آتی ہے
جیسے رات کی رانی
دور خواب میں مہکے
جیسے موتیا جوہی
شب کو عطر سے بھر دیں
تارے گیت گاتے ہیں
چاند گنگناتا ہے
یہ سکوت گویا ہے
بیکراں خموشی بھی
اک حسین نغمہ ہے
یہ طویل تاریکی
دن کا پیش خیمہ ہے

(۷)

دن ہے کس قدر تاریک
رات کتنی چمکیلی
دن اداس رہتا ہے
آنے والی ظلمت کے
خشمگیں تصور سے
ظلمتیں فضاؤں میں
پھیلتی ہی جاتی ہیں
زندگی کی راہوں میں
گر کبھی سرِ منزل
اک چراغ بجھتا ہے
سو چراغ جلتے ہیں
چاند ڈوب جاتے ہیں
آفتاب اُبھرتے ہیں
رات مسکراتی ہے
بھر کے مانگ میں افشاں
صبح کے جھروکوں سے
پرنیاں کے پردوں کو
تہہ بہ تہہ اٹھاتی ہے

(۸)

سایہ اک حقیقت ہے
دھوپ بھی حقیقت ہے
دھوپ اور سائے کے
امتزاجِ باہم سے
کائنات رنگیں ہے
کائنات باقی ہے

یاد

ضمیر اظہر

نسیمِ سحر کا سکوں پاش جھونکا
کسی شاہزادی کے خوابِ منقش کی صورت جلو میں کئی رنگ لیکر
بہاروں کے شاداب نیرنگ لیکر
بہ اندازِ آہو خراماں خراماں
ریاضِ تصور کی جانب رواں ہے

سبک چاپ، مدھم صدا لہلہاتی
ریاضِ تصور میں خوشبو نے نغمہ لچکتی ہوئی بے حجابانہ آئی
درختوں میں، شاخوں میں، پتوں میں، پودوں میں ہے جوشِ بالیدگی کارفرما
گلوں سے ہے موجِ تبسم ہویدا
پرندوں کی چہکار ہے کتنی سادہ

نسیمِ سحر کا فسوں ساز جھونکا
ریاضِ تصور سے ہو کر کسی اور وادی کی جانب روانہ ہوا ہے!
اور اس کی جدائی میں ہر ایک طائر ریاضِ تصور کا نوحہ کناں ہے
خزاں کے پلٹنے کا امکان پھولوں کی سہمی ہوئی صورتوں سے عیاں ہے
فضا پر مسلط غمِ بیکراں ہے!

★

غزل

عبداللہ خاور

ہے صبحِ عیش بھی یوں، غم کی شام ہو جیسے
ہمارا غم بھی غمِ ناتمام ہو جیسے
ترے حضور بھی پابندِ احتیاط رہوں
یونہی سا ربطِ پیام و سلام ہو جیسے
مگر نظر کے اجالے سلام کرتے ہیں
پیامِ لغزشِ پا گام گام ہو جیسے
شفق میں صبح کی پہلی کرن ہوئی تحلیل
تری جبیں پہ نظر کا خرام ہو جیسے
ہر ایک غنچہ ہے لب بستہ اے لبِ رنگیں
شگفتِ گل کو ترا احترام ہو جیسے
چھڑی ہوئی ہے چمن میں حدیثِ غنچہ و گل
فسانۂ لبِ مینا و جام ہو جیسے
بہار ہے تو، مگر چشمِ ملتفت کی قسم
ترا کرم ہو بہاروں کا نام ہو جیسے
ترے بغیر یہ عالم نگاہِ یاس کا ہے
سنے بغیر فسانہ تمام ہو جیسے!
ہر ایک لمحہ مرا، مجھ سے بے تعلق ہے
حیات تیرے تغافل کا نام ہو جیسے
میں کیا کہوں کہ شکستہ ہے سازِ زندگی کے
رکا رکا نفسِ کم خرام ہو جیسے
بہت ہی نرم ہے آہنگِ عرضِ غم خاور
زبانِ عشق کا طرزِ کلام ہو جیسے

غزل

جلیل قدوائی

جب سے وہ شوخ مجھ سے برہم ہے
کیا بتاؤں جو دل کا عالم ہے

بے رخی مجھ سے ہے مگر پھر بھی
میری امید سے بہت کم ہے

شاید اُن کو مرا خیال آیا
درد کیوں آج دل میں کچھ کم ہے؟

کیا وہ اپنی جفا پہ نادم ہیں؛
کس لئے اُن کی آنکھ پُرنم ہے؟

میرے دل میں بسی ہے اک دنیا
اُن کی آنکھوں میں ایک عالم ہے

جس کو منظور ہو خوشی اپنی
اس کو اُن کی خوشی مقدم ہے

سادگی حسن کا شعار نہیں
عشق کی سادگی مسلّم ہے

دستِ ہر رند میں ہے جامِ سفال
دستِ ساقی میں کاسۂ جم ہے

گُل کا مُنہ آنسوؤں سے دھو ڈالا
کس قدر خوش نصیب شبنم ہے

پیار میں ہو گئے خفا وہ جلیل
دل کو اس بات کا بہت غم ہے!

مجید شاہد

بیاضِ ارض و وطن پہ تحریرِ نور بنکر جو ضو فشاں ہے
وہ روشنی کی کرن ازالۂ ظلمتوں کا تو جاوداں تو ہے

غرورِ منصب ہے ٹمٹماتے چراغ کا آخری سنبھالا
سیاہیِ شب فقط سسکتے ہوئے ستاروں کی داستاں ہے

یہ کائناتِ حسیں حدودِ خیال ہی میں حسیں ہے ورنہ
تعیناتِ نظر کی حد تک بساطِ عالم دھواں دھواں ہے

وہاں تری تمکنت سے رازِ حیات ہوتا ہے آشکارا
جہاں گماں پردۂ یقیں ہے یقیں سراپردۂ گماں ہے

ہوس کے پاتال سے نکالا جسے بصد ہا ریاض ہم نے
نفس کا وہ زیر و بم اگر ہو محیطِ عالم تو بیکراں ہے

زوالِ فکر و نظر محرک ہے پستی و پا شکستگی کا
کمالِ عزمِ بشر کی زد پر ستارہ و ماہ و کہکشاں ہے

تراش لی ہیں یہ اصطلاحات سہل انگاریِ نظر نے
تلاش کرنے چلو چمن میں تو پھر قفس ہے نہ آشیاں ہے

عجیب سے سرمدی خد و خال کا مرقع ہے ابنِ آدم
قریب سے دیکھنے پہ ہر چند خاک کا تودہ رواں ہے

جنم دیا لاشعور نے اور شعور نے جس کی پرورش کی
وہ غم سلامت رہے، وہ غم ہی مسرتوں کا مزاج داں ہے

نئے زمانے کو جملہ اقدارِ زندگی پر محیط کر لو
گئے زمانے کا ذکر بھی اب سماعتِ عام پر گراں ہے

نزاعِ عقل و جنوں کے ردِ عمل سے شاہد خدا بچائے
متاعِ سوزِ دروں کا حاصل تمام ترکیفِ جاوداں ہے

رپورتاژ:

چاٹگام کا پہاڑی علاقہ

اگر مغربی پاکستان کی گل پوش وادیاں جیسے گلگت، آزاد کشمیر اور کاغان ہمارے لئے جنت نگاہ ہیں تو مشرقی پاکستان کی سرزمین آب رواں اور اس کے پہاڑی علاقوں کی دلکشی و نفاست بھی اپنی جگہ کچھ کم جاذب نظر نہیں۔ کوہستان چاٹگام کا علاقہ اپنی قدرتی خوبصورتیوں کے لئے دُور دور مشہور ہے۔ سیاحوں کے لئے یہاں وہ سب کچھ ہے جسے وہ دیکھنے کے آرزو مند رہتے ہیں۔ کوہستانی علاقہ کی سادگی یہاں کی مترنم ندیاں، یہاں کے رنگا رنگ لباس، قبائلی لوگوں کے رسم و رواج اور چائے کے باغات کے خوشنما قطعے اور ان کی بھینی بھینی فضا انسان کو سحر بنگالہ سے لفظاً و معناً آشنا کر دیتے ہیں۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقے، ضلع چاٹگام کے دھان کے کھیتوں کا سلسلہ اور یہاں کی سرزمین کی رومانی کیفیت ایک جنت ارضی سے کم نہیں۔ آیئے میرے ساتھ ذرا اس پاک سرزمین پر قدم رکھئے۔ مٹی کو دیکھئے۔ کہیں تو گلاب کی طرح دہکتی سرخ ہے تو کہیں اس کا رنگ گہرا اُٹیالا ہے۔ یہ عطریت کہاں سے آگئی۔ یہ آپ نے غور کیا۔ یہ یہاں کے باغ و راغ کی قدرتی باس ہے، دھرتی کی سوندھی سوندھی باس، نباتات کی فراوانی، باغوں کی قطاریں، ان سب نے مل کر فضا کو معطر کر رکھا ہے اور حواس اس کے سحر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان کی وضع قطع سے تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ یہ یہاں کے پہاڑی لوگ ہیں۔ مغربی پاکستان کے گلگتی اور کافرستانی وغیرہ بھی اکثر دیکھے ہوں گے۔ اب اپنے اس حصۂ ملک کے پہاڑیوں کو بھی دیکھیں۔ وہی سادگی و پرکاری، وہی خصوصیات مزاج، صرف آب و ہوا اور ماحول و نسل کے امتزاج کا قدرتی فرق تو بیشک ہے ورنہ ان کو ہم کسی طرح اپنے سے جدا نہیں سمجھ سکتے۔ آیئے ذرا ان کی مہمان نوازی کا بھی حال دیکھیں۔ سنا تو یہی ہے کہ مغربی پاکستان کے سرحدی اور قبائلی دوستوں کی طرح ان لوگوں کی بھی مہمان نوازی اور حسن سلوک کی داستانیں دور دور مشہور ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ جدید تمدن کی ملمع کاری نے ابھی ان کے لباس، رہن سہن، گھر، مکانات کسی چیز کو بھی ملوث نہیں کیا ہے مگر ان کی سادگی اور روایتی طرز زندگی میں بھی ایک البیلا پن ہے۔ معصومیت ہے۔ سچائی ہے اور ان کے خط و خال بھی یہاں کے دوسرے لوگوں کے خط و خال سے کچھ جدا ہیں۔ اس کی وجہ کچھ برمی اثرات ہیں کیونکہ برما اور اس علاقہ کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔

اس وقت میں آپ کو جس سڑک پر لئے جا رہا ہوں یہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان بننے کے بعد بنائی گئی تھی۔ یہ چاٹگام سے ۴۷ میل دور تک چلی گئی ہے۔ لیجئے ذرا انہیں دیکھئے۔ ان کا لباس کیا ہے بس ایک لنگوٹی ہے جسم تانبے کی طرح دمک رہا ہے۔ ان صاحب کو یہاں کے گاؤں والوں کا نمونہ سمجھئے۔ اس آب و ہوا میں ان کا یہی لباس موزوں ہے۔ ادھر ان کا کھیت ہے۔ دھان کا کھیت جو پہاڑی ڈھلان پر دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں ابھی حال تک جنگل ہی جنگل تھا۔ اسے کاٹ کاٹ کر ڈھلان صاف کی گئی ہے اور دھان بو دیا گیا ہے۔ آپ نے ابھی مجھ سے کیا پوچھا تھا؟ ہاں! یاد آیا۔ یہ جو لوہے کا آنکڑا سا ان کے ہاتھ میں ہے یہ ان کا بہت بڑا اوزار ہے اور غالباً یہی ایک اوزار ہے۔ اسے یہ لوگ "داؤ" کہتے ہیں۔ اسی سے زمین کھودنا اور فصلیں کاٹنا، سب کام لیا جاتا ہے۔ دھان تو خیر بہت ہوتا ہے مجھے تو سرسوں اور گھیا بھی بویا ہوا نظر آتا ہے۔ جس چیز کی فصل آئی وہ تیار ہوتی چلی گئی۔ مغربی پاکستان کی زمینوں کی طرح سے یہاں بھی زمین بڑی زرخیز ہے۔ روئی بھی یہاں پیدا ہوتی ہے۔ زمین میں پہاڑی ذرے ملے ہوئے ہیں اس لئے پیداوار کو ہر طرح کی قوت بخش کیمیاوی غذا ملتی رہتی ہے۔

یہ ان صاحب کی بیوی ہیں۔ دوسری خاتون ان کی یا تو بھانجی ہیں یا بھتیجی۔ ان خواتین کا لباس بڑا صاف ستھرا رنگین اور نفیس ہے۔ اب ذرا ان بچوں کے چہروں کو دیکھیے۔ یہ کالی کالی دھاریاں کیوں بنائی ہیں، بھوتوں کی بدنظر سے بچانے کے لئے اور یہ کتے بلی کی سی آوازیں بھی بھوتوں کو بھگانے کے لئے نکالتے رہتے ہیں۔

پیاسے کو پانی پلانا جس طرح مغربی پاکستان میں عام کار ثواب سمجھا جاتا ہے یہاں کے کوہستانی باشندے بھی اپنے عقیدے کے مطابق پانی پلانا بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ اس غرض سے یہ لوگ اپنی عورتوں سے متوقع رہتے ہیں کہ وہ پانی کا گھڑا بھر کر راہ میں لیکر چلیں گی۔ اور اگر کوئی راہگیر پانی مانگ بیٹھا تو اسے پانی پلائیں گی۔ گھرداری کی مصروفیتوں کے علاوہ یہاں کی پہاڑنیں پانی کے گھڑے بھی بھر کر کھیتوں کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ جس وقت بچے گاؤں میں واپس آتے ہیں تو سب سے پہلے مائیں ان کے چہروں سے کلونس کی دھاریاں دور کرتی ہیں گویا کہ نظر بد کا خوف ختم ہو گیا!۔

وہ سامنے کیا عمارت ہے۔؟ غالباً تھانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ کچھ پہرہ چوکی دکھائی دے رہی ہے۔ پاکستان کا جھنڈا اب تو صاف نظر آنے لگا۔ جی ہاں۔ یہ تھانہ انگریزی عملداری میں بنا تھا۔ نئے زمانہ کی شہری ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے پاکستانی سرکار نے تمام علاقے میں تھانے قائم کر دئے ہیں۔ ویسے امن وامان ہی رہتا ہے اور جرائم کی بھی کوئی کثرت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ نہ شرّی طبیعت ہیں، نہ جرائم پیشہ۔

ان لوگوں کے کھپریل والے گھر کیسے صاف ستھرے نظر آرہے ہیں۔ آئیے کسی راہگیر سے پوچھیں یہاں کے لوگ گھر کو کیا بولتے ہیں۔ باقی بنگال میں تو "باڑی" بولا جاتا ہے ـــــ کیا بتایا انہوں نے ـــــ "باشا"۔ یوں کہنے کو یہ جھونپڑی سی ہے مگر یہ "باڑی" یا "باشا" اپنی جگہ بہت عمدہ گھر ہے۔ یہ مارکیٹ ابھی نئی ہے۔ پہلے یہاں گھنے جنگل ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی ضرورتوں کے لئے ان کوہستانی باشندوں کو دور دور کی بستیوں میں جانا پڑتا تھا مگر اب پختہ سڑکیں بن جانے سے مال آنے جانے لگا ہے اس لئے سب ضروری چیزیں اس مقامی مارکیٹ میں مہیا ہو جاتی ہیں بازار میں یہ مجمع کیسا لگا ہوا ہے ڈھول جھانج کی برابر آواز آرہی ہے۔ آئیے آگے بڑھکر دیکھتے ہی چلیں۔ بازار میں خوب چہل پہل ہے ـــــ خرید فروخت کا سلسلہ تو چل ہی رہا ہے یہ جھن جھن جھن جھن اور بھی مزا دے رہی ہے۔ یہ ناچ ہو رہا ہے۔ قبائلی مرد اور عورت مل کر ناچ گا رہے ہیں۔ ان کے بول آپ کچھ سمجھے۔ مجھے کچھ کچھ بنگالی آتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی بولی کچھ تو بنگالی ہوتی ہے اور کچھ برمی۔ یہ ناچ بھی بڑا رومان انگیز معلوم ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے بھنگڑا ناچ سے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔

بازار میں کیا کیا پھل ہیں۔ آئیے ان لوگوں سے کچھ خرید کر اپنے دیس کے ان پھلوں کا ذائقہ چکھیں۔ انناس تو ضرور ہی کھانے چاہئیں، پپیتے بھی بہت میٹھے اور ملائم نظر آتے ہیں یوں کراچی میں بھی پپیتا اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مگر یہاں کی زمین میں تو مٹھاس اور رس ہی رس گھلا ہوا ہے۔ سنا ہے پپیتا اور انناس اب ڈبوں میں بند کر کے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔ شاید وہ دور اسی چیز کی فیلڈ ری نہ ہو۔ چاٹگام کے ان پہاڑی علاقوں میں کافی اور ربڑ کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔ عمدہ قسم کے پودے باہر سے منگا کر ان لوگوں کو دیئے گئے ہیں۔ لیجئے اب موٹر سے اتر جائیے۔ اوپر چوٹی تک پہنچنا ہے۔ یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہم بھی کچھ دیر ستائیں گے ـــــ آپ ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔ ہاں وہ سمندر "بحیرۂ بنگال" ہے، اور میری طرف نگاہ کریں تو یہ دور تک میدانی علاقہ جو چلا گیا ہے یہ چاٹگام کا ضلع ہے۔ یہ پہاڑ ایک سلسلۂ کوہ کا حصہ ہے جسے اپچاری سلسلۂ کوہستان کہتے ہیں۔ ادھر کے اونچے اونچے پہاڑ جو ایک اونچی سیڑھی سی بناتے چلے گئے ہیں سوبالانگ کے پہاڑ کہلاتے ہیں اور "برما" تک یونہی چلے گئے ہیں۔

اچھا صاحب، اب یہاں سے چلنا چاہیئے اور پہلے اس پل کو دیکھ لیں۔ دور سے بڑا خوشنما دکھائی دیتا ہے۔ ہرا اور سفید رنگ اس طرح پینٹ کیا گیا ہے کہ پاکستان کا جھنڈا معلوم ہو۔ یہ نیلٹ پل کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے جو ندی بل کھاتی گذر رہی ہے، مانک چاری کہلاتی ہے۔ بارشوں کے زمانہ میں اس کی تندی و تیزی غضب کی ہوتی ہے۔ اس تمام کوہستانی علاقے کا صدر مقام رنگامتی ہے۔ واقعی یہ رنگ و نور کی بستی ہے اور اس کا یہی نام ہونا چاہیئے تھا۔ نباتات کی بڑی کثرت ہے۔ کیلا بڑا نفیس ہوتا ہے۔ دھان بکثرت اور انناس، پپیتا، چائے، کافی، ربڑ، غرض قدرت نے اس سرزمین کو بہت کچھ دے رکھا ہے۔

یہ سامنے کوئی مندر معلوم ہوتا ہے۔ اسے شاید یہ لوگ کیانگ بولتے ہیں۔ ذرا دیکھنا، یہ پہاڑی بھینسا ہے۔ کیسا تنومند

ہے۔ توشانی کی پہاڑیاں نزدیک ہی تو ہیں۔ یہاں کے لوگ ان بھینسوں کو وہاں سے گھیر لاتے ہیں اور نسل کشی کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے بہت سے جنگلات کاٹے گئے ہیں تاکہ صاف شدہ زمینوں پر دھان بویا جاسکے۔ اب یہاں کی ضرورت کا پورا غلہ یہیں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جگہ ایک مقام کا نام جنرل محمد ایوب خاں کے نام نامی پر رکھا گیا ہے۔ یہ خراج عقیدت ہے اس زمانہ کا جب وہ پاکستان کے کمانڈر انچیف تھے۔ جنگلوں کو اب بھی صاف کیا جارہا ہے۔ جب درخت، جو بڑے قد آور ہوتے ہیں، گرادیئے جاتے ہیں تو ہاتھیوں سے ان درختوں کو کھنچوایا جاتا ہے۔ درختوں کے بڑے بڑے لٹھے اور شہتیر دور دور جاتے ہیں۔ چاٹگام کی بندرگاہ سے یہ کراچی کی بندرگاہ کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ جس طرح دریائے سندھ میں لکڑی بہادی جاتی ہے اور وہ اپنی منزلوں پر پہنچ جاتی ہے خاص کر جہلم پر۔ اسی طرح بانس اور شہتیروں کے لٹھے دریائے کرنافلی کے دھاروں پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ کاسالونگ کے جنگل کی لکڑی اسی طرح آتی ہے۔ ہمارا ملک اب کرنافلی کا کاغذ ہی برت رہا ہے۔ اس کے لئے خام مال، بانس یہیں سے مہیا ہوتا ہے

جس جنگل کے پاس ہم پانی پینے کے لئے ٹھہرے تھے یہ "کنج جناح" کہلاتا ہے۔ یہاں دیودار کے درخت بہت ہیں۔ ایک ایک درخت، پانچ پانچ سو روپے بلکہ ہزار ہزار روپے تک کا ہوتا ہے۔ مہاگنی نامی لکڑی کی دنیا میں بڑی شہرت ہے۔ قدرت کی یہ دولت بھی مشرقی پاکستان کے پاس بڑی کثرت سے ہے۔ یہاں کے جنگلات کوئی ۱۲۰۰۰ مربع میل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہاں کی چائے اور ربڑ بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی سرخ مٹی نے چائے کے رس اور بو باس کو بہت عمدہ بنا دیا ہے۔ آیئے اس ریستوراں میں بیٹھ کر چٹگامی چائے کے دو گھونٹ پی کر دن بھر کی تکان دور کریں +

•

تبصرہ: "خاتون پاکستان" کا انقلاب نمبر

مدیر: شفیق بریلوی

"خاتون پاکستان"، ہمارے جدید اور قدیم نسائی ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے یہ غیر ضروری روایت پرستی اور بے ڈھنگی ترقی پسندی سے مبرا ہے، انقلاب نمبر کے مضامین اور اس کی ترتیب و تدوین نسائی شعور اور حسن قبول کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے جس کی انقلابی اشاریت اور ترویجی افادیت کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے، انقلاب کے معنی اور اس کا مفہوم کیا ہے؟ انقلاب کیوں آیا؟ انقلاب سے صحیح معنوں میں قوم استفادہ کس طرح کرسکتی ہے؟۔ یہ وہ لازمی سوالات ہیں جو مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے ذہنوں میں بھی پیدا ہونا چاہئیں، اور خاتون پاکستان اپنے انقلاب نمبر میں ان تمام سوالات کا جواب اس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے جو پاکستانی خواتین کی ذہنی سطح اور انداز فکر کے عین مطابق ہے۔ اردو ادب کے ممتاز قلم کاروں سے اس نمبر کی فہرست مزین ہے۔ ہماری رائے میں، خاتون پاکستان، کا یہ نمبر نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے لئے بھی خصوصی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ ۵/۸۰ لانڈر، کراچی۔ (ط۔ق)

۱۰۰۰۲

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم — بقیہ صفحہ ۱۹

پانی اوپر چڑھایا۔ پطرس ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور سالک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

"مولانا دیکھئے۔ آپ کو پانی پانی کر دیا۔"

بھلا سالک صاحب پر اتنی آسانی سے وار کیسے کیا جا سکتا تھا۔ ؟ وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھتے ہوئے برجستہ بولے:

"دیکھا آپ نے، یہاں کیسے کیسے لوگ پانی بھرتے ہیں؟"

اور ان کے اس بھرپور طنز پر پطرس مرحوم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولے: "جائے استاد خالی"

عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ سالک صاحب گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے اور پھر واقعات اور معلومات کا ایک دریا بہہ نکلتا۔ واقعہ سے واقعہ جڑتا چلا جاتا اور بات سے بات نکلتی۔ گفتگو کا موضوع چاہے کچھ بھی ہو، کسی ملک یا قوم کا ذکر ہو، کوئی ادبی مسئلہ ہو یا سیاست کا پہلو سامنے آ جائے، میں نے دیکھا ہے کہ سالک صاحب اس روانی سے بولتے کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتا، ان کی گفتگو کے لئے موضوع کی پابندی نہیں ہوتی تھی، بلکہ موضوعات ان کے پابند ہوتے تھے۔ اور ان کی یادداشت تو حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھی جب کبھی گذشتہ حالات و واقعات کی بات چل نکلتی تو وہ اس طرح سن، تاریخ، دن، اور وقت کا حوالہ دیتے چلے جاتے جیسے کوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سالک صاحب ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے جس کے اوراق میں برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، ادبی، علمی، صحافتی، اور مجلسی تاریخ۔ قلمبند تھی۔ افسوس کیسے کیسے لوگ تھے کہ اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ نئی نانتی میں تو شاید کبھی بھی ایسی جامع شخصیتیں دکھائی دیں گی۔

مہمان عزیز — بقیہ صفحہ ۲۹

اگلے دس دن خیریت سے گزر گئے۔ گیارہویں دن امجد خلاف معمول رات گئے گھر واپس آیا تو بیگم زیدی کو اپنا منتظر پایا۔ سل دانا ان کے پیروں کے قریب آنکھیں بند کئے بیہوش سو رہی تھی اور بڑی بی پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھیں۔

"آیئے آیئے امجد صاحب۔ دراصل مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آپ تشریف رکھئے مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں" وہ بولیں امجد آج بہت خوش تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"دیکھئے امجد صاحب۔ آپ کو شاید علم ہو۔ یہ بڑا گھر تنہائی میں مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ چور اچکوں کا بھی مجھے اکثر ڈر لگا رہتا۔ دراصل اپنی تنہائی ہی کے خیال سے، صرف کمپنی کی خاطر اب تک میں پئینگ گیسٹ رکھنے کی دردسری مول لیتی رہی ہوں۔ لیکن جب سے سل دانا آئی ہے میرے دل کو بڑا اطمینان ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے سل دانا کی کھال سہلائی۔ "تو امجد صاحب — اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب مجھے گیسٹ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی — یعنی اگر آپ ایک ہفتہ کے اندر کمرہ خالی کر دیں تو نوازش ہوگی —— مجھے بے حد افسوس ہے۔ لیکن مجبوری ہے — !!!"

پنکھے والے حافظ جی — بقیہ صفحہ ۴۴

پھر؛ پھر کیا ایک "عابر سبیل اور ایک عائل کُن فی الدنیا غریبا" کو راستے کی روح افزائیوں اور دلکشائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ نہ رتیں بدلتی ہیں نہ اندھیرے اجالے سے واسطہ رہتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے یکایک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آ کر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا پردہ کر گئے۔ ایک دن خلاف معمول شام کے وقت گھر میں گئے۔ وضو کیا، نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عزیز دیکھنے کو دوڑے تو ختم تھے۔ اسم ان کے نام اللہ کا۔

جسم میں تازگی

نئی
شلوار
قمیض؟
جی نہیں! "لکس" سے دھوئی ہے!
یہ نرم و نازک شیفون اور وآلیں نفیس و دیدہ زیب ریشمی اور سوتی جوڑے جنھیں پہن کر آپ فخر محسوس کرتی ہیں، ان کی آب و تاب کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں ہر مرتبہ گھر پر ہی لکس فلیکس میں دھویا کیجئے۔
لکس فلیکس کے ملائم جھاگ آپ کے نفیس کپڑوں سے میل کو اس خوبی سے دھو ڈالتے ہیں کہ ان کی اصل خوبصورتی اور چمک دمک برقرار رہتی ہے اپنے قیمتی ملبوسات کی حفاظت کیجئے اور انھیں صرف لکس فلیکس میں دھوئیے
لکس سے دُھلے ہوئے نفیس کپڑے ہمیشہ نئے ہی معلوم ہوتے ہیں!
LUX

آپ ہر میل پر
پیٹرول کی بچت
کر سکتے ہیں۔
موبل گیس استعمال کیجئے۔

گلیکسو ایک مکمل دُودھ والی غذا ہے۔ یہ آپ کے بچے کے لئے وہ تمام چیزیں مہیا کرتا ہے جو صحت اور توانائی کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط کرنے کے لئے وٹامن ڈی اور خون کو مالامال کرنے کے لئے فولاد شامل ہے۔ یہ وہی گلیکسو ہے جس سے بچے تندرست رہتے ہیں۔

گلیکسو بچوں کے لئے مکمل دُودھ والی غذا

گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ کراچی • لاہور • چٹاگانگ • ڈھاکہ

STRONACHS

"میں
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
جمیلہ رزاق کہتی ہے
فلمی ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

چاٹگام کا پہاڑی علاقہ

"مباشی" (پہاڑی گھر)

دریائے درنافلی میں باربرداری (بانس اور شہتیر)

دؤں کا خوشنما تالاب

باغ

بستی

Regd. S No 1086

MAH I-NAU, NOVEMBER 1959.

خانگی مسرّت اور خوشحالی

ہماری قوم ہمارے گھروں ہی کا مجموعی نام ہے۔ افراد کی خوشحالی قوم کی خوشحالی کے ساتھ وابستہ ہے۔ قوم کی خدمت کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے گھروں کو بہتر اور زیادہ خوشحال بنائیں۔ اس کے لئے خرچ میں کفایت اور سلیقہ مندی کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری آمدنی کا کچھ حصہ بچانے کے لئے بھی ہوتا ہے، اور بچت کی بہترین صورت یہی ہے کہ بچت کے سرٹیفکیٹ خرید لئے جائیں جس سے قومی ترقی کو بھی مدد پہنچتی ہے ان پر ۶ فیصد منافع ملتا ہے یہ زائد آمدنی یقیناً ہماری خانگی خوشحالی میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگائیے

۶ فیصدی منافع ۔ انکم ٹیکس معاف

ہر ڈاک خانے سے مل سکتے ہیں

ماہ نو

اکتوبر ۱۹۵۹ء

نقاشی:

موسیقی:

زچگی کے موقع پر
آپ کا تحفظ

ANTISEPTIC
DETTOL

نئی
شلوار
قمیض؟
جی نہیں! "لکس" سے دھوئی ہے!
یہ نرم و نازک شیفون اور وآلیں نفیس و دیدہ زیب ریشمی اور سوتی جوڑے جنھیں پہن کر آپ فخر محسوس کرتی ہیں، ان کی آب و تاب کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں ہر مرتبہ گھر پر ہی لکس فلیکس میں دھویا کیجئے۔
لکس فلیکس کے ملائم جھاگ آپ کے نفیس کپڑوں سے میل کو اس خوبی سے دھو ڈالتے ہیں کہ ان کی اصل خوبصورتی اور چمک دمک برقرار رہتی ہے اپنے قیمتی ملبوسات کی حفاظت کیجئے اور انھیں صرف لکس فلیکس میں دھوئیے
لکس سے دھلے ہوئے نفیس کپڑے ہمیشہ نئے ہی معلوم ہوتے ہیں!
LUX
LUX-2-145 UD

جلد ۱۲

مدیر: رفیق خاور — اکتوبر ۱۹۵۹ء — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

لیاقت علی خاں مرحوم

(چند تاثرات)

رئیس احمد جعفری

لیاقت علی خاں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آٹھ سال ہوگئے، لیکن دلوں میں ان کی یاد باقی ہے، اور شاید ہمیشہ باقی رہے گی۔ حب وطن کا دعویٰ کرنے والے نہ لیاقت علی خاں کے زمانے میں کم تھے نہ آج کم ہیں، ملک و ملت پر جان نثار کرنے، اور اپنا سب کچھ لٹا دینے کا اعلان کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں، یہ آواز حلقوم و گلو کی پوری قوت کے ساتھ لیاقت علی خاں کے زمانے میں بھی دیوار و در سے ٹکرایا کرتی تھی، اور ان کے بعد بھی بلکہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک، تو اس آواز کا شور اتنا بڑھ گیا تھا کہ نقار خانے کی آواز معلوم ہونے لگی تھی، جس میں دوسری آوازیں گم جاتی ہیں اور جو خود بھی اچھی طرح سنائی نہیں دیتی۔

لیکن لیاقت علی خاں کی بات ہی اور تھی، اس نے کہا کم، کیا زیادہ، اس نے مرنے سے چند دن پہلے اعلان کیا تھا۔ میں اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آیا، صرف جان ساتھ لایا ہوں، اور وقت آنے پر سب سے پہلے میرا خون، ملت کی حرمت اور ملک کے دفاع پر بہے گا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، اسے سچ کر دکھانے کے لئے زیادہ انتظار نہ کر سکا۔ ایک روز وہ اپنے "برادران ملت" سے خطاب کر رہا تھا کہ پستول کی گولی اس کے دل میں لگی، اور وہ پاکستان زندہ باد کہتا ہوا مر گیا، مر گیا، لیکن زندۂ جاوید بھی ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

وہ اس دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا، خالی ہاتھ گیا۔ اس کی جیب بھی خالی تھی، اور بینک بیلنس بھی صفر، ہاں لیکن ایک توشہ اپنے ساتھ لے گیا — بلکتی ہوئی ملت کے آنسوؤں کا توشہ، اپنے خون ناحق کا تحفہ، اپنے داغ داغ دل، اور پھٹے ہوئے سینہ کا نذرانہ لے کر بارگاہ الٰہی میں پہنچ گیا۔ اس دنیا سے جاتے وقت اپنی قوم کے لئے وہ اپنی یاد چھوڑ گیا، — نہ بھولنے والی یاد، نہ مٹنے والی یاد، حالانکہ اس کے ہم عصروں میں ایسے اصحاب بھی تھے، جو اس دنیا سے گئے، لیکن قوم کے لئے اگر کوئی چیز چھوڑی تو تلخی، اور خاندان و متعلقین کے لئے لاکھوں روپے کا بینک بیلنس، کتنا عجیب شخص تھا یہ لیاقت علی، خود تو نواب زادہ تھا، لیکن قوم کے لئے، فقیر بن گیا، اور کتنے عجیب تر تھے اس کے بعض معاصر، غریب تھے، لیکن قوم کے بل پر لکھ پتی بن گئے!

لیاقت علی خاں کی کچھ جھلکیاں میں نے دیکھی ہیں، اور وہ چند جھلکیاں ایسی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔

یوم آزادی کے موقع پر، گورنر جنرل کی طرف سے استقبالیہ (ریسپشن) کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم بیمار تھے، اور زیارت میں مقیم، لہٰذا وزیر اعظم نے اس کا انتظام کیا، نواب صدیق علی خاں، پولیٹیکل سکریٹری نے، دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا۔ لیاقت علی خاں کی سرکاری قیام گاہ کا وسیع لان، معززین شہر، حکام والا مقام، وزراء حکومت اور سفراء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بینڈ کا نغمۂ جاں فزا فردوس گوش ثابت ہو رہا تھا، اتنے میں لیاقت علی خاں سیاہ شیروانی میں ملبوس، جناح کیپ سے آراستہ، وقار و شکوہ کی تصویر بنے برآمد ہوئے، ہونٹوں پر تبسم رقصاں، آنکھوں میں سحر انگیز چمک، مہمانوں کی مزاج پرسی کرتے، ہنستے بولتے، یہاں اور وہاں گشت کرتے رہے، — لیاقت علی کے اس پیکر میں نشاط و مسرت کی روح جھانک رہی تھی۔

پھر کچھ روز بعد قائد اعظم کا انتقال ہو گیا، قوم یتیم ہو گئی، اس نوزائیدہ مملکت کی بنیادیں لرزنے لگیں، — شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل، "اب کیا ہوگا؟" ہر شخص کی زبان پر یہی سوال تھا۔ اپنے آپ سے بھی، اور دوسروں سے بھی، لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا اگر تھا تو ہراس اور دہشت کی صورت میں، اندیشہ ہائے دور و دراز کی حکومت تھی، امید دم توڑ رہی تھی، حوصلہ جواب دے رہا تھا، — امنگ دم توڑ چکی تھی، !

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء

"یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت!" دفعتہً لیاقت علی خاں نمودار ہوئے، یہ کوئی نئے شخص نہ تھے، مدت کے جانے پہچانے، قائد اعظم کے دست راست پاکستان کے وزیر معظم، لیکن آج قائد اعظم کی وفات کے بعد جب یہ نمودار ہوئے تو بالکل نئے آدمی تھے ——— تیور بدلے ہوئے، آواز بدلی ہوئی لہجہ بدلا ہوا، شخصیت بدلی ہوئی، لیاقت علی خاں کی تقریریں بارہا سنی تھیں لیکن آج کی تقریر چیز ہی کچھ اور تھی، اس تقریر نے قوم کا مزاج بدل دیا، وہی دل جو سہمے ہوئے تھے دفعتہً ان میں طوفانوں سے کھیلنے اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا ولولہ پیدا ہو گیا، لوگ جلسہ گاہ میں جب آئے تو ان کی گردن جھکی ہوئی تھی، جلسہ گاہ سے نکلے تو سینہ تنا ہوا تھا ——— وہ سینہ! ؎

جس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد زمیں
جس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراق دیار

لیکن وقت کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا!
حیدرآباد کا سقوط! ؎

مصائب اور تھے پر دل کا جانا!
عجب اک سانحہ سا ہو گیا تھا

اس حادثہ نے قیامت برپا کر دی' حیدرآباد گیا ——— "کیا پاکستان رہ سکے گا!"

اس موقع پر وہ جادو گر اپنے حیات آفریں نطق و کلام کا معجزہ لیکر پھر نمودار ہوا، اس کے چہرے پر نہ ہراس تھا' نہ دہشت' نہ فکر' نہ اندیشہ نہ کم حوصلگی' نہ پست ہمتی' وہ آیا اور اس نے نعرہ لگایا ؎

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

دنیا میں الفاظ اور آواز سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں، بشرطیکہ اس میں خلوص ہو، حوصلہ ہو، زندگی ہو ——— لیاقت علی خاں کے الفاظ میں خلوص تھا، حوصلہ تھا، زندگی تھی، اور یہ ساری چیزیں آن کی آن میں قوم کے جسم ناتواں میں منتقل ہو گئیں، اور واقعی اس میں شوکت طوفاں پیدا ہو گئی ——— دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

وہ قوم کے ساتھ چلتا رہا، قوم اس کے ساتھ چلتی رہی، دونوں ایک دوسرے کے رفیق اور دمساز، ہمدرد اور جاں نثار تھے، لیاقت علی خاں نے زندگی کی آخری سانس تک' اپنے اور قوم کے درمیان وہ رشتہ نہیں پیدا ہونے دیا' جو طالع آزما سیاست دانوں کا شیوہ ہوتا ہے یعنی آقا اور غلام کا رشتہ! وہ جانتا تھا اس کی قوت کا سرچشمہ قوم ہے' اور قوم جانتی تھی اس کی عظمت اسی مرد کار کے خلوص سے وابستہ ہے' دونوں میں کبھی تلخی نہیں پیدا ہوئی، کبھی کشمکش کی نوبت نہیں آئی۔

لیاقت علی خاں اس دنیا سے رخصت ہو گئے، "سرخ رو" ہو کر، بارگاہ رسالتمآب میں پہونچے، اور نذر پیش کرنے کا حق لیکر ——— اقبال کے الفاظ میں ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
یہ چیز وہ ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی

——— آبگینہ، جس میں لیاقت علی خاں کا خون جھلک رہا ہے۔

۷ اکتوبر

اسد ملتانی

یہی دن تھا کہ پاکستان میں اک انقلاب آیا
فلک سے دردمندوں کی دعاؤں کا جواب آیا

جزا دیکھی، سزا دیکھی، ثواب آیا، عذاب آیا
نظر کے سامنے اک نقشۂ روزِ حساب آیا

جو الجھاتے رہے ہیں قوم کو پُرپیچ باتوں میں
اب اُن لوگوں کے حصّے میں مسلسل پیچ و تاب آیا

تجارت سے یکایک کم ہوا عنصر شرارت کا
جو بدعنوانیوں کے حق میں حکمِ سدِّ باب آیا

زمینداروں کی بھی جاتی رہی سب آسماں داری
کہ حارث بن گئے وارث، وڈیروں پر عتاب آیا

ملا پھر ملک و ملّت کو نیا پیغامِ بیداری
نئی تعبیر بن کر شاعرِ مشرق کا خواب آیا

مسلمانوں کے اندازِ نظر کا امتحاں ہوگا
نیا دستور بننے پر جو وقتِ انتخاب آیا

نئی نسلوں کی ذہنیت میں تبدیلی تبھی ہوگی
ہماری درسگاہوں میں جب اسلامی نصاب آیا

یہ جب باعث بنا اسلامیوں کی سربلندی کا
اسدؔ کے ساتھ مل کر سب کہیں گے کامیاب آیا

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء

دورِ نغمہ

(دورِ نو کا استقبال)

نظر حیدرآبادی

اے واقفِ طلسمِ غمِ روزگار آ — اے ناقدِ سیاستِ لیل و نہار آ
چھٹنے لگا چمن سے خزاں کا غبار آ — آ، اے امینِ زمزمۂ نو بہار آ

گل ریز و عطر بیز ہوائیں قبول کر
سرو و سمن کی تازہ دعائیں قبول کر

آ، زندگی سُرور بداماں تجھی سے ہے — جوشِ نشاط و عیشِ فراواں تجھی سے ہے
یہ دورِ نغمہ، عہدِ بہاراں تجھی سے ہے — روشن چراغِ بزمِ گلستاں تجھی سے ہے

جی چاہتا ہے چاند ستارے بکھیر دوں
قدموں پہ تیرے نور کے دھارے بکھیر دوں

تو آ رہا ہے کیسے حسیں لالہ زار سے — عرشِ نشاط و کعبۂ ابرِ بہار سے
بزمِ شباب و شعر سے، شہرِ نگار سے — رنگوں کی سرزمیں سے، گلوں کے دیار سے

پرتو سے تیرے خاک بھی گلزار ہو گئی
اپنی زمین مطلعِ انوار ہو گئی

آ، اور دیکھ روح ہے سرشار یا نہیں — تازہ ہے ذوقِ شوخیٔ گفتار یا نہیں
اس انجمن میں ساز ہے بیدار یا نہیں — زندہ ہوئی ہے فطرتِ احرار یا نہیں

یوسفؑ کو حسنِ دیدۂ یعقوبؑ مل گیا
اہلِ وطن کے صبر کو ایوبؑ مل گیا

آ، پھر دکھائیں جہد و عمل کا ہی کیا مقام — کرتے ہیں کیسے جشنِ بہاراں کا اہتمام
کس طرح عام ہوتے ہیں انوارِ دورِ جام — کن ظلمتوں کو چیر کے نکلا مہِ تمام

تو نے بدل کے رکھ دیا رُخ ماہ و سال کا
اونچا فضا میں ہو گیا پرچم ہلال کا

حیاتِ تازہ

جمیل نقوی

شفق شفق فضا میں رنگ بھر رہی ہے زندگی
فلک فلک ستارہ وار اُبھر رہی ہے زندگی
چمن چمن جمیل رقص کر رہی ہے زندگی
سنور رہی ہے زندگی

بہار مسکرا اُٹھی گلوں میں رنگ بھر گیا
رخِ حیاتِ تازہ دم دمک اٹھا نکھر گیا
وطن کے اک سپوت کا خلوص کام کر گیا
یہ شورِ تا قمر گیا

سحر طلوع ہو گئی غموں کی رات کٹ گئی
وہ تیرگی جو ڈس رہی تھی جسم و جاں کو چھٹ گئی
بساطِ جورِ ناروا کی آخرش پلٹ گئی
ردائے ظلم پھٹ گئی

چلو میں اپنے عظمتوں کا کارواں لئے ہوئے
یقین و سوز و ساز و عزمِ نوجواں لئے ہوئے
بڑھے چلو دلوں میں جوشِ بےکراں لئے ہوئے
قرارِ جاں لئے ہوئے

بڑھے چلو کہ وقت کو تمہارا انتظار ہے
بڑھے چلو کہ کاہلی، عمل کو ناگوار ہے
بڑھے چلو کہ آج اپنا بخت سازگار ہے
حیات کامگار ہے

روشنیوں کے شہر

رضا ہمدانی

اجلا ہے نشانِ راہگذر
منزل ہے عیاں آساں ہے سفر
روشن ہیں چراغ فکر و نظر
آتے ہیں نظر آثار سحر
ظلمات کا جادو ٹوٹ گیا

کس کنج سے یہ سورج ابھرا
ظلمت کا نگر پامال ہوا
جو دیس غموں کا مسکن تھا
اس دیس میں غم کا کال ہوا

اب روشنیوں کے شہر ہیں وہ
کل تک جو کرن کو ترسے ہیں
جو گھر تھے اندھیروں کے مسکن
آج ان پہ اجالے برسے ہیں

مکاری کے بت چور ہوئے
اب اہل ہوس کا راج نہیں
اب کوئی یہاں سردار نہیں
اب کوئی یہاں محتاج نہیں

ہر کھیت میں دولت اُگتی ہے
ہر کھیت میں اب ہریالی ہے
مزدوروں اور دہقانوں کی
تقدیر بدلنے والی ہے
آتے ہیں نظر آثار سحر
وہ رات کا جادو ٹوٹ گیا

ہوائے آزادی

بشیر فاروقی

ہوا یہ کاوشِ اہلِ نظر سے اندازہ
کریں گے اہلِ جنوں عظمتِ سلف تازہ

چلی تھی آج کے دن ہی ہوائے آزادی
کھلا تھا آج کے دن ہی قفس کا دروازہ

مرے جنوں نے طلسم خرد کو توڑ دیا
مرے جنوں کا ہے سارے جہاں میں آوازہ

سنور رہے ہیں عروسِ بہار کے گیسو
بکھر رہا ہے فریبِ خزاں کا شیرازہ

کہیں لہو ہے سرا سرخیٔ فسانۂ عشق
کہیں ہے شوخیٔ رخسارِ حسن کا غازہ

شگفتِ غنچہ و گل کی تو ہے خبر معلوم
نسیم صبح چمن لا کوئی خبر تازہ

یہ سوز و درد ہے کس جرم کی سزا یارب
یہ کاہشِ غمِ دل کس خطا کا خمیازہ

اس انقلابِ حقیقت نوا نے فاروق
دلِ فسردہ کو بخشے ہیں ولولے تازہ

"زندگی دوام ما"

(ایک انقلاب، ایک تاریخ)

تسلیم عارفی

ایک نوعمر ادیب اور ساتھ ہی ناظر بھی ـــ جو شاید ہی کسی شمار قطار میں ہو لیکن اپنے طور پر ـــ آنکھ ہے میری تماشائی نیرنگِ جہاں ـــ اور اس دنیا کے رنگ، اس کے نقشے، اس کے طور طریقے نظروں سے گزر کر دل میں اترتے جاتے ہیں اور اپنے نقوش مرتسم کرتے جاتے ہیں. گویا میری زندگی ایک مستقل "دیکھتا چلا گیا" کی تفسیر ہے. اس سلسلے میں غالب کا حوالہ کیا دوں جو شاعروں کا شاعر اور ادیبوں کا ادیب تھا ـــ خاک کو آسماں سے کیا نسبت ـــ لیکن دونوں کے سامنے شب و روز تماشا ضرور ہوتا رہا ہے. اس لئے اگر اس کی زبانی یہ کہہ دوں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ؎

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بحرفم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

نوعمر ہوں، سرد و گرم جہاں ناچشیدہ، اس لئے میری سوچ کا ڈھنگ نہ صرف غیر ادیبوں بلکہ پرانے ادیبوں سے بھی مختلف ہے. بہرحال صیغۂ واحد متکلم میں کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ادیبوں اور ان سے بڑھ کر شاعروں کا پرانا مرض ہے۔

میں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوش سنبھالا اور ہوش سنبھالتے ہی ایک تاریخی انقلاب سے واسطہ پڑا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی کے دور کو محسوس نہیں کیا. میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی تحریکِ آزادی کا مطالعہ کیا. سراج الدّولہ سے شاہ ظفر تک اور شاہ ظفر سے قیامِ پاکستان تک کے حالات پڑھے. اس کے علاوہ جنگ و جدل سے بھرپور فلمیں دیکھیں. تاریخی مطالعہ اور فلم بینی کے اثر نے میرے ذہن میں انقلاب کا ایک عجیب مفہوم پیدا کر دیا. میں سمجھتا تھا کہ انقلاب لانے کے لئے نقاب پوش گھوڑ سواروں کی موجودگی بیحد لازمی ہے۔

مجھے یاد ہے جب قائدِ اعظم فوت ہوئے تھے تو ہر شخص کی زبان پر تھا "اب کیا ہوگا؟ کون اب ہماری رہنمائی کرے گا؟ اس ملک کا کیا بنے گا؟" وہ پہلا دن تھا جب میں نے دوسروں سے ہٹ کر سوچا تھا. میں نے سوچا تھا کہ یہ قوم جو بنیادی طور پر نیک اور سادہ لوح ہے پیغمبر کے بعد امام یا مخلص رہنما کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی. میری نظروں کے سامنے میرا ملک جو فاضل اناج پیدا کرتا تھا اپنے عوام کو فاقوں مرتا دیکھتا رہا. میری نظروں کے سامنے اشیاء کی قیمتوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہوتا رہا. سمگلر اور ذخیرہ اندوز پھولتے پھلتے رہے. کسان اور مزدور تباہ حال ہوتے رہے. چور بازاری، رشوت ستانی، کنبہ پروری اور اقربا نوازی زور پکڑتی رہی. مذہب کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلا جاتا رہا. ہر قسم کے جوڑ توڑ ہوتے رہے. سیاسی جماعتیں اور وزارتیں بنتی بگڑتی رہیں. عوام سے وفا نہ ہونے والے وعدے کئے جاتے رہے. میں نے سوچا انقلاب آنا چاہئے. کوئی بھی لائے مگر آنا چاہئے. پھر سوچا کون لائے، کسان، مزدور، طالب علم، مولوی یا کمیونسٹ. کسانوں اور مزدوروں کے پاس گھوڑے کہاں. گھوڑے تو زمینداروں کے پاس ہیں. طالب علم تو جلوس نکال کر نعرے ہی لگا سکتے ہیں. مولوی گھوڑے، تلواریں اور بندوقیں کہاں سے لائیں گے. کمیونسٹوں کو اگر غیر ملکی امداد مل جائے تو گھوڑے خرید کر کہاں باندھیں گے کیونکہ یہ لوگ تو پاکستان کے شہروں میں آباد ہیں. اتنے سارے گھوڑے کہاں باندھیں گے؟ میں ہر قیمت پر انقلاب چاہتا تھا. میں پیاسا تھا، پانی پینا چاہتا تھا. اچھا، برا جیسا بھی ہو تاکہ مرنے سے بچ سکوں. مگر مجھے اپنے ملک میں انقلاب ناممکن نظر آیا. اپنے ملک کے بارے میں میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ فوج بھی انقلاب پیدا کرا سکتی ہے۔ میرا ذہن زیادہ سے زیادہ پولیس تک جاتا اور مایوس ہو جاتا. پھر بھی میں کبھی کبھی سوچتا کہ نقاب پوش گھوڑ سوار بازاروں اور گلی کوچوں میں ایک نہ ایک دن ضرور گولی اور تلوار چلاتے ہوئے پولیس اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیں گے اور کسی ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کر دیں گے کہ حکومت بدل گئی ہے. مگر میری فلم بینی

اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ اس وقت بالکل غلط ثابت ہوا جب پوری کی پوری قوم تباہی و بربادی کے گہرے گڑھے کے کنارے پہنچ گئی۔ چنانچہ میں نے موت کو قریب آتے دیکھ کر کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات اور ۸ اکتوبر کی صبح میں کبھی نہ بھولوں گا جو مجھے اطلاع دیئے بغیر آئی۔ اس صبح جب میں نے اخبار دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ "تمام ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ۔ ۔ پارلیمنٹ، قانون ساز اسمبلیاں، مرکزی اور صوبائی وزارتیں توڑ دی گئیں۔ ۔ ۔ جنرل محمد ایوب خاں نے ناظم اعلیٰ مارشل لا کی حیثیت سے اختیارات سنبھال لئے۔" میں نے انتہائی مسرت کے عالم میں بازار کا رخ کیا۔ بھاگی کہ جاکر دیکھے مگر نقاب پوش گھوڑ سوار کہیں دکھائی نہ دیئے۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا فوجی دکھائی دیا جو لوگوں کو فٹ پاتھ پر چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ یا پولیس کے اڈے پر عوام کو قطار بندی کی تربیت دے رہا تھا۔ سخت مایوسی ہوئی۔ نہ گولی چلی نہ تلوار اور نہ گھوڑ سوار نقاب پوش آئے۔ یہ کیسا انقلاب ہے۔ شام جب ریڈیو سنا تو جنرل ایوب خاں تقریر کر رہے تھے: "پاکستان کے عزیز شہریو! السلام علیکم۔ میں آپ کے سامنے جن مسائل پر تقریر کر رہا ہوں وہ اہم بھی ہیں اور بڑے سنجیدہ بھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ میری باتوں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سنیں۔ اور بڑی اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آپ تعمیری طریق پر عملدرآمد کر سکیں۔ کیونکہ ہم سب کی بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کی نجات صحیح عمل میں ہے۔" تقریر جاری رہی اور میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ جنرل تو قائد اعظم کے لب و لہجہ میں بول رہا ہے۔ یہ اس قوم کے لئے سخت الفاظ استعمال کیوں نہیں کرتا جو اس قدر ظلم و تشدد سہنے کے باوجود بے حس رہی۔ میں نے پھر توجہ کی۔ ۔ ۔ "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ انتشار انگیز حالات اِن خود غرض لوگوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں جنہوں نے سیاسی لیڈروں کے روپ میں ملک کو تباہ کیا یا ذاتی فائدوں کے لئے اس کا سودا کرنے کی کوشش کی۔" ایک شخص بولا "حقیقت ہے۔" سب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور اُس نے ہیرو کا پوز بنا کر سب پر ایک نگاہ ڈالی۔ براڈکاسٹ جاری تھا۔ "اس دوران کمزور اور کم حوصلہ حکومتیں انتہائی غفلت کوشی اور بزدلی کے ساتھ صرف تماشہ دیکھتی رہیں۔ اور حالات کو بگڑنے، ابتر ہونے اور ضبط و نظم کو لوٹنے تباہ ہونے دیا۔ ۔ ۔"

۔ ۔ ۔ میں نے سوچا یہ کیوں نہیں بتاتا کہ فوج کو انقلاب لانے کی کیوں سوجھی۔ کان دھرے تو آواز آ رہی تھی: "لیکن کچھ عرصے سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے عوام فوج پر بھی اپنا اعتماد کھونے لگے ہیں کہ اس نے انہیں اس ظلم اور اس ذہنی و روحانی اذیت سے نہیں بچایا۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شخص نے جو بنیان اور دھوتی پہنے کھڑا تھا پنجابی زبان میں نعرہ لگایا: "شاباش اوئے شیر دیا پُترا۔" مجھے اِس نعرے سے اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے حلوائی کو جس کی دکان کے سامنے میں کھڑا خبریں سن رہا تھا آدھ سیر دودھ میں ایک پاؤ جلیبیاں ڈالنے کا آرڈر دیا۔ اور سوچا کہ اب انقلاب آ گیا ہے۔ صحت بنانی چاہئے۔ میں نے دودھ کے چند ہی گھونٹ پئے تھے کہ توجہ پھر براڈکاسٹ کی طرف مبذول ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "انتشار پسندوں، اسمگلروں، چور بازاری کرنے والوں اور معاشرہ دشمن ذلیلوں سے بھی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سپاہی اور عوام تمہاری صورت سے بیزار ہیں۔ اس لئے اگر عافیت چاہتے ہو تو اپنی زندگی کو بدل دو۔ ورنہ سزا ملے گی اور یقینی ملے گی۔ ان کا اب کسی صورت میں بھی چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ ہم ان کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کریں گے۔"

میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ داڑھی منڈھانے کی مجھے عادت ہے۔ گو یہ قدرے غیر شرعی ہے مگر خدا مجھے اس کے لئے معاف کرے۔ [illegible] کو بازار میں بلیڈ کہیں نہیں مل رہے تھے۔ آخر ایک دوکاندار نے تمہید کے بعد فروخت کرنے کی یوں حامی بھری کہ "بلیڈ آج کل [illegible] میں نے چند دانے بلیک میں خریدے تھے۔ چار دانے باقی رہ گئے ہیں۔ آٹھ آنے دے دیجئے۔" ۔ ۔ ۔ میں نے غنیمت جان کر خرید لئے۔ [illegible] دوکاندار آٹھ آنے کے دس بیچ رہا تھا۔ اور اُس کی دکان سے اتنے بلیڈ نکلے کہ سارے شہر کو سال بھر کے لئے کافی تھے۔

مارشل لا کے نفاذ کے بعد چند ہی روز میں ہر کمیاب شے بہتات کے ساتھ کھلے بازار میں آ گئی تھی۔ دام اتنے گر گئے تھے کہ [illegible] شکار عوام کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے پیسے کہاں سے لائیں کہ سب کچھ خرید لیں۔ لوگ عمر بھر کی ضروریات زندگی [illegible] چاہتے تھے۔ اس لئے کہ بے عنوان سیاسی رہنماؤں اور نااہل حکومتوں نے انہیں اتنے فریب دیئے تھے کہ [illegible] ایمان [illegible] اناج کی خرید کے لئے پیسے بچا سکے تھے وہ ضروریات روزمرہ کا سامان [illegible] خرید کر لے گئے۔ اس صورت حال کے [illegible] بڑے شہروں میں اشیاء کی خرید کے لئے ایک حد مقرر کر دی۔ ایک تو اس لئے کہ امیر لوگ موقع سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ [illegible] اور دوسرا اس لئے کہ غریب عوام غیر ضروری اشیاء زیادہ خرید کر ضروریات زندگی کے لئے مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ [illegible]

صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے اپنی ایک نشری تقریر میں تمام اشیاء کو تین حصوں میں تقسیم کر کے کارخانہ داروں اور خوردہ فروشوں کے نفع کی ایک معقول حد مقرر کر دی۔

مارشل لا کے نفاذ سے ایک روز قبل امام بخش خالص دودھ فروش، جب سائیکل کے آگے پیچھے ڈبے لٹکائے ہمارے مکان پر دودھ دینے آیا تھا تو اپنی پندرہ بھینسوں کی تعریف کرتے اُس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ مگر ۸ اور ۹ اکتوبر کو وہ نہ آیا تو ہم سمجھے شاید بیمار ہو گیا ہے بیچارا۔ جب ۱۰ اکتوبر کو مارکیٹ میں میں نے اُسے بھلا چنگا دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا "بھئی۔ امام بخش۔ دودھ دینے کیوں نہیں آتے۔" کہنے لگا "جناب میری پندرہ کی پندرہ بھینسیں سوکھ گئی ہیں۔ کیا کروں۔ اللہ کی مرضی یہی ہو گی۔" میں نے حیرت سے پوچھا "کمال ہے۔ پندرہ کی پندرہ بھینسیں رات کی رات سوکھ گئیں" مسکرا کر کہنے لگا۔ "جی ہاں! جنرل ایوب کے خوف سے۔" پھر خود ہی کہنے لگا "جنرل صاحب نے کہہ دیا ہے کہ پرانی عادتیں چھوڑ دو۔ اس لئے اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ میرے پاس ایک بھینس بھی نہیں تھی۔ میں چار سیر دودھ میں ایک من پانی ڈال کر اُس میں پاؤڈر گھول دیتا تھا۔ اور وہ آپ کو فروخت کرتا تھا۔"

عملی طور پر ۷ اور ۲۷ اکتوبر میں کوئی فرق نہیں۔ مگر ۲۷ اکتوبر اس لئے زیادہ اہم ہے کہ فوجی انقلاب کے قائد جنرل محمد ایوب خاں نے اِس دن سے واضح طور پر صدرِ مملکت کا عہدہ سنبھال کر عوام کی خواہش کے عین مطابق پرانی سیاست کی آخری کڑی کو جو ٹوٹنا چاہتی تھی توڑ دیا۔ صدرِ پاکستان نے فوج کو انتظامیہ میں زیادہ مدغم نہ ہونے دیا۔ اور سول اداروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا۔ تعجب ہے کہ مارشل لا کے ایک ہی مہینہ میں عوام اور سول حکام پر فوج کو اتنا بھروسہ ہو گیا کہ ۱۰ نومبر کو مغربی پاکستان (ماسوا کراچی و ملیر) سے تمام فوجی دستے ہٹا لئے گئے۔ اور تمام فوجی عدالتوں کو ختم کر دیا گیا۔ یہی اقدام دوسرے روز کراچی اور پورے مشرقی پاکستان میں کیا گیا۔ یہ اقدام محض اِس لئے کیا گیا کہ ہماری فوج کو اطمینان ہو گیا تھا کہ مارشل لا کا فوری مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ انتظامیہ اب بیرونی اثرات سے آزاد ہو گئی ہے۔ اور سارے ملک کی فضا اب بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ گو فوجی دستے واپس بلا لئے گئے مگر مارشل لا جاری رہا اور اب بھی افواج ملک کو اپنی حفاظت میں لینے کو تیار ہیں۔

ہم بچپن میں جب سناروں کو دریا کے کنارے ریت چھانتے دیکھتے تو اُن کے پاس جا بیٹھتے اور سنار ہمیں بُرا بھلا کہہ کر بھگا دیتے۔ اس لئے کہ کہیں کوئی سونے یا چاندی کا ذرہ ہمارے ہاتھ نہ لگ جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہر سنار مسلسل تگ و دو کے بعد سال بھر میں کہیں ایک تولہ سونا اکٹھا کرتا ہو گا۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد ایک دیہاتی سنار مجھ سے کہنے لگا "بابو جی۔ سنا ہے کراچی کے سمندر سے لوگ بہت سونا نکال رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہاں"

"کتنا سونا نکلا ہو گا؟"

"دو ٹن"

"دو من" حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"دو من نہیں۔ دو ٹن" میں نے اُسے پھر سمجھایا۔

"ٹن کیا ہوتا ہے؟" اُسے کچھ تشویش ہوئی۔

"۲۸ من کا ایک ٹن ہوتا ہے۔ اور دو ٹن میں ۵۶ من ہوتے ہیں۔"

سنار چونکہ جتنی آنکھیں پھاڑ چکا تھا اُس سے زیادہ نہ پھاڑ سکتا تھا اور جتنا منہ کھول چکا تھا اُس سے زیادہ نہ کھول سکتا تھا اس لئے اِس سے پہلے کہ چکرا کر گر پڑے میں نے اُسے سنبھال لیا۔ جب ہوش میں آیا تو کہنے لگا "میرا خیال ہے سمندر میں وہیل مچھلیوں نے اتنا سونا بنایا ہو گا" میں نے جواب دیا "نہیں۔ یہ انسانی شکل و صورت رکھنے والے ان مگرمچھوں نے اکٹھا کر رکھا تھا جنہیں عرفِ عام میں سمگلر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ سونا بلکہ اسکے علاوہ لاکھوں روپے کی مالیت کے ہندوستانی سکے اور لاکھوں روپے کی مالیت کی سمگل شدہ اشرفیاں اور سونے کے تھیلے بھی نکالے۔" سنار کچھ سوچ کر کہنے لگا "میں بھی جاؤں"۔ میں نے کہا "کہاں؟" بولا "کراچی"۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کام پاکستان کی بحری فوج انجام دے رہی ہے حکومت اُسے تکلیف نہیں دینا چاہتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جنوری ۵۹ء کے دوسرے ہفتہ میں میرے گاؤں سے آیا ہوا ایک کسان میرے پاس ٹھہرا تھا اور مجھے بار بار مجبور

کرتا تھا کہ میں نئی حکومت کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ "میں ملک سے باہر کوئی جنگ میں حصہ لیکر نہیں لوٹا ہوں کہ تمہیں کارنامے سناؤں۔ تم بھی اِسی ملک میں رہتے ہو۔ اور میں بھی۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو یہ کارنامہ ہے اور اگر نہیں ہوئی تو کوئی کارنامہ نہیں۔ کسان سمجھا میں اسے ٹال رہا ہوں ——— کہنے لگا۔ "کچھ تو بتلایئے"۔ میں نے کہا۔ "میری رائے میں اِس حکومت نے سمگلنگ بند کرکے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ چور بازاری ختم ہو رہی ہے۔ سرکاری دفتروں میں کام کی رفتار تیز ہوگئی۔ عدالتیں پُرانے بدعنوان سیاست دانوں کے اثر سے آزاد ہیں۔ ذخیرہ اندوزی ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ کسان بولا۔ "مگر اس حکومت کو ان کاموں سے کوئی فائدہ بھی ہوا ہے یا نہیں؟"

"فائدہ! صرف ذخیرہ اندوزی اور پوشیدہ دولت کے اظہار، زرعی لگان اور انکم ٹیکس کے بقایاجات وغیرہ سے جو کئی برسوں سے واجب الادا تھے، حکومت کو ایک ارب چونتیس کروڑ روپے کا فائدہ ہوا ہے"...... کسان میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"ایک عرب سے چونتیس کروڑ روپے کا فائدہ! بڑا ہی امیر عرب ہوگا"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "عرب نہیں ارب۔ میری مراد ملکِ عرب کے باشندہ سے نہیں"

کسان نے حیرت سے پوچھا۔ "تو پھر آپ کی مراد کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "دیکھو۔ سو ہزار کا ایک لاکھ ہوتا ہے۔ سو لاکھ کا ایک کروڑ اور سو کروڑ کا ایک ارب"۔ کسان نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا! تو گویا چالیس کروڑ یہ اور سو کروڑ وہ"۔ میں نے کہا۔ "صرف یہی نہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ ملک کے دونوں حصوں میں بچت کی کئی اسکیموں پر عمل ہو رہا ہے اور بہت کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔ بچت بھی تو فائدہ ہے"۔

یہی کسان جب مجھے چند روز بعد ملا تو بیحد خوش تھا۔ میں نے اسکا سبب دریافت کیا تو کہنے لگا۔ "جرنیل صاحب نے موروثیوں کو زمینوں کا پکا مالک بنا دیا ہے"۔ اس کی مراد زرعی اصلاحات سے تھی۔ میں نے پوچھا۔ "بس۔ تمہیں اس معاملے میں صرف اتنا ہی علم ہے یا کچھ اور بھی؟ کہنے لگا۔ "ہم اَن پڑھ لوگ کیا جانیں۔ صرف سنی سنائی بات کر رہا ہوں"۔ میں اس وقت اسے سمجھانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر چونکہ اس نے اپنے اَن پڑھ ہونے کا اعلان کر دیا تو مجھے ثابت کرنا پڑا کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔ حالانکہ پڑھے لکھے لوگ مجھے بھی اَن پڑھ ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اسے صرف اتنی بات بتانی چاہیئے کہ زیبِ داستاں کے لئے کوئی اضافہ نہ کرسکے ورنہ یہ بھی جھوٹی افواہ پھیلانے کے جرم میں پکڑا جاسکتا ہے اور میں بھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ زرعی اصلاحات کے تحت کوئی شخص مالک یا قبضہ دار کی حیثیت سے پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ نہیں رکھ سکے گا۔ مالکوں اور قبضہ داروں کو اس بات کی اجازت بھی ہوگی کہ ایک سو پچاس ایکڑ باغاتی رقبہ رکھ سکیں اور اپنے وارثوں کے نام کچھ رقبہ ہبہ بھی کرسکیں۔ اس حد بندی کے بعد جو زمین رہ جائے گی وہ حکومت اپنے قبضہ میں لیکر مزارعین میں تقسیم کر دے گی تاکہ وہ اسے خرید لیں، اور پچیس سال میں قسطوں کے ذریعہ قیمت ادا کر دیں۔ حکومت اس بات کا بھی خیال رکھے گی کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زمین کو اکٹھا کر دے تاکہ پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ اس کے علاوہ جاگیرداری کا بھی بلا معاوضہ خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ کسان ضبط کئے خاموشی سے سنتا رہا مگر آخر پھٹ پڑا:-

"نہیں جی! ایسا بھی کبھی ہوسکتا ہے، آپ مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں"

میں نے کہا: "جی ہاں، آپ کی خوشنودی جیسے مجھے گورنر بنا دے گی"۔

کہنے لگا: "تو گویا یہ سب کچھ سچ ہے مگر بڑے بڑے زمیندار ایسا ہونے دیں گے۔ وہ تو بڑے سیاستداں ہیں۔ ان کا حکومت میں بڑا اثر رسوخ ہے"

میں نے کہا: "بھائی میرے! کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زرعی اصلاحات کے قانون سے کوئی چھ ہزار بڑے زمینداروں پر اثر پڑے گا۔ مگر ان کے لئے باعزت طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے کافی کچھ رہ گیا ہے۔ اس قانون نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ کسانوں کے ساتھ انصاف کیا ہے جن کی آبادی اس ملک میں تقریباً نوے فیصدی ہے چھ ہزار

لوگوں کے فائدے کے لئے ایک بیوقوف یا خود غرض حکومت ہی چھ کروڑ لوگوں کو بھوکا، ننگا اور جاہل رکھ سکتی ہے۔"

میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ اُوپر سے میرا ایک نہایت بے تکلف "انقلابی دوست" آدھمکا۔ اِس دوست کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ہر جگہ میری کم علمی کا بھانڈا پھوڑے۔ چنانچہ آتے ہی کہنے لگا: "کیوں، بیچارے پر رعب ڈال رہے ہو، ہاں اگر تقریر کی مشق کر رہے ہو تو ٹھیک ہے۔" کسان مسکرا دیا اور مجھ سے اجازت لیکر رخصت ہوا۔ میرا موڈ کچھ خراب ہو گیا۔ مگر میرے دوست نے اسے قطعی اہمیت نہ دی۔ "میں بڑی دیر سے کھڑا تمہاری باتیں سنتا رہا۔ نہ جانے تم مارشل لا سے اس قدر خائف کیوں ہو؟"

میں نے قدرے سختی برتی: "خائف تو میں جب ہوتا کہ سارے ملک میں گولی چل رہی ہوتی۔ بازار ٹینکوں سے لرز رہے ہوتے اور فوج عام لوگوں کو کتوں کی طرح مار رہی ہوتی۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا کس سے خائف ہو سکتا ہوں۔ اور پھر تم تو مجھے جانتے ہی ہو۔ جو بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہی کرتا ہوں۔ تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو انقلاب عوام چاہتے ہیں، وہ آ جائے جب بھی اُس کی مخالفت ہی کرنی چاہیئے۔"

میرے دوست نے مجھے ٹھوڑی سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "کیا کوئی لائسنس ملنے والا ہے یا سرکاری ملازمت؟"

غصّہ تو مجھے بہت آیا مگر میں نے تحمل سے کام لیا۔ "آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ موجودہ حکومت جب تک سرکاری ملازمین کی اسکریننگ کا کام مکمل نہیں کر لیتی کسی کے ملازم رکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر میں تو بقول آپ کے اَن پڑھ ہوں۔ رہا لائسنس کا معاملہ تو چونکہ درآمد اور برآمد کے صحیح مفہوم کا مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ اسلئے پہلے آپ کو میرے سامنے اس کی تشریح کرنا ہوگی۔ ویسے غلطی سے کہیں پڑھا تھا کہ درآمد برآمد کا نئے لائسنسوں کے اجراء کے ساتھ کوئی تعلق ضرور ہے اور کچھ لائسنسوں کو منسوخ کر دیا جائیگا۔ واللہ علم بالصواب۔"

میرا دوست مسکرا دیا۔ "بھئی ایک بات کی خوشی مجھے ضرور ہے۔ وہ یہ کہ تم طنزیہ گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ رہی موقع محل پر اس کے صحیح استعمال کی بات۔ تو یہ بڑی دیر میں سیکھو گے خیر جانے دو۔ سنو۔ تمہارے پاس لینن پر ایک کتاب ہے جو تم نے ۴۸ء میں لاہور سے خریدی تھی۔ اس کی مجھے ضرورت ہے۔" میں نے الماری سے کتاب نکالکر اس کے حوالے کی اور کہا۔ "تم اسے اپنے پاس ہی رکھ سکتے ہو۔"

اس نے پھر فقرہ چست کیا۔ "کیوں، گھبرا گئے؟"

میں نے جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا۔ "لاؤ۔ میں اس پر اپنا نام پتہ لکھ کر اپنی ملکیت کا اعلان کر دوں۔ تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو سکے کہ جب تم جیسے دوستوں سے مجھے بحث کرنا پڑتی ہے تو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ تم اشتراکیت کے مطالعہ سے بھی اتنے ہی بے بہرہ ہو جتنا کہ مذہب کے مطالعہ سے۔"

کچھ روز بعد میرا دوست لاہور چلا گیا۔ مگر کافی عرصہ تک اس کا کوئی خط نہ آیا۔ آخر اگست ۵۹ء کے آخری ہفتہ میں اس کا خط ملا۔ جس میں علاوہ دیگر باتوں کے یہ بھی درج تھا۔ "کہو، تمہارا انقلاب کن مراحل میں ہے؟" میں نے اُسے جواب دیا۔

"کامریڈ!

آخر خدا خدا کر کے ـــــ معاف کرنا ـــــ لینن لینن کر کے، تمہارا خط ملا۔ آجکل کون مصروف نہیں ہے۔ ایک سطر اپنی خیریت کی اطلاع کے طور پر تو جلد لکھ بھیجی ہوتی، میں ناحق پریشان رہا۔

تم نے لکھا ہے "کہو تمہارا انقلاب کن مراحل میں ہے۔" معلوم ہوتا ہے تم نے شہر سے باہر ایک ایسی جگہ کسی نہر کی کھدائی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے جہاں اخبارات نہیں پہنچ پاتے۔ ورنہ تم یہ سوال ہر گز نہ کرتے۔ میرا مقصد ہے۔ اچھا کہتے، بُرا کہتے۔ مگر یوں کورا سوال نہ کرتے۔ بہرحال تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ انقلاب کافی مراحل طے کر چکا ہے۔ کچھ مراحل تو یہ یہاں تمہاری موجودگی ہی میں طے کر چکا تھا جنہیں تم مانتے تو تھے مگر بین الاقوامی اہمیت نہ دیتے ہوئے معمولی سمجھتے تھے۔ مثلاً چور بازاری، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی کا قلع قمع کرنا، ہر قسم کے واجبات کی ادائیگی، زرعی اصلاحات وغیرہ۔ زرعی اصلاحات تمہیں یوں تو قدرے پسند آئیں کہ بڑے بڑے زمینداروں سے مقررشدہ حد سے زائد زمینیں لے لی جائیں گی مگر یوں پسند نہ آئیں کہ یہ زمینیں روسی کسانوں میں کیوں نہ تقسیم کرنے کی سفارش کی گئی۔ گو تم نے یہ الفاظ استعمال

انقلاب اکتوبر

ادب :

سائنس :

فن :

تعلیم :

انقلاب اکتوبر
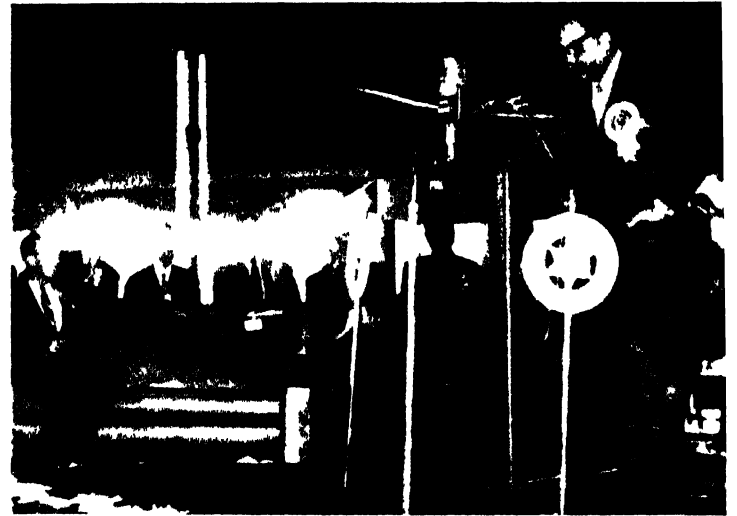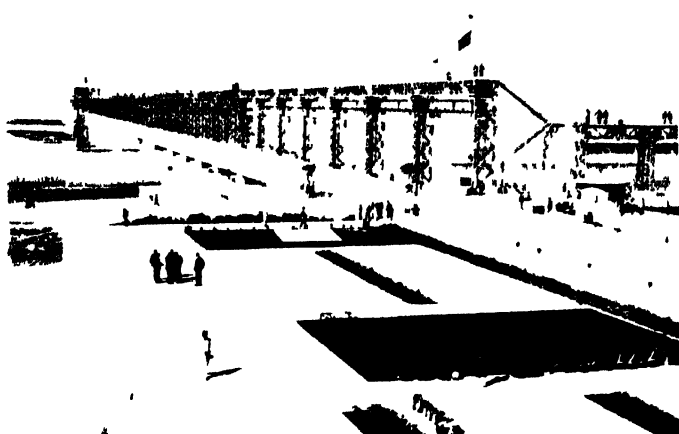
ڈھاکہ

نہ کئے تھے مگر تمہارے لب و لہجہ سے اخذ ہوتا تھا۔ کامریڈ! اگر تم نہ پوچھتے تو میں یہ تکلیف دہ خبریں تمہارے مطالعہ کے لئے ہرگز سپرد قلم نہ کرتا۔
گذشتہ چند ماہ میں سکریننگ کے طور پر سرکاری دفاتر سے سینکڑوں بدعنوان، راشی اور نااہل ملازمین کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ان میں چند اسی اعلیٰ احکام بھی شامل ہیں۔ کچھ لوگ وہاں بھی ہوں گے۔ ان سے کبھی کبھی ملتے رہا کرو اور غم غلط کرنے کے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دوسری جانگسل خبر یہ ہے کہ کورنگی میں حکومت نے پانچ ماہ کے قلیل عرصہ میں پندرہ ہزار کوارٹر تعمیر کر کے مہاجرین کو ان میں بسا دیا ہے۔ جب کورنگی کالونی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ جنرل اعظم خاں تکمیل تعمیر کا وقت مقرر کر کے پاگل پن کا ثبوت دے رہا ہے۔ واقعی تم نے ٹھیک کہا تھا۔ کیونکہ یہ فوجی اگر "پاگل" نہ ہوتا تو پانچ ماہ کے اندر پندرہ ہزار کوارٹر تعمیر کر کے ریکارڈ قائم نہ کر دیتا!

طبی اصلاحات سے چونکہ تمہیں دلچسپی نہیں ہے اس لئے ان کا ذکر نہیں کرتا۔

تعلیمی، قانونی، اور سائنسی کمیشن عنقریب اپنی سفارشات پیش کرنے والے ہیں، جنہیں امید ہے تمہارے خط کا جواب موصول ہونے سے پہلے قانونی شکل دے دی جائیگی ...... ملک کا دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی منتقل ہو رہا ہے مگر چونکہ تمہیں صحت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسلئے آب و ہوا کا ذکر کرنا بے سود ہے۔

جنرل محمد ایوب خاں نے ایک نہایت ہی "مایوس کن" اعلان کیا ہے کہ مارچ ۶۰ء تک نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات کیلئے رائے دہندگان کی فہرستیں ہر حالت میں تیار کر لی جائیں گی۔ بنیادی جمہوریتوں کا قانون عنقریب پاس ہونے والا ہے۔ جس کے تحت دیہات میں پنچایتی نظام رائج کیا جائیگا مگر پرانے بدعنوان سیاستدانوں کو جن پر جرم ثابت ہو جائیگا، ان انتخابات میں حصہ نہیں لینے نہیں دیا جائے گا۔ تم کہو گے، کیوں؟ اگر بدعنوان سیاست دانوں کو پنچایتوں یا اس سے اوپر کے انتخابات میں حصہ نہیں لینے دیا جائیگا۔ تو ہم کن کو گالیاں دیکر "انقلابی" کہلائیں گے۔

کامریڈ! میں زیادہ لکھکر تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اور آج ہی مارشل لا والوں کو درخواست بھیجتا ہوں کہ وہ اپنی تجویزوں کو عملی صورت نہ دیں کیونکہ اس سے میرے ایک عزیز دوست کی حرکت قلب بند ہو جانے کا اندیشہ ہے!

جب حالات نے مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کیا تو سب سے پہلے تمہیں اطلاع دونگا۔" فقط

تمہارا، تسلیم

+ + +

غزل

مضطر اکبر آبادی

ٹھہر ٹھہر کے سفرِ زندگی کاٹے نہ کرو — قیام بستیٔ ذوقِ سفر ہے ہم سفرو

قدم بڑھاؤ ستاروں کی انجمن کی طرف — حسین راہ نوردو جمیل راہرو

منا رہا دہ کشو جشنِ اولین بہار — بڑھاؤ ہاتھ دو صراحی اٹھاؤ جام بھرو

مغنیو! کوئی سحر آفریں غزل چھیڑو — جگاؤ دل کوئی جادو جگاؤ نغمہ گرو

سکھاؤ دیدہ کو آداب دیدۂ دل کو — اٹھاؤ دیدہ و دل سے حجاب دیدہ ورو

ابھی ہزار مراحل ہیں رنگ و بو کے سوا
ابھی کچھ اور مذاقِ نظر بلند کرو

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۸ء

مذاکرہ*:

مرتبہ: شہرت بخاری

نئے ادبی دور کا آغاز؟

موضوعِ بحث:

"کیا قیامِ پاکستان کے بعد
ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے یا نہیں؟"

ریاض احمد:

جب ہم یہ سوچنے بیٹھتے ہیں کہ کسی نئے ادبی دور کا آغاز ہوا کہ نہیں، تو دو باتیں فوراً ہمارے ذہن میں آتی ہیں: ایک یہ کہ تخلیقات میں کسی نئی افتادِ طبع کا احساس ہوتا ہو، دوسرے یہ کہ ہیئت کے لحاظ سے ایسے تجربے سامنے آئیں جو پہلے موجود نہ تھے یا پہلے تجربوں کے مقابلے میں کچھ الگ سے ہوں۔ ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ تاریخی لحاظ سے بھی کسی ادبی دور کا تعین کیا جاتا ہے۔ کسی ملک میں معاشرتی، سیاسی اور مجلسی لحاظ سے جو تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس سے کسی نئے ادبی دور کا آغاز عمل میں آتا ہے۔ سال ۱۹۴۷ء ہماری تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ اس سے ایک نئے ملک، ایک نئی قومیت کا تعین ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر پڑھنے والا لکھنے والوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ جو کچھ وہ اس سال سے قبل کہہ رہے تھے، وہ بعد کی تخلیقات سے واضح طور پر مختلف ہونا چاہیئے تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ ہم نے تاریخی طور سے ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ ذرا ماضی میں حالی اور آزاد کے زمانے میں جا کر دیکھئے۔ فن کی ہیئت اور مواد کا جہاں تک تعلق ہے، اسی زمانے سے جدید نظم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ زبان اور خالص جمالیاتی اقدار سے ہٹ کر ملکی اور ملی مسائل کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ "مسدس" کی طرف اس معاملے میں خاص طور پر اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اکبر الہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک سیاسی اور سماجی اقدار پر زیادہ زور دیتی ہے۔ جو دور حالی سے شروع ہوا تھا وہ اقبال پر ختم ہوا۔ اقبال نے جو کام کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ اُس کی زندگی ہی میں ادب کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ حصولِ آزادی تک جاری رہا۔ شعر اور افسانہ دونوں میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ انشائے لطیف ایک نیا تجربہ تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ ان معین اصناف سے علیحدہ ہو۔ جہاں تک تمام ادب کی افتادِ مزاج کا تعلق ہے، اس میں صرف اتنا احساس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی کسی نئی چیز میں دلچسپی لے رہا ہو یا نئے علوم کو آشنا کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس پورے ادب کا پس منظر وہی محرکات ہیں جو تقسیمِ ملک سے پہلے تھے یعنی ترقی پسند اثرات اور نفسیات۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی ہے جسے احساسِ بغاوت کہنا چاہیئے۔ اس بغاوت کو ہم اچھے معنی میں لیتے ہیں۔ اس لئے کہ طلوعِ آزادی سے پہلے جو بغاوت کا احساس تھا، اس کا رجحان یا میلان منفی تھا، وہ ایک ایسی حکومت یا قوت کے خلاف بغاوت تھی جو باہر سے ہم پر ٹھونسی گئی تھی لیکن لکھنے والوں میں آج جو احساسِ بغاوت پایا جاتا ہے وہ مثبت ہے۔ وہ ایسا تنقیدی انداز ہے جس پر ہمیں شرم نہیں آتی یا جو تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہے، اور جسے ہم اپنا کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک مختلف اصنافِ سخن کا تعلق ہے، ان سب میں یہی اقدار کارفرما ہیں۔ اگر ہم غزل سے قطع نظر کر لیں، جسے بعض لوگ جاگیرداری عہد کی یادگار کہتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری تمام اصنافِ سخن من و عن وہی ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھیں، اس لئے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بغاوت کے احساس کی گنجائش نہیں رہتی اور اس نئے موڑ پر ہم اپنے نقطۂ نظر کو اس جوش و خروش کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے جس طرح پہلے کر سکتے تھے۔ وہ دور ایسا تھا کہ مروجہ اقدار کے خلاف آواز اٹھانا فخر کا باعث ہوتا تھا، مگر لکھنے والوں کی مشکلات کا احساس بھی سامنے رکھنا چاہیئے کہ ان کے سامنے ایسی اقدار نہیں ہیں جن سے وہ متاثر ہوں اور نہ ہم میں اتنی جرأت ہے کہ نئی اقدار وضع کر سکیں۔ اردو ادب کا پس منظر یوپی کی زندگی تھی جس ادب کو ہم نے اب اپنایا ہے اس کا پس منظر

---

* حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور

ثقافتی لحاظ سے لاہور کے سوا کچھ نہیں۔ اب سندھ یا سرحدی علاقوں کا پس منظر ہمیں تحریک دے تو دے۔ شہری زندگی ہمارے لئے تحریک کا باعث نہیں ہو سکتی، اسی لئے ہم اس دور میں جو کچھ کر سکے ہیں، وہ یہی ہے کہ جو تحریک حالی سے شروع ہوئی اور مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی ۱۹۴۷ء تک پہنچی، اسے کسی نہ کسی طرح آگے بڑھاتے رہیں۔ صرف احساسِ بغاوت ہے جس میں نیم فرسودہ ملی پائی جاتی ہے، یہ چیز بھی غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ہے۔ کوئی تحریک منفی یا مثبت نہیں ملتی جو کسی نئے افق کا سراغ دے۔ جب کوئی ادبی روایت کسی خاص مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ خارجی تحریک ادیبوں کو تحریک دیتی ہے یا پھر کوئی خاص شخصیت ایسی ہوتی ہے جو اس پورے دور کو اپنے ساتھ لیکر آگے بڑھتی ہے۔ اس دور میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہیں ہے جو ہمیں گزشتہ اقدار کے مقابلے میں آگے بڑھا سکے۔

قیوم نظر:

ریاض صاحب نے بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ بات مسلّم ہے کہ کسی ادبی دور کا آغاز کسی خاص تاریخ سے نہیں ہوتا۔ ہم بعض ادوار کو متعین کرنے کے لئے کسی خاص واقعہ کے ساتھ اس کا تعلق پیدا کر دیتے ہیں مثلاً جدید دور کا تعلق ہم اقبال سے یوں بتلاتے ہیں کہ یہ اس کی وفات سے شروع ہوا۔ حالانکہ صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ اقبال کی زندگی ہی میں زمین ہموار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اسی طرح ۱۹۴۷ء کا سال بھی متعین کر لیا گیا ہے، اور جیسا کہ خود ریاض صاحب نے کہا کہ ہماری ثقافت کا تعلق دلّی اور لکھنؤ سے تھا، جواب منقطع ہو گیا ہے اور لاہور ہمارا ادبی اور ثقافتی مرکز مقرر ہو رہا ہے، لہٰذا یہ قبل از وقت بات ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء کے بعد اب تک کے ادب پر کوئی خاص محاکمہ کریں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس دور میں وہ احساسات موجود ہیں جن کا تقاضا ہے یا وہی ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے پشاور سے راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے؟

ریاض احمد:

میں نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ ۱۹۴۷ء سے کوئی ادبی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے زور اس بات پر دیا ہے کہ ۴۷ء کے واقعہ کے بعد وہ تمام تحریکیں ختم ہو گئی ہیں جنھوں نے ہم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا ہوا تھا۔ ان میں پاکستان کی تحریک بھی تھی۔ بغاوت کا شدید احساس تھا۔ ۴۷ء کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے کچھ اپنے تقاضے ہیں جنہیں ہم پورا نہیں کر رہے۔ بغاوت کا جو رجحان ہم میں پایا جاتا ہے، وہ حسبِ عادت ہے۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ جو کہا، وہ یہ کہ ؎

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر

سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسی باتیں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں؟

محمد صفدر میر:

ادب میں کسی نئے دور کو شروع کرنے سے پہلے ہم یہ اندازہ کرتے ہیں کہ فلاں دور ختم ہو گیا۔ اگر ایسا ہے تو وہ تقاضے کیا تھے جو اب نہیں ہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تمام دور کی تاریخ میں، جو زیرِ بحث ہے، کوئی ایسا مرکزی نکتہ ہے جس سے ہم ادبی روایت کو علیحدہ کر سکیں؟ اگر کچھ ایسی اقدار ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ہم تک پہنچ رہی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دور جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوا تھا، ابھی تک جاری ہے اور جس کی طرف ریاض احمد صاحب نے بھی اشارہ کیا تھا۔ اس مرکزی خیال کو حوالے کا نکتہ بنا کر ہم آگے چل سکتے ہیں اور غور کر سکتے ہیں کہ کیا واقعی ایسا دور شروع ہوا ہے۔ ریاض صاحب نے تو یہ کہا تھا کہ ایسا نہیں ہوا اور اب قیوم نظر کے جواب میں کہا ہے کہ ایسا ہوا ہے اور اس کا مرکز قومیت کو بتاتے ہیں، گویا ہم میں پہلے قومیت کا احساس نہیں تھا۔

ریاض احمد:

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نئی صورتِ حال کے ساتھ نئی باتیں اور نئی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں تھیں جو نہیں ہوئیں۔

عارف امان:

ریاض صاحب نے اس بحث کے سلسلے میں تحریک کے لفظ کو جو معانی پہنانے چاہے ہیں، ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ تحریک سیاست میں

ہوتی ہے ادب میں نہیں۔ ادب میں میلانات تبدیل ہوتے ہیں، ڈھانچے بدلتے ہیں، تحریکیں جنم نہیں لیتیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صرف ایک تحریک ہے اور وہ سیاسی۔ وہ تحریک انگریز سامراج کے خلاف تھی۔ ریاض صاحب نے کہا ہے کہ ۴۷ء سے پہلے بغاوت کا جو رجحان تھا۔ وہ ۴۷ء کے بعد بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ قائم رہا۔ اردو ادب نے کسی خاص صوبے کی عکاسی نہیں کی۔ یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ اردو ادب پورے طور سے شہریوں کا ادب رہا ہے۔ ریاض صاحب شہری ادب کے لئے دیہاتیوں میں جانا چاہتے ہیں حالانکہ شہر کی زندگی ایک ارتقا پذیر زندگی کا نام ہے۔

امجد الطاف :

یہ موضوع کہ ۴۷ء سے کسی نئے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے یا نہیں، بعض اوقات خاصی سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ ہم ادب میں کسی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نیا ادب شروع ہوتا ہے۔ اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۴۷ء کے بعد جو ادب پیدا ہوا، اس میں جنگ آزادی کے اثرات اور ماحول کے تقاضوں سے پیدا شدہ نئے مسائل پر غور کرنے کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ ریاض صاحب نے یہ کہا ہے کہ ۴۷ء کے بعد کے ادیب چونکہ نئے قومی مسائل پیش نہیں کر سکے اس لئے نیا ادب پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ ۴۷ء کے بعد نئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں احساس و فکر میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، وہ پہلے بھی تھی۔ ۴۷ء سے پہلے یہ احساس تھا کہ ایک بیرونی حکومت جو ہم پر ٹھونسی ہوئی ہے۔ اُسے ختم کرنا ہے یعنی 'جو کچھ تھا' اسے ختم کر کے 'جو کچھ ہونا چاہیئے' اسے شروع کرو۔ ہمارا میلان اب تعمیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیجانی انداز ختم ہو گیا ہے' فکر زیادہ ہے' تخریب کا رجحان کم ہے، تعمیر زیادہ ہے۔ تنقید میں ہم زبان و بیان کی مین میخ سے آگے نکل گئے ہیں۔ افسانے جو پہلے بہترین ہوا کرتے تھے، ان کا رد عمل رقیق القلبی تھا لیکن اب افسانوں کا انداز بہت مختلف ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوصف ہم کلیتے کے طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعی کوئی نیا دور شروع ہوا ہے یا نہیں۔

انتظار حسین :

۴۷ء سے کسی دور کا آغاز ہوا ہے یا نہیں، اس مسئلے کو ہم تحریک کے معنی میں دیکھتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں واقعی کسی نئے دور کا آغاز نہیں ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ محسوس کرنے اور سوچنے کے سانچے جب بدل جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ نیا دور شروع ہو گیا۔ ریاض صاحب نے آزادی سے پہلے کے ادیبوں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ وہ ساری سوچ ۴۷ء سے پہلے کے دور سے حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہ دیکھتے کہ کسی واقعہ کو کوئی نسل فوراً نہیں اپنا لیتی، وہ صرف اس کی تصویر کشی کرتی ہے اور آہستہ آہستہ کوئی واقعہ تاریخی واقعہ کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے تو نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ریاض صاحب نے یہ بتایا ہے کہ ۴۷ء سے پہلے کا رجحان ہر سطح پر بغاوت کا رجحان تھا۔ ماضی سے بغاوت تھی اور سنسنی پیدا کرنا اس دور کی خصوصیت تھی۔ منٹو اور کرشن کے افسانے اور راشد کی نظمیں اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ۴۷ء کے بعد ادیب بدل جاتے ہیں اور اب وہ اپنی روایت یا ماضی سے رشتہ قطع نہیں کرتے، بلکہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

امجد الطاف :

مجھے انتظار صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے۔ مثال کے طور پر افسانوں ہی کو لے لیجئے۔ وہ افسانہ نگار جو ہندوستان میں ہیں اور وہ افسانہ نگار جو پاکستان میں ہیں، ان کے پیش نظر موضوعات خواہ ایک ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کا انداز یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ وہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتظار حسین میرٹھ کی فضا پیش کرتے ہیں لیکن ان کا انداز یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ یوں احساس ہوتا ہے کہ ۴۷ء کے موڑ پر ایک ندی تھی جس نے دو مختلف راستے اختیار کر لئے۔

محمد صفدر میر :

کوئی فنکار اس طرح نہیں سوچتا کہ اس کی ۴۷ء سے پہلے کی عمر کا حصہ کاٹ کر الگ پھینک دیں۔ ہمارے ہاں اس عظیم سیاسی تبدیلی سے شعور کے لحاظ سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ابھی تک جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں، وہ ایسا ہے جیسے ہم اپنے بچپن کو یاد کر رہے ہیں۔ کسی نے اس عہد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ میں افسانے یا پورے ادب سے سیاسی سبق حاصل نہیں کرتا، مزے لیتا ہوں۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے، صرف غزل میں سیاسی

اشارے ملتے ہیں، لیکن ہم میں سے کسی نے اس روایت کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین:

زاویۂ نظر کی تبدیلی ہی کسی ادبی دور کی تبدیلی کا نام ہے۔ جب ایک دور ختم ہوتا ہے اور اس طرح کہ آپ کا تعلق آپ کی تاریخ یا روایت سے کٹ جاتا ہے تو ایک ادیب کو اس کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے ماضی کو محفوظ کرنے کے لئے اس کی یادوں کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ تاج محل ہمارے کلچر کی علامت تھا۔ آج وہ ہم سے چھن گیا ہے لیکن ہم اُسے بھلا نہیں سکتے اور اپنی تخلیقات میں اُسے مختلف طریقوں سے سموتے رہتے ہیں اور تاج محل کے حوالے سے ہم اپنے پورے ماضی اور اپنی روایت کی، جو ہم سے کٹ گئی ہے، تجدید کرتے ہیں اور اُسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی میلان نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے جو ۴۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔

عزیز الحق:

کوئی ادبی دور تخلیق سے نہیں بلکہ تنقید سے تبدیل ہوتا ہے۔ اگر تنقید کے زاویۂ نظر میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے تو تخلیقات میں خود بخود ایسا ہو جائے گا۔ پرکھنے کا انداز بدل جائے گا اور یوں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ادب کی تعریف تنقید کرتی ہے۔ ایک ہی غزل میں دو پڑھنے والے مختلف رجحانات تلاش کر لیتے ہیں۔

محمد صفدر میر:

یوں تو تمام زمانوں میں کچھ قدریں مختلف ہوتی ہیں۔ نظیری کی غزل میں ہم اپنے زمانے کا آئینہ دیکھتے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تنقید بدل گئی ہے اس لئے ادب بھی بدل گیا ہے۔ ہر زمانے میں مختلف رجحانات پائے ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ اقبال کے زمانے میں وحشت کلکتوی اور جگر مراد آبادی بھی تھے۔ +

انقلاب سے پہلے

صادق نسیم

یہ غزل کوئٹہ میں خاص حالات کے تحت مارشل لا کے نفاذ سے چند دن پیشتر کہی گئی۔ دشمنانِ وطن نے نہایت عجیب و غریب اور خطرناک منصوبے باندھ رکھے تھے اور "غریبِ شہر" آبادی قدرتی طور پر فکر مند تھی اور ایک بروقت اقدام کی آرزو مند۔ خوبیٔ قسمت سے یہ توقع انقلاب نے پوری کر دی۔ (صادق نسیم)

عہدِ حاضر میں بھی ہر عیب ہنر ہے کہ نہیں ۔۔۔ وہی بیداد بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں

خون برسانے لگی ہے نگہِ نرگس و گل ۔۔۔ باغباں تجھ کو گلستاں کی خبر ہے کہ نہیں

رہنماؤں پہ بھی الزام بجا ہے لیکن ۔۔۔ قافلے والو! تمہیں ذوقِ سفر ہے کہ نہیں

کس قدر تیز ہے گلشن میں حوادث کی ہوا ۔۔۔ جانے بلبل کو خیالِ گلِ تر ہے کہ نہیں

بات اب اہلِ جنوں تک ہی نہیں ہے محدود ۔۔۔ آج ہر اہلِ خرد خاک بہ سر ہے کہ نہیں

آج ہر سمت عجب شورِ شکستِ دل ہے ۔۔۔ بزمِ ہستی میں کوئی آئنہ گر ہے کہ نہیں

آج ہر ہاتھ میں خنجر ہے، ہر اک آنکھ میں خوں ۔۔۔ کس سے پوچھوں کہ مرے دوش پہ سر ہے کہ نہیں

ماہ و انجم کو جو تسخیر کیا بھی تو کیا ۔۔۔ آج انساں کو خود انساں کی خبر ہے کہ نہیں

عارض و لب مرے اشعار کی زینت نہ سہی ۔۔۔ نبضِ ہستی پہ مرا ہاتھ مگر ہے کہ نہیں

گردِ حالات نے دھندلا دیئے سب آئینے ۔۔۔ جانے اب میری نظر تیری نظر ہے کہ نہیں

عہدِ حاضر کے دھندلکے بھی عجب ہیں صادق
جانے اس رات کے دامن میں سحر ہے کہ نہیں!

غزل

عارف عبدالمتین

ہم سراپردۂ احساس میں روپوش ہوئے
دشتِ ادراک میں جب شعلۂ آغوش ہوئے

وقت کے ساتھ چلے، وقت کے تیور بن کر
کبھی فردا کبھی امروز، کبھی دوش ہوئے

ذہن میں نشۂ غمہائے ابد گھول لیا
تشنہ لب یوں بھی کبھی میکدہ بردوش ہوئے

گرمیٔ محفلِ امکاں ہے ہمارے دم سے
ساغرِ زیست میں ہم بادۂ سرجوش ہوئے

بیخودی سوزنِ تخیئل کی اک گردش ہے
جس کے اعجاز سے ہم بخیہ گرِ ہوش ہوئے

رفتگاں عجزِ ہنر دیکھ کے یاد آتے ہیں
کس قیامت کے سخنور تھے کہ خاموش ہوئے

ہم میں اقرار کی جرأت نہیں ورنہ عارف
تیری آواز سے روشن ارمِ گوش ہوئے!

شہرت بخاری

روبرو اس کے کئی صاحبِ اعجاز آئے
ہو کے مرہونِ نگاہِ غلط انداز آئے

میرے تکیے سے گیا جو بھی سو حیران گیا
تیری محفل میں سبھی آئینہ پرداز آئے

اس قیامت میں تری یاد نے وہ کام کیا
آخری وقت میں جیسے کوئی دمساز آئے

عمر گزری ہے اسی دشت کے سناٹوں میں
آسماں ٹوٹ پڑے پر کوئی آواز آئے

شق ہوا جاتا دل شورشِ سرِ غم سے
کاش ایسے میں کہیں سے کوئی ہمراز آئے

چاند تھا جائے شکوں اہلِ جنوں کو سنہرا
وائے اے روشنیٔ طبع کہ ہم باز آئے

دل سمجھتا ہے کہ دو دن کا ہے اب دامِ نفس
خواب میں بھی جو خیالِ پرِ پرواز آئے

جاں ہاروں سے رہی رزمگہِ شوق تہی!
ورنہ اس بزم میں کیا کیا نہ سخن ساز آئے

اب کے پتّوں کو بھی یہ حکم ہوا ہے شہرت
سوکھ کر شاخ سے ٹوٹیں تو نہ آواز آئے

غزل

احمد ظفر

یہ نہ کہو یہ چاند ہے میرا میں اُس پھول پہ دل سے فدا ہوں
اس دُنیا میں چاند ہے تنہا پھول ہے تنہا میں تنہا ہوں

تیرے حُسن کے آئینے میں جانے کیا کیا دیکھ رہا ہوں
کون سمجھتا ہے یہ باتیں کون سمجھتا ہے میں کیا ہوں

نرم ہوا کی جن لہروں نے جلتے دیپ بجھا ڈالے تھے
نرم ہوا کی ان لہروں نے پھول کھلائے دیکھ رہا ہوں

ایک ہی پل میں ان آنکھوں نے جانے کیا کیا دیکھ لیا ہے
ایک ہی پل میں جانے کتنی صدیاں پیچھے چھوڑ گیا ہوں

وقت نے مجھ سے رفتہ رفتہ کتنے نغمے چھین لئے ہیں
اب میں صحرا میں خاموشی اب میں جنگل میں دریا ہوں

کل اس راہگذر میں یارو لوگ مری آواز سُنیں گے
آج یہاں میں گمنامی کے پتھر سے سر پھوڑ رہا ہوں

اس دُنیا کی دورنگی نے کیسے کیسے رنگ دکھائے
راہ پہ آؤں تو میں رہزن بھٹکوں تو میں راہنما ہوں

لوگ مجھے دیوانہ کہہ کر اپنی بات بنا لیتے ہیں
لوگ ظفرؔ فرزانے ٹھہرے میں دیوانہ سوچ رہا ہوں

وشوا ناتھ دردؔ

میری خندہ لبی ہی نہیں دوستو، میرے نغمے بھی دنیا نے زخمی کئے
میں نے اس پر بھی شکوہ نہیں کچھ کیا، میں نے اس پر بھی ہنس ہنس کے آنسو پیئے

مجھ کو منزل کا کوئی پتہ ہی نہیں میری منزل کو میری خبر ہی نہیں
میں نے پھر بھی فریبِ طلب کیلئے خود کو صد رنگ دھوکے پہ دھوکے دئے

میری ناکامیاں، میری محرومیاں مجھ کو آخر تو اتنا بتا ہی گئیں
جس کا جادہ نہیں جس کی منزل نہیں زندگی وقف ہے اس سفر کیلئے

میری تنہائیاں مجھ کو راس آگئیں، میری ناکامیاں دل کے کام آگئیں
اے غمِ زندگی میں تصدق ترے تو نے کیا سوچ کے مجھ کو چرکے دئے

مجھ کو سود و زیاں کا کوئی غم نہیں، لٹ گیا ہوں مگر کچھ گیا بھی نہیں
میں نے دُنیا کا دامن خوشی سے بھرا مجھ کو بدلے میں دنیا نے غم دے دئے

میری بربادیاں کس سے منسوب ہوں کیا کسی سے کہوں کس کا میں نام لوں
دردؔ خود سے میں خود بے مروت رہا میں نے خود پر ہزاروں ستم خود کئے

★

رپورتاژ:

فن سے عرفان تک

سلیم خاں گمی

میرے اکثر احباب کو شکایت ہے کہ میں بہت بے ذوق ہوں۔ میں کسی نمائش میں دیوانہ وار گھومتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا۔ موقع بھی ہاتھ لگے تو بھی کسی اسٹوڈیو یا نگار خانے کے چکر نہیں کاٹتا، کسی استاد کا شہرہ سن کر اس کی زیارت کے لئے پا پیادہ روانہ نہیں ہو جاتا اور نہ کسی نقش یا مجسمے کے لئے اس قدر بے قرار ہو جاتا ہوں کہ جب تک اسے دیکھ نہ لوں نہ دن کو چین ہو اور نہ رات کو قرار۔ یہی کیفیت ادب کی بھی سمجھ لیجئے۔ ہوگا کسی شاعر کا کلام بے پناہ۔ میں اس کو سو بار داد دینے کو تیار ہوں۔ پطرس بخاری مرحوم کے "کتے"، ابن انشا کا "کتے کا کاٹا" یا قدرت اللہ شہاب کا "سرخ فیتہ" نظر پڑ جائے تو کون کافر ہے جو پھڑک نہ اٹھے۔ لیکن ہم ہر کس و ناکس کے شجرۂ نسب کی تلاش میں کیوں مارے مارے پھریں اور ہر چھوٹے بڑے آستانے پر کیوں سجدۂ نیاز پیش کریں۔ آخر بزرگوں ہی کا کہنا ہے کہ خاک از تودۂ کلاں بردار۔

لیکن اگر تودہ واقعی بڑا ہو اور آستانہ واقعی سجدۂ نیاز کے لائق تو پھر کون ہے جو اس تودے سے خاک نہ اٹھائے اور اس آستانے کی طرف بصد شوق رجوع نہ کرے؟ ایک مقناطیسی کشش۔ بس یہی چیز ہے جو دیدۂ و دل کے ساتھ پائے شوق کو پلک جھپکنے میں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِدھر میری نظر ایک چیز پر پڑی اور اُدھر میں ایک شاندار عمارت کے سامنے کھڑا تعجب کر رہا تھا کہ کہیں الہ دین کے چراغ نے تو رات کی رات میں یہ طلسم بپا نہیں کر دیا۔ تصور سے حقیقت تک کا مرحلہ کچھ اس طرح طے ہو گیا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ عمارت کی دل کشی تو خیر حیران کن تھی ہی لیکن اس سے زیادہ حیرت انگیز وہ ذوق و شوق، وہ چابکدستی تھی جس نے کراچی میں ایک عظیم الشان مرکزِ ثقافت قائم کر کے شیدایانِ فن کی ایک دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ کیا یہ بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مرکزِ ثقافت پاکستان آرٹس کونسل کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ راز اب پوری طرح معلومِ عوام ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

میں بڑی دیر تک کھڑا اس پُرشکوہ عمارت کو دیکھتا رہا، وہ جو ہماری ثقافتی عظمت کا مایۂ ناز مظہر ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا اور میں بار بار سوچتا تھا کہ —— ایں کہ می بینم بہ بیداری است یا بخواب۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا مجھے یہاں سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بالکل سپاٹ اور ویران سی جگہ تھی، اونچی نیچی سفید زمین جس پر تاحدِ نظر کوڑا کرکٹ اور پتھر ہی پتھر بکھرے پڑے تھے اور اب؟ —— اب یہاں ایک ایسی عالی شان عمارت کھڑی تھی جو فنونِ لطیفہ کا مسکن ہی نہیں بلکہ خود بھی فن کا ایک شاندار نمونہ تھی۔ پورے گیارہ برس ہماری جمالیاتی روح تشنہ کام رہی اور فنونِ لطیفہ بھی اکثر افرادِ قوم کی طرح بے خانماں رہے اور اب پاکستان آرٹس کونسل کو اپنے معاونین اور بہی خواہوں کی انتھک جدوجہد کی بدولت ایک مستقل اور شایانِ شان مسکن میسر آ چکا تھا۔
آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۵۸ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ کون جانتا تھا کہ ہمارا ذوقِ فن اس تیزی سے جادہ پیما ہوگا کہ اتنے قلیل عرصے میں منزلِ مقصود کو پا لے گا۔ اور ہمارے صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خاں یوم پاکستان کے موقع پر مرکزِ ثقافت کا افتتاح کریں گے جو ہماری ثقافتی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ہمارے دورِ انقلاب ہی کا کرشمہ تصور کیجئے جس نے ساری قوم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے اور ہماری سرگرمیوں کو اس طرح مہمیز کیا ہے کہ جن باتوں کے لئے سالہا سال درکار تھے وہ دنوں میں طے ہو رہی ہیں۔

ثقافتی اداروں کی ضرورت تو بہر حال مسلّم ہے۔ یہی ادارے ساری قوم کی روح کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے فنی شعور کی علامت بن کر اس کو دوسری قوموں سے روشناس ہی نہیں کراتے بلکہ ایک امتیاز بھی عطا کرتے ہیں۔ ناسازگار ملکی و سیاسی حالات نے ہمیں عرصۂ دراز تک ان اداروں خصوصاً مرکزِ ثقافت سے محروم رکھا جو بیک وقت فنونِ لطیفہ کی جلوہ گاہ بھی ہو اور تربیت گاہ بھی۔ محلِ اجتماع بھی ہو اور محلِ نمائش بھی۔ مل بیٹھنے کا مقام اور

تبادلۂ خیالات کا مرکز بھی ہو اور ثقافت کا صوری مظہر بھی جو اندرون و بیرونِ ملک ہر دیدہ ور پر ہماری فنی صلاحیتیں آشکار کرے۔ اس لحاظ سے دورِ انقلاب سے قبل ہماری زندگی داغِ ناتمامی کا شکار تھی " ہماری ثقافت کا چراغ بجائے کسی فانوس میں روشن ہونے کے چراغِ خانۂ درویش' بنا ہوا آندھیوں کی آغوش میں بارہ سال تک ٹمٹماتا رہا اور ہمارے فنونِ لطیفہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے "۔ آج یہ مرکزِ ثقافت' یہ عظیم الشان ایوانِ فن ہر طرح سے مکمل اور آراستہ و پیراستہ تیار ہے اور ایک عالم اس شعبدۂ تعمیر کا حیرت سے تماشائی ہے۔ ایک جدید شاعر کے الفاظ میں :-

پرندے کو حوراتِ دن گرمِ پرواز تھا
چمکتی ہوئی رہگزر رل گئی !

اور اب فنونِ لطیفہ سے متعلق ہماری تمام سرگرمیاں، ہمارے فنکاروں کی تخلیقی کوششیں اس مرکز پر مجتمع ہو کر شانِ جمالی کے ساتھ شانِ جلالی بھی پیدا کر رہی ہیں۔ وہ دن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب ایک قوم کی فنی جدوجہد اور ثقافتی روح نے اس جلیل القدر مظہر کی شکل اختیار کی اور ہمارے ہزاروں ہم وطن اس کے افتتاح کا دل افروز منظر دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ صدرِ مملکت نے جو ملت و حیاتِ ملیہ کے نقیب بھی ہیں اور زندہ و گویا علامت بھی، اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کا افتتاح کیا اور ایک ولولہ انگیز تقریر میں قوم کی ثقافتی روح اور مقاصد کو بیش از بیش نمود دینے پر زور دیا۔

ایسے ثقافتی مرکز کا افتتاح ایک ایسے یگانۂ روزگار فنکار کے شاہکارانہ نقوش سے مناسب تھا جس کی شخصیت و تخلیقات نہ صرف ملی حیثیت اختیار کر چکی ہیں بلکہ ان کو عالمگیر اہمیت بھی حاصل ہے۔ ہمارا مایۂ ناز نقاش ـــــ عبدالرحمٰن چغتائی ـــــ اگر مرکزِ ثقافت بجائے خود ایک علاماتی حیثیت رکھتا ہے تو چغتائی کی تصاویر کی اس مرکز میں نمائش بھی اتنی ہی علاماتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کا اثر دوبالا کرتے ہوئے اربابِ نظر کو ایک مستقل اہمیت و جاذبیت کا احساس دلاتے ہیں۔

اگر ہم فن سے ادب کی طرف آئیں تو اس کا منظر بھی کچھ کم پرکشش نہیں۔ اور خوش قسمتی سے صدرِ پاکستان کی ہمہ گیر حیات افروز شخصیت اس پر بھی حاوی ہے۔ اس کو فن و ادب کی بہترین نشوونما کی نوید سمجھنا چاہئے۔ یہاں بھی میری بے ذوقی و بے حسی دعوتِ ذوق و شوق کی تاب نہ لا سکی۔ ابھی میں کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ بے اختیار انسانوں کے اس سیلِ بے پایاں میں شامل ہو گیا جو موج در موج وادیٔ مہران کے عارف شاعر ـــــ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے روضۂ مطہر کی طرف رواں تھا اور حالیہ پایۂ تخت کراچی سے بھٹ شاہ تک یوں نظر آتا تھا جیسے ایک اور مہران موجزن ہو اور ایک مہران ہی کیا میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا تو پاکستان کے گوشے گوشے سے اربابِ شوق کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا ہی دریا موجزن نظر آئے۔ رہا شاہ بھٹائی کا اپنا وطن تو وہاں کیا شہری اور کیا دیہاتی، کیا مرد اور کیا عورتیں، کیا تعلیم یافتہ اور کیا ان پڑھ، کیا امیر اور کیا غریب، کیا خوش پوش اور کیا گودڑی پوش جوق در جوق ایک ہی منزل کی طرف رواں نظر آئے۔ اور طرح طرح کی پوشاکیں، رنگین سادہ دھاری دار پھول دار، زیب تن کئے ہوئے ریل گاڑیوں، موٹروں، کاروں، بسوں، چھکڑوں، بیل گاڑیوں میں اونٹوں گھوڑوں اور طرح طرح کی سواریوں پر اور ہزاروں ایسے تھے جو اس منزلِ شوق کی طرف از راہ عقیدت یا حصولِ ثواب کے لئے پاپیادہ ہی روانہ ہو گئے تھے۔ غرضیکہ زندگی کا ایک میلہ، ایک جمگھٹ، ایک بے پایاں تانتا۔ رنگ رنگ بھانت بھانت۔ اور اس کے ساتھ ایک ہماہمی، چہل پہل، جیسے زندگی کے سوتے یکایک پھل پڑے ہوں، ابل پڑے ہوں۔ یہ تھی اس کاروانِ شوق و عقیدت کی مجموعی کیفیت۔ یا ایک ولیٔ کامل کے روحانی اثر کا کرشمہ جس نے اس قدر دور دور سے دارفتگانِ شوق کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے اور روضے کی زیارت کے لئے آنے کی تحریک دلائی۔

اس سال وادیٔ مہران کے اس ہر دل عزیز شاعر اور ولی اللہ جس کو یہاں کے لوگ پیار سے "لال لطیف" کہتے ہیں کا دو سو ساتواں عرس تھا۔ اور تمام پچھلے عرسوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر۔ کیوں؟ اس کا جواب ایک ہی لفظ سے ملتا ہے۔ پاکستان۔ یہ ہماری نئی مملکت۔ پاکستان ہی کا قیام ہے جس نے اس سرزمین کے ہر ہر پہلو میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور ہم سب کے دلوں میں مشرقی پاکستان کے شاہ جلال سلہٹی سے لے کر مغربی پاکستان کے وارث شاہ، بلھے شاہ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، جو آنسال، شاہ بھٹائی جیسے عارفین و مشاہیر کو جاننے پہچاننے اور ان کی قدر و منزلت کرنے کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے چنانچہ اب شاہ بھٹائی صرف سابق سندھ کے ہی 'لال لطیف' نہیں رہے ہیں بلکہ سارے پاکستان کے 'لال لطیف' بن گئے ہیں اور ان کا گھر گھر چرچا ہے۔ اس

لئے جہاں پہلے اُن کا عرس صرف ایک مقامی چیز تھا وہاں یہ پاکستان کے قائم ہوتے ہی کُل پاکستانی بن گیا اور ان کے زائرین کے سیل میں سندھ کے ساتھ ساتھ آبادی کے ہر حصے کے عقیدت مند شامل ہو گئے اور رونق روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ اردو جاننے والے بھی شاہ بھٹائی کا کلام پڑھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے متعدد شاعروں۔ ابن انشا۔ رشید احمد لاشاری۔ شیخ ایاز۔ رفیق خاور۔ شہاب رفعت۔ حاتم حسین۔ جمیل نقوی۔ حمایت علی شاعر۔ اور رئیس امروہوی نے شاہ کا کتنا ہی کلام اردو نظم و نثر کے سانچے میں ڈھال دیا اور آج لالِ لطیف اردو کا بھی اتنا ہی، شاعر ہے۔ جتنا سندھی کا بلکہ اردو کے ذریعے ان کا تعارف بہت دور دور پہنچ چکا ہے۔ اور اُن کے کلام کے مطالعہ نے تو تنقید میں بھی نئے بال و پَر پیدا کر دیئے ہیں۔

ابھی چند سال کی بات ہے شاہ بھٹائی کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کی شروعات ہی تھی۔ ریڈیو پاکستان۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان اور پریس کے نمائندے قافلہ در قافلہ حیدرآباد۔ ٹنڈو آدم اور وہاں سے سندھ کے ایک بہت ہی معمولی گاؤں ــــ بھٹ شاہ کو رواں دواں نظر آئے کاریں اور بسیں ہر علاقے اور ہر زبان کے پڑھے لکھے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک ہی سمت رواں تھیں۔ بازار اور ہوٹل اُنہی کے ہجوموں۔ سے گونج رہے تھے۔ جیسے شہر میں ایک نئی جان پڑ گئی ہو اور موضوع ایک اور صرف ایک تھا۔ شاہ بھٹائی۔ اُن کا کلام۔ اُن کے افکار۔ رومی اور اقبال سے موازنہ۔ بھٹ شاہ کی سڑک تنگ ٹوٹی پھوٹی کچی پکی گرد و غبار کے دَل بادل اٹھتے ہوئے چاروں طرف اجاڑ بیابان سناٹا۔ نکمی قسم کی خود رو جھاڑیاں، ببول آک، ارنڈ، سب کی سب بُری طرح غبار آلود، یہ وہ راستہ تھا جس پر ایک دنیا اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ فوٹو گرافر کیمروں سے لیس، لوگوں منظروں، جانوروں، غرضکہ جو چیز سامنے آئے اُن کی تصویروں پر تصویریں لیتے ہوئے۔ روضہ کچھ دور سے ہی دکھائی دینے لگتا پاس پہنچنے پر کچی زمین ٹائیروں اور پہیوں سے بری طرح رگیدی ہوئی اور دور دور تک ان کے کئی کئی انچ دھنسے ہوئے نشانات ہی نشانات۔ ایک وسیع لق و دق میدان پر بُل ڈوزر ہی بل ڈوزر زمین کو بالکل ہموار کرتے ہوئے۔ اور پھر جیسے زمین کے دامن پر اردگرد کے کھیتوں کی طرح خیموں کی شکل میں بڑے بڑے کپاس کے پھول دفعتاً اُبھرتے ہوئے۔ اِس سے آگے بڑھیں تو گرد و غبار سے ڈھکی ہوئی پست پست جنگلی جھاڑیوں میں کچے دیہاتی کوٹھے۔ کچی دیوار چاروں طرف پھیلی ہوئی اور میل سوا میل کے پھیر میں میلے کی مخصوص چہل پہل اور گہما گہمی قمقموں سے جگ مگ کرتا ہوا پنڈال۔ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ اور پھر روضے کے اردگرد ایک بے پناہ ہجوم۔

اور ایک وہ سال ــــ اور وہ مشہور جھیل ــــ کراڑ۔ گندے گدلے مٹیلے پانی کا ایک بے ڈھب جوہڑ۔ اس میں دُور دُور سے نہروں کا پانی لا ڈالا گیا۔ بیچ میں ایک لمبی چوڑی جھیل بن گیا جس کو دیکھ کر طبیعت میں تر و تازگی کی لہر دوڑ جائے۔ ہوتے ہوتے کشتیاں بھی چلنے لگیں، لوگوں پر سیر تفریح کی دُھن سوار ہوئی اور پھر چاندنی راتوں نے تو اس کو سچ مچ چار چاند لگا دیئے جیسے جھیل کی سیال چاندنی پر ایک اور چاندنی بچھی ہو اور طلسمات کا سماں پیدا کر دے۔ سعدی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

سو یہاں بھی کیا انسان اور کیا چرند و پرند جوم جوم کر آئے اور ایک سنسان ہُو کی بستی میں اور ہی چہل پہل نظر آنے لگی، گویا گاؤں میں شہر کا سا عالم پیدا ہو گیا اور جب عالم فاضل لوگ بھی کاغذوں کے گٹھے کے گٹھے اور کتابوں کے انبار کے انبار اٹھائے جوق در جوق آنے لگے تو یہی گاؤں علم و ادب کا گہوارہ بھی بننے لگا۔ اور اب ــــ یارانِ تیز گام نے اور بھی قدم بڑھائے ہیں۔ دوسرا انقلاب کی معارف پروری اور ادب نوازی نے علم و ادب اور حکمت و عرفان کے فروغ کو ملی نصب العین قرار دے کر یکے بعد دیگرے کتنے ہی معرکہ آرا اقدامات کئے ہیں جن سے ہماری فکری اور علمی اور ادبی زندگی ہی نہیں بلکہ تمام زندگی میں نئی ہل چل پیدا ہو گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وادیٔ مہران کے چشم و چراغ، شاہ بھٹائی کے فیضان کو عام کرنا ہے۔ جس کا بیڑا ہماری انقلابی حکومت نے صدر مملکت جنرل محمد ایوب خاں کی سربراہی میں اٹھایا ہے۔ اب کی مغربی پاکستان اور مرکزی حکومتوں اور عوام کی متفقہ کوششیں اس کے لئے وقف رہیں۔ اس لئے عرس، میلے اور ادبی کانفرنس کا وہ ہنگامہ دیکھنے میں آیا جس کی نظیر اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔ پریس فوٹو گرافر فلم ساز، ارباب قلم۔ فن کار بھی اس انبوہِ عظیم میں شریک تھے۔ میلے کی گہما گہمی بجائے خود دلچسپ اور مقامی زندگی کے بوقلموں عناصر اور متنوع سرگرمیوں کا مرقع تھی۔ چنانچہ نت نئے تماشہ دکھانے والوں، مداریوں بازی گروں، سرکس والوں، سوداگروں

اور مغنیوں سے لے کر پھل فروشوں، ظروف ساز اور نیاریوں اور دوسرے ہزارہا کاروباری لوگوں کے باعث کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور جھولوں کے شور اور تماشائیوں کے غل غپاڑے سے واقعی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اُدھر روضہ کا خوبصورت گنبد رنگا رنگ قمقموں سے آراستہ اس طرح جگ مگ کرتا کہ چم چم جھم جھم کرتے ستاروں کا گمان ہوا اور رات کو دن کرتا ہوا دور سے ایک بقعۂ نور معلوم ہوا اور دیکھنے والوں کے دل و نگاہ دونوں کو روشن کر رہا ہو۔ مزار کے باہر صحن میں اپنی دُھن اور شاہ کے کلام میں مست موسیقار اکتارے پر اس انداز سے جو شاہ سے مخصوص سمجھا جاتا ہے جوکڑی مار کر بیٹھے یا کسی درخت سے شاہ کے انداز میں ٹیک لگائے ان کا کلام گا رہے تھے۔ شہنائیوں، ماشکی اور بینڈوں کے غلغلے اور غلغلے الگ ایک شان رکھتے تھے۔

جیسا کہ میلوں میں ہوتا ہی ہے عرس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہنگامے بھی آپ ہی آپ اُبھر آتے ہیں ہوٹل طرح طرح کی دوکانیں دُلھنوں کی طرح سجی سجائی اور بے شمار بوقلموں اسٹال، کہیں اونٹوں کے دلنواز ساز و سامان دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں۔ کہیں طوائفوں کے رقص کی جھنکار اور اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک" کا عالم ہے۔ کہیں درختوں کی گھنی چھاؤں ایسے ہاری بل بل کر شاہ کا کلام گا رہے ہیں جو نہ جانے زندگی کی کتنی بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ اور اُس دور کو بھی دیکھ رہے ہیں جس نے ان کو وڈیروں کے چنگل سے نجات دلا کر خود اپنی قسمت کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔ کہیں فقیروں کے غول کے غول پھر رہے ہیں یہاں تک کہ کوئی من چلا کشکول چمٹوں اور چیتھڑوں سے لیس علماء و فضلا کے پنڈال میں بھی جا دھمکتا ہے۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے، سابق سندھ کے وزیر اعلیٰ بڑی سنجیدگی سے شاہ کے کلام پر تقریر فرما رہے تھے اور جلسے کی ساری کارروائی کو فلمایا جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک بھتے آئے بھاری ڈیل ڈول کے کالے بھجنگ ملنگ کو جوش آگیا تو وہ عین اسٹیج پر آ دھمکا اور اس زور شور سے دھم دھم کر کے ناچنے لگا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ بھلا زندگی اپنی ان اصلیتوں کو کیسے بھول سکتی ہے اور پھر شاہ بھٹائی جیسے ولی اللہ کے دربار میں جہاں شاہ و گدا۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں۔

روضے کے باہر دروازے کے پاس ایک درخت پر بھاری سا گجر لٹک رہا ہے جو شاید زائرین کی آمد پر اطلاعِ حضور کا کام دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مگر زندگی کا سب سے دلچسپ مظاہرہ جو درحقیقت ہماری قومی توانائی اور ہشاش بشاش روح کا مظاہرہ ہے سندھ کی مشہور و معروف کُشتی "ملاکھڑا" ہے جسے بلوچی میں "بل" کہا جاتا ہے اور شاید اس کا ملاقات سے کوئی تعلق ہو لیکن یہ ملاقات بھی عجیب قسم کی ہے بڑی تکڑی قسم کی کُشتی جسے دیکھنے کے لئے لوگ بیس بیس ہزار کی تعداد میں آتے ہیں اور پھر تماشائیوں کے کیا کہنے کوئی دکان کوئی چھت، کوئی میدان، کوئی ٹیلہ کوئی درخت شاید ہی ان سے خالی ہو۔

مگر ہم آپ پڑھے لکھوں کی دلچسپیاں تو کچھ اور ہی ہیں کھلے میدان یا روضے کے صحن کے بجائے جہاں دعائیں اور مرادیں مانگنے والے مردوں اور عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آتے ہیں، پنڈال میں جلسوں اور کانفرنسوں کا اہتمام اور اس سال کی دلچسپیوں کا تو ذکر ہی کیا جب کہ صدرِ مملکت اور گورنر مغربی پاکستان تشریف لائے ہوں۔ جنرل محمد ایوب خاں نے رزم کے ساتھ بزم کا حق ادا کرتے ہوئے ایک بار پھر پاکستانی ادب و ثقافت کو بدرجۂ اتم فروغ دینے پر جو زور دیا وہ ہماری بنائے ملت کے استوار تر ہونے کی نوید ہے۔

تو یہ ہیں فن و ادب کی وہ ساحرانہ پیشقدمیاں جو بے حس سے بے حس اور بے ذوق سے بے ذوق شخص کو بھی خلوت سے جلوت میں لے آتی ہیں اور انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ایک نئے دور یا انقلاب کی خبر دیتی ہیں، یقین ہے کہ ان حالات میں ہماری ثقافت اور زندگی کا افق کچھ اور بھی تابناک ثابت ہوگا۔

زمانے کی دستبرد ہم سے ماضی کی یادگاریں چھینتی رہتی ہے۔ لیکن کاغذ کے طفیل ہم آج بھی اپنے ماضی کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ یادگار نامے، لفظوں، روایتوں، مصاحف، دستاویزات، کتابوں اور اسی طرح کی اعلیٰ یادگاروں کے انبار ہیں۔ جن کو ہم نے اب بھی کاغذ پر محفوظ کر کے لازوال بنا دیا ہے اور آئندہ بھی بناتے رہیں گے۔ پاکستان اب خود کاغذ تیار کر رہا ہے تاکہ ملکی ضروریات پوری ہو سکیں۔ نیز ماضی کے سرمائے کو محفوظ کیا جا سکے۔

پاکستان کی تاریخ اب پاکستانی کاغذ پر لکھی جا رہی ہے۔

پاکستان کی صنعتی کارکردگی کی اعلیٰ مثال

مینیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

UNITED

ماہِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء

افسانہ:

کالے میگھا پانی دے ....!

محمد عمر میمن

مینہہ تو جیسے کہہ رہا تھا، آج برس لوں، جتنا برسنا ہے، کل جانے برس بھی پاؤں یا ہوائیں دور بھگا لے جائیں۔ کون جانے؟ چنانچہ دھیمی دھیمی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی، موسم میں کچھ تازگی سی آ گئی تھی، ہلکی ہلکی خنکی — باہر اب بھی بوندیں کثیف، نیم روشن، تعفن سے بھرپور گلی میں اپنی شوریدہ سری کا مظاہرہ کر رہی تھیں، گلی میں پانی کھڑا تھا اور دھیمے دھیمے گرتی ہوئی یہ بوندیں، اس کھڑے پانی کی پُرسکون سطح پر گر گر کر ننھی منی لہروں کو جنم دے رہی تھیں، اور ٹاٹ اور چٹائی سے تیار شدہ چھت پر یہ بوندیں ٹپ ٹپ کرتی ٹپک کر جھگی کے سیلے ہوئے کچے فرش پر برس رہی تھیں۔

بوڑھا فضلو اپنے کٹھن جیون کو لئے بھیگی ہوئی کھرّی چارپائی پر بیٹھا تھا، گذرتے وقت نے اس کے چہرے کو شکنوں سے پُر کر دیا تھا اور اب یہی شکنیں بوڑھے فضلو کے چہرے پر عجیب گنجان سا جال بن رہی تھیں۔ اس کا ذہن خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھا، بھیگی ہوئی خوشگوار ہوا، کواڑوں سے بے نیاز موٹے سے ٹاٹ کے پردے کو جو جھگی کے مکینوں کی مدافعت کے لئے کسی تپتے ہوئے ریگستان میں کہیں دور، طویل کھجور کے تنہا درخت کی چھدری چھاؤں سے زیادہ فرحت بخش نہ تھا، دھیمے دھیمے سرکا کر آ رہی تھی، اس میں نم مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو تو تھی لیکن یہ سوندھی سوندھی خوشبو بستی کی غلیظ اور تعفن سے لبریز فضا میں آ کر کچھ آلودہ سی ہو گئی تھی۔ اور مٹی کی سوندھی خوشبو کے ساتھ گلی میں سڑتے غلاظت کے ڈھیر کی بدبو بھی شامل ہو گئی تھی، بوندیں ٹپ ٹپ کرتی فضلو کے پڑوسی، اللہ بخش کی ٹین کی چھت پر پڑ رہی تھیں۔ ایک ہلکی ہلکی موسیقی اور ترنم ان برستی بوندوں کے گرنے سے پیدا ہو رہا تھا، ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپاٹپ، ٹپ۔ بابا فضلو، اگر آج وہ بریلی والے اپنے پکے مکان میں ہوتا تو ضرور بوندوں کے اس دلفریب رقص اور موسیقی کے آہنگ سے متاثر اور محظوظ ہوتا، لیکن اس بستی جھگی میں؟ یہاں کے مکین تو بارہ برس سے یہ بھی بھول گئے تھے کہ موسیقی نام کی کسی شئے کا بھی دنیا میں وجود ہے۔ اس برستی، رقص فرماتی موسیقی کو جنم دیتی ہوئی بوندوں نے زندگی کے ریگزار میں بارہ طویل برسوں سے بادسموم کے طوفانی جھکڑوں سے جھلستے ہوئے بوڑھے فضلو کے دل میں تنہائی، یادوں اور خوش و خرم ایام کا ملا جلا درد پیدا کر دیا اور خیالات میں غرق بوڑھے فضلو کو محسوس ہوا —— باہر، جھگی کی چھت کے نام نہاد چھجے سے رستی ہوئی بوندوں کی اس کمزور پھوار میں اس کے ماضی کی حسین یادیں سر جھکائے کھڑی بھیگ رہی ہیں۔

کتنے ہی سال بیت گئے۔ کبھی وہ بھی تو جوان تھا۔

میرے پیا کی تلیا کو بھی پانی دے، میرے پیا کی تلیا کو بھی پانی دے"۔
جیسا ادھر نغمہ نکلتا تو وہ کسی اندرونی مسرت سے سرشار ہوکر تنے کے پیچھے ہی مسکرا دیتا۔ اور پھر جب چاپ تنے کے پیچھے سے نکل کر رشیدن پر ایک مسکراتی نگاہ ڈال کر کمرے میں حقہ گڑگڑاتے چچا اللہ رکھے کے پاس پہنچ جاتا۔ ادھر رشیدن " اوئی اللہ" کہتی آنگن میں بھاگ جاتی۔ پھر اس طرح کہ نہ برستی بوندوں کا خیال نہ ... پر سے ڈھلکے دوپٹہ ہی کا پاس۔
چچا اللہ رکھا بھی سارا زمانہ دیکھا ہوا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ آخر کو سارے بال دھوپ میں ہی تھوڑی سفید کئے تھے۔ وہ روز ساون کے بھیگتے لمحوں میں جوان فضلو کی آمد اور اس کے ایک ایک فعل سے چھلکتے اس کے اضطراب کا مدعا خوب جانتا تھا، اسی لئے کہتا:
" دیکھ رے پھلو، تجھ سے لاکھ بار نائیں کر دی پر تو روجینہ (روز) آجات ہے، اب کا ہے کی دیر ہے، پر تجھ سے تو جیسے انتجار ہوت ہی نائیں۔ بس بیٹا، اگلے ساہن (ساون) تک اور انتجار کرے"۔
اور اگلے ساون کی آمد سے پہلے ہی مضطرب فضلو رشیدن کی مسکراہٹ لے آیا تھا، دونوں جوان تھے، وقت تھا اور وقت کا تقاضہ، ماں پھولی نہ سماتی تھی، ایسی چاند سی بہو! اور فضلو کو تو جیسے کسی نے جگمگاتی کہکشاں لادی تھی۔ رشیدن کے پیا کی سوکھی، پیاسی تلیا تو اب فضلو کے وجود سے جل تھل سی ہوگئی تھی۔
لیکن آج بھی ساون بھیگ رہا تھا۔ اور سامنے ایک کونے میں کانپتی، ٹھٹھرتی، اپنے جسم کو چھدرے کپڑوں میں سمیٹتی ہوئی دمہ کی مریض رشیدن اپنے بوجھل وجود کو کھانسی کے طوفانوں میں سمونے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن آج بوڑھے فضلو نے اس سے نہ کہا " اری وہ گانا ہی سنا دے!"
" کونسا؟"
" وہی جو تو اس روز جھولے میں گا رہی تھی!"
فضلو تو اب کہیں اور گم تھا، اس کے کانوں میں تو اب سے بارہ سال پہلے سنے ہوئے وہ فقرے گونج رہے تھے جن میں اس زبوں حال مستقبل کی بشارت دی گئی تھی، پیش گوئی کی گئی تھی۔
" دیوانا ہوا ہے رے کیا۔ وہاں، سرحد پار کوئی نیا خدا بیٹھا ہے تیرے لئے کیا؟"
" بجرگوں (بزرگوں) اور برکھوں کی کبریں (قبریں) تو ادھر ہیں، کیوں اپنی مٹی خراب کرتے ہو"۔
" تم یہاں کون سے لاٹ صاحب ہو جو وہاں جا کر گبرنر بن جاؤ گے!"
" بھوکوں مروگے بھوکوں، فاقہ کروگے فاقہ"۔
لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ چلا آیا تھا، بوڑھا تھا، لیکن ــــ " پاکستان کا مطلب کیا؟ ــ لا الٰہ الا اللہ" اور " لے کے رہیں گے پاکستان" جیسے گرم نعروں نے اس کے وجود میں آتش سی گھول دی تھی۔ جوان روح! اور وہ سفر کی صعوبتیں، موسم کی شدت برداشت کرتا، فاقہ کرتا " پاک سرزمین" میں داخل ہو ہی گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اسے معلوم نہ ہو سکا، یہاں کوئی نیا خدا نہیں۔ اور جب وہ قائد آباد میں آکر سکونت پذیر ہوا تب بھی اسے کسی صبح نو کی امید تھی، جوان عزم اور جوش۔ لیکن آج تو اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا یقیناً یہاں کوئی نیا خدا نہیں اور وہ فقرے ـــــ ان میں سے ہر ایک میں سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ بھوکوں بھی مرا تھا، فاقے بھی کئے تھے اور بعض اوقات تو اس کی بوڑھی مضمحل زندگی اس مرحلے تک بھی آ پہنچی تھی جب اس نے شدت سے بے اختیار ہو کر سوچا تھا، یہ تو وہ مرحلہ ہے جہاں آکر بدقسمتی کی ساری حدود بھی دم توڑ دیں گی۔
بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن مطلع اب بھی ابر آلود تھا یا پھر مینہ کے تھمتے ہی گلی کے بچے تنگ منگ تالیاں بجاتے ہوئے گا رہے تھے،
" کالے میگھا پانی دے! کالے میگھا پانی دے!"
معصوم بچے! بارش کی تباہ کاریوں کے احساس ہی سے ناآشنا، ادھر جھگی کی سیلی ہوئی صدیوں کی بوسیدہ فضا میں متفکر بیٹھے ہوئے بابا فضلو کے احساس میں بچوں کے گانے کی صدا نشتر چبھو رہی تھی، کچھ کے سے لگا رہی تھی۔ گلی کے بچے بابا فضلو سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک تو عمر کا تقاضہ دوسرا اس کا ہر لمحہ

کسی سوچ میں غرق رہنے والا انداز جو اس کے چہرے کی کالی جھریوں کو اور بھیانک، پر اسرار کر دیتا۔ "جانے بابا فضلو ہر وقت کیا سوچتا رہتا ہے۔" بچوں کو چھوڑ یہ سوال قائدآباد کے کتنے ہی نوجوانوں کے ذہن میں کتنی ہی بار گونجا ہوگا۔ اس کی یہ بے نام سی سوچ اور آنکھوں کا یہ دردمند فسوں۔

جب اس کے احساس کے ایک ایک گوشے میں جاکر یہ کالے میگھا سے پانی کی خواہش کے تیر پیوست ہوگئے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تو ڈبڈبائی آنکھوں اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا باہر گلی میں نکل آیا۔

"چلو بھاگو شیطانو، نہیں تو ابھی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

بچے بابا فضلو کے غضبناک چہرے کو دیکھ کر جو اب خاصی بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا، اِدھر اُدھر بسرعت تتر بتر ہوگئے گرمی سے بولائے ہوئے بچے یہ نہ سمجھ سکے موسم کی یہ فرحت اور تازگی بابا فضلو کو کیوں گراں گذر رہی ہے۔ بابا فضلو کو بچوں سے کوئی خدا واسطے کا بیر تو نہ تھا لیکن اس احساس ہی سے کہ پانی کے پڑتے ہی نشیب میں مہاجروں کی بستی سیلاب کا سا سماں دے گی وہ دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی بوسیدہ جھگی کی طرف لوٹ ہی رہا تھا کہ گھور گھٹائیں گھِر آئیں، بادل کڑکے، بجلی چمکی اور ایک بوچھار چھپ چھپ کرتی بابا فضلو کی سپید داڑھی کے بالوں کو تر کرتی، اس کے کپڑوں میں جذب ہوگئی۔ بچوں کو خوش کرنے کو کالے میگھا نے پانی کی ایک پھوار بھیج دی تھی۔ بابا فضلو نے بڑی بے چارگی سے کالی گھٹاؤں کو دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں...... اب تو جیسے فطرت بھی اس سے مذاق کرنے لگی تھی۔

ہلکی ہلکی پھوار پھر تھم گئی۔ بادل گھِر گھِر کر آتے رہے، اور بادل کی ہر گرج کے ساتھ بابا فضلو کا دل کسی اندرونی خوف سے لرزنے لگتا مطلع بڑا سخت ابر آلود تھا، اور باسٹھ سالہ بابا فضلو اپنی بوسیدہ جھگی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ابکی بار جھگی بنانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ان طویل بارہ سالوں میں اس کے بوڑھے رعشہ زدہ ہاتھوں نے آٹھ بار جھگی کی ان نیم پختہ کچی دیواروں کو استوار کیا تھا، دیواروں ہی پر کیا منحصر ہے، آٹھ بار پوری جھگی کو ان کانپتے ہاتھوں نے نئی زندگی بخشی تھی۔ ہر سال چلچلاتی دھوپ میں تعفن سے بھرپور، گرمی اور گھٹن سے تنگ آکر جب ننھے ننھے بچے دھوپ کی تمازت سے کمھلائے ہوئے جسموں کی خارش اور جلن سے تنگ آکر ٹل مُل کر گاتے "کالے میگھا پانی دے، کالے میگھا پانی دے" تو وہ اس تصور ہی سے لرز جاتا کہ اگر کہیں ان بچوں کی دعا قبول ہوگئی اور بارش ہوئی تو پھر دو تین دن کی بارش ہی نجانے کتنے جھگی نشینوں کو گرمی سے تو نجات دلا دے گی لیکن ایسی تباہی میں مبتلا کردے گی جس کا کوئی مداوا نہ ہوسکے گا ـــــ اور مداوا ـــــ؟ اس کے گرد تو تباہیوں اور بربادیوں کا ایک جال سا بُنا تھا' پہلی بار جب اس نے سرحد پار کی تھی جبھی سے مصیبتوں، غموں اور آلام' المناکیوں اور بربادیوں کا ایک ایسا اٹوٹ، مضبوط ایسا طویل سلسلہ چل نکلا تھا کہ اس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی، ادھر ایک مصیبت سے چھٹکارا ملا تو دوسری منہ پھاڑے اسے نگلنے کو کھڑی تھی۔ اَن گنت غموں میں سے کس کا مداوا ہوسکتا تھا ابھی جواب وہ امید کرتا۔ اس نے تو اب امید ہی کرنی چھوڑ دی تھی۔ سو میں سے دس امیدیں بھی اگر بار آور ہوجائیں تو ٹوٹے ناکامیوں کو بھول کر انسان پھر ایک سو ایک دفعہ امید کر بھی سکتا ہے مگر سو فیصدی ہی ناکامی ہو تب؟ اب تک تو وہ وعدوں کے سہارے ہی جیتا آیا تھا، کونسا وعدہ پورا ہوا۔ ملک کے بانی کا عزم راسخ، اس کی قوت، اس کا استقلال دیکھ کر وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر سرحد پار کر آیا تھا لیکن موت تو وقت اور محل کا انتظار نہیں کرتی۔ وہ جس سے کئی وعدوں کے ایفا کی امید تھی، اس کو موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ چراغ بجھ گیا اور قوم نے قائد کے وعدوں کو پورا کرنے کی بجائے اس کا بیجان لاشہ ٹھیک ان ناتواں مہاجروں کے ضعیف شانوں پر لاد دیا جن کے غم پہلے ہی کونسے کم تھے۔ "لو اب یہی تمہارے غم کا مداوا بنے گا۔" اور وہ اس مزار کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اسے سینے سے لگائے رہے! اب بھی تو صبح کی امید کی جاسکتی تھی، ننھے چراغوں کی! لیکن اس امید کی کرن کو تو خود قوم نے سرخ لہو میں ڈبو کر مایوسیوں کے ڈھیر تلے دبا دیا تھا۔ ایک اور لاش، ایک اور مزار، شہر سے دور! پھر تو وہ تاریکی پھیلی کہ صبح کی کوئی امید نہ رہی، حالانکہ بابا فضلو اپنے بچپن سے سنتا آیا تھا۔ اندھیرے صبح پر ختم ہوجاتے ہیں! اور ہر نشیب کے بعد ایک فراز بھی مقدر ہے! ٹھیک جس طرح ظلمت کے طلسم کو آنے والی صبح کی پہلی کرن توڑ دیتی ہے۔ یہ عقیدہ تو وہ عقیدہ تھا جس پر بابا فضلو کو اپنے وجود سے زیادہ یقین اور اعتماد تھا۔ لیکن یہ تو سرزمین ہی عجیب تھی، اور یہاں کا نظام؟ بابا فضلو کو محسوس ہوا ـــــ وہ جانے اپنی خفت اپنے ماحول سے نکل کر کسی اجنبی سرزمین میں چلا آیا ہے، بھولا بھولا سا، یہاں آکر تو وہ خود اپنے وجود ہی سے انکار کر بیٹھا ہے۔ یہاں اس کے برسہا برس کے ساختہ اصول کس قدر جھوٹے ثابت ہورہے ہیں اور اس کے عقیدے ...... ؟ ہر آنے والا یہ یقین دلاتا رہا "ہم اس تاریکی کو دور کر دیں گے" لیکن اب تو وہ چراغ ہی

بجھ گئے تھے جن سے اندھیرے کو دور کرنے کی امید کی جا سکتی تھی، اور یوں اندھیرا بڑھتا ہی گیا۔ تاریکی گہری اور گہری ہوتی گئی ——

"کیا سوچ رہے ہو چاچا؟" ٹاٹ کا دبیز مگر پھر بھی اِدھر اُدھر سے پھٹا اور ادھڑا پردہ سرکاتے ہوئے رمضان دودھ والے نے اس کے خیالات کی پرسکون سطح پہ آ کر کوئی وزنی سا کنکر اچھال دیا۔ گول گول ننھی ننھی موجیں دائرے کی صورت میں کنکر کی سطح پر معدوم ہوتے ہی اس کے خیالات کی سطح پہ ابھر کر تلاطم برپا کرنے لگیں۔ وہ چونک گیا۔ کچھ ایسے جیسے کسی نازک اور اہم مسئلہ پر غور و خوض کر رہا ہو اور چونک جائے۔

"ہنہ! کیا کہا رے رمجان تو نے؟"

"کچھ نہیں چاچا! بس یونہی پوچھ لیا تھا، کیا سوچ رہے ہو؟"

"ہوں!" وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولا "بس یہی سوچ رہا ہوں، جھگی کیسے بنے گی؟"

"چاچا! کیسی باتیں کرتے ہو، ارے ہم جو جوان ہیں، تمہیں کا ہے کی فکر ہے!"

"اور دس سال پہلے تو کونسا بچہ تھا رے رمجو! یہ جھگی! تو بارہا گری ہے مگر ان کانپتے ہاتھوں نے ہی انھیں نئی جندگی بخشی ہے!

اس چوٹ پر رمضان کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ فضلو نے کتنا سچ کہا تھا۔ آج تک کتنی ہی بار یہ جھگی گری تھی۔ لیکن ......؟

"چاچا، یہاں کس کے غم کم ہیں!" وہ اپنی صفائی میں بولا "جھگی! چاچا جھگی میں رہنا اب بھی پسند کرو گے؟"

"ہنہ! ارے پگلے تو تو یوں کہہ رہا ہے جیسے ہم اور تم اپنی خوشی سے ہی رہ رہے ہیں نا، کیوں رے" وہ مسکرایا، ایک تلخ مسکراہٹ جس کے ساتھ ہی اس کے احساس کی ساری کڑواہٹ چلی آئی "ہنہ ہنہ ہنہ! بڑے آرام سے ہیں نا یہاں جیسے"

اس کا جواب رمضان دودھ والے نے کچھ بھی نہ دیا —— اور فضلو اپنی سوچ کے انہیں طولانی گنجلک سلسلوں میں پھر گم ہو گیا۔

اگر آج اس کا راجو زندہ ہوتا تو پورے چھتیس سال کا ہوتا، کڑیل جوان! اور اس کے جوان شانوں کے آسرے بڑھاپے میں یوں اس کی مٹی نہ خراب ہوتی لیکن اس کے راجو کو تو ٹھیک بیس سال کی عمر میں ہی موت کھا گئی تھی، اور اب سے سولہ سال پہلے وہ اس کڑیل نوجوان کو اپنے ہاتھوں قبر کی نامعلوم گہرائیوں میں اتار آیا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو جھگی کا غم اسے یوں نہ کھا جاتا۔ لیکن وائے قسمت! جانے کون سے ان دیکھے ان جانے گناہوں کے کفارے میں قسمت یوں چن چن کر اس سے بدلے لے رہی تھی .... شدتِ اندوہ سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آنسوؤں کے اس ملگجے دھندلکے میں دور بہت دور ان دیکھے قبرستان کا وہ منظر گھوم گیا جہاں ایک شکستہ سی قبر میں اس کا کڑیل راجو جوانی کی لاکھوں حسرتیں چھپائے ابدی نیند سو رہا تھا۔ "بزرگوں اور بڑکھوں کی قبریں تو یہاں ہیں، کیوں وہاں جا کر اپنی مٹی خراب کرتے ہو" تیزی سے صدائے بازگشت بن کر یہ سوال اس کے ذہن پہ ہتھوڑے سے برسانے لگا۔ لیکن اسے بزرگوں کی اور بڑکھوں کی قبروں کا کب اتنا پاس تھا، وہ تو اس ملک کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے ماسوا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے چلا آیا تھا، تب اسے شدت سے محسوس ہوا ہائے زندگی کی کتنی بڑی غلطی کی تھی اس نے اپنے راجو کو وہاں تنہا سُلا کر یہاں چلے آتے ہیں۔

یکایک کھانسی کا ایک شدید دورہ رشیدن پر پڑا، اور اس کا پورا وجود کھانسی کی شدت سے یوں لرزنے لگا جیسے تند آندھی میں کسی صدیوں کے بوڑھے سوکھے ہوئے پتوں سے عاری درخت کا کھوکھلا تنہ لرزے! پاس ہی بیٹھی بتول اپنی ماں کی دھونکنی کی مانند چلتی ہوئی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دینے لگی —— اپنی بیوی کی یہ حالت فضلو سے نہ دیکھی گئی، اور وہ رمضان کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ جیون مرن کے ساتھی کو یوں تنہا چھوڑ کر باہر آتے سمے اس کا دل تو بہت جلا لیکن اس کے اپنے غم ہی کون سے کم تھے۔ بارش اب تھم چکی تھی، لال دین اپنی کھاٹ گلی میں نکال لایا۔ بابا فضلو اس پر بیٹھ گیا۔ ایک طرف لال دین اور رمضان بیٹھے ہوئے تھے۔ بارش کے تھمتے ہی گلی میں زندگی سیلاب سے کچھ دیر پہلے کچھ منجمد کچھ مفقود سی ہو گئی تھی، اب پھر کروٹیں لینے لگی تھی، اور لوگ گلیوں میں نکل آئے تھے۔ کہیں سے شلجے مستانہ، کھنکھارتا آ پہنچا۔ شلجے حیدرآباد (دکن) کا تھا، اس کا سن یہی کوئی پینتیس ۳۵، چالیس کا رہا ہوگا، پر سرحد پار کرتے سمے اپنی بیوی کی لاش کو روند کر آتے ہوئے اس کا دل پھٹ گیا تھا، اور اس کا ذہن اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ پھر جب یہاں آ کر قسّامِ ازل نے اس سے اس کے دونوں لڑکے بھی چھین لئے تو اس کے غم اور بڑھ گئے۔ ذہن جو کچھ متوازن سا ہو چلا تھا، پھر ڈگر سے بہک گیا۔ پر شلجے مستانہ کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتا اور ان غموں کے باوجود وہ بڑا خوش خوش رہتا۔ یا پھر ایسا چپ پڑ جاتا کہ ہفتوں کسی سے نہ بولتا، کسی نے روٹی آگے ڈال دی تو کھا لی ورنہ یونہی سہی۔

زندگی سے بیزار ان لوگوں کی گفتگو کی تان مختلف موضوعات سے گزرتی ہوئی ٹھیک بارش اور اس کی تباہ کاریوں اور اپنی زبوں حالی پر آکر ٹوٹ رہی تھی ـــ اور اپنی محفل میں خوابیدہ سا بابا فضلو ان باتوں میں دلچسپی لیتا ہوا بھی کچھ گم صم سا تھا۔ اپنے اسی روائتی انداز میں بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا، وہ اب بھی جھگی سے اٹھتی رشیدن کی دلدوز کھانسی کی آواز سن رہا تھا۔

"بابا ـــ بارہ سال ہوگئے، پر ہم لوگ جہاں تھے وہیں ہیں، یہاں تو حکومت اس طرح بدلتی ہے جوں لوگ میلے کپڑے بدلیں۔ اور ہر آنے والے نے یہی کہا ہم بے گھر مہاجروں کو بسا کر ہی دم لیں گے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!" لال دین بڑی افسردگی سے بولا۔

"ابھی کیا ہے! ابھی تو صدیاں گذر جائیں گی اور ہم اپنے ہاتھوں سے بنائی ان غلیظ جھگیوں میں سڑتے گلتے رہیں گے۔"

بابا فضلو کہہ رہا تھا، وہ بابا فضلو جس کو اپنی گرتی، ٹپکتی جھگی کی فکر تھی، رشیدن کی کھانسی اور شادی کے انتظار میں بتول کی سوکھتی جوانی کی فکر تھی ـــ یہ بابا فضلو نہیں بول رہا تھا، زندگی کے ہزارہا تجربات بول رہے تھے۔ یکایک پائنتی پر بیٹھا شاجے مستانہ اچھلا اور بولا:

"ایسی باتیں نکو کرو فضلو بابا۔ صدا حالاں ایک سے نہیں رہتیں، دیکھو نا یہ سبھی لوگاں کیسے ہیں۔ سبھی اچھے ہیں۔ ہو بابا پھر تم بھی غم نکو کرو۔ سچی بات تو ایچ ہے، اوں خانڈے اعظم ہماری سنگت واعدہ کئے تھے نا، بس تو انہوں کا واعدہ یہ سپاہیاں پورا کر کے چھوڑیں گے! اتو، بابا۔ اب ختم بھی کرو نا یہ باتاں!"

اور فضلو بڑے تیقن سے شاجے مستانہ کی گدلائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"شاجے! میں تیرا غم جانتا ہوں، جانتا ہوں میں تیرا غم شاجے!" بابا فضلو کی آواز بھرا گئی، شاجے مستانہ کی آنکھوں میں سارے زمانے کا درد تھا لیکن ہونٹ پھر بھی مسکرا رہے تھے، یکایک ذہنی رو پھر بہک گئی،

"اجی حضرت! کیا بول کے بولے، شاجے مستانے کو کوئی غم نہیں ہے! اپن کی سمجھ میں تو تمہاری باتاں آتچ نئیں۔ تم تو حضرت خالی پیلی بوٹریاں مارتے بیٹھے ہو ـــ ـــــــــــــ وہ اور بہک گیا، بہکتا ہی چلا گیا" اماں رشیدہ اور بیٹی بتول کیسے ہیں؟" وہ عجیب بے ربط سی باتیں کر رہا تھا، مستانہ جو ٹھہرا۔ پھر یکایک وہ پائنتی سے اچھلا اور "بابا فضلو زندہ باد" کا نعرہ لگاتا ہوا یہ جا وہ جا۔

"دیوانہ! بیچارہ!" فضلو نے سرگوشی کی۔

گلی میں باتوں کی بھنبھناہٹ سن کر کرم دین سقہ بھی اپنا ہاتھ بھر کا حقہ لے کر گڑگڑاتا آ پہنچا۔ کرم دین کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی تیس پینتیس کے پھیرے میں تھا، اپنی کٹھن زندگی سے، جس نے اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ کر اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا، وہ آج بھی مایوس نہ تھا۔ اسے تو اب بھی کسی صبح نو کی آمد کا انتظار تھا، وہ صبح نو جس کا انتظار کرتے کرتے ان جھگی نشینوں میں سے بیشتر نے اس کی امید ہی چھوڑ دی تھی ـــ حالات صدا ایک سے نہیں رہتے، ان میں تبدیلی ضروری ہے، جلد یا بدیر! ـــ سو یہ وہ یقین تھا جس کے آسرے کرم دین سقہ اپنی زندگی کے ان گنے چنے دنوں کو گھسیٹے جا رہا تھا۔

"اوے پھجلو! اچھے دن آ رے ائیں، اب تو کھس ہو جا ـــ" پر جب اس نے بابا فضلو کے چہرے کو دیکھا جس پر غم واندوہ کی لکیریں آج کچھ زیادہ ہی نظر آ رہی تھیں تو اس نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"اے بھیا" وہ وہاں بیٹھے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "اے بھیا ہم کہت ہیں کی کائدِ اعجم لبعدہ (واعدہ) کرن تھے کی پاکستان اپن لئے جنت سے کم نہیں ہوگا، پر بھیا ابھی پوچھو تو ہم ابھن (ابھی) دوجخ میں ہیں ـ اس سے بھلے تو ہم باڈر (بارڈر) پار تھے تنک سوچو تو ھمو (ہمیں) کو تو ایک ٹھو کٹی بھی نہیں ملی۔ اپن تو نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ پر بابو جی اپنی جورو بڑی جیوٹ ہے۔ میں تو پھجلو سے کہت ہوں کہ تو کیوں روتا ہے، میری لگائی کو دیکھو خوب پان کھاتی تھی واں (وہاں) سو وہ تج دیا سونے کا کنٹھا بک گیا تو ڈورا باندھ کر گجارا کر رہی ہے، مگر پھجلو تو تو آس کھو بیٹھا ہے، یونہی بیٹھا آنسو بہایا کرے گا کیا۔ ارے پھجلو اب تو کھوس ہو جا، بھلے دن آ رئے ایں۔"

"جرور، جرور، بارہ سال سے آ رہے ہیں نا جواب آئیں گے کرمو!" فضلو اسی یاسیت سے بولا جو اس کا خاصہ اور حالات کا صریح تقاضہ تھی

نزدیک آتے ہوئے نوجوان شبّو نے بابا کی یہ بات سن لی اور بڑے پُرجوش لہجہ میں بولا:

"بابا! کرم دین ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، یہ سپاہی ہیں، اور سپاہی اپنے دعدے کے پکّے اور اپنی آن پر جان دینے والے ہوتے ہیں!"

شبّو جوان ہونے کے ناطے اپنی شریانوں میں وہ گرم خون رکھتا تھا جو ناساز گار حالات میں بھی سرنگوں ہونا نہیں جانتا۔

"کون جانے کیا ہونے والا ہے!" رمضو، شبّو کی بات کاٹتے ہوئے بڑی مایوسی سے بولا۔

"مگر ابھی کچھ دن پہلے ہی تو چیکن (چیکنگ) ہوئی تھی، بس اکی بار تو پیڑا پار ہی سمجھو۔"

یکایک بابا کی بوڑھی آنکھوں میں اب سے کچھ دن پہلے ہونے والی چیکنگ کا منظر گھوم گیا۔ اسے یاد آیا اس نے سرکاری عملے اور سپاہیوں کو دیکھ کر کچھ عجیب یاسیت اور سکون کے ملے جلے انداز میں کرم دین سقّے سے کہا تھا "اوکرمو! الو آرہے ہیں گرفتار کرنے، ہاں بھائی، سارے جہان کے بھوگ بھگتنے کو ہمیں تو اکیلے رہ گئے ہیں۔ خیر (خیر) ہمیں جیل جانا منظور ہے۔ جیل میں کم از کم پکّی چھت نیچے تو رہنے ملے گا جھگی تو نہیں بنانی پڑے گی" اور کرم دین بڑی امید سے بولا تھا۔

"کیوں جی تھوڑا کرتا ہے رے بھلو! چنتا مت کر، کھاتر جمار کھ! اس بار گڑبڑی کا اندیشہ نہیں، بس، نِسا کھاتر رہ" اور بابا فضلو اس کے جواب میں اسی قدر بولا تھا "ارے کرمو! اپنی تو بھلی بری جیسی تیسی گزر ہی گئی، اس جھگی ہی میں مریں گے، پر تو اپنی نبیڑ۔"

اور اب اس نے شبّو کی بات کا یوں جواب دیا۔

"پہلے بھی تو جھگی والوں کے کارڈ بنے تھے، تصویریں لی گئی تھیں، چیکن ہوئی تھی، یہ تو بارہ برس میں کتنی ہی بار ہوا ہے شبّو بیٹے!! دہ پھر وہ اسکول کالج کے لڑکے بھی تو آئے تھے، یہ تماشہ تو روجینہ ہوتا ہی ہے ہماری جندگی میں، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں۔ جو پہلے تھے سو اب بھی ہیں۔ بہت ہوا تو تھوڑے دن بعد حکومت توپ لگا کر ہمیں اڑا دے گی، کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!"

"پر بابا وہ کہہ رہے ہیں، پہلی اگست کو کورنگی بھیجدئے جائیں گے۔ صدر سے گزر رہا تھا تو اخبار والے چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے۔"

"میں تو بس اتنا ہی جانو ہوں! یہ پہلی ہماری تمہاری جندگی میں تو کبھی نہ آئے گی، شاید کبھی آئے لیکن ......" بابا فضلو جانے کیوں چپ ہو گیا اور پھر بولا "میری دنیا تو یہی جھگیوں کی بستی ہے اور یہ دو کبریں جس میں اب تیسری کا بھی اجافہ ہو گیا ہے، میں تو ان کبروں کو ہی سینے سے لگائے منوں مٹی نیچے جا سوؤں گا!"

"اتنے مایوس نہ ہو بابا" شبّو یوں بولا جیسے عنقریب اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ اس نے بھی تو ایک پکّے گھر کے خواب دیکھے تھے ٹپکتی جھونپڑی کی متعفن فضا سے دور ـــ کہیں ایک چھوٹا سا پکّا سا مکان جس کی چھت چوماسے میں نہ ٹپکتی ہوگی اور جس میں وہ اپنی بتول کو بیاہ کر لائے گا۔ اور پھر وہ ہوگا اور اس کی بتول۔ اور چند سالوں میں یہ گھر کھیلتے کودتے گول مٹول بچّوں سے بھر جائے گا۔ وہ اس احساس ہی سے دور رہنا چاہتا تھا کہ اس شبِ تار کی کوئی سحر نہ ہوگی۔

رُکی بارش، گھور گھٹاؤں، چمکتی بجلی اور کڑکتے بادل کے آنچل تلے پھر تھل تھل برسنے لگی اور کرم دین، شبّو، رحمت علی، لال دین، رمضو اور بابا فضلو سب کے سب کھلے آسمان میں بھیگنے سے بہتر اپنی جھگیوں میں بھیگنے چل دئے۔

باہر شاہجے مستانہ اپنی دلدوز آواز میں عجیب ہذیانی انداز میں اکیلا چیخ رہا تھا۔

"بابا فضلو زندہ باد۔ قائدِ اعظم زندہ باد۔ ہر۔ ہر۔ ہر۔ ہش۔ قائدِ اعظم۔ ہش!" اس کی آواز ڈوب گئی۔

★

ساری رات مینہہ برستا رہا۔

سارا دن پھوار پڑتی رہی۔

ساری شام ساون بھیگتا رہا ـــ

اور ـــ ان کے ہمراہ قائد آباد کے ہزاروں بے گھر انسانوں کی محنت اور مشقت سے تیار کردہ جھگیاں فطرت کی المناکیوں اور موسم کی

شدت کا شکار ہوتی رہیں ــــــ

★

وہ جانے کیسی صبح تھی ـــــ؛ ابھی دس ہی بجے تھے اور بابا فضلو اپنی جھگی سے باہر ہی نکلا تھا کہ شبّو ہنستا کھیلتا، مسکراتا، گنگناتا اس کے پاس آیا۔

"لو چاچا ـــ دیکھو نا میں ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا" "وہ" آئے تھے اور پہلی کو کورنگی جانے والے سو آدمیوں میں تمہارا نمبر بھی ہے۔ چاچا ـــ ہم تو بعد میں آجائیں گے پر تم جا کر ہمیں بھول ہی نہ جانا! ـــ مبارک ہو چاچا"

اور فضلو کو سوچنے کی بھی مہلت نہ ملی، وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر تو مبارکباد کا وہ سلسلہ چلا کہ رکنے میں ہی نہ آیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؛ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا بجز اس کے کہ یار لوگوں نے بڑھاپے میں بھی اسے چین نہیں لینے دیا اور لگے ہیں اُسے بنانے۔ اچھا خاصہ تماشہ کھڑا کر دیا ہے انہوں نے۔

"کیوں بے وقوف بناتے ہو بھائی! بوڑھے آدمی کے ساتھ مخول بازی کرتے ہو" وہ بڑی معصومیت، عجز اور بے چارگی سے بولا۔

"نہیں بابا۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا، کیا ہم سب جھوٹ بول رہے ہیں؟" شبّو نے بڑے تیقن سے کہا اس کو اعتبار دلانے کو، ادھر شبّو کے پیچھے کھڑے کرمو نے بھی اس کی تائید میں گردن ہلا دی۔

اس میں شاجے بھی تھا۔

"ہو بابا فضلو، شبّو ٹھیک کہے۔ انوں خاندِ اعظم ......! پھر جانے وہ کہاں بہک گئی اور "تاک دنادن" کہتا شاجے بھاگ کھڑا ہوا۔

مگر فضلو کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اسے یقین آتا بھی کیسے؟ یہ سب یوں اس قدر اچانک ہو جائے گا اور کچھ ایسے وقت میں جب وہ کسی خوشحال مستقبل کی امید ہی چھوڑ بیٹھا ہو گا۔ اسے اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ او چنانچہ وہ رنجیدہ سا بے اعتباری اور حیرت کے ملے جُلے احساس کے ساتھ اپنی جھگی میں لوٹ آیا۔

وہ رات اس نے کس تذبذب اور پریشانی میں کاٹی، یہ تو کچھ وہی جانتا تھا۔ بڑھاپے کی کچی نیند اور پھر پریشانیوں کا یہ طویل سلسلہ اور اوپر سے یار لوگاں کی مخول بازی۔ نیند آتی بھی تو کیسے؟ اور رات بھر اپنے بوسیدہ اور نم بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے اس نے صبح کر دی۔ اس نے سوچا، اگر کبھی ایسا سچ مچ ہو ہی گیا تو؟ مگر اس کے تجربات نے ہر بار اس قسم کی ہر امید کا بڑھ کر گلا دبا دیا۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ اور وہ تو سچ مچ اس رات ایک خواب سا دیکھنے لگا تھا جس میں اسے ایک چھوٹا سا پکا سا کوارٹر دکھائی دیا۔ اس میں وہ اور اس کی رشیدن تھی، اور تبول بھی تو جو زرق برق لباس پہنے جوانی کے نشے میں چور اِدھر اُدھر خوشی خوشی گھر میں منڈلا رہی تھی، یکایک اس نے اپنے پکے کوارٹر کی جامد اور سخت دیواروں کی ساخت کا اندازہ لگانے اسے چھونا چاہا۔ یکایک اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ سندر سپنا بکھر گیا۔ اور اس کا ہاتھ پاس ہی جھگی کی تنکوں سے آراستہ دیوار پر تھا اور کلمے والی انگلی میں ایک تنکا کھب گیا تھا جس کی سوزش سے اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اپنے چاروں اُور حقیقت اور تنکوں کی ان دیواروں کو دیکھ کر اسے اپنے اوپر بڑا رحم آگیا۔ رحم اور ساتھ ہی اپنے پر غصہ بھی، اور اپنی اس خوش فہمی پر اسے مذاق بھی سوجھا۔

"واہ رے واہ! یہ تو وہی بات ہوئی، بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آنے لگے ہیں، رہیں جھگیوں میں اور خواب دیکھیں کوارٹروں کے ارے نادان ہاتھ! تو زندگی بھر کسی جامد اور پختہ دیوار کے لمس سے ناآشنا ہی رہے گا" وہ عجیب استہزائیہ انداز میں بڑبڑایا۔ لیکن اس نے تو مدت سے اب ایسے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دئے تھے، مگر آج ـــــ ٹوٹ کر ایسے خواب پھر اسے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔؟ اسی تگ و دو میں صبح ہو گئی اور زندگی پھر مجبور کا ہو گئی۔

جولائی کی آخری تاریخ تھی، اور آخری تاریخ ہی پر کیا منحصر ہے، اس بستی کے رہنے والوں کا بجٹ تو ماہ کی بیس تک ہی بمشکل پورا ہو جاتا تھا۔ اور یہ باقی ماندہ دس گیارہ روز کیم سے پہلے وہ کس طرح گذارتے تھے، یہ تو کچھ وہی جانتے تھے۔ صبح پہلی ہو گی! لوگوں کے چہروں پر دبی دبی سی مسرت تھی کہ کل گیارہ روز کی طویل بے لطفی ختم ہو جائے گی۔

بابا فضلو اپنی چھوٹی سی ٹھیلیا دھکیلتا ہوا قائد آباد کے باہر بڑی سڑک پر نکل آیا۔ اور پھر گرم چھولے اور دہی بڑے کی چاٹ لو" کی صدا لگاتا ہوا وہ بچوں کے اسکول تک آگیا۔ ۱۱ بج رہے تھے اور اسکول میں انٹرول ہو گیا تھا چھوٹے چھوٹے بچے اسکول کی حدود عبور کرتے سڑک پر نکل آئے تھے اور وہاں کھڑے خوانچے والوں کا سستا اور گندہ مال خرید خرید کر کھا رہے تھے۔

بابا فضلو روز ہی یہاں آتا تھا۔ انٹرول میں اور پھر جب انٹرول کے ختم ہوتے ہی بچے اپنی اپنی جماعتوں میں لوٹنے لگتے تو وہ بھی اپنی ٹھلیا دھکیلتا ہوا چھٹی کے وقت تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا۔ اور ٹھیک چھٹی کے وقت اسکول پہنچ جاتا۔ فضلو کا دھندا ہی یہی تھا، دہی بڑے اور آلو کی چاٹ، گرم چھولے، پکوڑے اور پانی پوری ——— اور جب وہ ننھے منے بچوں کو اپنا سستا اور گندہ مال جس پر مکھیاں بھنک بھنک کر اسے آلودہ کر رہی ہوتیں اور ہزاروں مہلک بیماریوں کے ہزارہا جراثیم پھیلا رہی ہوتیں، کھاتے دیکھتا تو اس کا دل اندر سے جلنے لگتا۔ قوم کے یہ معمار ——— یہ گندی چیزیں! لیکن اگر قوم کے معماروں کی صحت کا خیال کیا جاتا تو خود بابا فضلو اس کی رشیدن اور بتول بھوک کے مرجاتے۔ وہ صفائی کو دیکھتا یا اپنی زبوں حالی کو! بچوں کے مانگنے پر چاٹ بناتے وقت اس کا دل شدت سے لرزنے لگتا معاً اپنی زبوں حالی کا نقشہ سامنے آتے ہی یہ احساس ہونے لگتا، اگر اس کے اندرونی ہیجان اور اس کے دل میں کیا ہے کا اندازہ ان بچوں نے اس کے چہرے سے لگا لیا تو کیا ہوگا ——— ؟ فضلو تو مر ہی جائے گا، اور اس کا مختصر سا خاندان؟ اور تب وہ جلتے دل پر چہرے کی بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ان بچوں کو زہر مہیا کر دیتا ——— معصوم بچے! انہیں برے بھلے کی تمیز کہاں تھی! بابا اگر غمزدہ ہوتا اور اس کے چہرے پر اس کا اندرونی غم چھلکتا تب بھی وہ کہاں سمجھ پاتے! اُنہیں تو چٹ پٹی چاٹ بہت پسند تھی۔

انٹرول ختم ہو گیا! لیکن آج بِکری روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ پہلے تو انٹرول تک ہی بابا فضلو دو تین روپے کما لیتا تھا جس میں سے اشیاء کی قیمت حذف کر کے روپیہ بارہ آنے بچ ہی جاتے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید چھٹی میں اس کی کسر پوری ہو جائے وہ انٹرول کے ختم ہوتے ہی اپنی ٹھلیا دھکیلتا ہوا دوسری جانب چل دیا۔ لیکن چھٹی میں بھی بِکری ٹھیک نہ ہوئی، بچے حسرت سے اس کے مال کو دیکھتے رہے، پیسے کہاں تھے آج ان کے پاس! مہینہ کی بالکل آخری تاریخ جو تھی نا۔ اور یہ تاریخ دوسروں کو چھوڑ درمیانی اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی میں ہمیشہ آتی تھی، اپنی تمام تر شدت کے ساتھ!

شام کو پھر بوندا باندی جاری رہی۔

رات آئی ——— اور پھر ......

..... اندھیرے کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے صبح کی جگمگاتی، چمکیلی پوتر دیوی نے روشنی کی ایک کرن پھینکی! ——— لیکن وہ ——— وہ تو سیاہی کی دبیز تہوں میں کہیں معدوم ہو گئی، ایک اور کرن مشرق کی منور جبیں سے پھسلی ——— اور اندھیرے کے سینے میں پیوست ہو کر رہ گئی، پھر ایک اور کرن، ایک اور ——— اندھیرے کسمسائے، گھبرائے، پھر تو کرنوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ اندھیرے چاک ہو گئے اور صبح کی منور دیوی کے لبِ لعلیں پر ایک بڑی پیاری شیریں اور چمکیلی مسکراہٹ پھیل گئی ———

وہ صبح بڑی عجیب تھی، بڑی چمکیلی، بڑی منور مطلع بالکل صاف تھا، اور کون کہہ سکتا تھا کہ بارش نے اپنی تباہ کاریوں کا سلسلہ کل تک پھیلایا ہوا تھا، وہ تو کچھ نشان ہی ایسے رہ گئے تھے جو گذشتہ بارش کے غماز تھے، ورنہ وہ صبح تو اتنی چمکیلی اور شفاف تھی کہ بارش کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اور پھر وہ یکم اگست کی صبح بھی تو تھی ——— اس کی جگمگاہٹ اور معنوی حیثیت تو یوں بھی اور بڑھ گئی تھی کہ آج بہت سوں کو تنخواہ ملنے والی تھی۔

لیکن آج صبح تو خلافِ معمول بابا بڑی دیر تک سوتا رہا۔ اس کا ایک ایک انگ درد کی شدت سے ٹوٹا جا رہا تھا، اور جب چمکتی ہوئی کرنوں نے ٹاٹ کا دبیز پردہ اٹھا کر ٹھیک بابا کے چہرے پر یلغار سی کر دی تو وہ کسمسا کر بیدار ہو گیا۔ صبح بڑی چمکیلی اور باہر خلافِ معمول بہت شور تھا، یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا! اس نے رشیدن اور بتول کے چہروں کو گھورا جو جلد جلد سامان باندھ رہی تھیں ——— وہ ابھی کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اس انوکھے معمہ کو سلجھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ باہر سے شبّو بھاگا بھاگا آیا، اس کے چہرے پر بڑی مسرت تھی، جیسے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی، بتول کو دیکھتے ہی وہ بڑے پیار سے مسکرایا۔ اور بتول نے بھی اسے دیکھتے ہی ہاتھ بھر لمبی گھونگھٹ تان لی جس کے پیچھے اندر وہ بھی مسکرا رہی تھی ———

"بابا، بابا" وہ خوش خوش عجیب اضطراری انداز میں بولا جیسے وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں بابا سے کہہ دینا چاہتا تھا "بابا، بابا۔ پڑے سوتے ہو، جلدی کرو، باہر ٹرک تیار ہیں، دوسروں کے تو سامان بھی بندھ گئے، جلدی کرو، بس کورنگی جا پہنچو بابا۔ ارے اٹھو بھی نا" اور وہ بابا کی بوسیدہ رضائی پھینکتا ہوا، بابا کا شانہ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے، مزید کسی بات کا انتظار کئے بتول پر ایک بڑی معنی خیز نظر ڈالتا یہ جا وہ جا۔

"ارے شبّو بیٹے، ارے سنو تو، ارے بھئی معاملہ کیا ہے؟" وہ پوچھتا ہی رہ گیا اور شبّو ——— وہ تو اس کی آواز کے محدود حلقے کو کب کا پار کر چکا

تھا، تب اس نے مسکراتی بتول سے پوچھا:

"کیوں ری کیا بات ہے؟"

"ابا! آج ہم لوگ کورنگی بھیجے جا رہے ہیں، جلدی کرو نا ابا!"

"سچ!" اور اس کے ناتواں درد سے ٹوٹتے ہوئے جسم میں ناگہانی کہاں سے اتنی قوت آگئی کہ وہ یہ لمبی قلانچ بھرتا بستر سے کود پڑا اور اپنی اس جلدبازی میں مستقل مسکراتی ہوئی بتول کی مسکراہٹ کی وجہ ہی نہ سمجھ سکا۔ شبتو اور بتول! محبت تو قائد آباد چھوڑ جہنم کی سلگتی آگ میں بھی ہو سکتی ہے اور پیار ــــ پیار انسان کو انسان سے ہو جاتا ہے ــــ کس کی میراث ہے پیار؟

اور جب اس کا ماؤف اور معطل ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور وہ اس مسکراہٹ کی وجہ جان گیا تو اس کی مسرت دگنی ہو گئی ــــ

باہر بچے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے۔

"کالے میگھا پانی دے! کالے میگھا پانی دے!!"

لیکن آج فضلو نے انہیں منع نہیں کیا اور نہ ڈانٹا ہی ــــ بچے اس تبدیلی پر حیرت زدہ سے اور چیخ چیخ کر گانے لگے، ہر شخص شاداں و فرحاں تھا، اور آج برسوں کی افسردگی کے پختہ، پژمردہ رنگ جیسے یکلخت ان کے چہروں سے غائب ہو گئے تھے، کہیں یہ سب خواب تو نہیں، برسوں کے تھکے مضمحل ذہن نے سوچا! لیکن جوں ہی اس نے اپنی انگلی کاٹی ــــ اس کی شدت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا، ــــ خواب ــــ نہیں یہ خواب ہرگز نہیں بعض اوقات تو خواب بھی حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

..... اور کے۔ ڈی۔ اے ٹرک میں بیٹھا فضلو مستقل یہی سوچے جا رہا تھا، آخر یہ سب کس قدر ڈرامائی انداز میں بالکل طلسماتی انداز میں کیسے ہو گیا ــــ؟

چار میل ــــ اسے تو اپنی سوچ میں وقت اور فاصلے کا اندازہ ہی نہیں رہا، اور جب وہ اپنی سوچ کے اتھاہ ساگر سے نکلا تو ٹرک یکلخت ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر چکا تھا، اور اس کی نظروں کے آگے بڑی دور تک چمکیلے شفاف کوارٹروں کی یہ لمبی سی قطار کھڑی تھی، سورج کی سنہری کرنوں میں چمکتے ہوئے یہ کوارٹر ــــ بس یوں دکھائی دیتے تھے، جیسے گرد سے اٹے ہوئے پتے بارش کے بعد سورج میں دھلے دھلائے سے جگمگا رہے ہوں! چمک رہے ہوں ــــ!!

وہاں بڑا شور تھا ــــ

بڑی آوازیں تھیں وہاں! نقرئی، دلفریب، مترنم آوازیں ــــ لوگ بڑے مسرور تھے کسی بھی متنفس کے چہرے پر غم کا ہلکا سا شائبہ تک بھی نہ تھا لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ایک سجے سجائے سے کوارٹر کے پاس بڑی بھیڑ تھی، وہاں بڑا شور تھا۔ کہیں سے شبتو بھی نکل آیا۔

"بابا! لوہے کے انسان دیکھو گے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ شبتو بیٹے! مجھے دکھاؤ وہ انسان....." وہ بڑے اشتیاق سے بولا۔

"ہٹ جاؤ ــــ مجھے دیکھنے دو 'انسان' ــــ!" وہ شبتو کے ہمراہ بھیڑ کا سینہ چیرتے ہوئے بولا اور ٹھیک مجمع کے اگلے حصہ میں نکل آیا۔

"ارے شبتو! یہ تو آگرے والے اپنے حافظ جی ہیں!" اسے بڑی حیرت ہوئی، حافظ رحمت اللہ کو نئے لباس میں دیکھتے ہوئے، وہ شبتو سے بولا۔

"ہاں بابا ــــ دیکھو حافظ جی کے قریب جو ایک مسکراتا سا چہرہ ہے نا۔ دیکھ رہے ہو نا، وہ، وہ ہمارے صدر ہیں! اور ان کے برابر وہ شخص ہے جس کے عزائم کے آگے فولاد بھی ہیچ ہے، یہ ہیں لوہے کے انسان۔"

مسرّت کے آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے، اس نے مسرّت سے چیخنا چاہا، لیکن شدّتِ جذبات سے آواز دب گئی، وہ صرف اسی قدر کہہ سکا:

"اس دور میں جب انسان دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ یہ انسان کہاں سے آگئے ہیں؟"

اور جب اس نے کوارٹروں کو دیکھا تو: "ارے یہ تو کچھ خواب والے ہی معلوم ہوتے ہیں رے شبّو!"

"ہاں بابا — خواب کبھی حقیقت میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں!"

اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا:

"کالے میگھا پانی دے — پانی دے!"

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور شبّو اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا، مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"بابا — وہ!" دائیں ہاتھ کی کلمے والی انگلی بھیڑ کے ٹھیک درمیان میں کھڑے مسکراتے انسان کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"بابا — وہ — وہ — بڑی مشکل سے ہوتے ہیں چمن میں دیدہ ور پیدا —"

اور کہیں دور، بھیڑ میں گم — شلجے مستانہ کہہ رہا تھا۔

"خانِ اعظم زندہ باد — صدا حالاں ایکسی نہیں رہتیں! تُسی بڑی تراوٹ آرئی اے۔"

★

ہمارے ملک کو کئی اہم مسائل درپیش ہیں مگر مجھے ان دو سے زیادہ کوئی اہم نہیں معلوم ہوتا، زرعی پیداوار کی کمی اور آبادی میں تیز رفتار اضافہ۔ یہ دونوں بنیادی مسائل ہیں۔ اگر ملکی ترقی کے دوسرے دائروں میں ہم نے کچھ کامیابی حاصل کر بھی لی تو وہ ان دونوں دائروں میں ناکامی کی تلافی نہیں کر سکتی۔ زرعی پیداوار، بالخصوص غذائی اجناس کی پیداوار میں معقول اضافہ اور آبادی کو متناسب حدود میں رکھے بغیر نہ تو ہمارے کم حیثیت لوگوں کی اہم ضروریات پوری ہو سکیں گی اور نہ ان کی زندگی کا عام معیار ہی بلند ہو سکے گا..... اس لئے ہم جتنی جلد ان پر توجہ دے سکیں اتنا ہی بہتر ہے —

جنرل محمد ایوب خان

(نشری تقریر بہ سلسلہ دوسرا پنجسالہ منصوبہ)

۲۳ رجون ۱۹۵۹ء

★

ماہِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء

سہرے کے پھول

نصرت یٰسین

صبح سے نوری کام کرتے کرتے ہلکان ہو گئی تھی مگر اماں تھیں کہ سوائے ڈانٹ کے بات نہ کرتیں۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر پر مدتوں سے جمی ہوئی گرد کی تہیں اتارنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن نوری نے صابن سے دھو دھو کر میز کرسیوں کو یوں تیل سے چمکا دیا کہ رفو آپا بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ مگر اماں تھیں کہ کسی طرح مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ آتشدان پر رکھی ہوئی تاج محل کی پرانی گرد آلود تصویر پر صاف کرتے کرتے نوری جمنا کے کنارے پہنچ گئی جہاں جمیل مدتوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال اور عینک میں سے جھانکتی ہوئی منی منی مسکراتی آنکھیں اس قدر قریب محسوس ہوئیں کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"ارے کمبخت نوری، تو آتشدان ہی کے پاس کیوں جم کر رہ گئی ہے"؟ اماں نے گرجدار آواز سے اسے چونکا دیا۔ نوری نے گھبرا کر دیکھا تو اماں ہاتھ میں دھلی ہوئی چادریں اور میز پوش لئے کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"توبہ ہے اماں، آپ بھی کیا بات بات پر غضبناک ہو جاتی ہیں" نوری جھلا گئی۔ "یہ اللہ ماری نری جھاڑ پونچھ ہی تو سب کچھ نہیں۔ ابھی ہزاروں کام پڑے ہیں اور مہمان آنے میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ تم جلدی سے یہ چادریں بدل ڈالو، میں صندوق میں سے گدیاں نکال کر لے آؤں" اماں بوکھلائی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور نوری بڑبڑاتے ہوئے جلدی جلدی کرسیوں کو ترتیب دینے لگی۔

رفو آپا جوان کیا ہوئی ایک جہان کو مصیبت میں ڈال دیا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ٹنٹا رہتا۔ کبھی بی زینا کی خاطر و مدارات ہو رہی ہوتی تو کبھی پیغامات کے سلسلے میں بات چیت کرتے ہوئے ابا کی آواز اسقدر تیز ہو جاتی کہ رفو آپا سہمی سہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک سے دوسرے کمرے میں یوں چکر لگانے لگتی جیسے اس میں کوک بھر دی گئی ہے۔ منے بھائی شرارت سے آپا کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے تو وہ بیچاری مجرم بنی اداس سی میز پوش لیکر کاڑھنے بیٹھ جاتی۔

ہاشمی صاحب کا گھرانا کسی زمانے میں امارت و عزت کی مثال تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے اور باپ دادا کی جائداد صرف چند کاغذوں میں منتقل ہو کر رہ گئی جنہیں اب وہ اکثر فرصت میں نکال کر دل کو تسلی دیا کرتے کہ یہ سب چکر صرف فیصلہ ہونے تک ہے۔ اتنی بہت سی جائداد کے بدلے میں عزت کی زندگی گذارنے کے لئے کیا دو چار دکانیں اور رہنے کو ایک اچھا سا گھر بھی نہ مل سکے گا۔" آجکل تو انارکلی میں ایک تھڑا ہی مل جائے تو ہزاروں کی آمدنی ہوتی ہے اور ہمیں تو دکانیں ملیں گی دکانیں" ہاشمی صاحب جوش میں زور زور سے حقہ گڑگڑانے لگتے اور بیگم آنسو بھری آنکھوں سے پسینے میں شرابور رفو آپا کو روٹیاں پکاتے ہوئے غور سے دیکھنے لگتیں۔

"پھر میں اپنی رفو کو وہ جہیز دوں گی کہ خاندان والوں کو ایک بار معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں ہم کنگنڈے بن کر نہیں رہتے" بیگم ذرا سا اطمینان کا سانس لیکر کہتیں۔

روٹیوں کی تھاپ مدھم پڑ جاتی اور رفو آپا چونک کر کہتی۔

"اماں، کیا آپ نے کچھ مجھ سے کہا ہے؟"

"ارے نہیں میں تو نوری کو پکار رہی تھی، کمبخت کو دو گھنٹے سے پنسل ہی نہیں مل رہی"

ہر روز جہیز کی فہرست بنائی جاتی اور اماں اپنی بچا کر لائی ہوئی چند ساریوں اور سہاگ کا جوڑا گنتی کرتے ہوئے بار بار غلطی کر جایا کرتیں۔

ابا جھنجھلا کر پنسل رکھ دیتے۔

"یہ تو سب بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے یہ تو بتاؤ گراؤنڈ کا کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ اُسی کے مزاج کے مطابق چیزیں ہوں گی۔ آجکل کے لڑکے تو بیوی کو کپڑے تک اپنی مرضی کے پہنواتے ہیں۔" ابا ذرا موڈ میں ہنستے ہوئے کہتے۔

"واہ واہ! یہ کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ہمیں تو کبھی اپنی پسند کا جوتا بھی لا کر نہ دیا۔ مرد ذات کے چاؤ چونچلے چار ہی روز کے ہوتے ہیں۔" اماں شکایتوں پر اتر آتیں اور جہیز و بری کھٹائی میں پڑ جاتے۔

رفو سے اماں کی محبت دوسرے بہن بھائیوں کے لئے خاصی تکلیف دہ تھی۔ بات بے بات وہ بس انہیں کے گن گایا کرتیں۔ اس کے مزاج کی نرمی تو بچاری نوری کے لئے طعنہ بنکر رہ گئی تھی۔ "سلیقے میں تو رفو بیٹا اپنی ماں سے بھی چند قدم آگے ہے۔" ابا شرارت سے اماں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے۔ اور رفو آپا جلدی جلدی باورچی خانے کے برتن سمیٹنے لگ جاتی۔ نوری گھورتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرنے کی کوشش میں ہلکا سا رک جاتی تو رفو آپا بڑے پیار سے کہتی "بھئی نوری کھانا کھا لو ناں۔ آج ارہر کی دال تو تمہارے لئے ہی پکائی ہے۔ چٹنی بھی پلیٹ میں رکھی ہے سچ بڑے مزے کی ہے۔"

نوری رفو آپا کی اس نرمی سے بالکل متاثر نہ ہوتی اور غصے میں کھٹا کھٹ الماری سے کھانا نکال کر بڑے بڑے نوالے کھانا شروع کر دیتی۔ رفو آپا آہستگی سے پانی کا گلاس اس کے پاس رکھ کر باہر چلی جاتی۔

"بڑی آئی ہیں فرشتہ سیرت۔ مکار کہیں کی! اماں کی لاڈلی بنی ہوئی ہیں۔" نوری اپنی ننھی سی ناک پھلا کر بڑبڑانے لگتی۔ "ایسی چار سو بیبیاں ہمیں نہیں آتی ناں کہ اماں ابا کو دیکھتے ہی زبان گنگ ہو جائے اور ہاتھ پٹاپٹ چلنے لگیں۔ یہاں تو جو کام ہزار محبت سے بھی کرو تو بدلے میں وہی ڈانٹ اور پھوہڑ پن کے طعنے۔" نوری غصے میں پانی پئے بغیر ہی اٹھ گئی اور دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔

"یہ نگوڑی تو پنجاب میں آکر زینے سے اترنا بھی بھول گئی۔ یوں سینڈلیں چٹخا کر چلتی ہے کہ کلیجہ دہل جاتا ہے۔" اماں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا مگر نوری نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ منہ پھلائے وہ دروازے میں کھڑی چاٹ خرید رہی تھی کہ خالہ بی آ گئیں۔ انہیں دیکھتے ہی نوری زرد پڑ گئی کہ دروازے میں کھڑے ہونے پر خدا جانے اب کیا کیا قصے گھڑے جائیں گے۔ سلام کے جواب میں خالہ بی نے نوری کو محبت سے گلے لگایا۔ اماں کی خیریت پوچھی اور اوپر چلی گئیں۔ خالہ بی کے اسقدر پُرشفقت رویے کے متعلق نوری ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ان کے صاحبزادے جمیل میاں آ گئے۔

"ارے نوری، یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اماں کیا اوپر چلی گئیں؟" جمیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی کیا کہا آپ نے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نوری بوکھلا کر رہ گئی تھی جمیل نے زوردار قہقہہ لگایا اور نوری سہم گئی۔

"جمو بھائی آپ اوپر چلئے ناں۔ اماں آپ کو......"

"بھئی نوری بس اب بھائی وائی کا قصہ سرے سے پاک کر ڈالو۔ اماں تو آج ہی بات کرنے آئی ہیں۔" جمیل نے اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نوری پریشان ہو کر ادھر اُدھر چھپا نکنے لگی۔

"آخر کب تک انتظار کروں۔ اب تو سچ پوچھو کسی پل چین نہیں۔" جمیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ نوری سُرخ پڑ گئی اور بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

اماں بیٹھی خالہ بی سے خوب گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ رفو آپا شربت بنا کر لے آئی۔ اماں حسب معمول آپا کے خوبصورت کاڑھے ہوئے میز پوش، اور ٹی کوزیوں کا تذکرہ لے بیٹھیں اور رفو آپا شربت انڈیلتے ہوئے گلاس گراتے گراتے بچی۔ خالہ بی نے اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "ارے ہاں بہنا، آخر جوان جہان لڑکی ہے اور شادی بیاہ کی تیاریاں تو بہت محبتوں سے کی جاتی ہیں۔"

رفو آپا چپکے سے باہر چلی آئی اور پھر شادی بیاہ کے طویل موضوع سے نوری کا دل بار بار دھڑکنے لگا۔

"یہ جمیل بھی بہت بے صبر ہے۔ اماں جب تک اس رفو آپا کو دلہن نہ بنالیں گی خالہ بی کا پیغام بھلا کب قبول کریں گی۔ اور انہیں دلہن بننے میں جانے کتنی صدیاں لگ جائیں گی اور ہم سفید بال لئے پٹر پٹر دیکھتے اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔" نوری بیٹھی مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی۔

"اے ہے توبہ بجیا، یہ تمہیں رات کو نیند کیسے آجاتی ہے؟ گھر میں اتنی جوان لڑکی ہو تو بھلا کہاں چین پڑتا ہے۔ میری زوبی تو خیر سے تیرھویں میں لگی تھی تو میاں نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر ڈالا۔ اپنی رفو سے پورے پانچ برس چھوٹی ہے اور ماشاءاللہ تین تین بچے کھیلتے ہیں۔ اب تم بھی کچھ کر ڈالو نا۔ کیا کوئی پیغام نہیں؟" خالہ بی مسلسل اماں کو کچوکے لگا رہی تھیں۔

"اے بہن پیغام تو ہزار ہیں مگر ان کے ابا کسی کو پسند ہی نہیں کر پاتے۔ ہر ایک میں تو کچھ نہ کچھ کیڑا نکال لیتے ہیں۔ اور پھر سچ پوچھو تو آخر ہماری بیٹی اب ایسی گئی گزری بھی تو نہیں کہ جہاں جو نظر آیا اس کے آگے اٹھا کر پھینک دیا۔ آخر باپ دادا کا خاندانی نام بھی تو رکھنا ہے۔ یہاں پرائے دیس میں کون کسی کو کچھ جانتا ہے۔" اماں نے خالہ بی کو بڑے درد کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"اے ہے بجو تم خاندان کی آن لئے بیٹھی رہو اور لڑکی کو کمر جھکوا کر سسرال بھیجنا۔ ابھی سے بچاری کے رنگ روپ پر راکھ اڑنے لگی ہے۔" خالہ بی نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ کے باورچی خانے میں بیٹھی آپا نے نمناک آنکھوں سے منے بھائی کو دیکھا جو وہاں بیٹھے اسے ترکاری بنانے میں مدد دے رہے تھے۔

"میں تو خیر سے اب اپنے جمو کے لئے بھی تیاری کرنے لگی۔ تین سو روپیہ اسی عمر میں کمانے لگا ہے، گھر نوکر سب سرکاری اور ترقی کا یقین۔" خالہ بی نے شادی کا اشتہار دیتے ہوئے کہا۔

"کہیں لڑکی بھی پسند کی؟" اماں نے اپنی دکھ بھری آواز پر کچھ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"اے واہ بجیا تم بھی کمال ہی کرو گی۔ بھلا کون ایسے لڑکے کو ہاتھ جوڑ کر بیٹی نہ دے گا۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا چاند۔" خالہ بی نے پاس بیٹھی نوری کو اچٹتی نگاہ سے دیکھا جو بظاہر بے توجہی سے سلائیاں بننے میں محو تھی۔ نوری کا دل دھڑک کر رہ گیا اور سلائیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تڑاخ سے خالہ بی کو ایسا جواب دے کہ ایکبار تو وہ سمجھ جائیں کہ لوگ نواب کے کیا ہاتھ جوڑیں گے، ابھی ان کا اپنا لاڈلا ہی اس کی خوشامد کرتا ہے مگر مارے لحاظ اور جمو میاں کی مسکراتی ہوئی میٹھی میٹھی نظروں کی خاطر چپ چاپ تیر سہتی رہی۔

نوری کو خالہ بی کسی طرح اماں کی بہن نہیں لگتی تھیں۔ معمولی سی معمولی ساری کو وہ اس قدر سجا کر پہنتیں کہ جی پھڑک جاتا۔ ہلکی سی لپ اسٹک کے ساتھ ہی اپنے مقیشی بالوں میں وہ کلپ اور پنیں لگانا تو کبھی نہ بھولتیں۔ اس ڈھلتی عمر میں بھی انہیں ہمیشہ بناؤ سنگھار کا خیال رہتا۔ پیشانی کی جھریوں میں اٹکی ہوئی کریم دیکھ کر تو نوری ہنسی ضبط ہی نہ کر سکتی تھی لیکن خالہ بی کی تیز نظروں سے وہ خوب واقف تھی، اس لئے نگاہ پڑتے ہی وہ کسی نہ کسی بہانے فوراً باہر نکل جاتی اور پھر گھنٹوں رفو آپا کے سامنے کھڑی ہاتھ چلا چلا کر خالہ بی کی نقلیں اتارا کرتی۔ مگر رفو آپا تھی کہ عمدہ سے عمدہ اداکاری پر بھی صرف ہلکا سا مسکرا دیا کرتی اور "چل ہٹ شریر کہیں کی" کہکر یوں مصروف ہو جاتی کہ نوری جل کر رہ جاتی اور پاس بیٹھے منے بھائی کا آم جیسن کر ندیدوں کی طرح چوسنے لگتی۔ منا بھائی نوری سے بہت عاجز تھا۔ جہاں آپا اسے کچھ کھانے کو دیتی یہ نوری کمبخت فوراً کہیں نہ کہیں سے حصہ بٹانے آجاتی اور بچارے منے کی کیا مجال تھی جو وہ انکار کر جائے۔ اگر وہ کبھی بھولے سے اس کی شکایت اماں سے کر دیتا تو وہ یوں ہاتھ نچا نچا کر باقاعدہ لڑنا شروع کر دیتی کہ دیوان خانے سے ابا قلم ہاتھ میں پکڑے غصے میں دندناتے آجاتے۔ منا سہم کر اماں کے پیچھے کھڑے ہونے کی کوشش میں نوری کو گھورتا جو خوب زور دار آواز میں منے کی زیادتی کے بین ابا کو سنا رہی ہوتی۔ اماں منے کی صفائی میں کچھ کہنے ہی کو ہوتیں کہ ابا فوراً بول اٹھتے۔

"یہ سب تمہارا ہی بگاڑا ہوا ہے۔ ہر بات میں اس کی پشت پناہی کر کے تم نے اسے اتنا بدتمیز اور بے غیرت کر دیا ہے کہ اب وہ اتنی بڑی بہن تک کو مارنے پیٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔"

نوری کے بین مدھم پڑ جاتے اور رفو آپا چپکے سے نہ جانے کہاں سے آکر منے کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے جاتی۔ ابا بڑبڑاتے ہوئے واپس چلے جاتے اور نوری اماں کے خوف سے فوراً اٹھ کر جھاڑو لئے ابا کے سونے والے کمرے کی صفائی میں لگ جاتی۔

"کمبخت نے ایسی بھاڑ وسنبھالی ہے کہ سارے جہاں پر جھاڑو پھیر کر رکھ دیا ہے۔ میں تو اس لونڈیا کی زبان سے بالکل عاجز آگئی ہوں" اماں تنہا بیٹھی غصے میں بڑبڑاتی رہتیں اور نوری صفائی میں مگن ہو جاتی۔ ویسے یہ بات تھی بھی سچ کہ نوری آئے دن نیا جھگڑا لے بیٹھتی۔ کبھی رفو آپا کے اچھے کپڑے پہننے پر تو کبھی منے بھائی کو زیادہ مٹھائی ملنے پر آفت مچائے رہتی۔ ابا اس کی طرفداری کی ہلکی سی کوشش کرتے تو اماں غصے میں انہیں مختصر آمدنی کے طعنے دینے لگ جاتیں اور ابا بیچارے اداس سے ہو کر نوری سے حقہ دیوان خانے میں لیکر آنے کا کہکر فوراً چلے جاتے اور نئے "کلیم فارم" کو خوب سوچ سمجھکر پر کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

خالہ بی کی ملاقاتیں اب زیادہ طویل ہو گئی تھیں۔ اکثر وہ صبح سے شام تک جہان بھر کی باتیں کیا کرتیں مگر ان کا پسندیدہ موضوع ہمیشہ شادی بیاہ ہوتا۔ رفو آپا ان کی آمد سے اور زیادہ مصروف ہو جاتی اور نوری کلیجے میں کئی مرتبہ ابال اٹھنے کے باوجود انتہائی ضبط سے کام لیتی۔ اسے اپنی ہونے والی ساس کے چہرے پر خالہ پن کم اور خباثت زیادہ نظر آتی تھی۔ منے بھائی سے اس روز خوب دوستی رہتی اور مسلسل اماں کی خدمتوں میں لگے رہنے کی کوشش کرتی۔ خالہ بی باتوں ہی باتوں میں کئی مرتبہ جمیل کے رشتے کے سلسلے میں ذکر کر چکی تھیں مگر اماں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے کی کوشش میں تھیں۔ جمیل کو وہ بچپن سے بہت پسند کرتی تھیں۔ اس کی دلچسپ باتیں سن کر وہ گھنٹوں محظوظ ہوا کرتیں مگر یہ سوچکر اداس ہو جاتیں کہ رفو اس سے پورے تین سال بڑی ہے۔ پھوہڑ، بدزبان اور شوخ نوری تو ان کے ذہن میں کبھی اس سلسلے میں آتی ہی نہ تھی لیکن جمیل تو شاید نوری کی بدتمیزیوں پر ہی ریجھ گئے ورنہ رفو آپا اگر دو چار سال بڑی تھیں تو کیا ہوا اور سب باتوں میں تو وہ اس سے کہیں آگے تھی۔ گندمی رنگ پر ستواں سی ناک اور سیاہ نیم وا آنکھیں بہت دلکش تھیں۔ لمبے الجھے بال ہمیشہ چہرے پر لہرایا کرتے اور کام کرتے کرتے آپا انہیں ذرا سا ہٹاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر یوں معروف ہو جاتی کہ ان کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہتا۔ اداسی اور نکھار کی آمیزش چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا کرتی۔ جب وہ چلتی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہیں سے آ رہی ہے یا کہیں جا رہی ہے۔ چپ چاپ سب کام کرتی رہتی اور نوری کی تلخ سے تلخ بات بھی یوں سہ جاتی کہ اس کے اس اطمینان سے اسے اور غصہ آ جاتا۔

"اسی چپ میں تو آپ سب کچھ کر کے کہنے پر بھی معصوم بنی رہتی ہیں" نوری کچھ زوردار جواب کے انتظار میں طنز پر طنز کئے جاتی لیکن رفو آپا بت بنی سب کچھ سنتی رہتی اور کام یونہی ہوتے رہتے۔ منا بھائی بیچارا صرف غرّا کر رہ جاتا اور موقع پاتے ہی فوراً آپا سے لپٹ جاتا۔ پیاز بگھارتے ہوئے آپا کی آنکھوں سے آنسو تیر کر گرے وان تک پہنچ جاتے مگر وہ ان سے یوں بے خبر رہتی جیسے یہ آنسو اس کے نہیں کسی اور کے ہیں۔ اس بے تعلقی پر نوری دھیمی پڑ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑ کر آپا سے لپٹ جائے اور فوراً معافی مانگ لے مگر آن میں وہ بے توجہی سے گھڑے سے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی دم سے پی جاتی اور اطمینان کا سانس لے کر باورچی خانے سے باہر چلی جاتی۔

ساتھ کے کمرے میں اماں رفو کے نئے پیغام کے متعلق میٹھی باتیں کر رہی ہوتیں۔ نوری کچھ سنتے اور کچھ نہ سننے کی کوشش میں پاس سے گزرتی ہوئی اماں کے اداس اور غمگین چہرے کو دیکھ کر کڑھ جاتی۔

"بس ایک ہی بیٹی جنی ہے دنیا میں۔ کیا کیا اس کی فکریں لگکر جان کو ہلکان کر رہی ہیں" نوری پلنگ پر لیٹ کر باقاعدہ چپ چاپ خود ہی سوال و جواب کرتی رہتی۔

ابا کو مشاطاؤں پر قطعاً یقین نہیں تھا۔ ان کے خیال میں دولت بٹورنے کے فن میں بی زرینا تو بہت ہی ماہر تھی۔ خود اماں بھی دل میں اکثر یہی رائے قائم کرتیں مگر پرائے دیس میں کوئی جاننے والا نہ تھا کہ پرانی امارت سے ہی متاثر ہو کر پیغام بھیجتا۔ اعلیٰ خاندان کا غرور بٹوارے میں منفی ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو نیچ ذات لوگ کیا کیا بنے بیٹھے تھے۔ ایسے حالات میں اگر وہ بی زرینا سے بھی بگاڑ لیتیں تو رفو کو سسرال بھیجنے کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔ اس لئے باوجود ابا کی مخالفت کے اماں رشتے ناطوں کی سیاست پر خوب گرما گرم بحث کیا کرتیں جس میں مشاطاؤں کے فن پر وہ انہیں چھمی بی کی مثال ضرور یاد دلایا کرتیں جو ان کے سسرال میں دور کی رشتے دار تھی اور بدسلیقہ اور غریب ہونے کے باوجود نوابوں کے خاندان میں بیاہی گئی تھی اور بقول ان کے "نواب صاحب تھوڑے سے بوڑھے ہیں تو کیا ہوا لاکھوں میں تو کھیلتے ہیں اور چھمی بی مہارانی

بنی عیش کرتی ہیں۔ " مگر یہ تمہاری بی زینا نے آج تک کون سا کام کا رشتہ بتایا ہے؟" ابا اصل موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے۔
"واہ بھول گئے؟ وہ وکیل صاحب کے بھانجے میں کیا عیب تھا؟ تم نے ہی خوامخواہ بےکار کے عیب نکالے" کہ سگریٹ بہت پیتا ہے، ہروقت یار دوست ساتھ لگے رہتے ہیں، وہ لڑکا ہاتھ سے جاتا رہا۔ سنا ہے اب تو کسی جج نے اسے بیٹی دی ہے۔" اماں ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

ابا اپنے کہے پر نادم سے ہو کر لیٹ جاتے اور اماں غمگین ہو کر آہیں بھرنے لگتیں۔
"آج بی زینا کو پھر بلاتی ہوں شاید کوئی موزوں رشتہ بتائے اور میری بٹیا کا نصیبا جاگ اٹھے۔" اماں کسی حرح مایوس نہیں ہونا چاہتی تھیں۔
شام کو منے بھائی ہاتھ میں سویوں کے زردے کی پلیٹ سفید کاڑھے ہوئے رومال سے ڈھانپ کر بی زینا کے گھر پہنچے۔ بی زینا اس وقت اپنی بہو سے لڑنے میں مصروف تھی۔

"ارے کیا تڑ تڑ کئے جاتی ہے۔ تیری خاطر اور تیرے بچوں کی خاطر دن بھر جوتیاں چٹخاتی ہوں اس بڑھاپے میں جھوٹ سچ کر کے اپنی عاقبت خراب کر رہی ہوں، اس پر بھی تم مجھ سے لڑتی ہو۔ باپ نے تو مجھے پچاس روپے ماہوار کمانے والے کے سپرد کیا تھا۔ دیکھتی اگر آج میرا لال زندہ ہوتا تو تجھے پانچ پانچ سو روپیہ کما کر دیتا اور تو یوں پھول پھول کر بھینس بن رہی ہوتی۔ میں نے تو جو کمایا وہ تجھے لا کر دے دیا۔ جو کھانے کو ملا وہ بچوں کے لئے اٹھا لائی اور جو عمدہ سے عمدہ کپڑا پایا وہ تیرے حوالے کر کے خود چیتھڑوں میں گزر کی۔ آج تک حج کے لئے بھی کچھ بچا کر نہ رکھا مرنے سے پہلے سرخرو ہو لیتی۔ ہائے آج میرا بیٹا زندہ ہوتا تو پھر میں دیکھتی یہ تیری زبان کس طرح قینچی کی طرح چلتی ہے۔" بی زینا اپنے جواں مرگ بیٹے کو یاد کر کے دھاڑیں مارنے لگی۔

سہمے ہوئے منے میاں سیڑھیوں میں پلیٹ کو مضبوطی سے تھامے کھڑے تھے کہ گلی سے باہر موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ بی زینا گھبرا کر اٹھی بقچی ہاتھ میں پکڑی، جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور جوتی برقع پہن کر سسکیاں بھرتی دروازے پر پہنچی۔ منے میاں نے پلیٹ تھماتے ہوئے اماں کا سلام اور ضروری کام کا پیغام دیا۔ بی زینا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری صبح آنے کا وعدہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی گلی کے موڑ پر کھڑی کار میں جا بیٹھی۔

رشتے کے ضرورت مندوں میں اس کے بہت سے گاہک موٹروں کاروں والے بھی تھے جو وقتاً فوقتاً اس کے تانگے بسوں کا کرایہ بچا لیتے تھے۔ اسی لئے وہ معمولی گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کی طرف ذرا کم ہی متوجہ ہوتی تھی۔ جتنے زیادہ غریب اتنے ہی زیادہ حریص! "فلاں چیز دلوا دو، ماں کو سونے کے بندے ضرور دیں۔ لڑکا ڈیڑھ سو روپیہ ضرور کماتا ہو، ساس نہ ہو تو انعام میں دس روپے زیادہ۔" اس قسم کی شرائط بی زینا حتی المقدور پوری کرتی مگر بڑے گھرانوں میں یہ بات نہ تھی، وہاں صرف حسن اور جائداد کی باتیں ہوتیں اور منہ مانگا انعام ملتا۔ بی زینا اپنے کام میں بہت تیز تھی۔ وہ ایک ہی نظر میں سارا معاملہ سمجھ جاتی اور پھر جہاں چاہتی ٹانکا بھر دیتی۔ معمولی غریب خاندانوں کی شریف زادیاں اب اس کی وجہ سے محلوں میں رہ رہی تھیں۔ شرافت، ذات پات اور عمر کی قید جس نے لگائی وہ چکے۔ "بس اس کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیتی اور "سہرے کے پھول کھلنے میں ابھی کچھ دیر ہے" کہہ کر دعا کرنے لگتی کہ الٰہی سب کو بچے بچیوں کے فرائض سے سبکدوش کر اور پھر وہ اپنے فرض سے یوں سبکدوش ہو جاتی کہ لاکھ بلانے اور التجا پر اُدھر کا رخ نہ کرتی۔
اماں نے جب پہلی مرتبہ دس روپے کا نوٹ باتوں ہی باتوں میں چپکے سے اس کے ہاتھ میں تھمایا تو بی زینا نے چونکے بغیر نوٹ کو تہہ کر کے نیفے میں اڑس لیا۔ اِدھر اُدھر کے رشتے ناطوں کا ذکر کرتے ہوئے بی زینا نے اپنی چھوٹی سی بقچی کھولی جس میں کاغذ کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پرزے بھرے پڑے تھے۔ طرح طرح کی تصاویر ایک کاغذ کے تھیلے میں بند تھیں۔ اماں نے للچائی ہوئی نظروں سے پیغامات سے بھری ہوئی بقچی کو دیکھا اور مسکرا کر بی زینا سے اس کی بہو کی شکایات سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہیں اس بچاری محنتی بڑھیا سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی جو جہان بھر کے والدین کی مشکلات آسان کرتے کرتے خود سب سے بڑی مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ بی زینا نے بہت

غور کرنے کے بعد ایک میلا سا سفید کاغذ کا پرزہ نکالا جو نہ جانے کتنی مرتبہ پکڑنے پڑھنے میں گل سڑ کر رہ گیا تھا۔ نوری کو بلایا گیا، وہ شرارت سے مسکراتی، ایک ہی آواز پر بھاگتی ہوئی آئی۔ الٹ پلٹ کر کاغذ کو دیکھا اور پڑھنے لگی۔ "نام ایس ایم ادریس؟" "نام تو بہت اچھا ہے" اماں نے دل ہی دل میں خوش ہوکر کہا۔

"تعلیم ایف اے" اور اماں کا منہ اتر گیا۔ ان کی رفو گھر پر قرآن مجید پڑھنے کے علاوہ اردو بھی پڑھ لکھ لیتی تھی۔ انگریزی پڑھنے کے لئے ابا نے بہت سر مارا مگر اماں کو یہ میمنڈ کوں کی سی ٹر ٹر بہت بری لگتی تھی۔ ساتھ ہی انہیں لڑکی کے بگڑنے کا پورا پورا یقین تھا اسلئے رفو ابھی مشکل سے "سی ڈی" تک ہی پہنچی تھی کہ گھر میں فساد مچ گیا اور ابا ہمیشہ کی طرح چیخ چلا کر ہار مان گئے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ اماں کا داماد صرف ایف۔ اے ہو۔ وہ خود بالکل پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں مگر ان کے میاں اس زمانے کے میٹرک تھے جب لوگ پرائمری کر کے تحصیلدار بن جاتے تھے۔ اماں کو اپنی جہالت اور میاں کے اسقدر تعلیم یافتہ ہونے پر بہت فخر تھا کبھی کبھار محفل میں پڑھنے پڑھانے کی بات چلتی تو وہ اپنے سگھڑاپے کی تعریف میں جہالت کو کامیاب زندگی کی وجہ بتا کر بڑی بوڑھیوں کو خوب خوب خوش کیا کرتیں۔

"بیاس انگریزی" نوری یہ پڑھتے ہوئے ہنستے ہنستے لوٹ گئی مگر اماں نے اسے اتنے غصّے سے گھورا کہ باقی کی تفصیلات نوری ایک ہی سانس میں پڑھ گئی۔ "گھرانہ نہایت شریف مگر پردے کی پابندی نہیں" اماں نے پریشان ہو کر دور بیٹھی رفو کو دیکھا جو دوپٹے میں لپٹی بیٹھی گڑیا کا لہنگا ٹانکنے میں بالکل محو تھی۔

"تنخواہ معقول اور باپ صاحب جائداد" اماں ڈوبتے ڈوبتے اچانک سطح پر آگئیں۔

اسی شام ہاشمی صاحب اپنے دوست یوسف صاحب سے ملنے گئے جنہیں وہ پچھلے کئی برس سے بھلا چکے تھے۔ ادریس صاحب انہی کے ہمسائے میں رہتے تھے اور بھلا پڑوسیوں سے زیادہ کون سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اماں شام کو ٹہلتے ٹہلتے ہانپنے لگیں مگر لگتا۔ پر بیٹھتی ہی تھیں کہ ذراسی آہٹ پر فوراً اٹھ کھڑی ہوتیں۔ ابا منہ لٹکائے جب کمرے میں داخل ہوئے تو اماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "یا اللہ خیر" اماں بالکل ہولا کر رہ گئی تھیں۔ نوری کو حقہ لیکر آنے کا کہکر ابا آرام کرسی پر دراز ہونے کی کوشش میں جھول کر رہ گئے۔

"کیا ہوا؟ کیسا لڑکا ہے؟ اچھا نہیں۔ کچھ جھوٹ نکلا؟" اماں بے چینی سے سوال پر سوال لئے جا رہی تھیں۔

"میں نہ کہتا تھا یہ مشاطائیں شیطان کی خالائیں ہوتی ہیں۔ ایسی ایسی چکنی چپڑی لگاتی ہیں کہ تم جیسیوں کے بھی کان کتر جاتی ہیں"

ابا نے اماں کو طنز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہائے ہائے ایسی کیا بات ہوگئی جو ایک دم پل پڑے ہو۔ اس بڑھاپے پر بھی تمہاری جوانی کی یہ عادت نہ گئی۔ آخر ہوا کیا؟" اماں بے چین ہو رہی تھیں۔

"میں تو یوسف صاحب سے بات کر کے ہی شرمندہ ہوا۔ اور تو جو کچھ بتایا گیا درست بتایا مگر فرق اتنا پڑا ہے کہ تمہاری اس بی زینا کی آنکھ صرف دو سال دیر بعد کھلی ہے۔ ادریس صاحب پچھلے دو برس سے بیاہے جا چکے ہیں اور اس وقت ایک عدد بچے کے باپ بھی ہیں" دروازے سے لگی ہوئی نوری نے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور حقہ لیکر کمرے میں آگئی۔ اماں لٹ لٹا کر بی زینا کو کوسنے لگیں۔

"اے واہ بہن خوب پاگل سمجھا تھا ہم لوگوں کو" اماں نے دوسری صبح ہی بی زینا کو پکڑ لیا۔ زینا بی اطمینان سے بیٹھی اماں کی تفصیل سنتی رہی۔

"ہاں بی بی میں کب کہتی ہوں کہ اس کی بیوی نہیں۔ اس کی پہلی شادی میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی۔" زینا بی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو پھر کیا ہماری بیٹی کو سوت بنا کر بھیجنے کا ارادہ تھا؟" اماں نے ذرا غصے سے کہا۔

"ہائے توبہ کرو بہن، کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں بھلا ایسی نیک اور سیدھی لڑکی کو کیوں ایسے جنجال میں پھنسانے لگی۔ بات یہ ہے کہ ادریس میاں کی پہلی بیوی پچھلے چھ مہینوں سے تپ دق لگائے بیٹھی ہے۔ اب تو بالکل آخری وقت آن لگا ہے۔ میں نے سوچا تم لوگوں کی تیاری

میں آخر دو چار ماہ تو لگ ہی جائیں گے، اتنے میں بچاری کے دم پورے ہو جائیں گے تو چالیسویں کے فوراً بعد ہی کوئی نہ کوئی رسم کر دیں گے۔ تم جانو بہن، لوگ تو گِدھوں کی طرح منتظر بیٹھے ہیں۔ ایسا اچھا لڑکا اور اتنا ٹھاٹ کا گھرانہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔" زینا بی تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔ اماں اداس اور غمگین ہو کر چھالیہ کترنے لگیں۔

اس واقعے کے بعد مہینوں زینا بی کبھی اِدھر نہ آئی مگر اس کے نہ آنے سے تو خیر کیا ہوتا، یہاں خالاؤں، چچیوں اور پھوپھیوں نے آ آ کر اسقدر ہمدردیاں کیں کہ اماں کے کلیجے پر پھوڑا بنا دیا۔ "جلدی کرو، ہائے جلدی کرو، کیا سوچ رہی ہو!" سنتے سنتے اماں عاجز آ گئی تھیں بشب برات آئی تو زینا بی کے ہاں مٹھائی کا سب سے بڑا تھال بھیجا گیا۔ اور پھر دو چار دن بعد ہی بی زینا مسکراتی ہوئی اماں کے پاس بیٹھی نئے پیغام کی تفصیل بتا رہی تھی۔ اماں نے پانچ کا نوٹ ہاتھ میں تھمایا تو وہ اداس سی ہو کر رُک رُک کر مسلنے لگی۔ بقچی کا ڈھکنا جلدی سے بند کر دیا۔ ایک رقعہ اماں کے ہاتھ میں تھمایا اور جلدی سوچنے کی تاکید کر کے چلی گئی۔

ریلوے افسر کی تفصیلات بالکل درست نکلیں۔ نہایت خوش پوش اور اچھے گھرانے کا لڑکا تھا۔ نیک سیرت اور خوبصورت۔ اماں یہ سب بار بار سننے پر بھی کسی طرح مطمئن نہ ہو رہی تھیں۔ اور مسلسل ابا سے پوچھے جا رہی تھیں۔ گھر میں چہل پہل سی ہو گئی۔ اماں بات بے بات مسکرا دیتیں ابا جلدی جلدی کا غذات کا تھیلا لیکر کلیمٔ کی اپیل کے دن گننے لگتے۔

"شکر ہے تم لوگوں کو کچھ پسند تو آیا" بی زینا نے اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ "اے بہن آخر کچھ مقابلہ بھی تو ہوتا بیٹی کی شادی پر جگ ہنسائی تو نہیں کروانی تھی!" اماں خوشی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

"تو پھر وہ لڑکی کو کب دیکھنے آئیں! ان لوگوں کی طرف سے تو ابھی کوئی سلسلہ نہیں ہے ناں!" بی زینا شوخ شوخ آنکھوں والی نوری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہماری بیٹی میں کون سا کجہ ہے۔ ضرور دیکھیں، جب جی چاہے آکر دیکھیں، مگر بھئی بی زینا اطلاع ذرا پہلے سے دے دینا، سو ہر مرض ہو جاتا ہے۔" اماں نے چاروں طرف بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور میلے کپڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سلائیاں بنتے بنتے اچانک رفو آپا کو الجھے ہوئے بالوں کو ترتیب دینے کا خیال آ گیا اور ساری اُون الجھ کر رہ گئی۔

مہمان آنے سے دو روز پہلے ہی گھر کی صفائی شروع ہو گئی۔ بچاری نوری، رفو آپا کو سسرال بھیجنے کے شوق میں کام کرتے کرتے شل ہو گئی تھی۔ اماں احکام جاری کر کے انہیں بار بار دہرا رہی تھیں۔ فلاں چیز پکے گی، میٹھا وہ خود تیار کریں گی۔ نوری بالکل سامنے نہیں آئے گی خوامخواہ لوگ اس کی چٹی چمڑی پر ریجھ جایا کرتے ہیں۔ رفو کیا پہنے گی؟ ہاتھ کان میں ضرور کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ منے کے ابا ابھی زہرہ کے بندے جا کر لے آئیں۔" نوری یہ سب کچھ مسلسل سنتے سنتے تنگ آ چکی تھی۔ چٹی چمڑی کا طعنہ سنکر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کھال ادھیڑ کر رفو آپا کو بخش دے تاکہ اماں کسی طرح تو اس کی جان چھوڑیں۔

گھر کا نقشہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ خالی خالی الماری میں ہمسائے سے منگوایا ہوا پانچ پیالیوں کا ٹی سیٹ سجا دیا گیا۔ اُجلے اجلے میز پوشوں اور چادروں نے پرانے سے فرنیچر کو یوں چھپا دیا جیسے زرد مدقوق چہرے پر غازہ مل دیا ہو فرش دھو دھو کر آئینے کی طرح چمکانے سے البتہ ایک نقصان ضرور ہوا کہ اکھڑا ہوا سیمنٹ جا بجا نظر آنے لگا اور نوری اسے دیکھ دیکھ کر الجھنے لگی۔ پسینے سے گرد کی تہہ نوری کے چہرے پر بہنے لگی، وہ کھڑی اپنے میلے سے دوپٹے کے ساتھ منہ پونچھتے پونچھتے دیوان خانے کو آخری نظر دیکھ رہی تھی کہ بی زینا کی باتوں کی آواز آئی۔ نوری مہمانوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھی مگر اماں کا حکم اسے فوراً ہی یاد آ گیا اور اپنی چٹی چمڑی کے یاد آتے ہی تو وہ دیوانی ہو کر باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔ رفو آپا ہاتھوں میں صابن لگائے خالی خالی نظروں سے دروازے کی طرف کھڑی گھور رہی تھی۔ نوری کو دیکھتے ہی وہ جلدی جلدی ہاتھ دھونے لگی اور اچھی بھلی ترتیب سے رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔

مہمان خاتون چمکیلے سے لباس میں نوری کو بالکل خالہ بی لگیں۔ "ساری دنیا کی ساس ایک جیسی ہوتی ہے۔ بندوں کو زبان کے ساتھ ہلانا کیا ضروری ہے؟" نوری دروازے کی درازسے لگی مہمان خاتون کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

بات چیت تو سادہ سی تھی مگر بار بار وہ اپنی کوٹھی اور نوکروں کا ذکر ضرور لے آتیں اور اماں نظر بچا کر مٹی کوٹ کی پھٹی اور لٹکتی ہوئی لیس کو چھپانے میں لگ جاتیں۔ رفو آپا نے اس روز اس غضب کا کھانا پکایا کہ ہمیشہ کے نقص میں ایا تک پھڑک اٹھے۔ مل مل کر برتن چمکاتے ہوئے نوری کا جی چاہتا تھا کہ اتنے بہت سے نوکروں والے گھر جانے والی آپا سے یہ آخری خدمت ضرور کروالے مگر آپا کی محویت دیکھ کر نوری ہلکا سا مسکرا پڑی اور زور آزمائی میں مصروف ہوگئی منے بھائی اپنا عید والا نیا جوتا پہنے چڑ چڑ کرتے آجا رہے تھے اور مہمان خاتون کی تفصیلات بتا رہے تھے۔ کھانے کے بعد رفو آپا نے ہلکے پیازی رنگ کی ساری پہنی، نوری نے بڑے پیار سے اس کے بال بنائے اور نہ نہ ہوتے ہوئے بھی زبردستی ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگا دی۔ نوری نے غور سے رفو آپا کو دیکھا تو پل بھر کے لئے واقعی اسے اپنی سفید رنگت سے نفرت سی ہونے لگی۔ سنہرے گندمی رنگ پر ہلکا سا میک اپ کیا غضب ڈھا رہا تھا۔ رفو بھی سجائی یوں نوری کو شرما کر دیکھنے لگی جیسے وہ اس کی نند ہو!

زینا بی آکر بڑے بہلنے سے آپا کو ساتھ لے گئی۔ نوری دروازے کی آڑ میں کھڑی لجائی ہوئی آپا اور مہمان خاتون کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور فیصلے کے تصور سے ہی اسے اپنی منگنی کا خیال آنے لگا۔

"زینا بی کیا چاند سی لڑکی کو تاڑا تھا۔ جی خوش ہوگیا، بہن اور بچیاں بھی ہیں؟" مہمان خاتون نے مسکراتی ہوئی اماں کو چونکا دیا۔

"جی ہاں ایک اور چھوٹی سی بچی ہے، اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے۔" اماں گھبرا کر بولیں۔ نوری کا جی چاہتا تھا کہ جھٹ سے دروازہ کھول کر سامنے چلی جائے۔ ہمیشہ اماں اسے چھوٹی اور گپ باز کہتے ہوئے اسے خوب جلایا کرتی تھیں لیکن آج ان کی ہر بات میں جھوٹ کی کیا بہتات تھی۔ نوری پلٹ کر باورچی خانے میں جا کر سڑیوں پہ ہاتھ صاف کرنے لگی۔

رات گئے تک اماں مہمان خاتون سے باتوں ہی باتوں میں ان کے لڑکے کا ذکر چھیڑ کر کچھ خوش ہونا چاہتی تھیں مگر وہ بڑی صفائی سے بات ٹال جاتیں اور بی زینا فوراً لڑکے کی تعریف میں قصیدے کہنے لگتی۔ "ایسا خوش مزاج بچہ ہے کہ ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دیتا ہے۔" اماں مسکرا کر اپنی سوکھی ہوئی کلائیوں میں طلائی کنگن گھورنے لگیں جو انہیں ناپ میں بہت بڑے تھے مگر زہرہ نے زبردستی پہننے کیلئے بھجوا دئے تھے۔

"لاہور سے گجرات تک خاصا لمبا سفر ہے، آپ یقیناً تھک گئی ہونگی۔ اب آرام کیجئے ناں۔" اماں انہیں سونے والا صاف ستھرا کمرہ دکھلانے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں۔

بی زینا اور مہمان خاتون کو کمرے میں پہنچا کر اماں چمکدار مخملی لحاف کو غور سے دیکھنے لگیں جسے پاکستان میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ صندوق میں سے نکالا گیا تھا۔ کمرے میں فنائل کی ہلکی ہلکی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور مہمان خاتون نتھنے پھلا پھلا کر سونگھنے کی کوشش میں اماں کو پریشان کر رہی تھیں۔ پانی کے جگ کو رومال سے ڈھانپتے ہوئے اماں کسی اور ضرورت پر تکلف نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔

رفو آپا برتن سمیٹنے کے بعد پلنگ پر لیٹ گئی۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان اور آسودگی تھی۔ کروٹ بدلتے ہوئے خواب میں نوری مسکرا پڑی اور منے بھائی نے ٹانگ الجھا کر کمبل لحاف پر سے اتار کر فرش پر گرا دیا۔ آپا گھبرا کر اٹھی اور میلے سے بوسیدہ لحاف کو پھر اچھی طرح کمبل سے چھپا دیا۔

دیر تک اماں کچھ نہ سوچنے کی کوشش میں مسلسل سوچے جا رہی تھیں۔ کبھی رفو دلہن بنی ان سے لپٹ جاتی اور کبھی ہاشمی صاحب پریشان اداس ہاتھ میں فہرست لئے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ چونک کر اماں نے دیکھا تو ابا اطمینان سے سو رہے تھے۔ ان کے حقے کی نے منہ سے نکل کر نتھنوں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اماں ہلکا سا مسکرا پڑیں اور سونے کی کوشش میں خدا جانے کب تک جاگتی رہیں۔

رفو کا گلا خشک ہو رہا تھا مگر اٹھ کر پانی پینے سے وہ سخت گھبرا رہی تھی۔ "خوامخواہ کسی کی آنکھ کھل جائے تو سمجھے شاید میں بہت بے چین ہو رہی ہوں" آپا نے سوئی ہوئی نوری کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ سرما کی ٹھنڈی راتوں میں اتنی شدت کی

پیاس آپا پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے وہ ہولے سے پلنگ سے اٹھی اور دبے پاؤں باورچی خانے میں جا کر پانی انڈیلنے لگی۔ پچھلے کمرے سے بی زینا کی کھسر پھسر رات کے سناٹے میں صاف تو نہیں مگر سنائی ضرور دے رہی تھی۔ آپا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ " میری ہی باتیں کر رہی ہوں گی۔ معلوم نہیں میں انہیں اچھی لگی ہوں یا نہیں۔ اتنے خوبصورت اور قابل آدمی کے مقابلے میں بھلا میں کیا چیز ہوں۔" رفو کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ صحن میں سے گزرتے ہوئے اسے اپنا سایہ دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے چوری کرتے ہوئے موقع پر پکڑ لیا ہو۔ چاند دیوار پھاند کر ٹنڈ منڈ بیری کے پیچھے چھپا دیکھ کر اسے ایکا ایکی منے بھائی کا خیال آیا اور وہ گھبرا کر ایک ہی لمحے میں سارا راستہ طے کر گئی اندر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

" گھرانہ تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔" مہمان خاتون نے ہولے سے کہا۔

" ہاں ہاں بہت شریف لوگ ہیں۔ اب تو آمدنی معمولی سی لگتی ہے مگر کسی زمانے میں اچھے کھاتے پیتے لوگ ہوں گے۔" بی زینا نے اپنی زوردار آواز پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ " لڑکی بھی کچھ بری نہیں۔ تو پھر تم رشتہ طے کیوں نہیں کروا دیتیں؟"

" ارے بہن کیا کروں۔ آجکل تو لوگ ہزاروں لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں اور یہاں وہ سلسلہ نظر نہیں آتا۔" بی زینا کی آواز میں ہمدردی سی تھی۔ " مجھے تو تم نے یہاں لا کر پریشان کر دیا ہے۔ اتنے اچھے لوگوں سے یوں دھوکا کرتے ہوئے تمہارا جی نہیں ڈرتا؟ میرا تو حلق سے نوالہ نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ کل کو میری اپنی کلثوم بھی جوان ہونے والی ہے۔ توبہ ہے زینا، پھر میں تیری باتوں میں کبھی نہ آؤں گی سچ پوچھو تو خوف کے ساتھ مجھے بہت ترس بھی آ رہا تھا۔ اللہ جوان بیٹی کا بوجھ کسی پر نہ ڈالے۔" مہمان خاتون کی آواز بھر آگئی۔

" ارے واہ یہ کیا بات بنی۔ تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔ دس روپے نقد اور جو خاطر تواضع ہو رہی ہے وہ الگ۔ بہو فسادتو بہت کرے گی مگر یہ جوڑا جو تم پہنے ہوئے ہو وہ بھی لے لینا۔ مجھے ایک شادی کے گھر سے ملا تھا۔ رنڈاپے میں بہو بھلا ایسے کپڑے کہاں پہنے گی۔ بعد کی باتوں کی تم بالکل فکر نہ کرو، میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ ہزاروں بہانے پڑے ہیں، کہہ دوں گی لڑکی پڑھی لکھی کم ہے۔ محنت تو سب میری ہے تمہارا کیا ہے رات کی رات گزار لو، اور چلو چھٹی ہوئی۔ لڑکی تو نہ ان کی کنواری رہ جائے گی اور نہ ہمارا روزگار بند ہو جائے گا۔ یہ سب نصیبے کی بات ہے، پھر تم کیوں گھبراؤ؟" صحن میں سے ایک سایہ بھٹکی ہوئی روح کی طرح گزر کر غائب ہو گیا!

★

قدیم ڈھاکہ

(چند جھلکیاں)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا ربطِ باہمی پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ اگر لاہور میں جہانگیر آسودۂ خواب ہے تو اس کی یاد تازہ کرنے والا نام "جہانگیر نگر" جو ڈھاکہ کا پرانا نام ہے، اشارہ کرتا ہے کہ ہماری مشترک ثقافتی میراث اور باہمی اتحاد و یگانگت کی طنابیں قدیم عہد سے ملی ہوئی ہیں، اور وجود پاکستان نے ان رشتوں کو اور بھی مضبوط بنا دیا ہے۔ آج ہم قدیم ڈھاکہ کی جھلکیاں تاریخ و آثار اور ثقافتی میراث کے نمونوں میں ڈھونڈیں تو بڑی مسرت ہوتی ہے اور اپنائیت کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ لاہور اور ڈھاکہ ایک ہی پھل کی دو قاشیں ہیں۔

۱۹ ویں صدی شروع ہوتے ہی مسلم اقتدار کا زوال شروع ہو گیا تھا بنگالہ خاص طور پر اس کی زد میں آیا کیونکہ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل بہت زیادہ ہو گیا تھا بلکہ ملکی بندوبست میں بھی "کمپنی بہادر" نے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اقتدار سلطنت کے کھو جانے پر مسلم ثقافت بھی روبہ انحطاط ہونی تھی۔ "یارانِ وطن" نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا اور انگریزی تعلیم و تمدن سے آشنائی پیدا کر کے مسلمانوں سے کہیں آگے بڑھ چکے تھے۔ مگر خیر، طاقت و اقتدار ابھی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے بالکل ہی نہیں گیا تھا اور اس دور کی بچی کھچی نشانیاں ۱۹ ویں صدی کے ابتدائی دور میں برقرار رہیں۔

ڈھاکہ بنگالہ کا دارالسلطنت رہا تھا اس لئے بڑا بارونق تھا۔ مگر زوال کے ساتھ آبادی بھی کم ہونی شروع ہو گئی۔ ۱۸۳۰ء میں ڈھاکہ کے ایک انگریز جج اور مجسٹریٹ تھے مسٹر ہنبری والٹرز۔ انھوں نے ۱۸۳۰ء میں پورے ڈھاکہ کی مردم شماری کرائی اور ایک بڑی اچھی رپورٹ یادگار چھوڑ گئے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً آبادی کا حال کچھ ایسا تھا: مسلمان ۳۵،۲۳۸ — ہندو ۳۱،۴۲۹ اور غیر ملکی ۳۲۲۔ ان غیر ملکیوں میں شاید وہ فرنگی شامل نہیں ہیں جو شہر میں بہت زمانہ سے بسے ہوئے تھے یا انگریزی پلٹنوں وغیرہ کے گورے یا افسر جو وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے تھے۔ اس مردم شماری سے معلوم ہوا کہ اس وقت ڈھاکہ میں ۱۲۶ ارمنی، ۱۴۴ پرتگالی، ۴۸ یونانی اور ۴ فرانسیسی بھی تھے۔ ۱۸۱۴ء میں ڈھاکہ کے مکانوں کا شمار کیا گیا تھا جن کی تعداد ۲۱،۶۳۱ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں یہ گھٹ کر صرف ۱۰،۷۰۸ رہ گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آبادی گھٹ رہی تھی۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ شہر پھر بھی بڑا تھا۔ چنانچہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "ڈھاکہ اپنی پرانی عظمت کھو چکا ہے، پھر بھی ہم اسے درجۂ دوم کے بڑے شہروں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس کی آبادی اب بھی ڈیون پورٹ اور برسلز سے زیادہ ہے اور پوری آبادی فائف کے ضلع کے برابر۔۔۔"

۱۸۳۰ء میں یہاں دس تھانے تھے جن کے ماتحت ۱۸۷ محلے تھے۔ مسلمانوں کی غالب آبادی گرد قلعہ، بیجیت پور اور پورب دروازہ کی طرف تھی یا پھر ڈھاکہ کے شمالی علاقے میں۔ ہندو زیادہ تر املی گولہ، نرائن دیا، شرافت گنج اور اسلام پورہ میں تھی۔ باقی شہر میں ہندو مسلم آبادی ملی جلی تھی۔

والٹرز کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ڈھاکہ میں مرد زیادہ اور عورتیں کم ہیں یعنی مرد ۳۷،۴۲۲ اور عورتیں ۲۹،۲۴۵ تھیں۔ مگر یہ تعجب بیکار ہے پردہ کی وجہ سے مستورات کی صحیح مردم شماری اس وقت ممکن نہ ہو سکی ہوگی۔ بہرحال عورتوں کی زندگی یا تو صحن خانہ میں گزرتی یا کم حیثیت لوگوں میں یہ روزی کمانے میں مردوں کا ہاتھ بٹاتیں۔ ہندو عورتیں جینو کا دھاگہ بٹنے، ٹوکریاں بننے وغیرہ کا کام کرتیں اور مسلمان ٹوپیاں، جامدانیاں، کرتے وغیرہ کاڑھنے میں مصروف نظر آتیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس وقت ڈھاکہ میں چند سو گانے بجانے والی عورتیں بھی تھیں، جن میں ۵۲۶ ہندو اور ۲۰۲ مسلمان تھیں۔ ہندوؤں کی نیچ ذات عورتیں دکانوں پر بھی بیٹھتی تھیں اور طرح طرح کے سودے بیچتی تھیں۔ خاص طور پر سبزی اور تیل۔ دھوبنیں تو خیر ہوتی ہی تھیں غرض اس طرح عورتیں بہت سے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

مسلمانوں کی رواداری مشہور ہے مسلم سلطنت کے زمانہ میں ان کا ہندو رعایا کے ساتھ جو سلوک تھا اس کے بے شمار ثبوت موجود ہیں۔ دور کیوں

جائیے قدیم مندروں کو ہی دیکھ لیجئے جو ویسے کے ویسے موجود ہیں۔ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی میں تعمیر شدہ ڈھاکیشری کا مندر اس کا بین ثبوت ہے۔ حد یہ کہ سکھوں تک کے تین گوردوارے خاص ڈھاکہ میں موجود تھے جو "نانک پنتھیوں" کے مندر کہلاتے تھے۔ ایک گوردوارہ شجاعت پور میں تھا۔ نواب عبدالغنی بہادر کے بنائے ہوئے "شاہ باغ" کے عین پائیں میں۔ دوسرا جعفرآباد میں تھا، جو آج کل دھان منڈی کے علاقے میں ہے۔ تیسرا گوردوارہ "سکھ سنگت" کہلاتا تھا اور سنگت ٹولہ گلی میں واقع تھا۔

مسلمان چونکہ کثرت سے تھے اور سلطنت کے وارث بھی وہی تھے اس لئے ان کی زندگی کی جھلکیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ بنابریں مسلمانوں کے آثار و معابد کی بھی کثرت تھی۔ اسی لئے ڈھاکہ کو "سات سو مساجد کا شہر" کہا جاتا ہے۔ درگاہیں اور اوقاف بھی یہاں بہت کافی ہیں۔ مذہبی عمارتوں میں "حسینی دالان" یعنی امام باڑہ ڈھاکہ کی خاص تعمیر ہے جو ۱۶۴۲ء میں میر مراد نے بنوایا تھا۔ اس کی دیوار کے پاس نوابینِ ڈھاکہ اور ان کے اہلِ خاندان کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ چوک بازار میں شائستہ خاں کی بنوائی ہوئی مسجد (۱۶۷۶ء) بھی بہت مشہور تھی۔ لال باغ میں بھی ایک بہت بڑی مسجد تھی جو مدت تک ناتمام ہی رہی۔ بڑی مساجد میں چوڑی حاطے کی مسجد جو ۱۶۴۹ء کی بنی ہوئی ہے، کافی کشادہ اور بڑی تھی۔ پولو گراؤنڈ کے اُس طرف ڈھو کو صاحب کی مسجد بھی مشہور تھی۔ ۱۸۶۰ء تک اس میں ایک اللہ والے بزرگ جو صاحبِ کرامت مشہور تھے، دیکھے گئے۔ مساجد کے علاوہ شہر کی ایک بڑی عید گاہ بھی تھی جو فیل خانہ سے ذرا آگے تھی اور ۱۶۴۰ء میں بنی تھی۔ شاہ مبارک کا مقبرہ (۶۴۲ھ = ۱۲۴۶ء) بھی آماجگاہ عوام تھا۔ یہ بزرگ شاہ جلالؒ سلہٹی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ——— یہ عمارت اب بھی "ایڈن" بلڈنگ کے نزدیک موجود ہے اور اس پر ایک گنبد بھی بنا ہوا ہے جسے نواب سلیم اللہ خاں نے ۱۹۰۹ء میں بنوایا تھا آج کل جہاں ہائی کورٹ بلڈنگ بنی ہوئی ہے اس کے نزدیک حضرت چشتی بہشتی کا مزار تھا۔

جہاں زندگی ہے وہاں زندگی کے ہنگامے بھی ہیں۔ چنانچہ میلہ ٹھیلہ اور تفریح پسندی کے اعتبار سے بھی ڈھاکہ والے مشہور ہیں۔ جس طرح لاہور میں چراغاں کا میلہ اور دوسرے بڑے بڑے میلے ہوتے رہتے ہیں، ڈھاکہ والے بھی اس طرح کے میلے منانے کے بڑے شوقین تھے۔ تقریبات کے سلسلے میں عید اور محرم خاص طور پر منائے جاتے تھے۔ پانچویں محرم سے جلوس نکلنے شروع ہو جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اکھاڑوں کا وہی اہتمام ہوتا تھا جو کراچی، ملتان، لاہور وغیرہ میں آج کل دکھائی دیتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے استاد گتکا، پھیری، تلوار، بنوٹ، لکڑی وغیرہ کے کرتب اسی طرح دکھایا کرتے تھے جیسے محرم کے جلوسوں میں شمالی ہند و پاکستان کے موجودہ علاقوں میں اب بھی دکھائے جاتے ہیں، ان جلوسوں میں عقیدت مند ہندو بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ عید کو خاص طور پر منایا جاتا تھا۔ اور بوڑھی گنگا میں رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجے ہوئے بجروں اور کشتیوں کی دوڑ بھی ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد سے ان اجتماعات میں اور بھی رونق ہونے لگی ہے۔

اگر جنم اشٹمی اور درگا پوجا کے تہواروں کی ایک طرف رونق تھی تو دوسری طرف محرم اور عید کے اجتماعات تھے۔

تکلف اور نفاست پسندی کے باب میں بھی ڈھاکہ کے لوگ بڑھے ہوئے تھے۔ مسلم ثقافت کی مخصوص جھلکیاں، جن میں رمضان کی گہما گہمی اور اہتمام افطار و سحر خاص طور پر نمایاں ہیں، جس طرح شمالی ہند کے مسلمانوں میں نظر آتی تھیں اسی طرح ڈھاکہ والے بھی ان پر فخر کر سکتے ہیں۔ رمضان آنے سے پہلے ہی اہتمام شروع ہو جاتے تھے اگر مغربی پاکستان کے لوگ شربت اور لسی کے زیادہ شوقین ہیں تو ڈھاکہ والے بھی رمضان میں طرح طرح کے شربت اور ٹھنڈائیاں تیار کرنے میں قدیم سے مہارت رکھتے ہیں۔ گھروں میں تخم ریحاں، کیوڑہ وغیرہ ڈال کر شربت بنائے جاتے تھے۔ افطار سے عین قبل گھر والیاں صراحیاں ٹھنڈی کرنے کے لئے رکھ دیتیں۔ مرد حقہ تازہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ گویا حقہ بھی دونوں جگہوں اسی طرح مقبول ہے۔ گھروں میں طرح طرح کے کھانے حسب توفیق پکوائے جاتے۔ سحری کے وقت جگانے کے لئے لڑکوں کی پارٹیاں گاتی بجاتی آتیں، نعتیں پڑھتیں اور لوگوں کو سحری کے لئے اٹھاتیں جس طرح لاہور، ملتان، پشاور وغیرہ میں لوگ افطار کا اہتمام کرتے، مساجد میں جاکر روزہ کھولتے، غربا کا روزہ کھلواتے ہیں۔ اسی طرح ڈھاکہ والے بھی مسجدوں میں جلد جلد پہنچ جاتے، کشتیوں میں افطاری لگ کر آتی رہتی اور سب مل کر افطار کرتے۔

یہاں کے ہندوؤں کا لباس وہی تھا جو بنگال کے دوسرے علاقوں کا۔ مسلمانوں کا لباس وہی تھا جو شمالی ہند کے مسلم شرفا کا عام لباس تھا۔ ہندو عورتیں سوتی ساڑھی باندھتیں۔ مرد سر پہ ٹوپی نہ پہنتے سوائے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں یا راجوں اور بڑے زمینداروں کے، ہاں مسلمانوں میں ٹوپی

کا رواج عام تھا۔ اگر مغربی پاکستان میں پگڑی طرح طرح سے باندھی جاتی ہے تو ڈھاکہ والے بھی شرعی احترام میں صافہ باندھنا سنت سمجھتے ورنہ قسم قسم کی ٹوپیوں سے سر کو ڈھانکتے تاکہ نماز کے وقت دقت نہ ہو۔ مسلم آبادی میں اچکن عام تھی۔ قبا اور صدری کا بھی رواج شرافت و نجابت کی دلیل سمجھی جاتی۔ ڈھاکہ میں ایسی ایسی عمدہ پگڑیاں بنتیں اور ان پر ایسی کشیدہ کاری ہوتی کہ عرب و ترکستان تک ان کی مانگ تھی۔ مخملی یا سوتی گول وضع کی ٹوپی ہمہ وقت پہنی جاتی۔ یہاں بھی ان ٹوپیوں کو "چوگوشیہ" اور "پنج گوشیہ" ہی کہتے ہیں۔ نہایت باریک ململ کی "کشتی ٹوپی" تو گویا ہمہ شما کے استعمال میں رہتی۔

اونچے طبقہ کی مسلم خواتین کرتا پاجامہ اور غرارہ پہنتیں پشواز کا بھی چلن تھا۔ ساڑھی زیادہ نہ برتی جاتی تھی۔ یہ بعد کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ ڈھاکہ کی مشہور صنعتیں جیسے ململ، جامدانی، آب رواں، شبنم، کشیدہ اور گلبدن کے ملبوسات مسلمان عورتوں میں زیادہ مقبول تھے۔

جس طرح شمالی ہند کے مسلمان نفیس کھانوں کے شائق ہیں اور انھوں نے کھانے کی چیزوں میں طرح طرح کی اختراعات کی ہیں اسی طرح ڈھاکہ کے لوگ بھی خوش خوراکی کے رسیا تھے۔ چاول، طرح طرح کی روٹیاں، جیسے لاہور اور پشاور وغیرہ میں پکتی ہیں انھیں پٹھان، ترک اور ایرانی آباد کار بنگال تک لے گئے۔ خمیری روٹی کو نان یا تنوری روٹی ہی کہا جاتا ہے۔ کلکتہ کو چھوڑ کر یہ روٹی بس صرف ڈھاکہ میں پکتی تھی۔ "شیرمال" مغلوں کی ایجاد تھی اور اس کی ایک معمولی شکل جو کم استطاعت لوگوں میں مرغوب تھی "ٹپو" کہلاتی تھی۔ "باقرخانی" بھی ڈھاکہ والے خوب بناتے تھے اور پھر ایسی عمدہ بنانے والے وہاں پیدا ہو گئے کہ یہ روٹیاں شمالی ہند تک سوغات میں جانے لگیں یہ شیرمال کی طرح سخت اور ملائم دونوں قسموں کی بنتی تھیں۔ ان روٹیوں پر ڈھاکہ کا مشہور پنیر بھی چڑھا جاتا تھا۔ پنیر تل کر بھی کھانے کا یہاں عام رواج تھا سالنوں میں قورمہ، قلیہ عام پکتے تھے، کوفتے اور کباب بھی اچھے بنتے تھے۔ ڈھاکہ والے چپاتی سے زیادہ واقف نہیں ہوئے۔ سنا ہے نوابین ڈھاکہ میں سے کسی نے ۱۹۰۴ء میں ایک چپاتی پکانے والا بنارس سے بلوایا تھا۔ مگر چپاتی کی کسر پراٹھے نے پوری کر دی تھی۔ ڈھاکہ والے قدیم سے بہت باریک اور سات سات آٹھ آٹھ پرت کے نہایت نفیس پراٹھے بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لاہور کے کلچوں کی طرح یہ بھی صبح ناشتے میں بہت مقبول و مرغوب تھے۔ دور دوران پراٹھوں کی مانگ تھی۔

پلاؤ یہاں بھی اچھے اچھے پکائے جاتے۔ ماہی پلاؤ اور مرغ پلاؤ عمدہ بنتے۔ ملسا مچھلی، روہو مچھلی وغیرہ کے پلاؤ بہت عمدہ پکاتے تھے۔ خاصہ پلاؤ اور طاہری پلاؤ کو بھی لوگ پسند کرتے تھے۔ عوام پسند کھچڑی تو خیر آئے دن پکتی رہتی۔ تورہ بندی کا رواج مغلوں کے ساتھ یہاں بھی پہنچا۔ ڈھاکہ کے خوش حال گھرانوں میں جب شادی ہوتی تو تورہ بندی کا عام رواج تھا۔ اس میں پلاؤ، کباب اور نانخورش یعنی سالن مثلاً قلیہ، قورمہ یا کوفتے ضرور ہوتے۔ انھیں بڑے بڑے خوبصورت خوانچوں میں سجا کر عزیزوں کے ہاں بھیجا جاتا۔ امارت کے ساتھ ثقافت بھی زوال میں آگئی اور اب لوگ اس نام تک کو بھول گئے، تورہ بندی کرنے کا کسے حوصلہ؟

پان سارے مشرقی پاکستان میں بکثرت ہوتا ہے اور پورے برصغیر میں پاکستان کا یہ خطہ اپنے پانوں کی اقسام کے لئے مشہور ہے۔ ڈھاکہ میں لوگ پان کے بہت شوقین رہے ہیں۔ ساچی یا میٹھا پان زیادہ چلتا تھا اور اب بھی چلتا ہے۔ پان کی گلوریوں کو "کھی لی" کہتے ہیں۔ پان کی "کھی لی" بنانا اور پیش کرنا مسلم خواتین کے سلیقہ اور خوش ذوقی کی علامت مانا جاتا تھا اور ان کی معاشرتی حیثیت زیادہ تر اسی سے جانچی جاتی تھی۔

مرفہ الحال مسلمان یا تو نوابین ڈھاکہ سے منسلک تھے یا خود بڑے تاجر اور زمیندار تھے۔ آخری نواب ڈھاکہ، نواب غازی الدین تھے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر مسلمان فائز تھے مگر بعض شعبے، خاص کر انتظامی اور حسابی کارخانے ہندو منشیوں اور متصدیوں کے رحم و کرم پر تھے۔

ڈھاکہ کی ململ ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ہر سال یہاں کے کاریگروں کو پچیس پچیس لاکھ روپے پیشگی وصول ہو جاتے تھے۔ یہاں کے ململ بنانے والوں سے زیادہ وہ "تانتی" مشہور تھے جو آنکھ سے نہ دکھائی دینے والا ڈورا ان ململوں کے لئے بناتے تھے۔

مسلمانوں کی تعلیم مکتبوں اور مدرسوں میں ہوتی تھی اور مسلمانوں میں تعلیم کا عام رواج تھا۔ ہندو پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۶۰ء تک انگریزی وضع کے صرف تین اسکول ڈھاکہ میں تھے اور یونیورسٹی کی قسم کی کوئی چیز اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ نئی تعلیم کی سب سے پرانی درسگاہ "ڈھاکہ کالج" تھا جو ۱۸۴۱ء میں قائم ہوا۔

مری کے سائے میں

قدیر نعیمی

راولپنڈی کے قریب بلند پہاڑوں کے دامن میں ہرا بھرا، سبزے سے لہلہاتا پوٹھوار کا دیس ہے۔ یہاں جب مکئی پھولتی ہے تو دور دور تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑوں سے آنے والی خنک ہوا جب اس کی سنہری سنہری بالیوں کو گدگداتی چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سبزہ زاروں کی شہزادیاں اپنے سنہرے بالوں کو سکھا رہی ہوں۔ ایسے میں اس دیس کی الہڑ دوشیزائیں کبھی چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں، کبھی شیشم کے درختوں پر جھولے ڈالے جاتے ہیں اور مینہ کی رم جھم پر لوک گیتوں کی مٹھاس فضا کو رومانوی بنا دیتی ہے۔ اور کبھی کہیں دور چرواہا کسی چشمے کے کنارے، درخت کی جڑ سے ٹیک لگا کر، بانسری پر سُریلی تان بجاتا ہے تو کسی کی شرمیلی

آنکھیں بار حیا سے اور جھک جاتی ہیں، گالوں پر گلال بکھر جاتا ہے، چُنری ڈھلک جاتی ہے، دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، اور لب کچھ کہنے کے لئے کپکپا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ اس دیس کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں۔

اس دیس میں صدیوں سے رومان پلتے آئے ہیں۔ آبادیاں بستی رہی ہیں، اجڑتی رہی ہیں، راج پاٹ قائم ہوئے اور یہیں کے
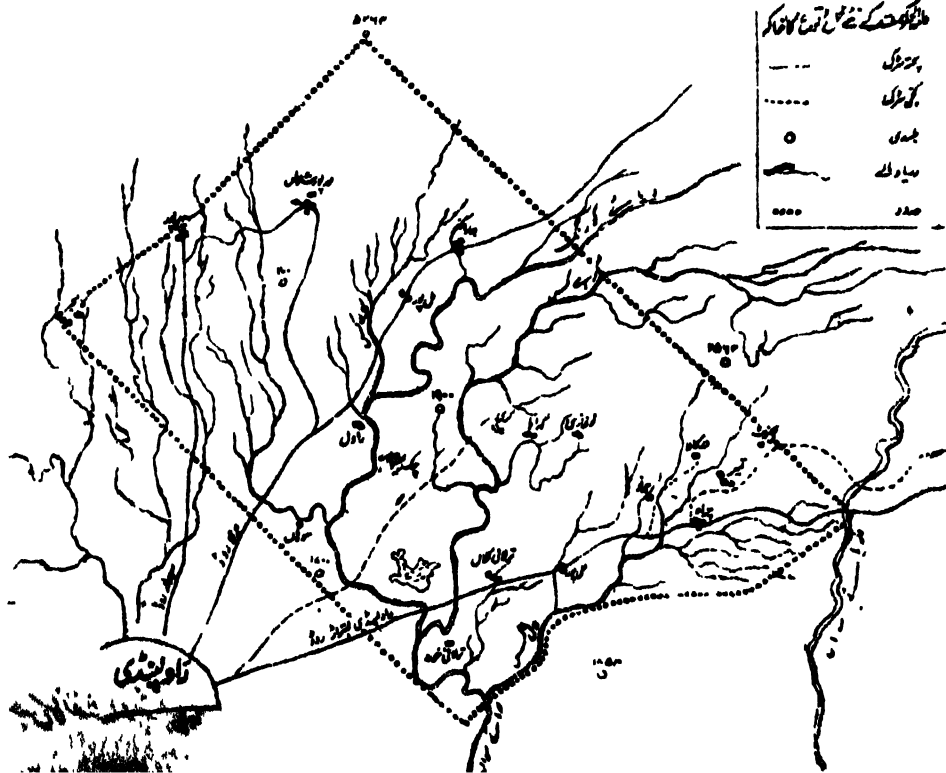
کے مٹے مٹے خدوخال ابھر آتے ہیں۔ ٹیکسلا کا علاقہ قبل از تاریخ دور کی انتظامیہ اور سیاحیانہ اہمیت کی مبہم سی یاد دلاتا ہے۔

وسط ایشیا سے سرزمین ہند میں آنے والے سیاحوں، تجارتی قافلوں اور حملہ آوروں کا صدیوں یہی راستہ رہا ہے جس پر ٹیکسلا واقع تھا۔ پھر اس کے قریب ہی راولپنڈی آباد ہوا۔ وسط ایشیا سے ہند و پاک میں آنے کے لئے شمال مغربی پہاڑی سرحدوں کی وجہ سے آنے والے کو مختلف قدرتی دروں سے گزرنا پڑتا تھا چنانچہ کابل سے جلال آباد اور جلال آباد سے خیبر، ٹیکسلا، راولپنڈی، سیالکوٹ، لاہور اور پھر دہلی۔ یہی راستہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا رہا۔ موجودہ گرینڈ ٹرنک روڈ تقریباً ان ہی مقامات سے گزرتی ہے۔ اس شاہراہ عظیم کے متعلق تاریخی ثبوت اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بہت پہلے چندر گپت موریا کا پشاور سے پٹنہ تک شاہی راستہ تھا جسے بعد میں شیر شاہ سوری نے کلکتہ تک بڑھا کر از سر نو تعمیر کرایا اور سڑک کے دو رویہ سایہ دار درخت لگوا کر اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرائیں بنوا کر مکمل کیا۔ یہ راستہ کچھ اس لئے بھی اہم ہے کہ مغربی علاقے میں یہ سب شوالک حصہ سے ملا ہوا ہے جہاں دریا آسانی سے عبور کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس راستہ پر ٹیکسلا اور راولپنڈی اپنے علاقے کے قدیم اور اہم مقامات ہیں۔

اگرچہ یہ سرزمین اپنی ہزار سالہ تاریخ کی وسیع آغوش میں چار مختلف تہذیبوں کو سمیٹ کر خاموش ہے لیکن کہیں کہیں مختلف قسم کی بود و باش کے نشان اور کھنڈروں کی ہیئت چار بار اجڑنے اور بسنے کے افسانے سناتی دکھائی دیتی ہے۔ ٹیکسلا کی عمارتوں اور آبادیوں کے وہ ٹوٹے پھوٹے نقش اور دیواریں انقلاب زمانہ کی نوحہ خواں ہیں۔ یونانی، بدھ مت اور کئی دیگر تہذیبوں کے مٹے مٹے نشان اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ علاقہ اپنے ادوار میں ہمیشہ مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ راولپنڈی سے تقریباً ۱۴ میل جنوب میں مانکیالا اس علاقہ میں ایک اور قدیم مقام ہے۔ بدھ مت کی روایات اور کچھ کھنڈروں کی ساخت کی بنا پر اسے بھی بدھ مت کے عہد سے متعلق کیا جاتا ہے۔

راولپنڈی بذات خود ایک قدیم مقام ہے۔ ایک مشہور و معروف ماہر آثار قدیمہ اے کننگھم اس کو قبل مسیح کے ایک بھٹی قبیلے کی جائے رہائش بتاتے ہیں۔ جب اس کا نام گاجی پور یا گاجنی پور تھا۔ کسی طرح یہ محمود غزنوی کے قبضہ میں آیا اور کچھ عرصہ بعد پھر اس نے گکھڑ قبیلے کو عطا کردیا۔ گکھڑ قبیلے کے ایک سردار جھنڈا نے اس کا نیا نام راولپنڈی رکھا۔ یہ نام راول سے متعلق ہے۔ راول راولپنڈی سے شمال میں چند میل کے فاصلے پر کسی زمانے میں اپنے وقت کی بہت خوشحال بستی تھی جو کہ اب بھی پنڈی مری روڈ پر واقع ہے ۱۷۶۵ء کے بعد سردار ملکا سنگھ کے زمانے میں راولپنڈی شاہراہ ترقی پر گامزن تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد ۱۸۴۹ء میں یہ اپنے ہی نام کے ڈویژن کا صدر مقام قرار پایا اور پھر اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی بڑی چھاؤنی میں شمار ہونے لگا۔

قدرت انسان کو بہت سی ممکنات عطا کرتی ہے اور انسان اشرف المخلوقات اور عالم و عاقل ہونے کے سبب بہترین شے، بہترین جگہ اور بہترین حل چن لیتا ہے۔ انسان کی بالغ نظری اپنی ضروریات کے مطابق حالات کو تبدیل کرلیتی ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا مزید تصدیق کرتا ہے کہ جاندار پہلے خود کو ماحول کے مطابق ڈھالتا ہے، پھر ضرورت کے تحت حالات کو بھی تبدیل کرلینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ انسان چونکہ سب سے ذہین واقع ہوا ہے اس لئے وہ یہ کام اور بھی زیادہ خوش اسلوبی اور مہارت سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ فیصلہ کہ حکومت کا نیا مرکز راولپنڈی کے قریبی علاقے میں بنایا جائے کچھ تو اپنی جگہ پر کشش ہے اور کچھ اس خوشگوار فضا کی بنا پر جس کا نقشہ اوپر پیش کیا گیا ہے یہ اس بات کی بھی یاد دلاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ راولپنڈی اور ٹیکسلا کا علاقہ ایک مدت تک اس سرزمین میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے مگر گردش افلاک نے مدتوں اسے ماضی کی داستان پارینہ بنائے رکھا اور اب ایک طویل عرصہ کے بعد ملک کا مرکز اسی تاریخی علاقے کی طرف منتقل ہو رہا ہے جہاں کی آب و گل تہذیبوں کی جنم داتا رہی ہے۔

نئے وفاقی دارالحکومت کا رقبہ تقریباً دو سو مربع میل ہے اور سرحدی مقامات کو سیدھی لکیروں سے ملانے پر علاقے کی شکل بگڑے ہوئے متوازی العمود کی طرح بنتی ہے۔ انتہائی بلندی ۴۲۶۵ فٹ اگر ہم راولپنڈی سے ہتر اڑ جائیں تو ہمارے داہنی طرف تالہ ملال کس حد بناتا ہوا چلتا ہے، پھر کچھ دور اوپر دریائے سواں حد بندی کرتا ہوا مجوزہ علاقے کے جنوب مشرق میں ہتر اڑ روڈ کے نیچے

سے گزرتا ہے۔ شمال مغربی سمت میں موضع کانجر بھی اس علاقے کی حد ہے۔ کانجر سے نور پور اور سید پور سے ہوتی ہوئی یہ سرحد علاقے کے انتہائی بلند مقام یعنی ۵۲۶۴ فٹ پر جا ملتی ہے۔ راولپنڈی روڈ اس علاقے کے تقریباً درمیان سے گزرتی ہے۔

مستقر دارالحکومت کا یہ محل وقوع مختلف قسم کی ٹوٹی پھوٹی اور نیم کوہستانی زمین پر مشتمل ہے۔ ضلع راولپنڈی میں یہ نیم کوہستانی پوٹھوار کا علاقہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ (ا) کہا — یہ علاقہ کہیں مری کی زیریں پہاڑیوں کے درمیان اور کہیں اُن سے مل کر چلتا ہے۔ اس علاقے میں بارش کافی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں قدرتی چشموں کی افراط ہے۔ (ب) کانڈھی — یہ علاقہ راولپنڈی سے کہوٹے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصہ میں جا بجا کم سخت ریتلے پتھر (SOFT SAND STONE) کی پہاڑیاں ہیں۔ راولپنڈی کے قریب علاقے کے مغربی حصہ میں نہایت زرخیز اور عمدہ میدان ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی پہاڑیاں بھی ہیں اور شمال کی طرف کوہ مری کی کچھ چٹانیں ویسے لگتی ہیں جیسے وہ سبزہ زاروں کے نظارے کے لئے زمین میں سے سر نکال کر جھانک رہی ہوں۔ یہ حصہ شروع سے آخر تک نہایت سرسبز اور ہموار وادیوں پر مشتمل ہے اور یہ خانہ بدوشوں کے بے ترتیب خیموں کی طرح وہاں بادامی مخروطی پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا ہے۔

راولپنڈی اور پہاڑوں کے درمیانی علاقے میں مری روڈ اور لہتراڑ روڈ کے درمیان کا حصہ مقابلتاً زیادہ ہموار ہے۔ اس میدان کے مشرق میں مری کی زیریں پہاڑیاں اور کہوٹے کے پہاڑوں کے جنوب میں پتھریلی پہاڑیاں پوٹھوار کے اس علاقے کو وادیوں اور ریتلی مٹی کی سطح مرتفع میں تقسیم کرتی ہیں۔ راولپنڈی کے جنوبی علاقے میں دریا اور نالے عجیب شان سے لہراتے بل کھاتے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگرچہ اس سارے علاقے کا بیشتر حصہ اونچی نیچی زمین اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل ہے لیکن تعمیر کے وقت انسان کی ذہانت یقیناً ان قدرتی حالات سے فائدہ اٹھا کر حد درجہ خوشگوار اور خوبصورت شہری مناظر پیدا کر سکتی ہے۔

دارالحکومت کا یہ نیا محل وقوع سطح مرتفع پوٹھوار کے شمال مشرقی حدود تک اور کوہ مری کی جنوبی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ اس متوازی العمود کی شمالی اور مغربی حدیں پہاڑی ہیں۔ زمین تقریباً جنوب سے شمال کی طرف ۱۷۰۰ فٹ سے ۵۲۶۴ فٹ تک بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ اس علاقے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے برساتی نالے بھی موجود ہیں جن کی ڈھلوان گہرائی عموماً سطح زمین سے ۲۰ سے ۴۰ فٹ تک ہے۔ شمال مغربی حصہ میں فی الحال دو پختہ سڑکیں ہیں۔ ایک راولپنڈی سے سید پور دوسری نور پور شاہاں سے چلتی ہے جو مری روڈ پر راول کے قریب آکر مل جاتی ہے۔ نور پور شاہاں اور سید پور کو بھی ایک پختہ سڑک ملاتی ہے۔ مجوزہ علاقے کے شمال مشرق میں متعدد دریائی وادیاں اور پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جن کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف ہے اس حصہ کی زمین کا ڈھال جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف ہے اور زمین کی بلندی ۱۷۰۰ فٹ سے ۲۰۰۰ فٹ کے اوپر تک چلی گئی ہے۔

وفاقی دارالحکومت کے اس علاقے کا ایک تہائی جنوبی حصہ غیر ہموار ہے جس میں کہیں کہیں کٹی پھٹی زمین شامل ہے۔ سب سے وسیع اور ہموار میدان راولپنڈی کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ دریاؤں، نالوں اور چشموں کے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں۔ بیشتر دیہاتی اسی پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بعض زمینیں بارانی ہیں۔ گیہوں، مکئی، باجرہ، چری اور جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ اور بستیوں کے علاوہ کھنہ، ترلائی کلاں، سہالہ، ڈھوک حیات، علی پور اور چراہ کی بستیاں اس علاقے میں قابل ذکر ہیں۔ یہ علاقہ تقریباً شمال سے جنوب کی طرف کچھ ڈھلوان ہوتا چلا گیا ہے۔ جبا کھیل نامی گاؤں کے جنوب مغرب کی طرف اس وسیع میدان کے تھوڑے سے حصہ میں دلدلی زمین بھی ہے۔ فی الحال اس حصہ میں ایک پختہ سڑک ہے جو راولپنڈی سے لہتراڑ جاتی ہے دوسری چراہ سے کرور کو جانے والی سڑک زیر تعمیر ہے۔

اس پورے علاقے کے زیادہ تر دریا اور نالے سلسلۂ سواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نالہ گرہ کس، دریائے کورنگ اور نالہ ملال کس سواں سے نکل کر راولپنڈی کے جنوب مشرق میں آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور بحیثیت ایک دریا کورنگ کے نام سے بہتے ہیں۔ ڈھوک ککڑال کے قریب نالہ گرہ کس کورنگ دریا سے مل جاتا ہے اور پھر کچھ دور بہنے کے بعد ملال کس بھی اس سے آملتا ہے۔

راولپنڈی کے شمال مغرب میں سید پور، نور پور شاہاں، راول، مل پور اور بارہ کہو قابل ذکر گاؤں ہیں۔ سید پور کی آبادی کے بالکل پشت پر پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو نور پور سے ہوتا ہوا آگے چلا گیا ہے۔ اس پہاڑ سے قدرتی چشمے نکل کر نور پور اور سید پور کی آبادیوں کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ یہ علاقہ نہایت خوشنما اور سرسبز ہے۔ سال میں ایک بار نور پور میں بیحد رونق ہوتی ہے جب بری شاہ امام کا عرس اور میلہ لگتا ہے تو چاروں

طرف سے خلقت کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔

مری روڈ سے شمال کی طرف ایک چھوٹی سی بستی راول ہے جس کے نزدیک نالہ کلاپو کس دریائے کورنگ سے جاملتا ہے اور پھر ایک مصنوعی آبشار کی شکل میں گر کر پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر دور تک بل کھاتا چلا جاتا ہے۔ راول ڈیم اسی دریائے کورنگ پر مری روڈ سے نزدیک شمال کی جانب زیر تعمیر ہے۔ اس پر تقریباً ۳۴۵ لاکھ روپیہ خرچ آئے گا۔ مکمل ہونے کے بعد پچاس ہزار ایکڑ فٹ پانی جمع رہا کرے گا جو راولپنڈی اور وفاقی دارالحکومت کی ضروریات کے لئے کافی ہوگا۔ مرکز کے نئے محلِ وقوع میں زمین دوز پانی بھی بہ آسانی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال تو اس علاقے میں زیادہ کنوئیں نہیں ہیں لیکن پانی کا دباؤ کافی ہے، اس لئے ضروریات کے تحت بہ آسانی پانی مہیا ہو سکتا ہے۔ کھنتہ کے قدرتی چشموں کے پانی کو صرف ایک کنٹرول کرنے والے بڑے پائپ کی ضرورت ہے۔ علاوہ بریں پہاڑوں کے زیریں حصہ میں ایسے بہت سے چشمے ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس محلِ وقوع کی آب و ہوا سونے پر سہاگہ ہے۔ سردی کا موسم آسانی سے قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ موسم گرما بھی شدید نہیں ہوتا۔ راولپنڈی میں اکتوبر سے مارچ تک حرارت کم ہوتی ہے اور اپریل سے جون تک بڑھتی ہے۔ جون سب سے گرم مہینہ ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۱۰۳٫۵ اور کم سے کم ۵ء۷۵ درجے ہوتا ہے۔ ستمبر تک گرمی کا موسم رہتا ہے، اس کے بعد موسم نہایت خوشگوار ہونے لگتا ہے۔ راولپنڈی میں اوسطاً سالانہ بارش ۳۶٫۷۳ انچ ہوتی ہے جبکہ لاہور میں ۱۹٫۲۱ انچ ہوتی ہے۔ لاہور کے مقابلہ میں بارش کے دنوں کی تعداد اور ابر آلود فضا راولپنڈی میں زیادہ رہتی ہے۔ راولپنڈی میں سردی کے موسم میں بھی بارش کافی ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں اگست اور سردی کے موسم میں جنوری سال کے سب سے زیادہ بارشوں کے مہینے ہیں۔ اسی طرح راولپنڈی سے مری کی طرف بارش میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کی سالانہ بارش کا اوسط ۵۹٫۳۶ انچ ہے۔

غرض جغرافیائی حالات اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے مجوزہ علاقہ وفاقی دارالحکومت کے لئے مناسب ترین جگہ ہے۔ دفاعی لحاظ سے بھی یہ علاقہ کراچی سے بہتر ہے۔ اور پھر یہ امر مسلم ہے کہ کراچی کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی نے کراچی میں کئی سوشل خرابیاں پیدا کر دی تھیں جن کی وجہ سے ہمارے معاشرہ کے مختلف طبقوں پر غلط قسم کے اثرات پڑ رہے تھے۔ اس سے پیشتر دو حکومتیں بھی تبدیلیٔ مرکز پر غور و خوض کرتی رہی ہیں چنانچہ اس وقت بھی موجودہ وفاقی علاقے میں یا کہیں نزدیک نیا مرکز تعمیر ہونے کے امکانات تھے۔ سیکرٹیریٹ، پارلیمنٹ ہاؤس اور دیگر کئی عمارتوں پر ابھی خطیر رقم خرچ کرنا باقی تھی، کیوں نہ یہ سب اخراجات مرکز کی تعمیرِ نو پر صرف ہوں۔

مجوزہ علاقہ بہت جلد ایک حسین اور مثالی شہر میں تبدیل ہونے والا ہے۔ وہ تصویریں جو آجکل چھپ رہی ہیں آئندہ تاریخی حیثیت اختیار کر لیں گی۔ ان وادیوں اور پہاڑوں پر کیا کیا عمارتیں ہوں گی، اس کٹی پھٹی زمین پر زندگی کے آثار کس کس طرح نمو پائیں گے، آج ہماری چشمِ تصور یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ سرسبز و شاداب علاقے ہیں، ٹیلوں اور پہاڑوں پر خوشنما بنگلے، نالوں اور دریاؤں کے کنارے بل کھاتی سڑکیں، جابجا عوامی پارک، وسیع و عریض میدان میں بنگلے، کوٹھیاں، دفاتر، اس علاقے کو یہ نئی بستیاں اور نئی آبادیاں کیا سے کیا بنا دیں گی۔ وہ دن دور نہیں جب چشموں، دریاؤں اور جھیلوں کے پانی کے تھرتھراتے سینے پر رنگ برنگ قمقموں کا عکس جشنِ چراغاں بن کر ہر کس و ناکس کے دیدہ و دل کو اپنی طرف کھینچے گا اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہے گا کہ جا اینجا است!

★

۱۰۰۰۲

اقوامِ متحدہ اور مسائل عالم

عظیم الدین شمسی

گذشتہ چند مہینوں سے سیاسی اور بین الاقوامی مذاکرات اور اہم ممالک عالم کے وزرائے خارجہ و سیاستین کی ملاقاتوں کا سلسلہ بہت سرگرمی کے ساتھ جاری ہے جس میں چند بڑے ممالک کے سربراہوں کی بالمواجہ ملاقات بھی شامل ہے۔ توی توقع ہے کہ ان سلسلوں کا نقطۂ آخر وہ کانفرنس ہوگی جسے عام طور پر "اعلیٰ سطحی کانفرنس" کہا جاتا ہے۔ دریں اثنا ممالک عالم کے مختلف علاقائی دفاعی اداروں کے بھی اجتماعات ہوتے رہے ہیں۔ غرض ان تمام مساعی کا ایک ہی مقصود معلوم ہوتا ہے —— دنیا میں سیاسی کشاکش اور کشیدگی کو دور کرکے امن عالم کو قریب تر لانا بلکہ نظریۂ باہمی بقا کو آگے بڑھانا تاکہ اس وقت دنیا کے امن کو جو خطرات لاحق ہیں ان کا سدِّباب کیا جاسکے۔ یہ تمام سرگرمیاں اقوامِ متحدہ کے دائرۂ امور سے باہر ہی ہو رہی ہیں۔ اس لئے ایک قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ من حیث الہیئت اقوامِ متحدہ کیا کر رہی ہے اور مسائل عالم میں اس کا درجہ و مقام کیا ہے۔ نیز یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ اس وقت وہ کن کاموں کو سنبھالے ہوئے ہے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ جائزہ لیا جائے کہ اقوامِ متحدہ آج کی دنیا میں کیا کردار ادا کر رہی ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ اقوامِ متحدہ ایک طرف تو وسیط اور وسیلہ ہے باہمی گفت و شنید اور مذاکرات و مشاورت کا اور دوسری طرف ایک ہیئت ہے جو چند مخصوص امور کا انصرام کرتی رہتی ہے۔ ان امور میں فوج، پولیس، سفارت و سیاست اور نظم و نسق کے کاموں کا دائرہ آتا ہے۔

دُنیا کو عدل و صیانت کی راہ پر لانے کے لئے جس پُرامن ارتقا کی ضرورت ہے اس کے لئے اقوامِ متحدہ بہت بڑا وسیلہ ہے اور چونکہ کوئی عالمی نظامِ صیانت موجود ہی نہیں ہے اس لئے اس ادارہ کی لابدی ضرورت و اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت دنیا میں امن و سلامتی کا کوئی فعال ادارہ موجود ہے تو وہ اقوامِ متحدہ ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ادارہ کے سکریٹری جنرل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا: "اگر اقوامِ متحدہ سے صحیح طریقہ پر کام لیا جائے تو وہ ان ذرائع سے، جو رکن ممالک کو اور طرح حاصل ہیں، سب سے بہتر وسیلہ بن سکتا ہے۔ سیاسی مصالحت کوشی اور صلح جوئی کے لئے وہ کہیں بہتر سطح ثابت ہو سکتا ہے۔ دنیا کے مختلف مفادات اور عزیز تصورات اگر صحیح طور پر کسی ایک معین جگہ پر مرتکز ہو سکتے ہیں تو وہ منشورِ اقوامِ متحدہ کا نقطہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی متفقہ حل نہ نکل سکے اور سیاسی مناقشات قائم رہیں اور کچھ ممالک عالم اپنے مخصوص و علاقائی مفادوں کے تحفظ کے لئے فعال جدّ و جہد بھی کرتے رہیں، اور یہ بھی ہوتا ہے کہ سیاسی کشاکش کا نتیجہ شدّت اختیار کرے اور ملک سمتِ مخالف کی طرف جھک جائیں —— لیکن ان سب باتوں کے باوجود، بلکہ بادصف، یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ رجحان پھر بھی موجود رہتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔ دائرۂ اختلافات کو کم کیا جائے، معاملات کو بگڑنے نہ دیا جائے بلکہ رفع دفع کیا جائے اور ایسا حل نکالا جائے کہ باہمی مفاد اور تحفظِ اصولِ منشور کا مقصد بھی فوت نہ ہونے پائے۔"

اقوامِ متحدہ کا ایک نہایت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ نمائندگانِ رکنِ ممالک کو اپنے بڑے سیاسی مسائل کے حل کے لئے باہمی مشاورت کے غیر رسمی مواقع مسلسل حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ گو ان مساعی کی عام اشاعت نہیں کی جاتی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کا ادارہ ایک ایسی ہیئت بن گیا ہے جس کے دائرہ میں بہت سے انصرامی امور آتے ہیں اور باہمی تبادلۂ خیال و عمل کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں کیونکہ یہ بہت اغلب رہتا ہے کہ سفارتی و سیاسی سطح پر گفت و شنید کے بعد کسی موقع پر اسے انصرام و اہتمام کے فرائض سنبھالنے کے لئے دعوت دی جائے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اقوامِ متحدہ کے دائرہ سے الگ ہو کر بھی جو گفت و شنید کی جائے یا افہام و تفہیم کی صورتیں پیدا کی جائیں ان کا

پس منظر بھی اقوامِ متحدہ کا منشور ہی رہتا ہے۔ کیونکہ دنیا "باہمی بقا" کے تصور و منہاج کو حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی رہنما اصول ہو سکتے ہیں تو وہ منشور کے سائے ہی میں ہو سکتے ہیں۔ باہمی آویزشوں کے پُرامن حل کی تلاش، ہر رکن ملک کی سالمیت و آزادی کا احترام، مسلح جارحیت کی حالت میں اجتماعی تحفظ و دفاع وغیرہ کے جملہ امور کا اہتمام منشورِ اقوامِ متحدہ میں پہلے ہی سے موجود ہے۔

اقوامِ متحدہ کی کامیابی یا ناکامی کے باب میں خواہ کچھ بھی کہا جائے یہ واقعہ اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ اس وقت اقوام و ممالکِ عالم جن مسائل سے دوچار ہیں ان سے نبٹنے کے لئے صرف دوگانہ مشاورت کوئی مضبوط و دائمی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، اس کے لئے ایک تیسرے فریق، ایک ثالث اور وسیط کی ضرورت لازمی طور پر پڑتی ہے۔ یہ کام اقوامِ متحدہ کرتی ہے۔ دنیا کے ملکوں کے مابین افہام و تفہیم کی نئی راہیں اسی نے کھولی ہیں۔ دو فریقوں کی بات چیت اور علاقائی روابط کی مساعی کو بہتر و موثر مواقع اسی نے فراہم کئے ہیں اور پھر اقوامِ متحدہ ہی وہ سطح ہے جس پر سے ایشیا اور افریقہ کی نئی اقوام و ملل ابھر کر سیاسیاتِ عالم کا ایک جزو بن سکتی اور اپنا وجود منوا سکتی ہیں۔

گزشتہ چودہ سال میں اقوامِ متحدہ کے سامنے بہت سی مشکلیں آئیں۔ لاینحل مسائل سے نبٹنا پڑا۔ اس ضمن میں اسے کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ اقوامِ متحدہ ہی نے کئی ممالک کو آزادی دلوائی یا بالادست حکومتیں قائم کرائیں۔ سوئز کے خطرناک مسئلہ کا حل اور جنگ کے نزدیک آجانے والے ملکوں میں قیامِ امن کے لئے اقوامِ متحدہ کی "ہنگامی فورس" کا بنایا جانا، چند ایسی مثالیں ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امنِ عالم کے لئے اقوامِ متحدہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اقوامِ متحدہ کسی قسم کا آزاد و خود مختار ادارہ نہیں ہے کہ بالجبر ہر ایک سے اپنی بات منوا سکے نہ وہ ساری دنیا کی بالادست حکومت و مملکت سی کوئی چیز ہے (شاید یہی عام غلط فہمی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اقوامِ متحدہ جو چاہے خود مختارانہ طریق پر کر سکتی اور فیصلے صادر فرما سکتی ہے خواہ رکن ممالک انہیں اچھا جانیں یا نہ جانیں) واقعہ بالکل یہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ ایک سطح ہے، ایک ہیئت ہے، جس کے دائرۂ آغوش میں آکر رکن ممالک افہام و تفہیم سے کام لیکر حلِ مشکلات تلاش کرتے اور امنِ عالم کے متلاشی بنتے ہیں۔ اس ہیئت کا کام یہ ہے کہ حکومتوں کو یوں تو روایتی طرز کی سفارتی سہولتیں گفت و شنید کی صورت میں حاصل ہی رہتی ہیں لیکن اسکے علاوہ بھی کچھ کام ہونا چاہیئے۔ یہ کام اقوامِ متحدہ کا دائرہ اثر کرتا ہے۔ اس ہیئت کی اصل قوت اس بات پر منحصر ہے کہ رکن ممالک اس کے اثر و قوت کے عوامل سے کس طرح اور کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حال ہی میں اقوامِ متحدہ کے کاموں کی ایک ارتقائی منزل اور آئی اور وہ خاص طور پر غور طلب بات ہے۔ سکرٹری جنرل کے دائرۂ امور کی وسعت تاکہ منشور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس ہیئتِ عالم کے اصول و مقاصد کو زیادہ سے زیادہ اظہار و نمو دمل سکے۔ اس نوع کی سیاسی مساعی کی ایک مثال وہ ہے جب تھائی لینڈ اور کمبوڈیا کے درمیان نقیض ہوا تو سکرٹری جنرل نے اپنا ایک شخصی نمائندہ فوراً اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ یہ مشن کامیاب رہا۔ دونوں ممالک پھر اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنے لگے۔

گذشتہ سال دنیا میں کئی اہم منصوبوں کو بروئے کار لانے یا مکمل کرنے کا مسئلہ بھی آیا تو اقوامِ متحدہ سے رجوع کیا گیا اور اس نے اپنی تحویل و نگرانی و تعاون سے ان منصوبوں کی تکمیل و تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔ ان منصوبوں کے ساتھ اقوامِ متحدہ کی نسبت، تاہم ہم نے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقوامِ متحدہ عالمی مسائل کے حل اور تدبیر منزل کے سلسلے میں کن کن مسائل سے نبٹتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جنوب مشرقی ایشیا کے دریائے میکونگ کے زیریں طاس کا منصوبہ لیجیئے۔ اسے اقوامِ متحدہ کے تعاون سے مکمل کیا گیا۔ لاؤس، کمبوڈیا، جنوبی ویت نام، اور تھائی لینڈ کے ملکوں کو براہ راست الگ الگ اعانت دی گئی۔ علاوہ ازیں "اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرقِ بعید" (ای کیفے) الگ اپنا کام سنبھالے ہوئے ہے "اقوامِ متحدہ کا تکنیکی پروگرام" بھی مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ دریائے میکونگ کا منصوبہ زیرِ تکمیل ہے اور جب یہ کام ختم ہو جائیگا تو قوی امید ہے کہ اس سے ان چاروں ممالک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہونے اور اصلاحِ احوال میں بڑی مدد ملے گی۔

دریائے سندھ کے پانی کا مسئلہ کئی سال سے پاکستان اور ہندوستان کے مابین مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے عالمی بینک کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور باہمی مذاکرات کا اچھا نتیجہ نکلنے کی امیدیں روشن تر ہو گئی ہیں۔ خیال ہے کہ دونوں ملک ان مشکلات کا حل نکالنے میں نہ صرف کامیاب ہو جائیں گے بلکہ یہ بھی ہو سکے گا کہ اس عظیم دریا کے آبی وسائل کو مزید ترقی دی جا سکے۔

مشرق وسطی میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ایک جماعت عارضی صلح کو قائم رکھنے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ مشرق قریب میں اقوام متحدہ کی جماعتِ امداد و تعاون برائے مہاجرین فلسطین اور اقوام متحدہ کی "ہنگامی فورس" برابر اس کام میں لگی ہوئی ہیں کہ دنیا کے ان حصوں کا امن برقرار رہے۔

افریقہ میں ایک نہایت اہم کام یہ ہوا ہے کہ اس براعظم کے لئے گزشتہ سال ہی ایک اقتصادی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد کی بنیادوں پر رکن ممالک کے درمیان اقتصادی و سماجی تعاون اور مرکزیت کار پیدا کی جائے۔ جنرل اسمبلی کے گزشتہ اجلاس کے دوران گنی کو بھی اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔ چونکہ یہ ملک ابھی اپنی نئی آزادی کے ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اس لئے کچھ مشکلات سے دوچار ہے۔ اقوام متحدہ نے اس ملک کی درخواست پر اقتصادی و سماجی ترقی کے لئے منصوبہ سازی کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے۔ اس غرض کے لئے سکرٹری جنرل نے اپنا ایک خصوصی نمائندہ وہاں بھیج رکھا ہے تاکہ وہ اقوام متحدہ اور خصوصی ماہرین کے اداروں سے مدد لے کر منصوبہ بندی کے کام کو مکمل کرے۔ افریقہ کے سلسلے میں کئی مسائل ہیں جن کو اقوام متحدہ حل کر رہی ہے۔ منجملہ ان کے وہ مسائل بھی ہیں جو اقوام متحدہ کی تولیتی کونسل کے دائرہ توجہ میں آتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی تولیت میں آنے والے چار افریقی علاقے ایسے ہیں جنہیں ۱۹۶۰ء میں یا تو کامل آزادی مل جائے گی یا درجۂ خود اختیاری حاصل ہو جائے گا۔ ان میں سے ایک سمالی لینڈ ہے جو فی الوقت اطالیہ کے زیر انتظام ہے۔

گزشتہ سال عوام اور حکومتیں مل کر لوگوں کی عام بھلائی اور رفاہِ عام کے کاموں کو ترقی دیتی رہیں تاکہ عوام کا معیار زندگی بلند ہو سکے اور ان کی حالت سدھر سکے۔ سماجی ترقی کے کام اکثر سست رفتار رہے کیونکہ اکثر ممالک میں مالی اور انتظامی مشکلات حائل رہیں۔ آبادی عالم میں تیز رفتار اضافہ اور آبادیوں کو شہری بستیوں میں بسانے کے کام کی وجہ سے ہر جگہ مکانات کی قلت کا سوال درپیش رہا۔ دنیا کے اکثر ملکوں کی آبادی آجکل اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ پہلے کبھی اتنی نہ بڑھی تھی۔ ان ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے۔ عین اغلب ہے کہ کوئی بیس سال میں آبادی دوگنی کے قریب ہو جائے گی۔ سماجی ترقیات کے سلسلے میں بہت سے جائزے لئے گئے اور ان کے مشاہدات و کوائف کو اقوام متحدہ نے شائع کیا ہے۔ بعض چیزیں آئندہ چند سالوں میں اشاعت پذیر ہوں گی، ان مطبوعات کا تعلق آبادی اور مسائلِ معاشرہ سے ہوگا۔

جن معاشری مسائل کو اقوامِ متحدہ نے اعانت بہم پہنچائی ہے ان میں شہری اور دیہی رفاہ عامہ کے بہت سے کام ہیں خاص کر بستی سدھار کے کام۔ ان میں سے ایک منصوبہ تو مشرقی پاکستان ہی کا ہے جہاں حکومت عوامی اصلاح و ترقی کے کاموں کے لئے انتھک کوشش کر رہی ہے۔

رکن ممالک کے بڑے منصوبوں میں مدد دینے کے لئے سب سے بڑا کام جو حال ہی میں ہوا ہے وہ "اسپیشل فنڈ" کا قیام ہے۔ یہ فنڈ "تکنیکی امداد کے توسیعی پروگرام" کو مکمل کرنے کی طرف ایک اور قدم ہے تاکہ مخصوص منصوبوں کے لئے جن میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہو، روپیہ فراہم کیا جا سکے۔ اس فنڈ نے اپنے قیام کے چھ ماہ کے اندر اندر ۱۳ منصوبوں کو جو مختلف ممالک کے تھے، مالی امداد دینی شروع کر دی ہے۔ جیسے جیسے کام آگے بڑھے گا مزید ممالک کو منصوبہ جات کی تکمیل و ترقی کے لئے سرمایہ مہیا کیا جاتا رہے گا۔ اس فنڈ کے لئے دس کروڑ ڈالر کا سرمایہ تجویز ہے اور امید ہے کہ یہ رقم سال آئندہ جمع ہو جائے گی۔ اور فنڈ اس قابل ہو سکے گا کہ ساری دنیا میں عوام کی مالی حالت سدھارنے کے لئے نئے رکن ممالک کو امدادیں دی جائیں گی۔

"تکنیکی امداد کے توسیعی پروگرام" کی دسویں سالگرہ منائی گئی ہے۔ اس کا ریکارڈ یہ ہے کہ اس نے ۸۰۰۰ ماہرین کی خدمات سے کام لیا اور ۱۴۰ علاقوں یا ملکوں میں تقریباً (۱۴,۰۰۰) وظائف دیئے۔

"جوہری قوت کے امن پسندانہ استعمالات" کے ادارہ کو اور ترقی دینے کے لئے "جوہری قوت کی بین الاقوامی ایجنسی" "ٹیکنیکل امدادی بورڈ" کی بھی رکن بن گئی۔

اقوام متحدہ کا "تکنیکی امدادی پروگرام" برائے پاکستان دنیا کا دوسرا بڑا پروگرام ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کام میں ۹۰ ماہرین لگے ہوئے ہیں جن میں دنیا کی ۲۶ اقوام کے لوگ ہیں۔ یہ غیر ملکی اپنے پاکستانی ساتھیوں کے ہمرشتہ کام کر رہے ہیں اور ان کے کاموں کا سلسلہ کافی دراز ہے جو سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً ڈھاکہ ہی میں "یو این ٹیکنیکل اسسٹینس آپریشن" کے زیرِ نگرانی ماہرین کی ایک جماعت دیہی ترقی کے کاموں کو سنبھالے ہوئے ہے۔ نیز ڈھاکہ اور لاہور میں سماجی اصلاح کی سرگرمیوں سے متعلق کام ہیں جہاں تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح گندھیرا ہیچ (مغربی پاکستان) کی تکنیکی امداد کا کام ہے۔ امداد باہمی اور آجر و اجیر کے تعلقات کے کاموں کے سلسلے میں مدد دینے کے لئے "آئی ایل او" (بین الاقوامی ادارۂ عمال) کی ایک جماعت بھی یہاں کام کر رہی ہے۔ پاکستان میں کوئی پانچ سال سے بین الاقوامی ٹیلی کمیونیکیشن کے ماہرین بھی کام کر رہے ہیں اور اس باب میں مدد دے رہے ہیں کہ ایشیا میں ٹیلی کمیونیکیشن کے جو چند سب سے بڑے سلسلے ہیں ان میں سے ایک پاکستان میں قائم و نصب کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ عمل خاص کراچی کے بالکل نزدیک تکمیل پذیر ہے۔

"خوراک اور زراعت کا ادارہ" بھی پاکستان میں کافی کام کر رہا ہے اور اس نے سب سے زیادہ ماہرین (۲۴ سے زیادہ) یہیں لگا رکھے ہیں۔ مثلاً گنگا کوباڈک اسکیم (مشرقی پاکستان)، بند کی نقشہ سازی، کھجور کو ڈبے میں بند کرنے کا عمل، زرعی جائزہ، حیوانات کے لئے مصنوعی نسل کشی، دریاؤں کا کنٹرول، زمین کی بالیدگی بڑھانے کا کام اور دوسرے زرعی مسائل۔ یونیسکو کے ۱۶ ماہرین پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔ ان ماہرین کے کاموں کا سلسلہ تعلیم، سائنس اور ثقافت سے متعلق ہے۔ یونیسکو نے پاکستان ہی میں ایک علاقائی مرکز موادِ مطالعہ قائم کیا ہے۔ جو کراچی میں قائم ہے اور پاکستان، ہندوستان، برما، لنکا اور ایران کو اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جو سائنسی اور تکنیکی معلومات و مطالعہ کی ترتیب کاری (ڈاکیومینٹیشن) سے متعلق ہے اور اس کام پر تین ماہرین تعینات ہیں۔ بعض دوسرے ماہر تعلیمی امداد و حقائق ارضیاتی طبیعیات، فلکیات، سماجیات اور تدریسِ ارضیات کے کاموں سے متعلق ہیں۔ "بین الاقوامی ادارۂ صحت" کے ماہرین نرسوں کی تربیت علاج الامراض، اور صحت و صفائی کی انجینئری کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ "عالمی بینک مشن" بھی پاکستان میں کام کرتا ہے جس میں ایک مشیر، ایک صلاح کارِ زراعت اور ایک ماہر اقتصادیات شامل ہیں۔

یونیسیف، بین الاقوامی فنڈ برائے اطفال کا بھی اس ملک میں کافی بڑا کام ہے۔ اس ضمن میں توسیع کے لئے ۵ بڑے منصوبے مکمل ہونے ہیں جس کے لئے حکومت پاکستان نے (۷۸۴،۰۰۰) ڈالر مالیت کی امداد مانگی ہے۔ اس امداد سے کراچی میں ایک جدید قسم کی ڈیری بنائی جائے گی جو (۲۵۰۰۰) "لٹر" دودھ یومیہ تیار کر سکے گی۔ اس امداد سے زچگی اور بہبودِ اطفال کے کاموں کو بھی امداد دی جائے گی۔ گاڑیاں فراہم کرنے، سلائی کی مشینیں دینے، ٹائپ رائٹر، اوزار اور قلم و ریڈیو وغیرہ کے پرزے مہیا کرنے کے لئے کوئی ۲۵ دیہات کو یہ امداد دی جائے گی نیز تپ محرقہ کی روک تھام اور معذور بچوں کی مدد و علاج کے لئے بھی رقوم مہیا کی جائیں گی۔

غرض اقوام متحدہ سماجی و اقتصادی کاموں کے سلسلے میں بہت کچھ کر رہی ہے گو یہ بات دوسری ہے کہ سیاسی مسئلوں کے شور شغب میں مخلوق خدا کے فائدے کے ان کاموں کا چرچا ذرا کم ہو جاتا ہے حالانکہ ان کاموں کی اپنی بڑی زبردست اہمیت ہے کیونکہ دنیا کے ہر حصہ میں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں پر ان سرگرمیوں کا اثر پڑتا ہے۔ دنیا کو ایک بہتر مقامِ زیست بنانے کے لئے ہر ملک میں یہی کام ہو رہا ہے اور بڑی تندہی سے ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ ان امور اور سرگرمیوں میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

★

چین سے دو خط
تمام لاعلاج جلدی امراض
ہر قسم کے پھوڑے پھنسی لاہوری پھوڑے
ناسور بھگندر۔ بال توڑ۔ داد چنبل۔ خارش خنازیر کھجلی۔
پرانے زخم اور زہریلے جانوروں کے کاٹے
چیر پھاڑ اور مرہم پٹی سے بچاتی ہے
حکیم طاہرالدین اینڈ سنز ڈلروز والا۔ فیروزپور روڈ لاہور (پنجاب)
ہر مشہور دوا فروش سے طلب کریں
قیمت فی شیشی ... ایک روپیہ

جی! میں کپڑے گھر ہی میں
دھوتی ہوں!
New SUNLIGHT SOAP
SUNLIGHT
نئے سنلائٹ سے یہ
اور بھی آسان ہوگیا ہے!
نئے سنلائٹ صابن میں ایک نیا
جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے جو سفید کپڑوں کو
پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور
رنگین کپڑے اور بھی خوشنما ہو جاتے ہیں۔ آپ کے
تمام کپڑے نئے سنلائٹ صابن میں
دھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے
نیا سنلائٹ استعمال کیا جائے
تو کوٹنے پیٹنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا
مل جاتا ہے۔ بس آپ کپڑوں کو
نیا سنلائٹ لگا کر ذرا سا مل دیجئے
اور پھر نچوڑ دیجئے۔ دیکھئے سارا میل نکل گیا،
اور کپڑے برف کی طرح صاف و شفاف ہوگئے
نیا سنلائٹ صابن
پیٹے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے!
S. 21—193 UD

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں
تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا
ایک اہم جزو ہے چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے
ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف
حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی
ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے ڈاکٹروں کی رائے
ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم دو اونس چکنائی
کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔
کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے
ڈالڈا برانڈ وناسپتی گذشتہ ایک پشت سے اس ملک
میں مشہور ہے اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے
اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے یہ ہاتھوں سے چھوئے
بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہر بند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب
ہوتا ہے یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے
ہیں اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل
ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہو گئی ہے۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا
ایک اہم جزو ہے!
DALDA VANASPATI
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے!

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

"مری کے سائے میں"

(نئے دارالحکومت کے لئے دلکش قدرتی ماحول)

زیر تعمیر راول بند کی تعمیر کے لئے چٹانیں
بارود سے صاف کی جا رہی تھیں

راول کے نزدیک نالہ "کلاین کس" اور دریائے کورنگ کا سنگم

نور پور شاہاں کا خوبصورت چشمہ

زمین ہموار کر کے پانی روکنے کے لئے ایک
اونچا پشتہ بنایا جا رہا ہے (راول بند)

ماہِ نو

اگست ۱۹۵۹ء

آپ چاہیں تو اپنی ہونہار لڑکی کو طبیبہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن فی الوقت اس کی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ اچھی صحت پر ہی اس کی آئندہ کامیابی کا انحصار ہے۔ نشو و نما کی عمر میں مناسب غذا کے علاوہ کسی اچھے ٹانک کی ضرورت بھی رہتی ہے تاکہ جسمانی اور دماغی قویٰ اچھی طرح پرورش پا سکیں۔

سِنکارا ایسے ہی قوت بخش اجزا سے بنایا ہوا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے۔ مفید و موثر جڑی بوٹیوں کے نچوڑ کے علاوہ ضروری حیاتین کے اضافے نے اسے ایسا جامع مرکّب بنا دیا ہے جس کا استعمال ہر ایک کیلئے ہر موسم میں یکساں مفید بلکہ ضروری ہے۔

سنکارا

ہمدرد

U.H.C-11/120

لہلہاتی کھیتیوں کے محافظ
جب کبھی فصل خراب ہوئی، کاشتکار نے "شومئی قسمت" کا گلہ کیا اور
یہ کبھی نہ سوچا کہ کم پیداوار کا باعث "شومئی قسمت" نہیں بلکہ
پودوں کی بیماریاں اور وہ مہلک کیڑے ہیں جو فصلوں کو تاراج کرتے ہیں۔
محکمۂ تحفظ نباتات کے دوش بدوش برما شیل نے بھی ان گنت تجربوں اور مظاہروں کے ذریعہ یہ بات کاشتکاروں
پر واضح کر دی ہے کہ "شیل ایگری کلچرل کیمیکلز" ہی ان کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کے بہترین محافظ ہیں۔
پاکستان کیلئے غیر ملکی زرمبادلہ بچانے میں بھی شیل کی تجربہ گاہوں سے نکلی ہوئی مصنوعات کو بڑا دخل ہے کیونکہ یہی مصنوعات
کیڑوں کا قلع قمع کر کے فصلوں کو تباہ کاریوں سے بچا رہی ہیں اور اسطرح ملک میں غلہ کی پیداوار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔
برما شیل ترقی پاکستان کا حصہ ہے
BSP 7 59

جسم میں تازگی
لائف بوائے
صابن
کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے
فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے جراثیم آلود
میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف
اور ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف
تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے کہ
آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے
صابن سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L. 19—193 UD

بچے کی
پیدائش
سے پہلے ...
ماں کی زندگی کے تحفظ میں کیا چیز مدد دیتی ہے ؟
آپ کا ڈاکٹر آپکو بتائیگا کہ پیدائش کی نالی کی بیرونی جلد یا اندرونی جھلی میں اگر ذرا سی بھی خراش وغیرہ
آجائے تو جراثیم کو اسمیں داخل ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر زچہ چھوت کی بیماری یا
زچگی کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے بہت سی خواتین اس بات کو نہیں جانتیں کہ زچگی کے وقت جو چھوت
لگ جاتی ہے اس سے زچہ کو نہایت شدید تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد یہ حالت
مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کبھی اس کا نتیجہ بانجھ پن ہوتا ہے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے کہ
زچگی کے موقع پر ڈیٹول کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔
بچے کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے دوران میں اور پیدائش کے بعد ڈاکٹر اور دائیاں حاملہ خواتین کی حفاظت
کیلئے ڈیٹول پر اعتماد کرتے ہیں۔ انکی تقلید کیجئے۔ ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھئے۔
ایک زود اثر دافع سمیت دوا ہے جو جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر دیتی ہے
آئیوڈین یا لائی سول کی طرح زہریلی نہیں ہے۔
اسے ایک محفوظ طریقہ پر استعمال کر سکتے ہے۔
یہ جس جگہ لگائی جائے وہاں ذرا سی تکلیف نہیں ہوتی۔
اس کی بو ناگوار ہرگز نہیں۔
ڈیٹول
DETTOL
ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھئے۔
ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ۔
پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی نمبر ۱
پیشہ ور ڈاکٹر ڈیٹول
استعمال کرتے ہیں اور
استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔
R C 842
J W T

جلد ۱۲

اگست ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی) کا ایک منظر رنگین عکس۔ محمد ...

چندہ سالانہ ۸ روپے — ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی ۸۰ پیسے

"دورِ فلک بکامِ ما"

قاضی یوسف حسین صدیقی

ہماری قومی زندگی میں کتنے ہی اتار چڑھاؤ کیوں نہ ہوں، ۱۴ راگست کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ وہ تاریخی دن ہے جب ہماری صبح آزادی طلوع ہوئی تھی، اور ہماری نظروں نے ایک بار پھر وہ اجالا دیکھا تھا جو کوئی دو صدیوں سے پردۂ ظلمات میں مستور ہوچکا تھا۔ یہ دن ہمارے لئے دلی مسرت کا پیغام ہے اور ہم اس کا کسی عملی صورت میں اظہار کریں یا نہ کریں، اس کا وجدانی طور پر ولولہ آفریں ہونا لازمی ہے۔

اگر ہم اس موقع پر شادماں ہوں کہ ہم نے اپنی آزادی کے بارہ سال پورے کرلئے ہیں اور تیرھویں میں قدم رکھا ہے، تو بیجا نہیں۔ یہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہے کہ ہم نے ایک ایسے پرآشوب دور میں اپنے قومی وجود کو برقرار رکھا ہے جس کا ہر لمحہ پیغام مرگ تھا۔ اور ایسی افتادوں کا سامنا کیا ہے جن کے سامنے بڑی بڑی قوموں کے قدم بھی "ڈگمگا جاتے ہیں۔ دراصل کسی قوم کی توانائی کا صحیح معیار بھی یہی ہے کہ اس نے حالاتِ زمانہ کا مقابلہ کیسے کیا ہے۔ اپنی زندگی کی پیچیدہ گتھیاں کیسے سلجھائی ہیں، شدید سے شدید آزمائشوں میں کیسے پوری اتری ہے اور ٹیڑھے سے ٹیڑھے موڑ مڑ کر کس طرح ایسے راستے پر گامزن ہوئی ہے جو اس کی بقا اور ترقی کے ضامن ہوں۔

کسی قوم خصوصاً نئی قوم کا راستہ ہمیشہ پرپیچ و خم ہوتا ہے۔ بلکہ اسے اپنا راستہ خود تلاش کرنا اور تراشنا پڑتا ہے۔ اگر کسی آڑے وقت پر اسکی صلاحیتیں جواب دے دیں، اس کی نگاہیں حدِ نظر سے آگے نہ دیکھ سکیں، وہ کسی موقع پر آزمائش میں پوری نہ اترے اور صحیح اقدام نہ کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کا چراغ گل ہوجائے اور وہی عناصر جنہوں نے اس کو جنم دیا تھا اس کو اپنے اندر جذب کرلیں۔ ہم اس بات کو فخر و کامرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گو ہم رہ رہ کر تند و تیز طوفانوں سے دوچار ہوتے رہے اور ہمیں بہت ہی بے ڈھب افتادوں سے نبٹنا پڑا ہے پھر بھی ہم نے ہمت و استقلال کا دامن نہیں چھوڑا اور ہماری ہمتیں برابر برقرار رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے نہ صرف مخالف عناصر کا ہروار سنبھالا بلکہ ان کو ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اور اب ایسے عناصر کو خضر راہ بنا کر منزلِ مقصود کی طرف جادہ پیما ہیں جن کی وضع بالکل مختلف ہے۔ ان کا مقصد قومی مسائل کو پورے خلوص اور دیانت داری سے حل کرنا ہے اور عوام کو ان کے چھینے ہوئے حقوق عطا کرنا ہے ان کا راستہ تعاون، اشتراکِ عمل، ہمدردی اور محبت کا راستہ ہے کیونکہ: ع

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

دورِ حاضر کا ایک عام مرض گوئبلز کے مسلک کی پیروی ہے۔ بے سروپا مبالغہ آمیز پیکاوٴں جیسی فریب کاری، کھوکھلی نعرہ بازی، ڈھنڈورے پیٹنا اور مصنوعی نمود و نمائش، لیکن یہ رویہ آپ اپنے لئے پیغامِ مرگ ہے۔ ع مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اسلئے آخر کار نوبت افراد قوم ہی تک پہنچتی ہے۔ وہی حکومتوں اور قائدوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور خواہ کتنی ہی تدبیریں کیوں نہ کی جائیں بالآخر ان کی طرف رجوع کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اور ہماری بارہ سالہ تاریخ نے اس کا بارہا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ لہٰذا جو لائحہ عمل اب اختیار کیا گیا ہے اس میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جارہی ہے۔

جہاں تک حالات کا رخ اجازت دیتا ہے، بعض قیاس آرائیاں کچھ بے جا بھی نہیں۔ یہ وہ نتائج ہیں جن کا ہم بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمارے لئے مسرت کا باعث ہے کہ ہماری قوم نے کافی دیر ہی سے سہی، ایک بہت بڑی مہم سر کرلی ہے۔ یہ نہایت پرامن طور پر وہ موڑ مڑنے میں کامیاب ہوگئی ہے جس کے لئے قوموں کو بالعموم بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور اب حالات اندرونی و بیرونی دونوں طور پر اس قدر اطمینان بخش ہیں کہ دوسری قومیں ہم پر رشک کرتی ہیں۔ ہمارا انقلاب موجودہ یوم استقلال سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے واقع ہوا ہے۔ اسلئے مقام مسرت ہے کہ ہمارا تیرھواں سالِ آزادی

بلدرجہا بہتر حالات کی نوید لئے ہوئے ہے۔

نئے دور میں جو پے در پے اقدامات ہوئے ہیں ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ ہم میں سے کوئی ہے جو اُن سے واقف نہ ہو؟ ان کی حیثیت بلاشبہ نہایت ڈرامائی ہے۔ اور وہ آناً فاناً اس کثرت اور برق وش تیز رفتاری سے کوند کوند گئے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ زرعی اصلاحات، مہاجرین کی آبادکاری، متروکہ جائدادوں سے متعلق دعاوی کا فیصلہ، ناجائز درآمد برآمد کا سدباب، قوم دشمن عناصر اور سیاسی جماعتوں کا استیصال، انتظامی صفائی و تطہیر، قانون، تعلیم، پریس وغیرہ کی اصلاحیں، معاشرتی فلاح و بہبود اور ترقی کی تدابیر اور سب سے بڑھ کر قومی مزاج، ضروریات اور روایات سے ہم آہنگ اور مناسب ترین آئینی نظام کی تشکیل کے لئے جدوجہد یہ تمام امور ہماری تاریخ میں ایک نیا باب مرتب کر رہے ہیں۔ اور ان کا نتیجہ ایک نئی فضا ہے جس میں زندگی از سرِ نو جاگ اٹھی ہے، اور اس کے حوصلے، اس کے تقاضے، اس کے عزائم ایک نیا ولولہ، ایک نیا شوق ہنگامہ آرائی پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اطمینان و دلجمعی حاصل ہوگئی ہے جو قوائے فکر کو پیغامِ نمو دیتے ہوئے ذہنی و ثقافتی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرتی ہے۔

موجودہ زمانے میں اربابِ قلم کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے کیونکہ معاشرہ کا دل و دماغ، اس کی روحِ رواں وہی اربابِ فکر و نظر ہیں جو ادب و فن کی مشعل روشن کرکے "جہانِ نابصیر" کو راستہ دکھاتے ہیں۔ قبل ازیں یہ طبقہ بھی دوسروں کی طرح کس مپرسی کا شکار تھا۔ ایک کے بعد دوسری خودغرض و بے پروا حکومت آتی رہی اور یہ طبقہ پریشان حال و سرگرداں ہی رہا۔ نئے دور کے طلوع ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ اس جماعتِ بے امام کو ایک امام، ایک سرپرست مل گیا۔ صدر پاکستان کی چشمِ حقیقت شناس شعر و ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔ اسلئے انہوں نے شعرا و ادبا کی قدردانی میں نمایاں حصہ لیا اور متعدد ذاتی و سرکاری انعامات سے حوصلہ افزائی کی۔ ان کے پیشِ نظر ادبی کاوشوں سے زیادہ جذبۂ ملی کی قدردانی تھی۔ اسلئے انہوں نے ہر پیشکش کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا، اور بعض صورتوں میں خود اپنی جیب سے انعامات دے کر داد و دہش کی دیرینہ روایات کو تازہ کیا۔ ایک بہت بڑا کام ان ادیبوں اور فنکاروں کی دستگیری تھی جو معذور یا مفلوک الحال ہوں۔ چنانچہ ے افراد کی اعانت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ان حالات نے ادب و فن کی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی۔ ادیبوں کو اپنے وجود کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک منظم جماعت بنانے کی جدوجہد شروع کی۔ اس کا نتیجہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام ہے جو تمام برعظیم میں اپنی قسم کا پہلا اور مہتم بالشان ادارہ ہے، اور جس سے کتنی ہی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کی آئندہ کارگزاریوں کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن تاحال اس نے جو اقدامات کئے ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خستہ حال اور معذور ادیبوں کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ اسی کے مشورہ اور جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر اراکین کی زندگی کا نہایت آسان اور ارزاں شرائط پر بیمہ فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس کی ادبی اداروں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی نظیر دکھائی دے۔ ایک پبلشنگ ہاؤس کا قیام جو ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت کا اعلیٰ پیمانے اور مصنفین کے لئے بہترین شرائط پر اہتمام کرے گا، ایک اور نہایت اہم اقدام ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی اور بے حد اہم امور مثلاً ادیبوں کے حقوق کا تحفظ، بیجا پابندیوں کو دور کرانے کی سعی و کوشش وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن کا ایک منظم و مضبوط ادارہ کے بغیر سرانجام ناممکن تھا اور ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ ایسا ادارہ رائٹرز گلڈ کی شکل میں وجود پذیر ہوچکا ہے۔ جو ادب کے لئے بھی اچھی فال ہے اور ادیبوں کے لئے بھی۔

اس مختصر جائزہ سے ظاہر ہے کہ ہم اپنی آزاد قومی زندگی کے تیرھویں سال کا آغاز ایسے حالات میں کر رہے ہیں جو بہت خوشگوار اور امید افزا ہیں۔ اگر "تیز ترک گام زن" کے حیات افروز پیغام پر عمل کی یہی کیفیت رہی تو ہم نہایت اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ "منزل ما دور نیست" کی بشارت کے پورا ہونے کی نوبت دور نہیں اور ہمارے قدم بہت جلد اس منزل کو جالیں گے۔

★

حمد

منیر احمد منیر

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں، تنگدستی کا کیا گلا کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہوئے، اُنکو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے، اِس سی خوش وقت کاروبار کہاں

ساز چھیڑا تو جم گئی محفل، منّتِ طبعِ غمگسار کسے
اشک ٹپکا تو کِھل گیا گلشن، رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مُراد، دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
ہم سے شوقِ نبرد ہو جس کو، جائے تسخیرِ کائنات کرے

کیمبرج میں میرے دو دن

ممتاز حسن

میں کیمبرج کا طالب علم تو نہیں ہوں۔ مگر اس دانشگاہ سے مجھے ہمیشہ ایک عقیدت سی رہی ہے۔ کیمبرج عربی اور فارسی کی تعلیم و تحقیق کا مرکز ہے۔ براؤن اور نکلسن اسی دانشگاہ کے استاد تھے۔ اور دونوں علمی دنیا میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ دنیا کی جس درسگاہ سے بھی ان کا تعلق ہوتا، اسے ایک پائدار عزت اور شہرت بخش دیتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیمبرج وہ جگہ ہے جہاں اقبال نے اپنی علمی اور تحقیقی زندگی کا ابتدائی دور گزارا۔ اقبال، پروفیسر نکلسن کے شاگرد تھے۔ اور استاد اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے پر فخر تھا۔ جب "اسرار خودی" شائع ہوئی تو نکلسن مرحوم اس کی شاعرانہ اور فلسفیانہ عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اگر یہ ترجمہ نہ ہوتا۔ تو اقبال کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز اتنا جلد نہ ہوتا۔ اور ہمارا یا خود ہماری قوم بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا رہتی۔

براؤن، نکلسن اور اقبال کے ناموں کے ساتھ اگر عمر خیام اور فٹز جیرالڈ کے نام بھی شامل کر دیئے جائیں تو کیمبرج کی علمی عظمت کی تصویر زیادہ مکمل ہو جاتی ہے۔ فٹز جیرالڈ جس نے اپنے ترجمے سے مغربی دنیا کو عمر خیام کی رباعیات سے روشناس کیا، کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اور اقبال کی طرح ٹرنٹی کالج میں داخل تھا۔ رباعیات کا دنیا میں قدیم ترین نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اور فٹز جیرالڈ کے مختلف مسودات بھی اسی یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔

میرا جی کیمبرج جانے کو ویسے بھی چاہتا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں جو نمائش کیمبرج میں منعقد ہوئی تھی، وہ ابھی جاری ہے۔ تو اور بھی شوق ہوا۔ چنانچہ جب برٹش کونسل نے، جو یہاں میرے میزبان ہیں۔ میرے کیمبرج جانے کی تجویز کی، تو میں نے اس دعوت پر فی الفور لبیک کہا۔ دوسری مصروفیتوں کے پیش نظر میرے لئے کیمبرج میں دو دن سے زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ مگر جو دو دن وہاں گذرے۔ وہ مجھے یاد رہیں گے۔

سب سے پہلے میں نے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں عمر خیام کی نمائش دیکھی۔ اور رباعیات کا وہ قدیم ترین نسخہ بھی دیکھا۔ جسے پروفیسر آربری منظر عام پر لا چکے ہیں یہ نسخہ عمر خیام کی وفات سے تقریباً اسی سال کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عمر خیام اور ثنائی اور دوسرے شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس نسخے کے علاوہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کا پہلا ایڈیشن بھی نمائش میں موجود ہے پہلے ایڈیشن کا وہ نسخہ بھی ہے جو کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کو کاپی رائٹ لائبریری ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۹ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت لائبریری کے ارباب اختیار نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا اور ایک طرف پھینک دیا۔ ۱۹۱۹ء میں کسی نے اسے ردی کے انبار میں سے نکالا اور نسخہ ضائع ہوتے ہوتے بچ گیا۔ آج پہلے ایڈیشن کے نسخوں کی قیمت ۱،۵۰۰ اور ۲،۰۰۰ پونڈ کے لگ بھگ ہے۔

یونیورسٹی لائبریری میں فارسی اور عربی کی کتابوں کا معقول ذخیرہ ہے۔ مگر مجھے یہاں اردو کی کتابیں دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی۔ یہ کتابیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کی فراہمی میں پروفیسر آربری کی، جو براؤن اور نکلسن کے جانشین ہیں اور جنہوں نے نکلسن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اقبال کی "رموز بیخودی"، "لالۂ طور" (پیام مشرق کا ایک حصہ) اور "زبور عجم" کا ترجمہ بھی فرمایا ہے، ذاتی توجہ کو دخل ہے۔ خود پروفیسر آربری سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے پروفیسر براؤن مرحوم کی تاریخی قیامگاہ دکھائی اور پھر خود اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں پروفیسر صاحب اور ان کی کتابوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ "خیر جلیس فی الزمان کتاب"۔

شام کو ایوری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک زمانے میں رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ آج کل کنگز کالج میں عربی اور فارسی کے لیکچرار ہیں۔ فارسی زبان، ایران اور ایرانیوں سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ میں نے کنگز کالج کے ہال میں ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو رہی۔ ان کے دو شاگرد بھی موجود تھے۔ میں نے علمی معاملات میں اتنا شگفتہ انہماک کم دیکھا ہے۔

ایوری صاحب سے ملنے سے پہلے میں نے کیمبرج کی پرانی کتابوں کی دکانوں کا گشت کیا۔ ایک آدھ چیز ہاتھ بھی آئی۔ مگر پرانی کتابوں کے بارے میں جو کیفیت لندن کی ہے وہ نہ کیمبرج کی ہے نہ آکسفورڈ کی، نہ اس ملک میں کسی اور شہر کی۔

دوسرے روز ٹرنٹی کالج کی لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ دو قدیم اور نفیس فارسی کے قلمی نسخے دیکھے۔ ایک کلیات سعدی اور دوسرا جامی کی مثنویات۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈاڈویل صاحب نے، جو یہاں لائبریرین ہیں، مجھے ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کے ذاتی کاغذات کا ذخیرہ دکھایا جو تمام تر اسی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ ایک بیش بہا اور نادر ذخیرہ ہے۔ اس میں فٹز جیرالڈ کے ذاتی خطوط، اس کے مطالعے کی یادداشتیں، اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں، اس کی تصنیف کردہ موسیقی، سب کچھ موجود ہے۔ ایک آدھ غیر مطبوعہ تصنیف بھی ہے۔ میں فٹز جیرالڈ کی مصوری اور موسیقی سے محض سرسری طور پر واقف تھا۔ اس ذخیرے میں جو کچھ دیکھا اس سے واضح ہو گیا کہ ابھی عمر خیام کے اس شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید مترجم کی پوری شخصیت دنیا کی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی۔

ٹرنٹی لائبریری سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر ڈاڈویل نے کالج ہال میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ یہ وہ ہال ہے جہاں اقبال نے ٹرنٹی کالج کے طالب علم کی حیثیت سے بارہا کھانا کھایا ہوگا۔ اس کے بعد مجھے شوق ہوا کہ اقبال کی طالب علمی کے زمانے کی قیامگاہ دیکھوں۔ معلوم ہوا کہ وہ زیادہ تر وہ کیسل روڈ پر رہے ہیں کچھ عرصے ہنٹنگٹن روڈ پر بھی قیام رہا۔ ڈاکٹر ڈاڈویل نے رہنمائی کی اور ہم دونوں کیسل روڈ پر جا پہنچے۔ یہ مکان ایک گرجا کے پہلو میں واقع ہے۔ اس کی نچلی منزل میں آج کل بھی طالب علم ہی رہتے ہیں۔ ہم ہنٹنگٹن روڈ پر نہ جا سکے۔ مجھے لندن واپس آنا تھا اور گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔ (بشکریہ بی بی سی، لندن)

★

درسِ عمل

مشتاق مبارک

ہر عیش اہلِ کفر پہ دنیا میں عام ہے — عشاقِ اہلِ بیت کو جینا حرام ہے

شیرازۂ حیات پریشاں ہے آج بھی — مشکل میں اب بھی امتِ خیرالانام ہے

ہیں بے کسوں پہ جبر و تشدد کی یورشیں — اب بھی حیات صورتِ مرگِ دوام ہے

قائم ہیں اب بھی حق و صداقت پہ بندشیں — باطل بساطِ دہر پہ محوِ خرام ہے

یوں تو بڑے خلوص سے ملتے ہیں اہلِ کیں — لیکن دلوں میں جذبۂ صد انتقام ہے

اے بے نیازِ ہوش تجھے کچھ خبر بھی ہے — مدت سے تو رہینِ غمِ صبح و شام ہے

اٹھ اور اٹھ کے وقت کے دھارے کو موڑ دے — پینا اگر تجھے بھی شہادت کا جام ہے

اک اور انقلاب پئے امن و عافیت — رودادِ کائنات ابھی ناتمام ہے

عزمِ حسینیت کو زمانے میں عام کر
تو عاشقِ حسین علیہ السلام ہے

ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ

(چند حقائق و بصائر)

ڈاکٹر محمد صادق

بادی النظر میں یہ سوال ایک جداگانہ حیثیت کا حامل نظر آتا ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ دراصل یہ ایک متنوع سوال کا جزو ہے۔ "ہمارے نظام تعلیم میں انگریزی کا مقام" "ہمارے نظام تعلیم میں اردو کا مقام"۔ "اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم"، درحقیقت ایک ہی اہم اصل سوال کے مختلف پہلو ہیں اور ان کی حد بندی اگر نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہذا اگر میں اپنے مخصوص موضوع سے ذرا پرے ہٹ کر متذکرہ بالا عنوانات میں مداخلت بے جا کا خطاوار ٹھہروں تو مجھے معذور رکھا جائے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں انگریزی علم و ادب کی کوئی منظم مخالفت نہیں اور جو کچھ ہے وہ محض جذباتی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم میں ایک ایسا طبقہ ضرور ہے جو انگریزی کے رواج و عروج کا شاکی ہے۔ اس کی رائے میں انگریزی کی حمایت کرنا یا اس کی تعلیم دینا ذہنی غلامی کی علامت ہے اور چونکہ ہم نئے نئے آزاد ہوئے ہیں اور اپنی آزادی پر کسی قسم کی پابندی کے لئے تیار نہیں، اس لئے یہ حربہ اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا طرز استدلال عموماً یہ ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کو ہمارے بدیشی حکمرانوں نے ہم پر مسلط کیا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہے ہمیں طوعاً و کرہاً یہ طوق غلامی پہننا پڑا۔ اب چونکہ غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے گلے سے اتار پھینکنا چاہیئے اس نظریئے کے مؤید تین قسم کے لوگوں پر مشتمل ہیں: زمانہ ساز سیاست داں یا گھٹیا قسم کے صحافی جو وطن پرستی کا ڈھنڈورا پیٹ کر عوام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا السنہ و علوم مشرقیہ کے چند نام لیوا۔ موخر الذکر طبقہ کی مخالفت محض ذاتی ہے۔ چونکہ فرنگی دور حکومت میں ان کی وہ قدر و منزلت نہ تھی جس کے وہ بوجہ اپنے علم و فضل کے مستحق تھے۔ (۲) لئے غالباً غیر شعوری طور پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت سے جس کی ایک بڑی نشانی انگریزی زبان ہے، کمل نجات مل جائے۔ تو وہ اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ یہ ایک خیال خام ہے —— میری اپنی خواہش ہے کہ ہماری مرکزی زبان اردو کو عروج حاصل ہو اور اس کا دنیا کی متمدن زبانوں میں شمار ہو لیکن یہ کام انگریزی کی مخالفت سے نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا غلامی کا سوال تو ہر وہ شخص جس نے ہماری ثقافتی تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے، ایسے گمراہ کن نظریہ سے ہرگز متفق نہ ہوگا۔ پچھلے سو سال کے محدود عرصہ میں ہماری زبان کے ادب نے جو ارتقائی منازل طے کئے ہیں ان سب کے لئے ہم انگریزی کے مرہون منت ہیں نہیں تو کس کے ہیں؟ آج سے سو سال پہلے ہمارے ہاں نثر قریباً قریباً مفقود تھی۔ ہماری زبان محض جذبات کی زبان تھی۔ اور اگرچہ متغزلین کی کاوشوں نے اس میں لچک اور روانی پیدا کر دی تھی لیکن غزل کے طلسمی دائرے کے باہر اس کی فسوں گری منقود تھی، علمی مضامین اور ٹھوس واقعات کے اظہار کی اس میں اصلا سکت نہ تھی۔ اگر ہماری شاعری "تنگنائے غزل" سے نکل کر زندگی کے بیشتر شعبوں پر حاوی ہوگئی، اگر ہمارے ادب میں افادی نثر کا آغاز و ارتقا عمل میں آیا۔ اور فن تنقید، ناول اور اس کے بعد افسانہ نے ترقی کی اور جدید صحافت نے جنم لیا تو اسے انگریزی ہی کا فیضان سمجھنا چاہیئے۔ ہماری زبان نے انگریزی کے ہزاروں الفاظ، محاورے، جملے، تراکیب اپنے اندر جذب کر لی ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر اس میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان پڑھ اور تعلیم یافتہ، مرد اور عورتیں بچے بوڑھے انہیں بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور انہیں خیال تک نہیں گذرتا کہ یہ سب کے سب غیر ملکی ہیں۔ پرانا طمطراق آمیز اسلوب متانت میں تبدیل ہو رہا ہے ادب میں نت نئے ہیئتی تجربے اور اسالیب بیان میں خوشگوار تبدیلیاں اسی اثر کی بدولت ہیں۔ دانش وروں کا طبقہ اور اس کی مخصوص ذہنیت کی تشکیل اسی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

کہ انگریزی آج تمام علوم جدیدہ کی کلید ہے اور صرف اسی کی بدولت یورپ کے علوم ادبی تحریکات اور جدید ترین انکشافات ہم تک پہنچ سکتے ہیں اور پہنچ رہے ہیں۔ اس تعلق کو قطع کر دیجئے تو ہم پر پھر وہی بے حسی، وہی جمود طاری ہو جائے گا جس سے محض انگریزی زبان کی بدولت ہمیں نجات ملی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ وہ اصحاب جو انگریزی تعلیم کو غلامی کے مترادف خیال کرتے ہیں، یہ حقیقت فراموش کئے ہوئے ہیں کہ آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز اور اس میں کامیابی کا سہرا انہیں لوگوں کے سر ہے جنہوں نے پہلے پہل انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اور انہی ان تھک کوششوں سے نہ صرف سیاسیات میں قوم کی رہنمائی کی بلکہ ان تمام مذہبی اور سماجی بدعتوں اور بدعنوانیوں سے بھی نجات دلائی جن کے مہلک اثرات سے ہمارے ذہنی اور روحانی قویٰ مضمحل ہو رہے تھے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور ان کے رفقائے کار کی ادبی و اصلاحی سرگرمیاں اسی انگریزی تعلیم کا ثمر ہی تھیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر انگریزی تعلیم نہ ہوتی تو نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی ہم غلام ہوتے۔

مانا کہ ہم نے مغرب سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ابھی ہمیں اس سے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ لہٰذا علمی اور ادبی درآمد کا یہ سلسلہ ابھی عرصہ دراز تک جاری رہنا ہوگا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ انگریزی زبان کے علم سے وابستہ ہے اس لئے ہم عرصہ دراز تک انگریزی زبان سے کلیتاً مستغنی نہیں ہو سکتے — میں یہاں صرف انگریزی زبان کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں اس کا وہی مقام ہو جو اب تک رہا ہے یا آجکل بھی ہے۔ بے شک ہم نے انگریزی سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں لیکن انگریزی کے وقار اور ہمارے انہماک کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے اپنی زبان یا زبانوں کی تہذیب و ترقی پر بہت کم توجہ کی۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور آزاد کے بعد ہماری ادبی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے حالانکہ ان کے سامنے انگریزی ادب و تہذیب کا ایک دھندلا سا نقش تھا اور بعد کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کی پیداوار تھا؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں فرق یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو قوم کی خدمت اور تربیت کے لئے صرف کیا۔ ہمارے انگریزی خواں طبقہ کی یہی معراجِ کمال تھی کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن چونکہ وہ اپنی زبان سے بے اعتنائی برتتے رہے لہٰذا نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ انہیں یہ توفیق ہوئی کہ مغربی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کر کے انہیں وسعت دیں۔ آجکل ہمارے ملک میں علوم کی فراوانی ہے۔ لیکن بخیل کی دولت کی طرح انکا کوئی نکاس نہیں۔ اب ہمیں ایسے تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت ہے جو بیک وقت انگریزی اور اردو میں مہارت تامہ رکھتے ہوں تاکہ وہ انگریزی علوم کو اردو میں منتقل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ایک محدود لیکن مستعد اور ممتاز جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ اصحاب تہذیب کے منتقل کرنے والے ہوں گے اور انگریزی علوم و ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے فرائض سر انجام دیں گے۔ ہمارے موجودہ سلسلۂ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ طلبا کی زندگی کے بہترین سال انگریزی سیکھنے پر اس لئے صرف ہوتے ہیں کہ وہ مغربی علوم کو انگریزی میں سیکھ سکیں۔ اگر انہیں یہی علوم اردو میں پڑھائے جائیں تو انہیں تین فائدے ہوں گے: (۱) اعلیٰ تعلیم کا آغاز نسبتاً چھوٹی عمر میں ہو سکے گا (۲) مطلب کے اخذ کرنے میں آسانی ہوگی (۳) تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائے گی۔ میں نے حال ہی میں ایک تجربہ کیا تھا۔ جو نتائج کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس لئے اس کا ذکر دینا بے جا نہ ہوگا۔ میں نے سالِ اول کے اوسط درجے کے دو طلبا سے کہا کہ وہ مقبرۂ انارکلی پر اردو میں مضمون لکھیں اور سالِ چہارم کے دو اوسط درجے کے طلبا سے کہا کہ وہ بھی انگریزی میں اسی موضوع پر طبع آزمائی کریں۔ جب وہ لکھ کر میرے پاس لائے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالِ اول کے مضامین میں روانی، شگفتگی اور زبان کا رواں استعمال تھا۔ اور ان کے مضامین بھی کافی طویل تھے۔ مگر سالِ چہارم کے طلبا کے مضامین مختصر اور بے جان تھے۔ ان کی زبان ایک جسدِ بے روح کی طرح تھی۔ پھر انہیں اقتصادیات کا ایک معمولی سا مسئلہ انگریزی میں سمجھایا گیا اور سالِ اول کے طلبا کو اردو اور سالِ چہارم کے طلبا کو انگریزی میں لکھنے کے لئے کہا گیا۔ پہلے تجربہ کی طرح اس میں بھی اردو والے جوابات نسبتاً بہتر تھے۔ حالانکہ انگریزی والے طلبا نے میرے انگریزی کے الفاظ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ اور اردو والوں کو اپنی جستجو سے اردو کے الفاظ تلاش کرنے پڑے تھے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ مغربی طلبا کی معلومات ہمارے طلبا کی معلومات سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہی ہے کہ

وہ ہماری طرح دوسری زبانوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، لیکن ان کا ذریعۂ تعلیم اپنی مادری زبان ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی زبان میں اظہارِ خیال کی کوشش کیجئے جس پر آپ کو کامل دسترس حاصل نہیں اور دیکھئے کہ آپ کو کتنی اعصابی اور ذہنی الجھن ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر طلبا اسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ اظہارِ خیال کے وسائل پر دسترس کا فقدان احساسِ کمتری اور اعصاب زدگی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اور ہمارے ہاں اس کی وجہ انگریزی کی غیر مناسب اہمیت ہے۔

میں انگریزی کی غیر مناسب اہمیت کا مخالف ہوں۔ اس کی اہمیت کا مجھے اقرار ہے۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ متمدن اقوام کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لئے اعلیٰ انگریزی تعلیم لابدی ہے لیکن صرف انہیں افراد کے لئے جو خود کو اس کے کام کے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں۔ اور جن میں اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت ہے۔

اگر انگریزی علوم و ادب کی صرف اتنی ہی ضرورت ہے کہ ان کی معلومات و ذخائر کو اردو میں منتقل کیا جائے تو طلبا کی اکثریت انگریزی تعلیم کیوں حاصل کرے اور اگر کرے تو اس کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟

انگریزی زبان دنیا کی مہذب زبانوں کی صفِ اول میں جگہ رکھتی ہے۔ جدید وسائلِ نقل و حرکت کی وجہ سے پرانی جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹ چکی ہیں اور روز بروز قومیں ایک دوسرے کے قریب تر آ رہی ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، سفر کی ضروریات سیاسی تعلقات۔ ان سب کی وجہ سے ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس سے ہم دوسرے ممالک سے خط و کتابت کر سکیں۔ یا رشتۂ ارتباط بڑھا سکیں۔ اس سے پہلے بھی انگریزی زبان تمام دنیا میں عموماً سمجھی جاتی تھی لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کا وقار بہت بڑھ گیا ہے اور اس نے عالمی زبان کی حیثیت سے فرانسیسی کی جگہ لے لی ہے۔ دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں یہ زبان نہ پڑھائی جاتی ہو۔ سیاسی اور ادبی دونوں لحاظ سے اسے ایک عدیم المثال وقار حاصل ہے۔ چونکہ ہم یہ زبان مدت سے سیکھ رہے ہیں اور اس میں اس کی تعلیم کی بے شمار وسائل اور صلاحیتیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اس کا بطورِ ثانوی زبان کے سیکھنا ہمارے لئے بے حد موزوں ہوگا۔

چونکہ توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب ہماری آبادی کا بیشتر حصہ اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے حاصل کرے گا، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کس قسم کا ادب زیادہ مفید ہوگا۔ میری رائے یہ ہے: چونکہ ان لوگوں کا مطمحِ نظر ادب برائے ادب نہیں ہوگا، بلکہ وہ اسے زندگی کی روزانہ ضرورتوں کے لئے حاصل کریں گے، اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ ان کے نصاب میں افادیت کا خاص خیال رکھا جائے۔ انگریزی نثر کے بیشتر انتخاب جو آجکل داخلِ نصاب ہیں ادب کے ارتقائی پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں اور ان میں جدید ادب کے ساتھ پرانے ادب کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ ایسے طلبا کے لئے مجوزہ نصاب صرف جدید ادب تک محدود رکھا جائے یہی نہیں بلکہ ایسے جدید مصنفین جو افادی نقطۂ نظر سے سود مند نہ ہوں، نظر انداز کر دیئے جائیں۔

میرے خیال میں ایسے طلبا کو مطالعۂ نظم کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی دوسری زبان کے صوتی اثرات، ترنم، نغمگی سے متاثر ہونے کے لئے فطری صلاحیت اور لگاتار کوشش کی ازحد ضرورت ہے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے الفاظ کے معانی کے علاوہ ان کی نوک پلک، مزاج، وضع قطع اور تلازمات سے کامل واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر ملکی تو ایک طرف اہلِ زبان بھی عام طور پر شاعری سے متاثر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ورڈز ورتھ لکھتا ہے:

> "یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ بیس میں سے انیس افراد میں شاعری سے کیف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی"۔
>
> اگر خود انگریزوں کا یہ حال ہے تو ہم لوگ کس گنتی میں ہیں؟

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ نظم کے مطالعے کے بغیر انسان کی ذہنی تربیت ادھوری رہ جاتی ہے اور انگریزی شاعری معراجِ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن طلبا کی اکثریت کو غیر ملکی شاعری کے مطالعہ پر مجبور کرنا جب کہ ان میں اس سے تشکیک ہونے کی صلاحیت نہ ہو؛ نیز اس کے مطالعہ سے کوئی بدیہی فائدہ مرتب نہ ہونے والا ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا اردو زبان میں فی الوقت اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اسے انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی زبان کو اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں آہستہ آہستہ تمام مطلوبہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں کوئی زبان خود بخود ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ جب اسے اعلیٰ مطالب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی وسعت، گہرائی اور لطافت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

انگریزی کے مخالفین اور ان کی نفسیات کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اردو کے مخالف بیشتر وہ اساتذہ ہیں جو انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی انگریزی سے شیفتگی صرف ایک عادت ہی کا سوال نہیں بلکہ انسان بالطبع آرام پسند واقع ہوا ہے اور یہ حضرات محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی ذریعہ تعلیم نہ رہی تو انہیں نئے ذریعہ تعلیم پر دسترس حاصل کرنے کے لئے محنت شاقہ کی ضرورت ہوگی۔ نیز انہیں حفظ مراتب کا بھی خیال ہے۔ "حوادث سن ستاون" کے بعد مسلمان علمائے نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لئے بھی کی تھی کہ سلسلہ تعلیم مسجدوں اور خانقاہوں سے نکل کر کالجوں اور مدارس میں جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مذہب کی آڑ لیکر مغربی تعلیم کی تکفیر کی۔ بالکل اسی طرح آجکل کے اساتذہ جو علوم مغربی کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دے رہے ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی کے وقار میں فرق آگیا تو ان کے ذاتی وقار میں بھی فرق آجائے گا چنانچہ وہ اردو کی کم مائگی پر زور دیتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ پرانا نظام تعلیم قائم رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی کی مخالفت کرتے ہیں وہ یا تو جذباتی ہیں یا خود غرض یا دونوں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اردو کے خلاف ہیں۔ اپنے آرام کو ملکی اور قومی ضروریات پر مقدم خیال کرتے ہیں۔

وہ صورت حال جس سے ہم آجکل دوچار ہیں انئی نہیں ہے۔ بیشتر زبانوں کو انہیں مراحل سے گذرنا پڑا ہے اور دانشمندوں نے قومی ضروریات کے پیش نظر آرام طلبی کی خوشگوار راہوں پر کوشش اور علو ہمت کے کٹھن اور دشوار گذار رستے کو ترجیح دی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات سے بیشتر فارسی کو وہی وقار حاصل تھا جو ہمارے ہاں آجکل انگریزی کو ہے۔ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستانی علمائے یہ محسوس کیا کہ انہیں اردو کو فروغ دینا چاہئے۔ اس تحریک میں خان آرزو سب سے آگے تھے۔ وہ اور ان کے رفقاء اس مشن میں کامیاب ہوئے چنانچہ فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ لیکن اردو کو فروغ دینے کا ان کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا ——— یہ کہ اردو کو فارسی کی دولت سے مالامال کیا جائے۔ اگر آج ہم اردو کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمارا بھی ایسا ہی فیصلہ ہونا چاہیئے یعنی انگریزی علوم کو عرق ریزی اور جانفشانی سے اردو میں منتقل کردیں۔

اس عمل کی بہترین مثالیں آپ کو مغربی نشاۃ الثانیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ مثالیں اتنی وقیع ہیں، نیز وہ ہماری موجودہ صورت حال سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ وہ بلاشبہ ہمارے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہیں۔ نشاۃ ثانیہ درحقیقت السنہ قدیم اور ان کے ادب کی احیا و ترویج کا دوسرا نام ہے۔ اس احیا میں جو لوگ آگے تھے انہیں HUMANISTS کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یورپ کی ورنیکلرز بانیں یونانی اور لاطینی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور وہ ان قدیم زبانوں سے بالکل اسی طرح مرعوب تھے جیسے آجکل ہم انگریزی سے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان علماء کے نظریے میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے عوام کی زبانوں کو اپنی ادبی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ انہیں زبانوں میں جن کی کم مائگی زبان زد خلائق تھی، اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں اور انہیں بعد میں "کلاسکس" یا ادب عالیہ کا درجہ دیا گیا۔

دیکھئے ذیل کے اقتباسات ہمارے کتنے حسب حال ہیں :-

سپیرونی (SPERONI) لکھتا ہے :-

"زبانیں قدرتی پیداوار نہیں ہوتیں۔ ان کی تشکیل انسان کی اپنی ضروریات اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔ زبانیں درختوں کی طرح نہیں ہوتیں کہ کچھ کمزور اور دوسری توانا۔ جو انسانی افکار کے بوجھ کی متحمل ہوسکیں بلکہ ان سب کی صلاحیتیں استعمال کرنے والوں کی کاوشوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اظہار خیال کی طاقت خود بخود پیدا ہو جائے۔ اس کا دارومدار اس کے استعمال کرنے والوں کی قوت ارادی اور سعی پیہم پر ہوتا ہے۔"

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

واقعۂ کربلا اور ہمارا علاقائی ادب

ضیاء الحسن موسوی

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بو تراب
سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا (غالب)

ہمارا علاقائی ادب ہماری مذہبی اور ثقافتی زندگی سے فطری طور پر مربوط ہے۔ ہمارا وطن بظاہر مختلف علاقوں میں رہنے بسنے والوں، مختلف بولیاں بولنے والوں کا مجموعہ ہے مگر یہ اختلاف ویسا ہی ہے جیسے ایک نظم کے مختلف اشعار میں ہوتا ہے۔ ہر شعر کا مطلب اپنی جگہ الگ مگر ہر شعر کا وزن و قافیہ و آہنگ ایک۔ ایک ہی مرکزی خیال سب اشعار کو مربوط کر کے نظم کی شکل دیتا ہے۔ یہی مرکزی خیال ہمارا وطن ہے جو ہمارے ہر علاقے میں مشترک ہے۔

ہماری قومی روایات میں قربانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہر زندہ قوم کی گرمیٔ حیات میں یہی عنصر سب سے اہم ہے۔ قربانی کے لئے جتنی بلند مثالیں جس قوم میں ہوتی ہیں اُتنا ہی اس کا اجتماعی جذبۂ فدویت بھی ہوتا ہے۔

استقلالِ پاکستان کی صد سالہ تحریک میں، جس کو غیروں کی لکھی ہوئی تاریخیں مختلف ناموں سے یاد کرتی ہیں، مسلمانانِ برصغیر نے بے شمار قربانیاں دی ہیں اور ان قربانیوں سے وہ اخلاقی طور پر ضرور فاتح ہو کر نکلتے رہے ہیں تاآنکہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے اخلاقی اور مادی کشمکش کا آخری مورچہ بھی فتح کر لیا اور اپنی قومیت اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک عظیم وطن حاصل کیا۔ یہی ان کی مختلف تحریکوں کا مقصد تھا۔

آزادی کے بعد زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی ازسرِ نو تنظیم و ترتیب کے ساتھ ہم کو اپنے ادبی ورثہ کی بھی تنظیم و ترتیب کرنی تھی اور اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے علاقائی ادب کو جگر لخت لخت کی طرح جمع کر رہے ہیں اور اُس کے مختلف رجحانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ابھی یہ کام بالکل ابتدائی منزل میں ہے اب تک تو ہمارے اہلِ قلم ناقدری اور ناموافق حالات ہی سے دوچار تھے مگر اب اس نئے دور میں پاکستانی اہلِ قلم کے وجود اور مستقبل، آزادی اور خودداری کی ضمانت مل گئی ہے اور اب ہم اپنے سرمائے کی طرف خود اعتمادی سے متوجہ ہو رہے ہیں۔

ہماری قومی روایاتِ فدویت و قربانی میں معرکۂ کربلا "سجدہ گہِ عزم و یقیں" کی حیثیت رکھتا ہے اور بقول اقبال "مقامِ شبیری" حقیقت ابدی ہے، اور ادب ہمیشہ ابدی حقائق سے بھرپور تاثر حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے علاقائی اور قومی ادب میں اس واقعہ کے تاثرات عام ہیں۔ ان تاثرات کے جائزے کے لئے وسیع مطالعے اور چھان بین کی ضرورت ہے۔ سر دست ان تاثرات کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور اس توقع کے ساتھ کہ دوسرے اہلِ قلم ان ادھورے خاکوں میں رنگ بھریں گے اور ان کو زیادہ بھرپور اور جاذب نظر بنانے کی کوشش کریں گے۔

پشتو ادب

پشتو ادب تمام کا تمام شجاعت اور بہادری کے جذبات سے لبریز ہے۔ ۵۰۰ھ کے بعد سے پشتو شاعری نے فارسی شاعری کے اثرات قبول کئے اور عارفانہ شاعری کا آغاز ہوا۔ پشتو کی سب سے پہلی دریافت شدہ کتاب "تذکرۃ الاولیاء" ہے۔ یہ ۶۱۲ھ (۱۲۰۰ء) میں سلمان ماکو نے لکھی جو قندھار کا رہنے والا تھا۔ ملا نور المشائخ مرحوم کے قول کے مطابق اس میں ایک پورا باب امام حسن اور امام حسین کی شہادت سے متعلق تھا۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اس کے چند ہی اوراق مورخینِ ادب کے ہاتھ آسکے ہیں۔

پشتو کا مشہور شاعر، خوشحال خاں خٹک، اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

پہ یزید باندِ لعنت شہ پہ اعوان ئے　　چہ پہ تیغ ئے دنبی نمسی مظلوم درے

پشتو غزل اگرچہ ایرانی غزل سے متاثر نظر آتی ہے لیکن اس میں "جمال وجلال" کا توازن ہے اور تصوف کے ذوق نے اس کو سوز و ساز بھی عطا کیا ہے اور قبائلی زندگی کے مردانہ صفات نے اس کو حماست اور رجز کا انداز بھی بخشا ہے۔

پٹھانوں کی زندگی میں غیرت، شجاعت، سرفروشی، جانبازی، ایفائے عہد اور قربانی کے جذبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ پشتو ادب میں واقعۂ کربلا کے اشارات فطری ہیں اس لئے کہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ صدیوں سے مسلمانوں کے جذباتِ فدویت و قربانی اور شجاعت و وفائے عہد کے لئے ایک جاودانی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

پشتو کے نوحے اور مرثیے بھی عربی مراثی کی طرح صفاتِ شجاعت و عزم و مہمان نوازی، بلندی نسب اور مثالی روایات کی یاد سے بھرپور ہیں گویا بقول جوش ملیح آبادی ؎

آنکھ میں آنسو ہو، سینے میں شرارِ زندگی
شعلۂ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

بنگال میں تیرھویں صدی عیسوی میں جب پٹھانوں کی حکومت قائم ہوئی اور پٹھان حکمرانوں کے زیر اثر جو بنگلہ ادب پروان چڑھا، اُس میں اسلامیات کا عنصر نمایاں تھا۔ اس دور کی ایک کتاب "مقتل حسین" کا تذکرہ بنگالی ادب کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اس ادب سے بھی پٹھانوں کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

اب پشتو کے نئے ادب میں بھی پاکستانی قومیت کے واضح نقوش نظر آنے لگے ہیں اور اپنی روایات پر نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ پشتو ادیب کو اس کا پورا احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک عظیم وطن کا باشندہ اور عظیم افتخار کا حامل ہے اور اس کے ماضی کا سلسلہ ایک "حال" تک پہنچتا ہے اور یہ حال عظیم ماضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔

سمندر خاں بدرشی کا ترانہ (زۂ اوس آزاد او پہ عمل لکہ فولادیم۔ مومن همه جادیم ...الخ) "میں اب آزاد ہوں، آباد ہوں اور شاد ہوں، اپنی سرزمین پہ قربان ہوں اور سر مال کی بازی لگا چکا ہوں۔ میں مسلمان ہوں، پاکستان میرا وطن ہے۔ وطن کیا گویا چمن ہے جو لہلہا رہا ہے میں سعی و عمل میں مانند فولاد ہوں۔ میں مومن ہوں اور سخی ہوں" ان نئے رجحانات کا مظہر ہے۔

پشتو کے نئے ادب میں تقی شراب ہاشمی کے ایک مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں جس کا عنوان ہے: "دکربلا ننداره"

غرمه ده، خړه دشته ده، سیلی طوفانونه
پېټ تاد سپينو تورو، توره لمبه، خوځگر دونه
لختی لختی په زړګی، د سرو وینو قطار دونه
سینے سورے سورے، د تیرو غشو بارونه
صحرا دکربلا په سور کو وینو لاله زار وه
فضا کښې سر کړدانه قافله دخو غبار وه
یو خوا په وینو رنګ ایخ مخلے علی اکبر وه
بل خوا په کرم رنګ پېروت معصوم علی اصغر وه
بې یار و مدګار پاتے نمسے د پېغمبر وه
نری نری ګردونه هسکیدل، لوړ منځګر وه
خپل سر ئے هم آخر کښې د اسلام په نامه زار کړو
چمن ئے د توحید په خپلو وینو لاله زار کړو

سیلی طوفان، دشمنوں کی قطاریں، تیروں کی بارش، خون شہداء سے صحرائے کربلا کی لالہ زاری اور سردار قبیلۂ آل محمدؐ کے خون سے فضا کی غبار آلودگی، اکبر و اصغر کی شہادت، نواسۂ رسول کی تنہائی، ان سب مصائب کا مقصد وہی تھا جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے کہ ؎

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　　سطر عنوان نجات ما نوشت

بنگالی ادب

۱۲۰۰ء کے بعد سے بنگال مسلسل مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بنگلہ زبان نے ادبی حیثیت اختیار کی اور اس میں ایک ثقافتی روایت پیدا ہوئی جس میں اسلامی اثرات بہت نمایاں ہیں بلکہ مسلمان مصنفین کی عہد بہ عہد تصانیف سراسر اسلامی خصوصیات رکھتی ہیں۔ بنگالی زبان کا بیشتر سرمایہ مسلمان شاعروں، عالموں، صوفیوں اور حکمرانوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

واقعۂ کربلا کے متعلق بنگالی ادب میں سب سے پہلی چیز ہم کو سولہویں صدی کے مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ کی "جینبیر چوتیشا" (۳۴ حرفی مرثیۂ حضرت زینب) نظر آتی ہے جس کے متعلق ڈاکٹر انعام الحق "مسلم بنگالی ادب" میں لکھتے ہیں:-

> "مرثیے:- سولہویں صدی میں بنگالی میں حزنیہ موضوع پر قصے کہانیاں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن بقول ایک انگریز شاعر کے ہمارے سب سے میٹھے گیت وہی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ حزن و ملال کے خیالات ہوں چنانچہ بنگالی ادب کے اس دور میں مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ نے حضرت زینب پر 'چوتیشا' لکھ کر بنگالی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔
>
> چوتیشا جسے ۳۴ حرفی کہنا چاہئے بنگالی نظموں کی ایک بہت قدیم صنف ہے۔۔ سنسکرت سے یہ صنف بنگالی ادب میں منتقل ہوئی اور یہاں شیخ فیض اللہ نے اس کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ شیخ نے واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینب کا نوحہ نظم کیا ہے۔ اس نوحے کے بعد پھر 'ضریح' گیتوں اور دوسری نظموں مثلاً "مقتل حسین" کا رواج شروع ہوا۔" (ص ۱۲۸-۱۲۹)

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ شہادت امام حسین کے بعد سب سے پہلا نوحہ یا مرثیہ جناب زینب ہی کا ملتا ہے اور بنگالی ادب میں بھی صنف مرثیہ کا آغاز انہی کے ترجمے سے ہوا ہے۔

اس طرح بنگالی ادب میں "چوتیشا" مرثیے کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر کربلا کے متعلق عوامی گیت "ضریح" کہلائے۔ یہ غالباً ویسے ہی ہونگے جیسے اودھ کے دیہاتوں میں "دھمے" ہوتے ہیں اور پھر مرثیے کی ایک اور شکل کا نام "مقتل حسین" ہوا۔

یوں تو بنگلہ زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مگر چند پوتھیاں عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً جنگ نامۂ حضرت علیؑ اور محمد خاں کی مشہور تصنیف "مقتل حسین"۔

"مقتل حسین" ایک طویل نظم ہے اور محمد خاں کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ چند سال قبل کلکتہ میں "بڑتلہ" سے شائع کی گئی تھی مگر اب کمیاب ہے۔ محرم کے مہینے میں یہ کتاب جگہ جگہ گھروں میں اور باہر لوگ بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے لیکن اس کی بڑی خوبی شاعرانہ بلند خیالی ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ محمد خاں نے یہ کتاب "مہابھارت" کے جواب میں لکھی تھی۔ ہندوؤں کی کتابیں مسلمانوں میں عام تھیں سید سلطان نے اپنے شاگرد محمد خاں کو ہدایت کی کہ وہ تاریخ اسلام سے ایسی نظمیں تیار کریں جو مسلمانوں میں مقبول ہوں، وہ اپنے ماضی کی عظمت سے آگاہ ہوں اور ہندوانہ خیالی قصوں کی جگہ حقیقی بہادری اور جرأت و مردانگی اور مقابلۂ حق و باطل کی داستانوں سے سبق اندوز ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ محمد خاں نے "قاسمیر لڑائی" یعنی حضرت قاسم کی جنگ" کے نام سے بھی ایک مرثیہ تصنیف کیا تھا سترھویں صدی کے ایک شاعر، فقیر غریب اللہ نے بھی "مقتل حسین" لکھی تھی جو نامکمل رہی۔ اس کو ایک اور شاعر، محمد یعقوب نے مکمل کیا۔ محمد یعقوب چوبیس پرگنہ کے باشندے تھے۔ کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۹۴ء ہے۔ یہ جنگ نامہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔

عہد مغلیہ کے آخری شاعر حیات محمود نے جو ضلع رنگپور کے تھے، ۱۷۲۳ء میں "جنگ نامہ" یا "محرم تہوار" کے نام سے ایک طویل مرثیہ تصنیف کیا ہے جو حضرت جبرئیل کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اور حسنین کی شہادت کے مکمل واقعات نہایت مؤثر انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔

چاٹگام کے رہنے والے ایک اور شاعر حمید اللہ خاں (۱۸۷۰ - ۱۸۰۸ء) کو عبوری دور کا بہترین شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم "گلزار شہادت" ہے۔ یہ اُس عہد کا کارنامہ ہے جب بنگالی ادب کے میدان پر غیر مسلم ادیب و شاعر چھا رہے تھے۔

نذرالاسلام کی شاعری کو واقعۂ کربلا سے ایک خاص تعلق ہے کیونکہ اس کی ابتدا اسی سرزمین میں ہوئی۔ قاضی نذرالاسلام "شط العرب" کے قریب ایک خندق میں بیٹھے تھے، پہلی جنگ عظیم کی ایک رات تھی، اس ماحول میں ان کی شاعرانہ طبیعت پر الہامی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے اپنی پہلی نظم "شاتی العرب" تخلیق کی اور ان کی شاعری پر واقعۂ کربلا کے تاثرات اس طرح چھا گئے کہ اس مجاہدۂ حق کی مصطلحات جابجا اُن کی نظموں میں جھلکنے لگیں۔ وہ اپنی نظم "مجاہد کی صدا" میں کہتے ہیں:۔

"نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہہ رہی ہے
لیکن اُس کا ساحل قربانی کا پیاسا ہے
ظلم و ستم کی فوجیں موج در موج چڑھتی آتی ہیں
اور میں عباسؓ کی طرح اس دریا کو اپنی تشنہ لبی کا پیغام سنانے جا رہا ہوں ......"

سندھی ادب

"وادی مہران" یا "وادی سندھ" قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے برصغیر کا یہی وہ خطہ تھا جہاں سب سے پہلے اسلام کا پیام پہنچا اور تقریباً ساڑھے سترہ سو سال کے بعد یہ خطہ بھی دنیا کی پانچویں بڑی اور سب سے بڑی مسلم مملکت کا جزو بن گیا۔ ابتدائے عہد اسلام ہی سے سندھ کے باشندے علوم اسلامی کی تشنگی میں حجاز و عراق و ایران پہنچنے لگے اور وہاں سے یہ تاثرات لاکے شمالی برصغیر میں پھیلانے لگے۔ سندھ کے ادب میں سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام سے کون واقف نہیں؟

سندھ کے مشہور شاعر سید ثابت علی شاہ میاں غلام شاہ کلہوڑو کے دور حکومت میں ۱۷۴۰ء م ۱۱۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ شہزادہ میاں سرفراز خاں کے ہم عصر شاعر تھے۔ اسی زمانے میں میاں مسکین پنجابی کی مرثیہ گوئی کا شہرہ تھا جن کا ذکر سودا نے بھی کیا ہے۔ خود شاہ صاحب سندھی میں بڑے پائے کے مرثیے کہتے تھے۔ ایک مرثیے میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ "ہند میں مسکین اور سندھ میں میں نے مرثیے کہے ہیں"۔ ثابت علی شاہ میر انیس (ولادت ۱۲۱۶ھ) اور میرزا دبیر (ولادت ۱۲۱۸ھ) سے پہلے اور میر ضمیر اور میر حسن کے ہم عصر تھے۔

سندھ کے آخری تاجدار ہز ہائی نس میر محمد محسن علی خاں جب قید ہو کے کلکتے گئے تو وہاں انہوں نے مراثی انیس و دبیر سُنے اور جب رہا ہو کر واپس آئے تو اپنے استاد مرزا فتح علی بیگ کے مشورہ سے سندھی میں اس طرز کے مرثیے تصنیف کرنے لگے۔ انہوں نے انیس و دبیر کے مراثی کا سندھی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کے علاوہ مرزا مراد علی بیگ سائل، آخوند محمد عالم، مرزا فتح علی بیگ، مرزا بدھل بیگ، مرزا قلیچ بیگ، اور خواجہ ناصر علی ناصر نے بھی مراثی انیس و دبیر کے ترجمے کئے ہیں۔

شاہ عبداللطیفؒ نے اپنی نظموں کے لئے ایک خاص "سُر حسینی" ایجاد کیا تھا۔[1]

شاہ صاحب نے واقعات کربلا پر ایک طویل مرثیہ لکھا ہے جس کے منتخب اشعار کا رئیس امروہوی نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور وہ "تحفۂ لطیف" (شائع کردہ محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان) میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مرثیہ ہے جو ترجیع بند بھی ہے اور جس میں "محرم آگیا امت کے شہزادے نہیں آئے" کی ہر بند کے بعد تکرار ہے۔ اس میں جا بجا نوحے بھی ہیں، جس طرح اردو کے طویل قصائد کے درمیان غزل آجاتی ہے۔

اس مرثیے میں ایسے زندہ اور حرکت میں لانے والے مضامین ہیں کہ اس کو شاہ عبداللطیفؒ کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اندازہ کے لئے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا ۔۔۔ وہ راہیں آج تک اس قافلہ کو یاد کرتی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "سُر حسینی" ماہ نو اگست ۱۹۵۸ء (مدیر)

شہادت کیا ہے اک ورثہ محمد کے گھرانے کا ——— کوئی شکوہ نہ تھا مولا کو اعدا کے ستانے کا
شہید عشق ہی واقف ہے اسرار شہادت سے ——— وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا
مدینے سے چلے تھے امتحان گاہ مصائب کو ——— جہاد فی سبیل اللہ کی دھن میں خدا والے
مصائب تھے مگر حضرت نے ماتھے پر نہ بل ڈالا ——— شجاعت سے نظام زندگی سارا بدل ڈالا
شکست ظاہری فتح مبین عشق ہوتی ہے ——— حسینی فوج نے باطل کی قوت کو کچل ڈالا
حبیبؐ اللہ اکبر اے حسینؓ اے کربلا والے ——— سبق لیں تجھ سے ایثار و شجاعت کا وفا والے

نوحہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھو غم رسیدوں کا ماتم کرو ——— خدارا شہیدوں کا ماتم کرو
اٹھو فخر امت کا ماتم کرو ——— قتیل صداقت کا ماتم کرو

پنجابی ادب

پنجابی ادب عہد نو سے پہلے پنجاب کے ہرے بھرے دیہات کا ادب تھا اور زمانۂ ماقبل اسلام کی عربی شاعری کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اس میں داستانیں بھی تھیں اور تانیں بھی، چھوٹے چھوٹے رسیلے اور دلسوز گیت بھی اور رماہیے جیسے متنوع اور سریلے گانے بھی۔

مسلم پنجاب نے عربی فارسی اور اردو کو اس طرح اپنایا کہ اس میں اہل زبان کے درجے کے افراد پیدا ہوئے۔ خصوصاً اردو پر ان کے احسانات کو احسان فراموش بھی نظرانداز نہیں کرسکتے۔ اس لئے مسلم پنجاب کا زیادہ مکتوبی ادب فارسی اور اردو میں ہے پھر بھی پنجابی عوامی ادب میں ان کے بعض عظیم کارنامے ہیں۔ پنجابی کی مختلف منظوم داستان ہائے حسن و عشق کے آغاز میں واقعۂ کربلا کا تذکرہ ہے مثلاً:

حضرت حسن حسین دی ذات علیؑ شیر خدا دے شیر دونویں
لخت جگر رسول بتول جائے عاشق رب دے مرد دلیر دونویں
جنہاں کدی سوال نہ رد کیتا دکھے راہ مولیٰ کئی دیر دونویں
منزل عشق دی جنہاں ثبوت کیتی مڑے ذرہ نا ہی قدم پھیر دونویں

(ہیر وارث شاہ)

پنجابی کے نوحے اور مرثیے جو منتشر ہیں اگر یکجا ہو جائیں تو معلوم ہوگا کہ پنجاب نے صرف "میاں مسکین" ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اور بھی صدہا عاشقان اہلبیت پیدا کئے ہیں اور پنجابی میں ایسے سخن پارے ہیں جو فنی اعتبار سے بھی اور سوز و اثر کے اعتبار سے بھی پاکستان کے علاقائی ادب میں نہایت قیمتی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلوچی اور مکرانی ادب

بلوچی زبان جو شمالی اور شمال مشرقی علاقے میں بولی جاتی ہے اس کو سلیمانی کہتے ہیں اور جنوب مشرق اور مشرقی علاقے کی زبان مکرانی کہلاتی ہے۔ بلوچی زبان جدید فارسی سے بہت مشابہ ہے اور پاکستانی اور ایرانی ثقافت کی ایک درمیانی کڑی سمجھی جاتی ہے۔ پھر بھی بلوچی زبان فارسی کی شاخ نہیں بلکہ ایک مستقل زبان ہے۔

بلوچی ادب بھی زیادہ تر سینہ بسینہ روایات کے سہارے زندہ ہے اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلوچی شاعری میں مذہبی شاعری کا بڑا حصہ ہے اور اس میں بکثرت نوحے اور مرثیے موجود ہیں اس کی اکثر نظموں میں جابجا واقعۂ کربلا کی تشبیہیں، اشارات اور استعارات پائے جاتے ہیں۔

بلوچی ادب کے متعلق ابھی بہت کچھ کام ہونا ہے۔ جب یہ ذخیرہ مرتب ہو جائے گا اسی وقت اس کا تنقیدی جائزہ ممکن ہو سکے گا۔ مشرق وسطی کے ایک سفر کے دوران کوئٹہ میں ایک بلوچی مرثیہ گو نے، جو فارسی سے بھی واقف تھا، مجھے بلوچی کے چند مرثیے سنائے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ ان مراثی پر فارسی مراثی کا کافی اثر ہے۔ مگر یہ اسلوب کی حد تک ہے، مضامین میں مشرق اسلامی کی جاگتی ہوئی روح

آزادی کی گھن گرج واضح طور سے سنائی دیتی ہے۔

کشمیری ادب

کشمیری ادب بھی تصوف کے سرچشموں سے سیراب ہوا ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی شہید کربلا کی نسل کے مبلغین، اہل علم و عرفان اور ان سے فیض یافتہ علماء کی مساعی کی احسان مند ہے۔

کشمیری ادب میں نوحوں اور مرثیوں کی کثرت ہے اور کشمیری مرثیہ ادب کی ایک اعلیٰ صنف ہے۔ اس موضوع پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی سید رضا ہمدانی نے اپنے مضامین میں کشمیری مرثیے کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> کشمیری ادب میں صنف مرثیہ بڑی مالا مال صنف ہے اگرچہ موضوع کے اعتبار سے یہ بڑی محدود ہے یعنی صرف واقعات کربلا، شہادت حسین، اور مصائب اہلبیت پر مشتمل منظوم کلام ہے، لیکن اس کے باوجود ادب کے تمام اصناف کا احاطہ کرتا ہے۔ کشمیری مرثیہ فن کی کسوٹی پر کسا جائے تو زر خالص سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کشمیری مرثیہ تکنیک کے لحاظ سے اردو یا فارسی مرثیوں سے قطعاً جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اسی طرح کشمیری نظم تکنیک کے اعتبار سے فارسی یا اردو نظم سے یکسر جدا ہے، کشمیری مرثیے کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی عنوان کے تحت لکھا جائے۔ شاعر مرثیہ تصنیف کرنے سے پہلے عنوان تجویز کرے۔ عنوان شاعر کی اپنی پسند اور رجحان پر منحصر ہے مثلاً مرثیہ نگار نے "قفس" عنوان پسند کیا تو اب اسی عنوان کی رعایت سے سارے کا سارا مرثیہ مرتب ہونا چاہیئے۔ آغاز سے اختتام تک کہیں بھی تلازمے اور رعایت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیئے:

کشمیری مرثیہ بالعموم طویل ہوتا ہے اور طویل نظم کی طرح اس میں مختلف بند ہوتے ہیں۔ ہر بند کو "چھیٹر" کہتے ہیں جس کے پہلے دو شعر الگ الگ قافیوں میں ہوتے ہیں پھر دو مصرعے الگ پھر دو چار یا چھ مصرعے الگ قافیوں میں آخری مصرع پھر ایک الگ قافیے میں ہوتا ہے۔ یہ التزام دوسرے بندوں میں بھی ہوتا ہے اور جو قافیہ ردیف پہلے بند میں اختیار کیا جاتا ہے وہی مرثیے کے آخری بند تک قائم رہتا ہے۔

کشمیری مرثیے کا پہلا بند یا چہرہ حمد باری پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرا نعت سرور کائناتؐ اور منقبت امیرالمومنین علی پر۔ اس کے بعد گریز کے بند ہوتے ہیں اور پھر غیر محدود بند مصائب اور واقعات کربلا پر۔

دوسری زبانوں کے مراثی کی طرح کشمیری مرثیہ بھی اگرچہ رونے رلانے کے لئے کہا جاتا ہے تاہم اس کے چہرے میں علمی، ادبی، فقہی اور تاریخی واقعات و مسائل اور اخلاقی تعلیمات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تعلیمی افادیت بھی مسلم ہے۔ کشمیری مرثیے کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں: عرش، پیدائش۔ قفس۔ زینہ عطش۔ دماغ اور آئینہ۔ نصرت۔ مرغ۔ کعبہ۔ چہار فصل۔ ماہ و سال۔ قرآن۔ عرش۔ اصول دین قیم۔ انگشتری۔ کیمیا۔ کاغذگری، حکمت، میراث، سفینہ، حج، ماہ صیام وغیرہ۔

کشمیری مرثیہ گو بڑے عالم و فاضل و زاہد و عابد گزرے ہیں۔ بعض کو کشمیر میں "ولی" کا درجہ حاصل ہے قدیم مرثیہ نگاروں میں مرزا ابوالقاسم، یوسف بابا، حبیب ملہ، منشی صفدر علی، حکیم حسن، منشی صادق علی خواجہ دیم حنفی، مولوی عبداللہ اسد، رضا شاہ، عظیم اور رحیم کافی شہرت کے مالک ہیں۔

کشمیری مرثیہ خوانی کا طریقہ بھی کشمیریوں کی اپنی ایجاد ہے۔ امام باڑے میں آٹھ یا دس افراد دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ دائرہ "پس خوان" کہلاتا ہے۔ دائرے بہت سے بھی ہوتے ہیں۔ ذاکر جیسے ہی مرثیہ شروع کرتا ہے پس خوان اس کو دہراتے ہیں اور ہم نوائی کرتے ہیں۔ کشمیری مرثیہ خوانی کی طرز لے اور دھن بڑی شیریں ہوتی ہے۔ کشمیر کے علاوہ لاہور، پشاور، کراچی وغیرہ میں بھی ایسی کشمیری مجالس ہوتی ہیں۔

یہ تھیں پاکستانی علاقائی ادب کے ایک خاص موضوع کی چند جھلکیاں۔ وہ ادب جو اب از سر نو اپنی روایات کے مطابق آراستہ ہو رہا ہے اور جس میں ہر روز نئی نئی اور زندگی آموز آوازیں شریک ہو رہی ہیں۔ وہ آوازیں جو مل کے ایک وطن عظیم کی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہیں۔ ان آوازوں کے لئے معرکۂ کربلا ہو یا ایسے ہی دوسرے حق و باطل کے معرکے، ہمیشہ نئے نئے گوشے، نیا اعتماد، نئی قوت اور نیا تاثر فراہم کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ معرکۂ کربلا کا سب سے بڑا پیام یہ ہے: "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی" اور پاکستان کی آزاد فضا جو صدیوں کی قربانی کا حاصل ہے عزت کی زندگی کا ماحول ہے اور اس کو برقرار رکھنے کا پہلا فرض ادب ہوں ہی کا ہے۔
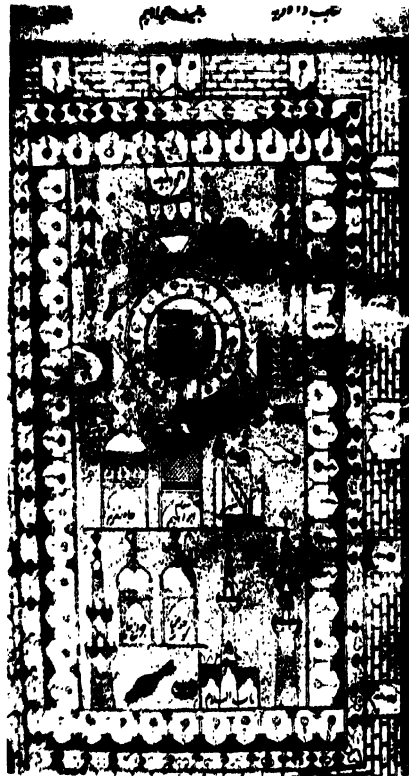
"فتوح الحرمین"

(دور مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)
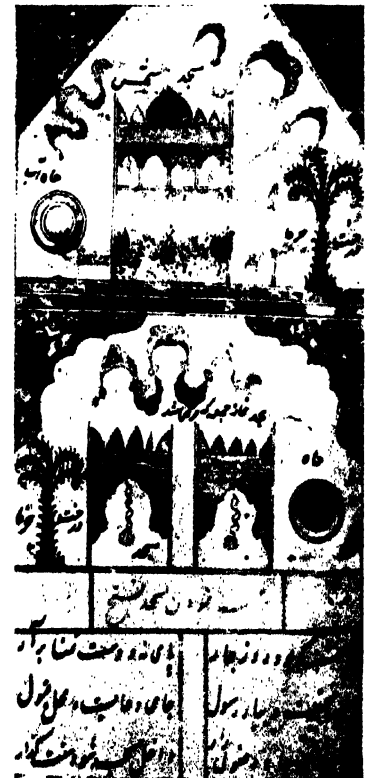
پاکستان کی دانش گاہیں

ڈھاکہ یونیورسٹی

پنجاب یونیورسٹی

کراچی یونیورسٹی

پشاور یونیورسٹی

ماہ نو، کراچی، اگست ۱۹۵۹ء
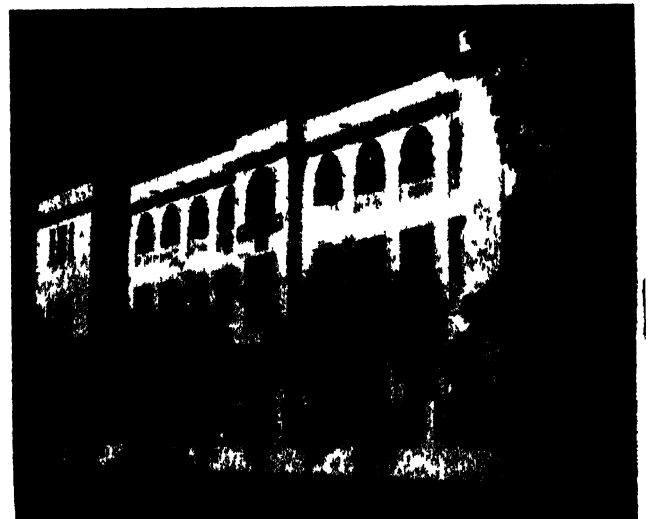
"فتوح الحرمین"

(عہدِ مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبد الرشید

فریضۂ حج ہمیں بار بار اُس عہد اور اُن مقامات کی یاد دلاتا ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا اور ہم بصد شوق یہ پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اس سلسلہ میں ہماری نظر فارسی کی ایک مثنوی "فتوح الحرمین" پر پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد سے ہے اور اس میں حرمین شریفین اور ان کے مضافات کے اہم مقامات کا تذکرہ ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک فارسی مثنوی کے چھوٹے سے مسودے پر مشتمل ہے جس میں ۱۱۰۰ کے لگ بھگ اشعار ہیں۔ حرمین اور ان کے مضافات وغیرہ کی کیفیت بیان کرنے کے علاوہ اس میں احکامِ حج کی بجا آوری کی مفصل کیفیت بھی درج ہے۔

یہ کتاب گزشتہ صدی کے اواخر میں دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ گو اس کے کئی نسخے مختلف لائبریریوں یا ذاتی کتب خانوں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ میرے پاس جو مخطوطہ ہے وہ کئی وجہ سے خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ خاص مدینۂ منورہ میں لکھا گیا اور اس سے رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے عہدِ مبارک کے تاریخی مقامات کے سنہرے اور نیلے رنگوں میں سترہ نقوش ہیں۔ یہ نقوش دو ابعادی ہیں۔ مصنف کا نام محی لاری ہے جیسا کہ مثنوی کے دو آخری ابیات سے ظاہر ہے ؎

محیؔ ازاں ہر دو طلب کام خویش
محو کن از لوحِ کساں نام خویش

گرم شد از سعیٔ تو بازارِ حج
ختم بنظمِ تو شد اسرارِ حج

یہ بات کہ مثنوی مدینہ میں لکھی گئی، کاتب کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

"تحریر یافت در مدینۂ منورہ"

یہ بات اس مخطوطہ میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے کہ اس صفحہ پر مشہور ایرانی شاعر حکیم محمد آتشی کا نام درج ہے جو سلطان عادل شاہ ﷫ کا درباری شاعر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آتشی کوئی اور کاتب ہو جس نے مثنوی کی کتابت میں حصہ لیا۔ آتشی کے نام کے بعد فوراً ہی مصنف کا نام اس طرح آتا ہے:

الفقیر آتشی

از تصنیف محی علیہ رحمۃ

ایک اور بات جو اس نسخہ کی دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیتی ہے یہ ہے کہ یہ دراصل مشہور ایرانی شاعر طالب ہمدانی کی ملکیت تھا جس نے وصلی پر اپنے ہاتھ سے یہ اشعار تحریر کئے ہیں ؎

عجب تمام کہ با من ....
لطف او با من بلطفہ که نیست
مو ان صبح کہ تو دم کاستہ دل بجز
با عرب عجم ندیم دل محزون نیست

ان اشعار کے بعد طالب ہمدانی کے ہاتھ سے یہ الفاظ بطور تکملہ درج ہیں مگر تاریخ تحریر درج نہیں :

این رباعی بجہت یادگاری مشفق مرزای میرک حسین ....

فقیر حقیر طالب ہمہ ....

اسی عبارت کے نیچے مشہور خطاط، محمد صالح مشکیں قلم ولد میر عبداللہ زریں رقم کے ہاتھ سے چند الفاظ تحریر ہیں جو عبدالرحمٰن رشیدی کے ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شاہی خطاطی اور مہتمم کتب خانہ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا۔[1]

اسی جگہ تمت میں محمد صالح نے مخطوطہ کے کاتب کا نام رسول محمد خاں بیان لکھا ہے۔ اس عبارت پر ۲۴۔ جمادی الاول، سال جلوس ۳۲ شاہجہانی مطابق ۱۰۶۷ھ تحریر ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ اس وقت سے کہیں پہلے طالب ہمدانی کی ملکیت رہا ہوگا کیونکہ یہ ظاہرا بعہد جہانگیر شاہی کتب خانہ میں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے صفحہ اول پر جہانگیر کی مہر ثبت ہے۔ شاید یہ اس کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ طور پر مہتمم کتب خانہ کی تحویل میں آیا، جیسا کہ محمد صالح کے عہد شاہجہانی میں بحیثیت مہتمم دستخط ثبت کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق دیگر معاصر مخطوطات سے ہوتی ہے جن پر اس کے دستخط ثبت نہیں ہیں مثلاً دیوانِ کامران پر بھی وہی تاریخ درج ہے جو زیر نظر مخطوطہ پر ہے یعنی ۳۳ سال جلوس۔ "رقعات عالمگیری" میں اس مخطوطے کے خاتمہ کا عکس طبع ہوا ہے۔ مخطوطے پر جہانگیر کی مہر کے علاوہ دو اور مہریں بھی ہیں جو پڑھی نہیں جاسکتیں۔ پانچ اور جگہ یہ الفاظ تحریر ہیں: عرض دیدہ شد۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور عمائد نے بھی اس مخطوطہ کو دیکھا ہے۔ ان الفاظ کا آغاز اللہ اکبر سے ہوتا ہے۔ ان سب کے نیچے مختلف تاریخیں درج ہیں یعنی ۷، ۱۶، ۲۳۔ دو اور تاریخیں بھی ہیں جو مٹی مٹی سی ہیں، اس لئے پڑھی نہیں جاتیں۔ یہ سب تاریخیں غالباً سال جلوس ہی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مگر ایک جگہ سال ۱۰۵۵ھ تحریر ہے جو آسانی سے معلوم ہوجاتا ہے۔ بگمان غالب یہ اورنگ زیب عالمگیر کے دستخط ہیں کیونکہ یہ دستخط عالمگیر کے ان دستخطوں سے ملتے ہیں جن کے عکس میری نظر سے گزرے ہیں۔

جہانگیر کی مہر کے نیچے لفظ "الہدیہ" تحریر ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی مالک نے یہ کتاب ہدیہ یا نذرانہ کے طور پر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی۔

کتاب ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی تقطیع ۳ انچ × ۶ انچ ہے۔ لیکن مسودہ بشکل ۲ × ۴ جگہ میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے میں ۵ اسطور بہ خط نستعلیق ہیں۔ عنوانات سنہرے اور سرخ رنگ میں مرقوم ہیں۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے صفحے پر کوئی رنگین خاکہ یا نقش ہے، کوئی سارے اور کوئی آدھے صفحے پر۔ تصاویر کی کیفیت حسب ذیل ہے :-

۱۔ صورت حرم محترم
۲۔ صفا و مروا
۳۔ جائے کہ بلال اذان گفت
۴۔ مولود حضرت صلعم و حضرت فاطمہ
۵۔ گنبد حضرت خدیجہ و شہدائے معلا
۶۔ گنبدے کہ شکم حضرت جبرئیل پُر نور کرد
۷۔ جبل ثور
۸۔ عرفات
۹۔ گنبد مزدلفہ
۱۰۔ بازار منا
۱۱۔ چاہ امیرالمومنین حضرت علی
۱۲۔ نخلین بی بی فاطمہ بین باب جبرئیل و باب رحمۃ

---

[1] ملاحظہ ہو "شاہ جہاں نامہ" جلد دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد صالح نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی خطاطی کو ترک نہیں کیا، کیونکہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ عالمگیر کے عہد حکومت میں دائی انگہ کے مقبرہ کے اندرونی حصہ کی آرائش پر مامور ہوا۔ چنانچہ اس مقبرہ پر اس کا نام بقید سال (۱۰۸۲ھ) درج ہے۔

۱۳۔ گنبد امیر المومنین عباسؓ و امام حسنؓ و امام زین العابدینؓ

۱۴۔ چاہ کہ درون خاتم حضرت از دست حضرت سلیمان افتاد۔

۱۵۔ مسجد فتاح

۱۶۔ مسجد آنحضرتؐ

۱۷۔ جبل اُحد

ان میں سے اکثر تصاویر ابیات کے مضمون کی توضیح کرتی ہیں۔

•

(ایران کے مشہور شاعر خاقانی نے بھی اپنے بعض قصاید میں سفرِ حج کی اول تا آخر نہایت ہی دلچسپ اور مفصل کیفیت پیش کی ہے اور دورانِ سفر کے چشم دید حالات و کوائف اس تفصیل سے درج کئے ہیں کہ سارے راستہ، اس کی منازل و اوقاف، مقامات اور خطرات نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی واقعات کا بھی تذکرہ ہے اور حجاج کے دلی احساسات و کیفیات کی بھی بہت خوش اسلوبی سے عکاسی کی گئی ہے۔ آخر میں مناسکِ حج کے تمام جزئیات کی موقع بہ موقع اور درجہ بدرجہ نہایت حقیقت پسندانہ پیرایہ میں تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر نوادر جہاں بھی ہوں قابلِ قدر ہیں) (مدیر)

•

ارضِ مُراد

نظر حیدرآبادی

زندہ باد ارضِ مراد، اے کشورِ امن و اماں — روشن و رخشاں رہیں تیرے زمین و آسماں

چھا گیا مہرِ یقیں اور چھٹ گئی گردِ گماں — اپنی منزل میں ہے اب اہلِ وفا کا کارواں

جانتی ہے تو کہ عزم و جوش کا پیکر ہیں ہم

جانتی ہے تو تری بنیاد کا پتھر ہیں ہم!

مل گئی منزل، اندھیرے نور افشاں ہو گئے — راہ کے کانٹے گلستاں در گلستاں ہو گئے

لطفِ دوریٔ نو سے پھر جینے کے ساماں ہو گئے — صبح چمکی، رات کے نغمے پریشاں ہو گئے

عشرتِ ذوقِ طلب کیا ہے؟ دلِ افگار سے پوچھ

امنِ ساحل کیا ہے؟ ہم طوفان کے ماروں سے پوچھ

وقتِ مبتلا، گردشِ دوراں سے واقف ہو گئے — حادثوں کی بخشش و احسان سے واقف ہو گئے

لطفِ آزادی غمِ زنداں سے واقف ہو گئے — ہم مزاجِ عالمِ امکاں سے واقف ہو گئے

انتہائے یاس میں بھی مسکرانا آ گیا

زندگی کو زندگی بن کر جگانا آ گیا!

اے وطن پیارے وطن، اے سرزمینِ رنگ و بو — فکرِ مسلم کو رہی ہے کب سے تیری جستجو

تیری راتیں ماہ پیکر، تیری صبحیں مہر رُو — تیری تابانی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو

تو سلامت! ہم ترے پرچم کو یوں لہرائیں گے

ہر اندھیرے میں کرن امید کی بن جائیں گے!

دورِ بہار

جمیل نقوی

مرے تصور میں پرفشاں ہیں، کچھ ایسی صبحیں، کچھ ایسی شامیں
کہ جن کی براق روشنی میں وجودِ شام و سحر نہیں تھا
وہ نور جو روشنی اثر ہے، بذاتہ جلوہ گر نہیں تھا
کہ جیسے تاروں کی سرزمیں میں نظامِ شمس و قمر نہیں تھا

غبار میں چھپتے جا رہے تھے نشانِ منزل، نقوشِ جادہ
تھکا تھکا سا تھا ہر مسافر، جرس کی آواز مضمحل تھی
نگاہِ رہبر اگر کبھی اٹھ گئی تو دیکھا کہ منفعل تھی
مگر وہ اک آگ جو تصور کے دشت و صحرا میں مشتعل تھی

★

فضا میں اک انتشار سا تھا، نگاہ محسوس کر رہی تھی
بیان پابندِ مصلحت تھا، لبوں پہ تالے پڑے ہوئے تھے
تپش سے سوزِ غمِ نہاں کی، زباں پہ چھالے پڑے ہوئے تھے
صبا گلوں سے الجھ رہی تھی، چمن کے لالے پڑے ہوئے تھے

ہزار فتنے کھڑے ہوئے تھے خلوص و غیرت کے راستوں میں
حیات دوزخ بنی ہوئی تھی تمام تر جن کے دم قدم سے
بنامِ تکمیلِ آدمیت الجھ رہا تھا ستم کرم سے
زمانہ تاریخ لکھ رہا تھا ثبات کے آہنی قلم سے

★

عرق عرق تھی جبینِ شیریں، نگاہِ پرویز مطمئن تھی
کہ تیشۂ سنگ پاشِ آہن صدا سے محروم ہو چکا تھا
دوانہ اک بے ستوں بنا کر سکون کی نیند سو چکا تھا
پہونچ کے ساحل پہ آرزوؤں کے دل کی کشتی ڈبو چکا تھا

یہ فکر تھی باغباں کو ہر دم کوئی کلی پھول بن نہ جائے
کہیں نہ سبزہ کی نیند ٹوٹے، چلے نہ بادِ صبا مچل کے
چہکنے پائے نہ کوئی بلبل، کہیں نہ لالہ کا جام چھلکے
خزاں رسیدہ چمن کے وارث نہ اٹھ کھڑے ہوں کہیں سنبھل کے

★

بجھی بجھی سی تھی شمعِ محفل، اداس تھی کارگاہِ ہستی
دلِ فسردہ رہِ محبت میں جیسے ناکام ہو گیا تھا
خود اپنے ذوقِ طلب کی قدروں پہ چل کے بدنام ہو گیا تھا
دماغ یوں مضطرب تھا جیسے خرد کو سرسام ہو گیا تھا

بنامِ تکمیلِ خود شناسی، بقدرِ احساسِ نامرادی
مرے جنونِ برہنہ سر نے خرد کو سو آئنے دکھائے
کبھی اجالوں سے بھیک مانگی کبھی لہو سے دیے جلائے
نقوشِ ماضی جو مٹ گئے تھے، افق پہ اکثر ابھر کے آئے

خود اپنی ہستی سے تنگ آ کر مرے دلِ جذب آفریں نے
حریفِ احساسِ ناامیدی کو رازدارِ جنوں بنایا
خلوص کو نیند سے جھنجھوڑا، عروسِ غیرت کو گدگدایا
چمن کو پھر تازگی عطا کی، گلوں کو پیغامِ نو سنایا
اٹھو کہ دورِ بہار آیا
اٹھو کہ دورِ بہار آیا

افسانہ:

گھر سے گھر تک

احمد ندیم قاسمی

حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزماں کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح فشافش غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لئے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھوئے اور محسوس کرنا چاہیئے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وقار پھول میں سے بھونروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ پڑاخ بند کئے تو گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پاندان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اُترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پاندان پر اتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نورالنساء چونک کر بولیں۔ "اے ہے وقار میاں' یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم' اسے سمجھائیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے پہ ہی ٹک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو، صوفے کس لئے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا۔ "سن رہے ہو میاں' تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اترا ہے۔

اس کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی۔ موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نورالنساء اٹھیں۔ "ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکڑا جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھئے باجی' انہیں منع کیجیے۔"

ہما کھڑکھڑاتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی۔ "آپ تشریف رکھیے خالہ جان' معصومہ کو میں لئے آتی ہوں۔"

نورالنساء فوراً بولیں۔ "نہیں نہیں ہما بیٹی۔ تم بیٹھو۔ میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔"
نورالنساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی۔ "دیکھا اماں۔ میں نہ کہتی تھی؟"
"اسی لئے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"
"غالیچہ دیکھئے جیسے سمندر کا جھاگ ہے" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبودیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"
"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیئے۔"
"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔"
"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا۔" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"
ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی چمکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی۔ "خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی "یہ دیکھئے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔
"اسے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "کیا کر رہی ہے۔ پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں۔ "ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"
"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو یہی ہوں گے۔" ہما بولی۔
"لیجئے اور سنیئے" وقار تڑپ اٹھا۔ "باجی تو کمال کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجئے مجھ سے۔"
"صوفہ دیکھئے، بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا۔ "تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھئے۔ وقار مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"
وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"
"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لئے آدھی اٹھ گئیں۔
"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا۔ "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"
عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں۔ "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔"
"میں نے تو کہا تھا کہ پہلے دیکھ بھال کر لیجئے۔" وقار نے کہا۔
"ہما سے پوچھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لئے پھر رہی ہے۔"
"تو کیا ہے اماں؟" ہما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"
"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہوگئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"
"چُپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔
تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے اُدھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔
نورالنساء پردہ ہٹا کر بولیں۔ "آجا بیٹی۔ شرمانے کی کونسی بات ہے۔ اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔

سب اپنے ہیں۔ آجاؤ"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہوگیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نور النساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پر بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دوبار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹہ کو درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی" یا "جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نور النسا معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب لٹھے کی صاف ستھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انہیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انہوں نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیروزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہما نے انہیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ "یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں!" عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے۔ معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر وقار تو چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جاتیں اور اس کی بھووں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آتیں۔ وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کئے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے" نور النسا نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انہیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آ جاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکہ تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آ کر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر آمڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟"

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم" نور النساء نے کہنا شروع کیا "واپس وطن آ کر ــــ"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آ کر پوچھا "اور چائے لاؤں بی بی؟"

لے آؤ۔" نورالنساء فوراً بولیں

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم ٹرے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لئے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں "ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔ جاؤ۔"

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں۔ "تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آ کر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے، کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انہیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔"

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے۔" ہما بولی۔ "ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔" وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آ کر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نورالنساء نے کہا۔ "ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجئے کہ جا کر انہیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی۔" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی۔" ہما بولی۔ "دیکھا؟"

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں۔ "بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں۔" ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں۔ "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں۔"

"ایک ایک روپیہ؟" ہما بولی۔ "نہیں اماں۔ دو دو دیجئے گا کیوں وقار؟"

"اماں کی مرضی ہے۔" وقار بولا۔

"دو دو سے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔

ہما نے بڑی ناگواری سے کہا۔ "اُفوہ اماں کیسی کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں ہر ایک کو دو دو دیجئے گا۔"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اتر رہی تھیں۔ انہوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے تو ٹھٹھک سی گئیں۔ پھر بولیں۔ "اے بہن۔ دیوان خانے میں جا کر بیٹھئے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہی ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں"۔ عشرت خانم نے مسکرا کر کہا۔" دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلئے۔ ملا دیجئے ان سے۔"

"میں انہیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں۔" نور النساء بضد رہیں۔" ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے ـــــ"

"تو کیا ہوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نور النساء کو بازو سے پکڑ کر کہا۔" آئیے۔"

"نیچے بھابیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ ــــــ" نور النساء نے احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے۔" عشرت خانم نے نور النساء کو کھینچا۔" میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔"

نور النساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہولیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔" اے کلثوم۔ اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لئے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اسے دھولنے چلا ہے۔ بیلم کیا کہے گی کہ"

یکایک نور النساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔" میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اٹھا پٹخ مچائی ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔" پھر جس طرح انہوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں۔" ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ـــــــ" نور النساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں۔ مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے؟" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نور النساء نے قدم روک لئے جیسے معصومہ سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائنیتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لئے ایلومنیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کریے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار قمیص پر ایک چیلی چیلی دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں: "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں: "توبہ ہے" انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا: "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں: "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے بے ڈھلے بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے کنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء۔ آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹئے بہن" عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں: "وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹی کے کمرے میں جو چار پائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لئے رسّی کے ساتھ کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے" عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں: "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھئے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے" عشرت خانم نے کہا "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ سے"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک پٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر چند سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اترتی چلی گئیں مگر عشرت خانم نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ میں سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں ماریئے بہن عشرت خانم" نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی: "پر یہ جو آپ کی ہنسی ——"

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا: "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفہ اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں"

نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ انہوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور" عشرت خانم زور سے پکاریں۔ اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو" عشرت خانم بولیں: "اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمہاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گنجلا کر واپس کئے"

"اماں" ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لڑکیاں" عشرت خانم نے نورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دئے ہیں" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نورالنساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں "کبھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ تانگے سے آجائیں گے بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لئے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ"۔ پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں "یہ تو۔ تمہارا انعام ہے"۔

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنسا سے لپٹ کر بولیں "اے بہن نورالنساء۔ خدا کے لئے ہنسئے۔ گیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے! اے بہن کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔

اب نورالنسا کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا "اماں جی۔ کار تو جا رہی ہے"۔

"جا رہی ہے تو جانے دو" عشرت خانم بولیں "کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے؟"۔

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنسا پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور رہا کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بتوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ اور پرسیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے چلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے۔ اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں۔ "ہائے بہن نورالنسا میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی۔ پسینہ سرخی پوڈر بہائے جانے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آئیے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں"۔

★

حوّا اور سانپ

اعجاز حسین بٹالوی

وہ میرا نیا مؤکل تھا اور قانونی مشورہ کرنے آیا تھا۔

اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اکہرا بدن، لمبا قد، باریک سی مونچھیں اور چہرے پر ہلکی سی اُداسی جیسے جوانی میں کبھی کبھی ہوتی ہے۔ گفتگو میں ذرا سا حجاب۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھوں تو اسے گفتگو کرنے میں اور زیادہ دقت ہوتی ہے۔ بعض مؤکلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرو تو انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ بعضوں کے چہرے کی طرف دیکھتے رہو تو ان کے لئے گفتگو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں کبھی سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف اور کبھی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے کہا۔ "جناب میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔" پھر اس نے ذرا سا رک کر آہستہ سے کہا، جیسے کوئی سازش کی بات ہو۔ "کیا عورت اپنے خاوند کو طلاق دے سکتی ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ مسلمان عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خاوند کو طلاق نہیں دے سکتی، اس سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔

میرا اصول ہے کہ جب تک مؤکل ایسے موقع پر خود کھل کر بات نہ بتائے اس سے کرید کرید کر پوچھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا معلوم وہ اس وقت اپنے آپ سے کونسی جنگ لڑ رہا ہو۔ میں نے سوچا یہ سوال اب تک مجھ سے کئی ایسی عورتوں نے پوچھا ہے جو شادی شدہ زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ کر مجھ سے قانونی مشورہ کرنے آئی تھیں مگر ایک غیر شادی نوجوان مرد یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے آثار دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں۔۔۔۔ جی، میں ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہوں۔ ایف ایس سی میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد مجھے نوکری کرنی پڑی۔ ہم انبالے کے ریفیوجی ہیں۔ والد کے کاروبار کا بھٹہ بیٹھ گیا تو میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا، اب ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔ والدین کے پاس رہتا ہوں۔ ہمارا گھر شہر کے اندر ہے۔ ہم کو صرف نچلی منزل الاٹ ہوئی ہے۔ اوپر والی منزل میں جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔"

میرے مختصر سے سوال کے جواب میں جب اس نے اتنی باتیں یکدم بتا دیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہنے کی کوئی بات چھپا رہا ہے اور اس کے عوض ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر اگلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے نچلے درجے کا سمجھدار نوجوان معلوم ہوتا تھا جس کی تعلیم اگر مکمل ہو جاتی تو زندگی میں ذمہ داری کا کوئی کام اچھی طرح سے انجام دے سکتا تھا۔

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کیوں صاحب، اس مقدمے کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگے گا اور کیا اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے؟" میرا جواب سن کر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "تو جناب اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ممکن ہے ایسے مقدمے میں ایک دو برس لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے آخر میں طلاق بھی نہ ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ تو مقدمے کے واقعات پر منحصر ہے اگر شہادت اچھی ہے اور وجہ مضبوط ہے تو طلاق ہو جائیگی

ورنہ مشکل ہے۔" پھر میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، وہ صاحب جن کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا جائے گا کیا وہ پوری شد و مد سے اس کی پیروی کریں گے؟"

"جی ہاں ضرور کرے گا۔ وہ بڑا ظالم انسان ہے۔" اور نوجوان کے چہرے پر غصّے اور نفرت کے رنگ پھیلنے لگے۔ "اس کا بس چلے تو وہ اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالے، اس کی آنکھیں پھوڑ دے، اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دے، وہ تو بڑا مردود آدمی ہے جناب۔" اور پھر یک لخت اسکے چہرے پر اداسی کا سایہ پڑ گیا اور میری طرف دیکھ کر اس نے یوں زہرخند کیا جیسے نہ کہنے کی باتیں کہہ گیا ہو۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ "یہ تو بتایئے کہ جب تک طلاق کا مقدمہ چلتا ہے، کیا میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ناممکن ہے۔ کم از کم میں نے کبھی یہ سنا نہیں، میرا خیال ہے اس سے تو مقدمہ کمزور ہو جائے گا۔"

پھر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پریشانی اور اضطراب نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا وہ بات جو اس کے دل میں اس طرح کھٹک رہی ہے۔ اب کہلوا ہی کیوں نہ لی جائے۔ میں نے چہرے پر وکیلوں کی سی بے تعلقی پیدا کرتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو کسی اور کی بیوی ہے۔"

طوفان ختم ہو گیا اور اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے: "جی ہاں، یہی بات ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکی ایک بہت ظالم آدمی کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے، وہ خود جاہل ہے۔ خود بڈھا ہے نا، ہوٹل کا کام کرتا ہے اور ہر روز رات کو کام سے گھر آتا ہے تو اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ ہمارے مکان کی اوپر والی چھت پر جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ یہ میں انہیں کا ذکر کر رہا تھا۔"

میں نے قانون کے ترازو میں زندگی کے بٹے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا: "بچے بھی ہیں ان کے کوئی؟"

"جی نہیں، ان کا کوئی بچہ نہیں، صرف میاں بیوی اس گھر میں رہتے ہیں اور سارے محلے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو مارتا ہے۔"

"تو یہ بتایئے کہ آپ جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو یہ محض اپنے ارادے کا اظہار کر رہے ہیں یا اس میں اس لڑکی کی خواہش بھی شامل ہے۔"

نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چور آنکھ سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر وہ میز پر آگے کی طرف جھک کر کہا۔ "وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اگر اسے طلاق نہ ہو سکی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ہم دونوں برباد ہو جائیں گے۔" محبت کی نرمی اس کی آواز میں آگئی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر بیٹھے ہوئے وکیل کو زندگی کی لوری سنا کر خاموش کرتا جا رہا ہے۔

اس کے عشق کی داستان طویل نہ تھی۔ میں اندرونِ شہر کے ایسے مقدموں کی نوعیت سے واقف ہوں۔ وہاں عشق کا آغاز اکثر ہمسائے میں ہوتا ہے۔ انجام کی صورتیں البتہ مختلف ہوتی ہیں مگر یہ نوجوان تو اپنی محبت میں نہا کر پاکیزہ ہو چکا تھا اور اس لڑکی کی باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی روشنی آجاتی جیسی بعض مصوروں نے فرشتوں کے چہروں پر بنائی ہے۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگا شاید ایسی بے پناہ محبت جو طوفان کی طرح ہر طرف چھا جاتی ہے جوانی کے اسی حصے میں ہوتی ہے اور پھر انسان باقی عمر اسی محبت کے بہانے چھوٹی چھوٹی محبتوں میں گزار دیتا ہے۔ یہ نوجوان جو زندگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا ایک ایسی محبت سے سرشار ہو چکا تھا جو اپنا راستہ خود متعین کرے گی اور میں تو محض ایک وکیل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق کا مقدمہ اس لڑکی کو خود دائر کرنا پڑے گا۔ آپ اس کی طرف سے پیروی نہ کریں تو اچھا ہوگا۔ لڑکی کے والدین میں سے کسی کو یہ فرض انجام دینے دیجئے اور ہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ مقدمے کے واقعات کو ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہوگی۔"

وہ نوجوان چلا گیا تو میں دوسرے مقدموں کی تفصیلات میں الجھ گیا۔ کہیں زندگی کی قبا پر کھونچ آگئی ہے تو قانون اسے سینے کی کوشش کرتا ہے کہیں زندگی کے جامے پر خون کے دھبے ہیں تو قانون انہیں دھونے کی فکر میں ہے اور عدالتیں شہادتوں پر فیصلے کرتی چلی جاتی ہیں۔

چند دن گزرے ہوں گے کہ وہی نوجوان پھر میرے دفتر میں آیا۔ اس دفعہ اسکے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ کالا برقع پہنے ہوئے۔ جب وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو لڑکے نے ایک جھجک کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "انہیں کے بارے میں اس دن میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" پھر اس نے لڑکی کو نام سے پکارتے ہوئے کہا: "ہاجرہ نقاب اٹھاؤ۔" اور لڑکے کے کہنے پر اس نے نقاب اٹھادیا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ غریب گھرانے کی مگر سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا:

"آپ اپنے میاں سے طلاق لینا چاہتی ہیں؟"

وہ شرما گئی اور بولی۔ "جی ہاں!"

"وجہ کیا ہے؟"

وہ اور شرمائی اور اس کے رخساروں پر سرخی کی لکیریں دوڑنے لگیں۔ لڑکے نے اس کی طرف دیکھکر کہا۔ "ہاں ہاں بتاؤ شرماتی کیوں ہو؟" لڑکی نے ہمت کرکے کہا۔ "جی وہ مجھے مارتا بہت ہے۔ ہماری بنتی نہیں اور وہ مجھ پر ظلم بہت کرتا ہے۔ اور پھر.....۔" یہاں پہنچکر لڑکی رک گئی۔

"اور پھر.....؟" میں نے دہرایا۔

"اور پھر اگر مجھے طلاق ہو جائے تو میں کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کرلوں گی۔" میں نے چور نظر سے دیکھا تو میز کے نیچے اس لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور ان دونوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں میری موجودگی کا قطعاً احساس نہیں رہا۔ خدا جانے وہ کیا نگاہ تھی کہ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں چاروں طرف موتیا کی ہلکی ہلکی مہک پھیل گئی ہو۔ محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ لڑکے نے پہلی دفعہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"یہ بتلائیے اگر ہم اس وقت گھر جانے کی بجائے کہیں اور چلے جائیں تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "آپ دونوں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور اگر ہم نکاح پڑھوالیں تو؟"

"تو آپ کے ساتھ وہ مولوی بھی گرفتار ہو جائے گا جو آپ کا نکاح پڑھے گا۔ شادی شدہ عورت سے شادی کرنا جرم ہے۔"

میں نے لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

لڑکی کی طرف دیکھکر میں نے کہا۔ "اگر آپ طلاق کا دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں تو اپنے والد یا کسی اور عزیز کو میرے پاس بھیجدیجئے۔"

چلتے ہوئے میں نے نوجوان کو پھر تاکید کردی کہ اس نے لڑکی کے ساتھ بھاگ جانے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان پر عمل نہ کرے۔ اس میں سراسر نقصان ہوگا اور کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلے گا۔ لڑکی کی آنکھوں میں تشکر کی جھلک تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اچھا کیا آپ نے ہم کو سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

اس واقعہ کو مہینوں گزر گئے۔ ایک روز دفتر میں کام کر رہا تھا کہ منشی جی نے کہا: "ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ضروری کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اندر بھیج دیجئے۔" ایک بزرگ صورت کمرے میں داخل ہوئے۔ عمر کوئی ساٹھ سے دو ایک برس کم۔ چہرے پر سفید چھوٹی چھوٹی چگی سی داڑھی، لبریز آنکھیں، کچھ پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔ بیٹھتے ہی بولے۔ "میرے لڑکے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کو سب قصہ معلوم ہے۔" انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی لیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا کہ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور میں یونہی اس امید میں ہوں ہاں کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں سے اس بات کا سرا ہاتھ لگ جائے گا۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "آپ اپنے لڑکے کو کیوں نہیں بُلا لیتے؟"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ "آپ کو نہیں معلوم، اسے تو تین سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی ہے"۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ "میرا تو خیال تھا۔ آپ کو سب معلوم ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اُوپر والی منزل پر جالندھر کا ایک ریفیوجی رہتا ہے، ہوٹل کا کاروبار کرتا ہے، اس کی ایک جوان بیوی ہے"۔

میرے ذہن میں ٹن سے گھنٹی بجی اور میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "تو وہ نوجوان لڑکا اسے اغوا کر کے لے گیا آخر؟"

"جی نہیں اغوا کر کے لے جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اس عورت کے خاوند کو جب ان دونوں کے بارے میں علم ہو گیا تو اس نے تھانے میں جھوٹی رپٹ لکھا دی کہ جب وہ عورت گھر میں اکیلی تھی تو وہ بُری نیت سے اس کے گھر میں گھس گیا اور ..... "

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا یہ وہی لڑکی نہیں جو آپ کے لڑکے کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اپنے خاوند پر طلاق کا مقدمہ دائر کرنے؟"

اس بزرگ کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں جیسے وہ یہ بات پہلی دفعہ سن رہا ہے۔ اس نے کہا: "یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے لڑکے نے یہ مختار نامہ آپ کے نام دیا ہے۔ میں اسے جیل میں ملنے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے ملوں اور مقدمے کے کاغذ اور اپیل دائر کرنے کے لئے مختار نامہ آپ کو دیدوں۔ وہ تو یہی کہتا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہے"۔

اور جب میں نے جلدی جلدی کاغذات دیکھنا شروع کئے تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو خاک بھی معلوم نہیں۔ مقدمے کی رپٹ خاوند نے لکھوائی تھی کہ جب وہ دوپہر کو غیر متوقع طور پر گھر پہنچا تو مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بیوی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچا تو ملزم اسکی بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے جلدی سے مسماۃ ہاجرہ بی بی کا بیان پڑھنا شروع کیا۔ میں جوں جوں اس کا بیان پڑھتا جاتا تھا۔ الجھن اور بے یقینی کا جال میرے گرد تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس خوبرو نوجوان کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے خاوند کے بیان کی تائید کی تھی بلکہ جرح میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس ملزم کو سرے سے جانتی ہی نہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس سے ملی ہے۔

میں نے سفید چگی داڑھی والے بزرگ سے پوچھا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں اس عورت نے آپ کے لڑکے کے خلاف شہادت کیوں دی؟"

بوڑھے نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس لمحے میں اسے دنیا کا بیوقوف ترین آدمی نظر آ رہا تھا اور پھر اس نے کہا: "میاں صاحب آپ تو سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ عورت جس کے قبضے میں ہو ہمیشہ اسی کی شہادت دیتی ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے میرا لڑکا بے گناہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہوٹل والے نے عدالت میں لے جانے سے پہلے اپنی بیوی کو مارا بھی، اسے قرآن بھی اُٹھوایا اور منتیں بھی کیں کہ اگر اس نے یہ گواہی نہ دی تو اس کے خاوند کی عزت ختم ہو جائے گی"۔

میں نے نظریں میز پر جھکا لیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا جیسے کاغذات کو دیکھنے میں مصروف ہوں۔ مگر دل تو یہی پوچھ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی نے یہ بیان کیوں دیا۔ یہ تو وہی لڑکی ہے جو اس ملزم کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی اور ان دونوں نے میری آنکھ بچا کر میز کے نیچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ چگی داڑھی والے بزرگ نے دفتر کی گہری خاموشی کو توڑا۔ "میرے لڑکے کا آخری سہارا آپ ہیں اُسے آپ سے بڑی اُمیدیں ہیں"۔

میں سوچنے لگا کہ میں اِس بزرگ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تو اس مقدمے میں وکیل نہیں گواہ ہونا چاہئیے تھا۔ عدالتیں تو مقدموں کے فیصلے شہادت پر کرتی ہیں۔ دفتر میں ہر طرف دیمک لگے ہوئے بوسیدہ کاغذوں کی بُو پھیلنے لگی تھی۔

★

ایک پاکستانی فن کار

(دنیائے مغرب میں)

مصنف:- السآندرو بوزانی

مترجم: صوفی احمد وحید اختر

سجاد سے میری پہلی ملاقات کئی سال قبل اٹلی میں مقیم پہلے پاکستانی سفیر کے ہاں ہوئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں علامہ اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" کا اطالوی زبان میں منظوم ترجمہ کر رہا تھا۔ سجاد اس وقت ایک نوجوان لڑکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے جو ذہانت ٹپکتی تھی اور سنجیدگی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو سنجیدگی ہے۔

فارسی کے عظیم صوفی شاعر باباطاہر عریاں کی شاعری سے متعلق اس کی معلومات اس وقت بھی بڑی وزنی اور ٹھوس تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اسے اپنی تہذیب اور ثقافت یعنی اسلامی روایات سے کس قدر لگاؤ اور عقیدت تھی۔

سجاد جیسے شخص کے لئے روم کے فنی حلقوں میں مقام پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ اس کی پرورش اور تعلیم ایک بالکل جدا ماحول میں ہوئی تھی۔ جسے یورپی ثقافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج ایشیا کے اس نوجوان فنکار کا اٹلی میں بہت چرچا ہے۔ حال ہی میں اسے "انٹرنیشنل آرٹسٹک ایسوسی ایشن" کا روم میں کونسلر چنا گیا ہے۔ اس کے تین ہزار سے زائد ممبر ہیں۔ جو زیادہ تر آرٹسٹ، شاعر، موسیقار اور معمار ہیں۔ اس کے صدر اور بارہ کونسلروں کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ممبران کے ووٹوں سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری بار ہے کہ سجاد کو ایک بھاری اکثریت سے کونسلر چنا گیا ہے۔

سجاد کونسل کے باقی تمام ممبروں سے کم عمر ہیں۔ اس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایشیا کا ایک فنکار اس کا ممبر کونسلر چنا گیا ہے۔ اور اہل پاکستان کو اس اعزاز پر بجا طور پر ناز ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ نہ صرف سجاد ہی کی کامیابی اور عزت کا باعث ہے۔ بلکہ اس نے پاکستان کی شہرت کو بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

مشکلات بالعموم لوگوں کی زندگیوں کو کامیابی و کامرانی سے روشناس کرتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مشکلات اور تکالیف کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے برداشت کریں۔ اور حصولِ مقصد میں ان رکاوٹوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کردیں۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ سجاد کی زندگی، مشکلات کا مجموعہ رہی ہے۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا جس نے اس پہ مشکلات کا پہاڑ گرا دیا۔ اسے بچپن ہی سے مصوری کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنی زندگی فن کے لئے وقف کردے گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں اس نے مائیکل انجیلو، لیونارڈو ڈی ونچی، رافیل وغیرہ کے فن پارے دیکھے۔ جنہوں نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا اور اس نے تہیہ کرلیا کہ جیسے بھی بن پڑے وہ مصوری کی تعلیم کے لئے روم جائے۔ اس کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے۔ لیکن وہ فن کار تھا اور اسی لئے ثابت قدم رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشش جاری رکھی۔

آج سے ساڑھے آٹھ برس قبل سجاد کی محنت پھل لائی اور فن کے بعض پرستاروں کی کوشش سے اسے روم کے پاکستانی سفارت خانہ میں اکاؤنٹنٹ کی اسامی مل گئی۔ روم پہنچتے ہی اس نے ایک "سانٹ سکول" میں داخلہ لیا۔ اور وہاں مصوری کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا اور رات کو پینٹنگ سیکھتا۔ اِن دنوں اسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ سارا دن فائلوں اور رات مصوری کی نذر ہوجاتی۔ اس کے

بعض ساتھی اس کا مذاق اڑاتے اور بعض نصیحت کرتے کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کو خواہ مخواہ ایک فضول اور بیکار شغل میں ضائع نہ کرے۔ مشکلات اور رکاوٹیں دن بدن بڑھتی گئیں۔ لیکن اس نے اپنا کام بڑے انہماک سے جاری رکھا۔ سفیروں اور دوسرے اعلیٰ افسروں نے اس کی ہر ممکن طریق سے مدد کی اور وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ، باذوق افسروں نے اس کی سرگرمیوں کو سراہا۔ کئی سال کی جدوجہد اور محنت کے بعد سجاد نے مصوری کی نمائشوں میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔

اٹلی جیسے ملک میں سجاد کا مقبول ہونا تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ گذشتہ دو ہزار سال سے اٹلی کو فنون کا گھر سمجھا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے شخص کا جسے زندگی میں لاتعداد مشکلات نے گھیر رکھا ہو اور جس کے پاس ذوق کے کام سے فارغ ہونے کے بعد بہت تھوڑا وقت رہ جاتا ہو جسے وہ اپنے فن کی نذر کر سکے، اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لینا واقعی قابلِ داد ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں سجاد نے تیس سے زائد نمائشوں میں حصہ لیا ہے، اور مندرجہ ذیل انعامات حاصل کئے ہیں:۔

(۱) طلائی تمغہ (اول انعام)، انٹرنیشنل فیسٹول آف ماڈرنیز ۱۹۵۸ء۔ ۲۔ چاندی کا تمغہ۔ (دوئم انعام)، انٹرنیشنل فیسٹول آف ماڈرنیز ۱۹۵۶ء۔ ۳۔ چاندی کا تمغہ (اول انعام)؛ اگزیبیشن آن اٹالین لینڈسکیپ ۱۹۵۵ء۔ ۴۔ چاندی کا تمغہ: پینٹنگ اگزیبیشن، سان وائیٹو رومانا ۱۹۵۵ء۔ ۵۔ ڈپلوما برائے قابلِ تعریف کام، پینٹنگ اگزیبیشن، روم ۱۹۵۸ء۔

ان انعامات کے علاوہ سجاد نے کئی ایک سندیں اور سرٹیفیکیٹ مختلف سکولوں اور فنی درسگاہوں سے حاصل کئے ہیں۔ روم کے ثقافتی و تہذیبی حلقوں میں وہ بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا آج سجاد کی کوششیں بڑی ہمدردی اور ستائش کی مستحق ہیں۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ معدودے چند افراد میں سے ہے۔ جنہوں نے اپنے ملک سے باہر، وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنے ملک کے پرچم کو سربلند کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے "مشکلات ہی عظیم انسان پیدا کرتی ہیں" لیکن حد سے زیادہ مشکلات اور سرپرستی کی عدم موجودگی بسا اوقات باشعور افراد کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ فنکار کے لئے مادی فوائد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی محنت اور ریاضت فن کی عظمت ہی کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ مادی فوائد کے لئے!

تاریخ شاہد ہے کہ ادب اور آرٹ کا زریں دور وہی رہا ہے جس میں حکومتِ وقت یا حاکمِ عہد نے ادب اور فن کی سرپرستی کی ہو۔ لیکن جونہی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا، ادب و فن کی ترقی بھی رک گئی۔ اور بسا اوقات زوال پذیر بھی ہوتی چلی گئی۔ اس کی واضح مثال سلطنتِ روم کا زوال ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب اس سلطنت پر زوال آیا تو ادب اور آرٹ کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ اور عالموں اور دانشوروں سے بے حد بے اعتنائی برتی گئی۔ نتیجۃً ایک ایسا دور آیا جو سات سو سال تک قائم رہا۔ اس دور میں آرٹ اور ادب کا سخت قحط رہا۔ بالآخر چودھویں اور پندرھویں صدی میں شاہی خاندان نے دوبارہ ان کی سرپرستی اختیار کی۔ اور کلاسیکی روایات کو حیاتِ نو بخشی۔ اس ذہنی انقلاب نے سینکڑوں ذہین اہلِ علم و فن پیدا کئے۔ جن کی شخصیت اور کمال کا آج بھی چار دانگِ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ اسی قسم کے واقعات سے دوسری اقوام کی تاریخوں کے صفحات بھی مزین ہیں۔

دورِ حاضرہ میں وہ پرانا سلسلہ تو باقی نہیں رہا۔ شہنشاہیت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کی سرپرستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب فردِ واحد کی جگہ جمہوریت نے لے لی ہے۔ لہٰذا اب یہ جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ فنکاروں کی سرپرستی کرے اور ادب و فن کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔

آج دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک میں چوٹی کے اہلِ قلم اور فنکاروں کو پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں کا ممبر چنا اور بنایا جاتا ہے۔ انہیں معذوری کی صورت میں زندگی بھر کے لئے معقول پنشن دی جاتی ہیں۔ اُن کے فن پاروں اور کتابوں کی خرید میں عوام اور حکومت اپنی پوری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کی مالی اعانت ہوتی رہے۔ سڑکوں اور پارکوں کو ان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی یاد باقی رہ سکے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر سال ایک کثیر رقم انعامات کی صورت میں دی جاتی ہے۔ تاکہ ابھرتی ہوئی نسل کو ادب و فن کی قدر کا احساس ہو۔

اب مجھے نوجوان پاکستانیوں سے چند ایک باتیں کرنی ہیں:۔
میں پاکستان کے نوجوان طبقہ کو یہ نصیحت کروں گا کہ وہ ہمارا کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ وہ زندگی میں جو بھی پیشہ اختیار کرنا چاہیں کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں فنونِ لطیفہ یعنی موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی وغیرہ میں بھی ضرور حصہ لینا چاہئے۔ فنونِ لطیفہ سے ہماری جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے ہماری نظر میں وسعت اور خیالات میں طہارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فنونِ لطیفہ انسان کو سُست اور بے کار بنا دیتے ہیں۔
اگر اطالوی مصوری، سنگ تراشی اور فنِ تعمیر، مغرب میں ایک عظیم انقلاب لا سکتے ہیں، اگر جرمن شاعری، موسیقی اور فلسفہ انہیں موجودہ سائنسی ترقی عطا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر پاکستان میں انہیں اپنایا جائے تو یہ آپ کو ترقی کے راستے پر گامزن نہ کریں۔
دنیا میں ہر چیز بیک وقت مفید و غیر مفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہمارے استعمال پہ منحصر ہے کہ ہم اسے اپنی ترقی کے لئے استعمال کریں یا تنزل کے لئے۔ آج پاکستان کو سائنس دانوں، انجینئروں، معماروں، ڈاکٹروں، دیانت دار سیاست دانوں اور قانون دانوں کی ضرورت ہے لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ اُسے ایسے دانشوروں کی بھی ضرورت ہے جو عوام الناس کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کریں۔
تعلیم واحد ذریعہ ہے جس سے کسی ملک کو ایک مثالی ملک بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستانیوں کو حالیہ انقلاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے جوش اور ولولے سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونا چاہئے۔ خداوندِ کریم پاکستان کے عوام الناس کو ترقی اور خوش حالی کے راستے پر گامزن کرے۔ آمین!

★

"ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ": ———— بقیہ صفحہ: (۱۴)

اور انگلستان کا مصنف رچرڈ ملکاسٹر (RICHARD MULCOSTER) لکھتا ہے:۔

"کوئی زبان فی نفسہٖ کسی دوسری زبان سے بہتر نہیں ہوتی۔ اس کی فوقیت کا انحصار اس کے بولنے والوں کی ہمت اور محنت پر ہوتا ہے جو اسے فصیح بناتے ہیں اور مختلف علوم سے مالا مال کرتے ہیں۔ لہٰذا یورپ کی علمی زبانیں اپنی قوم کے اُن افراد کی مرہونِ منت ہیں جنھوں نے اسے اپنے گھر میں سنوارا۔ اور باہر اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے وہ ادبی کارنامے جن کی خوبیوں پر آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کبھی شرمندۂ تحریر نہ ہوتے۔"

"کیا یہ غلامی قابلِ افسوس نہیں کہ محض علوم کی خاطر ہم ایک دوسری زبان کے غلام بن جائیں۔ اور سارا وقت اس کی تحصیل پر ضائع کر دیں جب کہ اس کے سب خزانے ہم اپنی زبان میں منتقل کر سکتے ہیں خصوصاً جب ہماری اپنی زبان ہماری آزادی کی مظہر اور لاطینی ہماری غلامی کی علامت ہے؟"

"مجھے روم سے محبت ہے لیکن لندن مجھے اس سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اٹلی کا حامی ہوں لیکن مجھے انگلستان سے اس سے بھی زیادہ دلبستگی ہے۔ مجھے لاطینی کا احترام ہے لیکن مجھے انگریزی سے عشق ہے۔"

★

مضمون نگاران اور دیگر حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ادارہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتہ مکمل، صاف اور خوشخط تحریر فرمایا کریں۔ (ادارہ)

★

غزل

سراج الدین ظفر

اک عشق ہے آزاد سزا و جزا سے
ہر شے کے لئے ورنہ سزا بھی ہے جزا بھی

کیا کیا سفرِ راہِ محبت میں کشش ہے
چلتے ہیں مرے ساتھ نقوشِ کفِ پا بھی

تا صبح تری زلفِ سمن بو رہی موضوع
شب خلوتِ میخانہ میں ہم بھی تھے صبا بھی

اس طرح کیا تیز سبو نے مرا احساس
سنتا ہوں سکوتِ ابدیت کی نوا بھی

بیٹھے ہوں اگر دست درازانِ خرابات
کُنجوں سے دبے پاؤں گزرتی ہے قضا بھی

کہہ دو کہ جو کر دے قدحِ بادہ مقرر
گردش اسی رستے پہ کریں ارض و سما بھی

اُن سے مری بیماری دل میں ہے اضافہ
ہے روحِ شفا جن کے تنفس کی ہوا بھی

اے آہوئے آوارہ ارادہ ہے کہاں کا
دل بادہ گساروں کا ختن بھی ہے خطا بھی

اخلاص ہو مفقود تو اے واعظِ خوشگو
الفاظ ہی الفاظ ہیں تسبیح و ثنا بھی

دونوں سے مری روح نے باندھے تھے پیماں
کل رات کہ بُت بھی تھے مرے ساتھ خدا بھی

کیا الٹا زمانہ ہے کہ ہر سمت ہیں پہرے
ہے بندِ سلیماں کے لئے شہرِ سبا بھی

حوروں ہی سے مقصد ہے تو کیا شرطِ تقدس
کچھ اور طریقے ہیں تقدس کے سوا بھی

اے زہرہ وشو راہِ وفا میں مرے ساتھ آؤ
اس راہ میں رہزن بھی ہوں میں راہنما بھی

ہوتا ہے یہاں مثبت و منفی میں تصادم
قوسِ لبِ شاہد میں فنا بھی ہے بقا بھی

معلوم ہوا زہد فروشانِ حرم سے
اک جنس ہے بازارِ عقیدت میں خدا بھی

وہ پردۂ اسرار ہو یا پردۂ محمل
ہاتھ اپنے پہنچ جائیں گے بے اذنِ صلا بھی

کچھ رشتہ تو ہوگا کہ پئے یادِ گلِ اندام
بھٹکوں تو مرے ساتھ بھٹکتی ہے صبا بھی

کام آ ہی گیا تجربۂ زلفِ نگاراں
آسودہ ہیں میخوارِ تہِ دامِ بلا بھی

اے تازگیِ روئے غزالانِ خرابات
دم سے ہے ترے تازگیِ آب و ہوا بھی

رکھا ہے مری خاک میں تونے شررِ ہوش
اب کیا اسے سمجھوں کہ ستم بھی ہے عطا بھی

بہکا ہی نہ دے ہمنفسو مجھ کو مرا علم
عالم بھی ہوں آئینۂ جہلِ علما بھی

دیکھا ہے ظفر تجھ کو خرابات میں ہم نے
تجھ کو بھی ہے دعوائے کرامت، ارے جا بھی

غزل

ناصر کاظمی

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

اُٹھ گئی رسمِ مروت ہی دلوں سے ورنہ
یار میخانے میں بیٹھے ہی رہا کرتے تھے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

کر دیا آج کسی غم نے انہیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

تم جفا بھی نہیں کرتے تو جفا کرتے ہو
وہ وفا کرتے رہیں گے جو وفا کرتے تھے

اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سُنا کرتے تھے

★

صہبا اختر

کب تک بنامِ فکر نہ پھوٹے گی روشنی
محرومِ نطق ہیں کئی نغمے شنیدنی

رکھتی ہے اُس تبسمِ سادہ کو رنگ رنگ
وہ غنچگیٔ لب کہ ہے ہر دم شگفتنی

پلکیں کہ جیسے چاند کی کرنیں سمٹ گئیں
کرنیں، کہ جن کا کام ہے بس تیر افگنی

میں چشمِ گُل بنوں کہ صبا کی طرح چلوں
وہ چہرہ دیدنی ہے وہ دامن کشیدنی

تیرے نثار تیری محبت ہے جاوداں
ہر رنج رفتنی ہے ہر اک غم گذشتنی

کیوں سنگِ راہِ سلسلۂ رنگ و نور ہو
اے وسعتِ بہار! مری تنگ دامنی

صہبا غریبِ شہرِ سخن ہے مگر سُنو
پھر کس سے سُن سکو گے سخنہائے گفتنی

★

ماہِ نو، کراچی۔ اگست ۱۹۵۹ء

کُتّے کا کاٹا

ابن انشاء

ہمارے ایک دوست ہیں جمیل الدین عالی۔ غزل گو، دوہا نویس، خوش گل، خوش گلو، بذلہ سنج، حاضر جواب —— آندھی طوفان بجلی پارے اور ڈائنامیٹ کا آمیزہ —— چونکہ دوست ہیں اس لئے ان کی خیریت ہمیں معلوم رکھنی پڑتی ہے۔ لہٰذا کل ہمارے ایک دوست نے جو فلسفی، نقاد، سنجیدہ مزاج اور گنجے ہیں، سرِ راہ ہمیں روک کر پوچھا:

"میاں یہ تمہارے عالی کو کس کتے نے کاٹا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "کتے کا نام پتہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ سنا ہے کہ ایک روز گوشت کے ناغے کے دن عالی صاحب اپنے دوست ابن سعید کے پھاٹک پر اپنے چھکڑے سے اترے ہی تھے کہ موصوف نے ان کی سڈول ٹانگ کو بیف کا ٹکڑا یا نہ جانے کیا سمجھ کر دانت گاڑ دیئے تھے۔ خیر فکر کی کوئی بات نہیں موصوف اب پچھتا رہے ہیں، سلوتری ہر روز یہ موٹی سوئی ان کے پیٹ میں گھونپتا ہے۔"

کہنے لگے۔ "سلوتری؟ عالی صاحب کسی باقاعدہ ڈاکٹر سے انجکشن کیوں نہیں لگواتے؟"

میں نے کہا۔ "چشم بددور۔ عالی صاحب کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ انجکشن کتے کو لگ رہے ہیں۔ خدا کرے تندرست ہو جائے۔ سنا ہے خوب صورت ہے لیکن آپ کو کہاں سے خبر ملی؟"

کہنے لگے۔ "حاشا! مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ یہ تو آپ سے معلوم ہوا۔ میں نے تو محاورہ بولا تھا۔ اور یہ بھول گیا تھا کہ آپ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ میں نئی کرن کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ پھٹیچر سی کتاب انہوں نے لکھی ہے نا؟ بھائی تم اپنے دوہے دوہے لکھو۔ کیوں نثر میں میخیں ٹھونکتے ہو۔ کیوں سیاست کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا چیز ہے نئی کرن۔ میں نے نہیں دیکھی۔"

کہنے لگے۔ "ضرور پڑھیئے گا۔ نئی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ بندۂ خدا۔ اپنے نام کا تو خیال کرنا چاہیئے تھا۔"

میں نے نہایت نادم ہو کر کہا۔ "واقعی بڑی ناشائستہ حرکت ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ لیکن مجھے ایک دن کے لئے وہ کتاب دیجئے تو۔"

تب میں نے وہ کتاب پڑھی جس کے متعلق جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ میں رات بھر بتی جلائے اپنے اینڈے بینڈے ہینڈ رائٹنگ میں لکھتا رہا اور صبح دم ختم کی۔ یہ کوئی ایسی اونچی کتاب نہیں ہے۔ ٹالسٹائی کی 'وار اینڈ پیس'، وکٹر ہیوگو کی 'لامزرابلے' اور شبلی کی 'شعر العجم' سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، وہ کہیں بہتر تخلیقات ہیں تاہم میں نے اسے رغبت اور دلچسپی سے پڑھا اور ایک ہی نشست میں جماہیاں لئے بغیر ختم کر لیا۔ کراچی سے "کاشانۂ اردو" نام کے کسی پبلشر نے معمولی سا ٹائیٹل لگا کر چھاپ رکھی ہے اور بارہ کنے قیمت ہے۔ لیکن اس کی فروخت سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں۔ کوئی صاحب اسے خریدنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر خریدیں۔

جمیل الدین عالی، ایک چھوٹی سی ریاست کے آخری نواب کے فرزند دلبند ہیں۔ یہ ریاست پاکستان میں نہیں اور عالی صاحب کو چند سال قبل کلرکی کا چرخہ کاتتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ ان کے اس دور کا ہم دوسروں سے مصلحتاً ذکر نہیں کرتے تھے لیکن حضرت نے اس کتاب میں خود یہ تسلیم کیا ہے۔ بہرحال نواب ہیں بے ملک سہی۔ ان کے اہل خاندان کے سو سوا سو مربعے پاکستان میں بھی ہیں۔ جس شام زرعی اصلاحات کا اعلان

ہوا ہے عالی صاحب رات بھر مضطربانہ جاگتے رہے۔

"ہائے اب کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا مستقبل کتنا تاریک ہے۔ یہ زمینیں میرے خاندان میں رہتیں تو میں ہر سال یورپ جایا کرتا اور لندن میں اپنے زیرِ تعلیم بچوں سے مل کر فرانس میں انگور کے باغ کی تازہ کشید شراب پی کر دوشیزاؤں کے بارے میں دوہے کہا کرتا۔ مجھے سچ مچ کا دکھ ہے۔ کیا مجھے اسی نسل میں پیدا ہونا تھا؟"

یہ سوچ قدرتی سوچ تھی۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی بیٹھک میں اب تک دقیانوسی عباؤں والے کج کلاہ بزرگوں کی تصویریں ٹنگی ہوں۔

"یہ تصویر اباجان کی ہے۔ یہ ان کے برابر لارڈ لینسڈون ہیں۔ ریاست میں شکار کھیلنے آئے تھے۔ غالب نے ہمارے اباجان ہی کو لکھا تھا: میں تمہارا دادا نہیں دلدادہ ہوں۔"

"انقلاب آیا۔ مارشل لا کا اعلان ہوا اور عالی جی کی آنکھوں کے سامنے 'ٹائم میگزین' کے صفحے ناچنے لگے۔ نوری سعید کی دست و پا بریدہ لاش۔ کیوبا میں گولیوں کی باڑھ کے آگے سرنگوں اجسام ——" ہم پڑھے لکھے افسران خوف کے مارے لرز لرز جاتے تھے۔ قتل عام سے اتنا نہیں جتنا اپنی انا کے قتل سے۔ ہم ہر حکومت کے مستعد فرمانبردار اور چاق و چوبند افسران اس انقلاب سے لرز رہے تھے۔ سات بجے ایوب خاں کی تقریر سنی۔ مجھے ان کے ایک ایک لفظ سے خوف آرہا تھا۔ میرے بچے میری دہشت زدہ صورت دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اپنا اکیلا کمرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی سنسان جنگل ہو۔ جہاں چاروں طرف شیر گرج رہے ہوں۔

اب جو مارشل لا کے ضابطے چھپنے شروع ہوئے۔ "اس کی سزا موت۔ فلاں بات کی سزا چودہ برس۔ دس برس۔ سات برس" تو عالی صاحب کو قدرے عافیت معلوم ہوئی۔

"مجھے اپنی انگریز والی دلی یاد آگئی۔ گورا برابر سے گزرا تو ذرا پرے ہو گئے۔ باقی نہ دس برس نہ موت۔"

"میں مارشل لا سے مطمئن نہ تھا۔ وہ پرانے لوگ کچھ بھی تھے لیکن موت کی سزا تو نہ دے سکتے تھے۔ ایک دستور تھا۔ اس میں بنیادی حقوق تھے۔ عدالتیں ان کی حفاظت کرتی تھیں۔"

اِدھر ان کا یہ عالم تھا۔ اُدھر کافی ہاؤس میں بڑے سے بڑا دقیقہ رس بزرجمہر بیٹھا بلا معاوضہ حکمت کے موتی رولتا اور آپ کو ہر چیز کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ملتا۔ اس کو کسی قسم کا نظری دھوکا دینا ناممکن تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں خوردبین تھی۔ سامنے ٹسٹ ٹیوبوں کی قطار تھی۔ وہ ہر چیز کا کیمیکل تجزیہ کرتے ہوئے اور ہر اعلان کی کنہ کو پہنچتے ہوئے آپ کو بتاتا تھا کہ:

"بوگس دعوے بھارت نے واپس کرائے ہیں۔"

"زرعی اصلاحات روس نے کرائی ہیں۔"

"چھپی ہوئی دولت برطانیہ نے نکلوائی ہے۔"

"سونا قارون صاحب کی وصیت کے مطابق نکالا گیا ہے۔"

"تعلیمی اصلاحات کی تجویز میکالے صاحب کر گئے تھے۔"

"امپورٹ لائسنس کی فروخت جرمن حکومت کے مفاد کے خلاف تھی۔"

"مہاجرین کا مسئلہ مصر نے طے کرایا۔"

"چیزوں کی قیمتیں اس لئے کم کی گئیں کہ غیر ملکی سیاحوں کو فائدہ پہنچے۔"

"رشوت کے خلاف مہم اسکاٹ لینڈ یارڈ کو خوش کرنے کے لئے ہے۔"

اس آب و ہوا میں عالی صاحب نے نئی کرن لکھی تو یقیناً اسے کسی کُتّے نے کاٹ کھایا تھا۔ ابنِ سعید کے دیدۂ دولت کے کُتّے نے نہیں کسی

بڑے ہی ظالم اور زہری کتے نے ——

وہ کتا جمیل الدین عالی کا DOG BENEATH THE SKIN ہے۔ ایک شاعر کا مضطرب ضمیر۔ اس کتے کے کاٹے کا علاج ہے —— عالی ہی کے الفاظ میں :

"پیسے کھانے کی ترکیبیں، نقد، وظیفہ سیر"

"ہائے وہ دُولت گھروں کی شامیں، وہ ان جانے کھوج
شیتل مدرا جلتی ناریں، میٹھے میٹھے بھوج"

"دس ڈالر میں پورس پیٹر نک سے پیار جتائیں
دس روبل میں لوئی فشر کو ننگا ناچ نچائیں"

عالی نے یہ علاج اور یہ حفظ ماتقدم پسند نہیں کیا۔ اچھا کیا یا بُرا کیا، اس سے بحث نہیں۔ موجودہ قضیہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز ان کے کمرے کے باہر ایک چپراسی ایک دفتری سے بحث کر رہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ"۔ ان پڑھ چپراسی نے دفتری سے پوچھا۔ "قانون کا کیا فرض ہے" پھر اس نے خود ہی جواب دیا۔ "قانون کا فرض ہے کہ ہم کو گھر دے۔ اناج دے اور ہسپتال کھولے۔ بولو ہے کہ نہیں ؟"

"یہ فرض قانون کا نہیں" مڈل پاس دفتری بولا۔ "یہ فرض حکومت کا ہے"۔

"اچھا تو حکومت اور قانون الگ الگ ہے ؟ تم ہمیں کیا سمجھتا ہے بھائی ! ہم خود سب بات جانتا ہے"۔ چپراسی دباؤ میں نہیں آیا۔

"اچھا تو بڑا تیرے لئے گھر بنا دیا ہے اس حکومت نے ؟ جا آرام سے گھر پر قبضہ کر لے"۔ دفتری اس کی جہالت پر بھنانے لگا۔

"یہ بات نہیں ہے" چپراسی نے فتح محسوس کی۔ "مگر تم پہلے بتاؤ تمہارا دستور نے ہمارے لئے کیا کیا ؟ اتنا قانون تھا مگر کون سا قانون چلتا تھا بولو"

"اچھا نہیں چلتا تھا مگر اب کیا چل رہا ہے"۔ اب دفتری سوالوں پر اتر آیا۔

"دیکھو بھائی"۔ چپراسی بولا۔ "تم فیل ہو گیا۔ اب دوسرا آیا ہے اسے دیکھو، اس کا کام دیکھو۔ جب وہ فیل ہوگا ہم یہی بات کرے گا۔ نہیں تو ہم اور بات کرے گا۔ ہم تو کام مانگتا ہے۔ بات کرنا نہیں مانگتا"۔

یہ سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچ جمیل الدین عالی کو کانی ہاؤس کے فیشنا غورثوں کی عقل پر بھاری نظر آئے۔ اور اس نے کام دیکھنا شروع کیا۔

"میں کون دمنتر خاں ہوں جو نظریاتی الجھنوں میں تپتا پھروں"۔

(۱)

"ہماری ایک فوج تھی بے حد طاقتور فوج۔ اس کے پاس چھ اکتوبر کے بعد نئے اسلحہ نہیں آئے۔ وہی ٹینک، وہی توپیں، وہی رائفلیں جو ۸ اکتوبر کو اس کے پاس تھیں، ۶۔ اکتوبر کو بھی تھیں۔

۶۔ اور ۸۔ اکتوبر کے درمیان اس کے جوان اور افسر بھی نہیں بدلے گئے۔

یہ فوج ہماری سرحدوں کے قریب ٹھہری رہتی تھی مگر ۸۔ اکتوبر کے بعد سارا غلہ سرحدوں کے اندر ہی رہتا ہے —— کیوں ؟

---

[1] بیرونی سفارت خانے۔

(۲)

"۶۔ اکتوبر کو زمینداروں کے پاس غلہ نہیں تھا۔ نیا ترقی یافتہ ڈپٹی کمشنر پہلے ان کو حکم دیتا تھا پھر خوشامدیں کرتا تھا۔ "میرا خیال تو کیجئے سردار صاحب"۔ ابھی الکشن بھی آرہا ہے۔ میں بھی یہیں موجود ہوں۔ آپ بھی ہیں۔ برابر کے ضلعے میں انہوں نے اتنا جمع کرلیا ہے۔ اب آپ میرا تبادلہ ہی چاہیں تو اور بات ہے"۔

سردار صاحب کبھی رحم کھا کر دو ہزار من غلہ ظاہر کردیا کرتے۔ کبھی بلیک بہت اونچی جارہی ہوتی تو الکشن میں ہارنے کا خطرہ مول لیکر بھی انکار کردیتے اور ڈپٹی کمشنر نااہلی کا الزام لگوا کر تبادلے یا رخصت پر چلا جاتا"۔

اور آج ان ہی زمینداروں کی جماعتیں اسی ڈپٹی کمشنر کے اہلکاروں کے سامنے قرینے سے صف میں لگی ہوئی لاکھوں من غلہ ظاہر کررہی تھیں"۔

(۳)

ایک نواب صاحب کا چودہ لاکھ کا کلیم منظور ہوچکا تھا۔ انہوں نے اسے گھٹا کر اٹھاسی ہزار کردیا۔ وہ ساتھ ساتھ تشریح بھی کرتے جاتے تھے۔ "یہ جو گھٹایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ چودہ لاکھ جھوٹا تھا۔ چودہ لاکھ تو جملہ خاندانی جائداد کے تھے۔ تین نواب وہاں مرگئے۔ گو لاولد مرے مگر ان کا حصہ ہمیں نہیں آتا۔ ہم نے احتیاطاً دکھا دیا تھا کہ ان کی بیوہ طوائف تھی۔ نہ جانے گھر رہی ہو کہ چھوڑ بھاگی ہو۔ دوسرے چچا آنے کا حصہ دار قبلہ تایا میاں کا لڑکا تھا۔ وہ امریکہ میں بس گیا ہے۔ ہم نے اس کا حصہ بھی اپنے ہاں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک کم بخت سوتیلی والدہ تھیں۔ ان کے نام باواجان نے چار آنے ہبہ کردیئے تھے۔ جب تک ہم رہے انہیں تکلیف نہ دی مگر قبضہ نہ ہونے دیا۔ کلیم میں وہ بھی ہم نے اپنا بتادیا تھا اور واقعہ بھی یونہی تھا مگر بھئی اب"۔

(۴)

بھٹ اور بابا جزیروں کے شاہ اسمگلر میرے ٹیکس گزاروں میں رہ چکے تھے۔ بھلے وقتوں میں ان کی گفتگو کا یہ انداز تھا۔ "ساب ادھر ہماری طرف آؤ نا کبھی۔ مچھی کھلاتے گا ہم"۔ وہ اینڈ اینڈ کر کہتے جیسے یہ کہتے ہوں۔ "ساب تم ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہم بڑے سابوں کے آدمی ہیں"۔

اب یہی سمندر اور جزیرے منوں نہیں ٹنوں سونا اور ڈھیروں سامان اگل رہے تھے"۔

(۵)

۳۱۔ دسمبر کو ہمارے کمروں کے باہر تاجروں اور افسروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پوشیدہ دولت کے اعلان نامے داخل کرنے کے لئے۔ ان میں تیسوں روزے رکھنے والے حجاج تھے۔ بعض اوقات ان کی لمبی سفید ڈاڑھیاں دیکھ کر ہم اپنے نپے تلے سوالات بھول جاتے تھے اور انکے حلفناموں پر فوراً یقین کرلیتے تھے۔

مگر ۳۱۔ دسمبر کی رات کے حلف نامے پہلے حلف ناموں سے مختلف ہوگئے تھے۔ کیوں؟ ایک آدمی نے اس کا جواب دیا۔ "صاحب ہمیں تو یہ خیال ہوا کہ جنرل ایوب خاں نہیں چھوڑے گا۔ اب اس نے کہہ دیا کہ سچ بولو اور خطرہ نہ کرو تو ہم سبھی آہی گئے؟"

میں نے سوچا۔ "جنرل ایوب خاں کو حساب کتاب کا کتنا علم ہے۔ شاید بہت معمولی۔ کیا وہ اس کے بہی کھاتے دیکھتے؟ اور دیکھتے تو پکڑ لیتے؟"

اس کا جواب بھی اس نے دیا (شاید میرے خیالوں میں)——

"تم جو پکڑ لیتے۔ تم تو یہ کام جانتے ہو"۔

"تو وہ کہاں سے آگئے"

"ارے تم اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ وہ تمہارے اندر بیٹھے ہیں، اور مجھے دیکھو۔ وہ میرے اندر جو بیٹھے ہیں"۔

*

پس مآلی صاحب نے یہ کتاب لکھدی اور ہمارے فلسفی، نقاد اور گنجے دوست کو ناراض کرلیا۔ بہت سے اصحاب مجھ قسمیہ رازداری کا

حلف اٹھوا کر بتلا چکے ہیں کہ عالی کا اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے کیا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور سے میرے اور عالی کے دو مدمغ دوستوں نے جو اعلیٰ انٹلکچول طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (بائیں بازو والے نہیں۔ وہ تو بدا چھا اور بدنام بُرا کی ذیل میں مارے جاتے ہیں) مجھے پیغام بھیجا کہ عالی سے کہہ دو آج سے ہماری اُن کی کُٹی۔ ہم اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے ہماری ناک کٹوادی۔"

میں نے کہا۔ "خیر باشد"

کہنے لگے۔ "میاں نئی کرن لکھ کر، حکومت کا ڈھنڈورچی بن کر، اس نے اپنے مستقبل پر لات ماری ہے۔ کونسی نئی کرن پھوٹی ہے بھلا۔ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

میں نے اپنی عقل کے مطابق کچھ چنیں وچناں کرنے کی کوشش کی تو ان دوستوں کی زبانی معلوم ہوا کہ میں فرسٹ ایئر کے طالب علموں کی سی انتہائی سطحی اور سوفیانہ باتیں کر رہا ہوں اور یہ ضمیر کی خلش اور POSITIVE THINKING وغیرہ اصطلاحیں سن کر ان کو بے اختیار ہنسی آرہی ہے۔

اس ہنسی کے ڈر سے بے نیاز ہو کر میں نے کچھ اور مبتذل باتیں بھی کہہ دیں اور میرا واقعی خیال ہے :

(۱) جمیل الدین عالی نے صرف اپنے ادبی مستقبل کو خطرے میں ڈالا ہے، کسی اور کے ادبی مستقبل کو نہیں۔

(۲) کسی ادیب کو (خواہ وہ پاکستان کا ہے یا روس کا یا وینزویلا کا) اپنے ہاں کی حکومت یا اپنے ہاں کے انقلاب کی موافقت میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ جب وہ ایسا ایمانداری سے محسوس کرے۔

(۳) دیانت، خلوص، بصیرت، اور حب الوطنی ایسی چیزیں نہیں کہ ٹینڈر طلب کرکے کسی کو ان کا ٹھیکہ دیا جاسکے۔ یہ خواص کے علاوہ کبھی کبھی عامیوں کو بھی مل جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت بڑا صحافی، پروفیسر، وکیل یا حکومت کا سکتر یا وزیر ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۴) حضرت جبرئیل کے بنفس نفیس آکر اہل زمین کی حکومت سنبھالنے اور خدا کی بے داغ بادشاہت قائم کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ انسانی کاموں میں خطا و لغزش کی ملاوٹ معمولی بات ہے۔

(۵) قومی اور انفرادی زندگی میں ایسے موڑ آتے ہیں جب، نامقبولیت یا زیاں کا خطرہ مول لے کر بھی دل کی بات کہنی چاہیئے۔

اور پھر عالی نے خاقانی کی زمین میں کوئی قصیدہ تھوڑا ہی لکھا ہے۔ احتیاط کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے :

"یہ صدر حکومت جو ہر محاذ پر آلائشوں سے جنگ کر رہا ہے، اچھے ارادوں کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اب تک تو اپنے وعدے پورے کئے ہیں۔"

"تاریخ بڑی بے رحم تلوار ہے۔ وہ نہ جنرل ایوب کی دوست ہے نہ میری۔ وہ بڑی بے باک، نڈر اور صاف گو ہے۔"

★

عالی کی کتاب کو دیکھ کر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کتاب بُری ہے تو عالی نے کیوں لکھی۔ اگر اچھی ہے تو دوسرے لکھنے والے کہاں ہیں۔ کیوں چپ ہیں۔ ایک وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کا منہ موتیوں سے بھرا جائے گا یا کم از کم خلعت فاخرہ عنایت ہوگی۔ یہ بات ہوتی تو اس کے بہترین موقعے گزشتہ حکومتوں کے ساتھ گزر گئے۔ جو حکومتیں خود کچھ کام نہ کرتی ہوں وہ پراپیگنڈسٹوں کی محتاج ہوتی ہیں اور ان کی خوب سرپرستی کرتی ہیں لیکن کام کرنے والی یا انقلابی حکومتوں کو مداحوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ عالی کا شمار ان لوگوں میں کبھی نہیں رہا جو ہر حکومت کے مدح خواں ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک سرکاری مصلح اور دعا وی سے ذرا سا انحراف بھی تخریبی کارروائی ہے۔ تو گویا ماورائے سخن کچھ اور بات ہے۔ ان لوگوں کا شاعرانہ خلوص سے خیر مقدم کرنا جو اس کے خوش آئند یا کبیدہ وارانہ مستقبل پر اثر انداز ہوئے ہیں، مداح کی بھی خوبی ہے ممدوح کی بھی۔ حکومتِ وقت کی حمایت، خواہ وہ حکومت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، نامقبولیت کا مجرب نسخہ ہے، اور ہمارے دوستوں نے عالی کے ادبی مستقبل کے متعلق جو تشویش ظاہر کی ہے وہ بے بنیاد نہیں۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی سوال ہے۔

ہمارے اہلِ شعور میں بشرطِ استواری والے خوش عقیدگان اور ہر نئی حکومت کی طرف قبلہ راست کرنے والے ابن الوقتوں کے مقابلے میں دو طبقے اور ہیں۔ ایک جس کا خمیر کلبیت سے اٹھا ہے۔ یہ طبقہ آنکھیں اور کان موندے بیٹھا ہے اور صرف زبان کھولے ہے۔ ان لوگوں کے لئے اسلامی، جمہوری، اشتراکی یا فاشی کسی حکمراں کی تخصیص نہیں۔ یہ کسی کی رو رعایت کے قایل نہیں۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ عالم آب و گِل کے مسائل ان کے سوا نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ ان سے مشورہ لئے بغیر حل کر سکتا ہے۔ جب کبھی ملک پر کوئی افتاد پڑے یہ خوش ہو کر اور سر ہلا کر کہتے ہیں: "دیکھا میں نہ کہتا تھا۔" "میں نے تو پہلے ہی روز کہہ دیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے کی نہیں۔" ان کا کام محض ستاروں کی چال دیکھنا اور مستقبل کے زائچے بنانا ہے اور یہ لوگ اپنے خمارِ گندم کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ دوسرا طبقہ کلبی نہیں لیکن اپنے مزعومات کو الہام کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اس بات کا قایل ہے کہ ہر چیز بطریقِ راسخ شعرا ہونی چاہیئے اور اگر انقلاب کو آنا ہے تو ان کی نظریاتی بائبل کے احکام عشرہ کے مطابق آئے ورنہ یکسر غلط ہوگا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ زرعی اصلاحات ہو ہی نہیں سکتیں بھلا جو لوگ خود زمیندار یا کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے حقوق سے دستکش ہو سکتے ہیں؟ جب یہ اَن ہونی بات ہو گئی تو اب کہتے ہیں ذرا اسے عملی صورت ملے تو جانیں — جب عملی صورت بھی مل جائے گی تو ان کے پاس کوئی اور برہانِ قاطع نکل آئے گی۔ یہ لوگ اس مشہور ریاضی داں کے ہاتھ پر بیعت ہیں جس نے دریا عبور کرتے وقت اس کی گہرائی کا حساب نکالا تھا۔ ایک جگہ دو فٹ تھی، بیچ میں سات فٹ اور ایک کنارے تین فٹ۔ اوسط نکلا چار فٹ مطمئن ہو کر دریا میں قدم رکھ دیا۔ بیچ میں آ کر کنبہ ڈوب گیا۔ خود قسمت کے سکندر تھے ڈبکیاں کھاتے ہاتھ پاؤں مارتے کنارے پر آ لگے۔ پھر اوسط نکالی، وہی چار فٹ۔ حیران ہو کر کہنے لگے عجیب بات ہے۔ اوسط گہرائی برابر چار فٹ نکلتی ہے۔ کنبہ ڈوبا تو کیوں؟

زرعی اصلاحات بھی ہوئیں خفیہ آمدنیاں بھی باہر آ گئیں۔ اسمگلنگ بھی رک گئی، بدعنوان افسر بھی نکالے گئے۔ لیکن یہ کیسے ہوا؟ 'کتاب' کی رو سے تو ناممکن ہے — میاں ذرا میرے چٹکی لینا — دیکھوں خواب کا عالم ہے یا بیداری کا۔

★

ہاں تو وہ کونسا نفسیاتی نکتہ ہے جو عالی یا کسی بھی ادیب کے لئے جو اثباتی نقطۂ نظر سے کوئی بات لکھتا ہے، خطرے کا باعث ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کار کتنا ہی تعمیری کیوں نہ ہو اس کے حق میں کچھ کہہ کر مقبول ہونا بہت مشکل ہے، ہاں اس کے خلاف آپ جھوٹوں بھی آواز بلند کر دیجئے یا شاعری کے پردے میں چھپا ہوا احتجاجی یا تعریضی حملہ کریں گے تو لوگ طرح طرح کی رعایتوں اور چشم پوشیوں سے کام لے کر اسے سراہیں گے دنیا کے ان ادیبوں کی شہرت اور مقبولیت کا جنہیں ہم " DISILLUSIONED " کے زمرے میں رکھتے ہیں، یہ بھی ایک بڑا راز ہے۔ انسانی فطرت کسی کی اچھائی سننے کی طرف اتنی راغب نہیں ہوتی جتنی برائی سننے کی مشتاق ہوتی ہے۔ روس اور چین دنیا کے دو ملک ہیں جہاں سوشلزم کے عملی تجربے ہوئے، وہاں بلاشبہ اکثر تعمیری اقدامات اس قسم کے ہوئے جیسے ہمارے یہاں ۷ اکتوبر کے انقلاب کے بعد ہوئے، یا متوقع ہیں۔ زرعی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات، دستوری اصلاحات، روزگار کا تحفظ، بلیک مارکیٹ کا خاتمہ، دولت کے ارتکاز کا سدباب وغیرہ۔ ظاہر ہے ان کے متعلق نظمیں، مضمون، ڈرامے، افسانے، ناول وغیرہ بھی لکھے گئے ہوں گے۔ ان بے شمار تخلیقات میں سے کچھ چیزیں یقیناً اچھی بھی ہونگی — یعنی جو افادی بھی ہوں اور ادب بھی۔ لیکن ہم ان میں سے نہ کسی تخلیق کا نام جانتے ہیں نہ اس کے لکھنے والے کا۔ ہمارا پیمانہ وہی مفرور کراؤ چنکو، وہی تیس برس پرانا آندرے ژید اور وہی سنکی جارج آرویل ہیں۔ آج اگر سکریننگ میں کوئی مشہور لکھنے والا نااہلی یا بدعنوانی کی بنا پر معتوب ہو جائے اور ایک رقت آمیز ناول لکھ کر جس میں صاحب دولت طبقے کو نزع کے عالم میں گرفتار دکھایا گیا ہو، انٹرنیشنل مارکٹ میں بھیج دے تو یقیناً وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور پاکستان کی صحیح تصویر سمجھا جائے گا لیکن وہ تصویر حقیقت بھی ہوگی؟ کوئی عالی پاکستان کے موجودہ نظام کی ہجو کو اگر کسی ترکیب سے اپنے دیس میں اسمگل کر سکے تو خواہ اس کا موقف کیسا ہی سست بنیاد اور مغالطہ آمیز کیوں نہ ہوتا، اس کے ادبی مستقبل کی سبھی لوگ ضمانت لینے کو تیار ہو جاتے —— آخر کیوں؟

دانشور طبقہ ہر معاشرے میں بہت اہم طبقہ ہوا کرتا ہے لیکن اسے ریڑھ کی ہڈی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حیثیت غیر دانشور اکثریت ہی کو حاصل رہتی ہے۔

کسی صحیح انقلاب کا منصب دانشوروں کے لئے جنت شداد بنانا نہیں ہوتا۔ خیر کثیر اصل منزل ہوتی ہے۔ پاکستان کا انقلاب اگر کافی ہاؤس یا ڈرائنگ روم یا پریس کلب میں بیٹھے سو دو سو چار سو بقراطوں کو خوش نہیں کر سکتا تو کوئی ہرج نہیں۔ اس کا مقصد اسمگلروں، خائنوں، بلیک مارکیٹیوں اور عیاش جاگیرداروں کی خوشنودی بھی نہیں، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ حاصل کر چکے ہوں۔ اس کی کسوٹی باقی آٹھ کروڑ غیر ادیب، غیر وکیل، غیر جرنلسٹ، غیر پروفیسر، غیر افسر، اور غیر نواب آبادی کا ردِ عمل ہے اور وہ ردِ عمل واضح ہے۔ موجودہ حکومت سے غالباً بعض فروگزاشتیں بھی ہوئی ہونگی اور آگے چل کر بھی ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں بدیہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ پہلوں سے مختلف ہیں اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے دار و رسن کا ڈراما کھیلے بغیر چپ چاپ وہ کچھ کر دکھایا ہے جو عموماً کشت و خون والے انقلاب کے بعد ہوتا ہے (اکثر اوقات نہیں بھی ہوتا)، لہٰذا ان لوگوں کو معاف کر کے جو مرمریں برجوں میں بیٹھ کر آسمانی پریوں کے متعلق لکھتے ہیں یا حجاب امتیاز کے افسانوں کے کرداروں کی طرح دھنک دیکھتے، خوشبوئیں سونگھتے اور ایرانی بلیوں سے کھیلتے زندگی بسر کرنے کے قایل ہیں ــــ باقی سب کو سوچنا ہے کہ ملک کی تقدیر کے ایک اہم موڑ پر ان کا کیا فرض ہے۔ انہیں کس کا ساتھ دینا ہے۔ حالی کو لوگ جذباتی کہیں گے لیکن دنیا میں جذباتی ہونے کے مواقع بھی تو آتے ہیں، جس شخص نے دس سال تک نفسا نفسی کا ڈراما دیکھا ہو اسے جب معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ بڑے صاحبوں کو محجوبی کھلانے والے شاہ اسمگلروں اور دیہات کے کمیلیوں جیسی کسان زادیوں کا شکار کرنے والے زمینداروں کے دن ختم ہو گئے اور انسانی تعلقات میں سکے کے چلن کے علاوہ زندگی کی دوسری قدروں کی بھی پوچھ شروع ہو گئی ہے، تو وہ کیوں نہ جذباتی ہوگا۔ سرحد کا ڈیڑھ سو سالہ پیر مرد اتول خاں سوچتا ہے یہ کون سا بادشاہ ہے جس کے راج میں پہلی بار میرے گاؤں میں قتل بند ہوئے ہیں۔ ایک صوبے کا حاکم حیران ہے کہ یہ کیسا صدر ہے جو ہدایت کرتا ہے کہ زمینوں کی ملکیت کی حد ایسی رکھنا کہ مجھے بھی اپنی زمین کا ایک ٹکڑا چھوڑنا پڑے۔ سکرٹری حیران ہے کہ اہلِ سیف کے طبقے میں سے یہ آدمی کہاں سے آ گیا جس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ذاتی عشرت میں صرف نہیں ہوتا، جس کا مطالعہ اتنا وسیع اور رائے اتنی صائب ہے۔ جو درویشوں فقیروں فلاکت زدوں اور اہلِ علم کے سامنے خاکساری سے گداز ہو جاتا ہے۔ جو برادری میں سبکی برداشت کر لیتا ہے لیکن ایک عزیز کو جس کا نام قرعے میں نہیں نکلا سفارش کر کے حج پر نہیں بھجوا سکا، جو ایک سالن کا کھانا کھاتا ہے اور اس مد میں خرچ کے لئے حکومت کی طرف سے جو رقم مقرر ہے اس کا ایک حصہ بچا کر سرکاری خزانے میں داخل کرتا ہے۔ یہ باتیں چھوٹی سہی لیکن حکومت کی پالیسیوں میں منعکس ہو کر چھوٹی نہیں رہتیں۔ یہ باتیں نا معلوم سہی لیکن جسے معلوم ہونگی اسے ضمیر کا کانٹا ضرور کھٹکے گا۔ حالی نے کتاب لکھ کر اپنی عاقبت، خراب کر لی ہے۔ دیکھیں:

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

★

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کیلئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں یا رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہِ راست حسب ذیل پتے سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان" معرفت پاکستان ہائی کمیشن، شیر شاہ میس روڈ۔ نئی دہلی۔ ہندوستان۔

منجانب: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

★

مان سون کا دیس

بیگم سلمیٰ تصدق حسین

وہ لوگ جو برسات کی رت میں مان سون کے دیسوں کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں کے پُرلطف نظاروں سے کیف اندوز ہوئے ہوں اور انہوں نے ان مرغزاروں اور کہساروں میں موسلا دھار بارش اور طوفانی برسات کے مناظر دیکھے ہوں صرف وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیلون، سنگاپور، جاپان، تھائی لینڈ بلکہ تمام مشرق بعید کے ممالک اور مشرقی پاکستان کے دلفریب نظارے ایک دوسرے سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر برکھا رت کا دلفریب اور روح پرور حسن وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ صبح ہو یا شام مطلع ابر آلود، گھٹا ٹوپ بادل! مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے، پانی سے لدے سیاہ بادل تہہ در تہہ لحافوں کی طرح اُلٹ پلٹ چلے آتے ہیں! اور فضا پر یوں چھا جاتے ہیں جیسے نیلی چھتری کے نیچے ایک اور کالی چھتری پھیل گئی ہو۔ اور اس چھتری میں سے کوئی چھاجوں بھر بھر کے پانی اُنڈیل رہا ہو۔ اور پھر یوں مینہہ برستا ہے کہ کئی کئی دن آسمان نظر نہیں آتا۔ اور اگر آسمان دم بھر کے لئے کھل جائے تو سورج کی کرنوں سے دنیا چمک اُٹھے۔ آٹھوں پہر دھواں دھار بارش۔ ہر طرف جل تھل۔ ندیاں نالے بھر بھر کر اچھلتے ہیں۔ گھر گھر تال تلیاں، جھوپے اور پکوان، غریبوں کی بستیاں ٹپکے سے حیران و پریشان نظر آتی ہیں۔ یہ سب پانی کے دیس، دھرتی کے پن کٹوروں کی طرح کناروں تک بھرے ہوئے، ڈل ڈل کرتے ہیں۔ اور لوگ جل پریوں کی طرح پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اوپر سے موسلا دھار پانی برستا ہے، اور نیچے دھرتی پر بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔

اگر آپ ہوائی جہاز کی بلندیوں سے یہ نظارہ دیکھیں تو اور بھی دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ بے پایاں سمندر کی طرح کنارہ نظر ہی نہیں آتا۔ گاؤں کے گھروندے پانی میں گھرے ہوئے، بانسوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آسمان سے یہ ننھے ننھے گھر نیچے زمین پر بکھیر دئے ہیں۔ کوئی یہاں جا پڑا ہے کوئی وہاں۔ اور اب یہ سارے بانسوں کے سہارے پانی کی سطح پر کھڑے ہیں۔

اگر تیز ہوا چلے تو شاید یہ گھر ناؤ کی طرح بہنے لگیں، لوگوں کی آمد و رفت ننھے ننھے شکاروں، کشتیوں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں پر ہوتی ہے۔ جگہ جگہ سبز پودے اور پیڑ پانی سے باہر جھانکتے نظر آتے ہیں۔ خشکیوں کے رہنے والے پانی کے دیس میں حیرت سے منہ تکتے اور سوچتے ہیں کہ الٰہی خشک زمینوں پر ہم پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہاں تیری رحمت کا یہ عالم کہ زمین کو دم بھر کے لئے خشک نہیں ہونے دیتی۔

ان پانی کے دیسوں کے باشندے آدھے خشکی اور آدھے پانی ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں پانی انسانوں کی زندگی میں اس طرح گھلا ملا نہ ہو جیسے شیر و شکر۔ خشکی کے رہنے والے ایسی رُت میں ضرور کپڑوں کو سنبھالیں گے، جسم کو چھپائیں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ پانی سے بچ کر رہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے۔ عورتیں سروں پر گاگریں اٹھائے بے تکلفی سے پانی میں اُتری جاتی ہیں۔ انہیں ذرا بھی دھڑکا نہیں ہوتا کہ ان کی ساڑھی بھیگ جائے گی۔ یا جسم پانی سے شرابور ہو جائے گا۔

مرد ہیں تو وہ بھی جگہ جگہ کشتیوں میں گھومتے۔ مچھلیاں پکڑتے اور سودا سلف لاتے نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مشرقی پاکستان کا یہ موسم اور یہ آب و ہوا، ایک نئی زندگی۔ اور نیا ہی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ لوگ بے دھڑک پانی میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سروں پر بانس کی چھتری نما ٹوپیاں رکھے ہوئے بارش سے بچاؤ کی صورت پیدا کر لیتے ہیں، اور روزمرہ کے کام کاج میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیتے۔

دیہاتوں کا منظر تو جو ہوتا ہے سو ہے، شہروں میں بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بلند اور عمدہ عمارات اونچی سطح پر بنی ہوئی طویل سڑکیں شہری آبادی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب بارش کا پانی ہوتا ہے جبکہ قدرتی تالاب پانی سے لبالب اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

مان سون کا دیس
(مشرق پاکستان)

۱ :

''آئے بدروا گھر گھر کے''

۲ :

۳ :

۱ : ''مجھے جانا ہے اس پار''

۲ : ''کشتی لوں یا لانچ''

۳ : ''کوچہ و بازار بھی اک جوئے آب''

ارض نغمہ
(وادیٔ مہران)

سرود بے خودی
(ڈھولک ، بانسری اور گھڑے پر سنگت)

'' مرلی کی دھن بجائے جا''

نغمات سرمدی
(روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)

سوز نے (الغوزہ)

اونچے سرسبز درخت، پھولدار بیلیں، ہری ہری گھاس اور شام کے وقت چہکتے ہوئے پرندے، قمری کی کوکو کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی شاعری حسن کے اِن خوبصورت پیامیوں سے بھری پڑی ہے۔ قدرت کی اَن گنت حسین چیزوں کے علاوہ اڑتے پھرتے بادل، قدرت کے ارغوانی اور سفید ہرکارے، جگہ جگہ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ شعرا کے لئے ایک لاثانی دنیا کا نہایت دلکش اور حسین منظر ہے اور حسن وعشق کا لاجواب سرچشمہ ۔۔۔ قدرت نے مشرقی پاکستان کو پانی اور ہریاول کا دیس بنا کر اس کے باسیوں کو زرخیز تخیل اور دلآویز طرز بیان بھی عطا کیا ہے۔ ایک مسلسل سبزہ زار جس میں پانی اَن گنت شکلوں میں بکھرا پڑا ہے۔ اس کے لئے خلیج بنگالہ کی وسیع پہنائی کیا کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ادھر ہمالہ کی فلک بوس دیوار خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بے پناہ بخارات سے لدی ہوئی ہواؤں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انہیں حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے طوفانی جوش وخروش کے ساتھ واپس لوٹ جائیں، اور جل تھل کا عالم رچا دیں۔ بخارات بھی اس حکم کی تعمیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ بادلوں کے کارواں پر کارواں اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، فضا دھواں دھار ہو جاتی ہے۔ اور برسات کا گھن گرج ڈراما بڑے زور وشور سے شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی زبردست رَن میں رتھ ہی رتھ گڑگڑاہٹ پیدا کرتے چلے آ رہے ہوں۔ اس برسات کا ہر دن کیف انگیز ہوتا ہے۔ آپ نے فلم "تان سین" میں دیکھا ہوگا کہ جب دیپک راگ گانے سے تان سین کا تن من پھنکنے لگتا ہے، تو اس کی محبوبہ "میگھ راگ" الاپنے لگتی ہے "اُمڈ گھمڈ کر برسو۔ پیا پر برسو" بادل کشتۂ محبت کی یہ درخواست سُن کر روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر اُبھرنے لگتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ تمام آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ اور پھر ایک طوفان ــــــ بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے، سیاہ بادل آپس میں ٹکراتے ہیں ــــ کڑک، خوفناک کڑک، دھرتی کا دل ہلا دیتی ہے، برسات کی اس جلالی شان کو دیکھنا ہمت سے تعلق رکھتا ہے۔

ہم خشک خطوں کے رہنے والے اگرچہ ان کیفیات سے بے بہرہ نہیں، مگر برسات کی جلالی اور قہرمانی شان سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں بھی برکھا رت کچھ ایسے ہی طمطراق اور کروفر سے آتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بخارات پہاڑوں کے سینوں سے ٹکرا کر برسات کا حسن وجمال پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہریاول بکھیرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں۔ ایک آدھ موقعہ پر ہمارے یہاں بھی دھرتی پر مشرقی پاکستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ندی نالے ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا دیتے ہیں۔ اور ایک بے پناہ سیلاب بن کر لوگوں کو طوفانوں سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زندگی خطروں میں گھر جاتی ہے۔ اور موت کے منہ میں بھی حیات کا سُراغ نکلنے لگتی ہے۔ مشرقی پاکستان اور دیگر خطہ ہائے وطن جیسے ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ان طوفانی مصائب کا مقابلہ دونوں میں یگانگت پیدا کر دیتا ہے۔ خلیج بنگالہ کا پانی کراچی کی جانب منہ موڑ لیتا ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ سمندر کے کنارے پر آباد کراچی، جو برساتی طوفانوں سے ناآشنا تھی، اس کے گلی کوچے بھی ان طوفانوں سے ہمکنار ہوں گے۔ درحقیقت قدرت تند وتیز گھٹاؤں کے ذریعے کراچی اور سندھ کو اپنے وطن کے اس خطۂ دور ودراز سے مانوس کرانا چاہتی ہے۔ اب کراچی بھی مشرقی پاکستان کے تصور سے محروم نہیں۔ وہاں بھی قدرت اسی زور شور سے ماں سون کا حسین موسم مہیا کر دیتی ہے۔ اور اس کے گلی کوچوں کو ندی نالوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مگر سچ پوچھئے تو یہاں کی برسات اور مشرقی پاکستان کی برسات کا کیا مقابلہ! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اس قدر بے پناہ کہ الاماں والحفیظ! اس کا نقشہ تو وہی کھینچ سکتا ہے جس نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ مری اور اکثر دوسرے پہاڑوں کی طرح یہاں بھی بعض گھروں کی چھتیں چادری ہوتی ہیں۔ جب ان پر بارش کے موٹے موٹے قطروں کی اندھا دھند بوچھاڑ ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وحشی جنات نے ہزار ہا ٹین کے کنستروں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا ہو اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اس قہرمانی شور وغل سے حسِ سماعت شل ہو جائے تو بعید نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس جلال میں ناقابلِ بیان جمال بھی پنہاں ہے۔ افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کا اردو ادب اس جمالِ فطرت سے آشنا نہیں ہوا۔ ہمارے اکثر ادیبوں کو وہاں جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ آج سحرِ بنگالہ کے ساتھ ساتھ حسنِ فطرت کے سحر کا بھی چرچا ہوتا۔ برسات کے قہرمانی پہلو کی جھلک فضل احمد کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ تو مشہور ہے کہ زندگی اور ماحول میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر کیا بعید ہے کہ جہاں افق پر بادل چھا جائیں۔ وہاں انسانی ذہن پر بھی

بادل ہی بادل منڈلانے لگیں۔ برسات کے موسم کی رومانی اور جذباتی کہانیاں شاعر کے لئے ایسا مواد مہیا کرتی ہیں کہ وہ دیوان کے دیوان مرتب کرسکتا ہے، اور بچاری عورت کے نام سے برسات کو مناسبت دے کر پریم کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ پی کی لگن اور برہ کی اگن اور خدا جانے کیا کیا جادو نہیں جگاتے جاتے۔ جس برہن کے پیا پردیس سدھارے ہوں، اس کی نظروں میں اُڑتے پھرتے بادل قدرتی پیغام بر نظر نہیں آئیں گے تو اور کیا ہوگا؛ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی شاعری میں ان خوبصورت ہرکاروں کا بار بار ذکر آتا ہے، اور گویا لکھنے والے انہیں کے گن گاتے ہیں۔ وہاں پر بادل اور پانی ہی دو چیزیں زندگی میں حسن و جمال اور محبت کی روح پیدا کرتی ہیں۔ پگھلوٹوں کا سلسلہ، گاگروں کا بھرنا اور چھلکنا، سانولیوں کا مٹک مٹک کر چلنا، بادلوں کی دلفریب آنکھ مچولیاں، ندی نالوں کا اٹھکیلیاں کرتے ہوئے بہنا، کشتیوں کی روانی، کھویوں کے گیت، چپوؤں کی آواز، لہروں کا بن بن کر ٹوٹنا، پانی میں مچھلیوں کا اچھلنا اور جھلملانا، کسانوں کا پانی سے بھرپور کھیتوں میں دھان لگاتے ہوئے گیت گانا اور بھونروں کا ڈال ڈال پات پات گھومنا۔ یہ سب زندگی کو ایک ناقابلِ بیان کیف عطا کرتے ہیں۔ سینکڑوں رومان اس کے آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اور شاعری کا ایک وسیع حصہ انہیں رومانوں کے سہارے جیتا ہے۔ بادلوں میں قوس قزح کی اٹھان حسن کی کمان بن کر عشق کے دیوتاؤں کو بلاتی ہے۔

ادھر کسانوں کی سوئی ہوئی امیدیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں، زندگی کھیلنے کودنے اور ناچنے لگتی ہے۔ شاعری اسی ماں سون کی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ شعر و ادب کی گود ہری ہو جاتی ہے اور سیکڑوں جذبات مایوسی کی گرفت سے نکل کر حیاتِ نو سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ بنگلہ شاعری جہاں ندی نالوں، کشتیوں اور مانجھیوں کے گیت سناتی ہے، وہاں کھیتوں کھلیانوں، دھرتی اور انسانوں کے راگ بھی الاپتی ہے۔ بنگلہ کے مایۂ ناز شاعر نذرالاسلام اسی زندگی کے گیت اور انہیں طوفانوں کی کہانیاں سناتے ہیں، اور انہیں ملاحوں اور دہقانوں کے من کی جوت جگاتے ہیں۔ ان سب کا دامن اسی برسات کے موتیوں سے مالامال ہے۔ اور ہر چیز اسی کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہے۔ جو زلفِ بنگال سے کم دلآویز نہیں۔ دوسری طرف اس بانسوں کے دیس میں بنسری کا نغمہ بھی وہ کیف پیدا کرتا ہے جو بے اختیار شاعری کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ ماں سون اس دیس کے چپے چپے کو گلزار بنا کر جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیتی ہے، یہاں کے رہنے والے بجا طور پر اپنے دیس کے لازوال حسن پر، جو فطرت نے اسے اس دریا دلی سے عطا کیا ہے، فخر کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو کر شعر و نغمہ کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑ جاتے ہیں جو صدیوں تک ان کی یاد تازہ رکھتا ہے ؂

راولپنڈی ۔۔۔ میرے خوابوں کا شہر

رفیق خاور

اگر میرے ذہن میں راولپنڈی کا تصور کتنی ہی یادوں سے لپٹا ہوا آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ میں نے اسی میں آنکھ کھولی اور اسی میں پروان چڑھا۔ میری نظر میں یہ بچپن کے دیکھے ہوئے نظاروں کی خواب نما دنیا ہے جس کی کشش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اور اب جب حالات نے اسی کے پاس نئے دارالحکومت کی طرح ڈال دی ہے، کچھ عجب نہیں کہ میرا خوابوں کا شہر اوروں کے خوابوں کا شہر بھی بن جائے۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں صبح سویرے اٹھتا تھا تو نظروں کے سامنے برف کی سفید براق دیوار کھڑی نظر آتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کا لبے پایاں برف پوش سلسلہ میرے بالکل پاس کھڑا ہو۔ اور اقبال کے شعر کی مکمل تفسیر کہ ؎

اک تجلّی تھی کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اور یہ کہ ؎

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

اس برف کے دامن پر جو زمین سے آسمان تک پھیلی نظر آتی تھی جا بجا دھارے سے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سفید بادلوں پر بجلی کوند کر شاخ در شاخ نظر آتی ہے اور پھر جس طرف نظر اٹھائیں ٹیلے ٹیلے پہاڑ ہی پہاڑ۔ نورپور اور رشید پور کی پہاڑیاں جن کے نشیب میں نیا دارالحکومت آباد ہونے کو ہے نو دس میل ہی تو دور ہیں نورپور کے پہاڑ پر دور سے ایک بڑا سا سفید نشان نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑی دلچسپ کہانی سننے میں آئی تھی۔ یہ کہ کسی شخص کی گائیں سیلاب میں ڈوب گئی تھیں وہ ایک بزرگ کے پاس پہنچا اور رو دھو کر اپنی بپتا سنائی اس نے کہا تم اپنے گھر کا رخ کئے چلے جاؤ اور گائیں نکل نکل کے تمہارے پیچھے چلتی آئیں گی لیکن خبردار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ وہ سب پتھر ہو جائیں گی۔ اس نے بزرگ ۔۔۔ (شاید وہ شاہ بری لطیفؒ ہی ہوں) ۔۔۔ کے کہنے پر عمل کیا اور گھر کی طرف منہ کر کے چلنے لگا تھوڑی دور چلا تو خیال آیا دیکھوں بزرگ کی بات کہاں تک سچ ہے۔ اس وقت تک صرف ایک بچھڑا باہر نکلا تھا وہی پتھر بن کے رہ گیا! بظاہر یہ عوامی ذہن کی من گھڑت کہانی معلوم ہوتی ہے جو بچھڑے سے ملتی جلتی کسی چٹان کو دیکھ کر گھڑ لی گئی ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ پہاڑ پر سے دھواں اٹھتا معلوم ہوتا اور آگ کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں دکھائی دیتیں جو کبھی لمبی ہو جاتیں کبھی چھوٹی۔ جیسے تو "ہنس" رہا ہو ۔۔۔۔۔۔ ! ۔ خبر نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن ہمیں بتایا یہی جاتا تھا کہ یہ پہاڑی جنگلوں میں آگ لگ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو یہ آگ کا سماں بہت دلکش معلوم ہوتا تھا جی چاہتا ان پہاڑوں کو قریب سے دیکھیں چنانچہ مری کی تنگ سڑک پر جو زمین کی سطح سے ڈیڑھ دو گز اونچی بنائی گئی تھی اور جس کے دونوں طرف توڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے رہتے تھے کبھی مستطیل کبھی مربع، سائیکل چلاتے چلاتے ہم نورپور پہنچ ہی جاتے۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوتا کہ پہاڑ کتنے پُرفضا ہوتے ہیں اور ان کی آب و ہوا کتنی خوشگوار۔ نیچے بیس پچیس فٹ کی گہرائی میں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا صاف شفاف بل کھاتا نالہ عجیب لطف دیتا اور اس سے پرے بری شاہ لطیف اور دوسرے بزرگوں کے خوشنما مزار بڑے باوقار معلوم ہوتے اور ساری جگہ

یوں لگتی جیسے یہ ایک بہت ہی خوش آیند باغ ہو۔ اگر یہاں میلہ لگا ہوتا تو اس کی رونق کیا کہنے۔ طرح طرح کے لوگ دور دور سے آئے ہوتے اور میلے کو چار چاند لگاتے۔ راگ رنگ اور ناچ گانا تو خیر ہوتا ہی ہے۔ لیکن جوئے کے رسیا دُور دُور سے آتے۔ کوئی ہارتا کوئی جیتتا اور جو ہار جاتا وہ اپنے مخصوص پشاوری انداز میں کہتا "توشاہ بری لطیف نہ ہوسی طوطا دبا ہوسی" یعنی یہاں شاہ لطیف دفن نہیں ہیں طوطا دفن ہے جب ہی میں اس کی مدد سے کامیاب نہیں ہوا — !

یہ تو یہاں کی زندگی کا مزاحیہ پہلو ہوا، جو کہاں نہیں ہوتا ؟ کہتے ہیں نالے کا پانی چشموں سے آتا ہے اور ہم ان کا سراغ لگانے کے لئے بڑی بڑی چٹانوں پر لپک لپک کر چڑھتے اور چشموں تک پہنچ کر ہی دم لیتے۔

نورپور سے ذرا پرے جائیں تو بل پیچ کھاتی پہاڑی سڑک کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور میل ڈیڑھ میل آگے بڑھیں تو لوکاٹ کے لمبے چوڑے باغات سے ہوتا ہوا انسان سید پور کے ہمسایہ پہاڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہندوؤں نے اپنے مخصوص انداز میں مندر بنائے ہوئے ہیں اور نیچے مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ غسل خانے بنائے ہیں۔ جن کے بیچوں بیچ ایک نالہ ہو کر نکلتا ہے۔ ان عمارتوں کے پیچھے کبھی کچھ تاریخ ہے یا شاید کوئی تحریک تھی جو مجھے بھول چکی ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کو جو سڑک جاتی ہے وہ مری روڈ کے اس طرف ایک اور سڑک ہے۔ مری روڈ کی دوسری طرف بھاری بھرکم چٹانوں میں سے بل پیچ کھاتا ایک بہت بڑا نالہ آتا ہے جو راول پر آبشار بنا کر گرتا ہے جس کا سماں دیکھنے کے لائق ہے۔ ہم اکثر دیکھتے کہ کوئی مچھلی کے شکار کا شوقین کنڈی میں کیچوا لگا کر پانی میں ڈال دیتا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبی سی بام مچھلی سانپ کی طرح تڑپتی باہر نکل آتی۔

اور ہاں، تھوڑی ہی دور ایک اور بزرگ عورت کا مزار بھی تو ہے۔ بالکل سڑک کے کنارے، دائیں طرف جس پر ہنڈیاں ہی ہنڈیاں دکھائی دیتی ہیں — اس کے متعلق بھی چوروں کی کوئی کہانی مشہور ہے، بڑی دلچسپ۔ مگر آپ کہیں گے یہ تو ہوئیں راولپنڈی سے دور کی باتیں۔ ہمیں تو خاص راولپنڈی کی باتیں سنائیے۔

شاید راولپنڈی کا نام راول ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اگرچہ ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ اس کو راولوں، یعنی ایک قسم کے فقیروں، نے آباد کیا ہے — خاص راولپنڈی کی دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اور وہ بھی ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کی نظر میں۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت ہی کھیت۔ کبھی مکا کبھی جوار کبھی سرسوں اور کہیں کہیں چنوں کی اک ہری بھری دنیا جن کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ شہر کا شہر اور گاؤں کا گاؤں۔ شہر اب اور بھی بڑھ گیا ہے بہت دور، مری روڈ کے دونوں کنارے کئی میل تک۔ کتنی ہی جگہ "سیٹلائٹ ٹاؤن" نے گھیر لی ہے — اگرچہ یہ کافی کھلا کھلا بنایا گیا ہے۔ گاؤں یعنی ہرے بھرے کھیت بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن یہ اپنی بہار ضرور دکھاتے ہیں۔ پیازی پیازی زمین پر لہلہاتے کھیت یوں لگتے ہیں جیسے کسی نے سبز ریشمی تارکشی سے بڑی ہی استادی کے ساتھ کشیدہ کاڑھا ہو۔ باجرا، مکی اور جوار کے بھٹے اور سرسوں کے پیلے پیلے پھول مجھے ابھی تک یاد ہیں ان ہی سے میرے ذہن میں تر و تازگی یا ہرے بھرے پودوں اور سرسوں کی گندل یعنی ساگ کے ڈنٹھلوں کی لہلوٹ کا تصور رس بس گیا ہے۔ باجرے اور مکا کے بھٹے یا اُن کی گھی میں رچی میٹھی روٹیاں کھانا، یہ بھی پنڈی ہی پر ختم ہے۔

کھیتوں سے کوئی ایک میل دور زمیں دوز قلعہ کتنا پراسرار معلوم ہوتا تھا! جیسے کسی بہت ہی بڑی کچی عمارت کا گنبد زمین پر آ رہا ہو اور اس کی سطح پر گھاس ہی گھاس اُگی ہو۔ گرداگرد لوہے کی تیکھی تیکھی چپٹی چپٹی سلاخوں کا جنگلا، گہری کھائی کبھی خالی کبھی پانی سے بھرپور۔ اور سامنے لوہے کا سرخ گیٹ۔ ایسی ہی کہیں دوسری طرف ایک اور زمیں دوز قلعہ بڑی طلسمی چیز معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی بڑے بڑے میدان تھے جہاں آئے دن ہاکی فٹبال کے میچ اور ٹورنامنٹ ہوتے اور عجیب گہما گہمی نظر آتی۔ اور کھیل ہی کھیل میں کبھی بے تحاشا دنگا فساد بھی شروع ہوتا۔ پانی سے بھری نہر کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ آس پاس اونچے اونچے درختوں پر فاختائیں حق سِرّہٗ کرتیں اور ان سے ملتی جلتی ایک اور چیز جسے بٹیر کہتے ہیں، جھاڑیوں میں اُڑتی پھرتی جن کا ہم کبھی غلیلو اور کبھی چھرے والی بندوقوں سے شکار کرتے پھرتے کیونکہ اتفاق سے ہمارے پڑوسی پٹھان تھے۔ اور اُن کے پاس ہر طرح کی بندوقیں تھیں۔ وہ شکار یا یوں کہیے اس کے گوشت کے بہت ہی دلدادہ تھے۔ یہاں کے پہاڑی کوّے اتنے بڑے بڑے، پھولے پھولے، چونچ ذرا سی سفید بھاری کالا دنتوں جیسی

آواز میں قاقا کرتے، اپنے بھاری بھاری پر ہلاتے آتے اور جھٹ چھرّوں والی بندوق کا شکار ہو جاتے۔ 'کرڑوت' کھانا بھی ہم نے اپنے پڑوسیوں سے سیکھا۔ 'کرڑوت' پنیر کے سخت سخت یا گول ڈھیلوں کو کہتے ہیں جن سے دانتوں اور جبڑوں کی ورزش بھی ہوتی ہے اور آزمائش بھی۔

بلا کی سردی، بلا کی گرمی۔ سردیوں میں زمین پر کہیں کہیں کہرا جما ہوا اور تالابوں کی سطح پر برف کی پپڑی جم جاتی ہے۔ ایک بلور کا صاف ستھرا ہموار تختہ جس پر پتھر لڑھکایا جائے تو وہ تیزی سے تیرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا ہے اور اگر اس کو کنکر مار کر توڑ دیا جائے تو خوبصورت کرچیں ہی کرچیں نظر آتی ہیں۔ پانی جمنے کی نوبت تو نہیں آتی تھی لیکن ہم رات کو کٹوروں میں پانی بھر کر کھلی ہوا میں رکھ دیتے — اور وہ صبح ہونے تک جم جاتا پھر ہم اس میں شکر ڈال کر مزے سے چبا چبا کر کھاتے اور یہ خوب لطف دیتی۔ برسات آنے پر کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔ جوہڑ پیازی رنگ کے گدلے پانی سے بھر جاتے اور کنارے پر یہ بو یعنی بُرادے کی سی باریک چیز تنکے اور کچرا تیرتا نظر آتا۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار بڑے بڑے کالے بھونڈ بھی چلے آتے جنہیں ہم "سانڈ" کہتے تھے۔ (بعض جگہوں پر ان کیڑوں کو "اللہ میاں کی بھینس" بھی کہا جاتا ہے) ہم ان کا سر گیلی زمین میں گاڑ دیتے اور یہ اس کو اپنے کالے کالے سینگوں سے زور شور کے ساتھ کھود کھود کر اندر گھسنے لگ جاتے۔ جب یہ ذرا زیادہ دور چلے جاتے تو بل میں پانی چھوڑ دیا جاتا اور یہ بیچارے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے۔ اسی طرح "سانڈوں" کی لڑائی کو اگر اس کا تماشہ دیکھتے۔ برسات کے کلاونت 'مینڈک' جتنے بڑے اور پاٹ دار آواز کے یہاں دیکھنے میں آئے شاید ہی کہیں ہوں۔ اور بارش ختم ہونے پر زمین سے اَن گنت سوراخوں سے نکل نکل کر ہوا میں اڑنے والے بھورے بھورے ننھے ننھے پروانے جنہیں چڑیاں لپک لپک کر کھاتیں!

برسات کا زور سب سے زیادہ نالہ لئی میں دکھائی دیتا۔ اتنا تنگ کہ چڑھا ہوا پانی اس میں اندھا دھند ریلا مار کر آتا اور کمپنی باغ کے پاس، جو اب "لیاقت باغ" کہلاتا ہے، آکر پھیل جاتا۔ چنانچہ برسات کے بعد یہ ابلتی ہوئی ندی بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اور کمپنی باغ۔ اتنی خوبصورتی سے بنایا ہوا، اس کی شامیانوں جیسی برمی وضع کی بارہ دریاں، ان کے ارد گرد چھوٹے بڑے شہتوتوں کے درخت، کھیلنے کا میدان جہاں ہم ماموجی اسلامیہ ہائی اسکول کے طالبعلم سالانہ جلسوں کے موقع پر کاغذی پھولوں سے سجاوٹ کے لئے دن بھر بانسوں کی مچانیں بناتے اور جس کے ایک طرف تھوہر کی گھنی جھاڑیاں اُگی تھیں اور ان تھوہروں میں وہ گہرے ارغوانی رنگ کا گاڑھا پانی، خونِ شہیداں کی طرح، جس سے زیادہ خالص سرخ رنگ شاید ہی تصور کیا جاسکے۔

راولپنڈی کی رگِ حیات مری روڈ ہے اور وہاں کی زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی پر ہوتی ہے۔ کوئی ہے جس نے اس سے گزرتے ہوئے شاہ کی ٹاہلیاں یعنی شیشم کے پیڑ نہیں دیکھے؟ کہتے ہیں ان ٹاہلیوں کے شاہ صاحب کہیں سے روانہ ہوئے تو یہ شیشم کے پیڑ بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ اور جب وہ یہاں آکر رکے تو یہ چالیس ٹاہلیاں بھی یہیں رک گئیں یہ بھی عوامی تخیل کی کتنی اچھوتی پرواز ہے۔ جو شاید شیشم کے درختوں کا جھنڈ دیکھ کر پیدا ہوئی۔ ویسے راولپنڈی ٹاہلیوں کا گھر ہے۔ جہاں دیکھو شیشم کے بڑے بڑے تناور پھیلے ہوئے درخت جو سڑک کے دونوں طرف عجیب بہار دیتے ہیں اور برسات میں بارش اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں چلتے پھرتے انسانوں کے لئے قدرتی شامیانے بن جاتے ہیں۔ ان کے گول گول پتے، ان کی سوندھی سوندھی خوشبو اور سفید سفید بور بھلائے نہیں بھولتے۔

مری روڈ پر پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں کیسی کیسی رنگ برنگی فوجیں بینڈ بجاتے گورے، ہائی لینڈر اپنے بیگ پائپ بجاتے اور دیسی زور شور سے ڈھول بجاتے، مارچ کرتی تھیں اور پھر خچر باتریوں اور رسالوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا کہ ختم ہی نہ ہوتا۔ ان رسالوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر توپیں اور گن مشینیں لگی ہوتیں۔ اسی مری روڈ پر چھاچھیوں کے خوبصورت ٹانگے اپنے بانکے گھوڑوں کے ساتھ رواں دواں دکھائی دیتے۔ ایک تو مضبوط و تنومند چھاچھیوں کی مخصوص وضع اور دوسرے ان کے نفیس ٹانگے جو پشاوری ٹانگوں کے بعد اپنا جواب نہیں رکھتے، کون ہے جو ان سے مسحور نہ ہو۔ ان گھوڑوں سے وہ میلہ اسپاں یاد آگیا جو درحقیقت میلہ مویشیاں ہوتا تھا اور چھاچھی محلہ کے سامنے ہی ایک کشادہ میدان میں لگتا تھا۔ کمپنی باغ کی بارہ دریوں سے ملتی جلتی ایک خوش وضع بارہ دری یہاں بھی تو تھی جو ہمارے لئے طلسمی کشش

دلکش تھی۔ جب میلہ لگتا تو اس میں خبر نہیں کہاں کہاں سے گھوڑے خچریں اور گدھے امڈ آتے اور ہنہنانے، رینکنے اور گھنگروؤں کی چھن چھن کرنے سے ایک عجیب سماں بندھ جاتا ——— جابجا تنبو بھی لگے ہوتے اور ہم لڑکے بالے سارا دن دیوانہ وار انہیں گھومتے رہتے۔ چونکہ اس میلے میں مویشیوں کا سودا ہوتا تھا، اس لئے جابجا تنبو لگے ہوتے جن میں لین دین کے دستاویز تیار ہوتے۔ ان سودوں میں ہمارے لئے خاص کشش بالکل نئی سنہرے رنگ کی چمکتی دمکتی پائیوں کی ہوتی جو خبر نہیں اتنی تعداد میں کیوں آتی تھیں۔

مری روڈ ہی کی دلچسپیوں میں سے ایک کشمیریوں کی آمد کا سلسلہ تھا کبھی اکا دکا، کبھی ٹولے کے ٹولے۔ کالی کالی لوئیاں پہنے اور گردن یا پیٹھ پر نمک کے بھاری بھاری ڈھیلے اٹھائے۔ اس وقت تو آنا جانا قدرتی حالات کے تحت تھا۔ لیکن اب! ایک ناسازِ تقدیر اور ”اجنبی کے دست غارت گر“ کی چیرہ دستیوں نے خاک و خوں میں غلطاں ہونے والے 'کشمیری' کو ترک وطن کرتے ہوئے ادھر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے! اور یہی مری روڈ ہے جس پر بلکہ سارے شہر میں لمبے تڑنگے پوٹھوہاری، ادھوڑی جوتے پہنے رواں نظر آتے ہیں۔

شہر کے اندر ”شاہ چن چراغ“ کی درگاہ پر ہر سال زوروں کا میلہ لگتا ہے جس میں گانا بجانا تو الگ رہا، سال بھر حال پڑنے کا سماں عجیب کیف رکھتا ہے۔ ہم لوگ راجہ بازار جاتے وقت اس کے پاس گذرتے تو دو چار آدمیوں کو درختوں کے ٹہنوں سے الٹا لٹکے ”حق حق“ کرتے دیکھکر بڑے حیران ہوتے۔ ہم راجہ بازار سے جھنگی محلہ واپس آئیں اور سرداروں کے لمبے چوڑے شاندار باغ سے نہ گذریں، یہ ناممکن تھا۔ یہ باغ سردار سوہن سنگھ کا تھا، اسی لئے اس کو سرداروں کا باغ کہا جاتا تھا۔ ادھر سے آتے وقت لگے ہاتھوں جامع مسجد کا نظارہ بھی ہو جاتا جس کے تالاب میں سرخ رنگ کی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ اور جس طرح یہ مسجد تعمیر ہوئی وہ بھی اچنبے یا یوں کہئے معجزے سے خالی نہیں۔ ہر گھر والی آٹا گوندھتے وقت مٹھی بھر آٹا ہنڈیا میں الگ رکھ لیتی جس کو جمع کرنے والے ہر جمعہ گھر گھر جا کر فراہم کر لیتے۔ اور اس کو بیچ کر جو روپیہ ملتا وہ مسجد کی تعمیر پر صرف ہوتا۔

راولپنڈی ہی کی یادوں میں محرم کے دنوں کی سماں بھی شامل ہے جب گھر گھر شہدائے کربلا کی یاد میں کھیر یا فیرنی تیار کر کے چھوٹے چھوٹے کوزے بھرے جاتے جنہیں وہاں 'کجی' کہا جاتا ہے۔ یہاں کی ایک دلچسپ ریت یہ ہے کہ بچے ٹولیاں بنا بنا کر گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے اونچی آواز میں ”کوئی نادر و کہاری۔ کوئی ..... “ کہتے پھرتے ہیں اور گھروں والے انہیں بلا بلا کر یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت 'کجیاں' دیتے ہیں۔

ایسے ہی کھیلوں میں چھین چھوت یا آنکھ مچولی سے ملتا ہوا دلچسپ کھیل ہے جو لڑکے رات کو جمع ہو کر کھیلتے ہیں۔ ایک ہانک لگاتا ہے ”یوسف پھل گلاب دا، کالی انگل ٹی لو“ اور دوسرے لڑکے آواز کی سمت کا پتہ چلا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھلوں میں ملوک سوکھا ہوا گہرے نیلے یا کالے رنگ کا، ہاڑیاں (زرد آلو) خوبانیاں اور گرنڈے (بہت ہی چھوٹے قسم کے کالے کالے دانے جن کی شکل اور ذائقہ جامنوں سے ملتا جلتا ہے) یہ سب برسوں گذر جانے پر ذہن، اور ذہن سے زیادہ دل سے محو نہیں ہوتے۔

صدر کی دلچسپیاں اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ گوروں کی بسائی ہوئی بستی ہے جنہوں نے چھاؤنی اور صدر کو اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق بہت ہی شاندار بنایا تھا۔ اور پنڈی میں گوروں کے ساتھ ساتھ ان کے چرچے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ دیسیوں کی بہادری کے سلسلے میں یہ اکثر سننے میں آتا کہ کس طرح ایک گل محمد والے چاچی کو جوان نے کتنے ہی نشے میں دُھت گوروں کو پیٹ ڈالا اور ان کی ساری نقدی چھین لی! یہ تو تھا زندوں کا کارنامہ۔ مردوں ——— اور وہ ظاہر ہے پیروں فقیروں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ کی کرامات بھی کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ یہ بات آئے دن سننے میں آتی کہ ریلوے اسٹیشن کی دیوار کے پاس جو ایک سائیں کا مزار ہے وہاں کسی گورے نے حسبِ عادت کھڑے ہو کر نازیبا حرکت کی۔ سائیں نے جلال میں آکے اسے اُلٹا کر ساری رات سر کے بل کھڑا رکھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پھر یہ بھی سننے میں آتا کہ جہاں ریل گاڑی اس مزار کے پاس آئی، اُلٹ گئی۔ انگریز بھی ایک استاد تھا اور پہلے درجہ کا مدبر۔ جھٹ جھنڈی سے سلامی دینے لگا اور سائیں جی کو راضی کر لیا ———!

صدر یوں تو سب کا سب دیکھنے کے لائق ہے۔ نفیس ڈاک خانہ، طویل اور شاندار پشاور روڈ، جابجا توپیں نصب، فوجی ہیڈ کوارٹر

ماہ نو، کراچی، اگست ۱۹۵۹ء

جہاں سے چاروں طرف نظر ڈالی جائے تو پہاڑیوں کا گول دائرہ ایک انگوٹھی سا لگتا ہے جس میں پنڈی نگینہ کی طرح جڑا ہے، لال کرتی جس کی وجہ تسمیہ خبر نہیں کیا ہے لیکن نام کتنا دلکش ہے! اور پنڈی سے تین چار میل دور ٹوپی رکھ کتنا پیارا نام ہے! آپ پوچھنے لگ جائیں گے کہ یہ نام پڑا کیسے۔ شاید اس کی شان نزول یہ ہو کہ صاحب لوگ یہاں تفریح کے لئے آتے تھے اور ہیٹ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے! رکھ، کے معنی شاید آپ نہ سمجھیں یہ وہ ہری بھری جگہ ہے جو پھولوں پودوں وغیرہ کے لئے رکھ لی جائے۔ جیسے نرسری۔ گرین ووڈیا "پریزرو" انگریز لوگ اسے "پارک" کہتے تھے۔ دیسی 'رکھ' کہنے لگے۔ اور یہ میلوں تک پھیلا ہوا بیلا یا دریائی جنگل واقعی 'رکھ' کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر خالد نے اسی کی بنا پر لکھا ہے کہ

رکھ میں پرانے جھنڈ کے اندر
ایک پپیہرا درد کا مارا پیہو پیہو کرتا ہے
کون سنے یہ غم کی باتیں کون کسی کی سنتا ہے!

ٹوپی رکھ کے ادھر دریائے سُہاں ایک عجیب شانِ محبوبی سے رواں ہے۔ ذرا اور پرے جائیں تو چک لالہ کی چھاؤنی نظر نواز ہے۔ پھر اسی کی ہم قافیہ دوسری جگہیں۔ سہالہ، مانکیالہ وغیرہ۔ سارا علاقہ گیرو رنگ کی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے اور پھر ادھر سے ادھر جائیں یا اُدھر یعنی جہلم گجرات سے ادھر آئیں، پہاڑیاں ہی پہاڑیاں اپنی گود میں ہری بھری پیاری پیاری خوبصورت کیاریاں لئے ہوئے اور سرنگوں پر سرنگیں جو ایک طلسم سے کم نہیں۔ دوسری طرف نکل جائیں تو "شاہ کی ڈھیری" زبانِ حال سے عہد رفتہ کے جاہ وجلال کی داستان سنا رہی ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات اگر شاہ کی ڈھیری نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور اس کی دلچسپیاں اور دلآویزیاں تو ایسی چیزیں ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اسی نظر سے ان کو دیکھنا بھی لازم ہے۔

مگر پنڈی اور اس کے گرد وپیش کے علاقے کی سب سے بڑی دلچسپی اور دولت تو اس کے لوگ ہیں۔ مضبوط، توانا، جفاکش، جیالے۔ جو پیدائشی فوجی ہیں اور پاکستانی فوج کا ایک نہایت اہم حصّہ۔ ہزارہ اور دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح پوٹھوہاری بھی نہایت بلند بالا، وجیہہ، دلیر اور بیباک ہیں۔ کھردری زبان اور لب ولہجہ جس سے وقار اور مردانگی ظاہر ہو۔ اس رزمیہ وضع کے باوجود وہ بزم یعنی شعر وشاعری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ اُن کی بولی، اُن کے ٹپّے، ان کے گیت اک ناقابلِ بیان اور مسحور کن کیف، تازگی، چٹخارے اور سب سے بڑھ کر اصلیت کے حامل ہیں جنھیں سنتے ہی انسان پھڑک اٹھتا ہے۔ گریرسن نے ان کی زبان کو آریائی زبانوں کے بیرونی حلقے میں شمار کیا ہے۔ اور جو لوگ ہندکو، سندھی، ملتانی، سرائکی وغیرہ کی ساخت اور لب ولہجہ سے آشنا ہیں وہ اس ہم وضعی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی داد کوئی ماہر لسانیات ہی دے سکتا ہے۔ ہماری دلچسپی تو محض بولی کے چٹخارے اور اس کے لوک گیتوں اور ٹپّوں کی دلآویزی تک ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور ——— آخری بات بھی سن لیجئے۔ شروع شروع میں پنڈی کی بولی اور لب ولہجہ مجھ پر بُری طرح حاوی تھا ——— ہوسی ——— ویسی ——— آسی، جاسی ——— کھاسی اور دوسرے پوٹھوہاری الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب میں اپنے آبائی وطن "بٹالہ" آیا تو میرے ہم جماعت اس عجیب بولی کو سن کر لگے ہنسی اُڑانے ——— رفتہ رفتہ زبان اور لہجہ منجھ منجھ کر ایسے صاف ہو گئے کہ اچنبھے سے خالی نہیں ——— اگرچہ میرے بعض احباب ——— سید ضمیر جعفری، احمد ندیم قاسمی، اور زیڈ۔ اے۔ بخاری کے لہجے سے اب تک جہلم، سرگودھا اور پشاور کا لہجہ صاف جھلکتا ہے۔ بالعموم جن لوگوں پر شروع ہی سے ان علاقوں کا لہجہ حاوی ہوتا ہے وہ اس سے کم ہی دامن چھڑا سکتے ہیں۔

ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی)

"راولپنڈی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک جگہ اب سے کچھ دن پہلے تک ٹوپی پارک کے نام سے موسوم تھی۔ لانبے لانبے سرو، چیڑ اور بہت سے خودرو درختوں سے گنجان اس جگہ کو کبھی "ٹوپی رکھ" کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ گرد ونواح کے غریب عوام یہاں سے خشک لکڑیاں اور ایندھن جمع کر کے لے جاتے تھے۔ یہ ویران جنگلی علاقہ بدمعاشوں کا مسکن اور لٹیروں کی جائے پناہ تھا۔ لوگ نصف النہار کی تیز روشنی میں بھی وہاں کی فضا کو تاریک اور گناہ آلود محسوس

کرتے تھے۔ انگریزی دورِ حکومت میں اس کا نام "ٹوپی پارک" رکھا گیا، اس کے باوجود اس کی ویرانیوں میں کمی نہ ہو سکی۔ لوگ نام سن کر جس شوق و اشتیاق سے جاتے، وہاں پہنچ کر انہیں اسی قدر مایوسی ہوتی۔ وہی "ہُو کا عالم، ہر سو وحشت، ویرانیاں، جنگل بیابان ایسا کہ غالب کو اپنا گھر یاد آئے۔۔۔۔ لیکن مجرموں کا وہ مسکن اب ایک صاف ستھری بہترین تفریح گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کا نیا نام "ایوب نیشنل پارک" ہے جس کا افتتاح خود صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے ۵ مارچ ۱۹۵۹ء کو کیا۔

چکنی سپاٹ سڑکیں، گل ہائے رنگا رنگ کے دلفریب تختے، خوشنما ریسٹورینٹ، خوبصورت بارہ دری، وسیع مصنوعی جھیل اور دیگر آرائش و زیبائش نے مل کر نہ صرف ٹوپی پارک کو ایوب نیشنل پارک بنا دیا بلکہ اسے ایسا حسن بھی بخشا ہے کہ وہ ایک نہایت عمدہ تفریح گاہ بن گیا ہے۔ چاروں طرف لوگوں سے خوب چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے اور جیسے جیسے شام کی گلابی فضائیں پارک کے ہرے بھرے ماحول پر چھاتی ہیں یہاں کا ذرّہ ذرّہ زندگی کی گوناگوں خوشیوں سے چمک اٹھتا ہے۔ شام کی کجلاہٹوں کے ساتھ ساتھ کاروں، تانگوں اور سائیکلوں کی قطاروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جدید طرز کے پرتکلف اور صاف ستھرے ریسٹورینٹ زبانِ حال سے "تنگیٔ داماں" کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ جھیل میں کشتی رانی کا معقول انتظام ہے۔ لیلیٰ شب اپنے لانبے گیسوؤں سے جب سارے عالم کو ڈھانپ لیتی ہے، چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہوتا ہے اور کہکشاں دور تک کسی عروسِ نو کی زرتار اوڑھنی کی طرح جگمگاتی ہے۔ کسی دوشیزہ کے دل کی معصوم دھڑکنوں کی طرح جھیل کی لہروں پر چاند ہلکورے کھاتا ہے تو اکثر باذوق لوگ کشتیوں میں محفلِ موسیقی کا رنگ جماتے ہیں۔ کبھی کشتیوں پر مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فلک کے باسی بھی جھیل میں اتر آئے ہیں اور شعرا حضرات اس سحر انگیز فضا سے مسحور ہو کر شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

پارک میں جگہ جگہ پختہ سائبان بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں رنگ برنگی بڑی چھتریاں جن کے نیچے پتھر کی ترشی ہوئی آرام دہ کرسیاں، کئی جگہ موتی لٹاتے ہوئے فوارے، حوضوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی خوش رنگ مچھلیاں، یہ سب مل کر پارک کے حسن کو اور بھی رنگین بنا دیتے ہیں۔ بچوں کا پارک، جس کی دیدہ زیبی بڑوں کو بھی دعوتِ نگاہ دے کر کچھ دیر کے لئے روک لیتی ہے بچوں کے لئے علیحدہ تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پارک کے ایک حصّہ میں گولف کلب اور کھیل کا میدان بھی ہے جس کا افتتاح بھی کچھ دن پہلے صدرِ محترم جنرل ایوب خاں ہی کے ہاتھوں ہوا تھا۔

راولپنڈی بذاتِ خود حسین جگہ ہے۔ اس کے بہت سے نواحی مقامات پکنک منانے اور فرصت کے اوقات گذارنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایوب نیشنل پارک اپنی خوبصورت ترتیب و تعمیر کی وجہ سے سب سے زیادہ پُر فضا مقام بن گیا ہے۔ پارک کو موجودہ ہیئت اور حسن بخشنے میں جنرل ایوب کی دلچسپی اور راولپنڈی کینٹونمنٹ بورڈ کے افسران کی کارکردگی شامل ہے۔ (قدیر نعیمی)

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

نقد و نظر

نفرت کی دیوار

مصنف: منظور ممتاز
ناشر: ممتاز پبلیکیشنز لاہور
ضخامت: ۴۳۱ صفحات
قیمت: ساڑھے آٹھ روپے

مصنف کا خیال ہے کہ "اس دنیا میں کوئی ہرجائی نہیں ہے۔ لڑکے لڑکیاں اور لڑکیاں لڑکے بدلتے رہتے ہیں۔ دونوں کو ایک گم گشتہ روپ کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی حاصل کرنے کے لئے اور کبھی چھن جانے کے بعد!" چنانچہ ناول کے ہیرو مقصود کا قصہ اسی نظریے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اسے زینو سے دلچسپی ہو جاتی ہے جو اس کے خوابوں کی ملکہ ہے۔ زینو اسے نہیں ملتی لیکن اس کی سہیلی ریحانہ جو خود ایک متمول اور ترقی پسند گھرانے کی لڑکی ہے مقصود سے متاثر ہو کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مقصود بحرین چلا جاتا ہے اور وہاں ایک یہودن میں زینو کی جھلک پاکر اس کے ساتھ اسرائیل بھاگ جانے کو تیار ہو جاتا ہے مگر یہودی رقیب کے ہاتھوں زخمی ہو کر پھر ریحانہ کی آغوش میں واپس آ پڑتا ہے۔

قصے کے واقعات عام قسم کے ناولوں سے مختلف نہیں البتہ مصنف نے رومانی محاکات میں خاصی دلچسپی لی ہے اور اس قسم کے مناظر کا اعادہ و تکرار نازک مزاج قاری کو شاید ضرورت سے زیادہ نظر آئے گا۔ ناول کا انداز بیان سیدھا سادا اور بے پیچ ہے اور نوجوان مصنف نے اس میں کسی نئے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عام اسلوب شگفتہ ہے لیکن بعض جگہ زبان کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔

نوجوان مصنف تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں اس لئے ان کا اسلوب نکھرنے اور بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ وقت گزاری کیلئے اس ضخیم ناول کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے لیکن کتاب پڑھنے کے بعد وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہو گا کہ مصنف اپنے عجیب و غریب نظریے کی تاویل میں پورے طور پر کامیاب ہو گیا ہے۔ اخلاقی و مجلسی نقطۂ نظر سے مصنف کے نظریے پر گفتگو کی بہت کچھ گنجائش ہے لیکن ناول کی پستی میں ان امور کا تذکرہ غالباً بے محل سمجھا جائے گا۔ ر۔

بولتی تصویریں

از عبدالمجید بھٹی
ناشر: خاور پبلشنگ کوآپریٹیو سوسائٹی۔ لاہور۔
صفحات ۴۸، قیمت مجلد دو روپے

"تازہ خبر

کوے نے کچھ کم تولا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
چیل نے سونا چھپا رکھا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
اُلو نے نقلی گھی بیچا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
بلی نے چوری دودھ پیا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا

ایسے تو پکڑے جائیں گے"

رنگین، خوبصورت، تصویروں اور نظموں کی یہ کتاب ننھے منے بچوں کے لئے بنائی گئی ہے جس کا رنگ ڈھنگ اوپر پیش کئے گئے نقش سے بخوبی ظاہر ہے۔ جیسے یہ اس کی منہ بولتی تصویر ہو۔ اور یہ خبر ۷ ۔ مارشل لا کے بعد کسی اخبار سے لی گئی ہو۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ کسی شاعر نے کیا کہا تھا کہ وہ بھی پکڑا گیا! اس کتابچے کی نظمیں بچوں کیلئے من بھاتی روحانی غذا بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ابن انشا کی "بلو کا بستہ" کے بعد یہ انگریزی وضع کی بچوں کی نظمیں اردو میں داخل کرنے کی دوسری کوشش ہے۔ لیکن ان کے تیور اتنے شوخ، تیز تیکھے اور رنگا رنگ نہیں کیونکہ تقریباً تمام نظموں کی وضع ایک ہی ہے۔

ایک بات اور۔ بچوں کے لئے نظمیں کہتے کہتے شاعر خود بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ اور اس کی سنجیدہ شاعری میں بھی ہلا غلا

اور مکتب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیفیت تابکے؟

مجید لاہوری

از شفیع عقیل
ناشر، مکتبۂ ماحول۔ بہادر شاہ مارکیٹ
کراچی۔ صفحات ۳۵۰
قیمت ساڑھے چار روپے

"میں ہوں مجید لاہوری
حرف و حکایت کا کالم"

لیکن مجید محض ایک اخبار کا بے حس و حرکت کالم ہی نہ تھا بلکہ ایک لحیم شحیم، زندہ و توانا اور زندہ دل انسان بھی تھا جس نے صحافت کی حد تک اردو کو بعض نرالی چیزیں عطا کی ہیں۔ ان کا ملکی فضا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی نظم و نثر کی تحریروں میں ایک رچی ہوئی واقعیت صاف نمایاں ہے۔ اس نے ایک ذکی الحس اور زندہ انسان کی حیثیت سے اپنے ماحول کے خلاف ردعمل کیا اور بعض بڑی اچھوتی چیزیں یادگار چھوڑیں۔ ایسے شخص کی زندگی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں اور شفیع عقیل نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اس کی حیثیت بوسول کی تو نہیں پھر بھی اس نے اس گوشت پوست کے انسان سے قریب رہ کر اس کا بڑا وقیع نظر سے مطالعہ کیا ہے جو ہمدردانہ ہوتے ہوئے حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ جو لوگ پاکستان کے ابتدائی دور میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ "مجید لاہوری" سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور نہ پیش نظر کتاب سے جس میں حرف و حکایت کے اس کالم کو زندہ کر کے دکھایا گیا ہے۔

"منتخبات خوشحال خاں خٹک"

شائع کردہ:
پشتو اکیڈمی
یونیورسٹی آف پشاور
مع اردو ترجمہ
از ڈاکٹر سید انوار الحق
صفحات ۳۲۰۔ اشاریہ ۱۴ صفحات
قیمت درج نہیں۔

آجکل پاکستانی زبانوں، ان کے ادب اور علاقائی مشاہیر پر روز افزوں توجہ ہے۔ اور اس سے ہماری ملت اور اس کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال روز بروز زیادہ اجاگر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو بوجہ احسن حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان اور سندھ، مغربی پنجاب اور سرحد میں متعدد ادارے سرکاری امداد سے قائم ہوئے ہیں جنہوں نے آثار کہن کو بروئے کار لانے میں بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ "منتخبات خوشحال خاں خٹک" ان ہی میں سے ایک ہے جو پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور کے سلسلۂ مطبوعات کی تیسری کڑی ہے۔ اور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں پہلی دفعہ نہایت اہتمام سے پشتو کے نامور شاعر خوشحال خاں خٹک کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر سید انوار الحق کا اردو ترجمہ بھی ہے جس سے پہلی بار اردو خواں حضرات کو اس شاعر کے دل و دماغ اور فکر و بیان تک رسائی کا موقع ملتا ہے۔ شروع میں متعدد تمہیدی تحریروں سے اکیڈمی کے مقاصد، پختون قوم اور اس کی تہذیب و ثقافت اور خوشحال خاں خٹک کی شخصیت و کلام پر بسیط روشنی پڑتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس شاعر کی زندگی اور شاعری کے بسیط مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں۔ جس کا حکیم ملت نے اس قدر و اہمیت سے ذکر کیا تھا اور جو اپنی کی طرح شاہین و عقاب کا شاعر تھا۔ ایک مرد مجاہد جس نے آج سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے اپنے طور پر خودی کی تربیت، تحفظ اور نشو و نما کی تعلیم دی تھی۔

پنجابی قصے فارسی زبان میں

باہتمام ڈاکٹر محمد باقر
شائع کردہ: پنجابی ادبی اکیڈمی
۱۲۔ جے ماڈل ٹاؤن لاہور۔
صفحات ۲۷۰۔ قیمت نو روپے

پشتو اکیڈمی کی طرح پنجابی ادبی اکیڈمی اپنے یہاں کی ادب و ثقافت کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ پنجاب کی مایۂ ناز چیز اس کی واریں اور طویل منظوم داستانیں ہیں جو اپنے دیس سے نکل کر برعظیم کے اکثر حصوں پر چھا گئی ہیں۔ ان میں ہیر رانجھا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دنیا میں ایسی اور کوئی نظم موجود نہیں جس کو اتنے لوگوں نے اتنی زبانوں میں نئے نئے رنگ میں پیش کیا ہو۔ صرف پنجابی ہی میں اس کی مختلف پیشکشوں کی تعداد بہتر ہے اردو میں بھی اس داستان نے کتنے ہی روپ دھارے ہیں یہاں تک کہ سابق پنجاب و سندھ میں متعدد مقامی فارسی شاعروں نے اس کو فارسی نظم میں بھی نظم کیا۔ اور غیر معمولی قدرت دکھاتے ہوئے تنوع اور آب و رنگ پیدا کیا یہی کیفیت دیگر قصص و حکایات کی بھی ہے مثلاً سسی پنوں، مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال، یہ واقعی سب ایک نہایت

اہم باشان ادبی سرمایہ ہیں جس کو مذکورہ اکیڈمی نے فراہم کرکے بروئے کار لانے کا تہیہ کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ایسے حصوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں چار مشہور داستانوں کی تقریباً ڈیڑھ درجن صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ سب مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں اور تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کرتی ہیں۔ اگر انہیں فارسی زبان و ادب کی "بہارِ ہند" کی بہارتازہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

خطاطی اور ہمارا رسم الخط

یوسف بخاری

طباعت: اردو ٹائپ

ضخامت ۲۱۳ صفحات

قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے غیر مجلد تین روپے

ملنے کا پتہ: ایچ۔ ایم سعید کمپنی ناشران کتب پاکستان چوک۔ کراچی

خطاطی اور رسم خط کے موضوع پر اردو میں مواد بہت کم ہے۔ چند مختصر رسالوں اور منتشر تحریروں کو چھوڑ کر اس موضوع پر کوئی مبسوط کتاب موجود نہ تھی۔ بخاری صاحب نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور نوادرات کی فراہمی کا شوق بھی ہے جو اس کتاب کی تدوین و تحریر سے ظاہر ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا بڑا حصہ "ماہ نو" کی مختلف اشاعتوں میں چھپ چکا ہے۔ رسم خط کی بحث پر بخاری صاحب نے بہت سے زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔ ملکی، تعلیمی، انتظامی اور طباعتی موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے مگر رسم خط کے مبحث پر ان کی تحریر جوش کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار اور حقائق کو جمع کرنے میں ان کی کاوش قابل داد ہے۔ اور ٹائپ کی تجدید و اصلاح اور رسم خط کے باب میں ان کی بعض تجاویز قابلِ غور و عمل ہیں۔ (ظ۔ق)

باغی چٹانیں

مصنف: سراج رضوی

ناشر: ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی پاکستان چوک کراچی

صفحات: ۳۳۶

قیمت: ساڑھے چار روپے

اس ناول میں سابق صوبۂ سرحد کے ایک مشہور "باغی اکبر خاں" کی مہم جو زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ باغی اکبر خاں کی ایک انگریز خاتون سے شادی اور پھر اس شخص کا فرنگیوں کے ہاتھوں دھوکہ سے قتل ہو، اس کے لڑکے مہر گل کا انتقام لینا، وغیرہ۔ بڑے ہوشربا حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ناول کے مطالعہ سے پٹھانوں کے رہن سہن، رسم و رواج معتقدات اور ان کی ثقافتی زندگی کی جھلکیاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ (ظ۔ق)

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں
تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم دو آونس چکنائی کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔
کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے ڈالڈا برانڈ وناسپتی گذشتہ ایک پشت سے اس ملک میں مشہور ہے۔ اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے۔ یہ ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہر بند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہوگئی ہے۔
ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے!
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی
ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمل غذا ہے!
HVM. 23—193 UD

بنگالی زبان کا مشہور ناول

عبداللہ

بنگلہ زبان کا یہ مشہور ناول اردو میں پہلی بار منتقل کیا گیا ہے۔ "عبداللہ" عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں۔

ناول کا پس منظر مشرقی پاکستان کا ہے، مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی ہی کہانی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں۔

۴۰۰ صفحات۔ کتاب مجلد ہے۔ سرورق دیدہ زیب

سادہ جلد والی کتاب کی قیمت: چار روپے

طلائی لوح سے مزین مجلد کتاب کی قیمت: ساڑھے چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

Regd. S. No. 1086

ماہ نو

جولائی ۱۹۵۹ء

۱۹۲۹ء ٹین کے ڈبّوں کے ذریعہ
۱۹۳۹ء پمپ کے ذریعہ
۱۹۵۹ء جدید طرز کے سروس اسٹیشن کے ذریعہ
BURMAH-SHELL SERVICE
برماشیل کے وسیع نظام اور سالہا سال کے تجربہ نیز شیل جیسے عالمی ادارہ سے وابستگی کی بدولت یہ سہولتیں بہ آسانی فراہم کی جا سکی ہیں۔
موٹروں میں ڈبوں کے ذریعے پٹرول ڈالنا مشکل اور دیر طلب کام تھا۔
ہاتھ سے چلائے جانے والے پمپ نے ڈبوں کی جگہ لے لی مگر کوئی اس دور کے پمپ چلانے والے کے دل سے پوچھے۔
ایسے سروس اسٹیشن قائم کئے گئے جن میں موٹروں کے لئے کشادہ راستوں کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ سروس کا انتظام کیا گیا۔
برماشیل ترقئ پاکستان کا حصہ ہے

یہ خوف و ہراس کیوں؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پایئے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد۔ نہ معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پیدا ہوتا ہے۔
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پالیتی ہے اور اسکے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھر چستی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
Saridon
اصلی سیریڈون صرف اصول صحت کے مطابق مُہر بند
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
J W T V D 226

SUNLIGHT
New
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT
یہ دیکھئے
نیا سنلائٹ صابن
ایک نئے جادو اثر جزو کے ساتھ
کپڑے پہلے سے بہت زیادہ سفید دھوتا ہے
نئے سنلائٹ میں ایک نیا جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے جو سفید کپڑوں کو پہلے
کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور رنگین کپڑوں کو اور بھی چمکدار بناتا ہے۔ آپ کے تمام کپڑے
نئے سنلائٹ صابن میں دھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے
نئے اور بہتر سنلائٹ کو ایک ہی اور خوبصورت پیکنگ میں خریدیے۔ آج
ہی اس کی ایک ٹکیہ لیکر گھر میں آزمائیے اور آپ ہمیشہ سنلائٹ کی نئی خوبیوں کو پسند کرینگے
نیا سنلائٹ صابن
بغیر کپڑوں کو
سفید اور اُجلے دھوتا ہے!

جولائی ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: سوات کا ایک منظر: رنگین عکس: محمد اسلم

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے • شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی • فی کاپی: آٹھ آنے

شاعرِ مشرق

(دو تقریریں: بہ سلسلۂ یوم پاکستان، لندن)

رش بروک ولیمز

سر مالکم ڈارلنگ

آج سر محمد اقبالؒ کا شہرہ غالباً اس سے زیادہ ہے جتنا کہ ان کی وفات کے وقت تھا۔ کئی شاعر، فلسفی بلکہ سیاست داں بھی اپنے انتقال کے بعد چند ہی سال کے عرصہ میں بالکل فراموش ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی شہرت پہلے سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ کوئی ذوق و شوق کی ہنگامی رَو نہ تھی جس کے تحت اُن کا ایک عظیم انسان کی حیثیت سے خیر مقدم کیا گیا۔ جو لوگ ان کا ایک شاعر، فلسفی یا سیاسی مبشر کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، ان کی تصانیف میں ایسے ارشاداتِ عالیہ اور حقائق و بصائر پاتے ہیں جن کی صداقت آج بھی اُسی طرح برقرار ہے جتنی کہ اس وقت جب وہ معرضِ اظہار میں آئی تھیں۔

میرے اقبال کے ساتھ روابط اِس آخری یعنی سیاسی مبشر ہی کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ میرا مطلب وہ کردار ہے جو انہوں نے ایک سیاسی مبشر کی حیثیت سے انجام دیا تھا۔ مجھے لاہور میں کئی بار اُن کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آج کی محفل میں سر مالکم ڈارلنگ بھی شامل ہیں جن کے اُس زمانہ میں اقبال کے ساتھ روابط مجھ سے کہیں زیادہ قریبی تھے۔

سر محمد اقبالؒ کے ساتھ میرے تعلقات حقیقی معنوں میں تین گول میز کانفرنسوں کے دوران پیدا ہوئے تھے اور انہی کانفرنسوں کے دوران ہی مجھے اُن کے سیاسی افکار کی وسعت اور گہرائی کو کما حقہٗ سمجھنے کا موقع ملا۔

اِس زمانے پر ایک نظر بازگشت ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ ہم میں سے اکثر جو اُس وقت ایک متحدہ ہندوستان کا وفاقیہ قائم کرنے کی اُمید میں سرگرم کار تھے، سر اقبال کی حکیمانہ بصیرت کو کم اہمیت دینے کی طرف مائل تھے۔ بلکہ میں تو اس سلسلہ میں قائداعظم کو بھی کلی طور پر مستثنیٰ نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں کئی ایسی صحبتوں میں شریک تھا جن میں سر اقبالؒ ہمیشہ یہی اصرار کرتے تھے کہ ہندوستان کی مسلم آبادی کی کسی بھی مجوزہ وفاقیہ میں مکمل شرکت کی متقدم شرط ایک ہی ہے: ان کا فرقہ وارانہ انتخابات سے مسلسل تحفظ۔ اُس وقت قائداعظم بھی اس بارہ میں متیقن نہ تھے اور میں بھی جو ہندوستانی ریاستوں کے مندوب اور نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، یہی خیال کرتا تھا کہ سر اقبالؒ جو کچھ کہتے ہیں خواہ وہ ماضی میں کتنا ہی اہم کیوں نہ رہا ہو، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں غالباً بالکل بے محل ہو چکا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ کس قدر صحیح تھے اور ہم کس قدر غلط! کیونکہ جونہی ۱۹۳۷ء میں وفاقیہ کے پہلے مرحلہ کی شروعات ہوئیں، وہ تمام اندیشے جن کی توضیح اقبال نے ہندوستان کی مسلم اکثریت کے زاویۂ نگاہ سے اس قدر سنجیدگی اور پیغمبرانہ پیش بینی و بصیرت کے ساتھ کی تھی، وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں اقبال بہت علیل ہو چکے تھے، پھر بھی جو اثر انہوں نے قائداعظم پر ۳۸۔۱۹۳۷ء کے نازک، بحرانی سالوں میں ڈالا وہ ہمیشہ اُن پر شدت سے حاوی رہا اور مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے قائداعظم کو یہ تحریک دلائی کہ وہ مسلم لیگ کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس کی طاقت کی بنیاد ہندوستان کے اعلیٰ طبقے یعنی خواص کی بجائے عوام پر ہو۔ یہ تبدیلی سر اقبال کے اُس سیاسی فلسفہ سے جس کا پرچار وہ برسوں سے کر رہے تھے، محض ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ پوری طرح ہم آہنگ تھی۔

میرے خیال میں اِن واقعات کی طرف دوبارہ رجوع کرنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے آئندہ اسلامی مملکت کا جو پیغمبرانہ رویا یا تصور سب سے پہلے مسلم لیگ کے الہ آباد سشن منعقدہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا، وہ کیا تھا۔ اُس وقت مسلمانوں کا کل ہند میں اسلامی ہند کا مطالبہ چنداں واضح نہ تھا، لیکن اس معرکہ آرا تقریر میں سر اقبالؒ نے اس علاقہ کی ہیئت ترکیبی بیان کی جو اب مغربی پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی اس تصور کو مسلم عوام کے دل و دماغ میں بسا دینے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہ تصور پیدا ہو چکا تھا۔

تاہم یہ سر اقبالؒ کی عظمت کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے جغرافیائی حدود کی توضیح ہی پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھا۔ انہوں نے اُن خصوصیات کی توضیح بھی کی جن کا اس مملکت کو حامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ فرد اور اس جماعت میں جس سے وہ وابستہ ہے، وہ تعاون و تعامل پیدا کرسکے جو اقبال جانتے تھے ان دونوں کی انتہائی نشوونما کے لازم ہے۔ آئیے میں آپ کو اُن آٹھ بنیادی امور کی یاد دلاؤں جو اُنہوں نے ایسے معاشرہ کے لئے لازم قرار دیئے ہیں۔

ان میں سب سے اولیٰ تھی توحید جس کو وہ بنی نوع انسان کی اخوت کے لئے لازمی خیال کرتے تھے۔ دوسرے، پُرخلوص اور والہانہ قیادت۔ تیسرے، ایک ایسا ضابطۂ اخلاق جو معاشرہ کے آدرشوں اور فضاؤں کا آئینہ دار ہو۔ چوتھے، اُس مملکت کا ایک معین جغرافی محل وقوع ہونا چاہیئے۔ اُن تمام سرگرمیوں اور وفاداریوں کا علاقائی مستقر اور مرکز و محور جن کو یہ مملکت وجود میں لائے۔ پانچویں، اس مملکت کا ایک نصب العین ہو یعنی ایک ایسا مقصود جس کی تحصیل کے مملکت اور اس کے شہری پابند ہوں۔ چھٹے، یہ ذرائع فطرت پر قادر ہو جس کے معنی اقبال کے تصور میں یہ تھے کہ اہلِ مغرب کے مشینی و سائنسی کمالات سے استفادہ کیا جائے مگر اس طرح نہیں کہ ان سے مغربی روح کی پیروی لازم آئے کیونکہ انہیں اس سے کئی امور میں اختلاف تھا۔ ساتویں، اس مملکت کو ایک مرکب اجتماعی خودی پیدا کرنی چاہیئے جو بیک وقت اس کے آزاد شہریوں کی ذاتی خودی کی توسیع بھی ہو اور تکمیل بھی۔ آٹھویں اور آخری بات یہ ہے کہ یہ ریاست خواتین کی نشوونما کے لئے مکمل گنجائش پیدا کرے خواہ وہ بالقوۃ ہو یا بالفعل۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہوں گا کہ ان آٹھ خصوصیات کی اہمیت پاکستان کی تاریخ سے بخوبی نمایاں ہے۔ ان کا جب بھی التزام کیا گیا ہے، ملک ان مقاماتِ عروج پر پہنچا اور قائم رہا ہے جن کا تصور اقبال اور قائدِ اعظم نے کیا تھا۔ اور جب ان کو نظر انداز کیا گیا ملک میں تنزل رونما ہوا۔ آج پاکستان میں، جیسا کہ مجھے اور میری اہلیہ کو چند ہفتہ ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنے کا عزم بالجزم نظر آتا ہے۔ تاکہ یہ پاکستان کو وہی مثالی چیز بنانے کی طرف پیش قدمی ہو جو قائدِ اعظمؒ اور اقبالؒ کے تصور میں تھی۔ چنانچہ ہم ان اصولوں کا مظاہرہ ان گوناگوں اقدامات میں پاتے ہیں جن کے ذوق و شوق سے پاکستان کی نئی حکومت سرشار ہے۔

ان اصولوں میں جو بات سیاحانِ مغرب کے تخیل کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رواداری ہے یعنی یہ عقیدہ کہ پاکستان میں دنیائے مغرب کے ساتھ بھائی چارہ اور دوستی کا پورا پورا امکان ہے۔ جب ہم پاکستان کی تاریخ پر اُس وقت سے نظر ڈالتے ہیں جب کہ یہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا، تو بعض ادوار سے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اخوت و رواداری کی جگہ یہاں اندھیر گردی کا دور دورہ نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بھی دیگر اُمور کی طرح اقبال ہی کا ارشاد آخری اور قطعی ہے ؎

بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت! | نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول!
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت! | ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا

ان اشعار اور ایسے ہی کئی اور اشعار میں جو اقبال نے کہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عظیم انسان نے پاکستانی معاشرہ کی ہمیشہ کے لئے نہج اور طرح مقرر کردی ہے۔

آج جب ہم اس کی برسی منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر ہم دنیا پر گہری نظر ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کی زندگی سے بھی کہیں زیادہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے تمام ممالک کو اس سیاسی فلسفہ کی ضرورت ہے جس کا اس نے اپنے حینِ حیات میں پرچار کیا تھا۔

●

میں آپ کی انجمن کا بہت شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک ایسے شخص کو اپنا ناچیز خراجِ عقیدت پیش کرنے کی دعوت دی ہے جس کی دوستی میری اہلیہ اور میرے لئے برسوں سامانِ مسرت رہی اور جس کی شخصی جاذبیت میری چھوٹی سی بچی نے بھی محسوس کی جو پانچ چھ سال کی عمر میں اس کے گھٹنوں پر بیٹھا کرتی تھی اور اب بھی اس خوشی اور مسحور کن کیف کی یاد تازہ کرکے مسرور ہوتی ہے جو وہ ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی۔

اس وقت میری طرف سے اقبالؒ پر بہ حیثیت فلسفی یا شاعر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان دونوں حیثیتوں سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا اور ان حیثیات سے سر محمد اقبالؒ کو کئی اہل الرائے بہت ہی عمدہ خراجِ تحسین ادا کرچکے ہیں۔ اس موقع پر

میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شخص کا بحیثیت انسان تھوڑا بہت نقشہ آپ کے سامنے لاؤں جس کی دوستی کا مجھے ستائیس سال شرف حاصل رہا اور میں نے کئی ملاقاتوں میں اس کے متعلق نقوشِ تاثر فراہم کئے تھے۔ یہ ادھورا سا نقشہ بھی میں شاید اس خط کی بنا پر پیش کرسکوں گا جو مجھے اپنے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط میں نے اگست ۳۴ء میں اپنی بیٹی کو لکھا تھا جس کا میں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے۔

میں ہندوستان کافی طویل عرصے کے بعد واپس آیا تھا۔ لاہور اور وہ بھی اگست یعنی گرمیوں کے مہینے میں جس دن میں یہاں پہنچا۔ اور وہ اتوار کا دن تھا، میں نے آتے ہی ڈاکٹر اقبالؒ کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ اسی کے متعلق میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

"یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ لاہور میں ہیں یا نہیں، میں نے انہیں ایک رقعہ لکھا کہ وہ آج میرے ہاں تشریف لاکر چائے نوش فرمائیں۔ جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو میں یہ سمجھا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں بلکہ سچ پوچھو تو میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ آج سہ پہر میں اپنے آدھی آستین کی قمیض پہنے ہوئے اسٹینو گرافر کو خط لکھوا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اقبالؒ برآمدے میں تشریف لے آئے۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ وہ مجھے بیحد پسند ہیں۔ وہ ساڑھے چار بجے آئے۔ اور ساڑھے سات بجے تک میرے پاس رہے۔ میں نہیں کیا بتاؤں کہ ہماری گفتگو کس قدر دلچسپ رہی۔ مشرق سے لے کر مغرب، سیاسیات سے لیکر تصوف اور ران ٹیگو سے لے کر مسولینی سب کو محیط تھی"

اس خط میں دو واقعات کا ذکر ہے جن سے وہ ۱۹۳۱ء کے دورۂ یورپ میں دوچار ہوئے تھے۔ ایک اقبال کے قرطبہ جانے سے متعلق ذکر ہے، جیساکہ میرے دوست آغا محمد اشرف نے ابھی بتایا ہے۔ میں پھر اسی خط سے کچھ سطور پیش کروں گا جن میں اقبالؒ کے بیان کا معاصرانہ تذکرہ ہے۔ یہ خط میں نے اسی تمام تحریر کیا تھا جبکہ اقبالؒ نے میرے ساتھ وہ بہت پر لطف گفتگو کی تھی۔ اس خط میں لکھا ہے:۔

"اقبالؒ نے مجھے اپنے قیام ہسپانیہ کی بہت ہی دلچسپ داستان سنائی۔ وہ قرطبہ کی قدیم مسجد کو تشریف لے گئے جو اب کلیسا بن چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ وہاں نماز ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ جگہ کبھی ایک مسجد تھی۔ گائیڈ نے کہا پادریوں کو یہ بات ناگوار ہوگی۔ اقبالؒ اس مقام پر مصلّی بچھا کر بیٹھ گئے جس کو بے حد مقدس سمجھا جاتا تھا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو جھٹ ایک پادری نے پہنچ کر زور و شور سے احتجاج کیا۔ مگر اقبالؒ نے بڑی مضبوطی ایمان کا ثبوت دیا اور پادری کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسے بتاؤ کہ ایک دفعہ مکہ میں عیسائیوں کا ایک وفد کوئی التماس لے کر پیغمبرِ اسلام کے پاس مکہ آیا تھا۔ اس کے اراکین کو آنحضرت صلعم کی اپنی مسجد یعنی مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا اور جب اُن کی عبادت کا وقت آیا تو وہ متردد تھے کہ انہیں اس کی اجازت دی جائیگی یا نہیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم نے کہا کہ وہ یقیناً اپنے طور طریق کے مطابق مسجد میں عبادت کرسکتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا اگر عیسائیوں کو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی ہی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی تو انہیں ایک ایسی جگہ اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت کیوں نہیں جو کبھی آخر ایک مسجد ہی تھی! جب وہ یہ باتیں کہہ چکے تو کلیسا کے سارے پادری ان کو دیکھنے آنکلے اور ایک نے ان کا فوٹو بھی لے لیا۔ اقبالؒ نے ایک گونہ تسلی کے ساتھ کہا کہ غالباً وہ واحد مسلمان ہیں جنہوں نے گذشتہ چار سو سال میں اس مسجد میں نماز ادا کی ہے"

اس واقعہ سے اقبالؒ کی استواریٔ ایمان ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا واقعہ مسولینی کے ساتھ ایک نہایت ہی دلچسپ ملاقات پر مشتمل ہے۔ جو ۲۰ منٹ جاری رہی اور اقبالؒ نے اس کی کیفیت کچھ ایسے دل پر نقش ہو جانے والے پیرایہ میں پیش کی کہ یہ مجھے اب تک یاد ہے۔ بلکہ یوں کہئے نقش کالحجر ہے۔ اسلئے میں نے اپنے خط میں اس پر کافی وقت صرف کیا۔ میں نے لکھا:

"مسولینی نے ان سے پلیزیو ڈی وینشیا کے ایک عظیم الشان ہال میں ملاقات کی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے کشادہ ہال کے دوسرے کنارے پر عظمت ڈھونڈتے مسولینی کو ایک اونچی شہ نشین پر بظاہر کام میں منہمک پایا، اس قدر کہ اسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اس کی طرف کون آرہا ہے۔ جب سر محمد اقبالؒ اس شہ نشین کے پاس پہنچ گئے تب کہیں مسولینی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کی طرف بڑے کریمانہ اور بندہ نوازی کے انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابتدائی آداب و مراسم کے بعد مسولینی نے کہا "سنا ہے آپ ایک ہفتہ سے اٹلی میں ہیں۔ کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟" یہ ایک بڑا خطرناک سوال تھا جس کا بے تکلف جواب کسی ابتدائی حکمتِ عملی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ سر اقبالؒ استعداد نکتہ رس تھے کہ وہ سوال کے اس پہلو کو فوراً سمجھ گئے۔ اسلئے انہوں نے کہا "جناب والا! میرے تاثرات آپ کے لئے کیا معنی رکھ سکتے ہیں جب کہ مجھے جناب کے ارشاد کے مطابق یہاں آئے صرف ایک ہفتہ گذرا ہے۔" مگر مسولینی نے کہا میں یہ تاثرات جاننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس نے

اصرار کیا اور آخر اقبالؒ نے اپنے آپ کو کافی مضبوط بنیاد پر محسوس کرتے ہوئے کہا "جناب والا! اگر آپ میرے تاثرات جاننا ہی چاہتے ہیں تو کیا میں سب کچھ صاف صاف کہہ دوں؟ اس کے جواب میں مسولینی لازماً 'ہاں' ہی کہہ سکتا تھا۔ تب اقبالؒ نے کہا "میں اطالویوں کے متعلق یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں"۔ اس پر مسولینی ذرا چونکا۔ "وہ بڑے ذہین و فطین، خوب رو، فن پرست ہیں، اور اُن کے پیچھے تہذیب و تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں۔ مگر —" اقبالؒ نے کہا۔ "ان میں کوئی خون نہیں!" اس پر مسولینی کچھ اور چونک کر سراپا توجہ بن گیا — "کوئی خون نہیں؟ کیا مطلب؟" تب مجھے خوب یاد ہے کہ اقبالؒ نے کس طرح اپنا بازو کھول کر دکھایا اور کہا "ان میں یہ سرخ چیز نہیں ہے جس کو خون کہتے ہیں، لیکن پھر اقبالؒ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ایرانیوں کو ایک فائدہ ہے جو اطالویوں کو حاصل نہیں — اُن کے ارد گرد مضبوط، توانا قومیں — افغان کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے ہیں مگر آپ، اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔ اسلئے آپ کمزور ہی رہیں گے۔" "اچھا" مسولینی نے کہا "پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہئے؟" اقبالؒ نے جواب دیا" اور اس وضع کا جواب میرے خیال میں اسی سے مخصوص ہے کہ "یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو۔ یورپ کا اخلاق، افسوس ہے، ٹھیک نہیں لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔" بعد میں مسولینی نے اقبالؒ کو خط لکھا اور پوچھا کہ اطالیہ میں بسنے والے مسلمانوں یعنی مسلمان رعایا کی خوشنودی کے لئے ان کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟ اقبالؒ نے دو تجویزیں پیش کیں، ایک یہ کہ روم میں ایک مسجد بنائی جائے کیونکہ اقبال نے یہاں تین سو ایرانی آباد دیکھے — دوسرے، عربی، علاء کی ایک کانفرنس سسلی میں منعقد کی جائے جس کو وہ ایک عرب شہر قرار دیتے تھے"۔

"مسولینی کے متعلق انہوں نے ایک بہت دلچسپ بات بیان کی۔ اور وہ یہ کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں — ان میں کچھ ایسی بات تھی جن سے اقبالؒ بہت مرعوب ہوئے۔ مگر یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ جب وہ قصر وینس سے باہر نکلے تو انہوں نے خود کو نصف درجن صحافیوں سے دوچار پایا۔ جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ عظیم فلسفیٔ ہندوستان — میں ہندوستان پرانی اصطلاح کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ ان کے عظیم ڈوچے کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ اور یہاں پھر اقبالؒ نے ان کو ہاتھ پٹھے پر نہ رکھنے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا اس بارہ میں اُن سے کچھ کہنا خلاف مصلحت ہے کیونکہ پوپ اس کو ناپسند کریں گے"۔

"یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب گاندھی جی اور ان کی تحریک 'ستیہ گرہ' کا بہت چرچا تھا۔ اس پر ایک صحافی نے کہا 'اگر آپ نہیں بتائیں گے تو ہم ستیہ گرہ کر کے آپ کو مجبور کریں گے'۔ تب اقبال نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ کا ڈوچے ایک لوتھر ہے مگر بے انجیل"۔

"اگر تم اس اس پر غور کرو تو یہ بہت گہری بات تھی کیونکہ لوتھر اپنی انجیل کے بغیر کیا ہوتا"؟

یہ دونوں واقعے میں نے خیال کیا آپ کو بتانے کے لائق ہیں۔ کیونکہ یہ اس انسان کی بھی یاد دلاتے ہیں اور اس فلسفی و شاعر کی بھی جس کے متعلق ہم نے آج کی سہ پہر اس قدر پُر لطف باتیں سُنی ہیں۔

آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ جب اقبالؒ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو وہ کیسے لگتے تھے۔ میں نے اس کے بارہ میں اپنی بیٹی کو یوں لکھا تھا:

"ڈاکٹر اقبالؒ درمیانے قد کے ہیں۔ عمر میں مجھ سے کچھ سال بڑے — شاید سات سال — چہرہ خوب باآب و رنگ، تیکھے تیکھے گنجان بال، اور چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھیں ہم روحانی دنیا کے متعلق بہت کچھ باتیں کرتے رہے جس پر ان کو پختہ یقین ہے"۔

یہ باتیں اگست ۱۹۳۴ء میں اقبال کی وفات سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئیں، اور اس صحبت میں موت ہی کے متعلق زیادہ گفتگو رہی۔ یہ حصہ میں آپ کو پڑھ کر سنانا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن اس میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ایک بڑی حیرت انگیز بات کہی اور وہ یہ کہ "موت میں ایک زبردست قوت مضمر ہے کسی شخص کی وفات، کسی زندگی کا خاتمہ، سینکڑوں زندگیوں کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن کیا موت خود حیات نہیں"؟ آج میرے خیال میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو اقبالؒ کو فوت ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، پھر بھی وہ ہمارے دلوں اور روحوں میں برابر زندہ ہیں اور میں یہ کہوں گا کہ خصوصاً وہ میرے دل میں ضرور زندہ رہے ہیں جو ستائیس سال ان کے قریب رہا اور تمام عرصہ ان سے برابر محبت کرتا رہا۔

★

بنگلہ تنقید

ڈاکٹر سجاد حسین

مترجمہ: محمد نہال وارث خاں

اُردو ہو یا بنگلہ یا ہماری کوئی اور زبان، ان سب کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہے ادب و فن اور تنقید کا ایک اعلیٰ تصور جو اربابِ قلم کو ایک بلند سطح تک پہنچنے میں مدد دے۔ یہ صریحاً عالمگیر ذہنی و ادبی رجحانات کا اثر قبول کرنے اور روایتی اثرات سے آزاد ہونے کی پُر زور جدوجہد ہی پر موقوف ہے۔ امید ہے زیرِ نظر مقالہ اس لحاظ سے خیال افروز ثابت ہوگا۔ (مدیر)

۴۷ء سے آج تک بنگلہ میں جو تنقیدیں لکھی گئی ہیں اُن کا مطالعہ کیا جائے تو اولیں احساس یہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے جن کی صلاحیتیں تنقید کے لئے خصوصی طور پر وقف ہوں اور جنہیں اس اعتبار سے پیشہ ور نقاد کہا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد ایسے لوگ ہیں جو تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو ادب اور ادبی مسائل کی باقاعدہ وضاحت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ مثلاً لسنگ، آئی۔ اے۔ رچرڈز یا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، بے شک ہمارے ہاں چند حضرات ایسے ہیں جو کبھی کبھار تنقیدیں لکھتے ہیں لیکن انہیں "پیشہ ور" نقاد نہیں کہا جاسکتا۔ ضروری نہیں کہ اس قسم کا نقاد دوسرے نقادوں کے مقابلے میں ادب کا بہتر ناقد ہو لیکن کسی معاشرے میں پیشہ ور نقادوں کی موجودگی اس بات کی علامت ضرور ہے کہ اس میں تنقید نے ایک مخصوص سرگرمی کی حیثیت سے باعزت مقام حاصل کر لیا ہے اور وہ ایک خاص معیار پر قائم ہے۔

ایک ادبی گروہ کی حیثیت سے باقاعدہ نقادوں کی عدم موجودگی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی تنقیدوں میں شاید ہی کوئی فرق کرسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم ہر اس شخص کو نقادوں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں جس نے کبھی ادبی، سماجی، سیاسی یا تاریخی مسائل پر کچھ لکھا ہو۔ بعض کو اصرار ہے کہ اسمٰعیل حسین شیرازی اور واجد علی کو نقاد کہا جائے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں ادبی نقاد نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بنگلہ نثر کی تاریخ میں دونوں حضرات ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اس قسم کی کڑی تقسیم میں کچھ خلا رہ جائیں مثلاً اس قسم کی سخت حد بندی سے ہماری زبان میں تاریخی اور فلسفیانہ تحریریں بالکل نظر نہ آئیں لیکن ہم جب تک ادبی تنقید اور تنقیدی نثر کی دوسری قسموں میں واضح فرق قبول نہیں کرتے۔ اس وقت تک ہمیں اپنی ادبی تنقید کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح شعور نہیں ہوسکتا۔

میرے خیال میں ادبی تنقید کی حدود کے اندر ایک اور حد بندی کی بھی شدید ضرورت ہے جو مشرقی پاکستان میں بالکل مفقود ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تبحرِ علمی اور تنقید میں فرق کریں۔ اور اس بات کو واضح طور پر جان لیں کہ ان دونوں کے امتیازی فرائض کیا ہیں۔ اچھی تنقید نگاری عمدہ علمیت سے مواد اور زندگی حاصل کرتی ہے۔ ایک اچھے نقاد کا صحیح اور دیانت دار عالم ہونا ضروری ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ اعتراف بھی ضروری ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم مشرقی پاکستان والے غلطی کرتے نظر آتے ہیں، کہ تبحرِ علمی اور تنقید دونوں ایک چیز نہیں۔ عالم وہ ہے جو مبہم متن کی توضیح، الفاظ و محاورات کی تحقیق اور عبارت کی غلطیوں کو درست کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نقاد نہیں

ہوتا۔ مثال کے طور پر مغرب میں اسکیٹ، پولارڈ، گریگ اور ای کے چیمبرز وغیرہ کو لیجئے جو بنیادی طور پر عالم تصور کئے جاتے ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات بے حد قابل قدر ہیں۔ اسکیٹ اور پولارڈ، چوسر کی تصانیف کے زبردست عالم ہیں اور گریگ اور ای کے چیمبرز، شیکسپیر کے عالموں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید تنقید نگاری ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتی لیکن جب ہم انگریزی تنقید نگاری کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمارے سامنے کولرج، بریڈلے، مارک وان ڈورن یا میتھیسن کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ادبی مسائل، خصوصاً تشریح و تحلیل کے مسائل سے ہے نہ کہ متن کی صحت کی تحقیق و تعین سے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں تنقید نگاری اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس بنیادی فرق کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ مثال کے طور پر یہ بات ڈاکٹر شہید اللہ اور منشی عبدالکریم کے لئے یقیناً باعثِ شرف ہے کہ ان کو عالم اور کتابوں کے شیدائی تسلیم کیا جائے جس میں وہ یقیناً نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح پروفیسر منصور الدین جیسے شخص کو بھی، جن کی خدمات بنگلہ لوک گیتوں کے سلسلہ میں مشہور ہیں، عالموں میں شمار کرنا چاہیئے۔

ہم ادبی مورخوں اور سوانح نگاروں کو بھی نقاد تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر ادب کی تاریخ اور سوانحمری لکھنے والے واقعی نقاد ہوتے تو انگریزی اور امریکی ادب کی ایسی تاریخیں جو طلباء کے کام آتی ہیں ان کے مصنف بھی بڑے نقاد ہونے کا دعویٰ کرتے۔ کومپٹن ریکٹ جو ایک مشہور انگریزی کتاب کے مصنف ہیں یا ہڈسن جنہوں نے انگریزی ادب کے مطالعہ کے بارہ میں کتاب لکھی ہے۔ ان دونوں کو نقاد کی حیثیت سے پرکھ کر دیکھئے۔ جس معیار کے مطابق کومپٹن اور ہڈسن کو نقاد تسلیم نہیں کیا جا سکتا اس میں اور ہمارے معیار میں اس قدر واضح فرق ہے کہ اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

رہا ان تنقیدوں کا معیار جو ۴۷ء سے لیکر اب تک لکھی گئی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر نقادوں کی سب سے بڑی دشواری بنگلہ میں ایسی معیاری تصانیف کا فقدان ہے جن کی روشنی میں موجودہ تحریروں کی قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔

جدید بنگلہ ادب کی بیشتر اصناف مغرب سے مستعار ہیں مثلاً ڈراما، ناول، مختصر افسانے اور شاعری میں بیلڈ، سانیٹ اور بلینک ورس وغیرہ۔ یہ سب کی سب ان لوگوں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں جو مغربی نمونوں سے متاثر ہوئے۔ اگر کوئی جدید نقاد ان اصناف کی قدر و قیمت متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کا علمی پس منظر وہی ہونا چاہیئے جو ان اصناف کو برتنے والے شعرا کا ہے۔ کسی شخص کا ملٹن سے پوری واقفیت کے بغیر بنگلہ نظم معرا پر بحث کرنا یا ہومر اور ملٹن کی شاعری پر عبور حاصل کئے بغیر کیقباد اور میکائل دت کے بیلڈوں پر تنقید کرنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مولیر، شیکسپیر، فیلڈنگ یا فلوبیر کو پڑھے بغیر بنگلہ ڈراموں یا ناولوں پر تنقید ناممکن ہے۔ ٹیگور اور سرت چٹرجی سے بنکم چندر چٹرجی کا موازنہ ہمیں ادب کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

بعض لوگ سنسکرت کی تنقیدِ شعر کو ارسطو کی بوطیقا کا مشرقی نعم البدل سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ مغربی نمونوں کے بغیر مشرقی ادب پر بحث کی جا سکتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ مذکورہ تنقیدِ شعر کی خوبیوں سے انکار نہیں لیکن اس سے نئی اصناف کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی جو مغرب کی پیداوار ہیں اور جنہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں بنگلہ ادب نے اپنایا ہے۔

معیاری تصانیف کی عدم موجودگی سے قطع نظر بنگلہ میں فن تنقید نگاری کے ترقی نہ کرنے کی ایک معاشی وجہ بھی ہے۔ جب کوئی نقاد کسی ادیب پر تنقید کرتا ہے تو اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ہمعصر ادیب کے ذریعۂ معاش کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چونکہ کسی کتاب پر تنقیدی اعتراضات اس کے مصنف کی ادبی حیثیت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں، اس لئے یہ شبہ بے جا بھی نہیں۔ ہمارے ہاں تنقید شخصی تنقید تصور کی جاتی ہے، اسے نقاد کی بدنیتی پر محمول کیا جاتا ہے اور ناقد کو جائز تحقیق کے باب میں اقدار متعین کرنے والے کی بجائے ذاتی دشمن سمجھ لیا جاتا ہے (جیسا کہ کم و بیش دنیا میں ہر کہیں ہوتا ہے) بدقسمتی سے ابھی تک یہ تصور پیدا نہیں ہو سکا کہ بے تعلقی یا غیر جانبداری کے ساتھ ایک دوست کی ادبی کاوشوں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ہماری تنقیدی تحریروں میں جو ذاتی تلخی پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اسی بنا پر عموماً

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

لالۂ کہسار

خوشحال خاں خٹک
مترجمہ: شہاب رفعت

پیشِ نظر ہیں کتنے جہاں — تو ہی نہ دیکھے اے ناداں
کئی زمینیں ایسی ہی — اور فلک بھی بے پایاں
تیرے دل میں سبھی سمائے — عرش سے برتر، اے انساں!
دل کا آئینہ صیقل کر — دیکھ لے تا وہ جانِ جہاں
دیکھ لے گر یہ نظارہ — تجھ سے جدا ہو کب یزداں

★

قاز بھی ہے پردار اور باز — اور نگران کی پرواز
جیسا قد ویسی پوشاک — جیسی صورت ویسا ناز
چادرِ عقل کی کاڑھی ہوئی — اور نہ سونے کی پیشواز
کشتی اتھلے جل میں چلے — گہرے دریاؤں میں جہاز
موش ہو کتنا ہی تیراک — کب ہو مگرمچھ کا انباز
جنگلی بلے میں یہ تاب — چیتے پر ہو دست دراز

★

کیسی دل کش ہے یہ بہار — اور اس پر یہ بانگ ہزار
اسپ عراقی، برق خرام — ران تلے چنچل رہوار
ہاتھوں پر وہ باز ہی باز — ہر سو بے اندازہ شکار
سب سے بانکا باز آگے — اور عقب میں باز ہزار
کتنے شکاری ڈور بندھے — کھلتے ہی جالیں جو شکار
ہر صورت تسکینِ تمام — دل میں صرف خیالِ یار
ایسے شغل پر اے خوشحال — فرصتِ صبح و شام نثار

زیرِ نقاب وہ جانِ جہاں — عاشق سے ہے ناز کناں
بال جنہیں کاڑھا ہے ابھی — شانوں پر ہیں آویزاں
جب وہ آنگن میں آئے — ہائے پھر آنگن کا سماں
جانِ عاشق کے درپے — اور غیروں سے خندہ زناں
ڈھنگ ستم کا ڈھونڈ لیا — گھونگٹ کاڑھ کے میں قرباں
اے خوشحال رہے یہ فن — ایسی غزل، ایسے عنواں

★

جب تک مرد ہو بے کردار — کیا اس کی خالی گفتار
گالیاں سن کر جو چپ ہو — ننگِ صفِ مردانِ کار
وہ ہے جری جو بدلہ لے — بدلہ ہے مردوں کا شعار
بس وہ کرم ہے حسنِ کرم — جس کے سبب ہو ننگ نہ عار
مرد ہی کیا ہے جس کو نہ ہو — کوئی بھی پاس عزّ و وقار
مہرہ بھی ہیں زہر بھی ہیں — ایسے لوگ ہیں صورتِ مار
برق و باراں سرتاپا — اُن مردوں پر جان نثار
اپنے کمال میں آپ لگن — نے زر چاہیں نے دینار
مرد کو ہے فکرِ ناموس — عزت کا بس اک معیار
نامردوں کو فخرِ نسب — مرد ورائے بند و حصار
یہ باتیں خوشحال کی دیکھ
لعل و گوہر تار بتار!

★

"اگر اعتبار ہوتا"

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

آغا ناصر

کردار :-

* درشہوار
* عدنان ملک
* سکینہ ـــــــ درشہوار کی خادمہ
* چمن ـــــــ عدنان ملک کا خادم

وقت : موجودہ

مقام : ایک پارک

*

(منظر: کسی شہر کے ایک پرانے پارک کا ایک حصہ ـــ داہنی طرف ایک پتھر کی بنچ خالی پڑی ہے ـــ موسم سرما کی چمکیلی خوشگوار صبح ـــ درشہوار پارک کے بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہے لیکن ابھی تک حسین نظر آتی ہے۔ اس کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہیں، ضعیفی کے باوجود اس کی آنکھوں میں چمک اور اس کے چہرے پر شادابی کا رنگ نمایاں ہے ـــ وہ اپنی نوجوان خادمہ سکینہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ باغ میں داخل ہوتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے جسے وہ سہارے کے طور پر استعمال کرتی ہے)۔

درشہوار: (پھولے ہوئے سانس کے ساتھ) ہا۔ ہا۔ ہم ٹھیک وقت پر آگئے مجھے ڈر تھا کہیں ہماری بنچ گھر نہ گئی ہو۔ کس قدر حسین صبح ہے آج کی۔

سکینہ: دھوپ کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔

درشہوار: ہاں خصوصاً تمہاری جیسی نوجوان کے لئے (بنچ پر بیٹھ جاتی ہے) آج میں روزانہ سے زیادہ تھک گئی ہوں (سکینہ کی طرف دیکھ کر) اوہ ۔ تم جانا چاہتی ہو۔

سکینہ: جی ۔ نہیں تو مالکن ۔ میں تو ـــ وہ ......

درشہوار: گھبراؤ نہیں میں جانتی ہوں تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں۔ جاؤ تم پارک کے اس حصہ میں ہو آؤ جہاں آیائیں بچوں کو لیکر آتی ہیں لیکن دیکھو زیادہ دیر نہ کرنا۔

سکینہ: (خوش ہوکر) بہت اچھا مالکن۔

(سکینہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن درشہوار اسے روک لیتی ہے)

درشہوار: ٹھیرو ـــ ۔

سکینہ: (مڑ کر) جی مالکن؟

درشہوار: تم وہ دانے بھی ساتھ ہی لئے جا رہی ہو جو میں چڑیوں کو چگانے کے لئے لائی تھی۔

سکینہ: اوہ ۔ معاف کیجئے گا۔ میں بالکل بھول گئی تھی۔

(سکینہ کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی درشہوار کو دیکر چلی جاتی ہے)

درشہوار: (تھیلی کھولتے ہوئے) بس اب آپ ہی آپ سب آجائیں گی۔

(وہ تھیلی سے مٹھی بھر کر دال کے دانے نکالتی ہے اور زمین پر بکھیرنے لگتی ہے۔ قسم قسم کی چڑیاں، جن میں طوطے۔ کبوتر اور چھوٹی چڑیاں شامل ہیں۔ چاروں طرف کے درختوں سے اتر کر نیچے آجاتی ہیں اور دانے چگنے لگتی ہیں)۔

درشہوار: یہ مجھے پہچاننے لگی ہیں۔ (وہ بار بار تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مٹھیاں بھر کر دانے نکالتی ہے اور بکھیرتی ہے) یہ طوطوں کے لئے ہے۔ اور یہ بڑے بڑے پرندوں کے لئے ہیں اور یہ چھوٹی معصوم چڑیوں کے لئے ـــ اور یہ ـــ ارے! یہ چڑیا کتنی پیاری ہے۔ بالکل ڈرتی نہیں ـــ آ ۔ میری ہتھیلی پر بیٹھ کر کھالے۔ آ ۔ آ ـــ ارے رے رے ۔ تم دونوں جھگڑنے کیوں لگے۔

دانے بہت ہیں۔ کل میں اور زیادہ لاؤں گی۔ لے لے لے۔
آ۔ ہا۔ ہا ہا۔

(پارک کے دائیں جانب والے دروازے سے عدنان ملک اپنے نوکر چمن کے کاندھے کا سہارا لیے داخل ہوتا ہے۔ وہ ستر سال سے زیادہ عمر کا آدمی ہے۔ اور اپنی ایک ٹانگ گھسیٹ کر چلتا ہے۔ چہرے سے بدمزاج قسم کا بڈھا معلوم ہوتا ہے۔)

عدنان ملک: (بڑبڑاتے ہوئے) خوامخواہ۔ بالکل فضول۔ وقت کی بربادی ہے اور کیا۔ وہ قصے کہانیاں سنا کر ایک دوسرے کا وقت خراب کر رہے ہیں۔

چمن: لیکن آپ یہاں بیٹھ سکتے ہیں مالک (درشہوار والی بنچ کی طرف اشارہ کرکے) وہاں اس بنچ پر صرف ایک بڑی بی بیٹھی ہیں اکیلی۔
(درشہوار اپنی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھتی ہے اور ان کی گفتگو سننے لگتی ہے)۔

عدنان: نہیں نہیں چمن — میں اپنے لئے ایک تنہا بنچ چاہتا ہوں۔
چمن: مگر تنہا بنچ تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے مالک۔
عدنان: لیکن وہ ادھر کونے والی بنچ میری ہے۔
چمن: مگر اس وقت تو اس پر وہ تین مولوی قسم کے لوگ بیٹھے ہیں مالک۔
عدنان: خوامخواہ۔ بالکل فضول — وہاں بیٹھے قصے کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ہونہہ۔ وہ کتنی دیر میں اٹھیں کے وہاں سے۔
چمن: میں کیا کہہ سکتا ہوں مالک!
عدنان: اونہہ۔ جیسے بنچ خرید لی ہے انہوں نے۔ جم کر ہی رہ گئے ہیں کم بخت — چلو۔ چلو یہاں سے چمن۔
(وہ دونوں دانے چگتی ہوئی چڑیوں کے قریب سے گزرتے ہیں)
درشہوار: (گھبرا کر) ذرا دیکھ کر۔ ذرا دیکھ کر۔
عدنان: (مڑ کر) کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں محترمہ؟
درشہوار: جی ہاں۔ آپ ہی سے
عدنان: کیا چاہتی ہیں آپ؟
درشہوار: آپ نے چڑیوں کو اڑا دیا۔ وہ بیچاری دانہ چگ رہی تھیں۔
عدنان: ہونہہ — میں چڑیوں کا پابند نہیں ہوں۔
درشہوار: لیکن میں تو ہوں —!
عدنان: تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ پبلک پارک ہے۔

درشہوار: تو پھر آپ یہ شکایت کیوں کر رہے تھے کہ مولویوں نے آپ کی بنچ پر قبضہ کر لیا ہے۔
عدنان: محترمہ آپ سے تعارف تک نہیں ہے۔ آپ کو مجھ سے مخاطب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے — جی — چمن۔ آؤ۔
(دونوں چلے جاتے ہیں)
درشہوار: بڈھا کس قدر بدمزاج ہے۔ آخر بعض لوگ بوڑھے ہو کر اس قدر چڑچڑے کیوں ہو جاتے ہیں۔ کتنا مزہ آئے اگر اسے آج پورے پارک میں کوئی بنچ ہی خالی نہ ملے۔ ایسے لوگوں کا یہی علاج ہے۔ اوہ۔ وہ پھر آرہا ہے — کس قدر دھول اڑاتا ہے چلتے ہوئے۔ جیسے کچی سڑک پر گدھا گاڑی۔
(عدنان ملک اپنے نوکر کے ہمراہ پھر داخل ہوتا ہے)
عدنان: خوامخواہ۔ بیہودہ بات ہے منتظمین کو موسم سرما میں زیادہ بنچوں کا انتظام کرنا چاہئے کس قدر واہیات بات ہے — خیر چمن میاں۔ میرا خیال ہے میں اسی بنچ پر بیٹھا جاتا ہوں، جس پر یہ ضعیف خاتون بیٹھی ہیں۔
(وہ بڑبڑاتا ہوا درشہوار والی بنچ کے آخری کنارے پر بیٹھ جاتا ہے۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر اس کی چھتری کو چھوتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے آداب عرض۔
درشہوار: تو آپ پھر آ گئے —؟
عدنان: میں پھر دہراؤں گا محترمہ کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہیں۔
درشہوار: میں آپ کے آداب کا جواب دے رہی ہوں۔
عدنان: سلام کے جواب میں سلام کیا جاتا ہے۔
درشہوار: آپ کو میری بنچ پر بیٹھنے کی اجازت لینی چاہئے تھی۔
عدنان: یہ بنچ اس پارک کی ہے آپ کی نہیں — اور یہ ایک پبلک پارک ہے۔
درشہوار: تو آپ نے اس بنچ کو جس پر مولوی صاحبان بیٹھے تھے اپنی کیوں کہا تھا؟
عدنان: بہت خوب۔ خوب۔ میں لاجواب ہوں — (بڑبڑاتے ہوئے) اتنی ضعیف العمر عورتوں کو تو گھر میں بیٹھنا چاہئے نہ کہ ......
درشہوار: بڑبڑانا بند کر دیجئے۔ میں یہاں سے اس طرح جانے والی نہیں ہوں۔

عدنان: (جیب سے رومال نکال کر اپنے جوتوں کی گرد صاف کرتا ہے)۔
ابھی اس پارک کی سڑکوں پر پانی کے چھڑکاؤ کی بہت ضرورت ہے۔
کس قدر گرد ہے۔

درشہوار: واہ وا کیا بات ہے —— رومال سے جوتے صاف کرنا۔

عدنان: کیا کہا؟

درشہوار: (مسکراتے ہوئے) کیا آپ منہ پونچھنے کے لئے جوتے کا برش استعمال کرتے ہیں؟

عدنان: آپ کو مجھ پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟

درشہوار: اس وقت ایک پڑوسی کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے ——

عدنان: (نوکر سے) چمن۔ میری کتاب دو۔ اب زیادہ دیر یہ حماقت میں برداشت نہیں کر سکتا۔

درشہوار: معاف کیجئے خاتون۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔ لیکن دیکھئے نا اگر آپ ایسی باتوں میں دخل اندازی نہ کریں جن سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے تو —— کوئی حرج تو نہیں ہے محترمہ!

درشہوار: میں عام طور پر وہ سب کہہ دیتی ہوں جو سوچتی ہوں۔

عدنان: اچھا تو پھر کہتی رہیئے —— چمن لاؤ میری کتاب دو ——

چمن: لیجئے مالک۔

(عدنان کتاب لے کر کھول لیتا ہے۔ پھر جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا نکالتا ہے اور اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار کر چمڑے کے بٹوے میں سے پڑھنے کا چھوٹا شیشہ نکال کر چشمہ کے شیشوں پر لگاتا ہے —— اور عینک آنکھوں پر لگا لیتا ہے)

درشہوار: میں سمجھی تھی کہ ابھی آپ خوردبین بھی لگائیں گے۔

عدنان: کیا کہا —— ! پھر دہی ——

درشہوار: معلوم ہوتا ہے آپ کی نگاہ بالکل کمزور ہے۔

عدنان: ہو یا نہ ہو —— آپ سے پھر بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔

درشہوار: جی بجا ارشاد فرمایا۔

عدنان: اس کی گواہی وہ لاتعداد خرگوش اور ہرن دے سکتے ہیں جو میری گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔

درشہوار: اچھا۔ تو کیا آپ شکار سے بھی شوق فرماتے ہیں۔

عدنان: ہاں میں بڑا اچھا شکاری تھا اور اب بھی کبھی کبھی میں شکار پہ جاتا ہوں —— وقت گذاری کے لئے۔

درشہوار: وقت گزارنے کے لئے —— ؟ ہاں ٹھیک ہی ہے، وقت گزاری کے سوا اب اور آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

عدنان: کیا سمجھتی ہیں آپ —— آپ اس چیتے کی کھال دیکھ سکتی ہیں جو ۲۵ سال پہلے میں نے مارا تھا۔ ابھی تک اس کی کھال میری بیٹھک میں لٹکی ہوئی ہے۔

درشہوار: اور میں آپ کو اپنے گھر میں دس چیتوں کی کھالیں دکھا سکتی ہوں —— واہ وا صاحب کیا دلیل ہے

عدنان: اچھا محترمہ۔ آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میں ذرا کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔

درشہوار: بہتر ہے۔ آپ پڑھئے نا میں نے منع کب کیا ہے۔

عدنان: شکریہ۔ (عدنان جیب سے بٹوہ نکال کر پان کھاتا ہے) کیا آپ بھی شوق فرمائیں گی؟

درشہوار: شکریہ (وہ ایک پان لے لیتی ہے)

عدنان: میں مراد آبادی تمباکو کھاتا ہوں۔

درشہوار: اور میں بھی (دونوں ہنستے ہیں) کیا خوب اتفاق ہے!

عدنان: لیجئے۔

درشہوار: شکریہ —— (خود سے) تو پان نے ہم دونوں کی دوستی کرا دی۔

عدنان: آپ برا تو نہیں مانیں گی اگر میں بلند آواز میں کتاب پڑھوں۔

درشہوار: قطعی نہیں —— آپ کا جیسے جی چاہے آپ پڑھ سکتے ہیں۔

عدنان: (پڑھتا ہے) "تب تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ہے نا؟ ساہوکار کی بیوی نے کہا "جلد ہی ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن جائیں گے۔" راستینیاک بولا۔ "اگرچہ آپ کی دوستی میرے لئے نعمت غیر مترقبہ ہوگی لیکن اس دوستی سے جی ڈرتا ہے۔" —— یہ بالزاک کے ناول "پیر گوریو" کا اقتباس ہے جسے نسیمہ ہمدانی نے ترجمہ کیا ہے سن رہی ہیں نا آپ —— ؟

درشہوار: غالباً۔

عدنان: (پڑھتا ہے) جن لوگوں کو اس قسم کی گفتگو کا پہلے پہل موقعہ ملا ہے انہیں اس قسم کے مہمل فقرے گھڑے گھڑائے مل جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کو ہمیشہ بہت پسند آتے ہیں ——"

درشہوار: (ہنسنے لگتی ہے)

عدنان: اس میں کچھ نظمیں بھی ہیں (وقفہ)

میرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی

درشہوار: آپ کو اتنی ساری عینکوں اور شیشوں کی مدد سے پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ بہت ہی عجب سا محسوس ہوتا ہے۔

عدنان: تو کیا آپ بغیر عینک کے پڑھ سکتی ہیں؟

درشہوار: یقیناً۔

عدنان: آپ کی عمر کیا ہے؟ — آپ یقیناً مذاق کر رہی ہیں۔

درشہوار: لائیے کتاب دیجئے مجھے (وہ کتاب درشہوار کے ہاتھ میں دیتا ہے)

(وہ پڑھتی ہے)

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشم خنداں میں
خمستانِ فلک پر نور کی صہبا چھلکتی تھی

عدنان: کمال ہے۔ آپ کی نگاہ واقعی بہت اچھی ہے۔

درشہوار: (خود سے) یہ نظم مجھے زبانی یاد تھی۔

عدنان: مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ نوجوانی میں میں نے بھی چند ایک نظمیں کہی تھیں۔

درشہوار: کس قسم کی نظمیں؟

عدنان: ہر قسم کی — چند ایک امریکہ کے سفر کے دوران کہی تھیں؛ وہ بہت اچھی تھیں۔

درشہوار: کیا؟ — تو کیا آپ امریکہ بھی جا چکے ہیں؟

عدنان: کئی مرتبہ —— پہلی بار جب میں امریکہ گیا تو میری عمر صرف چھ سال کی تھی۔

درشہوار: تب تو غالباً آپ کولمبس کے ساتھ گئے ہوں گے۔

عدنان: (بے اختیار ہنستا ہے) خوب بہت خوب! — اور چند نظمیں میں نے سرتاج پور میں کہی تھیں۔ سرتاج پور ایک بہت ہی پُر فضا مقام ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے ایک بہت ہی حسین بستی۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زاروں سے گھرا ہوا۔ آہ! کتنی میٹھی یاد ہے اس بستی کی۔ سرتاج پور۔ میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔

درشہوار: واقعی؟

عدنان: ہاں میں وہیں پیدا ہوا۔ وہیں بڑھا پلا۔ کیا آپ نے کبھی وہ بستی دیکھی ہے؟

درشہوار: کیوں نہیں۔ میں کتنی دفعہ یہاں گئی ہوں۔ سرتاج پور سے دو میل دور مغرب میں دریائے جہلم کے عین کنارے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جو شاید آج بھی وہاں ہو۔ اس حویلی میں میری بہت سی یادیں دفن ہیں۔ بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف شہتوت اور کھجوروں کے درخت تھے۔ بڑا پیارا سا نام تھا اس کا۔ دیکھئے میں بھول گئی۔ بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا "راج محل"

عدنان: (جذباتی سا ہو کر)۔ راج محل؟؟

درشہوار: کیوں؟ کیا یہ نام آپ کا جانا پہچانا ہے؟

عدنان: ہاں بہت زیادہ جانا پہچانا۔ راج محل۔ دریائے جہلم کے کنارے۔ سرتاج پور سے ۲ میل۔ آہ۔ آج سے چالیس سال پہلے اس راج محل میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ بہت ہی حسین۔ بے حد خوبصورت۔ میں نے زندگی میں اس سے خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں۔ شہوار۔ شہوار۔ درشہوار۔!

درشہوار: (جذباتی ہو کر) درشہوار؟

عدنان: ہاں (وہ دونوں ایک دوسرے کو عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں)

درشہوار: (خود پر قابو پاتے ہوئے) کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنی پیاری سہیلی کا خیال آ گیا۔ درشہوار۔ وہ میری سہیلی تھی۔

عدنان: اوہ۔ کتنی عجیب بات ہے!

درشہوار: اسے لوگ راج محل کا کنول کہہ کر پکارتے تھے۔

عدنان: ہاں۔ "راج کنول"۔ وہ سارے علاقے میں اسی نام سے مشہور تھی۔ آہ۔ میں آج بھی۔ اس کے تصور کو حقیقت سمجھ کر دیکھ سکتا ہوں۔ دریا کی طرف والے دریچے میں جہاں سرخ گلابوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہر صبح وہ اس دریچے میں کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ آپ کو یاد ہے؟

درشہوار: ہاں اچھی طرح۔ وہ اس کا کمرہ تھا۔

عدنان :۔ ہر صبح وہ اس دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی۔

درشہوار :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں مجھے یاد ہے۔

عدنان :۔ وہ حسن کی شہزادی تھی۔ گلاب کی طرح شاداب۔ اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں اور بال بہت لانبے لانبے تھے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب سی چمک رہتی تھی ۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے ۔ وہ کوئی آسمانی روح ہے جو بھول کر اس دنیا میں آنکلی ہے، وہ ایک خواب تھی۔

درشہوار :۔ (خود سے) اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ خواب اس وقت تمہارے برابر ہی بیٹھا ہوا ہے تو تمہیں اس خواب کی تعبیر کا بھی اندازہ ہو جائے ۔ (بلند آواز میں) لیکن وہ بہت بدقسمت تھی ۔ اس کی محبت کی کہانی بڑی پُر درد ہے۔

عدنان :۔ (آہ بھر کر) بہت ہی پُر درد؟

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

درشہوار :۔ کیا آپ کو معلوم ہے ؟

عدنان :۔ ہاں۔

درشہوار :۔ (خود سے) قسمت کے کیا کرشمے ہیں۔ یہ آدمی میرا عاشق ہے۔

عدنان :۔ اس کی کہانی کسے معلوم نہیں۔ اور پھر اس کا عاشق تو میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا اور اس لئے ہمارے درمیان کبھی کوئی بات راز نہیں رہی۔

درشہوار :۔ اوہ۔ میری سہیلی نے اپنے ایک خط میں اپنی محبت کی کہانی لکھ کر بھیجی تھی مجھے۔ تمہارا بھائی ہر روز علی الصبح گھوڑے پر سوار اس راستہ سے گذرتا تھا جس طرف درشہوار کا دریچہ تھا۔ وہ دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی اور گذرتے گذرتے تازہ گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ بالکونی کی طرف اچھال دیتا اور میری سہیلی دریچہ سے ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا کرتی۔

عدنان :۔ اور دوپہر ڈھلے جب وہ شہسوار اسی راستے سے واپس ہوتا تو آپ کی سہیلی سفید پھولوں کا ایک ہار اپنے دریچہ سے نیچے پھینکتی اور میرا بھائی اسے دبوچ لیتا۔ کیوں۔۔؟ ایسا ہی تھا نا؟؟

درشہوار :۔ ہاں ۔ مگر میری بدقسمت سہیلی کے والدین اس کی شادی کسی تاجر سے کرنا چاہتے تھے جسے وہ بالکل پسند نہ کرتی تھی۔

عدنان :۔ اور ایک رات جب میرا بھائی اس کی بالکونی کے نیچے گلابوں کی جھاڑیوں میں اس واسطے چھپا ہوا تھا کہ چاندنی رات میں اسے گاتے ہوئے سنے۔ تو بھی تاجر جو اُس کا منگیتر تھا جانے کہاں سے آگیا تھا۔

درشہوار :۔ اور اس نے تمہارے بھائی کو برا بھلا کہا تھا۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا تھا

درشہوار :۔ اور پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی نے اس کے منگیتر کو قتل کر دیا تھا، پھر گرفتاری کے ڈر سے میرا بھائی دو تین روز گاؤں ہی میں چھپتا پھرا تھا اور پھر کسی نامعلوم مقام کو بھاگ گیا تھا۔

درشہوار :۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ کہانی اچھی طرح معلوم ہے۔

عدنان :۔ اور میرا خیال ہے آپ کو بھی ۔۔۔؟

درشہوار :۔ میں نے کہا نا میری سہیلی نے سارے حالات مجھے لکھے تھے۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی نے مجھے بتائے تھے (خود سے) یہ عورت یقیناً درشہوار ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ قسمت نے آج ہمیں اک بار پھر ملا دیا ہے۔

درشہوار :۔ (خود سے) یہ مجھے پہچان نہیں سکا ہے۔ یا پھر آخر میں اسے کیوں بتاؤں ۔۔۔! اس کے ماضی کی حسین یادوں کے طلسم کو اسی طرح قائم رہنا چاہیئے۔

عدنان :۔ (خود سے) اس بیچاری کو کیا معلوم کہ وہ اس وقت اپنے محبوب سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ جان کیسے سکتی ہے؟۔ میں اسے کبھی نہیں بتاؤں گا۔

درشہوار :۔ اور کیا وہ آپ ہی تھے جس نے اپنے خالہ زاد بھائی کو درشہوار کو بھول جانے کا مشورہ دیا تھا؟

عدنان :۔ یہ کیسے ۔۔؟ میرا بھائی اسے کبھی بھی نہ بھلا سکا ۔۔ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں۔

درشہوار :۔ لیکن میں کس طرح یقین کروں؟

عدنان :۔ میں بتاتا ہوں۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ۔ سرتاج پولیس سے فرار ہونے کے بعد اس نے میرے گھر میں پناہ لی ۔۔۔

چند دن وہاں گذارنے کے بعد جھانسی چلا گیا اور پھر جھانسی سے شیلانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس نے درشہوار کو بہت سے خطوط لکھے لیکن اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ شاید اس کے والدین نے وہ خط راستے ہی میں روک دئے ہوں۔ آخر عدنان ملک کو یقین ہو گیا کہ اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گا۔ ناامید اور مایوس ہو کر اس نے فوج میں نوکری کر لی اور افریقہ کے محاذ پر چلا گیا۔ جہاں وہ بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ کہتے ہیں مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر صرف ایک ہی نام تھا۔ درشہوار۔ درشہوار۔ درشہوار!

درشہوار:۔ (خود سے) کس قدر عالیشان جھوٹ ہے۔

عدنان:۔ (خود سے) میں خود کو اس سے زیادہ بہادری کے ساتھ نہیں مار سکتا تھا۔

درشہوار:۔ آپ کو اس کی موت کا سخت رنج ہوا ہوگا!

عدنان:۔ بے شک۔ وہ مجھے اپنی جان کی طرح عزیز تھا۔ اور پھر میں یہ بھی سوچتا تھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) کہ درشہوار اس کے حالات اور موت سے بے خبر اپنے باغیچہ میں تتلیاں پکڑتی پھرتی ہوگی، ویسی ہی شوخی اور بے فکری کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

درشہوار:۔ نہیں یہ غلط ہے۔

عدنان:۔ عام طور پر عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

درشہوار:۔ نہیں۔ درشہوار عام عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ میری سہیلی نے دنوں۔ ہفتوں اور سالوں عدنان کے خط کا انتظار کیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی خط نہ آیا اور آخر ایک شام سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جب آسمان پر پہلا ستارہ طلوع ہوا تو درشہوار اپنے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہوئی۔ بس اب وہی دریا تو اس کا محبوب تھا۔ وہ دور تک اس راستہ پر چلتی گئی جس پر اس کا محبوب گھوڑے پر سوار گذرا کرتا تھا۔ آخر بہت دور جا کر وہ رک گئی، یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ وہ دیر تک کنارے پر بیٹھی، دوڑتی شور کرتی موجوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے ریت پر اپنی انگلی سے اپنے محبوب کا نام لکھا: عدنان عدنان۔ عدنان ملک۔ اور پھر وہ قریب کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ اس کی نگاہیں افق پر لگی ہوئی تھیں ۔۔۔ دور کھجوروں کے جھنڈ کی آڑ سے آخری تاریخوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ دریا زخمی شیر کی طرح چنگھاڑ رہا تھا، اور اس کے بعد ۔۔ اس کے بعد۔ کیا میں بتاؤں کیا ہوا؟

عدنان:۔ بس کرو۔ بس کرو۔ خدا کی پناہ!

درشہوار:۔ اس مچھیرے نے جو اس کی لاش دریا سے نکال کر لایا تھا بتایا کہ ریت میں عدنان کا نام موجوں کی روانی کے باوجود اسی طرح چمک رہا تھا جیسا اس نے لکھا تھا (خود سے) تم مجھ سے جیت نہیں سکتے۔ میری موت تمہاری موت کی کہانی سے کہیں زیادہ دلدوز اور اثر انگیز ہے۔

عدنان:۔ (خود سے) یہ مجھ سے زیادہ کامیاب جھوٹ بولنا جانتی ہے۔

درشہوار:۔ (آہ بھر کر) آہ بیچاری درشہوار!

عدنان:۔ (آہ بھر کر) آہ بیچارہ عدنان ملک!

درشہوار:۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ اس کے فرار ہونے کے چھ مہینے بعد ہی میں نے شادی کر لی تھی۔

عدنان:۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ سرتاج پور سے بھاگ کر میں نے تھیٹر میں ملازمت کر لی تھی اور نہایت عیش و عشرت کی زندگی گذارنے لگا تھا۔

درشہوار:۔ قسمت بھی کیسے عجیب عجیب کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ میں اور تم دو اجنبی، جو اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے سے مل گئے ہیں، چند ہی لمحوں بعد اس طرح گفتگو کریں گے جیسے ہم پرانے دوست ہوں۔

عدنان:۔ بڑی عجیب سی بات ہے واقعی۔ اور پھر یہ کہ ہماری ملاقات کا آغاز جھگڑے سے ہوا تھا۔

درشہوار:۔ آپ نے چڑیوں کو جو اڑایا تھا۔

عدنان:۔ ہاں۔ میں اس وقت خراب موڈ میں تھا۔

درشہوار:۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے (بڑے پیار سے) کیا آپ کل بھی آئیں گے؟

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

افسانہ :

کالی اُنگلی

انور ممتاز

ساری دنیا میں ایک پیرس ہے اور پیرس میں ایک شانزا لیزے اور شانزا لیزے میں سب کچھ ہے۔ پھر میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ مجھے کس کی تلاش ہے؟

اس وے سائڈ کافے کی دیواریں پلاسٹک کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے شانزا لیزے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آ رہا ہے۔ خوبصورت کاریں چمک دار سڑک پر تیرتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ مُلک مُلک کے سیاح اپنے کندھوں سے کیمرے لٹکائے حسین عورتوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے ہشاش بشّاش ٹہلتے پھر رہے ہیں۔ حسین عورتوں کے حسین لباسوں میں حسین جسم نظر آ رہے ہیں۔ شانزا لیزے ایک دلہن کی سج دھج کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر میں کیوں بے تاب ہوں؟ میں کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

اور اگر اس وے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ تو یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ میں کتنا بے وقوف ہوں۔

اور میرے پاس سُوسن کے لئے انٹروڈکشن لیٹر ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے کے لئے کیوں نہیں چلا جاتا؟ آج صبح جب میں ایک بک۔ سٹال سے پیرس گائیڈ بک خرید رہا تھا، تو ایک نیلی آنکھوں والی دلفریب عورت نے مجھے کہا تھا "میں آپ کے لئے گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے"۔ میں نے اُسے "نو تھینک یو" کیوں کہا۔ وہ میرے لئے یقیناً گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوتی، اور میں اس وے سائڈ کافے کے شور و غل میں تنہائی محسوس نہ کرتا۔

میں بہت دیر سے اس میز پر تنہا بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر تک اس میز کے اردگرد پڑی ہوئی تین خالی کرسیاں میری غمگسار بنی رہیں۔ اب دو کرسیاں کافے کے دوسرے گاہکوں نے میری اجازت سے لے لی ہیں۔ اب میرا تنہائی کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ میرے دو خاموش دوست مجھ سے جدا ہو گئے ہیں۔ اب صرف ایک خالی کرسی میرے سامنے سے اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟

او میرے خدا! میں سمجھ گیا۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ میں سفید قوموں کی دنیا میں ہوں۔ میں کالی قوم کا فرد ہوں۔ سفید قومیں ترقی یافتہ ہیں، کالی قومیں پسماندہ۔ سفید قومیں حاکم ہیں، کالی قومیں غلام۔ یہ کرسی خالی رہے گی۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔

اے میرے خدا! اس کرسی پر کوئی سفید قوم کا نمائندہ نہ بیٹھے۔ سفید قوموں کے نمائندے سیاہ قوموں کے نمائندوں سے بہتر نہیں ہیں۔ سیاہ قوموں کے نمائندے سفید قوموں کے نمائندوں سے بہتر انسان ہیں۔ سفید قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت کے ثبوت میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک دیتے ہیں، سیاہ قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اے میرے خدا! اس خالی کرسی پر کوئی سیاہ فام انسان آ کر بیٹھے۔ مجھے کسی کالی قوم کے فرد کی تلاش ہے۔ میں شانزا لیزے کی دلکش فضا میں کسی کالے بدصورت انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے وے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے سب کچھ نظر آتا ہے، لیکن کوئی کالا آدمی نظر نہیں آتا۔

کوئی الجیریا کا کالا باشندہ میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں اُسے کہوں "اپنے وطن پر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دو۔ اپنے وطن کے لئے خود مر مٹنا اپنے وطن کے لئے دوسروں کو مٹانے سے بہتر ہے۔ مٹ جاؤ، اپنے وطن کی آزادی پر قربان ہو جاؤ۔"

کوئی میرا سیاہ فام ہم وطن اس کرسی پر بیٹھا ہو تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں۔ میں اسے بتاؤں کہ پاکستان گیارہ سال کی صبر آزما مدت کے بعد سیاستدانوں کے خود غرض پنجوں سے آزاد ہو گیا ہے، وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا ہے، ملک میں مارشل لا کا نفاذ ہو گیا ہے اور تمام ملک

میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔

کاش میرے سامنے کوئی کالا آدمی بیٹھا ہو!

یکایک ایک کالی انگلی میری نظروں سے ٹکرائی۔ کالی انگلی خالی کرسی کی بیک پر نمودار ہوئی، پھر اُس کے پیچھے خوبصورت سیاہ لباس میں ملبوس ایک خوبصورت سفید فام عورت نمودار ہوئی اور اس نے کالی انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا:

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

میں اُس کو غور سے دیکھنے لگا۔ سفید عورت! سیاہ لباس! کالی انگلی! یا خدا اب کیا کروں!

میں نے کہا:

"تشریف رکھئے۔"

وہ تعارف کرانے کے لئے بولی "میں زی زولین کریر ہوں۔ میرے دوست مجھے زینا کہتے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہوں۔"

میری رُوح نے اُسے خوش آمدید نہ کہا۔ میری زبان نے بداخلاقی گوارا نہ کی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور جب دیر تک کوئی بات نہ سوجھی تو میں نے خاموشی کی بدمزگی سے بچنے کے لئے کہا:

"غالباً آپ سوسن میکفرسن کو تو نہ جانتی ہوں گی۔ وہ بھی یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہیں۔"

"اوہ! سوسی! خوب جانتی ہوں۔ سوسی کو سب جانتے ہیں۔"

"میرے پاس اس کے باپ کا خط ہے۔"

"میں ملا دوں گی سوسی سے آپ کو۔"

"آپ کیا پئیں گی؟ شمپین۔"

"جی نہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔"

میں کھسیانا ہو گیا۔ اس کے جواب میں روکھا پن تھا۔ جیسے وہ میری بات سے ناراض ہو گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اس کے لہجے میں غرور اور بدتہذیبی بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ دوسری میزوں پر بھی کرسیاں خالی تھیں۔ پھر وہ میرے سامنے آکر کیوں بیٹھ گئی ہے اور اس کی گفتگو کا آغاز تو بالکل عام لڑکیوں جیسا تھا۔

اس نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر میز کے دائیں کونے میں رکھ دیا اور کتاب بائیں کونے میں۔ پھر اس نے کتاب کو بائیں کونے سے اٹھا لیا اور اس کو دائیں کونے میں رکھ کر اس کے اوپر ہینڈ بیگ رکھ دیا پھر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"آپ کیا کھائیں گے؟"

میرا خیال تھا کہ وہ اب مجھ سے کوئی بات نہ کرے گی اور میرا بھی اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے اچانک سوال سے میں بوکھلا گیا اور یہ کچھ عجیب بات بھی تھی۔ ہوٹلوں میں پیشکش ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے پوچھنا چاہئے تھا آپ کیا کھائیں گی؟ لیکن میں تو پوچھ چکا تھا۔ فیشن کے مطابق پینے کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا:

"جی، میں ــــ میں کچھ نہیں کھاؤں گا ــــ"

وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولی: "میں ہوسٹل سے کبھی کبھی نکلتی ہوں۔ جب نکلتی ہوں، تو پینے کے لئے نہیں، کھانے کے لئے ہوسٹل کے کھانوں سے اُکتائے ہوئے ہیں ہم لوگ۔ کبھی کبھی چینج کے طور پر باہر کھانے میں لطف رہتا ہے۔ آپ کھا چکے ہیں؟"

میں سراسیمگی کے عالم میں بولا: "جی نہیں۔"

وہ چلائی: "گارساں، گارساں"

گارساں (بیرا) آگیا۔

"دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اینڈ فش!"

میرے چہرے پر احتجاج کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولی: "مجھے تلے ہوئے آلو اور روسٹ کی ہوئی مچھلی بہت پسند ہے۔ اگر میں آپ کو آرڈر دینے کی اجازت دے دیتی تو آپ پوٹیٹو چپس اور فش کی بجائے فرانس کے مشہور پُر تکلف کھانوں کا آرڈر دیتے۔ مجھے پُر تکلف کھانوں اور شرابوں سے نفرت ہے۔ آلو اور مچھلی غریبوں کا کھانا ہے، میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ پیش نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا: "میڈم، میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

اس نے فوراً موضوع بدل دیا: "مجھے میڈم کا لفظ پسند نہیں۔ آپ مجھے زیزا کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے زیزا کہتے ہوئے آپ کو کوئی رومانٹک احساس نہیں ہونا چاہئے۔ زیزا بڑا آرٹسٹک لفظ ہے۔ اس میں حروف اور آواز رنگوں کے امتزاج کی طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی زیزا کہتا ہے تو میں محسوس کرتی ہوں میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اور زیزا میری تخلیق۔ آپ مجھے زیزا کہئے، میں دیکھنا چاہتی ہوں آپ کی آواز میں موسیقی ہے یا نہیں۔"

اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ زیزا ایک دلچسپ اور ذہین لڑکی ہے، عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس لئے میری بات میں میرے جذبات شامل ہو گئے۔

میں نے کہا: "زیزا، مجھے اجازت دیجئے، میں آپ کے لئے لنچ کا آرڈر دوں۔"

لیکن بیرا دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اور فش لے کر آگیا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ آلو اور مچھلی کھاتے رہے۔ پھر وہ بولی:

"جب میں ہوسٹل سے باہر آتی ہوں تو کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔ ہوسٹل کی شور شرابے کی زندگی سے باہر نکل کر کچھ عرصہ بالکل تنہا اور خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ میں مردوں کے ڈانس اور سینما کے پروگراموں کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتی ہوں۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا: "زیزا، مجھے افسوس ہے میں آپ کی تنہائی کی لذتوں میں خلل انداز ہو رہا ہوں۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں: "لیکن جب کبھی مجھے کسی سیاہ قوم کا فرد نظر آجاتا ہے، تو میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اسکی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

میں حیران ہو گیا: "زیزا، کیا آپ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں؟"

وہ ہنس پڑی: "اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ سنا ہے سفید عورتیں نیگرو اور دوسری کالی نسل کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ آپ کو میری بات سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں اور رنگوں سے حُسن کی تخلیق میرا کام ہے۔ عجیب بات ہے کہ مجھے رنگوں میں سب سے زیادہ کالا رنگ پسند ہے۔ یقیناً کالے رنگ کو تمام دوسرے رنگوں کی ملکہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ رنگ سب سے افضل ہے۔ میرے رنگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ میں ہر رنگ میں کالا رنگ شامل کر دیتی ہوں۔ میرے سٹوڈیو میں ایک پورٹریٹ ہے جس کو پینٹ کرنے میں میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ وہ تصویر میری نمائندہ پینٹنگ ہے۔ وہ میرا ماسٹر پیس ہے، اس میں ایک جوانمرد کا سیاہ فام چہرہ ہے۔ سیاہ فام چہرے کے پیچھے گہرے سرخ خون کا سمندر ہے، خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے۔"

میں مرعوب آواز میں بولا: "زیزا، کیا مجھے اس ماسٹر پیس کو دیکھنے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے؟"

"آپ سوسی کو ملنے جائیں گے۔ ہم دونوں ایک ہی سٹوڈیو میں کام کرتی ہیں آپ وہاں پینٹنگ بھی دیکھ سکیں گے۔"

زیزا نے یہ فقرے جلدی جلدی کہے۔ جیسے اس کو میری قطع کلامی پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی: "یہ پورٹریٹ پینٹ کرنے کے بعد مجھ پر ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میرا تخیل وسیع ہوگیا اور کالا رنگ میرے سٹوڈیو سے نکل کر دنیا کی کالی قوموں کی حدود تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ سفید رنگ کے پیروں کے نیچے پڑا سسک رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ میں حرکت اور قوت پیدا ہوئی اور وہ سفید رنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب جہاں بھی میں کسی سیاہ قوم کے فرد کو دیکھتی ہوں، میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اس کی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

میں نے زیزا کی سیاہ انگلی اور اس کے سیاہ لباس کو دیکھتے ہوئے کہا:

"تھینک یو، زیزا"

آلو اور مچھلی ختم ہوگئی۔ کوفی آگئی۔ زیزا نے کوفی بناتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ الجیریا کے باشندے ہیں۔ آپ کا ملک آزادی کے لئے لڑ رہا ہے۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا: "جی نہیں۔ میں الجیریا کا باشندہ نہیں ہوں۔ میرے ملک کا نام پاکستان ہے۔"

وہ جلدی سے بولی: "میں جانتی ہوں۔ میرے والد وہاں ۱۹۳۷ء میں سفیر تھے۔ بڑا اچھا ملک ہے پاکستان۔ انگلش میں اس کو انڈیا کہتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا: "انگلش میں جس ملک کو انڈیا کہتے ہیں، وہ ہندوستان تھا۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں ایک نیا ملک وجود میں آیا ہے اور ۱۹۴۷ء ہی میں ہم نے انگریزوں کی حکومت سے آزادی حاصل کی۔"

وہ کسی قدر کھسیانی ہوگئی اور اپنے کھسیانے پن کو چھپانے کے لئے بلند آواز میں بولی۔

"او — لا، لا۔ آپ کا ملک آزاد ہوگیا ہے۔ مبارکباد!"

ہم کچھ دیر خاموشی سے کوفی پیتے رہے۔ میں زیزا کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن مجھے ذاتی سوالات کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر میں نے براہِ راست سوالات کرنے کی بجائے دوسرے طریقوں سے اس کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا:

"آپ مجھے فرانسیسی لڑکی معلوم نہیں ہوتیں۔"

وہ فرانسیسی لڑکی کے الفاظ پر کچھ چیں بجبیں ہوگئی اور بولی:

"میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔ مجھے تعجب ہے آپ اندازہ نہ لگا سکے۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ فرانسیسی لڑکی نہیں ہیں۔ آپ کی سطح عام لڑکیوں سے بہت بلند ہے۔"

"دنیا میں صرف جرمن لڑکیوں نے عورت کے بنیادی وقار کو بلند کیا ہے۔ عورت کو مرد کے برابر کی حیثیت دینے کی صدائیں ہر ملک سے اٹھی ہیں۔ لیکن اس جدوجہد میں کامیابی صرف جرمن لڑکیوں کو حاصل ہوئی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عورت دنیا کو حسن و عشق کی داستانوں سے سجانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ انسان کی سوسائٹی میں عورت کا سب سے اہم رول حسن و عشق نہیں ہے۔ عورت کا رول انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں حسن و عشق سے بہت بلند ہے۔ حسن و عشق عورت کی منزل نہیں۔ دنیا کا غم دوست کے غم سے زیادہ اہم ہے۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ دلکش ہیں۔ حسن و عشق کی داستان میں عورت مرد کے سامنے ایک ذیلی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ حسن و عشق عورت کو ایک گڑیا اور ایک کھلونا بنا کر مرد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس طرح عورت مرد

کے برابر کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں نے اس حقیقت کو پہچانا ہے۔ اور میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔"

میں بہت مرعوب ہو گیا، میری زبان بند ہو گئی۔ لیکن میں تو زیزا کے زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے وہ تو مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب اس نے میری شمپین کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

میں چپ بیٹھا رہا

وہ بھی چپ بیٹھی رہی

پھر اُس نے اپنی کالی انگلی کوفی کپ کے ہینڈل میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا:

"آپ اپنی کالی انگلی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی؟"

اُس نے کوفی کپ کے ہینڈل سے اپنی کالی انگلی نکال لی اور میز پر کہنی رکھ کر اس کو میری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور بولی:

"میری کالی انگلی کے پیچھے میرا سفید ہاتھ ہے۔ میرے سفید ہاتھ کے پیچھے میرا سنگِ مرمر جیسا بازو ہے اور میرے سنگِ مرمر جیسے بازو کے پیچھے میرا دودھ جیسا بدن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید انگلی سفید ہونے کے باوجود کالی ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید قوموں کی قسمت سفید ہونے کے باوجود کالی قوموں کی قسمت جیسی ہو سکتی ہے۔ میرا پیارا ملک جرمنی اوبار کی اسی گہرائی میں ہے جہاں انجیر یا ہے۔"

غضب ہو گیا۔ اُس کی نیلی نیلی بلور جیسی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے جلدی سے کہا:

"زیزا، تم آرٹسٹ ہو۔ تم بہت بڑی آرٹسٹ ہو۔"

اس نے میری بات نہ سُنی۔ اپنی بات کرتی رہی

"لیکن میری کالی انگلی اگر کالی قوموں کی قسمت کی یاد دلاتی ہے۔ تو یہ کالے ناگ کی اور گرانڈیل سیاہ ہاتھی کی بھی یاد دلاتی ہے۔ یہ اس سیاہ فام پورٹریٹ کی یاد بھی دلاتی ہے جس کے خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے اور جس کو اس کالی انگلی نے خود بنایا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش بیٹھا رہا۔ میں نے داد دینی بھی مناسب نہ سمجھی۔ ایسا نہ ہو اُس کی موڈ بگڑ جائے اور اُس کی روانی میں فرق آ جائے۔

میری توقع کے خلاف اس نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

"جب ۱۹۴۷ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، میں قید میں تھی۔"

میں نے اُس کو اکسانے کے لئے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ قید میں؟ کیوں؟ کہاں؟"

"آئرن کرٹن کے پیچھے۔ روس کے فولادی پردے کے اندر مشرقی برلن میں، میں، میرا بھائی، میری ماں، میرا باپ۔ میرا باپ فورین سروس میں تھا۔ ہمارے فیورر ہٹلر کو میرے باپ پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے میرے باپ کو بڑے بڑے اہم غیر ملکی مشنوں پر بھیجا۔ اسی سلسلے میں وہ ۱۹۳۷ء میں انڈیا گیا۔ پچھلی جنگ کے دوران میں میرا باپ فیورر کا دایاں بازو بن گیا۔ بدقسمتی سے جرمنی جنگ میں ہار گیا۔ برلن تقسیم کر دیا گیا۔ ہمارا خاندان مشرقی برلن میں آ گیا۔ میرا بھائی فیورر کی فوج کا بڑا ہونہار افسر تھا۔ ہمارے سارے کنبے کو جیل میں پھینک دیا گیا اور ہمارے گھر پر قبضہ کر لیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اور میری ماں کو رہا کر دیا گیا۔ میں اُس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ میری ماں ایک ہوٹل میں ملازم ہو گئی اور ہمیں سیڑھیوں کے نیچے ایک خلا میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ ایک دن میری ماں ہوٹل کی سیڑھیاں دھو رہی تھی کہ ہوٹل کے سامنے دو لاشیں آئیں۔ وہ میرے باپ اور بھائی کی لاشیں تھیں! میرے بھائی کی کنپٹیوں میں گولی ایک طرف سے دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اور خون کانوں، آنکھوں اور ناک پر بہتا ہوا کپڑوں پر گر کر جم گیا تھا۔ میرے باپ کے سر کے پیچھے گولی نے کھوپڑی کو توڑ کر ایک انچ قطر کا گول سوراخ کر دیا تھا۔ میری ماں اور میں ایک ہفتہ تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ پھر ہوٹل میں رہنے والے میری ماں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا سلوک کرنے لگے۔ میری ماں اور میں اکثر ہوٹل کے کسی مہمان کے ساتھ ڈنر، ڈانس اور سینما میں چلے جاتے۔ لیکن زیادہ تر میں اکیلی گھر پر رہتی اور میری ماں آدھی آدھی رات تک واپس نہ آتی مجھے اکیلی کو بڑا ڈر لگتا۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔

"ایک دن ہوٹل میں ایک مہمان آکر ٹھہرا۔ اس کے بال لمبے تھے، سر چھوٹا اور منہ لمبا جو فرنچ کٹ ڈاڑھی سے اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے، گال خشک اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ اس کی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے موٹے موٹے اور ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ اس کا نام البرٹ بکواسو تھا۔"

میں چونک پڑا۔

"کون البرٹ بکواسو؟ یہاں کی فرنچ فائن آرٹس اکیڈمی کا پرنسپل؟"

"جی ہاں۔ وہ وہاں روس کی دعوت پر اپنی تصویروں کی نمائش کرنے گیا تھا۔ میں نے اس کے حلیے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نہ بھولئے۔ اس کا آنے والے واقعات سے بڑا تعلق ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں، یہ حلیہ بھولنے والی چیز نہیں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو میری ماں کا بہت گہرا دوست بن گیا۔ وہ اکثر میری ماں کو کئی کئی گھنٹوں کے لئے باہر لے جاتا اور میں گھر پر اکیلی ڈرا کرتی۔ ایک دن میری ماں کہیں گئی ہوئی تھی۔ پروفیسر البرٹ بکواسو آیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آنے والے ہیں۔ ان کو بتانے سے پہلے آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا:

"جی۔ کیجئے۔"

"آپ کو یاد ہے میری عمر اس وقت کتنی تھی؟"

"بارہ تیرہ سال۔"

"اور آپ کو پروفیسر البرٹ بکواسو کا حلیہ یاد ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو اندر آیا۔ میں اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اور گڑگڑا کر بولی: پروفیسر بکواسو، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے اپنی بیوی بنا لو۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔" پروفیسر بکواسو کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیروں سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ دوسرے دن میں سیڑھیوں میں کھیل رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو اور میری ماں اندر بیٹھے تھے۔ میری ماں نے مجھے آواز دی۔ میں اندر گئی۔ جونہی میں نے اندر قدم رکھا۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو زور زور سے ہنسنے لگے۔ میری ماں نے کہا: 'زینا، تم پروفیسر بکواسو کی بیوی بننا پسند کرتی ہو؟' میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو نے ایک اور قہقہہ مارا اور دیر تک ہنستے رہے۔ پھر میری ماں نے پروفیسر بکواسو سے کہا: 'البرٹ، تم ٹھیک کہتے ہو۔ زینا یہاں بے حد ناخوش ہے اور کسی نہ کسی بہانے اس ماحول سے نکل جانا چاہتی ہے۔ اس کی مدد کرو۔ میں ممنون ہوں گی۔' پھر جس دن پروفیسر بکواسو واپس آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تصویروں کا بڑا صندوق کھولا۔ کچھ تصویریں نکال کر میری ماں کو دے دیں۔ اور ان کی جگہ مجھے لٹا کر صندوق کو قفل لگا دیا۔ اور میں پیرس آگئی۔"

بیرا بل لے کر آگیا۔ میرے بہ اصرار منع کرنے کے باوجود زینا نے دونوں بل ادا کر دئے، اور سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا:

"زینا، میں نے آپ کو کالی انگلی پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔"

"سٹوڈیو میں آپ کو کسی سے ملنا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہوا تو مجھے آپ کو اپنا ماسٹر پیس دکھانا ہے۔"

ہم کافے سے باہر آگئے۔

میرے اصرار کے باوجود اس نے ٹیکسی سے انکار کیا۔ اور ہم پیدل سائن کی طرف چل پڑے۔
سائن کے پل کو عبور کر کے اور تھوڑی دور دائیں کنارے پر چل کر ہم یونیورسٹی پارک میں داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی پارک میں گھاس کی مخمل بچھی ہوئی تھی، پھولوں کی پریاں ناچ رہی تھیں، ہوا کے جھونکے خوشبو بکھیر رہے تھے اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں مغربی پارکوں کی آزاد محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دریائے سائن شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور شام چار بجے کا سورج مغرب کی گہرائیوں میں غرق ہونے کے لئے بھاگا جا رہا تھا۔

زیزا نے کہا:
"غور سے دیکھو۔ یہ ہماری تہذیب کا قبرستان ہے۔"
میں نے کہا:
"مجھے شرم آ رہی ہے۔"
اس نے کہا:
"شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہماری زندگی کی سینما سکوپ فلم ہے۔ جب ہماری بیٹیاں، بہنیں، مائیں اور بیویاں رات کو سینما ہالوں میں جا کر بڑی جرأت سے ایسی فلمیں دیکھ آتی ہیں، پھر آپ دن کو زندگی کی یہ فلم دیکھنے سے کیوں شرماتے ہیں؟"
میں نے کہا:
"زیزا، جلدی اپنے سٹوڈیو کو چلئے۔"
"لیکن ذرا ٹھہریئے۔ اس سیب کے درخت کے نیچے دیکھئے۔ وہ جہاں پانی کا فوارہ موتی بکھیر رہا ہے اور گلاب کے پھولوں کا تختہ مہک رہا ہے۔"
میں نے طوعاً و کرہاً ادھر دیکھا۔

وہ بولی:
"یہ سوسی ہے۔"
میری چیخ نکل گئی
"سوسن؟"
"سوسن میکفرسن"
دونوں کے ہونٹ ملے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے جذبات سے مسخ ہو گئے تھے، دونوں ایک نہایت مکروہ منظر پیش کر رہے تھے۔ میں بھاگ پڑا۔
"زیزا، مجھے سوسن سے نہیں ملنا، خدا کے لئے اپنے سٹوڈیو میں چلو۔"

سٹوڈیو سادہ سا گندہ سا تھا۔ گرد و غبار اور بے ترتیبی تھی۔ فریم کی ہوئی تصویریں دیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے سہارے رکھی ہوئی تھیں۔ میں ایزل کے پاس چلا گیا۔ ایزل پر زیزا کے تاریخی ہیرو کی تصویر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے ماتھے پر سیاہ رنگ کی لکیریں تھیں۔ اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ وہ الہ دین کا دیو معلوم ہوتا تھا۔
زیزا بھی ایزل کے پاس آ گئی۔ اس نے اپنی کالی انگلی کو اپنے ہیرو کے ماتھے کی سیاہ لکیروں پر پھیرا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی:
"میرا ہیرو"
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"پروفیسر بکواسو کو میرے ہیرو سے نفرت ہے، میں اس کی تصویر پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اندر آیا۔ کینوس پر میرے ہیرو کی تصویر دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کینوس کو ایزل سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس کو پیروں سے مسل مسل دیا۔ اور اس کے اوپر کھڑا ہو کر چلانے لگا: اس ذلیل کتے نے ایک مقدس سرزمین کو اپنے ناپاک پیروں سے روند ڈالا۔ اس جاہل انسان نے میرے سٹوڈیو کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ خونخوار بھیڑیا میری اکیڈیمی میں داخل نہیں ہوگا! میں غصے سے دیوانی ہو گئی۔ میں نے چلا کر کہا: "پروفیسر بکواسو، اپنی بکواس بند کرو!" اور دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر میں نے کہا: "اگر میرا ہیرو اکیڈیمی میں داخل نہیں ہو سکتا تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی" اور میں نے باہر نکلتے ہوئے زور سے دروازہ چوکھٹ کے ساتھ دے مارا۔ میری انگلی دروازے میں آگئی اور کالی ہو گئی۔"

میں نے کہا:

"لیکن زیزا تو یہیں ہے۔ اور اس کا ہیرو بھی ایزل پر ہے؟"

"میں جا رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو میرے کمرے میں آیا۔ اور میرے پیروں پر گر گیا۔ اور گڑگڑا کر بولا: زیزا تمہیں یاد ہے۔ تم چھوٹی سی تھیں۔ تم نے میرے پیروں پر گر کر کہا تھا: "مجھے تم سے محبت ہے" وہ ایک مذاق تھا لیکن میں مذاق نہیں کروں گا۔ زیزا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے، تمہارے خوابوں کا دیوتا ایزل پر آگیا ہے اور زیزا یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔"

کالی انگلی کا راز کھل گیا۔

اب مجھے زیزا کا ماسٹر پیس دیکھنا تھا۔

میں نے کہا:

"زیزا، میں آپ کا ماسٹر پیس دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں۔"

زیزا ایک کونے میں گئی۔ وہاں سے مخمل کے غلاف میں چھپی ہوئی پینٹنگ اٹھا لائی۔ اس کو بڑے احتیاط سے مخمل کے غلاف میں سے نکالا۔ اور تصویر کو ایزل پر رکھ دیا۔ اور مجھے آواز دے کر بولی:

"یہ ہے میرا ماسٹر پیس!"

میں ایزل کے سامنے گیا۔

اور خوشی سے نعرے کے انداز میں چلایا: "ٹیپو سلطان!"

سیاہ خام خون کا سمندر تھا۔ حرکت اور قوت کا طوفان تھا۔

میرا سر احترام سے جھک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پینٹنگ کی طرف بڑھا۔ اور میں نے انتہائی تعظیم سے ٹیپو سلطان کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

پھر میں نے اسی احترام اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ زیزا کو مخاطب کیا:

"محترمہ، آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں!"

اس نے جواب دیا: ——— "تھینک یو!"

میں نے کہا: "محترمہ، کیا آپ میری ایک تمنا پوری کر سکتی ہیں؟"

"کیا؟"

"کیا آپ مجھے اس ہاتھ کو چومنے کی اجازت دیں گی جس نے ٹیپو سلطان جیسا شاہکار پیدا کیا ہے؟"

زیزا نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے ادب سے جھک کر زیزا کی کالی انگلی کو چوم لیا۔

ایک جھونکا

احمد ندیم قاسمی

سرد جھونکا کوئی آیا کہ بگولا گذرا
آدمی ہو کہ لبِ جُو کا سرافراز درخت
اپنی نظروں میں تو قدموں سے اُکھڑتا گذرا
سر جُھکائے ہوئے، سوئے ہوئے گل یوں چونکے
جیسے بھونچال میں جاگ اُٹھتے ہیں پیڑوں پہ پرند
اور چلاّتے ہیں یوں گونجتی تاریکی میں
جیسے بستی سے بپھرتا ہوا دریا گذرا

★

دُھوپ جھلاّ کے نکلتی ہے تو ابر آتا ہے
مینہہ برستا ہے تو بڑھ جاتا ہے ماحول کا حبس
شب کی تو بات ہی کچھ اور ہے — آخرِ شب ہے
دن کو ہر چیز کا، ملبوس اُتر جاتا ہے
میری تہذیب کا پردہ — مری قدروں کا نقاب
سانپ کی کینچلی بن کر، کسی چوراہے پر
آدھے جاگے ہوئے انسان کو دہلاتا ہے

★

کن تضادوں میں تپاں ہے مری پروازِ خیال
دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل —— ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت —— ایک کو آفاق بھی کم
اور پسِ ظلمتِ تہذیب کئی صدیوں سے
چاند بننے کو ہمکتے ہیں محبت کے ہلال

طنز و مزاح:

خاندانِ کیخسرو

سیّد ضمیر جعفری

سلطان راجہ مبارز خاں حکمرانوں کے ایک معزول بلکہ اب دو صدیوں سے تو گویا مفلوج کیخسرو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ چشم و چراغ میں نے یونہی ازراہِ اخلاق و مروّت نہیں کہہ دیا بلکہ وہ لفظاً و معناً یعنی کیا محاورہ اور کیا روزمرہ ہر لحاظ سے اپنے تاریخی خانوادے کے چشم و چراغ واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً چشم کو لیجئے اور اتفاق دیکھئے کہ سلطان مبارز خاں صرف ایک ہی چشم رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی جنگل میں ایک نوآموز عقاب کو "جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے" کی مشق کرا رہے تھے کہ نامراد پلٹ کر سلطان صاحب کی پوری آنکھ ڈھیلے پتلی سمیت صاف کر گیا۔ لوگوں نے پتھر کا ڈھیلا ڈلوانے کی رائے دی مگر پتھر کی آنکھ ان کے مذاقِ لطیف پر گراں گزری۔ بعض ڈاکٹروں نے یورپ جانے کا مشورہ دیا کہ شاید وہاں کے ماہرین کسی مُردہ انسان کی کوئی ایسی نیم زندہ آنکھ ڈال دیں جو تھوڑا بہت دیکھ بھی سکتی ہو۔ لیکن سلطان مبارز خاں اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ ایک تو انہیں سرے سے سفر کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ ریل جہاز وغیرہ میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ جمہوری طرز کا سفر کرنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ چنانچہ انہوں نے کوئی پچاس برس پہلے زندگی کا پہلا اور آخری سفر کیا تھا۔ پھر یورپ جا کر انسانی آنکھ ڈلوانے میں ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ نہ معلوم کس خوانچہ فروش کی آنکھ ان کے سر تھوپ دی جائے جو خدانخواستہ ان کی زندگی کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دے۔

سوچ بچار کے بعد آخر طے پایا کہ حکمرانوں، کشورکشاؤں کو باز و عقاب کی آنکھ ہی کچھ زیب دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ کے اُصول پر اُسی عقاب کی آنکھ نکلوا کر ان کی آنکھ میں فِٹ کر دی گئی۔ مگر یہ آنکھ دُور سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ باز کی آنکھ ہے کیونکہ ہر وقت باز رہتی ہے۔ کچھ یہ آنکھ، اس کے اوپر اُن کی پھیلی ہوئی گھمبیر مونچھ، آدمی اگر کچھ زیادہ غور نہ کرے تو راجہ سلطان مبارز خاں ایک اڑتا ہوا عقاب معلوم ہوتے ہیں اور چڑی، فاختہ، کبوتر وغیرہ کی قبیل کے امن پسند پرندے تو سچ مچ ان کو دیکھتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ البتہ کوّوں کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ یہ باز کی مری ہوئی آنکھ ہے اور بازوں سے وہ غالباً کوئی خصومت بھی رکھتے ہیں کہ جب موقع ملتا ہے بیمین و یسار سے اس آنکھ پر ٹھونگ مار جاتے ہیں چنانچہ بیچارے سلطان مبارز خاں دستار پر اکثر غلیل باندھ کر باہر نکلتے ہیں۔

یہ تو تھی چشم ——— رہا چراغ تو گو زندگی کی چہل پہل کی شمع تو ان کے ہاں مدت سے گل پڑی ہے لیکن حویلی کے ایک تہہ خانے میں جس کو توشہ خانے کہتے ہیں، پیتل کا ایک قدیم چراغ پچھلی کئی صدیوں سے روشن ہے۔ روایت یہ ہے کہ خاندانِ کیخسرو کے مورثِ اعلیٰ سلطان راجہ ممار آخاں نے بہرام پور کے قلعے کی تعمیر یا تسخیر (اغلباً تسخیر کیونکہ تعمیر کی اُنہیں فرصت ذرا کم نصیب رہی)، کی خوشی میں یہ چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کیا تھا۔ اور یہ وصیت کی تھی کہ اس کو ہرگز کبھی بجھنے نہ دیا جائے۔ چراغ کے ساتھ سلطان مرحوم نے اپنی ایک شمشیر آبدار بھی توشہ خانہ میں رکھی تھی مگر چونکہ اسی کے بارے میں کوئی وصیت کرنا بھول گئے تھے لہٰذا شمشیر تو بعد میں کوئی مغل صوبیدار اٹھا کر لے گیا ——— مزید بعد وہ ایک بھونسلہ سردار اور پھر لارڈ کارنوالس کے اردلی کی کمر میں دیکھی گئی ——— ہاں چراغ آج تک برابر جل رہا ہے!

قلعہ بہرام پور کو اس خاندان کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تاریخ اصل میں چلتی ہی اسی قلعے سے ہے۔ مگر بدقسمتی سے خود اس قلعے کو کوئی خاص تاریخ نصیب نہیں ہو سکی۔ قیاس یہ ہے کہ ایک طوائف الملوکی میں، جو اس زمانے میں اکثر پھیلا کرتی تھی، یہ قلعہ سلطان ممار آخاں کے ہاتھ پڑ گیا اور دوسری طوائف الملوکی میں ہاتھ سے نکل گیا۔ اور یہ دوسری طوائف الملوکی کچھ ایسی بے قابو ہو کر پھیلی کہ اب اس قلعے کے آثار تک بھی کہیں نظر نہیں

تے۔ ویسے لوگ کہتے ہیں کہ بڑا عالیشان قلعہ تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پرگنے میں بعض دوسرے قبائل کے جو دس بارہ قلعے آج تک موجود ہیں، یہ در اصل بہرام پور کے قلعے ہی کے دمدموں، کنگروں، برجوں اور دیواروں کو اکھاڑ کر بنائے گئے تھے اور یہ خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سب قلعے وضع قطع میں حلیے، میرے پچیرے بھائی نظر آتے ہیں ـــــ قلعے کی بنیاد میں جو پتھر تھے، اُن سے پہلے تو بہرام پور کے لوگوں نے اپنے مکان بنوائے، بعد میں وہی پتھر ان کی قبروں پر صرف ہوئے اور آج نہ بہرام پور کا قلعہ موجود ہے، نہ وہ قصبہ، نہ وہ لوگ، نہ ان کی قبریں ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

کیخسرو خاندان قلعے سے ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ رکھکر جو بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں گھومتا ہوا پایانِ کار اس حویلی میں پناہ گزیں ہوا، جو اصلاً تو ایک عظیم قلعہ نما حویلی تھی مگر اب عرصے سے اس کا اصطبل ہی قابلِ رہائش رہ گیا تھا جس میں وقتاً فوقتاً جا بجا دیواریں اٹھا کر یا جہاں دیواریں نہ اٹھ سکیں وہاں ٹاٹ تان کر زنان خانے، دیوان خانے، توشہ خانے، ہاتھی خانے اور وزیر ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں وغیرہ بنالی گئی ہیں۔

معزولی کے وقت پہلے سلطان کو معقول موروثی پنشن کے ساتھ خاص بڑی زرعی جاگیریں ملی تھیں۔ مگر کئی نسلوں کی تقسیم و تفریق کے بعد اب یہ آمدنی محض ایک علامتی امتیاز رہ گئی ہے۔ جو ہرگز اس لائق نہیں کہ "وضعِ سلطانی" کے بوجھ کو جو ہاتھیوں سے نہیں اٹھتا، سنبھال سکے مگر بوڑھا سلطان مبارز خاں اسی بوجھ کو اپنے سر کا تاج سمجھتا ہے۔

محل ڈھیر ہو چکا لیکن ڈیوڑھی پر چوبدار کھڑا ہے۔ مصاحب کوئی نہیں مگر دیوانِ عام موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ نشست و برخاست کے جو قواعد سلطان راجہ جمار اخاں کے وقت میں بندھ گئے تھے، ان معمولات پر آج بھی نہایت باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ ادھر آفتاب سوا نیزے پر بلند ہوا (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نیزہ لیکر آفتاب کو ناپتا کون ہے) ادھر آپ محلسرا سے سوا جریب چل کر دالان کے ایک چبوترے پر رونق افروز ہو گئے۔ سامنے پیچوان رکھا ہے اور بازو میں ایک طشت کے اندر کلیجی کی بھنی ہوئی چند بوٹیاں، مونگ پھلی کے مغز، باجرہ، سونف اور مصری وغیرہ کے علاوہ سبز چارے کی چند چھوٹی چھوٹی گڈیاں رکھی ہیں۔ سلطان صاحب نے حقے کے دو کش لیکر آواز دی:

"وزیر ڈیوڑھی"

اور مولوی اللہ بخش جو مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، ڈیوڑھی کی ایک بغلی کوٹھڑی میں سے نکل کر دست بستہ حاضر ہو گئے۔

"کوئی عرضی پیشی؟" سلطان نے پوچھا۔

"حضور سب خیریت ہے"۔ وزیر ڈیوڑھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اور سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"میر شکار"

اس آواز پر میر شکار جو در اصل نذرو مراثی ہے، ہاتھ کے انگوٹھے پر باز بٹھائے آگیا۔ سلطان نے باز کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور طشت میں سے کلیجی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر باز کی چونچ میں رکھ دیا۔ باز کو کھونٹی سے باندھ کر تھوڑی دیر میں وہی نذرو مراثی داروغۂ اصطبل کی حیثیت میں سلطان کے سمر قندی ٹٹو کو باگ سے پکڑ لایا جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے سبز چارے کی گڈی کھلائی۔ اسی طرح پھر یکے بعد دیگرے محل کے طوطے، بٹیر، مرغ اور بکریاں سلام کو حاضر ہوئیں اور اپنے اپنے حصے کا چارہ دانہ لے گئیں۔

اب چار ساعتیں آفتاب کی طرف تکنے کے بعد یہ آفتاب کے کسی زاویئے پر منحصر ہے کہ آپ چبوترے سے اٹھ کر دیوانِ خاص میں جائیں گے، توشہ خانے میں یا واپس محلسرا میں۔

حویلی سے باہر آپ شاذ ہی قدم رکھتے ہیں لیکن تو وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ: "نکل کر پھول سے خوشبو ذلیل و خوار ہوتی ہے" ـــ اور دوسری بڑی قیامت یہ ہے کہ ان کے بزرگ ہاتھیوں پر نکلتے تھے۔ پھر چار گھوڑوں کی فٹن پر نکلتے رہے۔ رفتہ رفتہ چار کے دو گھوڑے رہ گئے۔ اور اب سلطان صاحب کے پاس جو سمر قندی ٹٹو ہے، وہ مجذوبیت کے اُس مقام پر ہے کہ اگر فٹن کو کھینچنے لگے تو فٹن اس کو کھینچ کرلے جائے۔ پھر خود فٹن کا بھی یہ حلیہ کہ اگر آپ اُس میں بیٹھ کر نکلیں تو یوں معلوم ہو گویا کسی عاشق کا جنازہ دھوم سے نکل رہا ہو۔

توشہ خانہ تو ہاتھی خانے کی طرح شاید خالی پڑا ہے۔ البتہ دیوانِ خاص کی بعض چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

مخملیں غلاف میں ایک بہت بڑی منقش، مجلّا، مطلا کتاب رکھی ہے جس میں سلطان ممارا خاں سے لیکر آج تک کے جملہ سلاطین کے روزنامچے درج ہیں۔ ابتدائی دور کے روزنامچے تلواروں اور یلغاروں کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ تلوار ہر وقت نیام سے باہر رہتی تھی۔ نیام میں غالباً راشن بھرا رہتا تھا۔ شہسواری کا یہ عالم تھا کہ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر سو جاتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خود تو گھوڑے کی پشت پر سو رہے ہیں اور گھوڑا میدان مار کر قلعہ میں واپس بھی آگیا۔ ایک سلطان نے محمد غوری کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا تو حالانکہ محمد غوری ابھی جہلم کی پہاڑیوں میں بھٹک رہا تھا کہ سلطان غزنی پہونچ کر قتل بھی ہوچکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد غوری بھی بچ کر نہ جا سکا۔ کیونکہ اس کو ادھر جہلم کے ایک "گوہر" قبیلہ نے کیخسرو سلطان کے شبہ میں قتل کردیا۔

دوسرا دور شورشوں، خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ کیخسرو سلاطین، اُس زمانے میں کبھی دشمنوں سے اور کبھی خود اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ اس دور میں کوئی دس پندرہ چچا اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ چنانچہ بھتیجوں نے چچا بننے کے خوف سے بعد میں اپنے بھائیوں کو قتل کرنا شروع کردیا۔ مصروفیت بیکار اور فتح و شکست کی بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ رانیوں کو میدانِ جنگ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح ہوتی تو دوسروں کی رانیاں گھر میں ڈال لیتے۔ چنانچہ اولادِ نرینہ کا سلسلہ عموماً دشمن رانیوں ہی کے بطن سے قائم رہا۔

ہاتھی، شیر، چیتے، عقاب وغیرہ کے شکار کے رسیا تھے۔

تیسرے دور میں اگرچہ معرکہ جوئی کا ولولہ تو سرد پڑ چکا تھا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اگر سونے کی کوشش کرتے تھے تو گر پڑتے تھے، تاہم ہنوز خاصہ دم باقی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں کا "طوطا" بول رہا تھا۔ سکھوں سے ابتداءً ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے مگر پھر ایک ذرا سی غلط فہمی پر ان سے لڑائی چھڑ گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ ٹہل سنگھ یا میوہ سنگھ نامی ایک سکھ جرنیل مع لشکر ان کے ہاں اترا ہوا تھا کہ ان کے ایک سادہ لوح رکاب دار نے مدارات کے طور پر حقّہ لاکر اُس کے سامنے رکھدیا۔ اس پر وہ تلوار چلی کہ جب تلوار تھمی ہے تو اس علاقے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوچکا تھا۔ خاندانِ کیخسرو میں یہ لڑائی ــــــ "حقّوں کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی کامیابی میں کیخسرو خاندان کے اس حقّے کا بہت اہم حصہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بعض انگریز حکّام چاندی، تانبے، پیتل وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے حقّے تحائف و یادگار کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں رکھنے اور ولایت بھیجتے تھے۔

چوتھے دور میں جو راجہ سلطان مبارز خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے؛ روزنامچہ میں کچھ اس قسم کے اندراجات ملتے ہیں:۔

"دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے حقّہ پیتا رہا۔"

"سلطان طہماسپ خاں کے کمربند کو دیمک چاٹ گیا۔"

"مردان سے عمدہ نسوار منگوائی ہے۔"

"چترالی عقاب بیمار ہے۔"

"اس زور کی آندھی چلی کہ دیوانِ عام کی چھت اُڑ گئی۔"

"ہاضمہ سخت خراب ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

یہ اندراجات بھی سلطان مبارز خاں کے ابتدائی روزنامچوں میں ملتے ہیں۔ ورنہ بعد میں تو انہوں نے اپنے شاہی روزنامچہ میں دورہ پر ادھر آنے والوں افسروں سے ریمارکس اور سرٹیفکیٹ لکھوانے شروع کردیئے ہیں۔ چنانچہ پونا ہارس کے ایک میجر ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہڈسن صاحب سلطان مبارز خاں کی مونچھوں، ان کی حویلی کی محرابوں، بازکی ٹانگوں میں بندھے ہوئے گھنگھروں اور ان کے باورچی خانے کی تعریف میں پورے دو صفحات لکھ گئے ہیں۔ آخری ریمارک ایک سب ڈویژنل افسر مسٹر ایلن ہارسٹلے کا لکھا ہوا ہے جس پر یکم اپریل سنہ ۱۹۲۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ آزادی کے بعد سے

روزنامچہ خالی پڑا ہے۔ سلطان مبارز خاں کہتے ہیں کہ اب ہم ریمارک لکھوائیں تو کس سے لکھوائیں۔ جو افسر آتا ہے وہ پہلے کبھی نہ کبھی اسی علاقے میں قانونگو، گرداور، تحصیلدار، تھانیدار رہ گیا ہے۔ رہے بڑے سینیئر افسر تو وہ نہ معلوم کس افراتفری میں مبتلا ہیں کہ دورے پر کبھی اس طرف آتے ہی نہیں۔ آتے ہیں تو نہ انھیں شکار کھیلنے کا شوق نہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے ریمارک لکھواتے ہوئے کچھ شرم سی آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اگر تاریخی واقعات کی اوسطی صد نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان خاندان کے سلاطین اکثر و بیشتر دوسرے مسلمان سلاطین کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

باز و عقاب سے شکار کھیلنا کیخسرو خاندان کا مرغوب مشغلہ رہا ہے چنانچہ آج بھی کوئی بیس پچیس نامی گرامی عقاب، جن کی کھال میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ خاص کی دیواروں پر جابجا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ہر عقاب کے نیچے ایک تختی لگی ہے جس پر خطِ نسخ کوفی میں فارسی کا کوئی مشکل سا شعر کندہ ہے اور اس کے نیچے مرحوم عقاب کی مختصر سی سوانح عمری ——— آخری عقاب وہ ہے جس کی آنکھ نکلوا کر خود سلطان مبارز خاں نے اپنی آنکھ میں فٹ کروا رکھی ہے۔

دیوانِ خاص میں آبنوس کا ایک بہت بڑا چوبی بورڈ آویزاں ہے جس پر عہد بعہد کے مصوروں نے سلاطینِ کیخسرو کی تصاویر بنا رکھی ہیں۔ مورثِ اعلیٰ سلطان ممارا خاں کی تو قدِ آدم تصویر موجود ہے۔ مگر باقی سلاطین کے گردن تک صرف چہرے ہی دکھلائے گئے ہیں لیکن اس سے تصویر میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی کیونکہ بعد کے تمام سلاطین وہی سلطان ممارا خاں کا چغہ، کمربند اور پاجامہ پہنتے تھے۔

چہروں میں بھی مصوروں نے زیادہ کمال مونچھوں پر صرف کیا ہے کہ مونچھ اس خاندان کی قومی و تاریخی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ تصاویر کا یہ بورڈ عملاً گویا مونچھوں کا ایک کیلنڈر ہے جس میں بڑی بڑی جابر، گھنی اور گھمبیر، بلند و بالا مونچھیں نظر آتی ہیں۔ بعض سلاطین کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ مونچھوں کے دونوں کونوں پر الگ الگ دو تلواریں لٹکا کر چلا کرتے تھے۔ داناؤں کا کہنا ہے ان مونچھوں کے طول بلد اور عرض بلد سے خاندانِ کیخسرو کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جن سلاطین کی مونچھیں شاندار تھیں۔ ان کا دورِ حکومت بھی شاندار ثابت ہوا۔ خود بوڑھے سلطان مبارز خاں کی مونچھیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس پیری و ضعیفی میں اتنی گنجان مونچھیں یہ کہاں سے لائے ہیں اور اتنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ اتنا بوجھ لیکر چلتے کس طرح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سلطان مبارز خاں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اُن کی مونچھوں کو دوسرے میں، تو مونچھوں والا پلڑا شاید کچھ بھاری ہی نکلے۔ بہرحال سلطان مبارز خاں کی مونچھیں گھنی بھی ہیں، گنجان بھی ہیں، اور ان کا رُخ بھی ہنوز اوپر کی طرف ہے اور سلطان مبارز خاں خوش ہیں کیونکہ خاندان کا ستارۂ عروج انہیں مونچھوں سے بندھا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ستارہ بلندی کی طرف جا رہا ہے۔

★

قلوپطرہ کا رومانی سفر

ولیم شیکسپیئر
مترجمہ: رفیق خاور

(نظم کی پہلی ڈولتی بحر میں دریا کی لانبی لانبی، ہولے ہولے لپکتی لہروں کا سماں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح الفاظ میں بھی اس شاہانہ سفر کے کروفر اور دریا کے ٹھاٹھ کے ساتھ مختلف سُروں اور آوازوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔)

سفینہ جس میں بیٹھی تھی وہ ملکۂ پری وشاں
غضب تھا اس کے تیرنے کا جادو بھرا سماں
دھیرے دھیرے تیرے جیسے تختِ رواں کوئی
وہ اس کی چمک دمک، وہ اس کی دہکتی لَو
ہو دریا کے دل میں جیسے آگ سی لگی ہوئی
وہ کشتی بھلا کہاں سنہری سریر تھا
بھبوکا سی روشنی تھی، پانیوں کی تھرتھری
یہ عالم کوئی کہے کہ اک ٹکڑا امبر کا
چٹخ کر بھڑاکے سے ہو پانی میں گر پڑا
وہ دنبالہ سونے کا ڈھلکتا، شفق نما
شعلۂ طور بھی جس کے آگے جھک جھک کرے سلام
وہ خوشرنگ بادبان عطر میں بسے ہوئے
سماں ہو بہو جیسے بادلوں میں پینگ[1] کا
وہ خوشبوئیں کہ ان پر ہوا لوٹ لوٹ جائے
جو اک بل ادھر پڑے تو یاں بل پہ بل پڑیں
وہ چپو جیسے سانچے میں نور کے ڈھلے ہوئے
ملے جلے سنہری روپہلی، شعاع وار
اور ان کے نیچے موج جیسی کشتی کی آن بان
تمام جیسے نیلم ایسی انگھڑیوں کے خم یہ ہوں

نفیس ہلکی ہلکی نرم پلکوں کی جھالریں
تھپکتے پانیوں کو تھے کچھ اس طرح سے دمبدم
نفیریوں کے میٹھے میٹھے زمزموں کے ساتھ ساتھ
کہ تال مست ہو کے پانی ناچتا تھا اور بھی
ہمک ہمک کے پاس آ کے اک تھاپ اور بھی!
وہ کامدار سائباں، حریری سنہری بھی
اور اس کے تلے وہ حور لیٹی تھی ناز سے
وہ پیکر کی آن بان، جوبن کی دھوم دھام
مجال کیا بیاں کرے جو کوئی حسن کی ادا
کہ بول اس کے سامنے تھے کھوئے قدرتِ بیاں
کوئی کہے کہ وینس کے ساحروں نے زہرہ کی
عجیب ہی ہنر سے جو تراشی ہے مورتی
بعینہٖ وہی ہے یہ وہی وہی وہی وہی!
مگر جو دیکھیں غور سے تو وہ بت تھا یہ پری
مقابلہ ہی کچھ نہ تھا کچھ ایسی گداز تھی
تھا انگ انگ اس کا نیر، سیال چاندنی
جو تن سیمِ خام کا تو مکھڑا نرا کنول
کہ فطرت ہو پانی پانی اس کے ڈھلاؤ سے
اِک اس طرف اک اُس طرف دو لڑکے پری جمال
کمال کے بھنور تھے جن کی ٹھوڑیوں کی اوٹ میں
وہ مسکاتے جس طرح ہوں کیوپڈ ہی ہو بہو
اُتر کر جو آئے ہیں ابھی آسمان سے
وہ جھلتے تھے مورچھل تو اللہ وہ سماں!
کہ جن نرم نرم گالوں کو ہولے سے ٹھنڈ دیں
وہ گال دہکتے تھے، بھڑکتے تھے اور بھی
اِدھر جو کام وہ کریں ادھر تمام پٹ کریں!

---

[1] پنجابی قوس قزح

فن :

ہماری موسیقی میں جدید تجربے

انور عنایت اللہ

کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی سماجی زندگی میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور شاید اسی لئے فنونِ لطیفہ میں موسیقی کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ موسیقی کا تعلق حسِ سمع سے ہے۔ موسیقار گویا ہوا میں گرہ لگاتا ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور نازک فن ہے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح یہ آنکھوں کے سامنے ٹھہرا نہیں رہتا۔ شاعری، اصنام گری، تعمیر اور مصوری کی طرح اس کی کوئی دیرپا شکل نہیں ہوتی کہ اس میں اصلاح و ترمیم ہو سکے یا کسی بہتر فنکار سے امداد لیکر اس کے حسن میں اضافہ کیا جا سکے۔ مغنی کو بروقت کمالِ فن کے ساتھ نغمہ کی ایک تصویر ہوا میں بنانی پڑتی ہے اور اس تصویر کو ایک مختصر یا محدود وقت میں اس درجہ مکمل بنانا پڑتا ہے کہ سننے والا زیادہ سے زیادہ سرور حاصل کر سکے۔

"سُر" موسیقی کی اکائی ہے جو ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ارتعاش ضرب سے پیدا ہو، خواہ رگڑ سے، خواہ ہوا سے۔ گانے اور ساز، دونوں کی موسیقی کی بنیاد ہی ارتعاش ہے۔ جیسے جیسے ارتعاشات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، سُروں کی آواز چڑھتی جاتی ہے اور ایک حد ایسی آتی ہے کہ تیز سے تیز تر آہنگ میں یہ سُر پھر اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں۔ غالباً اسی اُصول سے، برسوں پہلے، فیثاغورث کو سُروں کی سپتک متعین کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ اُس نے سات سُروں کی ایک بنیادی سپتک مقرر کر دی جسے ہماری موسیقی میں بلاول کی سپتک کہتے ہیں۔ اس میں سات سُر مقرر کئے گئے۔ "سا، رے، گا، ما، پا، دھا اور نی" بعد کو ان کے علاوہ پانچ اور درمیانی سُر تشخیص کئے گئے۔ ان ہی بارہ سُروں میں دنیا کی تمام موسیقی سمائی ہوئی ہے۔ یہ وہ سُر ہیں جنہیں گوشِ انسانی آسانی سے تمیز کر سکتا ہے۔

ہماری موسیقی کی بنیاد راگوں پر رکھی گئی ہے۔ راگ چند خوش آہنگ سُروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بارہ سُروں کے امتزاج سے لاکھوں متفرق شکلیں بن سکتی ہیں۔ ان ہی مختلف شکلوں کو راگ راگنیوں سے موسوم کیا گیا۔ ان ہی راگ راگنیوں پر ہماری کلاسیکی موسیقی مشتمل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سے میری مراد ہماری وہ موسیقی ہے جو صدیوں پُرانی ہے اور جسے عوام پکے گانے اور فنی موسیقی کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی اس علاقے کی تہذیب و تمدن کی طرح بے حد قدیم ہے۔ لیکن ابتدائی زمانے میں موسیقی اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ ساز بھی گنے چنے ہی ہوتے تھے اور انہیں شاذ و نادر گانے یا ترنم سے اشلوک پڑھنے والوں کے ساتھ بجایا جاتا۔ جب رفتہ رفتہ موسیقی نے ترقی کی تو اس نے دُھرپد کی شکل اختیار کی۔ اس صنف کو بھی مسلمان فنکاروں نے ترقی دی۔ اس کو ہماری موسیقی کی سب سے قدیم شکل سمجھئے۔ یہ نہایت سادہ اور مردانہ طرز کا گانا ہوتا ہے جس میں خدا کی حمد کی جاتی ہے یا شجاعت اور تاریخ کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد 'خیال' گائکی کی ابتدا ہوئی۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ دُھرپد میں تانوں کی اجازت نہیں ہے۔ اس بندش سے بچنے کے لئے غالباً 'خیال' کا رواج ہوا جس میں ایک مخصوص ہیئت کے اندر برجستہ تان پلٹوں کے ذریعے تزئین و آرائش کی بہت گنجائش رکھی گئی ہے۔

مسلمان عرب اور ایران سے آئے تو اپنے ساتھ ایک نئی ترقی یافتہ تہذیب لائے۔ ہندوستان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جہاں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں انقلابات پیدا کئے وہاں مقامی موسیقی کو کچھ اس طرح اپنایا اور اس میں اتنی نمایاں تبدیلیاں کیں کہ آج تک یہ اسی نہج پر قائم ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لیکر روشن آرا بیگم اور نزاکت علی سلامت علی تک بیسیوں اساتذہ نے اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اس کی نشوونما میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آج جو فنِ موسیقی برصغیر میں رائج ہے وہ صرف مسلمانوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف خیال، ٹھمری، دادرا، ٹپہ، غزل وغیرہ گانے کا سلسلہ رائج کیا بلکہ سازکی موسیقی کے سلسلے میں بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ طبلہ، ستار، دلربا، سارنگی، سرود، رباب،

وچترو بینا وغیرہ سب کی ایجاد اور ساز کی موسیقی پر صدیوں سے چھائے رہنے کا سہرا مسلمان فنکاروں ہی کے سر ہے۔

ایک عجیب اتفاق دیکھئے کہ جس موسیقی کو صدیوں تک مسلمان موسیقاروں نے اس قدر محنت و مشقت سے پروان چڑھایا۔ اس کو مندروں اور درباروں کے شکنجے سے آزادی دلائی اور عوام تک پہنچانے کی سالہا سال کوشش کی، اس کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا جب عوام اس سے دُور بھاگنے لگے۔ اس کی بھی بڑی معقول وجہ ہے۔ شروع شروع میں ہماری موسیقی نے شاہی سرپرستی میں ترقی کی جس سے یہ بڑی حد تک حکمرانوں کے درباروں کا اجارہ بن کر رہ گئی۔ دوسرے لفظوں میں نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ کلاسیکی فن کی پابندیاں عوام کو نہیں بھاتیں تو ٹھمری دادروں کا رواج ہوا۔ یہ عوام کا من دوبارہ موہ لینے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ اس کا سہرا تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے سر ہے جو موسیقی میں اختر پیا تخلص فرماتے تھے۔ اس کے بعد ایرانی اثرات کے تحت غزلیں گانے کا رواج ہوا۔ موسیقی کی یہ نئی طرز طوائفوں کو بہت بھائی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سرپرستوں کی تفریح کے لئے زیادہ تر غزل اور پھر اس کے بعد ٹھمری دادرے کو اپنایا جن میں نرت کے ذریعے سامعین کو بھلانے کی بڑی گنجائش تھی کبھی کبھار بندھے ہوئے خیال کو بھی بحروں میں جگہ دی جانے لگی۔ ان سب تغیرات کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ موسیقی ایک ایسے طبقے کی میراث بن گئی جسے عوام اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی مشکل تیکنک کے ساتھ ساتھ اسے گانے والی طوائفوں کی سوقیانہ اور غیر سنجیدہ حرکتوں نے اس کو خاصہ بدنام کردیا چنانچہ تعلیمیافتہ شریف طبقہ اس سے دُور بھاگنے لگا۔ اب حالات یہ ہیں کہ صرف "گلے بازی" اور کسی راگ یا راگنی کی گرامر کی وضاحت یعنی دوسرے لفظوں میں بے معنی اور بے ہنگم شور و غل کو لوگ کلاسیکی موسیقی سمجھنے لگے ہیں۔ اس کی ذمہ داری فن کی اس نوع سے زیادہ اُن استادوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی لاعلمی کے باعث آواز کے حسن، ادائیگی کے مناسب اور متناسب اُصولوں اور سننے والوں کے میلانِ طبع سے زیادہ راگ کی گرامر اور آواز کی شعبدہ بازی کو اہمیت دینے لگے۔

یوں تو تھیٹروں اور فلموں نے موسیقی کو عوام الناس سے قریب لانے اور مقبول کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں لیکن سائنٹیفک اُصولوں پر پہلے گراموفون اور پھر ریڈیو ہی کی آمد سے موسیقی کی ترویج شروع ہوئی۔ اچھی موسیقی کو پہلی بار گھر گھر تک پہنچانے کا سہرا گراموفون اور ریڈیو ہی کے سر ہے۔ پاکستان میں اب تک اچھی موسیقی کو عوام میں مقبول کرنے کی کوششیں سب سے زیادہ ریڈیو ہی نے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں جدید تجربے بھی ریڈیو ہی پر کئے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کے احیائے ثانی کا دور ۱۹۴۸ء کے بعد شروع ہوا۔ شروع ہی سے یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اِس قدیم فن کے متعلق عوام میں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو دور کیا جانا بے حد ضروری تھا۔ سب سے زیادہ ضرورت اِس بات کی تھی کہ کلاسیکی موسیقی کا صحیح روپ عوام کے سامنے پیش کیا جاتا تاکہ وہ اچھی اور بری موسیقی کا فرق محسوس کر سکتے۔ اس سلسلے میں فلم والوں کے بعض تجربے مفید ثابت ہوئے۔ جنھوں نے یہ ثابت کردیا کہ اگر کسی بھی راگ یا راگنی کو صحیح اور معقول طریقے پر پیش کیا جائے تو عوام اِس کا بھی اتنے ہی جوش و خروش سے استقبال کر سکتے ہیں جتنا کہ عام ہلکے پھلکے گیتوں کا۔ عرصہ ہوا استاد جھنڈے خاں مرحوم نے ایک مشہور فلم "چتر لیکھا" میں ایک انتہائی دلچسپ تجربہ کیا تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ انہوں نے اس فلم کے تمام گانوں کی دھنیں ایک ہی راگ "بھیرویں" میں باندھی تھیں۔ اس کے تمام نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد ہماری فلموں میں ایک سے زیادہ گیتوں کو خالص راگوں میں پیش کیا گیا۔ مثلاً خورشید انور نے پاکستانی فلم "انتظار" میں نورجہاں سے ایک گیت ٹوڈی میں گوایا۔ خورشید انور ہی کی ایک دوسری فلم "زہرِ عشق" میں ایک نغمہ راگ پیلو میں ہے جسے ناہید نیازی نے گایا ہے۔ اسی طرح فلم "قسمت" میں روشن آرا کی گائی اور باندھی ہوئی ایک ٹھمری ہے اور فلم "وعدہ" میں نائک سدا رنگ کا مشہور درباری کا خیال ہے "نین سے نین ملائے راکھو نیکو بلماں" جسے پاکستان کے دو اچھے کلاسیکی موسیقاروں، زاہدہ پروین اور فتح علی خاں نے مل کر گایا ہے۔ اگرچہ یہ تمام گانے راگوں کے پابند تھے۔ پھر بھی یہ عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان تجربوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کردیا کہ جہاں تک کلاسیکی موسیقی کی عوام میں نامقبولیت کا تعلق ہے، قصور موسیقی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا تھا جو راگوں کی روح اور اس کے صحیح تاثرات کو سمجھنے کی بجائے ان کی ظاہری وضع پر جان دیتے تھے۔ گانے والوں کے مختلف گھرانوں میں اختلافات کے باعث ہر موسیقار بڑی تندہی سے کوشش کرنے لگا کہ راگوں کو ثقیل سے ثقیل تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس سے بتدریج راگوں کا روپ اس قدر بھیانک ہوتا گیا کہ لوگ ان سے دور بھاگنے لگے۔

ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پاکستان میں سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ راگوں کے قالب سے زیادہ ان کی روح کو اہمیت دی جائے۔ عوام کو راگوں سے مانوس کرنے کے لئے ریڈیو نے ایک دلچسپ تجربہ یہ کیا کہ غزلیں اور گیت راگوں میں پیش کئے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام "راگ رنگ" شروع کیا گیا جس میں سامعین کی موجودگی میں ایک ہی خیال کو کئی فنکاروں نے مل کر گانا شروع کیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ پہلی بار سب نے مل جل کر راگ کے صحیح روپ، اس کے صحیح تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ورنہ اب تک تو ہر استاد کو صرف اپنے ہی فن کے مظاہرے کی فکر ستایا کرتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس شعبدہ بازی میں راگ کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ فنکاروں کو ایک ساتھ کوئی راگ پیش کرنا پڑا تو "گلے بازی" اور "شعبدہ بازی" بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ یہ سلسلہ اب بھی ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے، اس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔

عوام میں ہماری موسیقی کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک اور دقت 'خیال' کے بولوں کی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ عوام اس وقت تک کسی نغمے کو قبول نہیں کر سکتے جب تک ان کے بول، چاہے یہ نغمے کلاسیکی ہوں یا ہلکے پھلکے، معقول نہ ہوں۔ چونکہ ہماری موسیقی کی ابتدا صدیوں پہلے دیوتاؤں کے مندروں میں ہوئی۔ اس لئے اکثر قدیم راگوں کے بول بھجنوں کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ پہلے عظیم موسیقار تھے جنہوں نے پہلی بار راگوں کو ان سنسکرت بولوں اور دیوی دیوتاؤں کی شان میں قصیدوں کے چکر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ان کے باندھے ہوئے بول ملاحظہ فرمائیے :-

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال
بیش خواجہ تم بن ٹھن آئے حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

اور ——

نجام الدین پیراولیا
نجام الدین شان امبیا
خسرو آن پڑے چرنن میں، کرپا کرو بہر کریا
نجام الدین پیراولیا

یہ سلسلہ حضرت امیر خسرو سے لیکر میاں تان سین، محمد شاہ رنگیلے کے درباری گوتیے سدا رنگ اور بہادر شاہ ظفر تک جاری رہا اور نئے نئے بول باندھے گئے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایک ایسا دور بھی آیا جب موسیقی چند مخصوص گھرانوں کی میراث بن کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو بول ورثے میں ملے۔ اُن میں ترمیم کو بدعت قرار دیا گیا۔ اور اس طرح ہم تک زیادہ بول ایسے آئے جو نہایت فرسودہ اور بے معنی تھے۔ بہت جلد سمجھدار لوگوں کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ عوام ان بے معنی بولوں کی وجہ سے بھی کلاسیکی موسیقی سے دور بھاگتے ہیں۔ اب ہماری موسیقی کے اِس اہم پہلو کے سلسلہ میں بھی بعض اچھے تجربے ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہی لوگ کام آسکتے ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہوں اور جنہیں عروض کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ راگوں کے تاثر کی بھی سوجھ بوجھ ہو۔ چنانچہ بعض ایسے ہی ذہین فنکاروں نے اب اس کی طرف دھیان دینا شروع کیا ہے جن میں اوروں کے علاوہ افضل پرویز اور "خوش رنگ پیا" نے اچھے اچھے نئے بول باندھے ہیں۔ اول الذکر کے باندھے ہوئے راگ بھیروں کے خیال کے بول ملاحظہ ہوں (تال چوتالہ) :-

استھائی :- "نور سحر پھیلا ہے ہر سو، جھلمل کرتے نیارے تارے سارے لرز رہے ہیں —— نور سحر ۔ ا

انترا :- "چھٹنے کو ہے گھور اندھیرا —— کوچ ہو لے ہے رین کا ڈیرا —— اندھیارے کے سنگی تارے لاج کے مارے لرز رہے ہیں —— نور سحر ۔؟

بھیروں صبح کا راگ ہے۔ اس کی مناسبت سے خیال کے ان بولوں کا تاثر بہت عمدہ ہو جاتا ہے۔

"خوش رنگ پیا" کے یہاں بھی راگوں کا صحیح تاثر ملتا ہے۔ ان کے دلکش اور سادہ بول اب اکثر ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال درباری کے بول ملاحظہ فرمائیے :-

"نظر کرم فرماؤ —— گوہر طرب برساؤ —— درباری کے گن جن، مل کے خوش رنگ کے سنگ —— داتا کے گن گاؤ —— گوہر طرب برساؤ —— نظر کرم فرماؤ"

اور غالباً یہ بھی خوش رنگ ہی کے بول ہیں۔ یہ 'خیال' بہار ہے جو ایک تالہ میں گایا جاسکتا ہے :۔

استھائی :۔ "آئی ہے بہار قلب و نظر کا قرار"

انترا :۔ "زندگی سپنا تو نہیں ہے ـــ جلوہ ہے پردا تو نہیں ہے ـــ کا کلیں سنوار آئی ہے بہار ـــ !"

پاکستان میں لوک گیتوں کا سرمایہ ایسا ہے جس پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ریڈیو ہی نے ہلکے پھلکے گانوں کے لئے ان لوک دھنوں کو بڑی کامیابی سے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لوک دھنوں میں اکثر گیت بھی نشر کئے جاتے رہے ہیں اور غزلیں بھی۔ اس کے علاوہ ایک علاقے کی دھنوں میں دوسرے علاقے کے گیت کی طرزیں بھی کانوں کو بھلی لگتی ہیں۔ مثلاً بھٹیالی کی دھن میں کوئی پنجابی گیت یا ہیر کی دھن میں کوئی بنگالی نغمہ۔ ابھی یہ تجربہ بھی عبوری دور سے گذر رہا ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ سلسلہ عوام کو بہت پسند آئے۔

ہماری موسیقی میں اب تک انفرادی کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی لئے ہمارے یہاں شروع سے مغربی انداز میں آرکسٹرا کبھی پنپنے نہیں پایا۔ کئی سال ہوئے قیام پاکستان سے پہلے استاد علاء الدین خاں نے بعض تجربے کئے تھے۔ اس کے بعد فلموں نے آرکیسٹریشن کی کوشش کی۔ ان کوششوں کو ریڈیو نے اپنایا اور اب اس سلسلے میں بھی خاصے کامیاب تجربے کئے جارہے ہیں۔

خیال کے نئے بولوں کے سلسلے میں تو نہیں لیکن راگ راگنیوں کو اچھے اشعار کے روپ میں ڈھالنے کی بعض دوسرے شعراء نے بھی خاصی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مثلاً قتیل شفائی، سیف الدین سیف، مختار صدیقی، احمد راہی وغیرہ۔ یہ تجربے اس لئے بھی اہم ہیں کہ راگوں کے تاثر کو شعر کے قالب میں پیش کرنے کی غالباً یہ پہلی کوششیں تھیں۔

شعر و نغمہ کے ذریعے سامعین کے ذہن میں مختلف تاثرات پیدا کرنے کے بھی بعض تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں رفیق غزنوی نے عرصہ ہوا صرف سازوں کی مدد سے ایک دلچسپ کوشش کی تھی۔ اس پروگرام کا عنوان "سناٹا" تھا۔ صرف آوازوں کی مدد سے تصویر کشی خاصا مشکل کام ہے کیونکہ صوتی اثرات کا بھلا تصویروں سے کیا تعلق۔ لیکن متذکرہ بالا ریڈیو پروگرام میں مختلف آوازوں کے ذریعے، ان کے اتار چڑھاؤ اور ایک خاص انداز میں، مختلف سازوں کی ہم آہنگی سے سناٹے کو ابھارنے کی خاصی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، عربی اور عجمی موسیقی کے میل ملاپ کے بعد ہی ہماری موسیقی نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ غالباً اسی لئے قیام پاکستان کے بعد سے اردو غزلوں اور گیتوں کو عربی اور ایرانی دھنوں میں پیش کرنے کے تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں دقت یہ آن پڑی کہ ادھر ہم نے تو خالص عربی اور ایرانی دھنوں کو اپنانے کی کوشش کی اور ادھر عرب اور ایران میں موسیقی نے کچھ اور ہی رخ اختیار کیا۔ وہاں موسیقار اب "میلوڈی" کو خیرباد کہہ کر بڑی تیزی سے "ہارمنائزیشن یعنی تالیفی موسیقی کی طرف جارہے ہیں۔ اسی لئے آئے دن وہاں خالص مغربی موسیقی کو مکمل طور پر اپنانے کی پُرخلوص کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض موسیقاروں کا رجحان کچھ ایسا ہی ہے "ہارمنائزیشن" کے تجربے ہورہے ہیں۔ لیکن ہماری موسیقی کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ شاید ہی وہ مغربی رنگ آسانی سے قبول کرسکے۔ اسی لئے ہمارے خالص دیسی سازوں پر یہ بدیسی نغمے کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔

اِن کے علاوہ آئے دن ہماری فلموں میں بھی بعض عجیب و غریب تجربے کئے جارہے ہیں۔ پچھلے سات آٹھ سال کی پاکستانی فلموں کا جائزہ لیا جائے تو بڑے خطرناک رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں۔ میرا اشارہ ہماری فلمی موسیقی پر مغرب کے اثرات کی طرف ہے۔ میں ان اثرات کا مخالف نہیں کیونکہ میرا یقین ہے کہ فن کی کسی بھی نوع کی صحیح نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ وہ مناسب حد تک بیرونی اثرات قبول کرسکے۔ لیکن ان دنوں جس قسم کے رجحانات کارفرما ہیں۔ وہ موسیقی کو غلط راستے پر لئے جارہے ہیں۔ بدقسمتی سے آجکل ہماری فلموں میں جس قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی ہورہی ہے اسے خود مغرب میں کبھی اعلیٰ درجہ کی موسیقی نہیں سمجھا گیا۔ جیز اور ریگ ٹائم وغیرہ کا رونا ہی کیا، اب تو راک اینڈ رول کی قسم کی بھونڈی موسیقی کی نقالی بھی شروع ہوگئی ہے۔ فنی طور پر یہ تجربے غلط ہیں۔ ان سے ہماری موسیقی کے مزاج کو نقصان پہنچنے کے امکانات ہیں اگر فلمی موسیقی کے معیار کو بلند کرنا ہے تو اس نقالی کی خطرناک وبا کو فوراً سختی سے روکنا ہوگا۔ اس کا سدباب ضروری ہے ورنہ مجھے یقین ہے ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو اُس روایتی کوّے کا ہوا تھا جس نے اپنی چال بھول کر ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔

غزل

تابشؔ دہلوی

کبھی دنیا سے کوشش بھی اگر کی دور جانے کی
ہمارے پاؤں میں زنجیر تھی گردش زمانے کی

جراحت ہے تبسّم کا نتیجہ، باوجود اس کے
گلوں کو دیکھ کر کرتا ہوں کوشش مسکرانے کی

ہوائے فصلِ گُل رکھتا ہے پیہم اس خرابی پر
ابھی چھوٹی نہیں ہے دل کی عادت زخم کھانے کی

حیاتِ جاوداں بخشی گئی اہلِ محبّت کو
تمنّا رہ نہ جائے تجھکو خنجر آزمانے کی

یقیں کرتے ہیں اب وعدہ ہو یا وہ عذرِ وعدہ ہو
کہ ہم لیتے ہیں لذّت اس طرح تیرے بہلنے کی

دلِ حیراں کو اک نقشِ تصور کے سوا حاصل
ترا اس طرح آنا، ایک صورت ہے نہ آنے کی

ہمیشہ ٹوٹ کر گرنے کو ہے بیتاب اے تابشؔ
یہ ہے برقِ بلا یا شاخ کوئی آشیانے کی

نظرؔ حیدرآبادی

ملا نہ فصلِ گُل و وصلِ گُل رُخاں سے مجھے
فغاں کہ چین میسر ہوا فغاں سے مجھے

وہ اور ہوں گے اکیلے گئے جو منزل تک
نشانِ راہ ملا گردِ کارواں سے مجھے

شباب، شعر، ترنّم، شراب، حسن، سرور
حیات لے کے چلی ہے کہاں کہاں سے مجھے

بتاؤ کیوں نہ کروں ایسے حادثوں کو سلام
گذارتے ہیں جو ہر راہِ امتحاں سے مجھے

ملے ہیں کتنے خرد آزما رموز نہ پوچھ
جنوں کی چند حکایاتِ خونچکاں سے مجھے

ابھی تو قصّۂ آدم تمام ہونا ہے
مگر یہ کس نے پکارا ہے درمیاں سے مجھے؟

بچا لیا غمِ دوراں کے تازہ مضموں نے
قفس سے، دام سے، بجلی سے، آشیاں سے مجھے

نظرؔ زبانِ غزل سے فروغِ نظم ہوا
ملا یہ نکتہ تری شوخیٔ بیاں سے مجھے

شرق

(ایک مغربی سیاح —

پاکستان میں جو آٹھ کروڑ لوگ آباد ہیں ان میں سے آدھے مشرقی پاکستان میں بستے ہیں اور اگرچہ یہ مغربی پاکستان سے گیارہ سو میل دور واقع ہے، پھر بھی پی آئی اے کے تیز پرواز طیارے اس طویل فاصلے کو ایک ہی رات میں طے کر کے صبح سے پہلے ہی یہاں کے پُرسکون دارالحکومت ڈھاکہ پہنچا دیتے ہیں جہاں سمندر کی مخصوص بو ہواؤں میں رسی بسی ہوتی ہے اور لہلہاتی ہوئی ہریاول ہر طرف وہ جادو جگاتی ہے جو گرم مرطوب علاقوں کی روحِ رواں ہے۔ اور انسان کو کراچی کی بین الاقوامی فضائیں بھلا دیتی ہے جیسے یہ بڑی دور کی چیز ہو۔

کئی اور حیثیتوں سے بھی مشرقی حصہ کی رفتارِ زندگی بہت مختلف ہے۔ یہاں زندگی ہولے ہولے پگ بھرتی ہے اور مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی ہاؤ ہو اور ریل پیل بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ، جس کی بنیاد بنگال کے مغل نواب نے رکھی تھی، اپنی پتھر کی ہموار بل پیچ کھاتی سڑکوں اور بہت بڑے ٹاپو کے باوجود بدستور اپنی مشرقی وضع لئے ہوئے ہے۔ گو اُردو اور انگریزی سارے مشرقی پاکستان میں بولی اور سنی جاتی ہیں، لیکن مقامی زبان بنگالی ہی ہے۔

مشرقی پاکستان کی دلکشی اس کے مخصوص وضع کے لوگوں میں مضمر ہے۔ بعض فرنگیوں کی طرح بالکل صفاچٹ، بعض لمبی لمبی داڑھیوں والے یعنی اسرائیلی فریسیوں اور فقیہوں کی طرح ریشائیل اور بعض بودھی چپ چاپ، چلچلاتی دھوپ میں ننگی چندیا کے ساتھ رواں۔ ایشیا کا پس منظر اس ملک میں کہاں نہیں؟ وہ برمی وضع کے پگوڈا، وہ سیامی وضع کے راہب خانے، کسی گلی یا پہاڑی پر جھرمٹ بنائے، مسجدوں سے دور — اور پھر کہیں کہیں گرجے بھی۔

ڈھاکہ کی اپنی ہی انفرادیت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ اس کا ماضی اس کی پرشکوہ عمارتوں میں محفوظ ہے۔ مثلاً لال باغ جس میں بی بی پری کا مزار ہے۔ ان عمارات کی نادر طرح اور کاریگری مغل دور کی صناعی کا دل آویز نمونہ ہے۔ یہاں شاہجہاں نے بڑے بڑے شاندار محل بنائے۔ تمام مسجدیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوؤں کے مندر اور بھی کشش رکھتے ہیں۔ مسافروں کے لئے ایک تقریباً نیا ہوٹل "شاہ باغ" تیار ہوا ہے جو ایک عظیم الشان حویلی معلوم ہوتا ہے۔ تمام فرشوں پر سنگ مرمر کے اتنے ستون نصب ہیں کہ بے اختیار کسی کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

"مجھے خواب آیا کہ میں ایک ایوانِ مرمر میں آسودہ ہوں!" سامنے نظر اٹھا کر دیکھیں تو ہرے بھرے تختوں پر نیا ریڈیو اسٹیشن ایک قلعہ کی طرح سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اور "شاہ باغ" کی چمک دمک کے ساتھ اپنی آب و تاب ملا کر خوب جگمگ جگمگ کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے پیچ بل کھاتے دریا لگاتار بارش سے اُمڈ اُمڈ کر بہتے ہوئے اپنی ہی ایک زندگی رکھتے ہیں۔ سارے علاقے میں پٹ سن کے کارخانے جو ہزارہا لوگوں کو برسرِ روزگار رکھتے ہیں، یہاں کی مرطوب ہوا کا فیضان ہیں۔ کریم جوٹ ملز کو جاتے ہوئے لنگی پوش کارکنوں کا تانتا، دریا کے تنگ تنگ کناروں پر نہ صرف بڑا دلکش سین پیش

غرب

ـــــ کی نظر میں)

کیمل میرپوئی

خواہ آپ ہوائی جہاز سے آئیں یا سمندر کی راہ سے، بہرحال آپ کو کراچی ہی سے گزرنا پڑے گا جو دنیائے مشرق کا باب داخلہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ایک مغربی سیاح کی نظر میں یہ شہر ہو بہو مشرقیت کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ جونہی انسان طیارے یا سمندری جہاز سے نیچے اترتا ہے پاکستان کے گہما گہمی سے پُر دارالحکومت کا جادو اس کے دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ وہی نفیس نئی وضع کی سڑکیں جن پر جدید ترین ماڈل کی کاریں تیزی سے دوڑتی نظر آتی ہیں، انہی پر اونٹ بھی اپنی دھن میں مست اسی طرح بے تکلف چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح انسان۔ ٹھیک ہے اونٹ یونہی شتر بے مہار نہیں ہوتے کہ آپ ہی آپ اینڈتے پھریں بلکہ وہ غریب بھاری بھرکم ٹھیلوں سے جتے ہوئے انہیں کھینچے لئے جاتے ہیں اور یوں لگتے ہیں جیسے کسی گھنے جنگل میں بڑے بڑے، زمین ہموار کرنے والے دبابے جنہیں "بل ڈوزر" کہتے ہیں، اور ہم مغرب کے رہنے والوں کو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تصور ان کے بارے میں بہت رومانوی یا الف لیلوی قسم کا ہے۔ یعنی یہ صحرا کے جہاز لق و دق صحراؤں میں کاروانی شاہراہوں پر گامزن رہتے ہیں۔ یا اہرام مصر کے اردگرد دور دراز مقامات کا چکر کاٹتے پھرتے ہیں۔ بے شمار گدھا گاڑیاں جن سے چلتے وقت گھنگھروؤں کی جھنکار بلند ہوتی ہے، اور سہ پہیہ سائیکل رکشہ گھومتے جھولوں کی طرح گل بوٹوں سے آراستہ ایک میلے کا سا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اگر آپ زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے ہوں تو شاید صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ انہی رنگا رنگ کی پوشاک زیب تن کئے گھوڑوں پر سوار آپ کی نظر سے گزر جائے، یا گھوڑ سوار پولیس کا دستہ یا کوئی بارات جس کے سامنے بینڈ بجانے والے رنگ برنگی پوشاک پہنے بینڈ بجا رہے ہوں، دولہا پھولوں سے آراستہ گھوڑے پر سوار اور اس کے پیچھے پیچھے براتی چلے جا رہے ہوں۔ حق یہ ہے کہ بڑی آب و تاب سے چمکتا ہوا سورج، گہرے نیلے رنگ کا آسمان اور مردوں عورتوں کے لباس کی حیرت انگیز گوناگونی، یہ سب آپ کی نظر میں کسی تیوہار کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

کراچی بس یہی چمک دمک اور چہل پہل ہی نہیں۔ جیسا کہ صریحاً ڈیڑھ لاکھ آبادی کا کوئی شہر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ آج سے سو برس پہلے محض مچھلیاں پکڑنے کی ایک چھوٹی سی بستی ہی تو تھا۔ اس لئے گو اس کے بعض حصے ترقی کرتے کرتے جدید وضع کے بڑے بارونق علاقے بن گئے ہیں لیکن ان سے ہٹ کر جو علاقے نواحیات میں ہیں وہ ویسے ہی پرانے لگتے ہیں۔

دو باتوں نے کراچی کو ترقی کرنے میں مدد دی: یہ ایک بڑی بندرگاہ بھی تھی اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی۔ جو براعظم ایشیا اور یورپ کا سنگم ہونے کی وجہ سے بڑی اہم کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہ تقریباً ہر ہوائی شاہراہ کا پڑاؤ ہے۔ اور رکنے جانے والے مسافروں کے لئے اس کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں جو آسائش مہیا کی جاتی ہیں وہ لندن پیرس اور نیویارک کے ہوٹلوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ دوستانہ تعلقات کی بنا پر یہ پرتگیزی ہند کے دارالحکومت، گوا پہنچنے کا واحد ہوائی

شرق:

کرتا ہے بلکہ صنعت کے حق میں بھی بے حد مفید ہے۔ ستلیاں، رسّے، ٹوکریاں، اور قالین جو دنیا کے نصف حصہ میں دُور دُور تک پہنچتے ہیں، زیادہ تر مشرقی پاکستان ہی میں تیار ہوتے ہیں۔ میرا آدھے سے زیادہ وقت بڑے بڑے شہروں سے دور دیہات ہی میں گزرا لیکن مجھے وہاں کی زبانوں میں بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لوگ مسکراہٹوں اور حرکات و سکنات ہی سے اپنا مطلب ادا کر لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے تک دوستی ہی دوستی ہے۔ جونہی کوئی اجنبی وہاں پہنچتا ہے یہ اس تک لپک کر پہنچتی اور اس کو گھیر لیتی ہے۔

چاٹ گام کی چہل پہل اور ہلچل سے پُر عظیم بندرگاہ میں ساتوں سمندر کے جہازوں کا نظارہ، ہری بھری پہاڑیوں کے پس منظر میں، عجیب سنسنی سی پیدا کرتا ہے۔ میلوں میل لمبا دریائے کرنافلی پیچ و خم کھاتا، پہاڑیوں کے دامن دامن رواں، سطح پر ہر طرح کی کشتیاں، ہاؤس بوٹ وغیرہ، لوگوں سے کھچا کھچ بھرے اور آس پاس اُگنے والے گیلے پٹ سن اور دوسری زرعی پیداوار سے لدے بڑا سہانا منظر پیش کرتے ہیں۔

پہاڑی علاقے تک دریلسے، بذریعہ لانگا منتی یا جیپ کے پہنچتے ہیں۔ یہ بھی مشرقی پاکستان کے اندر ایک اور ہی دنیا ہے — وادیوں، میلوں دھان کے کھیتوں، اور پرانی وضع کے فارموں کی دنیا جہاں لوگ اس طرح رہتے سہتے ہیں جس طرح ان کے آبا و اجداد — صرف ایک لنگوٹی پہنے، دھرتی ماتا ہی کی طرح بھوری بھوری۔ یہ تمام دیہاتی لوگوں کی طرح ڈھور ڈنگروں کے ساتھ اور ان میں مل جل کر ہی رہتے ہیں، جو کبھی کبھی ان کے گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں عین اس وقت گھس آتے ہیں جبکہ گھر والے کھانا کھا رہے ہوں اور اپنی تھوتھنی سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ٹہوکا دے دے کر روٹی کا ٹکڑا یا لقمہ طلب کرتے ہیں۔

ضلع جات کے کمشنر اور عمال کی بھی ایک روش خاص ہے۔ پرانی وضع کے رعونت پسند حکام اب کہیں نہیں رہے۔ نئے ملک کے عمال ایک نئی روح سے سرشار ہیں۔ اگر کوئی مہمان ریسٹ ہاؤس میں تنہا محسوس کرے تو وہ اسے اپنے یہاں قیام کی دعوت دیتے ہیں اور وہ بھی یہ معذرت کرتے ہوئے کہ افسوس ہے ان کا مکان مہمان کے شایانِ شان ایوان نہیں — عوام ان عمال تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ اور حکومت کا کاروبار زیادہ تر عمال اور جمہور دونوں کی باہمی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر کام کرنے پر موقوف ہے۔

یہی روح کاروباری حلقوں میں بھی دکھائی دیتی ہے چنانچہ چندر گونہ کے عظیم الشان کارخانہ کاغذ سازی میں جہاں مشینیں دیہاتی ماحول میں بڑی گھڑ گھڑاتی ہیں، کارکن اپنے ہی گھروں میں رہتے ہیں۔ ان سب کو ملک کے مستقبل میں بڑی دلچسپی ہے اور وہ فخر کرتے ہیں کہ کرنافلی کے مہتم بالشان کارخانے اتنی بھاری مقدار میں کاغذ تیار کرتے ہیں جو پاکستان کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ بھی تمام تر اپنے ہی کچے مال یعنی بانسوں سے اپنے ہی کارکنوں اور ماہرین کی بدولت۔ چنانچہ ایک خوش خلق اور مستعد منتظم کے زیرِ نگرانی دل، دماغ، سائنس، خام مال، اور سب سے بہتر سب مل کر طلسمی تیز رفتاری سے وہ نفیس چیز تیار کرتے ہیں جو کارخانے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی بک جاتی ہے۔

یہاں سے کوئی پچاس میل دور موضع کپتائی واقع ہے۔ جہاں جدید امریکی پن بجلی کی مشین نصب ہے۔ یہ مشین سچ مچ جادو کرتی ہے۔ اور برسوں کے وحشی لاابالی بے قابو پانی کو بڑی استادی سے قابو میں لے آتی ہے اور اتنے وسیع علاقے کی جملہ ضروریات کے لئے بجلی مہیا کرتی ہے۔ دو ملکوں کا یہ باہمی تعاون اور اس سے پیدا شدہ ترقی کی روح پاکستان کے خوشتر مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

کارخانوں کی فضا سے ہٹ کر تفریح گاہوں کی طرف رُخ کیا جائے تو ہماری نظر "کاکس بازار" پر پڑتی ہے۔ یہ بڑا ہی دلکش، بڑا ہی خوبصورت ساحلی علاقہ، جو لمبائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ گھنے جنگلات سے ڈھکی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ کراچی کا "ہاکس بے" بھلا اس کا کیا مقابلہ

غرب:

اڈہ ہے۔ اگر ہم سات سمندروں میں سے کسی پر بھی سفر کرنا چاہیں تو کراچی کی بندرگاہ سے کسی جگہ کے لئے بھی جہاز پر سوار ہو سکتے ہیں۔ اس سے سیاحوں کو بڑا خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ ان کے لئے آمد و رفت کا صرف ایک ہی راستہ نہیں۔

کراچی کی گریز پا ترقی کا حقیقی سبب وہ خدا ساز اتفاق ہے جس نے اس کو ۱۹۴۷ء میں دنیا کی چھٹی سب سے بڑی مملکت کا دارالحکومت بنا دیا اور چند ہی سالوں میں اس کی آبادی تین گنا ہو گئی۔ نیز دنیا کے تقریباً تمام بڑے ملکوں نے یہاں اپنے سفارت خانے قائم کر دئے۔

کراچی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی اور بہائی سبھی بستے ہیں اور سڑکوں پر سے گذرتے وقت ان سب کی عبادت گاہیں دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہب، تہذیب، لباس، طور طریقوں کا تلون کچھ بھی ہو، انسانوں کے اس بے پایاں سلسلے میں یہ بالکل قدرتی خیال کیا جاتا ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کو دیکھ کر متعجب نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کو سڑکوں پر یورپین اور امریکن خواتین مغربی لباس میں نظر آئیں گی اور ان کے پاس ہی سندھ کے بالائی حصے کی سانولی مگر خوش اندام عورتیں بڑی نفاست سے کاڑھے اور رنگے ہوئے سرخ و سیاہ پارچات پہنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ انہی کے ساتھ آپ آجکل کی پاکستانی ملازمت پیشہ خواتین کو بھی لہراتی ساڑیاں یا شلوار قمیض پہنے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ رواں پائیں گے۔ ان کے علاوہ بلوچی اور پارسی خواتین بھی ہیں اور وہ بھی جو قیام پاکستان کے بعد برصغیر سے یہاں آئیں، سب اپنے اپنے لباس میں۔ مختلف النوع لوگوں کے گوناگوں لباس بڑا ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو، بڑی بوڑھیوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی بچیوں تک سبھی چم چم کرتی چوڑیوں سے ضرور آراستہ ہوں گی۔

ان بازاروں کی سیر جہاں گاہکوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ بجائے خود ایک سامانِ کیف ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کے ساتھ ہی ساتھ صاف ستھری چمکتی دمکتی کاروں کا تانتا لگا رہتا ہے اور بسیں مسافروں سے کھچا کھچ بھری رہتی چلی جاتی ہیں۔ تنگ تنگ بھینچے بھینچے ٹیڑھے میڑھے گلی کوچوں میں عجیب و غریب وضع کی لوکدار جوتیاں، چمکیلے موتیوں سے جڑی انوکھے اور نادر ڈھنگ کی، اتنی ہی عام اور مقبول ہیں جتنے ہمارے یہاں پانچ پانچ سینٹ کے کینڈی بار یا شکر پارے۔ اتنے کم قیمت رو پہلی زری سلیپر اور چپلیں، ایسی کامدار اور موتیوں سے ٹکی ہمارے لئے تو بڑا حیران کن سودا ہیں۔ انسان چاہتا ہے اس کے پاس بے اندازہ وقت بھی ہو اور جگہ بھی کہ ان بیش بہا چیزوں کو سمیٹتا چلا جائے۔ صرافے میں دستی بنے ہوئے بڑے ہی خوبصورت ان گنت کنگن اور ہار انسان کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اہل پاکستان کو اس قسم کی چمک دمک بہت پسند ہے جو سورج کی کنگرہ کنگرہ کرنوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس حیرت انگیز سرزمین کے فنون اور دستکاریاں ہاٹ بازاروں میں عام دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے معمولی سے معمولی ان پڑھ لوگ بھی فن کا کتنا سلیقہ رکھتے ہیں۔ شاید یہ مسلمانوں کا موروثی جوہر ہے کیونکہ ساڑیاں بنانے والے، جڑاؤ کام کرنے والے اور پیتل کو بڑی ہی محنت سے پیٹ پیٹ کر نفیس برتن بنانے والے کاریگر، سب میں وہ فطری ذوق اور شعور پایا جاتا ہے جس سے انمول، یادگار چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

کراچی کے نواح میں سماجی بہبود کے کارکنوں نے ان ہنرمند کاریگروں کی ایک پوری بستی آباد کر دی ہے۔ اسی طرح ملتان کے نواح میں بھی ایک بستی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسی اور بھی کئی بستیاں ہوں۔

شرق:

کر سکتا ہے۔ میلوں میل پھیلا ہوا ساحلی علاقہ جہاں موجیں نرم و سبک ہیں اور رنگین پوش مچھیرے پانی میں بار بار جال ڈال کر ہزار ہا مچھلیوں کی کھیپ کی کھیپ کنارے پر لا ڈالتے ہیں۔ جب رام گڑھ کی طرف جاتے ہوئے میں نے جنگلاتی سڑک کے کنارے مچھیروں کا ماہی گیری کا ہنگامہ برپا دیکھا تو باز نہ رہ سکی اور کچھ مچھلیاں خریدنا چاہیں۔ کوئی ان کا ایک آنہ بھی تو نہیں لیتا تھا! ایک پردیسی دوست کے لئے یہ سب کرارے کرارے کیکڑے اور کھانے کی سمندری چیزیں مفت ہیں!!

ہاں، وہ بڑی بڑی سیاہ چھتریاں۔ انگریزی دور کی یادگار۔ شہروں کے گلی کوچے ہوں یا دیہات کے ہر شخص کے ہاتھوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی قدرتی دولت، اس کا تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دارالحکومت ڈھاکہ، اس کے لوگ باگ، ان کے لوک گیت، گانے، ہنسی کھیل سب ایک پوری کتاب چاہتے ہیں۔ مگر جو چیز اس کے متعلق سب سے زیادہ یاد رہتی ہے، وہ یہاں کے لوگوں کا سبھاؤ ہے جو معمولی کسان ہوں یا پڑھے لکھے بیدار مغز لوگ، ہر اجنبی کو اپنا لیتے ہیں، اس کا دل موہ لیتے ہیں۔ مسلمان اکثریت سے قطع نظر یہاں بودھی بھی ہیں اور پارسی بھی، ہندو بھی، عیسائی بھی، اور یہ سب پاکستان کے شاندار مستقبل، اس کے اعلیٰ مقدر پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان

وجدآفریں رقص (مانی پوری)

عظیم الشان دریاؤں پر
دھوپ چھاؤں کا
سہانا منظر
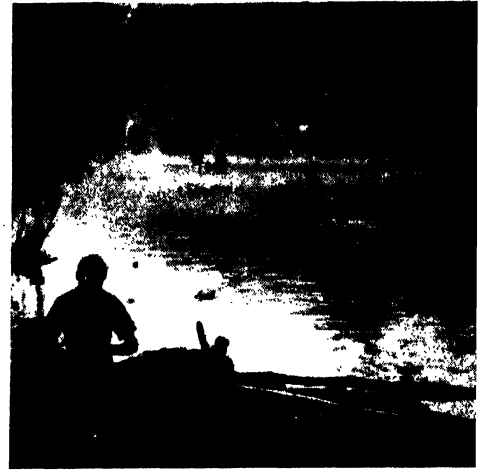
تاڑ کے درخت:
قطار اندر قطار

خلیج بنگالہ کا سماں

ستان

مغربی

ہزارہ:
وادی حس ن

سموں کے درخت:
بہار اندر بہار

تصویر: ناچھوما ھوا دہاں

بحیرۂ عرب: ''موج رقصاں اس کے ساحل کی چٹانوں پر مدام''
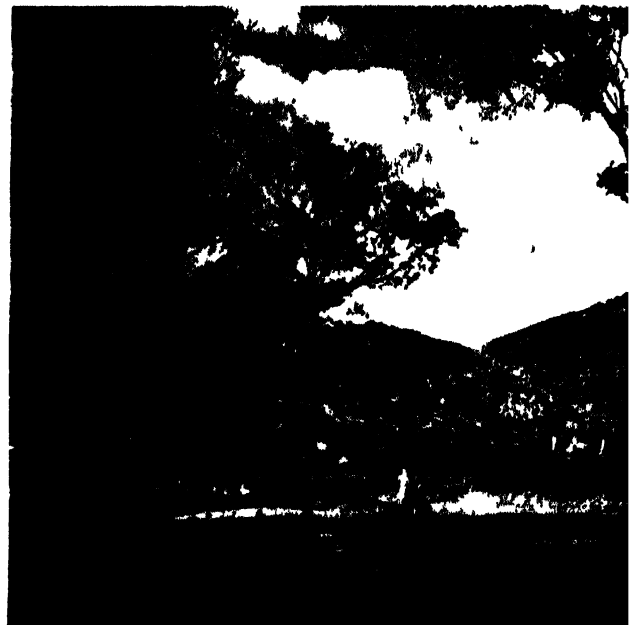
عزب:

کراچی سے باہر ایک بڑا وسیع صنعتی علاقہ ہے۔ جہاں پچھلے بارہ سالوں میں کتنی ہی صنعتیں پروان چڑھی ہیں۔ بلکہ پاکستان کی ساری صنعت کا ایک تہائی یہیں ہے۔ کراچی کے اردگرد بے شمار آبادیاں حشرات الارض کی طرح پھوٹ پڑی ہیں اور ان کا سلسلہ برابر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کراچی کے قریب کورنگی میں کاریگروں کے لئے تیس ہزار مکانات کی ایک خوبصورت بستی بسائی گئی ہے۔ درمیانے طبقے کے لوگوں کو زمینیں دی گئی ہیں۔ اور انہوں نے درجنوں ہاؤسنگ سوسائٹیاں قائم کر کے بہت ہی شاندار نو آبادیاں قائم کی ہیں۔ اسی طرح دیگر بڑے شہروں۔ لاہور، ملتان، لائلپور، اور ادھر ڈھاکہ میں بھی نو آبادیاں اور ذیلی بستیاں بنائی گئی ہیں۔

کلفٹن کا متمول علاقہ سمندر کے قریب اتنا خوبصورت اور ہرا بھرا ہے کہ اس سے کراچی کا صحرائی محل وقوع بالکل بھول جاتا ہے۔ پرانی وضع کی محلوں سے ملتی جلتی عمارات میں بالکل جدید وضع کے قطار در قطار بنگلے اضافہ ہوئے ہیں جو دنیا کے بہترین بنگلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کلفٹن کراچی کی سفارتی دنیا کا مرکز بھی ہے۔ کلفٹن عوام و خواص کی مقبول تفریح گاہ ہے۔ کیونکہ اس کا ساحل بے حد خوبصورت ہے اور اس کا باغ نہایت ہی دلآویز۔ تفریح کے شوقین یہاں جوق در جوق آتے رہتے ہیں، خاص طور پر شام کو؛ اور بحیرۂ عرب کے کنارے بڑی آزادی سے سیر کرتے ہیں۔

مجھے لاہور بھی ایک برق رفتار گاڑی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکی دلکشی کراچی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں مشرق کے جادو میں فرنگی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ کون ہے جو شالیمار کے جادو سے مسحور نہ ہو۔ قلعہ کے طلسمی اثر نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے فواروں کے ساتھ وقت کی رفتار کو روک لیا۔ میں اس عالم میں بخوبی ان قدیم مغلوں کا تصور کر سکتی تھی جو اپنی اس قدر نفاست سے بنائی ہوئی شہ نشینوں پر بیٹھے، کھیلتے ہوئے فواروں کا نظارہ کرتے قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے، جیسا کہ ہم میں سے آج کوئی بھی نہیں کرتا۔ یہ تھی دولت سکون ایک گزشتہ عہد میں۔ جہانگیر کے مقبرہ پر میں نے روزانہ نذر عقیدت کا منظر دیکھا اور ان تمام لوگوں کا سرور نشاط جو اس کے اردگرد کے خوبصورت باغات میں آ کر اس باغ دہبا الطبیعت کے مالک شہنشاہ کی زندہ دلی اور خوشی و خرمی کی روایات کو تازہ کرتے ہیں۔

اور واپس کراچی، میٹروپول ہوٹل میں یہ احساس ہوا جیسے میں پھر گھر لوٹ آئی ہوں، رومانوی باغات میں شبینہ طعام تاروں کی چھاؤں تلے، سہانے گیت سنتے ہوئے! کچھ عجب نہیں کہ دور دراز سے آنے والے مسافر یہاں پہنچ کر ایسا محسوس کرتے ہوں گویا وہ کسی پرستان میں پہنچ گئے ہیں! (تلخیص)

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

رپورتاژ :

سوات

(ایک جنتِ ارضی)

فیاض احمد نعیم

ریل گاڑی طویل مسافت طے کر کے ہانپتی کانپتی درگئی اسٹیشن پر ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ میرے ہمراہیوں کے چہروں پر مسرت ناچنے لگی کہ وہ افسانہ جسے ہم کل تخیل کا شعبدہ سمجھ رہے تھے، آج حقیقت کا لبادہ اوڑھے ہمارے سامنے آرہا تھا۔ ہماری وہ خیالی منزل جو سفیدہ براق برف پوش وادیوں، چنار کے خوب صورت پیڑوں اور رتاڑ کے طویل قامت اشجار پر مشتمل تھی، ہم سے صرف چالیس میل دور رہ گئی تھی۔ ہم نے جوں توں کر کے اپنے آپ کو بسوں پر لادا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم بس میں اس طرح ٹھونسے گئے جیسے ماچس کی ڈبیا میں تیلیاں۔ اس کے باوجود ہمارے دل اس ارضی جنت کے قرب کی وجہ سے جانے کن خوشیوں کے راگ گنگنا رہے تھے کہ میرے ہمراہیوں کے میدانی علاقوں کی جھلستی ہوئی لو سے متاثر چہروں پر قوس قزح کے رنگ پھوٹنے لگے۔ اگرچہ ہم اپنی منزلِ مقصود سے دس میل دور تھے۔ پھر بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے عطر بیز جھونکے ہماری خواہشات کے احترام کے لئے تیزی سے بھاگے چلے آرہے تھے۔ بالآخر منگورہ کی معتدل آب و ہوا نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہم ممتاز ہوٹل میں قیام پذیر ہوگئے۔

ہماری پارٹی کے لیڈر ہماری طرح اس دیس میں اجنبی تھے۔ وہ کسی گائیڈ کی تلاش میں تھے کہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے نے ہمیں خوش آمدید کہہ کر ہماری مشکل حل کردی۔ یہ نوجوان کوہ پیما ہمارے ایک قریبی عزیز نکلے۔ وہ وادی سوات کے چپہ چپہ سے اس طرح واقف تھے جیسے وہ یہاں کے مقامی باشندہ ہوں۔ وہ ہمارے قافلہ کے میرِ کارواں ثابت ہوئے اور ہمیں خاکستری پہاڑوں پر اگے ہوئے اخروٹوں، خوبانیوں، ناشپاتیوں اور خود رو پھولوں میں اس طرح لئے لئے پھرے جیسے کوئی شوخ تتلی پھولوں پر منڈلا رہی ہو۔ ہماری یہ کوہ پیمائی ایک چشمہ پر آ رکی۔ جو ہمارے قائد کے خیال کے مطابق تھوڑی دور واقع تھا۔ درحقیقت وہ "تھوڑی دور" نصف میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ چند دوستوں نے غسل کے لئے پر تولنے شروع کر دئے۔ قائد کی رہنمائی میں بچی کھچی جمعیت ذرا اوپر پہاڑ پر رینگتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچی جو ہزار ہا سال پیشتر مہاتما بدھ کے "زرّیں دور" سے روشناس ہوچکا تھا۔ یہاں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کھدائی میں مصروف تھے چنانچہ مہاتما بدھ کی مورتی اور چند سکے دیکھنے میں آئے جن سے "منگورہ" کی تاریخی حیثیت اور قدامت پر روشنی پڑتی تھی۔ واپسی پر ہم نے خنک اور میٹھے پانی سے دو دو ہاتھ کئے اور اس محاورے کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہوئے۔ ہم سردی کے مارے مسلسل بجتے ہوئے دانتوں کے ساتھ لحافوں میں آگھسے۔

دوسرے دن سورج کی تیز اور شوخ و شریر کرنوں نے ہمیں لحاف چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا کل کی تکان دور ہو چکی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے خرید و فروخت کے لئے بازار کا ارادہ کیا۔ اشیاءِ خوردنی کی ارزانی نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ موٹی کی بڑی بڑی کھالیں ہم نے صرف ایک ایک روپیہ میں خریدیں۔ مرغے چھ چھ آنے اور انڈے تین تین پیسے میں خرید کر ہم اس طرح خوش و خرم ہوٹل کو لوٹے جیسے ہمیں لوٹ کا مال ہاتھ آگیا ہو۔ چونکہ یہاں لذتِ کام و دہن کے لئے بافراط سامان مہیا ہوگیا تھا، جس کے مقابلہ میں ہم گویا فاقہ زدہ علاقے سے آئے تھے، اسلئے ہم نے چند یوم اس فاقہ زدگی کی کسر پوری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ شام جب سورج کی الوداعی کرنیں منگورہ کے شاداب پہاڑوں کو آخری بوسہ دے رہی تھیں ہم دریائے سوات پر جا دھمکے۔ اگرچہ اس دریا کی وسعت ہماری عام چھوٹی نہروں سے زیادہ نہ تھی تاہم اس کا پتھروں پر سر ٹپکتا اور شور مچاتا ہوا پانی اس قدر تیز و تند تھا کہ تین آدمی ایک دوسرے کا مضبوطی سے ہاتھ پکڑے ہوئے بھی اس کے سامنے کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ رات کے سائے گہرے ہونے سے پیشتر ہم اپنے ہیڈ کوارٹر آپہنچے۔

صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے پر ہم نے اپنا بوریا بستر باندھا۔ اور مدائن کو روانہ ہوگئے۔ ہماری بس دشوار گزار پہاڑوں اور عمودی چٹانوں پیچ

اس طرح دھیرے دھیرے اور احتیاط سے گزر رہی تھی جیسے کوئی شیشے کا سامان دونوں ہاتھ میں اٹھائے کسی بڑی بھیڑ کو چیرتا ہوا گزر رہا ہو۔

مدائن پہنچنے پر ہمیں سرد مرطوب آب و ہوا کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر ملکی دواساز اور ہوائی کمپنیوں کے کیلنڈروں پر سوئٹزرلینڈ کے جو برف پوش اور اودے اودے یا سرخ پہاڑ ہم نے دیکھ رکھے تھے وہ بے حقیقت معلوم ہونے لگے اور ہمارے دل مسرت سے اچھلنے لگے کہ ہمارے ملک میں سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ خوب صورت مقامات پائے جاتے ہیں۔ مدائن ہوٹل میں یک روزہ مختصر قیام کے دوران ہم تمام دن کیمرے کے لئے دل آویز برف پوش چوٹیوں اور گل پوش خطوں پر پھیلے ہوئے قدرتی لازوال حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کرتے رہے۔ اگلے روز ہم بحرین کو روانہ ہوئے۔ یہ مدائن سے چند میل کے فاصلے پر ایک دل فریب قصبہ ہے جس کے گرداگرد پہاڑوں نے دیوار سی چن رکھی ہے۔ ان پہاڑوں میں ٹھنڈے میٹھے میٹھے پانی کے چشموں کی بہتات ہے۔

اسی شام ہم کالام روانہ ہو گئے جو وہاں سے ۲۶ میل دور بلندی پر واقع ہے اور اس ساری حسین وادی کا دل سمجھا جاتا ہے۔ یہی جگہ ہے جس کا پرکشش حسن غیر ملکی سیاحوں کو کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ چنار کے خوب صورت شگوفوں، جابجا پھیلے ہوئے جنگلی پھلوں کے درختوں اور خود رو پھولوں کے سبب اس برف پوش سرزمین کا حسن سوئٹزرلینڈ سے کسی طرح کم نہیں۔ کالام کے دو روزہ قیام کا عرصہ آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی خوابوں کی حسین وادی میں آنکلے ہیں۔ ہمیں اپنے میدانی علاقوں کی نومبر دسمبر کی سردی بھی یہاں کے موسم کے سامنے ہیچ نظر آتی تھی۔ چشموں کے انتہائی خنک پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی یخ ہو جاتا چہ جائیکہ غسل کرنے کی جسارت یا حماقت کی جائے۔

دو روز بعد جب چڑیوں کی مترنم چہچہاہٹ نے ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میٹھی نیند سے جگایا تو ہم نے بادلِ ناخواستہ اس ارضی جنت کو آخری سلام کہہ کر منگورہ کے لئے رخت سفر باندھا۔ منگورہ پہنچنے پر ہمارے سالارِ قافلہ نے والئی سوات، اعلیٰحضرت جہاں زیب صاحب سے ملاقات کا انتظام کیا۔ انہوں نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا۔ وہ ہمارے سروں پر سواتی ٹوپیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہم نے انہیں بتایا کہ ہمیں ان کی اس فردوس نما دنیا کی اکثر چیزیں بہت ہی پسند آئی ہیں۔ وہ ہم سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے رہے جیسے وہ ہمیں سالہا سال سے جانتے ہوں۔ ہم نے یادگار کے طور پر ان کے آٹوگراف لئے۔ اور ایک گروپ فوٹو بھی۔ انہوں نے بڑی مہربانی سے ہمیں اپنی کار پیش کی اور ہمیں اپنے آبائی محل روانہ کر دیا جو مرغزار میں واقع تھا۔ ۱۳ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم منزلِ مقصود پر پہنچے۔ سنگ مرمر کا سفید محل جدید طرز تعمیر کا عدیم النظیر شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کوہ قاف کے کسی پرستانی محل میں آ گئے ہیں۔ تین طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پاسبانوں کی طرح ایستادہ تھے، پھلوں اور پھولوں کے حسن نے بیحد تازگی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ ہم گرد و پیش سے آنے والے عطر بیز جھونکوں سے اپنے قلب و نظر کو محظوظ کر رہے تھے۔ ہم نے محل کی خوب سیر کی اور اس کا ایک ایک کونہ ہماری نگاہوں کی دست برد سے نہ بچ سکا۔ ہم مہمان خانہ میں گئے جہاں پکی ہوئی پیازی انجیروں، زرد ناشپاتیوں اور گہرے سبز اخروٹوں سے ہماری خاطر مدارات کی گئی۔ ہم طلبہ کی اس قدر افزائی پر بہت خوش ہوئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد ہم جہاں زیب کالج دیکھنے گئے۔ اس ڈگری کالج میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بھی نئے طرزِ تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ وہاں کے طالب علموں نے ہمارا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ہمیں اپنے تمام اساتذۂ کرام سے ملایا۔ ہم نے جی بھر کر کالج کی سیر کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہمارا اپنا ہی کالج ہے۔ اس کے بعد ہم نے کچہری کا رخ کیا وہاں کے طریق کار اور مقدموں کے فوری فیصلہ کے متعلق سن کر بہت حیران ہوئے کیونکہ وہاں اکثر مقدمات کا فیصلہ ایک دو روز ہی میں سنا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باعثِ فخر بات عدالتوں میں اسلامی قانون کی پیروی ہے۔

ڈیڑھ ہفتہ پاکستان کے اس سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کے بعد ہم پھر اپنے دوزخ "ملتان" میں جھونک دئے گئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیں جنت سے دیس نکالا مل گیا ہو۔

شہتوت کی شاخوں کے اوپر — پتوں کے ننھے گھروندوں میں
خوشیوں کے جھولے ڈالے ہیں — اک روحِ مسرت بستی ہے
کچھ ہلکے ہلکے نغموں کی بوندوں کی تراوش ہوتی ہے — کرنوں سے آنکھ مچولی ہے

غزل

عبد اللہ خاور

کبھی جو اہلِ درد ناصبور ہو گئے
خیال سے وہ اور دُور دُور ہو گئے

مٹیں تمام حسرتیں، مگر مٹیں بھی کیا؟!
شعور کے صنم، پسِ شعور ہو گئے

وہی ہیں تم سے چاہتوں کو نسبتیں مگر
خود اپنی اس روش سے ہم نفور ہو گئے

کبھی تھیں عشق میں نیازمندیاں بہت
وہ ٹھوکریں لگیں کہ ہم غیور ہو گئے

ہزار بے قراریاں، ہزار ولولے
ترے حضور آ کے بے حضور ہو گئے!

نظر اٹھی، نظر میں قلب جھلملا اٹھا
حضورِ حُسن بھر کئی قصور ہو گئے

رفاقتوں سے قربتوں سے کس کو کیا ملا
مگر دلوں میں فاصلے ضرور ہو گئے

وہ اہلِ شوق بھی جئے ہیں اہلِ انجمن
جو التفات کی حدوں سے دُور ہو گئے

روش صدیقی

یہ طلسمِ خیال سا کیا تھا
ہجر میں بھی وصال سا کیا تھا

شمع کے زرد زرد چہرے پر
آخرِ شب، جلال سا کیا تھا

ارتقائے کمالِ عشق نہ پوچھ
یہ مسلسل زوال سا کیا تھا

ہم تو برباد ہو کے بھی خوش ہیں
مگر اُن کو ملال سا کیا تھا

اُس ادائے جواب میں پنہاں
ہم نشیں! اک سوال سا کیا تھا

پردۂ جسم و روح میں اے دوست
عمر بھر یہ وصال سا کیا تھا

عشق نے جس کے خواب دیکھے تھے
ہاں وہ حسنِ خیال سا کیا تھا

بارِ ہستی اگر نہ تھا تو روش
دوش پر یہ وبال سا کیا تھا

بلوچی لوک گیت

سلیم خاں گمی

وادی بولان دہقانوں، ساربانوں اور چرواہوں کی وادی قریب قریب بارہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس کا کل رقبہ تقریباً انیس لاکھ مربع میل ہے۔ اس طرح آٹھ مربع میل میں صرف ایک انسان بستا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان کو دیکھئے تو ایک مربع میل میں چھ سو افراد اقامت پذیر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وادی کا ماحول کیا ہوگا اور اس میں قدرت کی بے اندازہ پہنائی اور سکوت کا زندگی اور اس کی گہما گہمی سے کیا تناسب ہے۔ آب و ہوا میں بھی سابق بلوچستان کے مختلف مقامات میں زمین و آسمان کا فرق ہے سبی دنیا بھر کے گرم ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ گرمیوں میں اس کا درجۂ حرارت ایک سو میں ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس زیارت کی پر بہار وادی ہے جہاں سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ یہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے۔ وادی بولان کو جن پہاڑوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے ان میں سے اکثر دس ہزار فٹ سے بارہ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ یہ پہاڑ بالکل بنجر اور بے آب و گیاہ ہیں اور سال کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ نوشکی اور خاران کے ریگستان ایران اور افغانستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں ان ریگستانوں سے سخت گرم اور تند و تیز ریت سے بھرپور ہوائیں میدانوں اور وادیوں کا رخ کرتی ہیں۔ ان ہواؤں کو مقامی طور پر "لوار" کہا جاتا ہے۔ جو انسانوں، حیوانوں اور نباتاتی زندگی کے لئے پیغام اجل ہیں۔ وادی بولان کے شمال اور شمال مشرق کے علاقے کوہستانی ہیں۔ ان کوہساروں میں سرسبز و شاداب وادیاں ہیں جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے اور رنگا رنگ کے پھول اور قسم قسم کے پھل اس کثرت سے ملتے ہیں کہ تمام علاقے پر جنت کا گماں ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ جغرافیائی حالات جن سے بلوچ چرواہوں، ساربانوں اور دہقانوں کا واسطہ ہے۔ مظاہر فطرت کی اس رنگا رنگی اور دل آویزی میں کو د فادار اور پاک دل بلوچ بستے ہیں اور اپنی صحت مند اور توانا ثقافتی اقدار سے پاکستان کے اجتماعی تمدن کو اپنے میں حسین اور دل نواز عطیے پیش کرتے ہیں بلند بالا پہاڑوں، سیاہ دل ریگستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں بسنے والا بلوچ صحیح معنوں میں فطرت کا پروردہ ہے جسمانی لحاظ سے صحت مند اور توانا، طبعاً سادہ اور فراخدل۔ جب وہ بلند پہاڑوں وسیع صحراؤں اور شاداب وادیوں میں اپنے روزمرہ کے کام کاج کے لئے نکلتا ہے تو اس کے قلب و نظر فطرت کی ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی سے بے پناہ اثر لیتے ہیں یہی وہ ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی ہے جو اس کی معاشرت اور کلچر میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی کے پیش نظر بڈھے بلوچ نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی کہ ؎

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

بلوچ سرزمین دہقانوں، شتربانوں اور چرواہوں، پہاڑوں۔ ریگستانوں اور وادیوں، میٹھے اور پرسوز نغموں کی سرزمین ہے۔ بلوچ اپنے گھر میں ہوں یا لہلہاتے کھیتوں میں، پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گھاٹیوں میں گلہ بانی کر رہے ہوں یا تاریک لمبی راتوں میں اپنے اونٹوں پر سوار ریگستانوں کا سفر کر رہے ہوں، ہر وقت کوئی نہ کوئی گیت الاپتے رہتے ہیں۔ اور ان لمحات میں ان کا کوئی نہ کوئی محبوب ساز مثلاً نڑ، سروز، چنگ، رباب، سرائیندہ، دونلی، یک تارہ ان کا دمساز ہوتا ہے۔ ان سازوں کی رفاقت میں شمشیر بکف بہادروں کی داستانیں بیان ہوتی ہیں، رنگ و نکہت کے پیکر ترتیب پاتے ہیں ہمن پوش وادیوں میں وفا کی تجدید کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ اندوہ وفا کے چرکے سینہ کھول کر اہل دنیا کو دکھائے جاتے ہیں، خوش اندام نازنینوں کی

فرقت دلوں کو پارہ پارہ کرتی ہے، سردار کی موت پر رو رو کر آنکھیں گنوائی جاتی ہیں، دلہن کی سہیلیاں اپنے چھبوں سے دولہا بھائی کو تنگ کرتی ہیں، مرشد کامل کی یگانہ حقیقت ہی کو خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ سینکڑوں موضوعات ہیں جو ان گیتوں میں صدیوں سے ادا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وادی بولان اور اس سے پرے دور دور مغربی پاکستان کا تمام شمالی و شمال مغربی علاقہ بڑی مضبوط، جفاکش، اور جری قوموں کا وطن ہے اور صدہا سال نہ صرف بے باک و آزاد منش انسانوں کا گہوارہ بلکہ ان کی جولان گاہ بھی رہا ہے۔ یہ وہ دشتِ خطرناک ہے جس میں فطرت نے ریت کے ٹیلے تعمیر نہیں کئے بلکہ بڑے بڑے گراں ڈیل، جلے بھنے خاک سیہ ڈراؤنے پہاڑ ہی پہاڑ تعمیر کئے ہیں جو یہاں کے باشندوں کے دل کو بھی ایسے ہی مبہوت کن سانچے میں ڈھال دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بلوچوں نے تاریخ میں بڑا نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔ یہ شجاعت و جواں مردی قدرتی طور پر رزمیہ گیتوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اسی لئے ہم اس کو ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری اور گیتوں میں بھی شدت سے کارفرما پاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو گیت بزمیہ ہوں یا رزمیہ سب میں یہی شجاعانہ رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً لوک گیتوں کی ایک بڑے ہی ہر دلعزیز صنف "لاڈیا" "لاڈوگ" ہی کو لیجئے۔ ہے تو یہ شادی بیاہ کا گیت، چنانچہ جب کسی بلوچ نوجوان کی شادی ہوتی ہے تو اس کی ماں بہنیں اور دوسری رشتہ دار خواتین بڑے زور شور سے یہ گیت گاتی ہیں۔ لیکن ان میں تمام تر دولہا کی شجاعت، شہسواری اور شمشیر زنی ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ ؎

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
بھیگ ابر گہربار سراسر سہرا

بالفاظ دیگر دولہا محض ایک رنگین ہیولیٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ پیکر شجاعت اور رزم و پیکار کا دھنی ہوتا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت حسن وجمال نہیں بلکہ جلال ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف حقیقی معنوں میں تعریف ہوتی ہے۔ ایسے جواں مرد کے لئے رفیقۂ حیات بھی محبت اور ایثار کا پیکر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب لڑکی کی سہیلیاں گیت گاتی ہیں تو ان میں دلہن کے حسن اور پاکبازی کو خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کے سپاہیانہ مزاج اور جنگی روایات کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے کہ جب عہد قدیم میں ایک قبیلہ دوسرے پر چڑھائی کرتا تو خواتین اپنے بہادر بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کا دل بڑھانے کے لئے ان کی جواں ہمتی اور بہادری کی تعریف کرتیں۔ اور جب کوئی قبیلہ حملہ آور کے خلاف صف آرا ہوتا تو خواتین "لاڈوگ" میں ان سے مطالبہ کرتیں کہ وہ اپنی زمینوں اور چراگاہوں کی حفاظت کے لئے ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اگر مرنا ہو تو سینے پر گولی کھا کر مریں نہ کہ پشت پر۔

قدرتی طور پر جب کوئی قبیلہ کامران ہوتا تو اس کے نوجوان فتح کی خوشی میں "لاڈوگ" گاتے اور اپنے کارناموں کا ذکر بڑے پروقار انداز میں کرتے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب قبائل کی باہمی آویزش ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے اور شجاعت کا رخ دشمنانِ قوم و وطن کی طرف مڑ گیا ہے۔ اور بلوچ قوم اس سلسلہ میں کتنے ہی کارہائے نمایاں دکھا چکی ہے۔

ایک ایسی قوم جس میں تندرستی و توانائی پر زور رہو، قدرتی طور پر اپنی نئی پود کی بہترین صحت کی خواہشمند ہوگی۔ چنانچہ بچے کی پیدائش کے موقع پر بھی اس کی صحت مندی، سلامت روی اور بلند کرداری کے لئے "لاڈوگ" ہی گائے جاتے ہیں۔

یہ گیت جو بلوچوں کا مایۂ ناز ورثہ ہیں اب بھی ہر جگہ گائے جاتے ہیں جس سے ان کی شجاعانہ روح برابر تقویت پاتی ہے۔ یہ گیت بلوچ خواتین، مردوں کی تعریف میں اکیلی یا مل کر گاتی ہیں۔ اور ان کی خالق بھی وہی ہوتی ہیں۔ دیکھئے ایک خاتون اپنے جذبات کی ترجمانی کس پیرایہ میں کرتی ہے جس میں بزم کا انداز بھی ہے اور رزم کے تیور بھی۔[1]

---

[1] اس مضمون کے جملہ منظوم تراجم شہاب رفعت کے قلم سے ہیں۔ (مدیر)

جانم کی راہ پڑی دیکھوں
آنگن میں گُم سُم بیٹھی ہوں
جانم۔ وہ نڈر جانباز مرا
وہ اُس کی تفنگ دلندیزی
کب اس کا نشانہ چوک سکے
رفتار ہے ایسی شاہانہ
سر کرنے کو جیسے قلعہ چلے
جب آنکھیں گھما کر دیکھتا ہے
اوسان خطا ہوں دشمن کے
اقرار کیا ہے ملنے کا
میں جانتی ہوں بلوچ ہے وہ
اور اپنا قول نبھائے گا

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہی شجاعانہ روح بعض اور لوک گیتوں مثلاً ہالو، شئیر، یہاں تک کہ نازنک جیسی گھریلو صنف میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس طرح بزم کا دامن کبھی رزم سے جدا نہیں ہوتا۔

جہاں آئے دن جنگ و جدل کے معرکے ہوں وہاں انسان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ فاتح قبیلہ مفتوح قبیلے کی عورتوں کو پکڑ کر کنیزیں اور لونڈیاں بنا لیتا۔ اس طرح ان خواتین کی زندگی سراپا آہ بن کر رہ جاتی۔ وہ اپنی گذشتہ پر وقار اور آزاد زندگی کو یاد کرتیں، انہیں اپنے شوہروں کی محبت یاد آتی، تو ماضی کا خوش و خرم زمانہ اُن کی نظروں میں پھر جاتا اور ان کے ہونٹوں پہ بے اختیار رنج و غم سے بھرے بول آجاتے۔ یہ دکھ درد کی پکار جو گیتوں کی شکل اختیار کر لیتی "زہیروگ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ان سوگوار گیتوں کی تاثیر لازمی طور پر دائمی و غیر فانی ہے۔ اس لئے یہ قدیم درد بھرے گیت اب بھی وادیٔ بولان میں گائے جاتے ہیں۔ جن کو سن کر بے اختیار درد و سوز میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

شاید یہ پُر درد نوائیں — غم سے بھری دلدوز صدائیں
اگلے دنوں کی بڑی پرانی — بپتا کی ہیں رام کہانی
وہی نزاعیں، بیر کی باتیں — دل کو دکھانے والی گھاتیں
جنگ و جدل اور کشت و خوں کی — وحشی انسانوں کے جنوں کی
یا کوئی اور ہی سیدھی سادی — اپنے زمانے کی جگ بیتی
باتیں یہی جانی پہچانی — رنج اور دکھ اور غم کی ہانی
جو دل پر نت طاری ہوں گے — آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے!

رزمیہ و طربیہ گیتوں کے برعکس یہ المیہ گیت زندگی کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہیں جن کا اثر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

عوامی گیتوں کی یہی صنف دردمند انسانوں کے دیگر غمناک احساسات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ سبی کے علاقے میں اسے ڈیہی اور مکران میں لیکو کہتے ہیں۔ بعض اور علاقوں میں ان گیتوں کو ڈیکو اور لیلی مور کہتے ہیں۔ اگر لاڈوگ میں الک اور کھٹک ہے تو زہیروگ میں سوز اور محرومی ہے۔ جذبے کی آنچ، لہجے کا ٹھہراؤ اور دھیمی لے یہ سب ان کی بے پناہ مقبولیت کے راز دار ہیں۔ زہیروگ گانے

میں کسی کی تخصیص نہیں۔ یہ ہر انسان کا نغمہ ہے اور عورتیں مرد، بچے بوڑھے سبھی اس کو گاتے ہیں۔

نالہ پابندِ نے نہیں تو پابندِ مقام بھی نہیں۔ اس لئے جہاں کہیں کسی کا دل بھر آئے یہ پرسوز نغمہ خود بخود دل کی گہرائیوں سے ابھر آتا ہے مثلاً جب کسی خاتون کا شوہر دیس سے دور ہو تو اس کی یاد میں اس کا دل گھائل ہو جاتا ہے اور زہیروگ اس کے ہونٹوں سے آہ بن کر نکلتا ہے۔ اگر شومئی قسمت سے اس کا رفیق حیات فوت ہو جائے تو انہی گیتوں کی دکھ بھری لے اس کی مونس و غمخوار بنتی اور اس کے دل کی بے چینی اور درد و کرب کو دور کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی ماں کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ اس کی جدائی میں زہیروگ گا کر اپنے دکھے ہوئے دل کو تسکین دیتی ہے۔ اور اندھیری رات میں ایک گونہ تسلی کی لو پاتی ہے۔

پھر ان اندھیری راتوں کا تصور کیجئے جب ساربان پُرخطر راہوں پر سفر کرتے ہیں۔ وطن سے دوری اور محبوب کی جدائی کا احساس انہیں مغموم بنا دیتا ہے۔ یہ احساس ان کے دل میں گھر اور محبوب کی یاد کو شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑکا دیتا ہے۔ اور وہ اپنی پرسوز آواز میں محرومی کے گیت گاتے ہیں۔ زہیروگ کی اس قسم کو بجا طور پر نغمۂ ساربان کہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنا اپنا دکھ ہی جھیلتا اور اپنا ہی غم کھاتا ہے۔ اس لئے یہ گیت بھی الگ الگ گائے جاتے ہیں۔ ہر شخص، مرد ہو یا عورت، ان سے تنہائی میں ہی اپنا غم غلط کرتا ہے۔ اس لئے انہیں مل کر نہیں گایا جاتا۔ جدائی عارضی ہو یا دائمی، دیکھئے اس کے دلگداز نغمے کیا کیف رکھتے ہیں:۔

اے میرے محبوب، اے پیارے!
یونہی رہیں گے کیا دن رات؟
بدلیں گے اک دن حالات
چمکیں گے آکاش پہ تارے

موقع ہاتھ آئے گا بارے
جب بن کر بادل کا ٹکڑا
بھاگتا بھاگتا آ جاؤں گا
آخر کار میں تیرے دوارے

ساون کے بادل کی صورت
آنکھوں سے آنسو ہی آنسو
چھلکاتا برساتا ہر سو
آؤں گا تجھ تک حسن کی مورت!

وہ وعدے وہ بھولے بسرے
پیار کے لمحے تازہ کرنے
پھر سے محبت کا دم بھرنے
آؤں گا اے جاں پاس ترے

اپنے سموں سے میرا گھوڑا
اونچے اونچے کہساروں کو
اور قلعے کی دیواروں کو
توڑ کے آخر جا پہنچے گا

قید جہاں پر راحتِ جاں ہو
لمبے چوڑے میدانوں کو
تند اٹھتے طوفانوں کو
روند کے پہنچوں یار جہاں ہو

لیکو کا انداز یہ ہے:

مرا دل تھا
کھلے میدان میں تنہا اُگا پھول
جواب لُو سے
جدائی کی ہے مرجھایا ہوا پھول
مرا دل اب
ہے جیسے کوئی بنجر کھیت ویراں
نہیں جس میں
کوئی آثار ہستی کے نمایاں

ڈیہی میں بھی یہی پکار ہے:-

ایک دن وہ تھا ترے دیدار سے سرشار تھا   ایک دن یہ ہے کہ دل افسردہ و بے بس ہوں میں

جہاں انسان ہے وہاں محبت بھی ہے۔ اور ماں کی محبت سے زیادہ لطیف چیز اور کیا ہوگی۔ سراپا شفقت و ملائمت۔ نازینک اسی ممتا کا میٹھا رسیلا اور چیلا گیت ہے۔ جب کوئی ماں اپنے بچے کی صحت اور خوش نصیبی کے لئے یہ گیت گائے تو اس صورت میں یہ لوری — یا لوری کہلاتا ہے بلکہ بلوچ اسے لیلو کہتے ہیں۔ جب کوئی بہن اپنے بھائی کی منگنی یا شادی کے موقع پر یہ گیت گاتی ہے تو اس میں بھائی کی بہادری اور حسن و وجاہت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کی شیر دلی اور جواں ہمتی کا بڑے فخر سے ذکر کرتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر ہنسی ٹھٹھول اور خوشدلی کا مظاہرہ تو ہر کہیں ہوتا ہے۔ اور بلوچ اس زندہ دلی سے کیسے بیگانہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ایسے موقعے آتے ہیں اور دلہن کی سہیلیاں نازینک گاتی ہیں تو اس میں از راہِ شوخی و تفنن دو لہامیاں کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب گت بناتی ہیں۔ اس صورت میں نازینک کا موضوع ان پنجابی لوک گیتوں سے ملتا ہے جو "سٹھنیاں" کہلاتے ہیں۔ دیکھئے ایک بلوچی ماں کس انداز سے اپنے بچے کا ذکر کرتی ہے:-

مرا یہ پھول سا بچہ جواں ہوگا، جواں ہوگا
میں اپنے لاڈلے کو تیغ و خنجر سے سجاؤں گی
کندھے پر اپنے وہ بندوق کو رکھ کر رواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا — مرا ننھا جواں ہوگا

چمکتی ہوگی اک تلوار ان مضبوط ہاتھوں میں
بہت منہ زور گھوڑا ہو، اسے چک پھیریاں دے گا
اگرچہ توسن سرکش سراسر بے عناں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا
میں اس کو دیکھ کر مسرور ہونگی، شاد ماں ہونگی
میں اس کی عظمتِ جاوید ہی کے گیت گاؤں گی
خدا رکھے! جوانمردی کا چرچا جاوداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا

اس کے ساتھ ہی بہن کے احساسات ملاحظہ ہوں:۔

بھیا، مرا پیارا بھیا	چاندسی دلہن لائے گا
میرے بھیا کی تلوار	مصری لوہے سے تیار
اس کا جیالا سرکش گھوڑا	کہساروں کو روندنے والا
نام مرے بھیا کا سن کر	دشمن کانپ اٹھتے ہیں تھر تھر
بھیا مرا پیارا بھیا	چاندسی دلہن لائے گا

اب ذرا سوت کی طرف آیئے۔ یہ وہ سوت نہیں جس کا جلا پا ہر عورت کو جلاتا ہے اور جس کو وہ بیرن کہتے نہیں تھکتی۔ یہ بلوچی زبان کی قدیم غزل ہے جو شادی بیاہ اور اس قسم کی دوسری تقریبوں کے علاوہ فصل کٹنے پر بھی گائی جاتی ہے کبھی اکیلے کبھی مل جل کر۔ اس کے موضوعات وہی محبوب کا دیدار، وصل، دردِ فراق اور محبوب کی تعریف ہیں:۔

ہوں تیری یاد میں جاناں میں بلبل کی طرح نالاں
گنہ میرا بتا دینا
ہوں تپتی ریگ پر استادہ تیری دید کا خواہاں
خطا میری بتا دینا
ہے سوتے جاگتے تصویر طاق دل پہ آویزاں
گنہ میرا بتا دینا

تالو، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مبارک سلامت کا گیت ہے جو خواتین گاتی ہیں۔ کبھی لڑکے کی پیدائش پر، کبھی اس وقت جب دولہا یا دلہن کو مہندی لگائی جائے یا دولہا کسی بزرگ کی خانقاہ پر سلام کے لئے جا رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ پچھلے زمانے میں جب فاتح قبیلے کے بہادر لڑائی میں جیت کر گھر لوٹتے تھے تو خواتین فتح کی خوشی میں چراغاں کرتی اور ناچ ناچ کر تالو گاتی تھیں۔ اب بھی بعض علاقوں میں تالو گاتے وقت گانے والے ڈھول کی تال پر ناچتے ہیں۔ ایسے ہی کسی اور خوشی کی تقریب پر بھی نوکر اور خادم یہی گیت گاتے ہیں۔

بلوچی زبان میں دیہاتی بولیاں، بھی ہیں۔ جنہیں سوال و جواب کی صورت میں گایا جاتا ہے۔ یہ موڈ کہلاتی ہیں اور ان کو میلوں یا موسمی تہواروں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ گانے والے آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص گا کر سوال کرتا ہے اور دوسرا گا کر اس کا جواب دیتا ہے۔

ایک: پگلے بابا تجھے کس سے پیار؟

دوسرا: لمبی زلفوں والی نار،
یہ بڑے بڑے کہسار
گئی چھوڑ کے ان کے پار
چھپ گئی کہیں دلدار!

سپت (شاید صفت کی بدلی ہوئی شکل ہو) ایک اور دلچسپ صنف ہے جس کے معنی ہیں، تعریف۔ اس کا مضمون سندھی وائی پنجابی کافی اور بنگالی مرشدی سے ملتا جلتا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وائی، کافی اور مرشدی کو مرد اور عورتیں یکساں طور پر گاتی اور سنتی ہیں۔ لیکن سپت صرف بلوچ خواتین گاتی ہیں۔ بچے کی پیدائش پر رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کی خواتین مسلسل سات راتیں سپت گا کر گزارتی ہیں جس میں خدا کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ اور اولیائے کرام کا تذکرہ اور ماں اور بچے کی صحت کی دعائیں ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ ملاحظہ ہو:

سپت و ثنا با خدا لائق است —— خدا لائق است و رسولؐ لائق است
کئے واب و کئے آگاہ —— بندہ واب و خدا آگاہ
(کوئی سوتا اور کوئی جاگتا ہے —— انسان سوتا ہے اور خدا جاگتا ہے)

اس سلسلہ کی آخری اور بہت دلچسپ کڑی ہے شیر یعنی بلوچی کی منظوم داستانِ حسن و عشق۔ اس کے علاوہ اس صنف میں دوسری قوموں سے جنگوں، باہمی آویزشوں اور چراگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے کسی بہادر بلوچ کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ گویا اس کا موضوع ہنگامہ خیز واقعات اور حادثات ہوتے ہیں۔

شیر کو بلوچی شاعری کا حسین ترین سرمایہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہ تمام واقعات بڑی سادگی، خلوص اور خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں جنہوں نے بلوچ تاریخ مرتب کی ہے۔ کلاسکی بلوچی شاعری کی یہ منظوم داستانیں پہلے بے قافیہ ہوتی تھیں لیکن اٹھارویں صدی کے بعد قافیہ و ردیف کا التزام بھی ہونے لگا ہے۔

بلوچ اس صنف پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسے سننا یا گانا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ گھر، چوپال میلوں اور محفلوں میں یہ ولولہ انگیز داستانیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ان کو سُرتال سے بھی گایا جاتا ہے۔

رات خنک ہے، ایسی خنک کہ زمیں ساری
برف کی صورت ڈھیر ہوئی ہے جم جم کر
جونہی محبوبہ کا سندیسہ پایا میں نے
اپنی سانڈنی پر ہلکا سا پاکھڑ رکھا
اس کی ناک میں ریشمی پھولوں والی سجل مہار
ڈال کے نکلا اپنے احاطے سے باہر
اس کی پشت اتنی آرام دہ، اس پہ بیٹھا
چابک چار چھ مارے، سانڈنی ہرنی کے مانند
بے تابی سے اچھلنے لگ پڑی اور یہ کہا!
اے مالک! مجھ پر یہ عتاب، غضب کیسا
بس میری مہار ہی پکڑے رہنا میں آپ ہی آپ
سوئے نشیب رواں کہسار کی ندی
کے مانند چلی جاؤں گی بہتی ہوئی
اور بلندی کی جانب سیاہ بگولے کی صورت
تند ہوا کے دوش پہ تیرنے والے بادل کے مانند
تیز چلوں گی اور تجھے پہنچا دوں گی درِ جاناں تک

غرض ان لوک گیتوں میں بلوچوں کی زندگی، ان کی روح اور ان کا ماحول ہر چیز اس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جھلکتی ہے کہ ان کو سن کر ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو بلوچ ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے ان کے گیت، ان کی زندگی، ان کی روح، ان کا ماحول ہمارا اپنا ماحول ہو۔ فن۔ اگر اس قسم کی بے ساختہ شاعری کو فن کہا جا سکے۔ کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

★

کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے زیر اہتمام
کُل پاکستان ڈرامہ نگاری کا انعامی مقابلہ

شرائط و ضوابط

۱۔ یہ مقابلہ صرف اردو ڈراموں کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے، لہٰذا ڈرامے اردو زبان میں ہونے چاہئیں اور نثر میں لکھے گئے ہوں۔

۲۔ کسی خاص موضوع، طربیہ، المیہ وغیرہ کی پابندی نہیں۔ البتہ ڈرامہ نگاروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے تقاضوں خصوصاً پاکستان کی قومی روایات معاشرت اور آئڈیالوجی کو خاطر خواہ طور پر ملحوظ رکھیں گے۔

۳۔ ڈرامہ اسٹیج پر بہ سہولت پیش کئے جانے کے قابل ہو۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں مناسب وقفوں کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ سٹ کی تبدیلیاں کم سے کم واقع ہوں اور کرداروں کی تعداد محدود رکھی جائے۔

۴۔ ڈرامہ طبعزاد، اَن کھیلا، غیر مطبوعہ، اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی اپنی ملکیت ہونی چاہیئے۔

۵۔ جن ڈراموں پر انعام پیش کیا جائیگا انہیں کم از کم ایک بار پبلک کے سامنے اسٹیج پر پیش کرنے کا پہلا اختیار کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کو حاصل ہوگا۔

۶۔ ہر مسودے کی تین صاف نقلیں وصول ہونی چاہئیں۔ مسودے بذریعہ رجسٹری سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے نام بھیجے جائیں یا دستی طور پر ان کی رسید حاصل کی جائے۔

۷۔ ایک مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے بھی مقابلے میں شرکت کے لئے بھیجے جاسکتے ہیں لیکن تینوں انعامات تین مختلف ڈرامہ نگاروں کو پیش کئے جائیں گے۔ البتہ کسی مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے انعام کے قابل سمجھے گئے تو سوسائٹی اعلان کردہ انعامات کے علاوہ کوئی مزید انعام بھی دے سکتی ہے۔ یہ سوسائٹی کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۸۔ پہلا انعام مبلغ ۵۰۰ روپے، دوسرا مبلغ ۳۰۰، اور تیسرا مبلغ ۲۰۰ روپے کا ہوگا۔ انعامات کا فیصلہ ایک بورڈ کے مشورہ سے ہوگا جو سوسائٹی نامزد کرے گی۔ انعامات نیز اس مقابلے سے متعلق جملہ امور کی بابت کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کا فیصلہ قطعی تصور کیا جائیگا۔

۹۔ ڈراموں کے مسودات ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے پاس مذکورہ ذیل پتہ پہونچ جانے چاہئیں۔

سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی ۱۵/۴ میکلوڈ روڈ کراچی

۱۰۔ اگر کوئی اور امر وضاحت طلب ہو تو سکریٹری سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

"بنگلہ تنقید" ــــــــ بقیہ صفحہ: (۱۳)

ہمارے ادیب یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی بڑے حلقہ میں ان پر تنقید کی جائے۔

ہمارے نقادوں اور تخلیقی کام کرنے والوں نے خاموشی سے ایک قسم کے دوہرے معیار کو قبول کر لیا ہے۔ ایک وہ جو اپنے ملک کے قارئین کے لئے برتا جاتا ہے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ جس طرح آزادگی کا اظہار بنگلہ میں لکھے ہوئے تنقیدی مضامین پر کیا جاتا ہے اس سے زیادہ انگریزی میں لکھی ہوئی تنقیدوں پر ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے قارئین کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ ایسے مضامین کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اپنے ملک کو دوسروں کی نظروں میں نہ گراؤ۔ یہ ذہنیت بڑی عجیب ہے اور اُس معاشی بے اطمینانی کی آئینہ دار ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ ذہنیت اچھی تنقید کے منافی ہے جس کا فرض صاف گوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ ادب پاروں کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ وہ نقاد جو سچی بات کہنے سے ڈرتا ہے یا بلند معیار کو قبول نہیں کرتا، اپنے فرائض کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہمیں اپنے تنقیدی ادب کی تنگ خیالی کو دور کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے: وسعتِ علم اور بے باکی۔

"اگر اعتبار ہوتا!" ــــــــ بقیہ صفحہ: (۲۰)

عدنان :۔ ضرور۔ خدا کرے کل کی صبح بھی ایسی ہی خوشگوار ہو۔ کل میں بھی چڑیوں کے لئے تھوڑا سا دانہ لاؤں گا۔

درشہوار:۔ شکریہ۔ چڑیوں کو دانہ کھلانا ثواب کا کام ہے۔ معلوم نہیں میری خادمہ کہاں چلی گئی۔ (درشہوار کھڑی ہو جاتی ہے اور آوازیں دیتی ہے) سکینہ ــ سکینہ۔ کیا وقت ہوگا؟

عدنان :۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ معلوم نہیں میرا نوکر کدھر نکل گیا (آوازیں دیتا ہے) چمن چمن ــ

(عدنان دائیں جانب اور درشہوار بائیں طرف چل دیتی ہے

درشہوار:۔ (خود سے) نہیں نہیں میں ہرگز اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی درشہوار ہوں۔ اس کے تصور میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی درشہوار ہی کا رہنا زیادہ اچھا ہے۔ جس کے بال لانبے لانبے تھے اور جس کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب تھا۔ اور جو ہر سہ پہر اپنے دریچے سے سفید پھولوں کا ہار اس کی جانب پھینکدیا کرتی تھی۔

عدنان :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں ہی عدنان ملک ہوں۔ میرا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ یہی اچھا ہے کہ اس کے ذہن میں اسی عدنان کی تصویر رہے جو بڑا وجیہہ اور بہادر تھا اور جو ہر صبح گلابوں کا ایک گلدستہ اس کے دریچہ کی طرف پھینکا کرتا تھا۔

(سامنے سے سکینہ اور چمن نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے آرہے ہیں)

درشہوار :۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟

سکینہ :۔ کہیں بھی نہیں مالکن

عدنان :۔ کہاں تھے چمن؟

چمن :۔ بس قریب ہی تو تھا مالک

(درشہوار سکینہ کے کاندھے کا سہارا لے لیتی ہے۔ عدنان ملک چمن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور دونوں اسی طرح دائیں اور بائیں جانب روانہ ہو جاتے ہیں جس طرح پارک میں داخل ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ایک دوسرے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہیں)

عرفان :۔ (بہ آواز بلند) خدا حافظ! کل تک کے لئے۔

درشہوار:۔ خدا حافظ!

عدنان :۔ صبح بہت خوشگوار تھی۔

درشہوار:۔ بہت خوشگوار۔ کل پھر ایسی ہی صبح ہوگی!

(دونوں مخالف سمتوں میں روانہ ہو جاتے ہیں)

عدنان :۔ اللہ کی پناہ وہ کس قدر بدل گئی ہے!

چمن :۔ جی مالک؟

درشہوار:۔ کتنا بدہیئت ہو گیا ہے وہ!

سکینہ :۔ کیا مالکن؟

(پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

(مرکزی خیال ماخوذ)

باب مراسلات

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو
اُردو بورڈ، کراچی
۲۴۔جون ۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

میں نے آپ کا مضمون "اردو ادب کی تشکیل نو" پڑھا خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت صحیح اور گہری ہے۔ آپ نے مقدمۂ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کے انقلاب انگیز اثر کو جتانے کے بعد اس سلسلۂ انتقاد کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات سجھائی ہے وہ نہایت معقول، ضروری اور قابل توجہ ہے۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے کچھ حاصل بھی کیا۔ اُردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پرخلوص اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالحق

اپریل مئی اور جون کے ماہ نو پڑھنے کے بعد چند نتائج اخذ کر چکا ہوں ماہ نو کے نئے رجحانات کا انداز واضح ہو رہا ہے

آپ کے مضمون "اردو ادب کی تشکیلِ نو" کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی پرخلوص کوشش کی مضمون بیحد خیال افروز ہے اور واضح اشارات موجود ہیں جن کی روشنی میں منزل کا ہیولیٰ بھی ابھرتا ہے اور منزل کی طرف بڑھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً انسان سہل انگار ہے۔ خود سوچنے کی بجائے دوسروں کے فکر سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ خود سوچنا اور پھر اپنے فکر کو راہ نما بنا کر آگے بڑھنا خال خال نابغانِ دہر کا کام ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کی ہر تحریک کو اپنے اندر رچا کر نئی نئی راہیں تراشتے ہیں اور جدید روایات کی تشکیل کرتے ہیں۔

اسی قسم کے دو چار اور مضامین شائع ہوں تو آپ کی تحریک کا وہ رخ واضح ہو سکے جسے روشنی میں لانا انتہائی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ توجہ کریں گے۔ (یہ مضمون ایک طویل سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مدیر)

یہ ایک [illegible] ماضی اور اس کی روایات کو فراموش [illegible] سہارا لینا پڑتا ہے جو کہ [illegible] ہوں

لیکن دوسروں کے سہارے آگے بڑھنا بھی تو عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انگلی پکڑ کر چلانے والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور ایک کا جامہ دوسرے پر صحیح نہیں بیٹھتا بلکہ ڈھیلے بنتے اور پھٹتے رہتے ہیں۔ شہاب ثاقب کی چمک چند لحظوں کے لئے بہت شوخ و شنگ ہوتی ہے لیکن اس گریزپا روشنی سے کسب نور کرنے والے بھی چند لحظوں کے لئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کا فن چند لمحوں کی چکاچوند کے بعد تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

آپ کے مضمون کا لب لباب یہی ہے کہ ہمارا فن 'اپنا' ہونا چاہئے۔ ایسا فن جس کے متعلق ہم جرأت سے کہہ سکیں کہ یہ ہمارے ارادوں، ہماری اُمنگوں، روایتوں اور خواہشات کا مظہر ہے۔ اس کی ہر دھڑکن ہمارے اپنے دل کی لرزش ہے۔ ہماری روح کا ساز دوسروں کے مضراب کا ممنونِ احسان نہیں بلکہ اس کا ہر نغمہ ہماری اپنی مضراب سے لرزاں اور وجود میں آیا۔ مستعار خیالات اور مانگے تانگے کے جذبات کسی بڑے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ اپنے من میں اور اپنے من سے زیادہ اپنے ماحول اور اس کے مخصوص رجحانات میں ڈوب کر لکھنا ہی عظمت کا آئینہ دار ہے اور یہ عظمت بڑی کاوش اور سخت جانی کے بعد نصیب ہوتی ہے

غلام الثقلین نقوی

"ماہِ نو" اپریل ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر میری این شمل کا مضمون "منصور حلاج اقبال کی نظر میں" پڑھا یہ ایک قابلِ غور مضمون ہے جو اپنے اندر بڑی گہرائی لئے ہوئے ہے۔

علامہ اقبال میں مسائل اور شخصیات پر قلم اٹھانے کی جرأت تھی جو ایک بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں بعض خیالات کو ناگزیر طور پر از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ چنانچہ شیخ اکبر اور حافظِ شیراز کے متعلق ان کے تصورات میں تبدیلی ہوئی۔ منصور حلاج کے متعلق تو جیسا جاوید نامہ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اقبال کے تصور میں بڑی ہی نمایاں تبدیلی ہوئی۔

منصور کے بارے میں جو منفی نقطۂ نظر اقبالؒ نے شروع ہی سے اختیار کیا تھا وہ نہ عجیب تھا نہ دوسروں سے مختلف کیونکہ علی بن عثمان ہجویری (حضرت داتا گنج بخشؒ) نے بھی حسین فارسی (منصور حلاج) کے حلولی فرقے کو ملامت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"میں نہیں جانتا کہ فارسی کون ہے اور ابو سلمان کون۔ انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا۔ لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں

کچھ نصیب نہیں ہوتا۔"

علی بن عثمان ہجویریؒ کی رائے محض ایک عام صوفی کی رائے نہ تھی۔ وہ عالمانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح کی ایک سیدھی سادی اور پرخلوص رائے اقبالؔ نے بھی شروع میں اختیار کی جو آج ایک صاحبِ علم کی نگاہ میں کھٹکتی ہے کیونکہ منصور پر اب بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور میسی نانؔ جیسے مستشرق نے منصور کے مسلک میں جان ڈال دی ہے۔ جس کی تحقیق کے آگے شاید اقبالؔ کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

ڈاکٹر میری این شمیلؔ کے سامنے نہ مجھے صائب الرائے ہونے کا دعویٰ ہے نہ ان سے اختلاف کی مجال، تاہم یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ منصور حلاج کے مسلک سے اقبال کا متاثر ہونا، خصوصاً میسی نانؔ کی مطبوعات کے بعد کچھ زیادہ قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتا۔ اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اقبالؔ اور منصور میں بُعد المشرقین ہے۔ اقبالؔ اور منصور کے ہاں فنا فی اللہ کا مفہوم جُدا جُدا ہے۔ ان کے درمیان خودی سے بیکر بےخودی تک کی وسیع و عریض خلیج حائل ہے منصور کے اناالحق اور اقبال کے مردِ مومن میں کوئی موافقت نہیں۔ اقبالؔ کا مردِ مومن رومیؔ کے شیرِ خدا اور نیٹشے کے فوق البشر کے قریب تو ہے لیکن منصور کے اناالحق کے مفہوم کے نزدیک نہیں۔ نعرۂ اناالحق بدھ کے نروان اور شوپنہاور کی نفرتِ دنیا کے قریب تو ہے لیکن ایک کلیم سربکف اور حسینؔ بکنارِ فرات سے کوئی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے اناالحق کی تشریح وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی روشنی میں کی ہے اور رومیؔ کا حوالہ دیا لیکن اناالحق سے حلاج کا منشا واضح نہیں ہو سکا حالانکہ فاضل مضمون نگار نے حلاج کے شارح روزبہان باقلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر موصوف کی نظر رومیؔ کی تصنیف "فیہ۔فیہ" پر نہ پڑی ہو کیونکہ لوہے اور آگ والی تمثیل اسی سے ماخوذ ہے "فیہ مافیہ" میں رومیؔ کی اپنی زبان سے اناالحق کی تفسیر ایک نشست میں بیان ہوئی جو بڑی جامع ہے اور حلاج کے مسلک کے بالکل قریب ہے۔ فرمایا:-

"حلاج نے اناالحق کہہ کر کونسی بڑی بات کہی؟ بڑی بات تو وہ کہتے ہیں جو انا العبد کہتے ہیں۔ انا العبد کہنے سے دو ہستیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اللہ اور بندہ۔ لیکن اناالحق کہنے سے تو اپنی مکمل نفی ہوتی ہے، صرف خدا کا اقرار ہے۔ دوئی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے زیادہ عجز کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انکساری کیا ہو۔"

یہاں عجز و انکساری تو ممکن ہے حاضرین پر اثر ڈالنے کے لئے کہا گیا ہو کیونکہ اصل تحویل وحدت الوجود کے ایجاب کی صاف غمازی کرتی ہے۔ خود منصور کی بھی (جس نے اقصا الہند یہ کی خاک چھانی تھی اور فلسفۂ ویدانت سے ناواقف نہ تھا) اناالحق سے مراد وحدت الوجود کے اقرار باللسان کے سوا کچھ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ سراسر اسلامی توحید و تحقیق کے خلاف پڑتا تھا۔ ان حالات میں اقبال جیسا قرآن فہم تصورِ منصور کی کبھی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔

فاضل مقالہ نگار رومیؔ کے مقام و شرف سے ضرور واقف ہوں گی اور اقبالؔ تو رومیؔ سے بیحد مرعوب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال، منصور حلاجؔ کے متعلق زاویۂ نگاہ بدلنے میں میسیؔ نان کے رجحانات اور انکشافات سے تو متاثر ہوئے لیکن مولانا روم کی تشریح سے ناواقف رہے یا جان بوجھ کر چپ سادھ لی؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اقبال کا تصورِ حلاج اسی مسلک پر مبنی رہا جس کا ذکر انہوں نے اپنے لیکچروں میں کیا اور "جاوید نامہ" مرتب کرتے وقت بھول نہیں ہوئی۔ "جاوید نامہ" ایک جامع اور عظیم بالشان نظم ہے جس میں کئی مغربی نظموں پر تبصرہ اور شاہکاروں کا جواب ہے۔ "جاوید نامہ" میں زروان فرشتہ، ہر زنش نازنیں، منصور حلاج، افغانی یا رومیؔ کوئی ہو، ہر ایک میں اقبال خود ہی بول رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی مرکزِ فکر کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے جلا بخشی ہے۔ رہی اقبال کی اپنی زبان میں اناالحق کی تعریف تو ان کے کلام سے صرف ایک جوا ہر پارہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:-

اناالحق جز مقامِ کبریا نیست	سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ	اگر قومے بگوید ناروا نیست

سلیم صادق

مراسلات "ماہ نو" میں آپ کی دلچسپی کا عملی ثبوت ہیں۔ جو آپ کے افکار و تاثرات کو بروئے کار لانے میں آپ کا ہمیشہ ممد و معاون رہا ہے اس کے ذریعہ تبادلۂ خیالات میں سرگرمی سے حصہ لیجئے۔ (مدیر)

ر۔ خ

نقد و نظر

شرحِ دیوانِ غالب

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
ناشر: عشرت پبلشنگ ہاؤس،
ہسپتال روڈ، انارکلی، لاہور
صفحات: ۹۵۲ قیمت: آٹھ روپیہ

اس کتاب میں کلامِ اقبال کے ایک کار آزمودہ شارح نے دیوانِ غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ سابقہ شرحوں کی موجودگی جہاں اس کے لئے سہولت کا باعث ہوئی وہاں حصول امتیاز میں دقت آفریں بھی ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اپنا نقش درست کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ مگر ـــ جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے۔ کلامِ غالب کی تشریح ایک لامتناہی چکر بن کر رہ گئی ہے اور کسی شرح کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ شعر لیجئے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شارح نے حالی کا سہارا لیتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ "اگر یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے"۔ حالی نے جو معنی بتائے ہیں وہ اپنی جگہ معقول ہیں، لیکن "ہمت" ایک صوفیانہ اصطلاح بھی تو ہے جس کے معنی ہیں: ترکِ دنیا کی ہمت۔ چنانچہ غالب نے مثنوی "رنگ و بو" میں تین پریوں۔ دولت، قوت اور ہمت کا ذکر کیا ہے جو ایک بادشاہ کے خواب میں آئیں۔ آخر الذکر کے بارے میں غالب نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس شعر کو دیکھا جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جو قطرہ دنیا کو ترک کر دینے کی ہمت رکھتا ہے ہم اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح "رہا آباد عالم ....." میں جو گنجلک سی نظر آتی ہے وہ 'ہمت' کے اِس مفہوم سے فوراً دور ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی شرحِ تازہ کی گنجائش کئی اور اشعار میں بھی ہوگی۔

شارح کو عربی و فارسی پر خوب عبور ہے۔ اس سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور اسلامی افکار و نظریات کے اصلی ذرائع سے استفادہ کر کے وحدت الوجود کے بارہ میں نہایت اہم انکشافات کئے ہیں۔

ایک جدید شارح سے لازماً یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ ذوق اور تنقید کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرے گا۔ قاری کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ مقدمہ میں من و عن دوسروں کی پامال آراء کو دوہرا دیا گیا ہے۔ غالب کے متعلق کئی باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ خصوصاً اس کی فارسی شاعری کے بارے میں۔ تعجب ہے کہ شارح نے ان کے فارسی کلام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے متعلق روایتی رائیں دوہرا دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تصوف کے 'برائے شعر گفتن' ہی کی حد تک قائل تھے۔ اگر تعارف میں مکتبی و رسمی رنگ غالب نہ ہوتا تو کتاب کی افادی حیثیت زیادہ بلند ہوتی۔

قادر نامۂ غالب

مرتب: تحسین سروری
ناشر: مکتبہ نیا راہی
صفحات: ۶۴، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

آثارِ غالب کی تلاش اب بجائے خود ایک مقصود بن چکی ہے اور ہم آئے دن اس میں کسی نئی دریافت کا اضافہ پاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک "قادر نامہ" ہے جس کا مقصد بچوں کو فارسی کے عام الفاظ اور ان کے معانی ذہن نشین کرانا ہے۔ یہ کتاب ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں۔ یہ نظم مدتوں نایاب رہی اور اس کا غالب کی تصنیف ہونا بھی مشتبہ تھا۔ مرتب نے اس کا سراغ پا کر ضروری معلومات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جن لوگوں نے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "قادر نامہ" کے کئی الفاظ کو مانوس پائیں گے۔ یہ اس منظوم کتابچہ کے غالب کی تصنیف ہونے کی ایک اور بہت عمدہ شہادت ہے۔

کلامِ بینظیر

مرتب: محمد اکبر الدین صدیقی
ملنے کا پتہ: کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن
صفحات: ۴۶۴، قیمت صہ روپے

سید محمد بینظیر شاہ وارثی بینظیر صحیح معنوں میں ایک صوفی منش اور درویش سیرت شاعر تھے۔ گو ان کا چرچا ایک فطرت نگار شاعر ہی کی حیثیت سے رہا ہے۔ اسلئے انکے اس نئے اور حقیقی عارفانہ رنگ کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ درحقیقت ان کی فطرت نگاری

جس میں وہ زیادہ کامیاب رہے ہیں، عرفان و سلوک ہی کا جزو ہے۔ ان کا رشتہ ایک طرف فارسی قادری مجددی سلسلوں سے ملتا ہے تو دوسری طرف سنائی اور عطار جیسے شاعروں سے۔ انکی شاعری مذہب و تصوف کے دبیز پردوں ہی سے گزر کر آتی ہے۔ اسلئے اس کا اپنا رنگ نسبتہً کم نمایاں ہے۔ قاری زیادہ تر مجذوبیت ہی کا احساس لے کر اٹھتا ہے۔ بنابریں شاعر ایک گزشتہ دور کی یادگار کی حیثیت ہی سے قابلِ توجہ ہے۔

اقبال کا سیاسی کارنامہ

صفحات: ۵۲۳، قیمت چھ روپے
ناشر: کاروانِ ادب، کراچی
از محمد احمد خاں

اقبال کا شعری و فکری کارنامہ اس قدر نمایاں رہا ہے کہ اس کے سامنے ان کے سیاسی کارنامے کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا لیکن قیام پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے سیاسی فکر کی اساس کس قدر مضبوط تھی۔ کیونکہ یہ درحقیقت ان کے حکیمانہ فکر کا جزو تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں اس اہم موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اندازِ بیان بہت صاف اور دلکش ہے جس میں عنوانات کی طرحداری اور بھی کیف پیدا کرتی ہے۔

حسرت کدہ

از شفقت کاظمی
ناشر: علمی کتب خانہ، مظفر گڑھ
صفحات: ۱۷۶ ۔ قیمت: تین روپے

"کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ہم ان کی پہلی اور آخری غزل میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے"

بات نیاز فتحپوری کے انہی الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آخر یہ حسرت کدے تعمیر کرنے کی خواہش کیوں؟ شفقت کاظمی کے علاوہ جلیل قدوائی بھی تو خاکپائے حسرت ہونے کے مدعی ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے شاعر کی ریس کرنے سے نہ تو شاعر بن سکتا ہے اور نہ اس جیسا شاعر اور نہ بڑا شاعر۔ خواہ وہ میر ہو یا غالب یا اقبال۔ اور پھر ریس بھی وہ جس میں اپنی خودی تمام تر غیر کی خودی بن جائے۔ رنگِ حسرت کو اگر وقیع بھی تسلیم کر لیا جائے تو نہ شفقت کاظمی کے یہاں اس کی کوئی علامت ہے نہ جلیل قدوائی کے یہاں۔ جب وہ بنیادی احساس و تجربہ ہی نہیں یعنی حسن سے گہرا لگاؤ اور عشق کی سرمستی اور سوز و گداز تو پھر کلام میں تاثیر کہاں؟ اس قسم کی شعری پیرپرستی اور مریدانہ ذہنیت شعر و ادب کے لئے کوئی

ابھی خال نہیں۔

تاریخ آزاد پٹھان

از مولانا اللہ بخش یوسفی
صفحات: ۳۱۲، قیمت چار روپے آٹھ آنے
(جلد اوّل)
ملنے کا پتہ: محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی۔ کراچی ۵

کچھ عجب نہیں کہ آزاد پٹھانوں کی اس پہلی مبسوط تاریخ سے نہ صرف سرداران قبائل کے چہرے چمک اٹھیں بلکہ تمام ملتِ پاکستان کے دل میں بھی فخر و مسرت کی لہر موجزن ہو۔ کیونکہ یہ اسی کے شجیع و دلاور فرزند ہیں جن کی ساری تاریخ آزادی و حریت اور جہاد ہی کی تاریخ ہے۔ مصنف نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا ہے اور مورخانہ تحریر کی متانت اور صفائی کو بھی بڑی کامیابی سے برقرار رکھا ہے، جو تاریخی کتابوں میں شاذ ہے۔ غرض مند عناصر اور ناساز حالات نے پشتونوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں ان کو احتیاطاً سے دور کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پٹھانوں کی صورت و سیرت اور نسل و قوم کے حقیقی خدوخال جلوہ گر ہیں۔

زلیستم

از لیفٹننٹ کرنل مشتاق احمد
صفحات: ۱۲۸، قیمت: درج نہیں۔
ملنے کا پتہ: مکتبہ رحمانیہ گھوڑہ، ضلع راولپنڈی

ہست ہم تقلید از اسمائے عشق۔ اور فارسی و اردو رباعیات کے اس مجموعہ پر جو ایک سپاہی شاعر کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں، شروع سے آخر تک عشق ہی عشق چھایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ شاعر پر اسکے مرشدِ اقبال کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ہم آہنگی حکیم ملت کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے کہ۔ یہاں اب مرے ہم زباں اور بھی ہیں۔

(۱) "سیارہ"۔ فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن، کراچی
(۲) "ارم"۔ کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری اسکول کراچی
(۳) "ہونہار"۔ گورنمنٹ سیکنڈری اسکول ۲ جیکب لائن۔ کراچی
(۴) "سید رضا علی کالج میگزین" (۵۸-۱۹۵۷)۔ کراچی

یہ چاروں رسالے ہماری نئی پود کی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بہت امید افزا بھی۔ ایسے کہ ہم ان آئینوں میں حسنِ فردا کی جھلک دیکھ سکیں۔ ان سب میں مواد اور پیشکش کے اعتبار سے امتیاز مشکل ہے لیکن اول الذکر میں ریحان کے خاکوں اور کارٹونوں سے کچھ زیادہ تعیش دل و نگاہ کا سامان نظر آتا ہے۔ امید ہے یہ کوششیں آئندہ اور بھی وقیع ثابت ہوں گی۔

آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک
اور دل کا سرور
یہ پھول سے نازک ـــــ آپ کے لخت جگر ـــــ جب چلچلاتی دھوپ کی تپش اور لو کے جھکڑوں سے پژمردہ ہو کر اسکول سے گھر واپس آتے ہیں۔ تو انھیں موسم گرما کی اس بے رحمی سے نورس ہی نجات دلاتا ہے۔
نورس کو دیکھتے ہی شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ نورس کا استعمال گرمی کی حدت اور کوفت کو ختم کر کے تسکین اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔
بیش قیمت اجزا اور تازہ پھلوں کے رس سے تیار کردہ نورس اپنے وقت کا مقبول ترین مشروب ہے۔
NAURUS
نورس
مشروبِ وقت
احمد فروٹ پروڈکٹس کراچی
پروپرائیٹرز:۔ احمد فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ

بچّے کی
پیدائش
سے پہلے...
ماں کی زندگی کے تحفظ میں کیا چیز مدد دیتی ہے؟
آپ کا ڈاکٹر آپکو بتائیگا کہ پیدائش کی نالی کی بیرونی جلد یا اندرونی جھلی میں اگر ذرا سی بھی خراش ہوجائے تو جراثیم کو اُسمیں داخل ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر زچہ چھوت کی بیماری یا زچگی کے بخار میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ بہت سی خواتین اس بات کو نہیں جانتیں کہ زچگی کے وقت جو چھوت لگ جاتی ہے اُس سے زچہ کو نہایت شدید تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور اُس کے بعد یہ حالت مستقل صورت اختیار کرلیتی ہے اور کبھی کبھی اس کا نتیجہ بانجھ پن ہوتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے کہ زچگی کے موقع پر ڈیٹول کس طرح استعمال کرنا چاہیئے۔
بچے کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے دوران میں اور پیدائش کے بعد ڈاکٹر اور دائیاں حاملہ خواتین کی حفاظت کیلئے ڈیٹول پر اعتماد کرتے ہیں۔ انکی تقلید کیجیے۔ ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔
ڈیٹول
* ایک زود اثر دافع عفونت دوا ہے جو جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر دیتی ہے۔
* یہ آیوڈین یا لائی سول کی طرح زہریلی نہیں ہے۔
* اسے ایک بچہ بھی محفوظ طریقہ پر استعمال کرسکتا ہے۔
* یہ جس جگہ لگائی جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو ناگوار ہرگز نہیں۔
DETTOL
ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔
ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ۔
پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۲۳۸ - کراچی نمبر ۱
پیشہ ور ڈاکٹر ڈیٹول استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔
RC 812
JWT

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہِ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان" معرفت پاکستان ہائی کمیشن، شیر شاہ میس روڈ۔ نئی دہلی (انڈیا)

منجانب: ادارۂ مطبوعات پاکستان،
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

صورِ اسرافیل

مغنیِ آتش نفس، قاضی نذرالاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم — مقدمہ شان الحق حقی۔

نذرالاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی تھا جس کے گرجدار آہنگ نے صورِ اسرافیل کی طرح قوم کے تنِ مردہ میں پھر حیات کو پھونک دی تھی۔

اس کا مقدمہ جو نہایت کاوش سے لکھا گیا، نذرالاسلام کی شخصیت اور شاعری پر اردو میں اپنی طرز کا نادر مقالہ ہے۔

ہر صفحہ دیدہ زیب آرائش سے مزین ہے، سرِورق مشرقی پاکستان کے فنکار زین العابدین کے موقلم کا حیرت آفریں شاہکار ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ
ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ: ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ کراچی ؛ مدیر: رفیق خاور

خانگی مسرت اور خوشحالی

ہماری قوم ہمارے گھروں ہی کا مجموعی نام ہے افراد کی خوشحالی قوم کی
خوشحالی کے ساتھ وابستہ ہے قوم کی خدمت کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم
اپنے گھروں کو بہتر اور زیادہ خوشحال بنائیں اس کے لئے خرچ میں کفایت
اور سلیقہ مندی کی بھی ضرورت ہے ہماری آمدنی کا کچھ حصہ بچانے
کے لئے بھی ہوتا ہے اور بچت کی بہترین صورت یہی ہے کہ بچت کے سرٹیفکیٹ
خرید لئے جائیں جس سے قومی ترقی کو بھی مدد پہنچتی ہے ان پر ۶ فیصد منافع
ملتا ہے یہ زائد آمدنی یقیناً ہماری خانگی خوشحالی میں اضافہ کا باعث ہوگی

سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگائیے

۶ فیصدی منافع انکم ٹیکس معاف

ہر ڈاک خانے سے مل سکتے ہیں

ماہ نو

یوم پاکستان کے موقع پر مسلح افواج کی سلامی

یوم پاکستان کی تقریب استقبالیہ
صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان اور بابائے اردو
ڈاکٹر مولوی عبدالحق

لفٹیننٹ جنرل اعظم خان.
محمدپور کولونی (ڈھاکہ) میں بےخانماں لوگوں کے لئے
کم قیمت مکانات کا ملاحظہ فرما رہے ہیں

صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان
پاکستانی اون کے تحقیقاتی ادارہ میں

پاکستان کا مرکزی بجٹ: وزیر خزانہ
مسٹر محمد شعیب کا پریس کانفرنس سے خطاب

۱۹۲۹ء ٹین کے ڈبوں کے ذریعہ
۱۹۳۹ء پمپ کے ذریعہ
۱۹۵۹ء جدید طرز کے سروس اسٹیشن کے ذریعہ

برماشیل کے وسیع نظام اور سالہاسال کے تجربہ نیز شیل جیسے عالمی ادارہ سے وابستگی کی بدولت یہ سہولتیں بہ آسانی فراہم کی جاسکی ہیں۔

موٹر میں ڈبوں کے ذریعہ پٹرول ڈالنا مشکل اور دیر طلب کام تھا۔

ہاتھ سے چلائے جانے والے پمپ نے ڈبوں کی جگہ لے لی مگر کوئی اس دور کے پمپ چلانے والے کے دل سے پوچھے۔

ایسے سروس اسٹیشن قائم کئے گئے جن میں موٹروں کے لئے کنارہ رستوں کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ سروس کا انتظام کیا گیا۔

... آج شیل کے ماہرین آپ کی خدمت میں
پٹرول پیش کر رہے ہیں جس میں آئی سی
مناسب مقدار شامل ہے اور کل؟ .....

برماشیل ترقی پاکستان کا حصہ ہے

جلد ۱۲

مئی ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

شائع کردہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ نمبر ۱۸۳، کراچی

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے — فی کاپی: آٹھ آنے

آپس کی باتیں

پُر آشوب طوفانی مرحلوں سے گزر کر ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جس میں ٹھہراؤ ہے۔ اب نہ موجیں ہم سے دست و گریباں ہیں اور نہ ہم موجوں سے دست و گریباں۔ بلکہ ہمیں مدت کے بعد آسودۂ ساحل ہونے کا موقع ملا ہے اور یہ وقت ہے کہ ہم نئے سرے سے سامانِ سفر تازہ کریں۔ اب ہم پورے اطمینان سے ان معاملات پر غور و خوض کر سکتے ہیں جن کی قبل ازیں ناموافق حالات نے اجازت نہیں دی۔ یہ ایک لمحۂ فکر ہے اور ہماری کوششوں کے نتائج اسی قدر وقیع ہوں گے جتنا ہم اپنے معاملات کے بارہ میں صحیح قدم اٹھائیں گے۔ بہر حال اس ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ : ؎

باز بر رفتہ و آئندہ نظر باید کرد

اور یہاں ہمارا روئے توجہ زیادہ تر ادب و ثقافت کی طرف ہے۔ ہمارا شروع ہی سے یہ مطمحِ نظر رہا ہے کہ ہم ایسے اسباب و عناصر فراہم کریں جن سے ہیئتِ ملّیہ کی کما حقہٗ تشکیل ہو اور جو ہمارے ملّی خصائص کو زیادہ سے زیادہ پیغام نمود دے۔ ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے ہیں اور ہمیں مسرت ہے کہ ذی شعور طبقہ نے اس سے کافی اثر لیا ہے۔ اب ہمیں اپنی سمت کو اور بھی واضح اور متعین کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ مقاصد اور ان کے ذرائع حصول میں اور بھی ہم آہنگی ہو۔

"ماہ نو" کی حد تک ہماری سمت بہت واضح ہے۔ ملّی تشخص کے لئے ملّی ادب و ثقافت اور ملّت ساز عناصر و عوامل کی نشو و نما۔ اس سمت میں ہم نے پہلے بھی اقدام کئے ہیں۔ آثارِ کہن، تاریخ و تہذیب، علاقائی روایات و شعائر، مشاہیر، تحریکات سب اسی سعیٔ بلیغ کے آئینہ دار ہیں لیکن اب ضرورت ہے کہ تاروں کی گردش کچھ اور بھی تیز ہو اور اپنے جلو میں شدید تر کوششیں لائے تاکہ بنائے ملّت استوار تر ہو اور حصول مقاصد کی سعی و کوشش اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پچھلے چند شماروں کی طرح اس شمارہ میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آئے گی۔ ہمارے کتنے ہی علمی خزانے، زندگی کے کتنے ہی گوشے، تہذیب و تمدن کے کتنے ہی نادر پہلو اور کتنی ہی مایۂ ناز شخصیتیں نگاہوں کی دسترس سے دور پڑی ہیں جن کو جاننے اور دنیا سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ان اہم عناصر کو جو ہماری ثقافت کی بنیادی ہم آہنگی کا ثبوت اور اس کے مختلف مظاہر ہیں، اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ ہمارے شعور کا جزو بن جائیں تو وہ ملّی استحکام کا مؤثر ترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ان سے ہمارا حصارِ ملّت اور بھی مضبوط ہوگا اور ہم وثوق سے کہہ سکیں گے کہ : ؎

بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

★

سرورق :

دھان کوٹنے والیاں :۔۔۔۔ عمل : قاضی عبدالباسط

صبحِ صادق

ابوالاثر حفیظ

عرشِ اعظم سے دعاؤں کا جواب آ ہی گیا
ارضِ پاکستان پر بھی انقلاب آ ہی گیا

انقلاب ایسا کہ عالم میں نہیں جس کی نظیر
نرم نرم اس مرتبہ اُٹھا ہے دستِ "سخت گیر"

چھا گیا ابرِ کرم بجلی گرانے کے بغیر
خوں کیا — آنسو کا اک قطرہ بہانے کے بغیر

ہو گئیں مظلوم بندوں کی دعائیں مستجاب
چیر کر ظلمات کے سینے کو اُبھرا آفتاب

آفتاب اُبھرا، گھٹا چھائی تجلیات کی
ہو گئیں روپوش اولادیں اندھیری رات کی

عدل کی میزان قائم کرنے والا انقلاب
ہر تہی قسمت کا دامن بھرنے والا انقلاب

زخمِ محتاجی کا مرہم، دردِ ذلت کی دوا
مژدۂ لَاتَقْنَطُوا — رنجورِ ملت کی شفا

خارجی خطروں کا سدِّ باب فرماتا ہوا
داخلی فتنوں کا زہرہ آب فرماتا ہوا

آگیا — دورِ مساوات و اُخوت آگیا
دامنِ جمہور میں سامانِ قوت آگیا

آؤ ہم بھی — جان و تن میں روح کو جاری کریں
صبحِ صادق آگئی — اعلانِ بیداری کریں

آؤ رسمِ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ — تازہ کریں
چشمِ ابراہیمؑ سے ذوقِ یقیں تازہ کریں

ابرِ رحمت بن کے برسیں کائناتِ زیست پر
کشتِ اُمیدِ بشر کو ہر کہیں تازہ کریں

عید کی صورت میں دیکھیں معنئ ذبحِ عظیم
عشق کے عہدِ کہن کو پھر دیں تازہ کریں

گونج اُٹھے تھے آسماں جس نعرۂ توحید سے
پھر وہی ہنگامہ بالائے زمیں تازہ کریں

سرکشی نے کر دئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

آؤ سینے میں بسا لیں پھر مدینے کی بہار
دل میں حبِّ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَؐ تازہ کریں

دوسروں سے کیوں کہیں قربان ہونے کو حفیظ
کیوں نہ اس رسمِ کہن کو پھر ہمیں تازہ کریں

فسانہ تھے وہ لوگ!

(میر تقی میر کی زندگی کا ایک واقعہ)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

آزاد نے میر صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ "جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی، یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے "صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے خیر آپ کا شغل ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ گاڑی میں ان کا ساتھی کون تھا۔ اس کا پتا ہمیں ایک دوسری جگہ سے ملتا ہے :۔

خواجہ امیر احمد آری قادری، لکھنؤ کے امرا میں سے تھے۔ ان کے والد خواجہ بادشاہ خاں، نواب سعادت علی خاں کے مدار المہام تھے۔ چنانچہ جب نواب صاحب گورنر ہسٹنگز سے ملنے کلکتہ گئے تو یہ ان کے ہمراہ تھے۔ خواجہ امیر کی یادگار ایک کتاب "معدن الجواہر" ہے جو انہوں نے ۱۲۳۵ھ میں تالیف کی جبکہ ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امیر صاحب علم شخص تھے۔ ان کی تحریر منشیانہ ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ کتاب کے نام کی مناسبت سے فصل یا باب کو "جوہر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کل کتاب میں بیس جوہر ہیں اور ہر جوہر کسی خاص طبقے کے واقعات و حکایات پر مشتمل ہے۔ یہ بڑی دلچسپ اور عجیب کتاب ہے۔ مؤلف نے اس میں ایسی حکایتیں یا نقلیں یا واقعات جمع کر دئیے ہیں جو اس نے اپنے بزرگوں اور معتبر اشخاص سے سنے یا بچشم خود دیکھے اور بہت سی ایسی ظریفانہ اور عجیب و غریب حکایتیں ہیں جو بقول مؤلف "در ورع ہمہ راست مانند ایں و برائے پڑھنے والے کے لئے" باعثِ معلومات و سرمایۂ علم مجلس و موجب افراح متواتر" ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں حیدرآباد دکن کے مطبع گلزار احمدی میں طبع ہوئی تھی۔

کتاب کے "جوہر دہم (در بیانِ صفاتِ بد و بخت زبون ہر کس)" میں یہ واقعہ لکھا ہے :۔

"نقل :۔ تقی تخلص میر کہ سرآمد شعرائے ہند بود و عمرش قریب بصد سال رسیدہ در عہدِ وزارتِ نواب سعادت علی خاں بہادر اکثر اوقات در خانۂ ما می آمد، غزلہائے آبدار خود خواندہ مستمعان را محظوظ ساخت۔ والد بزرگوار راقم آثم بادے سلوک ہائے نمایاں می کرد۔ زبانی چند کس معتمد بہ فرح سمع گردید کہ یک بار میر تقی و میر ضیاء الدین کہ او ہم شاعر زبردستے بود، ہر دو بیک عرابہ بنشستہ عازم سفر بودند و قریب یک ماہ ہم سفر بودند۔ امّا ہر دو کس مذکور شدہ بغرورِ شاعری خود شاں دریں مدت ہم کلام نشدند۔ یکے بہ یک پہلوئے عرابہ روئے دوم بہ پہلوئے دیگر عرابہ بود و پشتہائے ہر دو ملاصق ہمدگر۔ ایں بد خلقیہا را لحاظ باید کرد کہ چہ قدر تنگ خو بودند۔ چنانچہ مولوی معنوی جلال الدین رومی ہم دریں معنی فرماید ؎

اے بسا ہندو و ترک ہم زباں

اے بسا دو ترک چوں بیگانگاں"

ترجمہ نقل :۔ تقی تخلص میر جو شعرائے ہند کے سرتاج تھے اور ان کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد وزارت میں اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ اور اپنی والا ویز غزلیں پڑھ کر سننے والوں کو محظوظ کرتے تھے۔ راقم آثم کے والد بزرگوار ان سے بہت عمدہ سلوک فرماتے تھے بعض لوگوں کی زبانی یہ بات تفریح سے سُنی گئی کہ ایک بار میر تقی اور میر ضیاء الدین جو خود ایک زبردست شاعر تھے، دونوں ایک گاڑی میں بیٹھے سفر کر رہے تھے اور ایک

مہینہ اکٹھے سفر کرتے رہے لیکن دونوں اشخاص مذکورہ اپنی شاعری کے گھمنڈ میں اس تمام عرصہ ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہوئے۔ ایک کا رخ گاڑی کے ایک طرف اور دوسرے کا دوسری طرف تھا اور وہ پشت بہ پشت بیٹھے تھے۔ یہ بدخلقی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کس قدر تنگدل تھے۔ چنانچہ مولوی معنوی مولانا جلال الدین رومی نے بھی اس بارہ میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ

"کتنے ہی ہندو اور ترک ہیں کہ ہم زباں ہیں، اور کتنے ہی ترک ہیں جو ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں!"

میر ضیاء الدین ضیاءؔ اردو کے مشہور شاعر اور استاد گزرے ہیں۔ میر حسنؔ کو بھی ان سے تلمذ تھا۔ میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں ان کی بہت تعریف لکھی ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کچھ کم نہیں۔ خواجہ امیرؔ نے یہ واقعہ خود میر صاحب یا اپنے والد کی زبانی نہیں سنا بلکہ چند معتمد اشخاص کی زبانی سنا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ اشخاص کون تھے۔ اس کی تصدیق کسی اور تذکرے وغیرہ سے بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف خواجہ امیر کے بیان کی بنیاد پر اس واقعہ کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے۔ مگر بہرحال یہ بیان ایسا نہیں جو نظر انداز کر دیا جائے ممکن ہے آئندہ تحقیق اس پر کچھ روشنی ڈالے ◆

★

استفسار

دورِ جہانِ آب و گِل سے
ہم انسانوں کی محفل سے
اے فردوس کو جانے والو!
لافانی، ملکوتی روحو!
عالمِ بالا کے سیارو!

تم ہمیں اکثر یاد آتے ہو
ہم بھی تمہیں یاد آتے ہیں؟

تم نے چھوڑا عالمِ ہستی
سفلی انسانوں کی بستی
یہ دنیا، اس کے ہنگامے
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
شور و شغب اور ہا و ہو کو
عربدہ زارِ ما و تو کو
کھو گئے ایسے، ایک نفس بھی
دنیا کو آواز نہ آئی!
یاں ترسیں دن رات نگاہیں
جانے کھلیں کب دید کی راہیں

تم بستے ہو سدا دلوں میں
ان آنکھوں میں، ان سینوں میں

ہم بھی اُس دنیا کے مکینو!
دل میں تمہارے رہ پاتے ہیں؟

تم جنید سالارِ جہاں تھے
روح و روانِ زندہ دلاں تھے
سینوں میں اک آگ بھری تھی
برقِ تپاں رگ رگ میں بسی تھی
طوفانوں کا شور نفس میں
بجلیاں لہراتی نس نس میں
تم میں ایسا سحر نہاں تھا
سر تا سر مسحورِ جہاں تھا
یاد سے ہیں مخمور دل و جاں
تڑپاتی ہیں سونی گھڑیاں

اے فردوسِ بریں کے تارو!
ہم بھی تمہیں کیا تڑپاتے ہیں؟

★

عاصمہ حسین

کینٹو:

ستارۂ انقلاب

سید جعفر طاہر

بنامِ خدائے سخن آفریں و الٰہِ سخن گسترانِ زمانہ
بنامِ دبیرِ حکایاتِ ہستی، امیرِ سپہرِ کلام و فسانہ
بنامِ شہنشاہِ شیوا نگاراں، بنامِ جہاں دارِ جادو بیاناں
بنامِ نویسندۂ دفترِ آرزو، خسروِ بزمِ شیریں کلاماں

بنامِ نگارش گرِ مصحفِ عالم و قصۂ آدم و خاک زاداں
بنامِ نگارندۂ لوحِ تقدیر و سرکاتبِ قسمتِ پاک زاداں
بنامِ ہمہ دانش و حکمت و علم و پروردگارِ ادب آفریناں
سزاوارِ حمدِ ہنر پروران گرامی، خداوندِ باریک بیناں

خیالات کے طائرانِ سبک تاز کو اذنِ پرواز دینے لگا ہوں
زہے ذوقِ نغمہ سرائی کہ تا اور زبانوں کو آواز دینے لگا ہوں
نہ "سدِ سکندر" کی سختی کا ڈر ہے نہ "دیوارِ چیں" کے ستم کی ہے پروا
یہ دھرتی کے سینے پہ نیچی لکیریں، لکیروں سے رکتا نہیں سیلِ دریا

مری راہ میں خوف کی ظلمتیں بھی گراں تا گراں ہوں تو پروا نہیں ہے
پرانا سپاہی ہوں اور مجھ کو ان سے کوئی خاص ایسا بھی پروا نہیں ہے
گرجتی چمکتی گنوں سے برستی ہوئی گولیوں میں غزل خواں رہا ہوں
گلے سے عروسِ اجل کو لگائے محاذوں پہ بے خوف رقصاں رہا ہوں

عناں بر عناں ظلم کی دیویاں میری راہوں میں نعرہ زناں ہیں تو کیا ہے
یہ راہِ سخن ہے، تہِ راہ دمنزل کئی دامِ تیرہ نہاں ہیں تو کیا ہے
مرے دوستو میں سپاہی ہوں اور مصلحت کے تقاضوں سے بھی باخبر ہوں
مگر ایک شاعر بھی ہوں اور حالات کے سازپر آج پھر زخمہ گر ہوں

رگ و پے کے بالین و بستر پہ سوئی ہوئی چاندنی پھر ہمکنے لگی ہے
ادھر موتیوں کے سفینے ستاروں کے زینے سے زہرہ[1] اترنے لگی ہے
یہ طبعِ بہانہ طلب "رشحۂ فیض" کی داد پا کر برسنے لگی ہے
عروسِ سخن آسماں سے اتر کر نہاں خانۂ دل میں بسنے لگی ہے

بڑی دیر کے بعد آوازۂ کلکِ صد زمزمہ ساز آنے لگا ہے
شگافِ قلم سے برستی ہوئی شبنموں میں زمانہ نہانے لگا ہے
بڑی عمر کے بعد فکر و نظر کی سیہ بخت راتوں کی تقدیر جاگی
شبِ شبہ گوں کی سیاہی چھٹی، پو پھٹی، ہر طرف ایک تنویر جاگی

مری کانپتی انگلیاں پردۂ ساز پر چھیڑتی ہیں نرالا ترانہ
ترانہ کہ جس کے ابھرتے سروں کے جلو میں رواں عظمتِ خسروانہ
سپاہی کی بے لوث قربانیوں کا ترانہ، یہ اک نغمۂ فاتحانہ
نئے دور کی برکتوں کا فسانہ، نشید و نویدِ نصیبِ یگانہ

مگر کوئی سُر خونچکاں بن کے ابھرے تو خونِ رگِ جاں کی تصویر سمجھیں
بڑا ظلم ہوگا اگر ظلم کو آپ اہلِ نظر صرف تقدیر سمجھیں
مغنّی کے سینے میں جو لوٹ کر رہ گئے ہیں ستم کے زبوں تیر دیکھیں
سُروں کے بہاؤ میں اپنی بدلتی ہوئی قسمتوں کی لکھی تفسیر دیکھیں

مرے ہمدمو، دوستو، ساتھیو! سن چکا ہوں ہزاروں حسیں داستانیں
وہی گیسوؤں کی برستی گھٹائیں، سنا برق بینوں کی تیتی سنانیں
لب و زلف و رخسار کے تذکرے ساحتِ دوش و بازو کی پرکیف باتیں
گماں ہو رہا ہے خمِ ابرواں میں گذاری ہوں جیسے یہ پُرہول راتیں

---

[1] زہرہ، غالب: ترکِ سپہر از نہیبِ شغلِ عطارد گزید ٭ قاضیِ چرخ از نشاط پیشۂ زا در گرفت (مدیر)

حکایاتِ آہو نگاہانِ تاتار و کوثر لبانِ عدن کے فسانے
فسونِ ہوائے سرِ زلفِ خوباں، گنگناتی ہوئی انکھڑیوں کے ترانے
جوانی میں دیکھے ہیں میں نے بھی کتنی جنوں خیز آنکھوں کے سچے نشانے
گلابی لبوں کے سبو، نقرئی انگلیوں کی لَویں، نور کے آستانے

مجھے علم ہے نرم سرگوشیاں گرم سانسوں میں تبدیل ہوتی ہیں کیونکر
شبِ وصل انگڑائیاں ہولے ہولے نشہ بن کے تحلیل ہوتی ہیں کیونکر
مجھے علم ہے نازنینانِ پیماں شکن ہم سے لیتی ہیں ہر قول کیونکر
مجھے علم ہے ایک بوسے کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے ماحول کیونکر

مگر اے ستائش گرانِ فسوں کاریٔ لعلِ لب ہائے جادو طرازاں
پرستندگانِ شفق سازیٔ وارغواں زاریٔ روئے شعلہ عذاراں
یہ مانا کہ حسن و محبت کی پُر کیف باتوں سے ہے زینتِ ہر فسانہ
مگر اس گھڑی جب گلستاں میں کہرام برپا ہو، جلنے لگے آشیانہ

فریبِ ہوا و ہوس کے علاوہ بھی ہیں زندگی کے ہزاروں تقاضے
کہاں تک بھلا کوئی تکتا رہے آرزوؤں کے جلتے سلگتے جنازے
غمِ جاں کی تاریک راتوں میں انساں سراغِ سحر کیلئے ہو روانہ
نمِ اشک سے ریگ زاروں کو سینچے مہ و کہکشاں کو بنائے نشانہ

جنوں خیز انگڑائیوں کے بھنور سے ابھر کر یم زندگانی میں کھیلے
عناں بر عناں یہ بلاؤں کے ریلے، قیامت کے میلے دکھوں کے جھمیلے
وہی مرد ہے جو سپاہانہ انداز میں ان حقائق سے پنجہ ملائے
مصیبت زدوں کا بنے آسرا، بے نواؤں کو بندِ ستم سے چھڑائے

مقدس وطن کی محبت کے مارے ہوؤں کی سنانے لگا ہوں کہانی
کہانی جسے سن کے ہو پانی پانی، جوانانِ آہن قبا کی جوانی
کہانی کہ جس کے خم و پیچ میں سینکڑوں دم گرفتہ امیدوں کے لاشے
کہیں ٹوٹتی ہچکیاں ہیں، کہیں وہ فریبِ ہوس کے ہزاروں تماشے

سنا ہوگا تم نے کہ ہم بے نواؤں میں اک مردِ تقدیر ساماں ہوا ہے
دیارِ بتاں میں محمد علی نام کا ایک مردِ مسلماں ہوا ہے
جناحؒ جگردار وہ صاحبِ جرأت و عزم و فہم و شعورِ یگانہ
وہ مومن کہ جس کی نگاہوں میں نرمی تو پاؤں کی ٹھوکر میں سارا زمانہ

اسی کا یہ اعجاز تھا ہم اسیروں نے پائی جو بندِ اجل سے رہائی
اسی کا یہ فیضان تھا پھر میسر ہوئی بارِ دیگر جو فرماں روائی
گدایانِ شب کوک و محرومِ برگ و نوا قائدِ قوم سے شادماں تھے
سپاہ محمد کے بانکے جیالے جواں آج پھر قوم کے پاسباں تھے

زمانے کے چالاک شاطر نے ہر چند چالیں چلیں دامِ رنگیں بچھائے
زر و سیم کے ڈھیر لعل و جواہر کے انبار فاقہ زدوں کو دکھائے
مگر قوم کے ناخدا کے ارادوں پہ گردش گرِ وقت بھی مسکرایا
بڑھا اور دم توڑتی آرزو کا سفینہ کنارے پہ خود کھینچ لایا

محبو! حکومت جو پائی تو اس کے جلو میں ہزاروں پریشانیاں تھیں
نہ کوئی خزانہ، نہ قصرِ امارت، مگر دشمنوں کو بھی حیرانیاں تھیں
کئی قصر و ایواں سجائے، گلستاں گلستاں نئے آشیانے بنائے
غرض ایک ہی سال میں معترف ہوگئے عزمِ قومی کے اپنے پرائے

ادھر قائدِ قوم و بابائے ملت ہوئے جنتِ جاوداں کو روانہ
رفیقو! مصیبت کا طوفان ٹوٹا ہمیں آزمانے لگا پھر زمانہ
مگر اس نئی قوم کا یہ مقدر، بلندی پہ تقدیر کا تھا ستارا
لیاقت علی خاںؒ سا مضبوط انساں بنا اس نئی مملکت کا سہارا

لیاقت علی خاںؒ نے بھی مدتِ مختصر میں کئے کارہائے نمایاں
بسائے گئے شہر در شہر کتنے غریب الوطن خانہ برباد انساں
کئی کام جو قائدِ قوم سے رہ گئے تھے فقط آپ نے کر دکھائے
عدو کے لئے اب یہ دشوار تھا اس جگردار سے بڑھ کے پنجہ ملائے

وطن کی حدوں کی حفاظت کبھی صاحبانِ ہنر کے لئے ساز و ساماں
نئی درسگاہیں، نئی کارگاہیں، نئے کارخانے چلانے کے فرماں
وطن کی محبت میں دنیا کے دورے، نئے حکمرانوں سے وہ آشنائی
مگر اس مجاہد نے بھی دوستو اک سپاہانہ انداز میں موت پائی

لیاقت علی خان کی موت نے یہ حقیقت ہے اپنی کمر توڑ ڈالی
یہ کیسا چمن تھا جہاں پر کوئی باغباں تھا نہ مالی نہ وارث نہ والی
بظاہر خدا کا تو یہ بھی کرم تھا کئی لوگ ہم پر ابھی مہرباں تھے
حکومت کے جنجال سے جی چراتے ہوئے بھی فقیروں پہ وہ حکمراں تھے

وطن کی حفاظت وطن کے جگر دار بیٹے برابر کئے جا رہے تھے
لگاتار قربانیوں کے صلے میں دلوں کی دعائیں بھی لئے جا رہے تھے
وہ گردن کشانِ زمانہ سے بے خوف ہو کر برابر جئے جا رہے تھے
وطن کی حفاظت میں کتنے جواں سال دادِ شجاعت دئے جا رہے تھے

وہ سالارِ اعلیٰ کہ جس کی نگاہوں میں قوموں کی تقدیر کے راز پنہاں
وہ ایوب سا مردِ شاہیں جگر جس کی ہیبت سے کفار و اغیار ترساں
جوانِ ستودہ شیم جس نے ہر دورِ ناپاک میں خامشی سے بسر کی
وطن کی حفاظت میں ننگی چٹانوں پہ جاگا گھنے جنگلوں میں سحر کی

یہی شیر کہسار پیکر، یہی مردِ فولاد چہرہ فقط غم نشاں تھا
مصیبت کے ایام میں اک یہی آہنیں عزم اس قوم کا پاسباں تھا
محبو! وگرنہ ہماری حکومت کے جو طور تھے وہ جہاں سے نرالے
غضب تو یہ تھا حکمرانوں سے بھی بڑھ کے ظالم تھے اُن حکمرانوں کے سالے

اسی ایک سالارِ اعلیٰ کے سائے میں ہر کارواں منزلوں کو رواں تھا
یہ مردِ قوی بال ہم میں نہ ہوتا تو دنیا میں اپنا ٹھکانہ کہاں تھا
اگر اس گھڑی کوئی سالار تھا بھی تو دنیا نے دیکھا وہ غدار نکلا
محبو! یہی ایک سالارِ اعلیٰ، یہ بانکا سپاہی وفادار نکلا

چمن تھا کہ ننگِ چمن، ننگِ گلزار، نکہت فروشوں کی اک انجمن تھا
اور اس انجمن میں خلوص و شرافت تھے لب دوختہ، اہرمن خندہ زن تھا
بساطِ سیاست پہ پھولوں کے مہرے سجا کر نئی بازیاں ہو رہی تھیں
نہ جانے خداوندِ عالم کی وہ رحمتیں برکتیں اب کہاں سو گئی تھیں

جگر کوفتہ چشم و دل سوختہ نوجوانوں کی راہوں میں حیرانیاں تھیں
وہ داماندلانِ وطن جن کی تقدیر میں جانے کتنی پریشانیاں تھیں
وہ "زندانِ برقلۂ کوہ" کی بے گماں کبریائی، وہ فرماں روائی
جو فریاد کے جیل خانوں میں پہنچے جو سونا سمگل کیا داد پائی

نہ جانے کہاں روٹھ کر چل دئے صبحِ اقبال کے مسکراتے سویرے
یسار و یمیں قحط کی آندھیاں خوف کی ظلمتیں ذلتوں کے اندھیرے
وطن کی مقدس فضاؤں پہ کتنے غموں کی شبِ تیرہ گوں چھا گئی تھی
محبو! کراں تا کراں، گوش تا گوش بس ایک آوازِ غم آ رہی تھی:

اے وائے وطن وائے!

کیا دن تھے کہ انوار یہاں سایہ فگن تھے
دریا ترے سرچشمۂ صد گنگ و جمن تھے
کوچے ترے یاروں کے لئے مصر و یمن تھے
ہر سمت رواں کتنے غزالانِ ختن تھے
اب لالہ و گل ہیں نہ کوئی کُنجِ چمن ہائے

اے وائے وطن وائے!

حاکم ہیں مگر دشمنِ انصاف ہوئے ہیں
فریاد کبھی کی ہے تو کھر صاف ہوئے ہیں
ہونے کو سبھی صاحبِ اوصاف ہوئے ہیں
خصاف یہاں آن کے زرباف ہوئے ہیں
ندات بنے ساقیٔ میخانۂ فن ہائے، اے وائے وطن وائے!

سنتے نہیں مفلس کا بیاں ظالم و راشی
گر جیب ہو خالی تو یہ لیں خانہ تلاشی
صاحب سے بھی بڑھ چڑھ کے ہیں صاحب کے حواشی
ہے ان کے لئے ایک ہی کعبہ ہو کہ کاشی

کو دِرہم و دینار، کجا نقدِ سخن ہائے، اے وائے وطن وائے!
بیٹھے ہیں دکانوں پہ کئی ایک لٹیرے
ملنے کا نہیں کچھ بھی کرو جتنے ہی پھیرے
ناپاک نگاہوں میں ہیں بنکوں کے بسیرے
اپنوں کے نہیں، ہوں گے یہ کیا آپ کے میرے
یہ عزت و ناموس کے دلّالِ کہن ہائے، اے وائے وطن وائے!

اللہ رے کیا تیز ہیں اربابِ سیاست
کرتے ہیں سدا حق و صداقت سے بغاوت
کیا ان کو خبر دوستی کیا شے ہے رفاقت
کچھ وہ ہیں جو ایماں کی بھی کرتے ہیں تجارت
یہ فتنہ گر و تیرہ دل و شوردہن ہائے، اے وائے وطن وائے!

اے میرے وطن دیکھ یہ فرزند ہیں تیرے
آغوش میں کتے ہیں تو ہاتھوں میں بٹیرے
یہ طرّہ و دستار یہ شلوار کے گھیرے
لہراتے ہوئے مونچھوں کے پُر ہول پھریرے
ہر وقت جنہیں رہتی ہے ووٹوں کی لگن ہائے، اے وائے وطن وائے!

وہ حاکمِ ذیشان غضب کا تھا مداری
وہ قوم کی حالت پہ سدا گریہ و زاری
گٹھ کتروں سے چوروں سے لٹیروں سے وہ یاری
سونے کی سلاخوں کا تھا کمبخت پجاری
آوارۂ غربت ہے وہ شدّادِ زمن ہائے، اے وائے وطن وائے!

وہ خوش ہے سیہ منڈیوں میں بیچ کے کاریں
گندم کا بڑھے بھاؤ تو یہ گھاٹے ملا دیں
دیتا ہے کوئی ٹھیکے پہ گلشن کی بہاریں
تقسیم جو پرمٹ کریں تقدیر سنواریں
ہائے یہ وفادار، یہ غمخوارِ وطن ہائے، اے وائے وطن وائے!

کیا دَور ہے یہ سینہ زناں اہلِ ہنر ہیں
کیا دَور ہے یہ نوحہ کناں اہلِ نظر ہیں
میں ہوں کہ کوئی اور سبھی خاک بسر ہیں
ہر جاہلِ مطلق کے لئے لعل و گہر ہیں
فنکار ہیں اور کاہشِ عریانیٔ تن ہائے، اے وائے وطن وائے!

کوئی بھی غریبوں کا نہ پُرساں ہے نہ والی
دل سوزِ وفا، نورِ یقیں سے ہوئے خالی
سرگشتہ و جاں باختہ اربابِ معالی
ہر کودنِ دوراں ہے ابوالفضل و غزالی
آنرا گلِ نو برگِ خزاں در کفِ من ہائے، اے وائے وطن وائے!

یہ محفلِ شب، شکر کہ برخاست ہوئی ہے
اک صبحِ جواں پھر سے علم راست ہوئی ہے
اللہ نے سن لی ہیں غریبوں کی دعائیں
منظور مری قوم کی درخواست ہوئی ہے
وہ لوگ جو میخانۂ ہستی کے مغاں تھے
سنتا ہوں کہ اب ان سے بھی واخواست ہوئی ہے
اب تو بہ حق آگاہ سمجھنے لگا سب سے
یاروں کو بھی اب فکرِ کم و کاست ہوئی ہے
آتے ہیں سلام ان کو لیسار اور یمیں سے
صد گونہ خوشی میرے چپ و راست ہوئی ہے

ابوالاثر حفیظ

رفیق خاور

"تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں"

اور اب تو یہ قصّہ نصف صدی کی حدود سے کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ کیونکہ آٹھ دس برس ہوئے اس شاعرِ شیریں نوا کی پچاس سالہ جوبلی بھی منائی جا چکی ہے، اور اب اس کا ذکر آتے ہی کتنے ہی شاہکاروں ۔۔۔ 'نغمہ زار'، 'سوز و ساز'، 'تلخابۂ شیریں'، 'شاہنامۂ اسلام'، 'ہفت پیکر' وغیرہ اور سب سے بڑھ کر پاکستان کا قومی ترانہ، نظروں میں گھوم جاتا ہے جو ایک مختصر مگر مستقل، گراں قدر، مقبول عام چیز ہوتے ہوئے ملّی اعتبار سے ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی بدولت پاکستان کا بچّہ بچّہ حفیظ کو جانتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک پورا دور نئے سرے سے زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ وہ دور جس کو ہم میں سے کئی لوگوں نے خود دیکھا ہے، اس میں سے خود گذرے ہیں لیکن جو رفتہ رفتہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔ اپنے تمام ہنگاموں اور ان یگانۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ جو ان ہنگاموں کی روحِ رواں تھے۔ ڈاکٹر تاثیر، پطرس، اختر شیرانی، میرزا یاس یگانہ چنگیزی، ہری چند اختر، میراجی ۔۔۔ اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز لاہور تھا جو اپنی تیز قدم بیداری سے شعر و ادب کے ساتھ ایک مناسبتِ خاص پیدا کر چکا ہے۔ ابوالاثر اس دور کی ایک ایسی قد آور شخصیت ہے جو ہر اعتبار سے نمائندہ حیثیت رکھتی ہے اور جب ہم اس دور کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو قدرتی طور پر اس کی مختلف خصوصیتیں اس ہی کی ذات میں سمٹ آتی ہیں اور دعوتِ قلب و نظر دیتی ہیں۔ اس طرح کہ :

نظارہ زجنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

ہاں فردوسیٔ اسلام، ابوالاثر حفیظ کے ساتھ یہ دور اور اس کی فضا ہی نہیں ابھرتی بلکہ اس کی نوا بھی ابھرتی ہے۔ یہ دور ہی زندہ نہیں ہوتا بلکہ بلکہ اس کے مغنّی بھی اپنے نغموں، اپنے گیتوں، اپنی گوناگوں خوش الحانیوں اور اپنے عظیم الشان مشاعروں کے ساتھ زندہ ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نادیدہ ساحر نے چپکے سے "کھل سم سم" کہہ دیا ہو اور ہمارے سامنے یکلخت ایک طلسمی دنیا کے دریچے کھل جائیں۔ معنوی خزانوں سے بھرپور حفیظ کے دوست پطرس نے انہیں 'ساحر' کہا ہے۔ اور وہ 'نغمہ زار' سے لیکر اب تک کتنی ہی صورتوں میں اسکا ثبوت بھی بہم پہنچ چکا ہے۔

ہم حفیظ کو اس فضا اور اس نوا سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ نوا، یہ لحنِ داؤدی ہی اس کی زندگی ہے۔ یہ اس کو مبدا فیاض کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ ایک قدرتی دین جو شروع سے لیکر اب تک زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس کے ساتھ رہی ہے اور برابر نت نیا جادو جگاتی رہی ہے۔ یہ وہ نوا ہے، شعری بھی اور نغماتی بھی، جو سنتے ہی دل میں اُتر جاتی ہے، اپنی تمام سحر آفرینیوں کے ساتھ۔ وہ اُردو شاعری کا ایریل ہے جس کی رسیلی، نشیلی آواز آسمان و زمین میں ہر کہیں سمائی ہوئی ہے اور ہم جدھر جائیں اسی کے گنگناتے زمزمے اور مدبھری تانیں سنائی دیتی ہیں۔ جو لوگ ابتدا ہی سے حفیظ کی یہ نوا سنتے آئے ہیں اور انہوں نے حفیظ بے نوا کو ابھرتے دیکھا ہے، انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں ایک خاص اٹھان تھی۔ انہیں وہ عظیم الشان مشاعرے بھی یاد ہونگے جن میں حفیظ بڑے طمطراق سے شامل ہوتا اور اپنی جادو نوائی سے سامعین پر دھاک بٹھا دیتا۔ یہی مشاعرے اس کی شہرت و مقبولیت کے لئے بال و پر ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ زہرۂ افلاک ان کی لے اڑا کر لے گئی۔ اور وہ رفتہ رفتہ ستاروں کی منزل تک پہنچ گیا۔

آپ پوچھیں گے اس نغمگی کا راز کیا ہے۔ یہ سبک، ہلکی، ہوائی نغمگی جس سے ساری فضا پر سیمیا کا سا اثر طاری ہو۔ اس کا راز اسکی حباب وار نزاکت میں مضمر ہے۔ قدرت نے حفیظ کو ایک بچے کی نظر عطا کی ہے۔ تمام تر حواس، تمام تر تخیّل۔ بھولی بھالی سیدھی سادی طبیعت جو رنگ ہی رنگ

اور کیف ہی کیف کی متوالی ہے۔ اس کی دنیا حواس کی رنگ رلیوں کی دنیا ہے مگر عیاشانہ یا رندانہ نہیں، بالکل معصومانہ۔ اس کے دستِ شوق نے حسن کو وہاں اپنایا ہے جہاں یہ کسی تصنع یا تکلیف سے آلودہ نہیں ہوا۔ اس میں ایک قدرتی سادگی اور بانکپن جھلکتا ہے۔ اس نے اپنی دنیا اس سنسنی سے بنائی ہے جس میں کوئی سنسنی نہیں۔ یعنی وہ کھری چاندی جیسی نکھری نکھری جھلکیاں جو حواس اور مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن تک پہنچتی ہیں اور پھر رنگینیوں میں ڈوب کر دل کی راہ لیتی ہیں۔ اس کا فکر کسی فلسفی کا بوجھل فکر نہیں بلکہ چلبلا تخیل ہے۔ چنچل، البیلا، جوبن مست۔ اگر اس کے یہاں فکر آتا بھی ہے تو حسن کا چولا پہن کر جو اپنی ہلکی پھلکی وضع سے بہت ہی پیارا اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شاعری شروع ہی سے اس ہلکے پھلکے جوبن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا دل جو اس سانچے کو ڈھالنے والا سانچہ ہے، بہت ہی نفیس اور سڈول ہے، بے حد بانکا، سادہ پرکار۔ اس کی بناوٹ، جو چیز بھی اس کے دامن میں آئے، اس کو غضب کی چھاپ عطا کر دیتی ہے۔

آواز جبھی بلند اڑ سکتی ہے کہ وہ خالص آواز ہو — جتنا بوجھ زیادہ ہوگا اتنی ہی وہ دبے گی، ابھرے گی نہیں۔ حفیظ کی نوا ہلکے سے ہلکا سامان لے کر اٹھتی ہے۔ سیدھے سادے ہلکے پھلکے محسوسات، اس لئے اس کی اڑان شوخ، چنچل ممولوں کی سی اڑان ہے کہ ابھی وہ زمین پر تھے اور ابھی دور کہیں اونچائیوں میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ شروع ہی سے حفیظ نے اس ہلکی پھلکی اڑان کو اپنایا۔ اس کی دنیا ایک وسیع نغمہ زار ہے۔ وہ اپنی لَے وہاں سے اٹھاتا ہے جہاں ایک دھیما دھیما سوز چپکے ہی چپکے ہلکے پھلکے زمزموں کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا اس میں کاوش کو دخل نہیں ہوتا۔ اور نوا اپنے لئے جو ہیولیٰ تراشتی ہے وہ بھی چلبلی، چمکیلی کرنوں کے تانے بانے کا سیمیائی ہالا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے چاندرات کو چاروں کھونٹ ہلکی پھلکی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بکھری ہو۔ ابتدا ہی سے اس نے چھوٹی چھوٹی بحروں، اور چھوٹے چھوٹے بحروں کو اپنایا۔ جو قبل ازیں کہیں کہیں اقبال کے تجربے کراں میں بڑی تیزی اور پھرتی سے رواں دواں نظر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی وہ چھوٹے چھوٹے چپو اور پتوار ہیں بھی۔ بڑے ہی نازک لچکیلے مصرعے جو آپس میں یوں بے ساختگی سے گھل مل جاتے ہیں جیسے دریا کے سینے پر مچلتی ہوئی لہریں۔

اس میں شک نہیں کہ حفیظ نے بڑی بحروں کو بھی اپنایا ہے۔ اور "شاہنامۂ اسلام" کی بحر سے زیادہ لمبی بحر اور کیا ہوگی؛ لیکن وہ یہاں بھی طبعاً "ایریل"[1] ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور ان لمبی بحروں میں بھی وہی سبک اور تیز اڑان پیدا کر دیتا ہے جو اس کی چھوٹی بحروں کا خاصہ ہے۔ ان میں بھی وہی رنگ و آہنگ کی لہر نظر آتی ہے۔ اور دھیما دھیما سوز لئے ہی جیسے نرم نرم ساز کو جنم دیتا ہے۔ یہ آہنگ، یہ راگنی جتنا طبیعت کو سلگاتی ہے اتنا ہی رجھاتی بھی ہے۔ اور شعر اور راگ کا وہ دوگونہ جادو جگاتی ہے جو حفیظ کے دل میں ازل سے کروٹیں لے رہا ہے۔ اس میں اس چوٹ کا لطف بھی ہے جو جل ترنگ کی پیالیوں پر وہ کر پڑتی ہے اور وہ نغمگی بھی جو پیالیوں کی سریلی آواز اور جل کی ترنگ اپنے جلو میں لاتی ہے۔

حفیظ نے اپنے گرد و پیش اور خود زندگی کو وہاں اور اس وقت دیکھا ہے جبکہ ابھی فطرت کے ظلمت خانہ سے ابھری ہی تھی دنیا۔ یعنی وہ قدرت کو اسی عالم میں دیکھتا ہے اور اسی انسان کی نظر سے جس نے اس کو اول اول اپنے نکھرے نکھرے اور کھرے کھرے رنگ میں دیکھا تھا۔ اور اسی سادگی احساس اور سادگی فکر و خیال کے ساتھ۔ یہاں پھر اس کی سوچ اور احساس کے ڈانڈے طفلِ صغیر کی سوچ اور احساس سے مل جاتے ہیں جس کو صرف دیکھنے اور دیکھے جانے سے غرض ہے۔ اور صبح ہو یا شام، اجالا ہو یا اندھیرا، اس کے لئے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف یہ دیکھتا ہے کہ،

اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر
وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے

تو دوسری طرف یہ بھی مشاہدہ کرتا ہے کہ

نیلم پری رات — جادو بھری رات
بیٹھی ہے چپ چاپ — ہر رہگذر میں

ایسے اشعار میں تصویر پوری طرح روشن بھی ہے اور مجسم بھی۔ جیسے کسی نے واقعی کوئی تصویر رنگ و روغن سے تیار کر کے چوکھٹے میں جڑ دی ہو۔ اور پھر "نیلم پری رات" میں اشارات کی ایک وسیع دنیا بھی بکھری پڑی ہے جیسے اس پر ایک طلسمی چھوٹ پڑ رہی ہو۔ اور اسکے سبب تصویر کے حاشئے دور دور تک پھیلتے چلے

[1] شیکسپیر کے TEMPEST کا ایک کردار

جائیں۔ اسی طرح جب حفیظ پہاڑوں کی اونچائیوں پر نظر ڈالتا ہے تو دن رات کے سارے روپ، سارے سمے اس کے لئے علیحدہ علیحدہ پیغام کیف و نظر لے کر آتے ہیں۔ اور ایک ابتدائی انسان، ایک نگاہ مست بچے کی طرح خالص نظر ہی نظر، سنسنی ہی سنسنی کے رنگ میں آشوب دیتے ہوئے:۔

گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے — بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے — جس قدر سونا فراہم کر سکے لایا کرے
لے کے آتی ہے زرِ خالص کی کانیں ہر سحر — لاکے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر
کیمیا سازانِ چرخ اٹھتے ہیں اپنے کام کو — آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو
دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھواں — چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں
دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال — کوئی شئے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال
حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے چھن جایا کرے — اور باقی اک طلسمی گیند بن جایا کرے

. . . .

شام آئی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے — ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دئے — ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دئے
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں — جس طرح دیوؤں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

حفیظ اپنے بالغ ترین لمحوں میں بھی اس "قرمزی کچھ لال لال" اور دیوؤں کے گھر میں قید شہزادیوں کا جادو نہیں بھولتا۔ چنانچہ جب "شاہنامۂ اسلام" کے وسیع و عریض صحرا میں کبھی نخلستان آتے ہیں تو یہ روپ لے کر:۔

وہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا — مجموعہ ریگستانوں کا اونا ہموار چٹانوں کا
طوفانی ریگِ رواں جس میں زہریلے طوفاں اٹھتے ہیں — غصے میں بھر کر کالے نیلے پیلے طوفاں اٹھتے ہیں
وہ وسعت، ذرے ذرے کو جو وحشت بنائے بیٹھی ہے — گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے

اس سے ظاہر ہے کہ حفیظ کی نظر حیاتی سے بھی زیادہ مشاہداتی ہے۔ وہ طبعاً شہودی ANTHROPOMORPHIC یعنی خوگر پیکر محسوس ہے۔ ہر شاعر طبعاً کم و بیش ایسا ہی ہوتا ہے، مگر کسی میں خمار چشم ساقی زیادہ ہوتا ہے کسی میں کم۔ حفیظ سے کہا جائے تو وہ اپنی ساری اندرونی کیفیتوں کو بھول کر شاید سندباد جہازی کی طرح اژدہاؤں سے پر، سنگلاخ اور ہیبت ناک پہاڑوں میں بھی لعل و جواہر چھیننے لگ جائے! "نغمہ زار" کی حد تک اس کی ساری شاعری انہی خارجی مشاہدات ہی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی دنیا "دیکھتا چلا گیا" کی دنیا ہے۔ جس کو وہ بڑا ہو کر بھی نہیں بھولتا۔

کیا اس لگن کو زندگی کی لگن کہا جائے؟ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ بنیادی طور پر زندگی یہی ہے ماحول سے کچھ لینے، ماحول کو کچھ دینے کا نام — یہ ایک امنگ ہے، کسی کی طرف بڑھنے، ہاتھ بڑھانے اور اس کو جاننے کی کوشش۔ ایک خالص حیاتیاتی اقدام۔ جو ممکن ہے خشک مغز فلسفیوں کے ٹھوس افکار کی بہ نسبت زندگی، کائنات اور حقیقت سے زیادہ قریب، زیادہ جاندار ہو۔ شاید قدیم وحشی انسانوں میں زندگی کی وہ تڑپ ہو جو ہم تہذیب و تمدن کے مارے جدید انسانوں میں موجود نہیں۔ اور ایک بچہ، ایک شاعر فطرتاً اس قدیم، تندرست چست و چاق زندگی سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور ہمیں اس کی طرف پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ اور شاید اسی میں شاعری اور فنون لطیفہ کا حقیقی مصرف بھی پنہاں ہو جس کو ہم فلسفہ اور نفسیات کے نظریوں کے دبیز غلاف چڑھا چڑھا کر نظروں سے محو کر دیتے ہیں۔ حفیظ نے زندگی کا بھی اس کے حقیقی سوتوں ہی سے سراغ لگایا ہے جو پاتال کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں۔ اس کی دلچسپی عام انسانی زندگی سے ہے اور وہ اس کا خصوصیت سے رسیا ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے مرقعے برابر اور مسلسل نظر آتے ہیں۔ ایسے کہ ان سے واقعیت کا ایک شاندار نگار خانہ تیار ہو سکے۔ وہ جو مہران اور استاد اللہ بخش کے لئے دلی مسرت کا باعث ہو۔ حفیظ کی باریک بیں نظر ماہر عکاس کے مانند باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف جزئیات کو بھانپ لیتی

ہے اور اصلیت میں تخیل کا رنگ بھر کے اور بھی مؤثر بنا دیتی ہے۔

حفیظ کے یہاں شاعری کا رچاؤ تو ہے ہی۔ اور اس کا تخیل، اس کی بے نظیر قوتِ مشاہدہ، شگفتہ بیانی اور لطیف نغمگی کے ہوتے ہوئے اس کا پیدا ہونا لازم ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی راگ رنگ کا دھنی بھی ہے۔ کم از کم لَے کاری اور سُر تال کی حد تک وہ موسیقی کے بنیادی گُروں کو خوب سمجھتا ہے۔ اور اس لئے بڑی ہی کامیابی سے برتتا بھی ہے۔ چنانچہ شروع ہی سے اس کے کلام میں خوشنوائی اور نغمہ سرائی کا یہ عنصر شدت سے نمایاں رہا ہے۔ اور مختلف صورتوں میں اپنا اثر دکھاتا رہا ہے۔ ایسا کہ اگر ان کا سرگم صوری شکل میں پیش نہ کیا جائے تو بھی ہم اس کی غنائی وسعتوں اور امکانات کا بخوبی تصور کر سکتے ہیں۔ ان کی ترتیل ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ آپ ہی آپ غنا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور بعض اوقات تو شاعری پیچھے رہ جاتی ہے اور موسیقی آگے نکل جاتی ہے۔ اس قدر کہ اس کو موسیقی قرار دینا زیادہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کے مصرعوں کی نشست ترتیب، لمبا چھوٹا ہونا سُروں سرتیوں کے استادانہ تال میل کا کام دیتا ہے — اور اس کو حسنِ اتفاق سمجھئے یا دستِ غیب کی قدرتی رہنمائی کہ حفیظ کا ملجا و ماویٰ وہی خطہ رہا ہے جو اب پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی نظر شروع ہی سے اس کے بہشتِ نظر کناروں، اس کی دھوپ چھاؤں اور اس کی بھرپور زندگی سے کھیلتی رہی ہے۔ اس لئے اس نے فطرت اور زندگی کے جو مرقعے بھی کھینچے ہیں ان میں پاکستان ہی پاکستان جھلکتا ہے جیسے پتوں کے جھرمٹ میں دھوپ کی جھلملیاں۔ چناب، درۂ خیبر، کشمیر یہ سب بڑے بڑے مظاہر اور پھر عام مناظر اور زندگی کے گوناگوں پہلو جو اس کے یہاں بالعموم ہیں ہی، یہ سب اس کے مرقع کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور بھرپور بنا دیتے ہیں۔ چناب کا راگ سنئے:

مدتیں گزری ہیں اس فردوس میں رہتا ہوں میں   یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں
اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں   شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں
حسن و صورت، عشق و الفت کا نہیں کال اس جگہ   ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ
ٹوٹتے ہیں میری موجوں پر کئی کچے گھڑے   روز دکھلاتے ہیں اک الفت نئی کچے گھڑے
یہ ہوا لہروں سے جو محوِ شکست و بست ہے   ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے
ہر دوشیزہ دیکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا   بن گیا ہوں آئینہ میں ہیر کی تصویر کا

"صبح و شام کو ہسار" جس کے پردہ میں ہمالیہ کی سطوت اور شانِ دلربائی پنہاں ہے، کی کیفیت آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب "درۂ خیبر" کی شان دیکھئے:

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں   مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے   گھٹا بچ کر نکلتی ہے۔ ہوا کترا کے چلتی ہے
۔ یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے   امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے،
ہوائے درۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی   کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی
اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں   انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

اور جو نظر درۂ خیبر کی کالی چٹانوں کے ناہموار چٹیل سلسلوں سے یوں گل چینی کر سکتی ہے وہ کشمیرِ جنت نظیر سے کیا کچھ گلدستہ بندی نہیں کرے گی:

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باقی رہی عام پاکستانی زندگی تو حفیظ نے قیام پاکستان سے پہلے بھی اس کا ایک ایک روپ، ایک ایک رنگ، ایک ایک نقشہ اپنی پلکوں سے چنا اور بڑے ہی پیار، بڑے ہی چاؤ سے اپنے کلام کے سجل طاقچوں پر سجا دیا۔ خوبانِ ہندی یعنی خوبانِ پاک کا یہ عالم مشاہدہ و احساس کا کس قدر سادہ دپرکار امتزاج ہے:

اٹھلا رہی ہیں   اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی   حورانِ ارضی   رونق گھروں کی
نازک دوپٹے   رنگین ہلکے
سر پر سنبھالے   شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے   جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے   شرما رہی ہیں

اگر ان حورانِ پاک کے پسِ پردہ کتنی ہی دیہی شہری الھڑ انیلی ہیریں اور باحجاب سلمائیں جھلملاتی نظر آتی ہیں تو جو رکھوالا لڑکا اس منظر میں بنسی یعنی دبجلی کا رسیا دکھائی دیتا ہے، اس کے عقب میں محبت کے متوالے رانجھوں کا کیا کچھ تانا نظر نہیں آتا:

رکھوالا لڑکا   گیتوں کا دولھا
بنسی بجا کر   گانے کا رسیا
متوالے پن میں   اصلی پھبن میں

اب حفیظ شاید رچنا کے بیلوں میں جس طرح رانجھا کہیں گے۔

جہاں تک شخصیتوں کا تعلق ہے اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ، اور ـــ جنرل محمد ایوب خاں، ان پر اپنے موقلم کی جنبشیں صرف کر کے حفیظ نے گویا پورے پاکستان کو سمو دیا ہے۔ اور اس مثلث کی تکمیل کر دی ہے جو فطرت، زندگی اور انسان سے تیار ہوتی ہے۔

سُر سرتیاں آپس میں گھل مل جاتی ہیں تو آہنگ بڑھتے بڑھتے آخر میں پوری طرح گمبھیر ہو جاتا ہے۔ اور ہم آپ ہی آپ سرگم کی چوٹی یعنی ٹیپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر پارے بے اختیار گیتوں میں ڈھل گئے ہیں۔ کچھ عام کچھ فلمی۔ اگر ہمیں گیتوں کی تکنیک اور ان کے بنیادی گروں کو سمجھنا ہے تو اس کے لئے حفیظ کے گیت بہت کام آسکتے ہیں ان کی بناوٹ ایک بسیط تجزیہ کی مستحق ہے۔

حفیظ کے گیتوں کا یوں سرسری تذکرہ ان کی قرار واقعی داد سے گریز ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گیت پابند شاعری ہی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس پابندی ہی میں شاعر نے آزادی اور بہو خرامی کی ایک دنیا پیدا کر دی ہے۔ وہ مصرعوں اور قافیوں کا دروبست اس چابکدستی سے کرتا ہے جیسے ساز کے تار زخموں کی کبھی ہلکی کبھی کڑی چوٹوں سے جھنجھنا جھنجھنا کر ایک مرکب راگنی کا روپ دھار لیتے ہیں جیسے تان قدرتی طور پر بڑھتے بڑھتے سرگم پر آن کر ٹوٹے۔

حفیظ کے بعض نقوش کہنے کو بند ہیں لیکن درحقیقت یہ بجتے ہوئے باجے اور سُر، چنگ و رباب کی سربند طربیں ہیں۔ ان ہی سروں کا خلا ملا ایک پُر اسرار اور پُرفسوں ڈھنگ اختیار کئے جاتا ہے۔ اور جو نوائیں پہلے الگ الگ، بکھری بکھری تھیں وہ گھل مل کر ایک سمٹا ہوا سنگیت بن جاتی ہیں۔ یہ پھیلنا یہ سمٹنا بجائے خود ایک نادر طلسم ہے۔ الفاظ کے سینہ سے ابھرتی ہوئی نوائیں کبھی اس غنائی پکار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس کو ہم قریب قریب گیت کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کبھی زیادہ پُر درد ہو نیکی صورت میں ٹھمری بن جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مکمل مصرعوں سے گریز بھی ہے اور یہاں شاعر پابندی سے ہٹ کر نظم آزاد کی طرف بھی مائل نظر آتا ہے۔ چند مثالیں شاید تسکین ذوق کا باعث ہوں۔

جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی — کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی — دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

★

باغ میں بلبل بول رہی ہے — نرگس آنکھیں کھول رہی ہے
شبنم موتی رول رہی ہے
آم پہ کوئل کوک اٹھی ہے — سینے میں اک ہوک اٹھی ہے
بن جاؤں نہ کہیں سودائی — جانوروں کی رام دہائی
چبھتی ہے نس نس میں
دل ہے پرائے بس میں

★

آ رہا تھا حسن بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا
آپ ہی اپنی ہوا خواہی کا دم بھرتا ہوا
بے حجاب —— شوخیاں کرتا ہوا
بیش و کم سے بے خبر
زیر و بم سے بے خبر
شاد شاد
بامراد
بے خبر —— رنج و غم سے بے خبر
بے حجاب —— شوخیاں کرتا ہوا
آ رہا تھا حسن بھی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا
مسافر
تیری منزل دور
نظارے اس آب و گل کے
رہزن ہیں تیری منزل کے
نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو
سب پردے ہیں نگاہ و دل کے
تو ہے طالبِ نور
مسافر
تیری منزل دور

لیکن وہ پیکرِ شعر جو پابند ہونے کے باوجود پیکرِ موسیقی بن گیا ہے اور نظمِ آزاد سے اس طرح ہمکنار ہو گیا ہے کہ ہم دونوں میں بمشکل امتیاز کر سکتے ہیں، وہ "نغمہ زار" کی اس سراپا ترنم ابتدائی نظم میں دکھائی دیتا ہے:

یوں وقت گزرتا ہے
فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتہ
بہتا ہوا دریا میں
چاہے کہ ٹھہر جائے
اور سیر ذرا کر لے
اُس عکسِ شجر کی
جو دامنِ دریا پر
زیبا تشِ دریا ہے
یوں وقت گزرتا ہے
فرصت کی تمنا میں

گیت اور غزل کو ایک ہی چیز، غنائیت کے دو روپ سمجھنا چاہئے۔ گو ان کی ساخت میں بہت فرق ہے۔ اگر حفیظ کے سلسلہ میں اس کی غزل گوئی کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ داستان بالکل نا تمام رہے گی۔ اس نے غزل کو اسی طرح دی ہے جو اسی سے مخصوص ہے اور اسی لئے اس کو منفرد بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی غزل میں غنائیت کی روح رچی ہوئی ہے۔ اگر ایک دو غزلیں اس کے تیوروں کو نمایاں کر سکتی ہیں تو ان دو غزلوں کے چند اشعار جو کسی کاوش کے بغیر چن لی گئی ہیں شاید اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو!
کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

———

میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے
پھر آگیا کوئی رخِ زیبا لئے ہوئے

پھر دل میں آبسی ہے کسی انجمن کی یاد
اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لئے ہوئے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر
بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لئے ہوئے

شاعر منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا۔ شاعری اور موسیقی دونوں اس کا قدم قدم پر ساتھ دیتے رہیں بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں اس کی آزاد نغمگی اشعار کے مقاصد کے لئے پا بجولاں ہو گئی۔ لیکن ان عوالم میں بھی اس کا زندگی سے پیار نہ گیا۔ جب اس کے منہ سے یہ بول نکلے کہ:

اب اٹھ دسن ٹڑ دسن کچھ جو کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

تو اس کی نظر اپنے وطن کی عام زندگی ہی پر رہی اور اس نے اسی کی زبان میں اس کی عکاسی اور ترجمانی دونوں کا حق ادا کیا۔ ایسے ہی جب حالات نے ایک اور تاریخی کروٹ بدلی اور ہماری آرزوؤں اور امیدوں کی سرزمین پاکستان نے جنم لیا وہی صلاحیتیں جو ناسازگار حالات میں طوعاً و کرہاً ایک اقتصادی مادی بیگار کا کام انجام دیتی رہیں وہ تمام تر وطن و ملت کے لئے وقف ہو گئیں۔ اور ان کا بہترین نتیجہ پاکستان کا قومی ترانہ ہے جو آج ساری قوم کی آواز ہے اور بچوں بڑوں سب کی زبان سے ادا ہو کر ایک نوخیز، اولوالعزم ملت کے دلی احساسات اور بلند مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے اور جب تک پاکستان زندہ

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

"لہو ترنگ"

(سید ضمیر جعفری)

بیگم سلمیٰ تصدق حسین

ایک سپاہی سے بہتر اور کون جان سکتا ہے کہ زندگی حقیقۃً لہو ترنگ ہے۔ کیونکہ وہ ہر ہر قدم خونِ حیات ہی سے کھیلتا ہے، یہ لہو کی ترنگ ہی ہے جو اسے خطرناک سے خطرناک مرحلے سے بے باکانہ گذر جانے کی ہمت دلاتی ہے اور وہ گولیوں اور بموں کی خوفناک بوچھاڑ میں بھی، کانٹے دار باڑوں کو پھلانگتا ہوا فتح و نصرت کا پرچم گاڑ کر ہی دم لیتا ہے۔ خواہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ اور ضمیر جعفری سے بہتر اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا جس کی زندگی سپاہی کی زندگی رہی ہے! اور وہ جتنا "باقاعدہ سپاہی" ہے اتنا باقاعدہ شاعر نہیں۔ کیونکہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران اسے اپنے شعر و ادب، بذلہ سنجی اور صحافت کے ذوق کو دل میں لئے ہوئے خبر نہیں کہاں کہاں ملک ملک صحرا صحرا، جزیرہ جزیرہ انسان کے ازلی دشمن، موت کو اس کے خون کے ساتھ ہولی کھیلتے دیکھا۔ شاید اقبال کی نظر میں فطرت کا لہو ترنگ ہونا زیادہ تھا یعنی وہ پیالیوں میں جل کی جگہ خون ڈال کر سامانِ طرب پیدا کرتی ہے۔ اتنی سنگین کہ دوسروں کو خونیں کشمکش میں مبتلا کرنا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔ ضمیر جعفری نے اس کی تعبیر خونِ گرم کی ان ولولہ آفرینیوں، بے باکیوں اور معرکہ آرائیوں میں دیکھی ہے جن کو صرف "ترنگ" ہی کا لفظ ادا کر سکتا ہے۔

سپاہی کی زندگی وطن سے دور دمبدم بدلتے ہوئے محاذِ جنگ پر مورچہ بندی اور منزل بہ منزل کوچ، اندھا دھند یلغار اور خشکیوں سمندروں پہاڑوں، میدانوں میں دن رات گشت ہی کی زندگی ہے۔ اس لئے مشاہدہ و تجربہ کا تنوع، حقائق حیات سے آگاہی، عبرت و بصیرت، اور انسانی فطرت سے شناسائی جیسے اس کو میسر آتی ہے خانہ نشیں اور پابہ گل شہریوں اور سبکسارانِ ساحل کو میسر نہیں آسکتی۔ اسی لئے اس کے لہو میں دو طرح کی ترنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو جذبۂ ملی سے سرشار ہر سپاہی کے خون میں پیدا ہوتی ہیں — جو قوم و وطن کی عظمت و تقدیس کے نغموں کا روپ دھارتی ہیں اور جنہیں "ملت و وطن سے محبت رکھنے والا ہر شاعر گاتا آیا ہے۔" دوسری ترنگ وہ ہے جو "سپاہی کی زندگی و شخصیت، اس کے محسوسات و جذبات" سے ابھرتی ہے۔ اس کا تعلق ملک و وطن سے الگ اس کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ جس میں شجاعت، غیرت، اخوت، قربانی، محبت اور عزم و ثبات کے کتنے ہی ارفع و اعلیٰ جوہر شعلہ زن نظر آتے ہیں۔

شاعر کو اپنی سپاہیانہ زندگی میں ملک ملک کے سپاہیوں اور جوانمردوں سے ملنے برتنے اور ان کے کارناموں، افسانوں اور روایتوں کو دیکھنے کا نادر موقع ملا۔ اسی کے ساتھ ان کے جذبات اور ملی حماسوں کو دیکھنے اور سننے کا بھی زیادہ سے زیادہ موقع ملا۔ یہ سب دھارے اس کے ذاتی احساس کے دھارے سے گھل مل کر زیادہ بھرپور ہو گئے یہاں تک کہ آزادی کی سیلِ تند و تیز نے ان کو اچھل کر بے کراں ہونے کی تحریک دلائی۔

یہاں سے ہماری زندگی، ہمارے سپاہیوں کی زندگی میں ایک زبردست بھاٹا آیا۔ اس سے پہلے جنس خودداری بہانے دیدۂ اغیار تھی۔ جو کچھ تھا اوروں کے لئے تھا۔ استعمار کی بھٹی کا ایندھن، اس کی توپوں کے لئے گولہ بارود۔ سپاہیوں کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ تھی کہ وہ دوسروں کے لئے اپنی جان گنواتے تھے، دوسروں کی لڑائیاں لڑتے تھے۔ ان کے نعرے، ان کے بازوئے شمشیر زن، ان کی تلواریں دوسروں کے قبضہ میں۔ ان کی ہمت و شجاعت اور بے مثل جوہروں کے باوجود ان کی زندگی ایک جھوٹی، کھوکھلی اور رائیگاں زندگی تھی۔

آزادی نے یہ سب کچھ بدل ڈالا۔ اس نے ہماری تاریخ، ہماری زندگی کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیا۔ اب ہمارا دل اور تھا، دل کی

دھڑکنیں اور تھیں۔ اور دھڑکنوں کے ساتھ خونِ گرم جوش کی ترنگیں بھی۔ جیسے کسی ساحرِ عظیم نے ایکدم "کھل سم سم" کہدیا ہو، ہمارے لئے زندگی کے طلسمی دروازے وا ہو گئے۔ اور ہم نئی امنگیں، نئے مقاصد اور نیا ولولہ و جوش لئے ہوئے میدانِ حیات میں آگے بڑھے۔ ہماری افواج بھی اسی ملت کا چشم و چراغ تھیں، ان کا دل و دماغ ملت ہی کا دل و دماغ تھا، ان کے ارادے ملت کے ارادے اور ان کی تمنائیں ملت ہی کی تمنائیں تھیں۔ ایک جسم، ایک جان، ایک امنگ، اک ترنگ۔ اسی لئے ان کو شروع ہی سے ملت کا پاس رہا اور ملت کو ان پر شروع ہی سے مکمل اعتماد۔ اسی لئے ضمیر جیسے حساس شاعر جہاں ہمیشہ ہم پیشہ و ہم مشرب سپاہیوں کی حیثیت سے ان کے گن گاتے رہے وہاں عام شہریوں کی طرف سے بھی ان نگہبانانِ قوم و وطن کے ترانے گاتے رہے۔ "لہو ترنگ" میں ان دونوں حیثیتوں کا بھرپور رنگ چڑھا ہے۔ آزادی نے ہماری رگ رگ اور ریشے ریشے میں جو خونِ تازہ دوڑا دیا تھا، اس میں از خود ایک سیلاب نما ترنگ پیدا ہونا لازم تھا۔ اور اسی ترنگ کی افتاں خیزاں لہریں ہیں جو ہمیں اس مجموعہ کے نقوش میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ اس کو ایک پیش آہنگ کہئے۔ اس لحاظ سے بھی کہ یہ ہمارے نئے آہنگِ حیات، آہنگِ رجز کا پیش خیمہ تھا یا اس لفظ کے قدیم مفہوم کے مطابق قافلہ کا ہراول دستہ، (الا یا خیمگی خیمہ فروہل کہ پیش آہنگ بیرون شد ز منزل — منوچہری) بہر حال یہ حیرت انگیز آنے والے واقعات، یعنی عساکرِ پاکستان، خصوصاً اس کے مایۂ ناز اولیں پاکستانی سپہ سالار جنرل محمد ایوب خاں نے جو معرکہ آرا انقلابی کردار ادا کیا، کی پیشینگوئی اور بشارت تھا۔ کیونکہ یہ مجموعہ اسی مردِ مجاہد کی خدمت میں ایک سپاہی کا نذرانہ ہے۔ بلاشبہ یہ مجموعہ جس کی نمود لہو کی ترنگ ہی کی شرمندۂ احسان ہے، ایک ملت کی آواز ہے جو اس کے نہاں خانۂ ضمیر سے بلند ہوئی ہے۔ اور اگر اس کے غلغلہ سے دیارِ پاک کی فضا کے ساتھ ہر پاکستانی شہری کا رواقِ دل بھی گونج اٹھے تو کچھ عجب نہیں۔

یہ ملی شاعری جہاں ہمارے ابھرتے ہوئے قومی شعور اور تندرست جوانمردانہ احساس کی آئینہ دار ہے وہاں اس کا ایک اور خوشگوار پہلو یہ ہے کہ ہم میں قومی لگن بیدار سے بیدار تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ملی شاعری کا جذبہ بھی شدید سے شدید تر ہو کر ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں نے ہراول کا کام کیا ہے، اور ضمیر جعفری ان میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اردو ادب ان کا ہمیشہ گرویدۂ احسان رہے گا۔

پاکستان کی آزاد فضا میں حب الوطنی کا جذبہ کیا کیا صورتیں اختیار کر سکتا ہے، اس کا اندازہ اس مجموعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں اس کو دانستہ بعض خیالی یا قیاسی سانچوں میں نہیں ڈھالا گیا بلکہ حالات اور واقعات سے جو نقوش قدرتی طور پر شاعر کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں، ان ہی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یا پھر ان نقوش کو جو دوسری زبانوں میں موجود ہیں بےتکلفی سے اپنا لیا گیا ہے۔ سوال صرف لگن کا تھا۔ جب شاعر کا ذہن حب الوطنی سے سرشار ایک خاص نہج پر کام کرنے لگ گیا تو زندگی نے خود ایسے واقعات مہیا کر دئے۔ جو ملی پیشکشوں کے لئے موزوں ہوں۔ قومی ترانے تو بجائے خود ایک صنف ہیں۔ ان کے علاوہ قبائلی لشکر۔ شہید وطن۔ مارچ پاسٹ۔ واہ میں اسلحہ سازی کا پہلا ملی کارخانہ۔ پاکستانی ہوا باز۔ سابق سپاہیوں کا اجتماع۔ پردیس کے ایک فوجی کیمپ میں ہلالِ عید دیکھ کر۔ صبح آزادی کا طلوع۔ سرحدی مورچہ۔ کل پاکستان ملٹری اکیڈمی۔ موضوعِ سخن بن سکتے تھے۔ جو خود بھی حقیقی ہوا اور اس میں کوئی ایسا شخص دیدۂ بینا لئے ہوئے گھوم پھر رہا ہو جو واقعی سپاہی ہو اور اپنے سینے میں حبِ ملت و وطن سے سرشار دل رکھتا ہو۔ اس کے متعلق "فکرِ او بکر است و با محسوس در خلوت نرفت، اور ما کیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس" کا گمان نہیں پیدا ہو سکتا۔ ایسے ہی ملایا، برازیل، اطالیہ، شرق الہند اور برطانیہ وغیرہ سے جو "لہو ترنگیں" حاصل کی گئی ہیں، وہ ایک باقاعدہ سپاہی کی جہاں گردی و جہاں نوردی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ اور ان کا اثر اس لئے زیادہ گہرا اور حقیقی تھا کہ سپاہی شاعر نے ان کو اپنے کانوں سے سنا اور دل میں سمویا۔ شاید یہ اسی تأثر کا نتیجہ تھا یا شاعر کا کرشمۂ فن جس کو اپنے ذریعۂ اظہار پر خوب قدرت تھی، کہ یہ اجنبی گیت بڑی کامیابی سے اپنائے گئے۔ ان میں ترجمہ بعد ہے اور تخلیق پہلے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسے تراجم میں ان کا ترجمہ ہونا پسِ پشت جا پڑتا ہے۔ شاعر کی اپنی صلاحیت مقدم ہو جاتی اور ترجمہ مؤخر۔ لہٰذا ان بدیسی دھنوں کو بھی ضمیر کی اپنی ہی دھن تصور کرنا چاہیئے۔ جس کے لئے اس کے الفاظ، اس کی ترکیبیں، اس کی شوخیٔ فکر اور طبعی جسارت کافی جواز مہیا کرتی ہے۔ "ایک کتبہ" کس صفائی سے کوہیما کے دیارِ غیر میں کام آنے والے انگریز سپاہیوں کی یادگار کو اردو کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے :-

وطن میں اہل وطن سے کہنا !
تمہاری صبحوں کی روشنی ہے
ہماری اس شام کے لہو سے

ان اجنبی دھنوں میں سب سے اہم اور جاذب نظر برازیل کا قومی ترانہ ہے جس پر اصل کے مقابلہ میں۔ دہ ہے دوم، بہ اول کا وثوق ہوتا ہے :

پرنگا کے ساحل کی خاموشیوں نے سنا تھا جو اک نغمۂ آتشیں
جیالے، جری، شیر مردوں کا نغمہ وہ اک گونج سی خشمگیں
افق در افق جگمگاتی ہوئی شوخ، آزاد کرنوں کا رقصِ حسیں
دمکنے لگا جن سے اپنا وطن
یہ مقدس زمیں یہ بہشتِ بریں

اگر شاعر شروع ہی میں یہ جتلا نہ دیتا کہ موسیقی کی مناسبت سے بحر کے ارکان میں کہیں کہیں ردّ و بدل سے کام لیا گیا ہے تو قاری اس کو خود محسوس کر لیتا۔ بحر کے انتخاب میں یوں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے کہ آخر میں ایک سببِ خفیف کم کر دیا گیا ہے جس سے آہنگ نرم اور ڈھیلا نہیں پڑتا بلکہ خوب چست رہتا ہے جو ایک قومی یا سپاہیانہ ترانے کے لئے بہت موزوں ہے۔ ٹیپ کے بند میں آخری مصرعے کے شروع میں ایک سببِ خفیف بڑھا کر قدموں کی کھٹ کھڑاہٹ کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ اور یوں آہنگ کا سپاٹ پن دور ہو جاتا ہے۔ تیسرے بند میں ہیئت پھر کچھ بدلتی ہے۔ اور اگلے بندوں میں اور بھی برابر بدلتی ہی جاتی ہے گو یا ایک آئینی بے آئینی سے بڑا ہی بے تکلف تنوع پیدا کیا گیا ہے

تجھے مرحبا! ——— تجھے آفریں!

★

برازیل اک خواب شیریں ہے تو، ایک روشن کرن مسکراتی ہوئی
نکھرتے پگھلتے ڈھلے آسمانوں میں اک زندگی کسمساتی ہوئی
"جنوبی صلیب اپنے تاروں" کی جس سے ضیا در ضیا جگمگاتی ہوئی

عظیم و قوی	دلیر و جری
بہاروں کا گھر	ستاروں کا گھر
جمال آفریں	خیال آفریں
نگاروں میں ایک	ہزاروں میں ایک
مقدس زمیں	بہشتِ بریں

برازیل ہاں!
مادرِ مہرباں!

یہاں پھر مارچ کے وقت چلتے چلتے قدموں کی کھڑکھڑاہٹ زیادہ شدت اور وضاحت سے سنائی دیتی ہے۔ پھر تخلیقی توانائی نے کتنی ہی جگہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیا ہے۔ افق در افق، نکھرتے پگھلتے ڈھلے آسماں، زندگی کسمساتی ہوئی، ضیا در ضیا بنتی ہرے رنگ کی نغمہ خواں سرسراہٹ۔ یہ مصرع "جنوبی صلیب......" خصوصاً اپنی پھلجھڑی جیسی کرن در کرن جگمگاہٹ اور نور پاشی یعنی متلازم اشاروں کی کثرت سے ایک عجیب سماں پیدا کرتا ہے۔ ایک نظر بند طلسم۔

مگر ہماری دلچسپی قدرتی طور پر اپنی ملت و وطن ہی سے متعلق لہو ترنگوں سے ہے۔ شاعر نے ان میں بھی نزاکتِ احساس اور ندرتِ تصور کا

ایک طلسم زار پیدا کر دیا ہے۔
پاک دیس کی فضا ان محبت بھرے نغموں میں پوری طرح رسی بسی ہوئی ہے۔ اور جا بجا اس کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کی لپٹ آتی ہے:

تیرے کھیتوں میں خوشے چراغاں رہیں
تیری شاموں کے چہرے درخشاں رہیں
تیری صبحوں کے سہرے فروزاں رہیں

اور اس مصرعے کی حد تک تو اس کا دعویٰ حرف بہ حرف درست ثابت ہوتا ہے کہ:

تیری مدفون دولت نکالیں گے ہم

"شعلۂ خیال" میں احساسات اور شوخیٔ فکر دونوں کے اجالے صباحت کا رہیں۔ جن کے ساتھ ساتھ زندگی کی سرمستیاں بھی مچل مچل پڑتی رہیں:

طلائی گھاٹیاں، وہ ریشمیں اشجار وادی میں
لرزتی گنگناتی آہٹیں سنسان راہوں میں
لبِ دریا، گھڑوں کے ساز، دوشیزاؤں کے نغمے
کنواری بیٹیوں کے ساتھ سادہ ماؤں کے نغمے
ہوا میں پھیلتی موسیقیاں ساکت اندھیروں میں
فضا میں جاگتی رعنائیاں دھندلے سویرے میں
کشادہ۔ گرد میں ڈوبے ہوئے ماتھے کسانوں کے
سنہری مچھلیوں والے بھرے بازو جوانوں کے
سہانی۔ سانس لیتی چاندنی میں رات کا منظر
کھری چاندی کے سوتے جاگتے ذرّات کا منظر
مقدس، آسمانی سادگی۔ ڈھیلے لبادوں میں
نگاہوں میں حیا، پاکیزگی مبہم ارادوں میں

پاکستانی کردار کی جو مرقع کشی ان اشعار میں کی گئی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس خوش اسلوبی سے ادا کیا گیا ہے، وہ جمالِ ہمنشیں یعنی شاعری پر بھی پلٹ کر ایک لطیف عکس ڈالتی ہے۔ شاعر نے بعض جگہ اِکّا دُکّا لفظوں سے بھی پاکستانی کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے نگینوں میں ان کی ساری جوت سمیٹ کر دکھائی ہے یوں:

کاشتکار ــــ آہنیں
شہسوار ــــ آتشیں
کوہسار ــــ سرمگیں
شاخسار ــــ ریشمیں

منظر نگاری میں وہ برمحل الفاظ کے ساتھ برجستہ استعاروں، ترکیبوں اور تصورات کو بھی آمیز کرتے ہیں۔ اور اردو کو ایسے جواہر پارے بخشتے ہیں:

اک طرف نیلی چٹانوں کی کھڑی اونچائیاں
اک طرف چٹیل ڈھلانوں کی کڑی گہرائیاں

جھومتے اشجار، گاتے، سرسراتے، آبشار
اونچے نیچے کھیت، گُل در گُل، بہار اندر بہار
گھومتے رستوں سے مُڑتی پھوٹتی پگڈنڈیاں
دل میں کہساروں کے جا کر ٹوٹتی پگڈنڈیاں
شبنمستانوں کی برنائی چٹانوں کا وقار
پتھروں کے کھردرے سینے صنوبر در کنار

سنہرے کھیت کرنوں کے • نکھری چاندی اجالوں کی
نکھرے گیہوں، بکھرے دھان — جگ مگ پٹ سن کے کھلیان
نہروں کے لہراتے جال — لہروں کے اٹھتے ارمان

حبِ وطن کی جوت جگاتے ہوئے یہ شیدائی وطن شاعری کی لَو بھی اکساتا جاتا ہے۔ اکیلے دکیلے الفاظ: بہارِ بہار آفریں۔ طوفاں بہ طوفاں، دیوار بر دیوار، خراماں شعلہ۔ سنہری مروّت، اور کبھی خوشہ خوشہ الفاظ کے جھرمٹ سے:۔

چاندنی — یہ نقرئی گلزار تھرّائے ہوئے
ساحلوں کے نو دمیدہ خواب لہرائے ہوئے
اشکوں کی برسات میں چمکا — ساتھ ہلال کے تارا،
بیاباں میں جیسے الاؤ کے شعلے، گلستاں میں جیسے چراغوں کے گھیرے
زندگی منزل بہ منزل — آپ لاتی ہے سراغ
روشنی — ساحل بہ ساحل — خود جلاتی ہے چراغ
مگر وہ شبِ وداعِ یار کی شب، ساتھ ہے میرے
تری چشمِ ستارہ بار کی شب ساتھ ہے میرے
مری یادوں کے دامن پر فروزاں ہیں ترے آنسو
ترے اندیشۂ بیدار کی شب ساتھ ہے میرے

اور پھر ٹیپ کا نغمہ تو وہی نغمۂ پاک ہی ہے۔ جو ہماری نوزائیدہ ملت کی امیدوں اور درخشاں مستقبل کا نغمہ ہے۔ شاعر کی نظر مجاہدانِ سرحد پر پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دَورِ محکومی کی ذلّت میں بھی جو آزاد تھے
اپنے کہساروں میں شیروں کی طرح آباد تھے

اسی مسلسل شعلہ زن احساس کا نتیجہ تھا جس نے سرحد تو کیا تمام برصغیر کے مسلمانوں میں حریت کا الاؤ بھڑکا دیا تھا:۔

قید — بے میعاد بھی، جاں سوز بھی، دلگیر بھی
سلسلہ در سلسلہ، زنجیر در زنجیر بھی
زرد تھی چہروں کی رنگت، سرد تھی سینوں کی آگ
جم چکے تھے مضمحل ہونٹوں پہ آزادی کے راگ

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

نذرالاسلام

یونس احمد

نذرل کی مشہور نظم "آمار کیفیت" کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

برتمانیر کوبی آمی بھائی بھوشیتر ناثی نبی

(میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں)

اور آخری شعر یہ ہے: "پرارتھنا کورو، جارا کیڑے کھائے تینتریش کوٹی مو کھیر گراش

جینو لیکھا ہوئے آمار رکتو لیکھائے تادیر شرہو ناش"

(دعائیں مانگو کہ جو تینتیس کروڑ انسانوں کا اپنا لقمہ بنا رہے ہیں، ان کے لئے

خون میں ڈوبی ہوئی میری یہ تحریر پیام موت ثابت ہو)

ٹھیک ہے نذرل مستقبل کے پیغمبر نہیں تھے لیکن انہوں نے تابناک مستقبل کے لئے جو دعائیں مانگی تھیں وہ حرف بحرف قبول ہوگئیں اور سچ مچ ان کی خون میں ڈوبی ہوئی تحریر حاکم وقت کے لئے پیام موت ثابت ہوئی۔

نذرل زمانۂ حال کے شاعر تھے۔ "تھے" میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی شاعری کا چراغ آج سے اٹھارہ سال پہلے ہی اپنی جلوہ سامانیاں کھو چکا ہے اور اب ان کے ذہن و فکر پر تاریک غلاف چڑھا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا، دل و دماغ نے جو کچھ محسوس کیا، تفکرات و احساسات میں جو آندھیاں چلیں، وہ سب انہوں نے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی دوربیں نگاہوں اور دوررس ذہن ہی کی تو یہ برق پاشیاں ہیں کہ سسکتی اور لولی لنگڑی زندگی کے خشک ہونٹوں میں انہوں نے امرت رس چھلکائے اور اماوس جیسی گہری تاریک راتوں میں ان گنت جگنو بکھیر دئے۔ وہ خیالی جنت کی چمن بندی اور تخیلی اصنام کے آگے سجدہ ریزی کو اعصابی کمزوری سمجھتے تھے۔ ان کے آگے ایسے شاعروں کی مثالیں بھری پڑی تھیں جو مرتے دم تک خیالی بت تراشیاں کرتے رہے لیکن اِدھر ان کی سانسیں اکھڑیں اور اُدھر ان کی "تخلیقات" بھی ہزاروں من مٹی کے نیچے دب کر رہ گئیں۔ شاعر کا کام صرف اختر شماری کرنا، ہجر و فراق کی راتوں میں سرد آہیں کھینچنا، سیاہ کاکلوں اور دھانی دوپٹوں کو دیکھ کر اپنا گریبان چاک کرنا اور چودھویں رات کی ملگجی چاندنی میں معشوق کی بیوفائی کا گلا کرنا نہیں ہے۔ وہ تو دراصل نباض فطرت ہے۔ زندگی کا نغمہ خواں ہے، ترجمان حال ہے۔ وہ زندگی کو اور اس کے تقاضوں کو اصلی روپ میں دیکھتا ہے۔ اسے حالات و واقعات کے ان مراحل اور مدارج سے گزرنا پڑتا ہے جہاں نہ تو چاندنی کی سحر انگیز مسکراہٹیں ہیں، نہ روپ رنگ کی عشوہ طرازیاں۔

نذرل نے اپنے دور کے دوسرے بنگالی شاعروں کی نسبت اپنی دنیا قطعی مختلف بنائی تھی۔ تعجب تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس نرالی اور مثالی دنیا کی بنیاد ایسے حالات میں رکھی جبکہ برصغیر ہند و پاک میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں نقطۂ عروج پر تھیں۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد کا پُر انتشار اور پُر ہول زمانہ تھا جب آہنی سلاخوں کے پیچھے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ جب زبان پر پہرے بٹھا دئے گئے تھے اور قلم چھین لیا گیا تھا۔ ایسے افراتفری کے دور میں اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ:

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں......"

تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ عظیم شاعر ہے، پرستار حیات ہے، زندگی کا نغمہ گر ہے۔

نذرل کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑا جس میں سب سے بڑا محاذ انگریز کے خلاف تھا۔ انگریز ان کو اپنا کٹر دشمن سمجھتے تھے کیونکہ ان کے

خلاف ان کی آوازیں شہروں کے علاوہ گاؤں، دیہاتوں، کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں تک میں بازگشت کر رہی تھیں۔ یہ تینوں محاذ بہت مضبوط اور مستحکم تھے۔ ان کی دیواریں صرف چونے اور گارے کی نہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے ہونٹوں سے ہمیشہ یہی نغمہ پھوٹتا رہا:۔

ہم اندھیری رات کا جگر چاک کرکے درخشندہ صبح کی داغ بیل ڈالیں گے۔

ہم ازسرنو دھول اور مٹی کا تاج محل تعمیر کریں گے۔

نذرل کی یہ للکار فضا میں اس وقت گونجی تھی جب رقص و نغمہ کی سرزمین بنگال کے آسمان پر قوس قزح کے رنگ نے شاعر و ادیب کو اپنے حسین رنگوں کے پردے میں چھپا لیا تھا، جب آفاقی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، جب خیالات کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر یہ شاعر چاند نگر کی طلسمی فضاؤں کی سیر کر آتے تھے۔ نذرل نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چاند کو زمین پر بیٹھ کر ہی دیکھتے تھے۔ وہ اس زمین کے پرسوز اور دلرس گیت گاتے تھے جس کی کوکھ سے انہوں نے جنم لیا تھا۔ وہ ماورائی دنیا سے باتیں کرنے کی بجائے ان مانجھیوں سے ہمکلام ہونا بہتر سمجھتے تھے جن کے بادبان طوفانی ہواؤں سے تار تار ہو چکے ہیں، اس کے باوجود وہ مخالف سمت ناؤ کھیتے جا رہے ہیں۔ وہ چرواہے کے اس لڑکے کی دلجوئی کرنے میں دوامی خوشی محسوس کرتے تھے جو چھوٹے سے پیڑ کی چھاؤں تلے بیٹھ کر بانسری کی لے پر جھوم رہا ہے۔ وہ ان کاشتکاروں کے گیت گاتے تھے جن کے مٹی سے اٹے ہوئے ہاتھ نئی فصل کا پیغام لاتے ہیں۔

نذرل نے کبھی مستقبل کی پیشین گوئی نہیں کی۔ انہوں نے کبھی 'کل' کے بارے میں کچھ نہیں کیا۔ وہ تو وہی کہتے اور لکھتے تھے جو ان کا دل محسوس کرتا تھا، جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں وہ مستقبل سے قطعی لاپروائے فکر اور بے رہتے تھے۔ یہ چیز ان کی نجی زندگی میں بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے 'کل' کے لئے کچھ نہیں سوچا۔ ان کی لاابالی طبیعت اور مجتہدانہ فطرت اس بات کی متقاضی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ صرف حال پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی "جام جمشید" کی خواہش نہیں کی۔ وہ تو امروز کے آئینہ میں کائنات کے خدوخال اور نقش و نگار کو دیکھ لیتے تھے۔ اسی آئینے میں انہوں نے زندگی کو اس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھا۔ ان کا یہی وہ مشاہدہ تھا کہ وہ پکار اٹھے تھے:۔ "میں اسی کے گیت گاتا ہوں جو دنیا کو نئی فصل کا پیغام سناتا ہے"۔

یا پھر: "میں اسی کے گیت گاتا ہوں جو شاہراہ حیات پر کائنات کے ساتھ پیش روی کر رہے ہیں"۔

زندگی کو صحیح معنوں میں برتنا بہت کٹھن کام ہے۔ نذرل نے زندگی کو برتا تھا۔ وہ صرف اس کے ظاہری خدوخال پر نگاہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ ان دکھوں، آنسوؤں، چیخوں اور کراہوں کو بھی محسوس کرتے تھے جن کا کرب مشکل سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند ان پڑھ اور سطحی ذوق رکھنے والوں نے نذرل کا ان لفظوں میں مذاق اڑایا کہ ان کی شاعری میں صرف جذبات غالب ہیں اور لطیف احساسات کا فقدان ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ ایک سپاہی تھے اور گھن گرج اور نعرۂ انقلاب و بغاوت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ نذرل کے ان رسیلے گیتوں، غزلوں اور نظموں سے قطع نظر جن میں خونِ جگر کی بوندیں شامل ہیں اور لطیف احساسات و محسوسات کی چبھن ہے اگر وہ ان کی باغیانہ نظموں ہی کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو ان کے اندر بھی انہیں نئی آواز سنائی دیتی، لطیف احساسات ملتے تھے۔ نذرل سپاہی ضرور تھے لیکن ان کی انگلیاں صرف بندوقوں سے نہیں کھیلتی تھیں، یہ انگلیاں خونِ دل میں بھی ڈوبی رہی ہیں۔ ان کا دل لاشوں کو دیکھ کر سخت نہیں ہوا پگھل گیا ہے اور وہ محسوس کرنے لگے کہ زندگی کی کھالیں کس بیدردی سے ادھیڑی جاتی ہیں۔

"ادب" کسی کے سامنے "بازیچۂ اطفال" ہو تو ہو نذرل نے اس کے لئے شب بیداری کی ہے، دل کے ہزاروں چراغ جلائے بجھائے ہیں۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اس جنون میں مبتلا رہے ہیں جہاں گلہائے رنگارنگ کی سیج نہیں بچھتی اور جھلسے ہوئے ریگ زاروں کے کانٹے ہیں۔ انہوں نے "بنگلہ ادب میں مسلمان" کے عنوان سے اپنے اخبار "نوایگ" میں جو اداریہ لکھا تھا اس سلسلے میں اس کا اقتباس پیش کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ادب دلی کیفیت کے اظہار کا نام ہے۔ جس کا دل مردہ ہو چکا ہے اور جوانی رعنائیاں کھو چکا ہے وہ ادب پر بھینٹ کیسے چڑھا سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ادیبوں کی اکثریت بے گور و کفن لاش ہے جس میں نہ کوئی بوقلمونیت ہے، نہ حسن ہے نہ جمالیاتی ذوق........

ان دنوں نوجوان ادیبوں کی نگارشات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ عہد ماضی کے بوڑھوں کی تحریریں ہیں کیونکہ ان کے اندر

نہ تو زندگی ہے، نہ غور و فکر ہے اور نہ مطلب و معنی۔ اگر ادب میں قوس قزح کے رنگوں کی طرح مسرت و کامرانی کی رنگ آمیزی کرنی ہے تو نوجوانوں کو سازِ سنگیت کی طرف بھی توجہ دینی پڑے گی کیونکہ اس طرح ان کی نگارشات میں ان کی تحریروں میں سنگیت کا جادو رس بس جائے گا اور پھر وہ حیاتِ دوام حاصل کرلیں گی۔"

نذرل ادب میں صداقت، سچائی اور حقیقت پسندی کے رسیا تھے۔ ان کے خیال میں وہی ادیب زندہ رہ سکتا ہے جس کی تحریروں میں صداقت ہے۔ مبالغہ آرائی ادب میں جائز نہیں کیونکہ ایسے ادب اور ایسے ادیب کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ اسی اداریہ میں وہ کہتے ہیں:

"آرٹ کا مطلب صداقت کا اظہار ہے اور صداقت ہی دراصل حسن ہے، دائمی مسرت ہے"

مذکورہ بالا اقتباسات سے نذرل کے ادبی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس بات کا بھی سراغ مل جاتا ہے کہ وہ محض نعرہ باز شاعر تھے یا کچھ اور۔ حق تو یہ ہے کہ نذرل نے ہمیشہ ادب میں جمالیاتی قدروں اور حقیقت پسندیوں پر زور دیا ہے۔ وہ شاعر کے لئے موسیقار ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو شاعر موسیقی کا دیوانہ نہیں اس کی شاعری میں گداز پن نہیں آسکتا۔ وہ تاثر نہیں پیدا ہو سکتا جو شاعری کے لئے ناگزیر ہے۔ نذرل خود بہت بڑے موسیقار تھے۔ وہ اس زندگی کے گیت گاتے رہے جو امروز کی آگ میں تپ کر کندن بنی۔ وہ شاہراہ زندگی کے ایسے مسافر تھے جو اس وسیع و عریض کائنات میں تنہا چل پڑے تھے۔ انہیں اس کی فکر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ ان سمندروں اور صحراؤں سے بھی خائف نہیں جو ان کے سامنے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

کسے معلوم میں مسافر کہاں جا رہا ہوں؟
میرے دونوں جانب دکھ سکھ کے پردے اڑ رہے ہیں اور میں
دریا کے بیچوں بیچ بہہ رہا ہوں۔

نذرل کی زندگی دکھوں اور مسرتوں سے عبارت ہے۔ وہ افلاس کی زنجیروں میں جکڑے بھی رہے اور مسرتوں کے حسین مجسمہ سے بغلگیر بھی ہوئے۔ ان کی خوشیوں اور کامرانیوں کا حسین مجسمہ اگرچہ وقفے وقفے کے بعد منہدم ہو جاتا تھا، اس کے باوجود وہ برابر مسکراتے ہی رہے۔ افلاس ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹیں نہ چھین سکا۔ ان کی آنکھوں کی وہ چمک ماند نہ پڑ سکی جو حوادثِ روزگار میں بھی نظر آتی تھی۔ ان کے دل کا وہ سرگم خاموش نہ ہو سکا جو ہر رنگ میں کائنات کو وجد میں لاتا رہا۔

نذرل بیس بائیس سال تک افقِ شاعری پر جلوہ گر رہے اور اس عرصے میں وہ برابر حال کے نغمے الاپتے رہے۔ کبھی انہوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئیں، کبھی حسنِ جہانتاب کے آگے سجدہ ریزی کی اور کبھی راگ رنگ کی پُرسکون دنیا بسائی۔ چنانچہ ان کی اس متنوع زندگی کی طرح ہم ان کی شاعری میں بھی تنوع پاتے ہیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ پانچ چھ سال تک فوجی زندگی گذارنے کے باوجود ان کا دل کتنا گداز تھا، ان کی مسکراہٹوں میں کتنی کشش تھی۔ ان کے محسوسات اور خیالات کتنے نازک تھے۔ انقلاب و بغاوت کے علاوہ وہ برابر حسن و عشق کی راگنیاں چھیڑتے رہے۔ عشق اور حسن اُن کی شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ وہ بارہا "حسن" کا شکار اور ان کے ہونٹوں سے نغمے پھوٹے۔

آئے گا اک بھیانک طوفاں کھل کے گریں گے بندھن سارے
آہ اُٹھے گی اک سینے سے تڑپے گا دل درد کے مارے
کھل کے گریں گے بندھن سارے
آئے گا میرا دھیان نہ کیونکر
بھاری ہوگا بجھ کا پتھر

کاش وہ ہوتا چھیڑنے والا
میری محبت کا متوالا
آپ ہی اپنا مکھ چوموگی
اس دن مجھ کو یاد کروگی

✱

فن :

(ایک خود شبیہہ)

عبدالرحمٰن چغتائی

آرٹسٹ جب اپنی پہلی تصویر بناتا ہے تو وہ اس کی پیدائش کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے میری پیدائش کا سال ۱۹۱۹ء ہوتا ہے اور یہی سال میرے مستقبل کی فال ہے۔ جب میری بنائی ہوئی تصویریں ۱۹۲۰ء میں پہلی بار پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی لاہور کی نمائش میں پیش ہوئیں تو یکایک ایک طوفان امڈ آیا۔ تنقید اور نکتہ چینی کی شکل میں مختلف ذہنیتوں نے جو مظاہرہ کیا وہ میرے اور میرے آرٹ کے لئے ایک روشن اور نیک فال ثابت ہوئی۔ یہ نمائش جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہندوستانی اور مغربی آرٹ اور آرٹسٹوں کی ایک نمائندہ نمائش تھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی بات ہے جب مشرق میں بھی بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ہر فرد اور قوم ترقی کے زینے طے کرنے کی فکر میں تھی اور ہندوستان میں یہ زمانہ جدید ہندوستانی اور بنگالی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جس نے ہر اہلِ نظر کو مسحور کر رکھا تھا۔ گو اس سے پہلے پنجاب علوم و فنون کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

ہمسایہ قوم کو چھوڑ مجھے ایسے حالات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جن کے تصور سے دکھ ہوتا ہے۔ میرا فن اتفاقات کا کرشمہ نہیں، یہ پکا پکایا ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اعتماد تحمل اور محنت کا پھل ہے۔ آج میرے آرٹ، میری تکنیک کو بین الاقوامی درجہ حاصل ہے اور میری تصویریں دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔

جب میرے آرٹ نے جنم لیا، میرے اپنے ملک اور میری اپنی قوم میں ایسے اسباب موجود تھے جو ایک آرٹسٹ کی سلامتی کے لئے سد راہ ہو سکتے ہیں خصوصیت سے وہ قوم جس کا میں فرد تھا اسے اس وقت آرٹ کی صلاحیتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اگرچہ وہ علوم و فنون، ذوق نظر اور ہنر پروری کے تمام ذرائع سے مالا مال تھی۔ جب پہلی بار میری بنائی ہوئی تصویر "موڈرن ریویو" کلکتہ میں شائع ہوئی تو مجھے برما، سیلون، پشاور، ہندوستان یہاں تک کہ افریقہ سے خطوط آئے تھے کہ کوئی مسلمان آرٹسٹ اس میدان میں بھی نظر آیا ہے۔ میرے عزیز دوست جو میری اس کوشش کو قومی نقطہ نگاہ سے نیک فال خیال کرتے تھے، اس فکر میں مبتلا تھے کہ میں اس بڑھتی چڑھتی دنیا میں اپنے مستقبل کا ساتھ بھی دے سکوں گا یا نہیں۔

شروع سے لیکر آج تک ایک گروہ کسی نہ کسی صورت میری جدوجہد کا پیچھا کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے ہمیشہ میرے آرٹ اور میرے مدعا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس کی یہی کوشش رہی ہے کہ میں دل برداشتہ ہو کر اپنے برش اور رنگوں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لوں، مگر باوجود ہزار شکست اور تخریبی حالات کے میں اس شاہراہ پر برابر گامزن ہوں جس کو میں نے پوری شدومد سے سرگرم عمل رہنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے وہ کوئی معجزہ نہیں۔ یہ تمام تر اسی بات کا نتیجہ ہے کہ زندگی کی دشواریوں سے دوچار ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جائے اور جوشِ حیات کو کبھی سرد نہ ہونے دیا جائے، چاہے سرفرازی حاصل ہو یا نہ ہو۔

آرٹ کے سلسلہ میں میرے دل میں ایک ہی جذبہ کارفرما رہا ہو جو آج بھی میرے فنی شعور کا جزو اعظم ہے: یہ کہ آرٹ محض آرٹسٹ کی ذاتی لذتوں اور خوشیوں کا ذریعہ نہیں، اس میں انسان اور انسانیت کا بھی حصہ ہے، اور یہ وہ عالمگیر جذبہ ہے جس سے کائنات پھلتی پھولتی ہے۔ "مرقع چغتائی" کی اشاعت مسلمانوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلانے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ میرا اعتماد، میری جدوجہد میری قوم کے کام آئی۔ مسلمانوں نے آرٹ کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا احساس بڑی شدت سے محسوس کیا۔ میری کوشش اور ہمت نے ہمسایہ قوم کو بھی میری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا اور میرا آرٹ دیکھتے دیکھتے ہر ہندوستانی کے دل میں گھر کر گیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی آرٹ کے بانی ڈاکٹر ابندر ناتھ ٹیگور اور تمام بنگال کو میرے فن سے مرعوب ہوتے ہوئے اعتراف کرنا پڑا کہ چغتائی کو رنگوں کے امتزاج اور خطوط پر غیر فانی قدرت حاصل ہے۔

اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں بنگال کی جدید تحریک سے وابستہ رہا ہوں، یا میں ان میں سے کسی استاد کا پیرو یا پروردہ ہوں۔ میں نہ تو بنگال اس غرض سے گیا ہوں نہ مجھے کسی کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب میرے آرٹ نے جنم لیا اس وقت جدید ہندوستانی آرٹ

کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ اس تحریک میں میں نے بھی اپنی بساط بھر حصہ لیا ہے اور آج جدید ہندوستانی آرٹ کی تاریخ میرے آرٹ کے وجود کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔ میری آدمی سے زیادہ تصویریں ہندوستانی عجائب گھروں اور ریاستوں کی زینت ہیں اور ان لوگوں کے پاس موجود ہیں جو آرٹ کے دلدادہ ہیں۔

میرے فن، میرے عمل، میری تصویروں اور تحریروں میں اس مقصد کو ہمیشہ دخل رہا ہے جس سے انسانیت پھلتی پھولتی ہے۔ میں یہ سب کچھ اس لئے تحریر نہیں کر رہا کہ میں کوئی بڑا آدمی ہوں اور میری بھی کوئی غیر معمولی شخصیت ہے بلکہ اس لئے کہ قدرت ایک ادنیٰ درجے کے آدمی سے بھی کام لینے کے اسباب کس طرح پیدا کر لیتی ہے۔ جب میرے آرٹ کی ابتدا ہوئی تو مغل ایرانی آرٹ کو چھوڑ پورے مشرق پر ایسا ادبار چھایا ہوا تھا اور کسی کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آج سے صدیوں پہلے انسان کو آرٹ کی ضرورت تھی یا آرٹ ہماری زندگی کا ایک حصہ بھی رہا ہے۔ ہمارے قدیم فنکاروں نے آرٹ اور زندگی کے تعلقات کو گہرا بنا دیا تھا، زندگی کے ہر شعبہ پر ان کا فن غالب اور نمایاں تھا۔ فطری رجحانات ہی کے سبب مجھ میں جمالیاتی تصور پرورش پا رہا تھا۔ میں نے اپنی روایات اپنی تہذیب کو اپنے فن کا جزو اعظم بنایا ہے اور مشرقی آرٹ، مشرقی روح کو پورے انہماک سے اپنایا ہے۔ میرے فن سے مشرقی آرٹ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوا ہے۔ میرا فن ایسے سانچوں میں ڈھل گیا ہے کہ قدیم استاد چاہے بہزاد، رضا عباسی، میرک محمدی، عبدالصمد، میر علی اور فرخ بیگ کیوں نہ ہوں، اگر میرا آرٹ دیکھیں تو یہ نہ کہیں گے کہ ہم جہاں آرٹ کو چھوڑ گئے تھے وہیں کا وہیں رکا پڑا ہے، وہ ضرور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ تقاضوں کے مطابق اس کے آرٹ نے بھی وقت کا ساتھ دیا ہے۔ وہ تسلیم کریں گے کہ مشرقی آرٹ خصوصیت سے ایرانی اور مغل آرٹ کئی منزلیں طے کر کے کہاں سے کہاں آ پہنچا ہے۔ میرے فن کی انفرادیت نے دوست دشمن دونوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلائی ہے اور آرٹ کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں اپنے فطری رجحانات کی بنا پر مشرقی واقع ہوا ہوں اور جب مشرقیت کا میں ترجمان ہوں، اس کا بڑی شدت سے لوگوں کو احساس دلایا ہے۔ مغربی آرٹ کے معیار کو بلند اور جامع بنانے میں مغربی آرٹ اور اس کی تاریخ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ مشرقی آرٹ میں وہ تمام صلاحیتیں سمو دوں جو وقت کی ضرورت اور معاشرے کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے دو دفعہ یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ میں یورپ مشرقی کی حیثیت سے گیا ہوں اور مشرقی کی حیثیت سے واپس آیا ہوں۔ جہاں تک مغرب نے ہماری مشرقی خوبیوں کو اپنانے اور اپنی تہذیب کا حصہ بنانے میں سرگرمی دکھائی ہے۔ میں نے بھی اپنی مشرقیت کو جلا دینے میں کمی نہیں کی مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بعض فنکار حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں اور تلاش اور کوشش کی قوت سے گریز کرنے لگے ہیں کسی نقاد، شاعر اور آرٹسٹ کو جرأت نہیں کہ وہ برملا کہہ سکے کہ ہمارے برسر اقتدار آنے کے طریق ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے لئے کس قدر مفید ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ چغتائی ایک ماضی پرست آرٹسٹ ہے اور جو میرے زیادہ قریب ہیں، مجھے ایک جدید ترقی پسند آرٹسٹ خیال کرتے ہیں۔ وہ آرٹ جو اپنے نام ونسب، اپنی معاشرت، اپنی طرز نگارش سے پکارا جائے وہ آرٹ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جاپانی چینی، فرانسیسی، جرمن، اور اطالوی آرٹ۔ آرٹ مشرق کا ہو یا مغرب کا، اگر وہ اپنی روایات اور ماضی سے متاثر نہیں تو اس کا کوئی مستقبل نہیں اگر پوچھا جائے کہ چغتائی اور اس کا آرٹ کیا ہے، تو میرے خیال میں یہ وہی حقیقت ہے جو ایک فن کار کو دوسروں سے بلند کرتی ہے اور نئے کردار کی تخلیق کرتی ہے۔ میری تصویروں کی بندش نئی ہے، رنگ اور خطوں کا انداز نیا ہے، مرکزی خیال وشعور اور ان کا جمالیاتی تصور نیا ہے۔ میری طرز نگارش اور اسلوب مشرق و مغرب کے امتیاز کو اجاگر کرتا ہے۔ میری نئی راہیں، نئے تقاضے مشرق کی عظمت کا باعث اور مغرب پرستی کے خلاف جہاد ہیں۔ جس طرح مغرب کے قدیم وجدید فن کاروں نے اپنی تہذیب وتمدن کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اسی طرح میرے فن نے بھی مشرقی تہذیب اور روایات کی نمائندگی کی ہے۔ جس زندگی کا اقبال خواہاں تھا، جس نظر سے وہ زندگی اور اس کی اقدار کو دیکھتا تھا، میں نے بھی اسی سوز و ساز اور زندگی کو رنگوں اور خطوں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ میری مصوری میں ایسے کردار بھی نظر آئیں گے جن کو دیکھ کر اقبال کے اشعار خود بخود لبوں پر کھیلنے لگیں گے، کچھ ایسی صورتیں بھی نظر آئیں گی جن سے ہماری عظمت اور شوکت یاد آئے گی۔ مغرب پرستی کے خلاف اقبال نے تمام عمر جہاد کیا ہے۔ میرے جہاد کا تعلق بھی اسی بت پرستی اور تقلید سے ہے جس نے ہماری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ مغرب پرستی نے ہمارے خد و خال ہی کو مسخ نہیں کیا بلکہ ہمارے نظریے کو

بھی بدل ڈالا ہے۔ میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادیت کو جنم دیا ہے جس کا مرکزی تصور اپنی سلامتی، اپنی صلاحیتوں اور اپنے جذبۂ حیات کو از سرِ نو وجود دیتا ہے۔ اس لئے میرے کرداروں کے خدوخال، رنگ روپ، میری طرزِ نگارش، نقش و نگار سب مشرقی امتیازکے حامل ہیں۔ ان میں زندگی، زندگی کا سوز و ساز، مشرقی خون کی حدت، سخت کوشی، مقصد آفرینی اور ماضی کی عظمت و شوکت مضمر ہے۔ خدا کی بخشش کو اس بناء پر نظرانداز کر دینا کہ مغرب کی نقالی سے تحسین اور سرفرازی حاصل ہو گی کوئی اہم مقصد پورا نہیں کرتا۔ اقبال نے ایسی ماؤں اور بچوں کی آرزو کی ہے جو سربکف مجاہدانہ زندگی کی تلخیوں سے لذت آشنا اور جلال و جمال کے مظہر ہوں۔ ایسے مشرقی جنہیں انتخاب و اختیار پر قابو حاصل ہو۔ یہی میری تخلیق کا مقصد اور ماحصل ہے، کہ ہر فرد زندگی کے ترجمان اور زندگی کی سرمستیوں سے سرشار پیمانہ بردار حقائق کا متلاشی ہو۔ اگر موجودہ آرٹ کے انتشار کو دماغی خلل کہکر پکارا جائے تو میرے نزدیک یہ خلل محض اعصابی ہی نہیں، زندگی سے فرار اور احساس کمتری کا وہ سبب ہے جس سے نشوونما رک جاتی ہے اور انسان اپنے مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ابھی تک ہمارے ہاں کوئی تجریدی اضافہ نہیں ہوا۔ کسی ایسے آرٹ نے جنم نہیں لیا جس کی بنا پر ہم آرٹ چھوڑ کر اس گھٹیا آرٹ کی نقالی میں لگ جاؤں جسے مغرب پرستی اور مغربی آرٹ کی صحیح تقلید بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب پرستی کی بدعت اور نقالی کو میں سوائے فرار اور کمزوری کے اور کچھ نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں بدحالی اور بے راہ روی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے کسی انفرادیت کو ابھرنے نہیں دیا اور نہ کوئی فرد کوئی ایسی راہ تلاش کر سکا ہے جس میں قومی کردار یا کسی عالمی تحریک کو پہنچنے کا موقع ملا ہو۔ ہماری رجعت پسندی اور ترقی پسندی محض مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ جب میری بنی ہوئی بابر جہانگیر یا اورنگزیب کی کوئی تصویر دیکھ پاتے ہیں تو مجھ کو قدامت پسند یا مشرق زدہ کہنے پر اتر آتے ہیں اور نہیں جانتے کہ مغرب کے جدید سے جدید آرٹ نے بھی بی بی مریم اور حضرت مسیح کی تصویریں بنائی ہیں اور ان آرٹسٹوں نے بائیبل کے واقعات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ یورپین عیسائی آرٹ کے مقابلے میں مغلوں کا آرٹ کل کی بات ہے، ان کی تصویروں میں نہ کوئی مذہبی تبلیغ ہے اور نہ کسی رہبانیت کا تسلسل۔ صرف کرداروں کی تشکیل اور عظمت و شوکت کا اظہار ہے۔ ہو سکتا ہے میں ضرورت سے زیادہ مشرقی نظر آتا ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی کہلانے ہی میں ہماری نجات ہے۔ کیونکہ وہ قوم جس کے آرٹ کا نام و نسب، اس کی خصوصیت، اس کی طرزِ نگارش اور تکنیک اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے معاشرے سے وابستہ نہیں، اس کے آرٹ کا نہ کوئی حال ہے نہ مستقبل۔

میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادی تحریک اور مرکزی خیال کو جنم دیا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری مشرقیت، تکنیک، میرا فن، طرزِ نگارش صدیوں تک ملک اور اس کے فن کاروں کی رہبری کرتے رہیں گے، اور انہیں زندہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی جرأت دلاتے رہیں گے۔ میں نے ایک ایسی ثقافت و معاشرت کی ترجمانی کی ہے جس کی نمائندگی کا مجھ کو حق پہنچتا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تنقیدی دائرے سے نکل کر اور قدیم و جدید کے تقاضوں سے بلند ہو کر ایک ایسی شاہراہ تلاش کروں جس سے ہمارا تمدن، ہماری تہذیب ایک ایسے وسیع مقام پر جمع ہوں جہاں روایاتی تعلق منقطع نہ ہو۔ تعین مقاصد کے لئے اس حقیقت کا معلوم کرنا ازحد ضروری ہے کہ آخر ہم کیوں اندھا دھند مغربی آرٹ کو ذریعۂ نجات سمجھ بیٹھے ہیں جس کی پشت پناہ گنتی کے آرٹسٹ ہیں اور ہم خود ایسے ملک اور ایسے آرٹ کے علمبردار ہیں جن کی طرف ان ملکوں کے باشندوں اور آرٹسٹوں کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کچھ اہمیت ہی نہیں۔ آرٹ کا نظریۂ فن برائے زندگی یا فن برائے فن زندہ قوموں کی بصیرت کا کرشمہ ہے۔ ہماری سابقہ بدحالی اور غلامی نے ہماری صلاحیتوں کو چھوڑ، فن کا جو بھی مقصد ہو اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اہلِ ذوق کو اتنا موقع بھی میسر نہیں کہ وہ ذوقِ نظر سے کوئی فرق مراتب محسوس کر سکیں کیونکہ ہمارے آرٹسٹوں کا تعلق نہ تو ہماری شعوری زندگی سے ہے اور نہ اس جوہر سے جس سے تغیر اور انفرادیت کی شکل مرتب ہوتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ آرٹسٹ کی صلاحیتوں کے شناسا اس کے زمانے ہی میں پیدا ہوں۔ جب کبھی ایسا موقع فنکار کے ہاتھ آجائے اور وقت مردِ زیرک (GENIUS) کا ساتھ دے اور اسے جاننے اور پرکھنے کی فضا اس کی زندگی ہی میں پیدا ہو جائے، تو اس کی تخلیق میں اس کی قوم اور اس کے افراد کے تقاضوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فن کار کے عمل اور فرض میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے نئے نئے راستے متعین کرنے

اور عوام و خاص کو قریب ترلانے میں منہمک رہتا ہے۔ اسلئے کبھی کہ تخلیق اور عمل میں اپنے معاشرے اور روایات کی ترجمانی ضروری ہوتی ہے۔ میرا تخلیقی سرمایہ، میری خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ اگر میں رائج الوقت تجریدی آرٹ سے پیدا ہونے والی بے راہ روی اور انتشار کی پیروی کرتا اور بغاوت نہ کرتا تو میرا آرٹ بھی سطحی صورت اختیار کر لیتا اور کبھی دعوے سے نہ کہا جا سکتا کہ ہماری تہذیب، ہمارے آرٹ کا پس منظر کس قدر جامع اور پختہ ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے کہ اس برصغیر کی جدید مصوری کا احیا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی تہہ میں انگریزی سیاست کا ہاتھ کارفرما تھا۔ مگر اس میں وہ خلوص بھی تھا جس سے مقامی مصوروں کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور یہاں کا جدید آرٹ دیکھتے دیکھتے دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور وہ تحریک اپنی روایات اور اپنے نام سے پکاری جانے لگی۔ مغربی نقادوں اور مبصروں کو بھی اس کے وجود اور انفرادیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کا محض یہ سبب تھا کہ کسی تجریدی آرٹ، کسی مغربی تحریک کی پیروی کا اس سے تعلق نہ تھا۔ برصغیر کے جدید آرٹ میں حصہ لیتے ہوئے مجھے پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ میں نے اپنے ہمعصروں کے دوش بدوش اس جدید تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور پرخلوص جدوجہد اور فرائض کی رو سے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے جس کا بڑے خوش آیند الفاظ میں دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے یہاں تک کہ برصغیر کی جدید مصوری کی تاریخ میرے نام کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ میں یہاں کا واحد آرٹسٹ ہوں جس کے متعلق زیادہ سے زیادہ لے دے ہوئی ہے اور جس پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ میرے اسلوب کو ایک مستقل دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ امید ہے اس سے ہماری مصوری کا وجود زندہ اور تابندہ رہے گا جو تقریباً تین سو سال سے اپنی راہیں کھو چکی تھی۔ اقبال نے جب پہلا شعر یا غزل لکھی ہوگی اس کے سامنے "ضربِ کلیم"۔ "پیام مشرق"۔ "زبورِ عجم" یا "جاوید نامہ" کا تصور نہیں تھا۔ میں نے بھی جب پہلی تصویر، پہلا اسکیچ بنایا تھا، اس وقت آج کی مصوری اور آج کی طرزِ نگارش پیش نظر نہ تھی۔ میں پیکاسو، گوگین، برک اور ون گوخ بننے کا خواہشمند نہیں۔ ہماری بقا کا راز ہمارے اپنے تقاضوں میں ہے تم بھی بہزاد، برک، رضا عباسی، میر علی عبدالصمد، فرخ بیگ اور نادر العصر منصور جیسے عظیم استادوں کے اندر ان امکانات کی تلاش کریں۔ جیسا کہ مغربی آرٹسٹوں نے اپنے آرٹسٹوں کے اندر رہ کر اور اپنے تقاضوں کی تلاش کر کے اپنے آرٹ کے وقار کو بلند کیا ہے۔

میرے آرٹ پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور ہر دور میں میں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے اور آج تک رنگ، برش اور پنسل کو اپنے ہاتھ سے نہیں رکھ دیا۔ میرے مطالعہ کا مرکز ایرانی، مغل، راجپوت اور بدھ آرٹ رہا ہے۔ میں نے وقت کی ضرورت کے تحت مغربی آرٹ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے، اپنے مطالعہ کو جلا دینے کی خاطر دو دفعہ یورپ بھی ہو آیا ہوں لیکن اپنی صلاحیتوں اور انفرادیت کو کسی کا مقلد اور پیرو نہیں ہونے دیا۔ میں نے شاہین صفت لوگ، مجاہد، قلندر اور ایسی ایسی محبوب ماؤں اور عورتوں کے کردار پیش کئے ہیں جو ہمارے کلچر اور ثقافتی قدروں کی اور عظمت اور شوکت کی ضامن ہیں۔ میری کندہ کاری نے، جس کی ٹکنیک مغربی ہے، مشرقی آرٹ میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے اور مغرب بھی اس کی دلکشی اور انفرادیت سے متاثر ہے۔

عبدالرحمان چغتائی

یوم پاکستان کی
تقریب پر قومی
اعزازات

دمس حعہ ڈی

حلیعہ

’ ںا دمس سىرار ں ىدر سوا ىعدا

خطیب

مردہ خانقاہ!

میلہ کی طرف

جوش

زندگی

سرمستی

میلہ چنن پیر

(چولستان)

ریت — — ریت — — ریت!
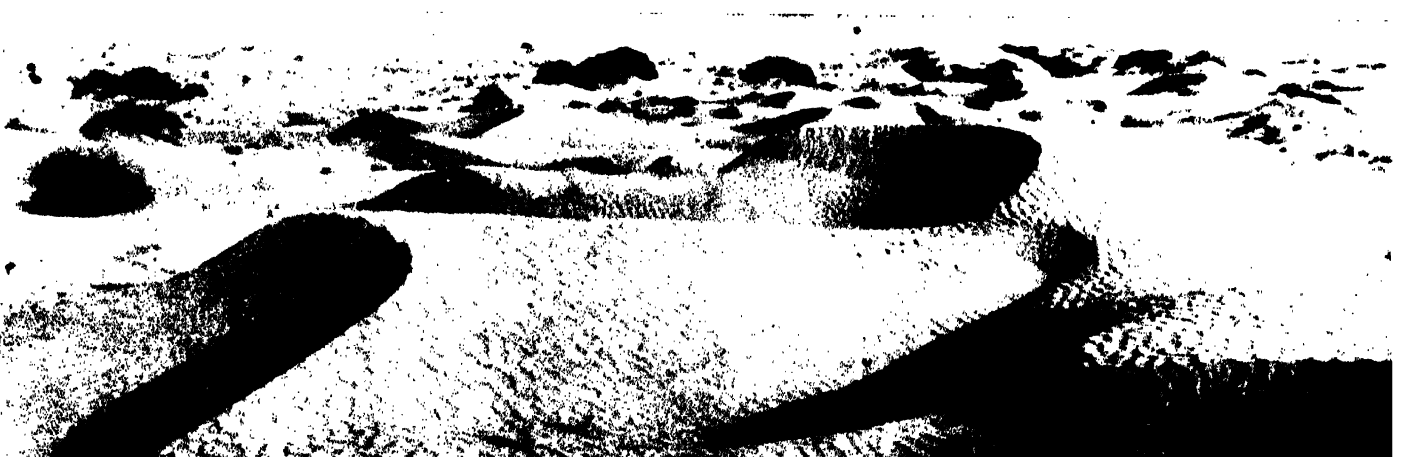
بازگشت

کچھ عرصہ ہوا مجھے مدت دراز کے بعد اپنی زادبوم راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا، یہ نظم اسی موقع کی یادگار ہے۔
(د-خ)

وہی نظارے، وہی کھیت ہرے!
یہ ہنستی دھوپ، یہ کھلی فضا
یہ روپ انوپ پہاڑوں کا
گم سم چپ چپ خاموش فسوں
اک خواب نما دنیائے سکوں
جس سمت نگاہیں اٹھ جائیں
وہی لو پھیلی، وہی نور گھلا
آنکھوں کے مدھر گہوارے میں
ہلکورے لیتا اجیارا
رہ رہ کے چمک پارہ پارہ
سب دھرتی ہو جیسے شیش محل
لہراتے طلسماتی جلوے
ہر جانب کوندے ہی کوندے!

۲

وہ کھیت سہانے سرسوں کے
یہ کامنی متوالی سرسوں
اس کے وہ کنوارے گل بوٹے
قدرت کی گشیدہ کاری کے
پرکار نمونے سحر بھرے
تا دور زمیں پر پھیلے ہوئے
کن ہاتھوں سے جانے کاڑھے ہوئے
دھرتی کی حریریں چادر پر
زرد وزر کرشمے پریوں کے
یہ پھیلے کھیت ہیں سرسوں کے
یا کسی طلسمی منتر سے
ہیں لاکھوں ہریل سوئے ہوئے!
وہ موجِ ہوا مستانہ اٹھی
ان سبز قباؤں کے سر پر
البیلی کلیاں جھوم اٹھیں
وہ کلغیاں پیلی پیلی سی

۳

اے ذوقِ نظر، اے دیدۂ دل!
اس دھوپ سی کوئی دھوپ نہیں
ان سایوں سا کوئی سایہ نہیں
اس روپ سا کوئی روپ نہیں
اس چھاؤں سی کوئی چھایا نہیں
وہ گرداگرد پہاڑوں کے
اک حلقہ بھورا بھورا سا
اور ان میں یہ وادی ہری بھری
انمول نگینہ جڑا ہوا
جادو کی انگوٹھی سرتاسر
افسونِ سلیماں جس کو کہیں
پنڈی، رومانوں کی بستی
اعجازِ بہاراں جس کو کہیں
ہر بول میں جس کے مستی ہے
اک سحرِ غزلخواں جس کو کہیں
ہر چیز نظر میں کھبتی ہوئی
ہر شے دل میں گھر کرتی ہوئی
ہر بات دلوں میں بستی ہوئی
سب دنیا ہنستی ہنستی ہوئی

۴

ہاں چھوڑ کے پھر میں دور کہیں
اس پیاری پیاری بستی کو
چلنے کو چلا جاؤں گا مگر
ان لوگوں کو کیسے بھولوں گا
جو اس بستی کے باسی ہیں
وہ پیار محبت کے پیکر
جو الفت کے متوالے ہیں
میں ان کی محبّت کے بدلے
اپنا دل چھوڑ کے جاؤں گا

۵

وہ ہونٹ ہی کیا جن ہونٹوں پر
الفت کا رسیلا گیت نہیں
وہ دل ہی کیا ہے جس دل میں
انسانوں سے گہری پریت نہیں
میں مہر و محبت کا پیامی
اک پیار کا تحفہ لیتا ہوں
اک پیار کا تحفہ دیتا ہوں

غزل

یوسف ظفر

ہم گرچہ دل وجان سے بیزار ہوئے ہیں
خوش ہیں کہ ترے غم کے سزاوار ہوئے ہیں

اُٹھے ہیں ترے در سے اگر صورتِ دیوار
رخصت بھی تو جوں سایۂ دیوار ہوئے ہیں

کیا کہیئے نظر آتی ہے کیوں خواب یہ دنیا
کیا جانیئے کس خواب سے بیدار ہوئے ہیں

آنکھوں میں ترے جلوے لئے پھرتے ہیں ہم لوگ
ہم لوگ کہ رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

کچھ دیکھ کے پیتے ہیں لہو اہلِ تمنّا
میخوار کسی بات پہ میخوار ہوئے ہیں

زنجیرِ حوادث کی ہے جھنکار بہر گام
کیا جُرم کیا تھا کہ گرفتار ہوئے ہیں

اظہارِ غمِ زیست کریں کیا کہ ظفر ہم
وہ غم ہیں کہ شرمندۂ اظہار ہوئے ہیں

غزل

حشمت فضلی

اب اس بات کا رونا کیا ہے اگلی سی وہ بات کہاں
تم بھی بدلے، ہم بھی بدلے، اب وہ دن وہ رات کہاں

جیسے بدلی بدلی سی ہیں پیار کی رت کی باتیں بھی
غم کی وہ گھنگھور گھٹائیں اشکوں کی برسات کہاں

ہم دکھیارے شام وسحر اشکوں کے ہار پروتے ہیں
ہم دکھیاروں کی قسمت میں آپکے سے دن رات کہاں

بنجاروں نے صحرا صحرا اپنے دام بچھائے ہیں
اب بولو آوارہ غزالو گذرینگے دن رات کہاں

وہ اور ہم سے پیار کریں گے یہ امید بھی جھوٹی ہے
یارو آخر کچھ تو سوچو اپنی یہ اوقات کہاں

فضلی میری غزلوں میں بھی غم کی باتیں ہیں لیکن
میرؔ کے رنگ میں غزلیں کہنا اپنے بس کی بات کہاں

★

غزل

شیدا گجراتی

پھر اُس نگاہ نے کی داستانِ دل تازہ
بکھر گیا مرے صبر و سکوں کا شیرازہ

مری نوا نے سنوارا ہے زندگی کا مزاج
مرا ہی خوں ہے رُخِ کائنات کا غازہ

نئی حیات کا دامن تہی ہی نغموں سے
سنے تو کون سنے دل کا نغمۂ تازہ

اُس انجمن میں خرد منفعل ہوئی کیا کیا
جنوں کا پھیل گیا دُور دُور آوازہ

میں نا امید نہیں تیری کم نگاہی سے
بکھر بکھر کے سنورتا ہی دل کا شیرازہ

بجز نگاہِ محبت کرے تو کون کرے
ہم اہلِ درد کی کیفیتوں کا اندازہ

بس اک نگاہِ کرم کا گناہگار ہے دل
تمام عمر بھگتنا پڑا ہے خمیازہ

★

غزل

آغا صادق

آئنے میں جلوہ فرما کون ہے؟
بےخودِ ذوقِ تماشا کون ہے؟

کون ہے محوِ تغافل ہائے ناز؟
اور سرگرمِ تقاضا کون ہے؟

کون ہے گرمِ سفر محمل نشین؟
دشت پیما آبلہ پا کون ہے؟

ساز کے پردوں میں ہے مستور کون؟
صورتِ نَے نالہ فرسا کون ہے؟

گوشہ گیرِ خلوتِ ناموس کون؟
آہ بازاروں میں رسوا کون ہے؟

بسترِ گل پر ہے محوِ خواب کون؟
میہمانِ خارِ صحرا کون ہے؟

حیرتِ آئینۂ تمکیں ہے کون؟
مثلِ جوہر ناشکیبا کون ہے؟

کون ہے مجلس فروزِ کبر و ناز؟
آستاں پر ناصیہ سا کون ہے؟

کون ہے گنجِ صدف کی آبرو؟
اضطرابِ موجِ دریا کون ہے؟

کون میخانے میں ہے ساغر بدست
تشنہ کامِ جامِ صہبا کون ہے؟

کون ہے عنوانِ مضمونِ نشاط
سُرخیِ خونِ تمنّا کون ہے؟

بےنیازی میں ہے صادق کون فرد؟
ناز برداری میں یکتا کون ہے!

غزل گو چنابی

بذلِ حق محمود

حکیم چنابی، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا ایک فارسی گو شاعر تھا۔ وہ گوجرانوالہ کے نزدیک ایک گاؤں گرٹھو کیلاس کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ حکیم درویش شاہ جہانی عہد میں مشہور طبیب تھا۔ چنانچہ اس نے "پران سُکھ" کے نام سے ہندی طب میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ حکیم چنابی موجودہ منٹگمری کے قریب کوٹ کمالیہ کے رئیس محبت خاں اور اس کے بیٹے سعادت خاں کھرل سے وابستہ تھا اور انہی کی فرمائش پر اس نے مغربی پاکستان کے مشہور رومان ہیر رانجھا کو "عشقیہ پنجاب" کے نام سے ۱۱۰۰ ہجری قمری میں فارسی مثنوی میں تصنیف کیا۔ عشقیہ پنجاب کا اب تک ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے مرحوم والد پروفیسر قاضی فضل حق (صدر شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج لاہور) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ "عشقیہ پنجاب" پر مرحوم کا ایک مقالہ میرے تکملہ کے ساتھ حال ہی میں پنجابی ادبی اکادمی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے[1]۔ اس مقالہ میں چونکہ والد مرحوم کی توجہ بیشتر مثنوی ہی پر مرکوز رہی تھی، اس لئے میں نے بھی "عشقیہ پنجاب" کی ان غزلوں کی طرف توجہ نہ کی جو مثنوی کی ہر فصل کے بعد بترتیب حروفِ تہجی درج ہیں اور ایک مکمل دیوان کا درجہ رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ غزلیں "عشقیہ پنجاب" کے منحصر بفرد قلمی نسخہ ہونے کی وجہ سے اب تک اربابِ دانش کے مطالعہ میں نہیں آسکیں، اس لئے یہاں انکا ذکر ضروری ہے۔ یہ غزلیں اس لئے بھی قابلِ مطالعہ ہیں کہ مغربی پاکستان کے ایک گمنام شاعر کے فکر کا نتیجہ ہیں جس کا نظریۂ شعر اپنے ہم عصر شعراء سے مختلف بلکہ منفرد ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ عہدِ عالمگیری غزل گوئی کے انحطاط کا زمانہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب خود بڑا عالم و فاضل شخص تھا اور شعر سے بھی کافی شغف رکھتا تھا گو وہ متین اور سنجیدہ طبع کا مالک تھا اور اس کی دلچسپیاں قرآن مجید کی کتابت، علمی و تاریخی کتابوں کے تراجم اور دینی درسگاہوں کے قیام تک محدود تھیں۔ وہ صرف نعت گوئی اور عارفانہ کلام کو پسند کرتا تھا اور مدح سرائی اور غزل گوئی کی مذمت کرتا تھا، چنانچہ اس نے دربار سے ملک الشعرا کا منصب ختم کر دیا تھا۔ اس اقدام کی وجہ سے بھی ایرانی اور مقامی غزل گوؤں اور قصیدہ سراؤں کا ہجوم جو کبھی مغلیہ دربار کی زینت تھا منتشر ہو گیا کچھ لوگ ایران لوٹ گئے، باقی ماندہ دور افتادہ علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے جہاں نہ تو تخت نشینی کی جنگ تھی اور نہ اورنگ زیب کے بیٹوں اور پوتوں کی یورشیں۔ ان دور افتادہ علاقوں کے منصب دار بھی شعرا کی قدر کرتے تھے اور شاعروں کو عاشقانہ مثنویاں اور رنگین غزلیں کہنے کے لئے پُرامن فضا میسر آجاتی تھی۔ البتہ قصیدہ گوؤں کا بُرا حال تھا۔ انہیں اپنے ممدوحین کو خوش رکھنے کے لئے ان کی بے جا تعریف و توصیف کرنی پڑتی تھی۔ ان کی حالتِ زار کا نقشہ چنابی نے اپنی ایک غزل میں پیش کیا ہے ؎

چہ لازم است ایں کہ بہر مدح و شکوہ در تفا کردن | نفاقی چوں بود در دل چہ سود از مرحبا گفتن
وزیر و شاہ را رازق ز جہلِ خویش دانستن | تہے ایں را دعا کردن گہے آں را ثنا کردن
ثنائے خانۂ ظالم برائے مطلبی کردن | چنابی کلۂ قصاب را دار الشفاء گفتن

ایک اور جگہ شعر کی قدر ناشناسی پر ماتم کیا ہے اور شعر سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ای شعر ترا کسادی از چیست | بی قدری و نامرادی از چیست
از نقل تو نقلِ انجمن بود! | شور و طرب تو در چمن بود
سودای ترا نہ رونق بازار! | کالائی ترا نہ کس خریدار[2]

---

[1] پنجابی قصے فارسی زبان میں، جلد اول، مرتبہ، ڈاکٹر محمد باقر ص ۱۰۸ و ص ۱۲۰ • [2] یہ اشعار ہمیں بے اختیار حالی کی نظم "شعر سے خطاب" کی یاد دلاتے ہیں۔ مدیر

چنانچہ شعر کی اس ناقدر شناسی کے عالم میں چنابی بھی غزل گوئی کو ایک شغل اضافی سمجھنے لگا تھا اور اپنے آپ کو شاعر کہنے میں خجلت محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی غزلوں میں اکثر کہا کرتا تھا:۔

زبسکہ عام شدہ اشتہار شعر اکنوں | خجل شوم چو بگوید کسی مرا مشہور
گمنام بہ چنابی کز بیم چشم خویش | گل رادرون غنچہ نہانی بہار خوش
دانی زچہ گمنام بود شعر چنابی | فریاد شہید است بآوازہ نسازد

اس کے برعکس وہ باپ کی طرح طبیب ہونے میں فخر محسوس کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ؎

اکنوں نشدہ است اعتبارم | دادہ نہ چنابی اشتہارم
ہم بودم مشتہر ازیں پیش | مینا پسر حکیم درویش
زخاک راہ او سرمہ برائے چشم خود سازا | حکیم قدر میدانم (من) ایں دارئے عالی را
بروش رفت چنابی وبگفتند شش خلق | خود طبیب است ولے بہر دواہی گردد

ایک اور سبب جو اس زمانہ میں شعر کی رسوائی کا باعث ہوا، یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں خود بعض شعراء متقدمین کی روش کو چھوڑ کر خیال بافی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں صائب تبریزی کے بعض نااہل مقلدین نے نہایت عامیانہ غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں۔ وہ صائب کی خیال بافی کے فن کو نہیں سمجھتے تھے اور بے رنگ تشبیہات و استعارات، دقیق اشارات و کنایات اور بے محل صنائع و بدائع کے استعمال کو مایۂ افتخار سمجھتے تھے اور شعر کو ظاہری حسن کا جامہ پہنا کر اسے فنی اعتبار سے ناپسندیدہ اور ناقابل فہم بنا دیتے تھے۔ عوام بھی شعر کے ظاہری حسن کو دیکھ کر کچھ ایسے کھو جاتے تھے کہ اس یاوہ گوئی کو معراج فن سمجھتے تھے۔ اپنی شعر نافہمی و ادب ناشناسی کے عیب کو چھپانے کے لئے ان شعروں کو نہایت بلند پایہ تصور کرتے تھے اور عامیانہ درجے کے شعراء کو استاد فن قرار دیتے تھے۔ چنابی ان گمراہ شعراء اور ان کے ممدوحین سے نہایت برگشتہ تھا۔ شروع شروع میں وہ اس قسم کے شعر کہہ کر دل بہلا لیتا تھا ؎

فردوسی و سعدی نہ تو گمنام چنابی | حالِ تو بایں خوبیٔ اشعار نسازد

سعدی و خسرو بطاق افتادہ صائب در بغل
خندہ می آید مرا بر شعر فہمی ہائے خلق

لیکن بعد میں جب اس نے محسوس کیا کہ عوام کے ان پسندیدہ شعراء کی گمراہی بڑھتی جا رہی ہے تو وہ فریاد کرنے لگا ؎

فریاد ازیں خیال بنداں | سنگ رہ فکر ملکہ سنداں
از واضح و صاف بی نصیب اند | محظوظی خلق را رقیب اند
ہیہات کہ قدر واضح و صاف | دانند کہ نیستند چو اسلاف

مگر صائب اور اس کے حامیوں نے ایک باقاعدہ محاذ قائم کر لیا اور ایرانی و مقامی شعراء کو آپس میں بھڑا دیا، چنانچہ چنابی کو اپنی "عشقیہ پنجاب" کے منثور مقدمہ میں صاف صاف لکھنا پڑا:۔

"اگر بیت لبریز معانی است بلے آں کہ از فلانی است یا از مصاحب فلانی است از تورانی است یا از ایرانی است عزت نیابد منعم حقیقی بر ہر ملکی مہربان است"

بلکہ اس نے نہایت برگشتگی و مایوسی کے عالم میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

طالب ز دمشق است و صائب ز صفاہاں
در من بود ایں عیب کہ از ملک چنابم

حکیم چنابی شعر میں اسلاف کی سنت اور متقدمین کی روش کا احترام کرتا تھا، چنانچہ اس نے کہا تھا:

نائب زِنیٔ نظامیم من — بر مسند تیر و جامیم من

وہ اسلاف سے برابری کا دعویٰ نہیں کرتا تھا، بلکہ چاہتا تھا کہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے بھی اپنے لئے ایک نئی روش تلاش کرے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ لکھا کہ:

کردم نہ تتبعِ نظامی — گشتم نہ شریک تیر و جامی
جستم نہ برابریٔ اسلاف — کیں محض فضولی است و اسراف
گویم چو سلف اگرچہ من صاف — دارم رہ لے قبیلے ز اسلاف

یہاں حکیم چنابی کی غزلیات سے ایک انتخاب پیش کیا جاتا ہے جو اس کی "عشقیہ پنجاب" کے منحصر بفرد نسخہ میں محفوظ ہونے کی وجہ سے اربابِ دانش کی دسترس سے باہر ہے اور جس میں اس کے مخصوص اندازِ بیان کے تمام پہلو نمایاں ہیں:

میکشائی گرہ از زلف، صبا می رقصد — چوں ز دستے بسوئے جیب گدا می رقصد
بانگِ خلخال تو چوں گرم کند ہنگامہ — دست بر دست زند فتنہ بلا می رقصد!
از حنائی کفِ دستِ تو رود خلق ز دست — گل ز ہم رنگیٔ آں گونہ حنا می رقصد
مفلسے بود چنابی، بہ نگاہے بہ رخت — ایں توانگر تو چہ پرسی کہ چرا می رقصد!

وداع از من چو آں دلدار سیم اندام میگردد — چہ دست انداختن در آتشی ہر گام می گردد
برخسار تو گیسو آشنا ز اعجاز حسنت شد — وگرنہ کفر کے ہم بزم با اسلام میگردد
اگر چشمت بریزد خونِ من جائے شکایت نیست — کہ مست از ریختن می کے مورد الزام میگردد
چنابی کشتۂ نازش نباشد مضطرب چنداں — کہ بسمل تیغ گر کند است، بے آرام میگردد

ہر دم بعیاشی جواں حالم چنیں، دل آں چناں — شیخم ولے ابیات خواں، حالم چنیں دل آں چناں!
در کف عصا و پشت خم، دنبالِ آں شیریں صنم — چوں ایں بود کے زیبد آں حالم چنیں دل آں چناں
ایں وقت ایں اشغالِ من، دردا کہ ہر ہمسالِ من — در حجرہ من در بوستاں حالم چنیں دل آں چناں
با من ندارد سر گراں سر دفترِ خیلِ بتاں — من پیر او خط جواں، حالم چنیں دل آں چناں

شرابے خوردہ، خو کردہ شرابم ساختی رفتی — عذار و قد بناز افروختی، افراختی رفتی
اگر جان و دلم بُردی بہ اندوہش چہ بسپردی — چہ سود ایں نقد را کاندوختی انداختی رفتی
بہ یوسف ہم نمی باشد تلافیٔ وصالِ تو — بسانِ خانۂ ویراں کنارم ساختی رفتی
پریشاں کردہ طرز توام جاناں کہ از گیسو — کشودی یک گرہ صد بر دلم انداختی رفتی
علم بہر سپاہی فتنہ افراشتی و بگذشتی — ز پیشِ چشم من یعنی کہ قد افراختی رفتی
بہ تیغ غمزہ ات نازم بسر دادن سرافرازم — نہ سر بازم ز دوش انداختی بنواختی رفتی
خرامش را بہ نقشِ پائے کردی صحیح موزوں — کلام فتنہ انگیز مقفی ساختی رفتی
نمیدانم کجا ہستی کہ ہشیاری و یا مستی — چنابی را ز بامِ صبر دل انداختی رفتی

چنابی نے اپنی غزلوں سے اپنے بعض پسندیدہ شعر خود بھی منتخب کئے ہیں اور غزلوں کے عنوان میں اس طرح کی عبارت دیکھی جاتی ہے کہ "انتخاب غزل خصوصاً بیت پنجم و ہفتم"۔ آخر میں چنابی کی غزلوں سے اسی کے منتخب کردہ ابیات درج کئے جاتے ہیں جن سے اس کے مذاقِ سخن کا اندازہ ہو سکے گا:

گر حیا در چشم باشد احتیاج سرمہ نیست — آب روی حسن کردہ خوبیٔ افعال ما
سنبل خجل از موی تو صد چشم گلشن سوی تو — اے در کمین روی تو در غنچہ ہا نظارہ ہا

مطلع نیست کس از حالت مستان الست؟ — ورنہ ایں بے خبراں را خبرے نیست کہ نیست

ہر سجدۂ من سجدۂ سہو است چنابی — زیں جرم کہ من ترک کنم یاد خدا را

شوی ایمن ز نفس تو اگر مرتاض میگردی — کہ از سگ آہوی تصویر ترسیدن نمی داند

از بہر شوخے آں بت شیریں گل اندامی — کہ یک نقطہ بود کافی نشان انتخابی را

نقل کے پہلو زند با اصل زخم سینہ ام — کے کند بی آبرو چاک گریبان مرا

نشۂ چشم تو از مرگ کند ترسانم — ہر عزیزی اے صنم از بہر خمار ست مرا

شعر پر سوزم پئے اصلاح کس محتاج نیست — حاجت دیگر نمک دارد کجا آب نمک

افسوس کہ یہاں حکیم چنابی کی غزلوں اور غزلیہ شعروں سے زیادہ انتخاب پیش نہیں کیا جا سکا۔ وہ خود بھی تو کہتا ہے کہ ؎

از بسر چمن ہا دل مردم نکشاید
زاں گونہ کہ از خواندن دیوان چنابی

"ماہ نو" میں اشاعت مضامین سے متعلق شرائط

۱۔ ماہ نو میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔
۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔
مضامین بھیجتے وقت "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں۔
۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(ادارہ)

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۹ء

گجراتی افسانہ:

اندھیرے کی اوٹ میں

فخر ماتری

یکایک چونک کر میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نئی نویلی دلہن کو اپنے خاوند کی اچانک موت کی خبر پا کر جو صدمہ ہوتا ہے ویسا ہی کچھ مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ ایسا ہوا ہے۔ شاید ہی کسی رات میں چین کی نیند سو سکا ہوں۔ یہ بھی نہیں کہ مجھے کوئی سونے نہیں دیتا۔ لیکن کسی کی ایک گونہ لگاوٹ نے میری زندگی میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ اگر تمہارے پاس دل کی سی کوئی شے ہوگی تو تم میرے ان الفاظ پر تعجب نہیں کروگے۔ مجھ میں ایک خوبی بھی ہے۔ من کی یافت کو اپنے پاس ہی رکھنے کی۔ یہاں پاس سے میری مراد پہلو کا سا قرب ہے اور تم یہی سمجھو اس کا مجھے تم سے تقاضہ بھی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ یہ عادت مجھی تک محدود ہے۔ اس بات پر زور دینے یا اس کو منوانے کا نہ مجھے کوئی شوق ہے نہ ضرورت۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ عادات و خصائل انسانوں ہی سے مخصوص ہوتے ہیں۔ حیوانات کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ ان کے قریب آنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ کوئی جانور میرا رفیق نہیں۔ اس سے میرا مدعا یہ نہیں کہ انسان حیوان نہیں ہو سکتا لیکن میرے تمام شناسا مجھے انسان ہی نظر آئے ہیں۔ کم از کم انسان کا رویہ انسانوں ہی کی طرح رہا ہے۔ نہ کسی نے مجھے دھتکارا نہ دھکا دیا نہ کوئی کاٹنے کے لئے دوڑا۔ اور اس سے مجھے بھی محسوس ہوا کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ سال بڑا سخت ہے۔ ایسا ہی سہی! میری روزمرہ زندگی کو تو وہ کوئی خاص متاثر نہ کر سکا۔ شاید وہ خود تھک گیا ہو لیکن اس نے مجھے تھکا ہوا نہ پایا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ مجھ پر کسی کی مہربانی ہے۔ تم کہوگے شاید وہ مہربان ذات خدا کی ہو! شاید، لیکن میں اس وقت بحث کرنے کے لئے تمہارے سامنے نہیں بیٹھوں گا۔ میری تو تمام شخصیت اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ زندگی کھڑی ہوئی ہے۔ خیالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ تم ہی بتاؤ میں ایسے میں کہاں بیٹھ سکوں گا؟

نہ جانے کیسے کسی تربیت کے بغیر ہی میں ایک رمز سے آشنا ہو گیا ہوں۔ دنیا میں جینا ہو تو جی کھول کر جیا ہو۔ چاہنے سے میرا مطلب ہے محبت کرنا، کسی کی پرستش کرنا۔ من کا رس کسی کو گھول کر پلانا، دل کا نذرانہ پیش کرنا۔ نوشگفتہ غنچوں کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ بلبل کی نغمہ سنجی میں مجھے زندگی کی وجد انگیز کیفیت ملتی ہے اور جاگے ہوئے احساس سے دل کی دھرتی جب ریگستان کی طرح تپ جائے تو کسی کا نرم و گداز ہاتھ بدن پر پھرنے سے جو سکون اور راحت ملتی ہے، اسی کی تمنا کرنا۔ باد بہاری کے نرم جھونکے جب گلشن گلشن کلیوں کو کھلنے کے راز سے آشنا کرتے پھریں اور پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دے تب کسی کی پروا کئے بغیر گریباں چاک کر کے شور مچانے والا ماحول بنانا۔ یہ کام قدرت کے بس کا نہیں، صرف انسان ہی یہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ صنفِ نازک کی نزاکت ہی اسے یہ سب کچھ کرنے کو ابھارتی ہے۔ میں تمہیں یہ بھی جتلا دوں کہ میں شادی شدہ ہوں۔

میری شادی کو آج پورے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ پہلے کسی لڑکی کے ساتھ محبت کر کے شادی رچانے کا خیال مجھے ٹھیک نہ لگا۔ مجھے اس میں خود غرضی بے حیائی اور عیاری کی بھرپور گندگی پڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی، ہمت کی شکست نظر آتی تھی، انسانیت کے دیوالیہ ہونے کا منظر نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ مجھے والدین کی غلامی پسند نہ تھی اسلئے میں نے ان لوگوں کا کہنا کبھی نہ مانا۔ بڑے لوگ یہی کہتے ہیں اسلئے یہ کرنا چاہئے جب میں نے یہ بات کی ہی نہیں تو پھر بڑے لوگوں سے کیا واسطہ؟ مجھے جو بھی ٹھیک لگا میں نے ہمیشہ وہی کیا۔ میں نے اپنے ہی خیالات اپنائے ہیں۔ میں خود اپنا خالق ہوں۔ جسم کا نہ سہی، اپنے ارادوں کا۔ اور یہ بات میرے اختیار سے باہر تھی۔ لیکن دوسری بہت سی باتیں میرے ہاتھ میں تھیں اور میں نے ان کو اپنے طور پر سنوارا ہے۔ کسی کو ان میں خرابی نظر آئے نہ آئے، اس کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں۔ لیکن مجھے اپنی ساری شخصیت بڑی خوبصورت نظر آئی ہے۔ میں نے کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اکثر لوگوں کو کتابیں ہی پڑھ ڈالتی ہیں۔ لیکن اپنے ساتھ میں نے یہ نہیں ہونے دیا۔ میں نے کتابوں کو پڑھا، کتابیں مجھے نہ پڑھ سکیں۔ اس دنیا میں میرا کوئی ہمدم نہیں، کوئی دوست نہیں۔ میرے خیالات، میرے احساسات ہی میرے ساتھی ہیں جنہیں سدا میں نے گلے سے لگائے رکھا۔ میری فہم نے میری رہبری کی ہے۔ آج تک میں نے کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ سگرٹ کا میں شائق رہا ہوں۔ میرے گاؤں کی بات چھوڑو۔ سارے ملک میں سگرٹ پینے کی دوڑ میں مجھے شکست دینے والا کوئی نظر نہ آیا۔ دھوئیں کے ان دائروں سے میری

زندگی کے رنگین خوشنما دل دچسپ ہیں اور ان بادلوں نے میری زندگی کو دھنک سے سجایا ہے۔ مجھے کسی مصور کے موقلم کا احسان مند نہ ہونا پڑا۔ مجھے ایک شخص ملا۔ وہ غریب تھا تو پھر کیا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ میں نے کہا "ایک کے ساتھ میری شادی کر دو"

اس نے ذرا بھی پس و پیش نہ کی اور اس طرح معصوم نینا میری بیوی بن گئی۔

وہ کیسی تھی، یہ میں تم سے نہ کہوں گا۔ میری بیوی کے بارے میں کچھ جاننے کی تمہیں ضرورت بھی کیا ہے؟ یہی سمجھ لو کہ وہ تمہاری بیوی کی طرح خوبصورت تھی اور اسی کی طرح باعصمت بھی۔ لیکن شاید میں تم سے کچھ بہتر ہی ہوں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود کو تم سے بہتر شوہر محسوس کرتا ہوں —— اس بات سے بھی میں تمہیں بغیر کسی جھجک کے آشنا کر دوں۔

جس طرح نینا میرے گھر آئی وہ دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ رات ہنس رہی تھی۔ گھر کی دیواروں سے شادمانی برس رہی تھی۔ میں خوش تھا۔ میرا دل باغ باغ تھا۔ پلنگ گلزار بنا ہوا تھا۔ یہ سب کیوں اتنے خوش تھے؟" اگر تم اتنا بھی نہ جانو تو پھر مجھے کچھ بھی نہیں کہنا۔ جنس کے بارے میں میرا مطالعہ صفر کے برابر ہے۔ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور کوئی شاعر میرا دوست نہیں۔ لیکن نینا میرے اوّلیں پیار، اوّلیں قرب اور اوّلیں بات سے کھل اٹھی تھی۔ اس کی بشاشت روز بروز افزوں ہوتی گئی۔ روشنی کی طرح بڑھتی گئی، جال بنتی گئی۔

نینا عورت ہے، بس یہ جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری ہے۔ اپنی چیز کے لئے اب کچھ کرنے کی مجھے کیوں خواہش نہ ہو؟ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے اس کے رویّے میں کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ کل وہ میری ٹوپی اور پتلون پہنے ہوئے آرام کرسی میں بیٹھی اخبار کا مطالعہ کرنے میں مشغول تھی۔ آج صبح سویرے اس نے ایک عجیب ضد اختیار کر لی تھی اور اس پر مُصر تھی۔ اُسے سینڈل پہننا پسند نہیں۔ محض کی سلیم شاہی پہننے کا اسے بے حد شوق ہے۔ میں نے گھر میں طرح طرح کی مخملیں سلیم شاہیوں کا انبار لگا دیا۔ جب عورت سلیم شاہی پہنتی ہے تو اس کے پاؤں ایک عجیب نغمہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ اور اگر میں تم سے یہ کہوں، تو مجھے بیوقوف نہ سمجھنا۔ نینا نے مجھ سے کہا "آج باہر جاؤ تو بوٹ کی بجائے میری سلیم شاہی پہن لینا" اس ضد کو تم دلچسپ سمجھو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تمہیں یہ نہ بتاؤں گا کہ آیا میں نے ایسا کیا یا نہیں۔ دوپہر کو وہ میرے بالوں کی لٹوں کے ساتھ اپنی زلفوں کو باندھنے لگی تھی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ اپنے سینے پر اس کا سر رکھ کر سونا میری عادت بن چکی ہے۔ اور ایسے میں نینا اگر ادھر اُدھر ہو جائے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اسی لئے مجھے چین سے سونا نصیب نہ ہو گا اور مجھے کئی بار یکایک جاگ اٹھنا پڑا ہے۔

آج کا دن جس قدر سہانا اور روح افزا محسوس ہوا ہے اس سے پیشتر کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ آج ہماری شادی کو پورے پانچ سال ہو گئے تھے۔ آج کی رات ہی نینا میرے گھر حنا رنگ قدم لئے آئی تھی۔ اور آج کی رات وہ میرے بستر پر حیا کی پتلی بنی بیٹھی تھی۔ آج کی رات ہی میرے کمرے میں سارے جہان کے پھولوں کی خوشبوؤں کا کارواں ڈیرا جمانے آیا تھا۔

گاؤں کے باغبانوں کے گھر گھر پہنچ پہنچ کر میں نے پھول پسند کئے تھے۔ پھول حسیناؤں کے لئے ہوتے ہیں، یہ میں مانتا ہوں۔ مردوں کا تو بس یہی کام ہے کہ وہ یہ پھول اکٹھے کریں اور ان تک پہنچا دیں۔ میں نے ان پھولوں کا ایک گلدستہ ایک ہوشیار مالی سے تیار کروایا۔ اپنی محبوبہ تک تحفہ پہنچانے کے لئے میں یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اس رات کی بات مجھ سے نہ پوچھو۔ میرے دل میں میلہ لگا ہوا تھا۔ ایسی خوشیوں سے بھرا ہوا جس کے لئے تمام دنیا ہاتھ پاؤں پھیلاتی رہی ہے۔!

یکایک میری آنکھ کھل گئی ..... نینا میرے پہلو میں نہ تھی۔ وہ میرے بستر پر ہی نہ تھی۔

چادر سلوٹوں سے پُر، تکیہ نیچے پڑا ہوا، مسلے ہوئے پھول فرش پر گرے ہوئے —— اور نینا میرے پہلو میں نہ تھی، بستر پر نہ تھی! بڑی محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد حاصل کیا ہوا وہ گلدستہ بھی نہ تھا!

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا، چراغ روشن کیا۔ نینا کمرے میں نہ تھی۔ لپک کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا اور مجھے محسوس ہوا جیسے دونوں کمرے کھلکھلا کر ہنس رہے ہوں اور میں تماشہ بنا ہوا ہوں۔

دوسرا کمرہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ نینا کے کپڑوں کا صندوق بیچ میں کھلا ہوا اور کچھ قیمتی پوشاکیں بکھری ہوئیں۔ کیا نینا مجھے سوتا چھوڑ کر کہیں چلی گئی؟ نئی پوشاک میں سج کر! کیا اس نے مجھ سے دھوکا کیا ہے؟ میں نے سن رکھا تھا کہ عورت میں بیشتر ایسی بے وفائی ہوتی ہے۔ تو کیا یہ بات میرے لئے حقیقت کا جامہ

پہن رہی ہے؟

لیکن میں نے اُسے کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ بات چیت کرتے نہیں دیکھا۔ میرے نوکروں اور آنے جانے والوں کے ساتھ بھی اس نے کبھی طویل گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں کو میرے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بزدل شخص ایسے میں بہت جلد عورت کے کردار پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ کیا میں بھی بزدل ہوتا جا رہا ہوں؟

میں نے کمرے کو مقفل کیا، ہاتھ میں لالٹین لے کر تن تنہا گھر سے چل پڑا۔ جو چیز گھر کی چار دیواری میں نہ ہو وہ باہر ہی ہوگی۔ نینا کو بھی باہر ہی کہیں ہونا چاہیئے اس کی تلاش میں میں نے رات گذارنے کا تہیہ کر لیا۔ کسی کو ساتھ لے کر اپنی ہنسی اُڑواؤں، اتنا کم فہم نہ سمجھنا۔

نینا کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ وہ کسی کے ہاں بیٹھنے نہیں گئی ہوگی۔ آدھی رات گئے میرا قرب چھوڑ کر کسی کے ہاں باتیں کرنے جانے — نینا اتنی بیوقوف تو نہیں۔ میں گاؤں کی دس پندرہ گلیاں چھان چکا۔ اف.... کتنے دنوں کے بعد میں اس طرح پھرنے کے لئے نکلا تھا۔ پینتیس سال کی عمر میں شاید دوسری ہی بار......

ان دس پندرہ گلیوں میں چار پانچ پولیس والوں کا سامنا ہوا۔ دس بارہ کتے ملے۔ سات اجنبیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن نینا کہیں دکھائی نہ دی۔ میں دل گرفتہ ہوگیا، تھکنے لگا۔ دل گرفتہ شخص بہت جلد تھک جاتا ہے۔ مجھے بھی تھکن محسوس ہونے لگی۔ ہونی ہی چاہیئے تھی۔ میں ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ گھڑیال نے تین بجائے۔ ٹن .... ٹن .... ٹن۔

پچھلی رات .... غضب ناک ... ڈراؤنی ..... یکایک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے کچھ یاد آ گیا۔ مغرب کی طرف ایک ویران سا گلشن ہے۔ وہاں پر ایک کھنڈر کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں شاید کھنڈر نہ بھی لگے۔ لیکن خراب حالت میں ضرور ہے۔ وہ ہر شام اس جگہ سیر کو جانے کے لئے مجھے آمادہ کرتی تھی۔ ضد کرتی تھی۔ پورے پانچ سال کی زندگی میں نینا نے اس کے علاوہ کسی اور بات کے لئے اتنی ضد نہیں کی۔ ہاں آج سویرے مخملی سلیم شاہی پہن کر باہر جانے اور رات سونے سے پیشتر اپنے بالوں میں وہ گلدستہ رکھ کر مجھے گھوڑا بنانے کے سوا اس نے کوئی ضد نہ کی تھی۔ کبھی کبھار میں اسے لے کر وہاں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کھنڈر کے ساتھ اسے اتنا والہانہ عشق کیوں تھا؟ ایسی محبت کیوں تھی؟ اور وہ پلک جھپکائے بنا کھنڈرات کی طرف دیکھ کر، دل ہی دل میں ، اس قدر کیوں خوش ہو جاتی تھی۔ لیکن ماضی کی یادگار عمارات سے اُس کی اس والہانہ عقیدت پر مجھے کیا اعتراض ہونا چاہیئے؟ اس کی کونسی خواہش پر میں نے دل میلا کیا ہے؟

میں ان کھنڈرات کی طرف دوڑنے لگا۔ گاؤں کی سرحد قریب آنے پر چند کتے بھونکنے لگے۔ جیسے میں نہ صرف تین گھنٹے ہی میں سارے شہر کو لوٹ کر بھاگنے لگا ہوں بلکہ میری ہی ایک عزیز شے یہاں لٹ گئی تھی۔ یہ بات میں کس طرح ان پاگل کتوں کو سمجھا سکوں گا؟

پچھلی رات اور گاؤں کی سرحد....... بھونکتے کتے اور دور دور تک ان کے بھونکنے کی گونج، دوئی صدائے بازگشت یہ سب باتیں تجربہ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں دوڑنے لگا۔ کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ پھر بھی دوڑتا ہی رہا۔ یکایک قندیل بجھ گئی۔ اندھیری رات کس قدر ڈراؤنی ہے۔ یہ جاننے میں دیر نہ لگی۔ دو ایک اُلوؤں کے جوڑے میری اس حالت پر ہنس دیئے.... گھو.... گھو.... گھو....

لیکن مجھے ڈر کی سی کوئی کیفیت چھو بھی نہ سکتی تھی۔ میں موم کا بنا ہوا آدمی نہیں۔ مٹی سے بنا ہوا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر کر میں نے پھر قندیل روشن کی اور تیز قدموں سے ان کھنڈرات کی طرف چل پڑا۔ شاید نینا یہاں آئی ہو۔ کیا اس کا آج کا رویہ عجیب نہ تھا؟

میں نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ میں نے قندیل کی لو کچھ اور بڑھائی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا! اب واپس چلا چلوں؟ شاید تالاب کے کنارے بیٹھی ہو۔ مگر جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اس کھنڈر میں بھی دیکھ لوں؟ شاید وہاں کہیں سو گئی ہو۔ آج نینا کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں قدم اٹھاتا ہوا کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ اسی اُجاڑ، سنسان ... اور ڈراؤنی عمارت میں قدم رکھے۔ میرے قدموں کی چاپ سے ہزاروں چمگادڑ پروں کو پھڑپھڑاتے، شور مچاتے اڑنے لگے۔

قندیل کو ذرا اور اونچا کر کے میں نے اس کی روشنی دور تک ڈالنے کی کوشش کی۔ اندر دو خوبصورت لیکن ٹوٹے پھوٹے کمرے تھے۔ مجھے کیوں وہاں نہ جانا چاہیئے؟ مگر یہاں تک آ ہی پہنچا ہوں تو پھر تلاش تو کرنی ہی چاہیئے۔

اور میں ایک کمرے کی دہلیز پر آکر کھڑا ہو گیا۔ یکایک کسی کی آواز کان کے پردے سے ٹکرائی "اوہو! آگئے نا؟ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔۔ ذرا اندر آؤ۔۔۔۔۔۔ بیوی کی تلاش میں آئے ہو؟"

قندیل یکایک بجھ گئی۔ میرا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور معلوم ہوا کہ انسان کا دل چاہنے کے علاوہ کانپ بھی سکتا ہے، سارا عالم گھومنے لگتا ہے اور آدمی بولنا چاہے تو بھی بول نہیں سکتا۔ نہ جانے کیوں ایسے میں میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کے ساتھ ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔

کچھ ڈراؤنے، پُر سکوت لمحات کو چیرتی ہوئی وہی آواز پھر آئی۔ کسی نے کہا "بس گھبرا گئے؟ تاریکی سے ڈر گئے؟ پینتیس سال سے میں اس گہرے اندھیرے میں جی رہا ہوں۔ مگر تمہاری طرح نہیں ڈرا۔"

میری مردانگی پر کوئی کاری ضرب لگاتا ہوا محسوس ہوا۔ میری ہمت اور شجاعت کی ہنسی اڑاتا ہوا معلوم ہوا۔ ایسے تازیانے میں نے کبھی برداشت نہیں کئے۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پھر وہی آواز آئی۔

"قندیل بجھ گئی؟ میں نے ہی اُسے بجھایا ہے، ڈرو نہیں۔ دیکھو یہ قندیل بھی کیسی عجیب چیز ہے؟ جب تک جلی جلی۔ کسی کی پھونک لگی اور ختم!۔۔۔ اندھیرا۔۔۔۔ ہر سمت اندھیرا۔۔۔۔!"

اور الفاظ کی گونج ختم ہوتے ہی ایک ڈراؤنا قہقہہ ہر طرف گونجنے لگا۔ کوئی اور بھی ساتھ ہی ساتھ ہنس رہا ہے۔ میں یہ خیال کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ دوسرا کمرا اس کمرے کے ساتھ ہم آہنگ تو نہیں ہو رہا یا پھر یہ اس قہقہہ کی صدائے بازگشت تھی؟

"اور دیکھئے صاحب۔ زندگی بھی کیسی چیز ہے۔ بالکل قندیل جیسی۔ خود ہی تیل بھرنا۔۔۔۔ کم یا زیادہ کرنا، ہوا کے جھونکے روشنی کو اڑا نہ لے جائیں، اس کا دھیان بھی رکھنا ورنہ ـــ اندھیرا۔۔۔۔ گھور اندھیرا۔۔۔۔ اور پھر بس گُم!۔۔۔۔ جو لوگ بے دھیان ہوں ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔"

یہ فلسفہ کون چھانٹ رہا تھا؟ میرے ساتھ کون مصروفِ گفتگو تھا؟ یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں جاگ اٹھی۔ لیکن کس سے پوچھوں؟ کس طرح پوچھوں؟

"کس فکر میں پڑ گئے؟ مجھ سے کیا چھپا ہے۔ یہ کون بول رہا ہے۔ یہی جاننا چاہتے ہو نا؟ تو پھر اندر آؤ۔ ڈرو نہیں۔ بہت عرصہ کسی سے گفتگو کرنے کا موقع نہ ملا تھا، سو آج ذرا زبان کو جنبش میں لانے کا خیال آگیا۔ آپ اچھے آدمی ہیں، یہ جانتا ہوں۔ اور اسی لئے آپ سے ہمکلام بھی ہوں۔"

میں اندر گیا۔ ڈر کا کہیں آس پاس سان گمان بھی نہ تھا۔ میں کچھ اور چوکنا ہو گیا۔ پھونک پھونک کر قدم دھرنے لگا۔

"خوب۔۔۔ بہت دنوں کے بعد یہاں کوئی آیا۔ کتنے عجیب لوگ ہیں! یہاں بھوت رہتا ہے ـــ یہ سمجھ کر کوئی اس کمرے میں تو کیا کھنڈر میں بھی رات کے وقت بھی نہیں بھٹکتا۔ تم لوگوں سے تو یہ چمگادڑ ہی بہتر ہیں کہ مزے سے دن رات یہاں شور مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن صاحب! ذرا سنبھل کر اندھیرے میں کہیں گر نہ جائیں۔ قندیل روشن کرنا ہو تو کر لیجئے ورنہ آپ کی مرضی۔ کیونکہ بعض اوقات روشنی میں جیسا ڈر لگتا ہے ویسا اندھیرے میں محسوس نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں نے اُسے یوں بجھا دیا تھا۔ گھبرائیے نہیں۔ آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں۔"

میں اس فرمان کا منتظر ہی تھا۔ میں نے جیب سے دیاسلائی نکال کر قندیل روشن کی۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ میں نے چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ یقیناً کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کیا یہ آواز کمرے کی اپنی تھی؟ کیا عمارت کے خستہ سنگ و خشت کو زبان مل گئی تھی؟

"دیاسلائی پاس ہی رکھے رہتے ہو کیا؟ سگرٹ کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ اُس طرف دیکھو۔ وہاں ایک خوبصورت الماری تھی۔ میرے مالک کی الماری! وہ نقش و نگار تھے کہ کیا کہوں۔ کشمیر سے اُن کے کسی دوست نے ان کی شادی پر سوغات کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ پوری الماری قیمتی سے قیمتی سگرٹوں کے ڈبوں سے بھری رہتی۔۔۔ اور میرا مالک بھی سگرٹ پر سگرٹ پھونکے جاتا تھا۔ اس قدر دھواں ہوتا کہ مجھے سانس رکتی محسوس ہوتی۔ کون جانے اُسے یہ لت کیسے پڑ گئی تھی۔ ایک بار تو ایسا بیمار ہوا کہ سب نے امید چھوڑ دی۔ مگر وہ بچ گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ "اب تم اچھے ہو گئے ہو لیکن سگرٹ کا زیادہ استعمال مضر ثابت ہوگا۔ بچ نہ سکو گے۔" لیکن وہ کب سنتا تھا۔ اس نے کہا: "میں مروں تو میری قبر پر سگرٹوں کا مینار بنوانا۔"۔۔۔ یہی الفاظ۔۔۔ ہاں یہی الفاظ میرے مالک نے کہے

تھے۔ یوں تو میری یادداشت بھی کافی اچھی ہے۔ یہاں اس کمرے میں جو کچھ بھی ہوا ہے۔ میں اسے نہیں بھلا سکا ہوں۔ آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھئے نا، اسی پتھر پر بیٹھ جائیے۔ آپ بیوی کی تلاش میں نکلے ہیں، میں یہ جانتا ہوں لیکن اب وہ نہیں ملے گی۔ واپس بھی نہیں آئے گی۔"

یہ الفاظ سن کر میں بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے کانوں پر الفاظ کے پھر حملے شروع ہو گئے۔

"آپ چونک اٹھے! اس میں مبہوت ہونے کی کیا بات ہے! بھاگی ہوئی عورت کب واپس آئی ہے .... لیکن یہ تو پاگل ہو گئی ہے۔ پاگلوں کا بھروسہ کیا؟ کیا اعتبار؟ ہو سکتا ہے کہ تالاب میں ڈوب جائے اور وہ تو جہاں تھی وہیں چلی گئی ہے اور اس بات کی مجھے بڑی خوشی ہے اور خوشی کیوں نہ ہو؟ اپنی نگاہوں کے سامنے ہونے والے واقعات کی یادوں ہی کے سہارے زندہ ہوں۔ یہ باہر کا حوض اور وہ خاص کمرہ، وہ باغیچہ، وہ منڈیر، سب ٹوٹ پھوٹ گئے، اجڑ گئے۔ بارش کی بوچھاڑ بھی محبت کی ماری ہی کی طرح ہوتی ہے۔ نہ گریں تو پھر کیا ہو، مرجھا نہ جائیں تو پھر... لیکن میں اس واقعہ کی راہ دیکھتے ہوئے آج تک قائم ہوں۔ مالک مجھے بہت عزیز رکھتا تھا۔ یہیں دن رات پڑا رہتا تھا۔ اِدھر کہیں باہر گیا اور اُدھر واپس ..... اوہ! کیا کیا کتابیں لاتے تھے۔ کتنی پنسلیں، کتنے کاغذ! اور اب جہاں آپ بیٹھے ہیں، اس پتھر کے آگے جھولتی کرسی پر، سامنے چھوٹی سی میز رکھ کر پڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور کچھ لکھتا رہتا۔ سگرٹ ایک کے بعد دوسرا پیتا جاتا۔ کیا وقت ہے اس کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔ کب سونا ہے، اس کی کیا پڑی تھی۔ سیالکوٹی قسم کا پلنگ تھا جو کشمیری چادر سے سجا ہوتا، پھر بھی اسی کرسی پر پڑے پڑے سو جاتا۔"

پھر ایک دن اس نے شادی کر لی۔ میں نے خیال کیا جب الماری میں اتنے سگرٹ ہیں تو پھر آدمی کتنے آئیں گے؟ مگر کوئی بھی نہ آیا۔ نہ مالک ہی نے کسی کو بلایا۔ وہ عورت کسی بڑے باپ کی بیٹی نہ تھی۔ اس سے پیشتر وہ یہاں کسی لڑکی کو نہیں لایا تھا۔ میں نے سوچا یہ دھوئیں کا راجہ اور کاغذ کے انبار کا عاشق عورت کیوں لے آیا؟ تیس سال کی پکی عمر کے باوجود؟ اس کو ایسی کونسی ضرورت پڑ گئی۔ وہ اسے کیا سمجھ سکے گا؟ لیکن ..... لیکن اس عورت کے آنے کے بعد مالک میں غضب کی تبدیلی ہوتی ہوئی محسوس کی میں نے۔"

"جب اس لڑکی نے کمرے میں قدم رکھا تھا تو میرے سینے پر لٹکتی ہوئی گھڑی نے رات کے نو بجائے تھے۔ کون جانے کیوں، لیکن اس کی یہ ٹن ٹن کی آواز مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی تھی۔ مالک اس لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے یہاں داخل ہوا۔ اس گوشے میں پلنگ ہوتا تھا۔ اس پر اسے بٹھا دیا۔ دھیرے سے کواڑ بند کئے اور پھر اس کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا 'تجھے دیکھے بغیر ہی شادی کی ہے۔ دوستوں نے مجھے نادان کہا ہے۔ وہ لوگ لڑکیوں کو شادی سے پہلے ہی بیوی بنا دینا چاہتے ہیں مجھے اس میں دوشیزگی اور انسانیت کی توہین محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے کسی کو بھی اپنی شادی پر نہیں بلایا۔ ناپاکی سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ گناہ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ لیکن مجھے کسی کتاب میں فرحت نہ ملی۔ اَن گنت سگرٹوں کے دھوئیں کے بادلوں سے ہوتا ہوا میں دھیان کی راہوں پر نکل گیا ہوں۔ عورت کی محبت اور زندگی پر میں نے سوچ بچار کیا ہے۔ ان سب کا حاصل تُو ہے۔ میرے لئے تو ہم مذہب، نصف بہتر یا سیج کی ساتھی نہیں۔ یہ تو میری توہین ہوگی۔ میرا نصف ہی تو کیوں ہو؟ تو خود میں ہی کیوں نہیں؟ بڑے بڑے فیلسوف لوگوں کو میں نے یہیں چکراتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔'"

"یہ کہہ کر مالک نے اس کا گھونگھٹ ہٹا دیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ مجھے اس قدر شرم آئی کہ کیا کہوں اور پھر اس نے اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ لیا کہ مجھے محسوس ہوا مجھے کوئی چیز آن لگی ہو۔

"وہ مالک کے سینے میں اپنا چہرہ چھپائے رہی۔ اس نے ایک ایسی گہری سانس لی جیسے ساری کائنات کا شکوہ گھول کر پی رہی ہے۔ مالک اس کے گیسوؤں پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔ کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ میں بھی متحیر ہو گیا۔ گھڑیال نے صبح کے ساڑھے سات بجائے لیکن دونوں یونہی کھڑے رہے۔ مالک کے سینے میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا اور اس کی سیاہ زلفوں پر مالک کا ہاتھ اسی طرح پھر رہا تھا۔

صبح نوکر نے چائے کے لئے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو دونوں جدا ہوئے۔ چائے آئی۔ مالک نے پیالی میں چائے ڈال کر خود اپنے ہاتھوں سے پلائی۔ خود بھی پی لیکن سگرٹ نہ سلگائی۔ سامنے چوکی پر کھلا ڈبا پڑا ہوا تھا۔ لیکن مالک نے اس میں سے سگرٹ نہ نکالی۔ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ مالک کی نظریں جیسے ان نیچی نگاہوں کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ دونوں یونہی بت کی طرح بیٹھے رہے۔ اور پھر عورت نے بھی نگاہیں اونچی

کیں اور رات گئے تک دونوں یونہی ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہیں پروئے بیٹھے رہے۔

دوسری صبح عورت ذرا خوش خوش دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی سی کوئی شے پھیلنے لگی تھی۔ اس میں کچھ اور چمک کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن اس تمام عرصہ مالک نے سگرٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔ کتاب کی ورق گردانی نہ کی۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالا اور ہدایت کر دی کہ اسکے بلائے بغیر کوئی نوکر نہ آئے۔

"اس شام مالک نے بنوں کو بلا بھیجا۔ بنوں کو آپ کیا جانیں۔ وہ اس گھر کا نوکر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھیل کر وہ بڑا ہوا تھا۔ بنوں سے کہا "یہ چٹھی لے اور یہ روپے پیسے۔ شہر کے تمام اخباروں میں جا اور سبھی میں اس خبر کو چھپوانے کا بندوبست کر۔ سارا کام ٹھیک طرح ہو جائے"۔

مالک نے اخباروں میں "ایک ہوشیار باغبان کی ضرورت ہے" کے عنوان سے اشتہار دیا تھا۔ پانچ سات دن تو یہاں بہت سے لوگ طرح طرح کے سارٹیفکیٹ لئے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک کو مالک نے منتخب کر لیا۔ اچھی قسم کے پھولوں کے پودے منگوائے گئے اور کئی دنوں کی محنت کے بعد۔ وہاں — اس جگہ جہاں سے آپ داخل ہوئے تھے، اس نے ایک بہت خوشنما باغیچہ تیار کر دیا۔

آپ نے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو کبھی محسوس کی ہے؟ جوبن کی خوشبو بھی کچھ ایسی ہی ہے جس سے انسان کے دل کی کلیاں کھلنے لگتی ہیں اور یہ کیفیت دیکھ کر مالک پر بھی جیسے کیف طاری ہو گیا۔ باہر کی باتوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن جب اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے وہ اندر آتا تو پھولوں کی مست کن خوشبو سے مجھ پر بھی کیف طاری ہونے لگتا۔ اور تھوڑی دیر مجھ میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ اے کاش! میں بھی اس عدم کے بدلے وجود کا حصہ ہوتا......

اور... اور.... اگر نصیب سے عورت ہوتا تو اس مست شخص کی آغوش میں اس کی بیوی کی طرح کھیلنے کا زریں موقع ملا ہوتا اور میری زندگی بھی خوش خوش گذرتی۔ سچ کہتا ہوں جس شخص کو صنف نازک سے رغبت نہیں وہ ہم سے بھی گیا گذرا آدمی ہے۔ کئی بار میں نے سوچا ہے کہ ایسے آدمی کو کسی زیر تعمیر عالیشان عمارت کی نیو میں مزدوروں سے ٹھونک ٹھونک کر گڑوا دینا چاہیئے۔ میں تخیل کے ذریعے سے جان لیتا کہ مالک اسکے ایک ایک بال میں پھول گوندھتا تھا اور وہ خود یہ سب کچھ کرنے دیتی تھی۔ اور پھر میری آنکھوں کے سامنے کیا کیا دلفریب منظر آتے، میں کیسے بیان کروں۔ اس پلنگ پر وہ عورت اس ادا سے بیٹھتی جیسے دنیا کی تمام خوش ذوقی اس کے پاس پنکھا جھلا رہی ہو اور میرا مالک اس کے بالوں میں پروئے ہوئے پھولوں کو سونگھتا رہتا.... چاند نکل کر غروب ہو جائے تب تک۔ سورج بچپن، جوانی اور بڑھاپا تینوں ادوار سے گذر جائے تب تک.....

مالک نے پورے پانچ سال تک اس پر محبت کی موسلا دھار بارش کی۔ اس کی بوچھاڑ بے پناہ تھی۔ اونچی پر غرور چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالنے والی بارش کا سامنا کون کرے۔ اس کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے۔ اس کا تمام جسم اس میں شرابور ہو گیا۔ اور اس نے بے حجابی اختیار کر لی۔ ایک داخلی عریانی۔ مجھے آج بھی وہ آخری دن اچھی طرح یاد ہے جس نے میری عالی شان دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا، میری نیو کو کمزور کر دیا اور مجھے زلزلہ سے آشنا کیا۔ پھر یکایک میں نے اپنا شباب کھو دیا۔ ایک میں نے ہی کیا، اس دھرتی کی تمام اشیاء نے.....

"ہاں، تو اب آپ یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ ہوا کیا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ لیجئے تاکہ یہ کہیں درہم برہم نہ ہو جائے اور آپ کو ایسا صدمہ پہنچے کہ خود کو سنبھال نہ سکیں۔

"باغبان نے چن چن کر پھول جمع کئے، پردیس سے آئے ہوئے عطریات چھڑکے گئے۔ پلنگ پر پھولوں کی سیج بچھائی گئی۔ سارا کمرہ خوشبو سے مہک اٹھا۔ ہر طرف خوشبوؤں کا رقص جاری تھا۔ ایسے میں اس عورت کی خوشبو!.... مالک کی امیدوں اور آرزوؤں کے اختتام کی خوشبو۔ کچھ نہ پوچھئے۔

"مالک کی شادی کی یہ پانچویں سالگرہ تھی۔ ہر پانچ سال کے بعد ایسا ایک من گھڑتا تہوار منانا ان کی دلی خواہش تھی۔ اس دن کی رات کا اب پیش خیمہ تھا۔ آسمان پر کتنے چاند نکلے تھے، اس کی مجھے خبر نہیں لیکن اندازے سے کہوں تو دنیا اور زندگی کی تمام روشنی جیسے میری چار دیواری کے اندر سما گئی تھی۔ باغبان ایک گلدستہ لے کر آیا جسے تازہ اور مست خوشبو والے پھولوں سے تیار کیا گیا تھا۔ مالک نے اس کے بالوں میں پُر کیف دل اور خمار آلود آنکھوں سے اٹکا دیا۔ آج دل کے تہوار کی بے مایہ رات آئی تھی؟

یکایک کوئی رو دیا..... آہ و بکا کے ساتھ۔ میرا دل کانپنے لگا۔ بھیانک کپکپی سی طاری تھی۔ بات گلے میں اٹک گئی تھی۔ بھیانک سناٹا اور خاموشی ہر طرف مسلط تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا، پچھلی رات کا سماں تھا۔ کیا میں اب تک ان دیواروں سے نغمہ سن رہا تھا؟ رونے کی آواز اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

دکان

حمید کاشمیری

یہ دکان ڈی سوزا[1] کے پاس اس وقت بھی تھی جب اکثر دکانوں پر "کرایہ کے لئے خالی ہے" کی تختیاں آویزاں رہتی تھیں۔ کیسے کیسے انقلاب آئے، لوگوں کے رہن سہن اور طور طریق میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈی سوزا کے ساتھ کے درزی ٹیلر ماسٹر بن گئے۔ چالیس پچاس روپے تنخواہ پر کام کرنے والے کاریگر دس دس کاریگروں پر انچارج مقرر ہو گئے اور ڈی سلوا، جو کبھی ڈی سوزا کے پاس بیٹھ کر کاج تُرپائیاں سیکھا کرتا تھا، اپنی الگ دکان کا مالک بن گیا اور چھ درزی ملازم رکھ لئے۔ آبادی ٹڈی دل کی طرح بڑھی۔ دکانیں سونا اگلنے لگیں، چھوٹے چھوٹے کیبن ہزاروں کے مال سے کھچا کھچ بھر گئے، بازاروں میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی، دکان کے پرانے ڈیزائن بدل گئے، تجارت نے نیا روپ دھار لیا، اور زمینیں اور دکانیں سونے کے مول بکنے لگیں۔ لیکن ڈی سوزا کی دکان کی پرانی وضع قائم رہی۔ وہی بغیر سائن بورڈ کی دکان، بغیر رنگ کے دروازے، دیواروں پر میلے کچیلے دھبے، چھت میں جا بجا مکڑی کے جالے پچھلی دیوار کے ساتھ ایک بوسیدہ سی الماری جس میں کسی مفلوک الحال بابو کی پتلون یا قمیص پڑی اس کی مفلسی کا رونا روتی رہتی۔ اور ڈی سوزا جس کی عینک کا نمبر روز بروز اس کا ساتھ چھوڑتا جاتا، اپنی پرانی وضع کی کھٹارا سی مشین پر جھکا کچھ نہ کچھ سیتا ہی رہتا۔ اس کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بنچ بچھی رہتی جس پر کبھی کبھار اس کا کوئی گاہک یا ملنے والا آ کر تھوڑی دیر سستا لیتا۔ پچھلے کمرے میں ڈی سوزا کی گٹھڑیوں بھری چارپائی بچھی رہتی لیکن بیچ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا۔ یہ دکان اچھے محل وقوع اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی، بڑے بڑے مالدار لوگوں نے اس کی قسمت بدلنے کا فیصلہ کیا، مگر کسی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اسی دکان کے برابر ایک جوہری کی دکان تھی جس کا کاروبار بہت ترقی پر تھا۔ اس جوہری کو تجارت میں شکست دینے کے لئے شہر کے اکثر جوہریوں نے ڈی سوزا کی دکان حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہزاروں روپے کی پیشکش بھی کی، لیکن ہزاروں روپے کر وہ جاتا کہاں؟ اسے سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ بھی چاہیئے تھا اور اسے معلوم تھا کہ ٹھکانہ حاصل کرنا کتنا دشوار ہے۔ اور یہ دکان تو اس کا بنا بنایا ٹھکانہ تھی جہاں وہ آزادی سے کام کر سکتا تھا اور اطمینان کی نیند سوتا تھا۔ اس نے دکان کو فروخت کرنے کے ارادے کو ذہن میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ جہاں اس نے زندگی کا طویل حصہ تن تنہا اس دکان میں گزار دیا ہے وہاں وہ آخری لمحے بھی یہیں پورے کرے گا اور اس کے مرنے کے بعد جس کا جی چاہے اس دکان کا وارث بن جائے، وہ بے تعلق ہو جائے گا۔ لیکن دکان سونے کی ایک اینٹ تھی جس پر گرد و غبار کے پردے چھائے ہوئے تھے اور سوائے ڈی سوزا کے ہر آدمی ان پردوں کو اتارنے کے لئے بے تاب تھا۔ لہٰذا لوگوں نے اس کے فیصلے کو بدلنے اور دکان کو خریدنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ آئے دن اس کے پاس ایک نہ ایک پارٹی آ جاتی، سبز باغ دکھاتی، دکان کی اہمیت، اپنی مجبوری اور روپے کی قوت کا اظہار کرتی۔ دلال اسے نت نئے چکر دیے جاتے، مگر وہ اپنے ارادے پر اٹل رہا اور اپنے پیروں کو پیسے کی چکناہٹ پر سے پھسلنے سے روکے رکھا۔

لیکن جمیل درزی کا مطالبہ سب سے ہی الگ تھا۔ اس نے نہ تو ڈی سوزا کو سبز باغ دکھائے اور نہ روپوں کی جھلک، البتہ اپنی غربت بیکاری اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی مجبوری کا اظہار ضرور کیا۔ پھر اس کی سیدھی سادی بات تھی کہ وہ لیڈیز کا کام کرتا ہے اور ڈی سوزا جینٹس کا۔ ایک طرف وہ مشین رکھ کے بیٹھ جائے اور اپنا لیڈیز کام شروع کر دے ــــ دکان ایک ہی معلوم ہو گی اور کام تو ہوتے رہیں گے۔

---

[1] اس افسانہ کے تمام کردار فرضی ہیں

کمیشن طے کرنے کا فیصلہ اس نے ڈی سوزا ہی پر چھوڑ دیا۔ ڈی سوزا کو اس کی بیکسی پر رحم آ گیا۔ اس نے جمیل کو ایک طرف مشین رکھنے کی اجازت دے دی۔ بلکہ دکان کا آدھا حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ اور کمیشن کی بجائے صرف دکان کا نصف کرایہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ ڈی سوزا کی اس مشفقانہ رضامندی سے جمیل کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور اس کا انگ انگ ڈی سوزا کو دعائیں دینے لگا۔

اگلے دن جمیل نے صبح سویرے آ کر دکان کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی۔ ڈی سوزا کی مشین کے تختے کے نیچے سے مدتوں کا پڑا ہوا کوڑا نکالا، دروازے اور دیواروں پر صاف کیں مکڑیوں کے جالے اتارے، ڈی سوزا کے سامنے والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بنچ کو اٹھا کے پچھلے کمرے میں رکھ دیا اور آمنے سامنے دونوں مشینیں رکھ کے بیٹھ گئے۔ اس دن صفائی کی وجہ سے ڈی سوزا کی دکان کی نئی شکل نکل آئی۔

ڈی سوزا کا کام بدستور چلتا رہا، وہی پرانے لگے بندھے گاہک قائم رہے آمدنی کم ہوئی نہ بڑھی لیکن جمیل کا کام چند ہی روز میں خوب چمک اٹھا اس نے جب ڈریسوں کے نئے نئے اور اعلیٰ قسم کے ڈیزائن بنا کر باہر لٹکائے، تو عورتوں نے بہت پسند کئے، چند ایک بک بھی گئے، چند ایک کے آسے اور آرڈر مل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جمیل بنکوں اور انگریزی فرموں میں کام کرنے والی کرسٹانیوں کا مقبول ترین درزی بن گیا۔ کام کی بہتات رہنے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ کام ایک آدمی کے بس کا نہیں رہا، حالانکہ وہ دن کے علاوہ رات کو بھی کئی رات تک کام کرتا رہتا۔ اسے دوسرے آدمی کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس نے کافی سوچ بچار اور ڈی سوزا سے مشورہ کرنے کے بعد ایک درزی بٹھا لیا۔ اس طرح اس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور مہینہ گزر جانے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ دوسرا درزی بٹھانے کے بعد اس کی آمدنی کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس کے کام کو اس قدر ترقی پر دیکھ کر کئی اور درزی، جن کا کاروبار اچھا نہیں تھا، جمیل سے حسد کرنے لگے اور اس کو اس دکان سے نکلوانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

اس دن جب ڈی سوزا ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تو فخرو درزی، ڈی سوزا کو دیکھ کر اندر ہوٹل میں داخل ہو گیا اور پھر جمیل کے خلاف زہر اگل کر ڈی سوزا کو پھسلانے کی کوشش کرنے لگا:

"جمیل تو تمہیں صرف دس روپے ماہانہ کرایہ دیتا ہے اور خود کم از کم پانچ سات سو کما لیتا ہے، تمہیں کیا فائدہ ہوا! مجھے بٹھاؤ، میں بھی لیڈیز کام کروں گا، تمہیں پچیس فیصدی کمیشن دوں گا۔ جتنا زیادہ کام ہوگا اتنا ہی تمہارا فائدہ"

فخرو بڑی بےتابی سے ڈی سوزا کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہم کو کمیشن نہیں کرایہ مانگتا ہے، ہم کو جمیل کمیشن دیتا تھا، ہم اپنی مرضی سے کرایہ لیا۔ تم ہم کو اس کے بارے میں اب جاستی بات مت بولو"

ڈی سوزا نے سر نہوڑائے چپکے سے اسے دو ٹوک جواب دے دیا۔ اور فخرو مایوس و نامراد ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ آخر رفتہ رفتہ اس کے ہم پیشہ لوگوں کو پورا الیقین ہو گیا کہ ڈی سوزا کسی حالت میں بھی جمیل کی مخالفت پر آمادہ نہیں ہوتا، لہٰذا انہوں نے جمیل کی مخالفت اور اس کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ اور اس طرح ڈی سوزا اور جمیل کے تعلقات کو مضبوط ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ آپس میں یوں گھل مل گئے جیسے صدیوں کے پرانے دوست ہوں جمیل جو اس دکان میں کام کرنے کے باوجود کچھ عرصہ فٹ پاتھ پر سوتا رہا، اب ڈی سوزا کے کہنے سے دکان کے پچھلے کمرے میں ڈی سوزا کے برابر چارپائی بچھالی تھی، اور اس طرح اس دکان کی یکتائی بالکل ختم ہو گئی۔ پہلے ڈی سوزا دکان میں ایک تھا اور اس کے لئے ہوٹل سے ایک کھانا آتا تھا۔ ایک چائے اور ایک سگریٹ؛ اب وہ دکان میں دو تھے۔ اور ہر چیز دو سے بدل گئی تھی۔ اب ہوٹل سے دو کھانے آنے لگے، دو چائے اور سگریٹیں، اندر کے کمرے میں دو چارپائیاں بچھ گئیں اور دونوں میں جوئے میں جیتے ہوئے بیلوں کا سا توازن پایا جانے لگا......

جمیل کو خاصی معقول آمدنی ہونے لگی۔ اس نے لوگوں کے قرض چکا دیئے۔ گرانی ہونے کے سبب [illegible] سے بےکھٹکے ہو کر بہت اچھے طریقے سے گزر بسر کرنے لگا۔ اب اس کی صرف ایک بڑی خواہش رہ گئی تھی کہ اسے کہیں کوئی ٹھکانے کا مکان مل جائے اور اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس بلوا لے۔ بیوی بچوں کی مستقل جدائی اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی اس تکلیف کو رفع کرنے کے لئے اس نے بہت بھاگ دوڑ کی، کئی دلالوں کے چکر میں آیا، انہیں پیسے کھلائے مگر مکان حاصل کرنے میں اسے

کامیابی نہ ہو سکی۔ اگر کہیں کوئی امید پیدا بھی ہوئی تو روپیہ کا مطالبہ اس کی بساط سے باہر ہوا اور پھر اسے پچھلے کمرے کا خیال ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا ڈی سوزا کتنا بدنصیب ہے، کتنے بڑے محل مکان کا مالک ہے جس کا پچھلا کمرہ ایک پورے فلیٹ کا کام دے سکتا ہے لیکن اس نے کبھی اس سے کوئی کام نہیں لیا اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ تن تنہا بغیر بیوی بچوں کے اس میں گذار دیا جبکہ لوگ اپنے سارے کنبے سمیت فٹ پاتھ پر بھی سوتے ہیں۔ پھر وہ کتنی دیر تک اسی انداز میں سوچتا رہا۔

اس دن جمیل کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ جب تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ دکان پر بہت بھیڑ لگی ہوئی ہے اور بھیڑ کے اگلے حصے میں بچوں کا ایک بہت بڑا گروہ بلند آواز میں دکان کی طرف منہ کر کے چیخ رہا ہے:

"پاگل ہے، چریا ہے"

"عینک والا چریا ہے"

"کالا کلوٹا چریا ہے" پھر وہ ہاتھ لہرا لہرا کے بیک آواز چیخنے لگے "چریا.... چریا۔ چریا۔ چریا" اور چریا چریا کی رٹ سے جیسے آسمان گونج اٹھا۔ جمیل تھوڑی دیر کھڑا دیکھتا رہا، پھر جلدی جلدی ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ دیکھا تو ڈی سوزا کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی، اس کے ماتھے پر پسینے کے بہت سارے قطرے پھوٹ آئے تھے اور وہ بڑی انکساری سے بچوں کو چپ کرانے میں مصروف تھا لیکن وہ جتنی ہی التجا کرتا بچے اتنا ہی چڑ جاتے اور زور و شور سے "چریا۔ چریا" پکارنے لگتے۔ جمیل نے بیچ میں مداخلت کرنے کی کوشش کی اور کچھ گالی گلوچ سے بچوں کو چپ کرانے لگا۔ بچے تاؤ کھا گئے اور جمیل کو گھیر لیا۔ اور "ہائے ہائے، مونچھل درزی ہائے ہائے" چلانے لگے۔ جمیل کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ اپنی جان اور مونچھوں کے تحفظ کی خاطر جست بھر کے دکان میں چلا گیا اور جلدی سے کواڑ بند کر لئے۔ بچے دیر تک بند کواڑوں کے باہر "چریا چریا" کی رٹ لگاتے رہے۔

"کیا بات ہو گئی تھی؟" جمیل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم نہیں جانتا" ڈی سوزا نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "ایسا بتر و تر د آیا اور خالی پیلی بوم مارنے لگا"

"تعجب ہے" جمیل نے حیرانی سے کہا۔ اور اس دن کافی دیر تک وہ دونوں بند دکان میں بیٹھے بچوں کی بیہودگی کے اسباب سوچتے رہے۔

اگلے دن جب صبح دکان کھلی تو ڈی سوزا بمشکل کل کے واقعہ کو تھوڑی دیر کے لئے بھلا سکا تھا اور ابھی مشین صاف کر کے کام پر بیٹھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اچانک بچوں کا ایک ہجوم پھر آن دھمکا اور گذشتہ دن کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر ڈی سوزا کے خلاف نعرے لگانے لگا:

"پاگل ہے، چریا ہے"

"عینک والا چریا ہے"

"کالا کلوٹا چریا ہے"

"چریا، چریا۔ چریا۔ چریا"

ڈی سوزا نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور دل ہی دل فریاد کرتے ہوئے بچوں کی طرح منہ بنایا اور مدد کے لئے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ جمیل اس وقت ناشتہ کرنے گیا ہوا تھا اور اس کا درزی ابھی تک آیا ہی نہیں تھا۔ باہر سے کسی آدمی نے بچوں کو اس حرکت سے منع نہیں کیا، بلکہ لحظہ بہ لحظہ تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ ڈی سوزا پر پہلے تو جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا لیکن پھر دل مضبوط کر کے اٹھا اور دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ وہ دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ باہر سے ایک انڈا کسی نے ڈی سوزا کی طرف پھینکا جو اس کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا اندر الماری میں جا لگا، دوسرا ٹماٹر سے ڈی سوزا کے منہ پر لگا، تیسرا سینے میں اور چوتھا.... چوتھا نجانے کہاں لگتا مگر ڈی سوزا نے جلدی سے کواڑ بند کر دیئے اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ کچھ دیر دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر پچھلے کمرے میں جا کے منہ صاف کیا اور کتنی دیر تک پاگلوں کی طرح آئینہ دیکھتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار اس نے اپنی انگلیوں کو کاٹا، یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ ایک

طویل اور بھیانک خواب نہ دیکھ رہا ہو۔ لیکن اسے اپنی بیداری کا یقین کر کے اور زیادہ پریشانی ہونے لگی۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں شام تک جار ملانے بھی نہیں لگا سکا اور اس کے چھوٹے موٹے سب کام جمیل خود کرتا رہا۔

اگلے دن جب پھر دکان کھلی تو اس وقت دونوں دن کے واقعات ڈی سوزا کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولے تھے اور وہ لگاتار ایک کانٹے کی سی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ اسے دہشت سی ہو رہی تھی، وہ کتنی دفعہ مشین پر بیٹھا اور پھر بدک کے اٹھ گیا۔ کام کرنے کو اس کا قطعی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے آدم خور بونے کہیں سے نمودار ہوں گے، اس کی لاش کو گھسیٹ کے بازار میں پھینک دیں گے اور وہ اپنی عزت کی بوٹیاں ہوتے دیکھ کر منہ سے ایک لفظ نہ کہہ سکے گا۔ لیکن جمیل کے کہنے سمجھانے سے وہ پھر کام پر بیٹھ گیا مگر اس کے بیٹھتے ہی آدم خور بونے نمودار ہو گئے اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"پاگل ہے۔ چریا ہے۔"

"عینک والا چریا ہے۔"

"کالا کلوٹا چریا ہے۔" اور پھر چریا۔ چریا کا ورد تیزی سے شروع ہو گیا اور سارے بازار میں آوازیں گونجنے لگیں۔ ڈی سوزا کے ہاتھ پیر جہاں تھے وہیں رہ گئے اور وہ کسی بت کی طرح اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا لیکن جمیل غصے میں بھڑک اٹھا اور تیزی کے ساتھ باہر نکل کر دونوں ہاتھوں سے ڈھکیل ڈھکیل کر بچوں کو دور کرنے لگا۔ بچے زیادہ مشتعل ہو گئے اور جمیل کو اپنے گھیرے میں لے کر نعروں کا رخ جمیل کی طرف پھیر دیا۔

"مونچھ والا بھی چریا ہے۔"

"کانا درزی ہائے ہائے" (کیونکہ جمیل کی ایک آنکھ قدرے چھوٹی تھی) جمیل کو جان بچانی مشکل ہو گئی۔ وہ دوڑ کے مکان میں گھس گیا اور اس سے پہلے کہ انڈوں کی برسات شروع ہوتی، اس نے دروازے بند کر دئے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈی سوزا؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں ڈی سوزا سے پوچھا، لیکن ڈی سوزا کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا، اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی تھا اور ہونٹ جیسے چپکے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم ان میں سے کسی کو جانتے ہو؟" جمیل نے دوسرا سوال کیا۔ اور ڈی سوزا کے مجسمے نے گردن کو صرف نفی میں ہلا دیا۔ جمیل نے اس وقت ڈی سوزا کو زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ دروازے بند کئے بیٹھا رہا اور ہنگامہ تھمنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن اس کے بعد یہ ہنگامہ تھما نہیں بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ ایک لامتناہی سلسلے کی طرح بچوں کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ دکان کھلنے کے فوراً ہی بعد آجاتے اور ڈی سوزا کی طرف منہ کر کے تالیوں کی آواز پر "چریا ہے، چریا ہے" کے نعرے لگانے شروع کر دیتے۔ اور تماشہ دیکھنے والوں کا ایک بڑا مجمع لگ جاتا۔ ڈی سوزا بعض اوقات بت بنا بیٹھا رہتا اور مظاہرین کی طرف ایک آنکھ بھی اٹھا کر نہ دیکھتا، لیکن اگر نوبت انڈے پھینکنے تک آجاتی تو وہ چپکے سے اٹھ کے پچھلے کمرے میں چلا جاتا اور پھر ادھر ہی سے کہیں باہر نکل جاتا۔ جمیل بھی اپنے بچاؤ کی خاطر اب مداخلت نہ کرتا اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتا۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک یونہی جاری رہا اور آخر ایک دن ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

وہ رات عجیب تھی۔ جمیل تنہا پچھلے کمرے میں بتی بجھائے لیٹا تھا۔ دن بھر کی شدید تھکن کے باوجود نیند اس سے کوسوں دور تھی، اسی لئے وہ سونے کی خود بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کمرے پر بلا کی وحشت اور تاریکی طاری تھی، لیکن جمیل وحشت اور تاریکی سے بے خبر کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کہیں فضا میں معلق ہو۔ خیالات یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں داخل ہو رہے تھے اور وہ سر میں شدید درد محسوس کرنے لگا تھا۔ اچانک پچھلے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور کمرے کا سناٹا ٹوٹا۔ جمیل چونک سا گیا اور کان باہر کی طرف لگا دیئے "کھٹ کھٹ کھٹ" دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون؟" جمیل نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں" باہر سے ویسی ہی مدھم سی آواز ابھری۔ جمیل نے لیٹے لیٹے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر دھیرے سے اٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص باہر اندھیرے میں کھڑا تھا جس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"کیا ہے شیرو؟" جمیل نے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی پوچھا۔

"وہ ماسٹر تم دن میں گر ایک لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ہم اسی لئے تم کو اس وخت تکلیف دیا۔" اندھیرے میں کھڑا ہوا آدمی بڑے کاروباری طریقے سے بولا "اب تو وہ ڈی سو جا جا چکا ہے، گو ابھی پہنچ چکا ہوگا، اب تو ہمارا حساب کر دو۔ تم نے جو رقم دیا تھا وہ ہم نے سب بچہ لوگ کا حساب چکا لیا ہے۔"

"صبح اپنے سب پیسے لے جانا شیرو" جمیل نے بمشکل گلے رندھی ہوئی آواز نکالی اور پھر جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور یوں کواڑوں سے چمٹ گیا جیسے اسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ کمرے کی تاریک فضا میں دبی دبی سسکیاں پھیل گئیں۔

"لہو ترنگ" ——— بقیہ صفحہ ۲۵

اور پھر:

مدتوں کے بعد بدلی پھر تری تقدیر دیکھ
اپنے دامن پر ابھرتی اک نئی تصویر دیکھ
دو فسردہ۔ مردہ و آزادہ صدیوں کا جواب
لے وہ ابھرا کاروانِ نو کا تازہ آفتاب
سامنے جو زندگی افروز منظر آج ہے
یہ ہمارے عزمِ نو کی اولیں معراج ہے

اور اب اس انقلاب اولیں کا دامن ہمارے موجودہ انقلاب سے مل کر پھر ہی حیات افروز منظر پیش کر رہا ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارا عزمِ نو بے کار نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے نژادِ نو کی صلاحیتیں اپنے اندر ایک غیر فانی امید کی نوید لئے ہوئے ہیں۔

ایک برتر روشنی کے انجم و خورشید تم
ایک بہتر زندگی کی اولیں امید تم

اور یہ آ انتہا شاعر کے کلام کی طرح ان تمام خوابوں کی انتہا بھی ہے جو ہمارے سونیا مندوں کی گرم تاب تخیل نے پاکستان سے وابستہ کر رکھے ہیں۔ یہاں شاعر کی فکر تمام قوم کی فکر بن جاتی ہے۔ اور ستارہ و ہلال میں کتنے ہی درخشاں آفتابوں کی تجلیات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

اندھیرے کی اوٹ میں ——— بقیہ صفحہ ۴۵

میرے اعضا ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ محبت کی مستی بھری کہانی میرے دل میں مچل رہی تھی۔ کیسا آدمی! ... اور کیسی عورت! ... اور عشق! خالق نے کس مٹی سے بنا کر انہیں یہاں بھیجا ہے اور میں! میری بیوی!

میں نے پھونک مار کے قندیل گل کر دی۔ اس روشنی کے سہارے میں اپنی بیوی کو ڈھونڈنے چلا تھا؟ ان نظروں سے میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟ کیا میرے دل کو اس سے زیادہ روشنی کی ضرورت نہ تھی؟ من کی روشنی جس چیز کو دکھاتی ہے اسے دوسری چیز کس طرح دکھا سکتی ہے؟

میں نے سوچا شاید اب نینا نہیں ملے گی۔ اس چاند یا اس سورج کی روشنی بھی اسے تلاش نہ کر سکے تو پھر میں کیا ہوں؟ مجھے اپنے من کا چراغ جلانا ہوگا اور اس کی روشنی نینا کو ڈھونڈ لائے گی۔

اور اس دہلیز کو جب میں عبور کر گیا تو بھی دیواروں کی ہچکیاں ختم نہ ہوئی تھیں ... لیکن اب میں کہاں جاؤں؟ ... کیا مجھے کوئی یہ بتائے گا؟

آثارِ سلہٹ :

حضرت شاہ جلالؒ

(سلہٹ)

سید مرتضیٰ علی

سلہٹ پاکستان کی شمال مغربی سرحد ہے۔ سارا علاقہ شاداب، ہرا بھرا و تقدرتی مناظر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ صاف ستھرے قریئے، قصبے، دھان کے لہلہاتے کھیت اور سلہٹ کی مشہورِ زمانہ نارنگیوں کے باغات کا مہکتا گہوارہ ــ بے شمار اچھی اچھی سڑکوں، ریلوں اور آبی راستوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ مغربی رخ کو چھوڑ کر ننھی ننھی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دور دور تک حلقہ کئے ہوئے۔ شمال، مشرق اور جنوب میں ہندوستان کا علاقہ ہے۔ اوپر کی طرف کھاسی اور جینتیا کی پہاڑیاں ہیں۔ جانبِ راست کچھار ہے اور نچلی طرف تریپورہ کی ریاست ہے۔ جانب چپ اور نشیب میں بیشمار دلدلیں اور جھیلیں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں یہاں کے لوگ "ھورز" کہتے ہیں جب برسات زوروں پر ہوتی ہے تو یہ لبریز ہو جاتی ہیں اور ایک چھوٹے سے سمندر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ خشک موسم میں ان کے پانیوں میں طرح طرح کی مچھلیاں پیدا ہو جاتی ہیں برسات میں مطلع اکثر ابر آلود رہتا ہے۔ ہزاروں پُرشور ندی نالے تیز رفتاری کے ساتھ پہاڑیوں سے اتر کر نشیبی وادیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ بس یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سارا علاقہ سمندر ہی سمندر ہے اور اس کے بیچ بیچ میں جا بجا ٹاپو اُبھر آئے ہیں جن پر گاؤں آباد ہیں خزاں کے موسم میں پانی خشک ہونے لگتا ہے ابر چھٹ جاتا ہے تو ان نشیبوں میں دھان کے کھیتوں کا پھیلاؤ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ فرازِ کوہ پر سنہری سنہری نارنگیوں کے مست کن باغات کا سلسلہ دور تک الگ نظر آتا ہے۔ چائے کے باغات کی اپنی ہی بہار ہے۔ چار چار پانچ پانچ فٹ بلند باڑھیں کٹی ہوئی اور یہ قطاریں تا حدِ نظر آنکھوں کو عجب سرور بخشتی ہیں ننھے ننھے جنگل اور درختوں کے جھنڈ پہاڑی ڈھلانوں پر اُگے ہوئے اور تختہ بندی کی وضع میں چائے کے پودوں کا سیلاب سا منڈلاتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہرا ہرا سمندر ہے جو ہچکولے کھا رہا ہے۔ مرد اور عورتیں اپنے مقامی بھڑکیلے اور رنگا رنگ ملبوسات میں ایک عجیب نظارہ پیش کر کے آنکھوں کو آسودہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ دن بھر ان باغوں میں محنت مزدوری کے کام کرتے ہیں۔ مگر دور سے صرف ان کے سر اور شانے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اپنی پھرتیلی انگلیوں سے چائے کی نرم و نازک پتیاں چننے میں جھکے رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ سحر آگیں آغوشِ فطرت جس میں حضرت شاہ جلالؒ نے ۱۴ ویں صدی (عیسوی) کی ابتدا میں سرزمینِ سلہٹ پر قدم رنجہ فرمایا وہ یہاں عرب جیسے دور ملک سے محض دعوتِ اسلام عام کرنے کے لئے پہنچے اور یہاں کے نواح میں دین کا جو بھی چرچا پھیلا اس میں حضرتؒ کے فیوض و برکات کو بڑا دخل ہے۔ حضرت شاہ جلال یمنیؒ نسباً قریشی تھے اور یمن کے ایک بزرگ "محمد" کے فرزند تھے۔ شاہ جلال کی درگاہ میں ایک کتبہ محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے ایک مقام قونیہ کے رہنے والے تھے۔ مؤرخ بلوچمین کے نزدیک یہ جگہ یمن کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ حضرتؒ چھوٹے سے تھے کہ والدین کے سائے سے محروم ہو گئے اور ان کی تربیت کا بار ان کے ماموں سید احمد کبیر نے اپنے ذمہ لیا۔ وہ حضرت جلال سرخ بخاری کے فرزند تھے۔ شاہ جلال کے ماموں انہیں مکہ مکرمہ لے گئے جہاں وہ دینی اور روحانی علوم و معارف سے بہرہ ور ہوئے ان کے فیوضِ روحانی حاصل کرنے کے بعد ماموں کی ہدایت پر انہوں نے عزمِ ہند کیا تاکہ یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ عزمِ ہندوستان کے لئے ان کے ماموں نے اپنے آستانے کی خاک بھی ان کے سپرد کی اور بتایا کہ تم جس سرزمین سے گزرتے جاؤ اس زمین کو دیکھو۔ اس کے رنگ، روپ۔ ذائقہ کو پرکھو اور جس مقام کی زمین میں یہ اوصاف تم پاؤ بس وہیں اقامت اختیار کر لو۔ چنانچہ شاہ جلال نے یہ برکتوں والی مشتِ خاک اپنے ایک طلبیں وہمراز کو سپرد کر دی جو شاہ چشنی کہلاتے ہیں۔

وہ حضرت کے حکم کے مطابق راستوں کی خاک کو چکھتے جاتے تھے۔ بہرکیف، یہ لوگ دہلی پہنچے اور وہاں حضرت نظام الدین اولیا سے ملاقی ہوئے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے انہیں نیلے کبوتروں کے دو جوڑے بطور تبرک عنایت کئے۔ یہ بزرگ اپنے ساتھ ان کبوتروں کو سلہٹ لے کر آئے۔ ان کبوتروں کی نسل ابتک چلی آتی ہے اور وہ بیشمار ہو گئے ہیں۔ کوئی شخص بوجہ احترامِ درگاہ ان کبوتروں کو گزند نہیں پہنچاتا۔ اس کے بعد حضرت تروینی کے مقام پر پہنچے جو سنگاؤں کے پاس واقع ہے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک مقامی باشندے، برہان الدین سے ہوئی۔ یہ شہر سلہٹ کے باشندہ تھے اور "تلتی کور محلہ" کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں فرزند تولد ہونے کی خوشی میں ایک گائے ذبح کی تھی۔ اس کی خبر راجہ گوڑ گووندا کو پہنچی۔ اس نے غصہ میں آکر اس بچہ کو مروا ڈالا اور میاں برہان الدین کا دایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا! برہان الدین میاں نے اس کی فریاد مسلمان حاکم بنگالہ سے کی اور اس نے اپنے بھتیجے سکندر خاں غازی کو مع ایک لشکر کے روانہ کیا۔ اس نے دو مرتبہ راجہ گوڑ گووندا پر حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ برہان الدین نے حضرت شاہ جلال سے سکندر خاں غازی کی مدد کے لئے التجا کی اور حضرت نے اسے قبول کر لیا اور راجہ کے خلاف ایک بار پھر مہم شروع ہوئی۔ اس مہم میں حضرت کے ۳۶۰ معتقدین شریک تھے اور ان کی روحانی برکت کے سبب غنیم پر فتح حاصل ہوئی۔

ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس کی رو سے شاہ جلال کے ورودِ سلہٹ کی صحیح تاریخ متعین کی جاسکتی ہے۔ یہ کتبہ آجکل ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کتبہ کی دریافت کا سہرا معصوم شمس العلما مولانا ابونصر وحید کے سر ہے۔ یہ شہر سلہٹ کے محلے "عنبر خانہ" کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس کتبہ کو ڈھاکہ کے عجائب خانہ کی تحویل میں دے دیا۔ اس کی عبارت کو مسٹر سٹیپلٹن نے پڑھا ہے (حوالہ کتبہ: عجائب خانہ ڈھاکہ جے۔اے۔ایس۔بی ۱۹۲۲۔ پی ۴۱۳)۔ عبارت یہ ہے:

"شیخ المشائخ، عارف ربانی کے نام نامی کے جلال کے باعث (عرصہ) سرہٹ کے مقام پر اسلام کی پہلی فتح کی یادگار میں یہ فتح لشکر سکندر خاں غازی نے حاصل کی۔ بزمانہ سلطان فیروز شاہ دہلوی، ۷۰۳ھ یہ عمارت رکن خاں نے تعمیر کی جو فاتح "ہشت جہریاں" ہیں نیز کامروپ، کامتا، جاگ نگر و اڑیسہ وغیرہ مقامات کی فتح کے دوران کئی ماہ بہ حیثیت وزیر و سپہ سالار بادشاہ کی لشکر کشیوں میں بھی شریک تھے۔ (محررہ) ۹۱۸ھ"۔

اس سے شاہ جلال کا ورودِ سلہٹ ۱۳۰۳ء میں قرار پاتا ہے نہ کہ ۱۳۸۴ء میں جیساکہ غلطی سے بلوخمین نے سمجھا تھا۔ شمس الدین فیروز کی آمد کے موقع پر اسلام بنگال میں دور دور تک پھیل چکا تھا میمن سنگھ کے ضلع سے ادھر برہمپترا کے پار سلہٹ تک۔ سنارگاؤں میں پٹھان بادشاہوں کے قدم جم چکے تھے اور اب ان کے لئے قدرتی طور پر یہ آسانی حاصل تھی کہ اپنی فتوحات کا دائرہ مشرقی بنگال کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیں اور ان تمام مقامات کو مسلم سلطنت کے زیرنگیں لے آئیں۔

کہا جاتا ہے کہ پرگنہ چوکی پہنچنے پر شاہ جلال کا گوڑ گووندا سے مقابلہ ہوا اور غنیم کو بڑی آسانی سے پسپا کر دیا گیا۔ وہ دریائے بارک (نزد بہادر پور) کو ایک مصلے پر بیٹھ کر عبور کر گئے۔ دریا پار کرنے سے پہلے حضرت نے ایک رات فتح پور میں گذاری تھی جو بہادر پور کے پاس ایک پڑاؤ ہے۔ اس واقعہ کی یادگار میں یہاں ایک جگہ بنی ہوئی ہے جسے لوگ "مقام" کہتے ہیں۔ جب شاہ جلال نے دریا پار کر لیا تو راجہ گوڑ گووند نے اپنا ایک ایلچی شاہ کے پاس بھیجا اور اس کے ساتھ ایک زبردست آہنی کمان بھیجی۔ اس نے کہلا کر بھیجا کہ اگر کسی نے اس کمان کا چلہ چڑھا دیا تو میں بغیر لڑے ہتھیار ڈال دوں گا۔ حضرت نے اپنے ایک معتقد "سید نصیر الدین سپہ سالار" کو، جن کی نمازِ فجر کبھی قضا نہ ہوئی تھی، اس کام پر لگایا اور انہوں نے کمان کا چلہ چڑھا دیا اس کے بعد شاہ جلال نے دریائے سرما کو "شیک گھاٹ" کے مقام پر عبور کر لیا جس کی خبر پاکر راجہ گوڑ گووند بھاگ کر پوچ گڑھ چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ راجہ گوڑ گووند راجایانِ تریپورہ کا کوئی باجگذار تھا۔

یہاں پہنچنے پر شاہ جلال نے دیکھا کہ یہاں کی مٹی رنگ روپ، ذائقہ میں ان کے ماموں کی دی ہوئی مٹی کے موافق ہے۔ چنانچہ وہ وہیں ٹھہر گئے اسی مقام پر ان کا روضہ تعمیر ہوا۔

روایات کہتی ہیں کہ اس وقت حضرت کے ساتھ ۳۶۰ معتقدین تھے۔ ان کے اسمائے گرامی کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں مگر ان کے بڑے بڑے معتقدین کے نام یہ بیان کئے جاتے ہیں: علی شہزادۂ یمن، سید عمر سمرقندی، سید محمد غزنوی، شکریہ عربی۔ سید علاء الدین بغدادی، شاہ کمال یمنی، شاہ گبھرو افغانی، شاہ جنید گجراتی۔ عارف ملتانی، شاہ داؤد قریشی، مخدوم جعفر، غزنوی، شاہ حشم الدین نارنولی، حسین الدین بہاری، سید قاسم کنی،

مظفر بہاری، شریف اجمیری، وغیرہم۔ اس مختصر فہرست سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا کے کتنے دور دست علاقوں سے لوگ اشاعت دین کی خاطر شاہ جلال کے ہمراہ شریک ہو چکے تھے۔

جس وقت حضرت سلہٹ پہنچے ان کی عمر ۳۲ سال تھی اور ان کا وصال ۶۹ یا ۷۰ سال کی عمر میں ۷۵۰ھ یا ۱۳۴۰ء میں ہوا۔ ان کا سال وفات "شاہ جلال مجرد قطب الدین" سے متخرج ہے۔

فتح سلہٹ کے بعد آپ نے اپنے معتقدین سے کہا کہ وہ ضلع میں ہر طرف پھیل جائیں اور دعوت اسلام کو عام کریں اور رشد و ہدایت سے خدمت خلق کا فریضہ انجام دیں۔ جہاں وہ اپنا سلسلۂ ہدایت قائم کرنا چاہیں وہیں اپنا مستقر بھی بنالیں۔ زیادہ تر لوگ جینتیا کے باہر صدر سب ڈویژن میں مقیم رہے، اس وقت اس علاقہ میں ہندو راجہ مسلط تھے۔ سنام گنج سب ڈویژن میں ان کے معتقدین حلقہ جگن ناتھ پور اور لوتر کے مقامات میں رہے۔ کیونکہ سب ڈویژن کا بقیہ حصہ زیادہ تر تہہ آب تھا۔ چونکہ ضلع کا نواح جنوب اس وقت راجایان تریپورہ کی حکمرانی میں تھا اس لئے ان اللہ والوں نے وہاں جانا اس وقت مناسب نہ سمجھا۔

ڈاکٹر بھٹا شالی اور چند دیگر مؤرخین بنگال کا خیال ہے کہ مشہور مراقشی سیاح، ابن بطوطہ بھی شاہ جلال سے آکر ملا تھا۔ ابن بطوطہ کا یہ سفر (۴۷-۱۳۴۶ء) کے موسم سرما میں قرار پاتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"میں کامروپ کے پہاڑوں تک پہنچا۔ یہ پہاڑ دور تک چلے گئے ہیں اور جادو سے منسوب ہیں۔ شیخ جلال الدین سے ملاقات کے بعد میں ہبونگ کے مقام پر پہنچا۔ کامروپ کے پہاڑوں سے بہہ کر جو دریا نیچے اترتا ہے اسے "نہر ارزق" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کے شہر اور بستیاں بڑی خوبصورت اور خوش حال و وسیع نظر آتی ہیں، ان جگہوں میں ایک جگہ ہبونگ بھی ہے۔"

شہر ہبونگ، شب ساگر ضلع میں واقع ہے اور دریائے برہمپترا کا کنارہ ہے اور چودھویں صدی میں بڑا بارونق شہر تھا۔ یلو خمین اور چند دیگر مؤرخین نے "نہر ارزق" کو دریائے برہمپترا بتایا ہے۔ اس وقت دریائے سرما کی وادی میں کوئی جگہ ہبونگ شہر کے نام سے نہیں تھی۔ ابن بطوطہ نے چونکہ یہاں کے لوگوں سے سحر اور جادو کے تذکرہ کو منسوب کیا ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ کامروپ تک پہنچا ہو۔

★

آئیے اب چشم تصور سے سلہٹ میں شاہ جلال اور ان کے پاک نفس رفقا کی آمد کا نظارہ کریں۔

سن ۱۳۰۳ء ہے۔ موسم خزاں کی شام ہے۔ اگر مشرقی بنگال میں اس وقت کوئی شخص نظارہ کرتا تو اسے ۳۶۰ پردیسی وضع قطع کے آدمی گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیں گے۔ یہ مقام وادی سرما کے گھنے جنگلات ہیں۔ دو دو سواروں کی قطار ہے۔ گھوڑوں پر کوئی سجاوٹ نہیں ہے بلکہ معمولی ساز و سامان ہے۔ شہسواروں کا لباس شلواریں ہیں اور ان پر لانبے لانبے، موٹے کپڑے کے کرتے، سروں پر بڑے بڑے عمامے چہروں پر بڑی بڑی نورانی ڈاڑھیاں۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مجاہد بھی ہیں اور اہل فقر بھی۔ کسی کے گلے میں جزدان لٹکا ہے تو کسی کی کلائی میں تسبیح لپٹی ہوئی ہے۔ غرض ہر طور سے وہ دیندار لوگوں کا گروہ معلوم ہوتا ہے ــــ لیجئے، سورج کی آخری کرنیں پتوں کے جھرمٹ کے پیچھے اپنی تابنا کی ختم کر کے غائب ہو گئیں۔ غلغلۂ اذان سے جنگل کا ایوانِ ہزار ستون گونج اٹھا۔

غرض ایسا نقشہ تھا کہ دعوت اسلام سلہٹ کی سرزمین تک پہنچی۔ شیخ طریقت نے اپنے روحانی تصرف، تلقین اور عمل صالح سے جلد ہی یہاں کے لوگوں کے دل میں جگہ پیدا کر لی اور لوگوں میں عزت و حریتِ نفس کا احساس بیدار ہونے لگا وہ کشائشِ حیات کے فیض سے آشنا ہوئے۔ حضرت کے متوسلین نہ صرف ضلع سلہٹ میں رہے بلکہ پیڑا، نواکھالی اور چٹاگام تک جا پہنچے۔ اور اسلام وہاں تک پہنچا یا۔ ہدایت و اعانت خلق سے دریغ نہ کیا اور زندگی کی آسودگیوں اور ملک و مال و منال سے ان بے غرض انسانوں نے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ جونہی ملک اسلام کے اثر میں آیا انہوں نے ملکی انتظام کی باگ ڈور سکندر غازی کے سپرد کر دی اور خود اللہ اللہ میں لگ گئے۔ شاہ جلال نے اپنی زندگی ایک حجرہ میں بسر کر دی اور یاد الٰہی سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ علائق زندگی سے کنارہ کش رہے بلکہ نکاح تک نہ کیا تاکہ زندگی کے بکھیڑوں سے بچے رہیں اور خدمت خلق

کے لئے وقف رہ سکیں۔ ان کے زہد و ورع کا حال جب دور دراز لوگوں تک پہنچا تو وہ جوق در جوق ان سے رجوع کرنے لگے اور ۳۰ سال تک یہ چراغِ ہدایت روشن رہا۔ وصال کے بعد ان کا مزار بھی وہیں بنا جہاں انہوں نے یہ عمر گزاری تھی۔

درگاہ شہر سلہٹ کے شمالی حصہ میں ایک مرتفع جگہ پر واقع اور مرجعِ خلائق ہے۔ ہر قوم و ملت کے لوگ زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں۔ درگاہ کا قبہ بڑا شاندار ہے اور پہاڑی کی طرف واقع ہے۔ درگاہ کے چاروں طرف خشتی دیوار ہے۔ چاروں کونوں پر بڑے بڑے اونچے ستون ہیں اور مزار پر انواب کے اوپر چھتری بنی ہوئی ہے۔ احاطہ کے مغربی جانب اور درگاہ کے ایک حصہ کے طور پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ جسے مسٹر وائلز نے مکرر بنوایا تھا۔ یہ مسٹر وائلز ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۳ء تک سلہٹ میں کلکٹر رہے تھے۔ درگاہ کی سب سے بڑی عمارت جو "گنبد" کہلاتی ہے ۱۶۷۷ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ امیر سلہٹ، فرید خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ گنبد کے جانبِ جنوب جو مسجد ہے اسے بہرام خاں، فوجدار سلہٹ نے ۱۷۴۴ء بنوایا تھا اور بوجہ وسعت سلہٹ کی سب سے بڑی مسجد مانی جاتی ہے۔

سلہٹ میں جب کبھی کوئی مسلمان حاکم تعینات ہوتا تھا اسے پہلی تقرری پر درگاہ کی زیارت کو بھی جانا لازم تھا اور جملہ عوائد رسمیہ ادا کرنی ہوتی تھیں۔ غیر مسلموں سے بھی یہ زیارت کرائی جاتی تھی۔ اس روایت کا ذکر مسٹر لنڈزے نے بھی کیا ہے۔ یہ صاحب ۱۷۷۹ء میں سلہٹ کے کلکٹر مقرر ہوئے تھے اور اپنی زیارت کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

"اب مجھے بتایا گیا کہ انگریزی ریذیڈنٹ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ قدیم رسم کے مطابق مشہور بزرگ حضرت شاہ جلالؒ کی درگاہ پر حاضری دے۔ یہاں ہندوستان کے ہر مقام سے مسلمان زائرین آتے رہتے ہیں۔ بعد میں مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ درگاہ کے مجاورین و خدام مذہبی جنونی یا خطرناک بالکل نہیں ہیں اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ مذہبی معتقدات سے تعرض کروں اور اس غرض سے میں بھی اپنے پیشرووں کی طرح زیارت درگاہ کے لئے بحالت جلوس روانہ ہوا۔ جوتے دروازہ ہی پر اتار دئے اور ۵ اشرفی نذرانہ پیش کیا۔ روحانی پاکی سے سرفراز ہو کر میں اپنی جگہ واپس آگیا اور یہ امر ہماری رعیت کی خوشنودی و دلجوئی کا باعث ہوا۔"

شاہ عالم کے فرزند مرزا فیروز شاہ بھی دہلی سے یہاں آئے تھے اور ۱۸۴۹ء میں انہوں نے بھی درگاہ کی زیارت کی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حضرت شاہ جلال الدین سلہٹی شیخ جلال الدین تبریزی سے مختلف شخصیت ہیں۔ آخر الذکر کا مزار پنڈوہ میں ہے اور ان کا وصال ۱۲۲۵ء میں ہوا تھا۔

حضرت شاہ جلال سلہٹی کے پہلے سوانح ۱۱۲۴ھ میں لکھے گئے جن کے تحریر کرنے والے وسطِ ہند کے بزرگ حمید الدین نارمولی کے خاندان کے کوئی صاحب تھے اور شاہ جلال کے ساتھ رہے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب کا نام "روضۃ الصالحین" ہے۔ معین الدین، خادم درگاہ شاہ جلال نے بھی ایک سوانح لکھی تھی جو ۱۱۴۴ھ میں نواب نائب بنگال، مرشد قلی خاں کے حکم سے تیار ہوئی تھی۔ نصیر الدین حیدر، منصف سلہٹ نے بھی ۱۷۶۰ء میں شاہ جلال کی ایک سوانح لکھی جسے "سہیل یمن" کا نام دیا گیا۔ مگر اس کتاب میں زیادہ تر ان دو سابقہ کتابوں ہی سے استفادہ کیا گیا ہے یا پھر کچھ مقامی روایات کا الحاق ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعد میں جو بھی سوانحی تذکرے لکھے گئے ان میں "سہیل یمن" سے استفادہ کیا گیا ہے، چنانچہ ۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر وائز نے بھی ایک سوانح تحریر کی اور "سہیل یمن" کو بنیادی ماخذ بنایا۔ درگاہ محلہ سلہٹ کے رہنے والے مفتی اظہر الدین احمد نے بھی ۱۹۱۳ء میں ایک احوال بعنوان "شاہ جلال اور ان کے خدام" لکھا۔ اس کتاب (بنگالی) کا نظر ثانی کیا ہوا ایک ایڈیشن پھر ۱۹۴۳ء میں بھی چھپا اور اب شاہ جلالؒ کے حالات پر مکمل و مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے:

۱۰۰۰۲ ۰

ماہِ نو کراچی۔ مئی ۱۹۵۹ء

ثقافت:

میلہ چنن پیر

محمد کریم

جہاں تک سننے میں آیا ہے یہ میلہ واقعی بہت دلچسپ اور دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کا رنگ دوسرے میلوں سے بہت مختلف ہے۔ جیسے سارے علاقے کی آزاد روح اس میں پوری طرح سما گئی ہو۔ اسی لئے یہ حقیقی معنوں میں میلہ ہے، یعنی سارے لوگوں، عورتوں مردوں کی ساجھی اور گہری دلچسپی کا نتیجہ۔ ایک اجتماعی مشغلہ جیسے وہ اس میں اپنے دل کے ساتھ شامل ہو رہے ہوں اور اپنے دل کی ساری امنگیں اور مرادیں لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تہہ میں محبت کا وہ عالمگیر جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے جو انسانی فطرت کا بہترین جذبہ ہے اور ہشاش بشاش، تندرست و توانا انسانوں کی امتیازی خصوصیت۔

اس میلہ میں خلا ملا اور میل جول کی پوری پوری آزادی نظر آتی ہے اور دیکھتے ہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ عربوں ہی کا اثر یا یوں سمجھئے فیض ہے۔ وہی آزادی، وہی بے باکی، وہی رومانوی رنگت، جیسے انسانی روح ہر مصنوعی تکلف کا حجاب پرے پھینک کر اپنے فطری لا ابالیانہ پن کے ساتھ سامنے آگئی ہو۔ چنانچہ اس میلہ کے عوامی رقص میں وہی کیف و مستی، وہی البیلا پن، وہی رومانوی ترنگ نظر آتی ہے، جس کا عربوں میں چرچا تھا اور میلہ کی رونق، اس کی دھوم دھام عکاظ اور ایسے ہی دوسرے زندگی کی ہاؤ ہو سے لبریز میلوں کی یاد دلاتی ہے جن میں بدویت کی روح پوری طرح سمائی ہوئی ہے۔ میل ہا میل پھیلی ہوئی ریت کی ڈھیریاں ہی ڈھیریاں، چنن پیر کے مزار کی سہانی کھلی فضا، اس کے ارد گرد اونچے لانبے، خوش شکل، خوش وضع ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے گبھرو اور سرخ، رنگین بھڑکدار کپڑوں میں ملبوس عورتیں، سب مل کر ایک ایسا سماں پیدا کر دیتے ہیں جو رہ رہ کر دشتِ عرب اور اس کے منچلے انسانوں کی یاد دلاتے ہیں اور دیکھنے والوں کا دل بے اختیار کیف و مستی کے عالم میں کھو جاتا ہے اور رقص کے ساتھ جو گیت ہونٹوں پر آتے ہیں وہ بھی ان لازوال احساسات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ملتانی ہو یا پنجابی، ان گیتوں کا موضوع، اُن کے بول، ان کا رنگ رس ایک ہی ہوتا ہے:

نیری ڈاچی دے گل وِچ ٹلیاں — میں تاں پیہ مناون چلیاں
تیری ڈاچی دے گل وِچ ہار وے — ڈاچی والیا موڑ مہار وے
(تیری اونٹنی کے گلے میں گھنٹیاں ہیں — میں تو پیہ کو منانے چلی ہوں
تیری اونٹنی کے گلے میں ہار ہے — اے اونٹنی والے! اونٹ کی مہار موڑ دے!)

یہ پھر وہی عرب کا سماں! اور اونٹنی، ملتان اور بہاولپور کے وسیع ریگ زاروں کی یاد دلاتی ہوئی اس سماں کا کیف اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔ غرض چنن پیر کا میلہ محض میلہ نہیں، زندگی ہے۔ اور جس نے اس کو ایک بار دیکھا ہو وہ اس کو عمر بھر فراموش نہیں کر سکتا ✤

(مدیر)

چولستان کے ریگزاروں میں چنن پیر کے مزار پر بہار کا میلہ تعجب خیز ضرور ہے کیونکہ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں بہار کا تصور ہی ایک بے معنی سی بات ہے چہ جائیکہ بہار کا میلہ، مگر خدا کی رحمت جوش پر آجائے اور بارش کے چار چھینٹے پڑ جائیں تو زمین کی قوت نمو اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ خود رو جھاڑیاں اور پودے سرسبز ہو جاتے ہیں اور بعض مقامات پر لمبی لمبی گھاس بھی اُگ آتی ہے، ہر چند کہ یہ بہار نہیں مگر چولستانیوں کے لئے اس سے زیادہ بہار کا تصور اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ بہار آتی ہے اور اپنے ساتھ نئی امنگوں اور نئے ولولوں کا ایک طوفان لے کر آتی ہے۔ خزاں کی دست درازیوں کے ستائے ہوئے انسان ذرا سستانے کے لئے اپنے اعتقادات کی آڑ لیکر چنن پیر

کے مزار پر جمع ہونے لگتے ہیں، جہاں روحانیت کا فیضان بھی حاصل ہوتا ہے اور تفریح کا سامان بھی۔

چنن پیر کا مزار چولستان کے عین وسط میں بہاولپور سے کوئی پچاس میل دور واقع ہے۔ یہاں ہر سال موسم بہار میں جمعرات کی جمعرات میلہ لگتا ہے۔ اور مکمل دو ماہ یعنی فروری اور مارچ گہما گہمی اور چہل پہل میں بیت جاتے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت کی دشواری زائرین کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ بے نام و نشان اور بے سنگِ میل راستوں پر اونٹوں کے قافلے منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں سے معتقدین اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب پر ریل سے اُترتے ہیں اور ۳۵ میل اونٹ کی پشت پر سفر کرنے کے بعد شرفِ زیارت حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ مزمان کے راستہ ۴۵ میل کا سفر لاری پر اور ۳۰ میل کا سفر اونٹوں پر طے کرنے کے بعد مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ قطار در قطار اونٹوں کے قافلے جن میں عورتیں اور بچے کجاووں میں بیٹھ کر کمر توڑ ہچکولوں کے اس سفر کا تجربہ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، اور مرد آگے پیچھے خواجہ غلام فریدؒ کی پرسوز کافیاں گا گا کر راستہ کی تکان مٹاتے ہوئے چولستان میں ہر سمت سے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ منزل چنن پیر کا مزار ہے۔

کہتے ہیں کہ آج سے اڑھائی سو سال پیشتر ایک ہندو راجہ چولستان پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے ہاں ایک حسین و جمیل بچہ پیدا ہوا مگر جب راجہ اپنے بچہ کو دیکھنے گیا تو وہ آہستہ آہستہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔ راجہ بہت برہم ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس بچہ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ رانی پھر بھی ماں تھی۔ وہ کیسے گوارا کرتی کہ اس کا لال مارا جائے۔ اس نے اپنے کچھ معتمد افراد کو بلا کر بچہ ان کے سپرد کیا اور ہدایت کی کہ جو شخص بچے کی پرورش کرنے پر رضامند ہو بچہ اسے دے دیا جائے۔ رانی کے معتمدین نے لاکھ کوشش کی کہ کوئی اس بچہ کو گود لے مگر کافروں کی مملکت میں کوئی شخص مسلمان بچہ کو پالنے کی ذمہ داری لینے پر تیار نہ ہوا۔ وہ لوگ گھومتے گھامتے جب اس مقام پر پہنچے جہاں اب چنن پیر کا مزار ہے تو ان لوگوں نے تنگ آکر بچہ کو اس جگہ ایک درخت کے سایہ میں لٹا دیا اور خود واپس چلے گئے۔

جب رانی کو یہ بات معلوم ہوئی تو اسے بہت رنج ہوا۔ وہ بعجلت تمام ان لوگوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر آئی تاکہ اپنے بچّہ کو دیکھے مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کہ بچہ چپار کی لکڑی کے ایک جھولے میں پڑا ہوا ہے جو خود بخود ہل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ بچہ تندرست اور زندہ ہے رانی باغ باغ ہو گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ یہ بچہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور کوئی فوق الفطرت طاقت اس کی نگہبانی کر رہی ہے۔ اسلئے رانی نے مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہ کی اور واپس چلی گئی۔ یہی بچہ جب جوان ہوا تو چنن پیر کہلایا۔

چنن پیر کا مزار روایتی قبہ و تعویذ سے بے نیاز محض ایک کچی قبر ہے جس پر کنکر پتھر چُن کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ قبر تقریباً ۲۰ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ چوڑی ہے۔ اس قبر پر کسی قسم کا سائبان تک نہیں ہے۔ صرف ایک پرانا جنگلی درخت اس کے سرہانے کھڑا مزار مقدس کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو لوگ اس مزار پر منتیں مانتے ہیں وہ اپنی ہر منت کے ساتھ درخت پر دھاگہ یا کپڑے کی کتر باندھ دیتے ہیں چنانچہ اس کی ہر شاخ پر بے شمار دھاگے اور کترنیں پیر اور اس کے معتقدین کے درمیان ایک قول کی حیثیت رکھتی ہیں، اور مرید جب سال بسال زیارت کے لئے آتے ہیں تو منت کی ہر شرط پوری کرتے ہیں۔

مزار کے قریب ایک چھوٹی سی ویران مسجد بھی ہے اور ذرا دور ہٹ کر کوئی دو درجن کچے مکان ہیں۔ یہ گاؤں بھی چنن پیر کے نام سے موسوم ہے۔ ان مکانوں میں سے تقریباً نصف درجن مکان ان لوگوں کی ملکیت ہیں جو اس مزار کے متولّی ہیں۔

میلہ کے دنوں میں مزار کے اردگرد دور دور تک ریت کے ٹیلوں پر انسانوں اور اونٹوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ ریگستان کی تاروں بھری راتوں میں یہ منظر اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے جب ہر ٹولی کی عورتیں جگہ جگہ چولہے جلا کر روٹیاں پکا رہی ہوتی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی پرکیف ہوا من کو گدگدا دیتی ہے۔ خورد و نوش سے فراغت کے بعد جگہ جگہ جھومر ناچ کا نظارہ بڑا ہی دلکش منظر ہوتا ہے۔ بنسری کی مُرلی اور مدھ بھری تانوں پر چولستان کا جو مزاج ایک ایسی کیفیت طاری کر دیتا ہے جس میں روحانیت اور تقدس کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور تفریح طبع کا سامان بھی۔ اس میلہ کی ایک اور خصوصیت یہاں کے داستان گو ہیں جو "جنگ اور محبت" کی منظوم کہانیاں طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی لَے پر جھوم جھوم کر سناتے ہیں اور سننے والوں کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

چولستان میں خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کو وہ شہرت اور قبولیت حاصل ہے جو شاید کسی اور علاقہ میں کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔ میلہ میں لوگ خواجہ صاحبؒ کی معرفت سے لبریز کافیاں جگہ جگہ گاتے سنائی دیتے ہیں اور آدھی آدھی رات تک کافیوں کی چھوٹی چھوٹی محفلیں جمی رہتی ہیں۔

ر۔ غ

نقد و نظر

پیت کی ریت

از خواجہ دل محمد دلؔ

صفحات ۲۵۶، قیمت چار روپے

ناشر:۔ خواجہ بک ڈپو، اردو بازار لاہور

یہ مجموعہ ۵۰۰ دوہوں، ایک تعارف، ایک پیش لفظ اور ایک تمہید پر مشتمل ہے۔ دوہہ صدہا سال ایک نہایت مقبول صنف رہا ہے۔ یوں بھی شاعر کے تاثر کو سادہ ترین اکائی میں مرکوز کر دینے سے یہ صنف بڑی ہی قدرتی، بے ساختہ اور پُر اثر بن جاتی ہے۔ اردو میں اس کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن اہلِ ذوق اس کی لطافت و موزونیت سے بے خبر نہیں رہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد جواں سال شاعر عالیؔ نے اس پر خاص توجہ دی ہے جس سے یہ صنف پھر جاگ اٹھی ہے لیکن عالیؔ سے کہیں پہلے خواجہ صاحب واحد شاعر ہیں جنہوں نے اس کو اپنایا، اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ دوہوں کی ٹھیٹ زبان پر جو انہیں قدرت ہے اس کی وجہ سے وہ اس کام کے لئے موزوں بھی تھے۔ اور پھر اہلِ دل ہونے کی بناء پر انہیں گیان گن اور پریت کی ریت سے بھی وہ گہرا لگاؤ تھا جو کچھ دوہوں کی زبان ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ شاعر اور صنف دونوں کی وضع میں ایک فطری مناسبت ہے۔ جس نے دونوں کو ایک دوسرے کا دمساز بنا دیا ہے۔

خواجہ صاحب کی ذہنی فضا ایسے عناصر سے مرتب ہوئی ہے جو انہیں دورِ کہن سے قریب تر ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ لہٰذا جس پریت کی ریت کا راگ انہوں نے گایا ہے، وہ آج کا شاید ہی کوئی شاعر گائے۔ اور ممکن ہے یہ میلان کسی قدر زیادہ معلوم ہو جس کی وجہ سے جدید طبائع ان کا ساتھ نہ دے سکیں۔ مثلاً ؎

داتا کا در چھوڑ کر دَر دَر پھرے نہ کوئے
اس کے دَر سے در ملیں، دَر دَر دُر دُر ہوئے

بہت بہتر ہوتا اگر بھاشا کی بجائے اس کو اردو سے قریب تر لا کر مانوس بنایا جاتا جیسا کہ عالیؔ اور خود خواجہ صاحب نے متعدد اشعار میں کیا ہے۔ پھر بھاشا ہی کے انداز میں تجنیس لفظی سے جو کام لیا گیا ہے وہ بھی عہدِ رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔ بعض جگہ تمثیل اس حد تک قطعی ہے کہ اس میں تخیلی پھیلاؤ اور اشاریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے باوجود اس مجموعہ کا دامن انمول موتیوں سے لبریز ہے۔

تیز ہوا اور تنہا پھول

از منیر نیازی

صفحات ۹۶، قیمت تین روپے

ناشر:۔ مکتبہ کارواں، لاہور

نظمیں، غزلیں، قطعے، گیت (کل ۸۰) سیر کہسار (پیش لفظ) اور گرد پوش کا تعارف یہ سب ایک شاہین۔ شاعر کی لاابالی روح۔ کو زیرِ دام لانے کی کوششیں ہیں لیکن یہ تدبیر شاید ہی کارگر ثابت ہو۔ کیونکہ جس پُر اسرار فضا میں یہ تنہا پھول اگا اور پروان چڑھا ہے وہ۔ اشفاق احمد نے "سیر کہسار" میں اس کا بہت ہی بھرپور نقشہ کھینچا ہے ــــ شاید کسی بھی تیز ہوا کا حریف ہو سکتا ہے۔ منیر نیازی اور اس کی شاعری کی فضا کو سمجھنے کے لئے اس کے دونوں افسانہ نما تعارفوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ایک ذہین قاری اس پُر اسرار فضا اور اس میں گھومتے پھرتے کردار کو خود بھی بھانپ لے جو ان مختصر مگر بھاری ــــ بعض گھروں کی طرح نظموں کو بھی بھاری کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟۔ نظموں کے پسِ پردہ جھلکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کی طرح اس کے مجموعہ میں کوئی حرفِ راز کسی طلسمی دروازے کے پٹ کھول دیتا ہے۔ بلکہ سناٹا، ہو کا عالم کھوئی کھوئی گونگی فضا، گم سُم ٹھہرا ٹھہرا ماحول، افسانوی سماں، گئے موسموں اور بچھڑے لوگوں کے لئے سسکیاں، سوچ، اکیلاپن، دوری، ویرانی، بھولی بسری باتیں، سرگوشیاں، جھلملاہٹیں، سائے۔ یہ سب ایک مبہوت کن کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جن میں کہیں کہیں آسیبوں، چڑیلوں اور جنوں کا ذکر بہکانے کے لئے کافی ہے۔ مگر جادوگری کے بھیس میں اصلی شاعر صاف دکھائی دیتا ہے۔ جو دوسرے شاعروں کی طرح بالعموم جانے پہچانے موضوعات ہی پر قلم اٹھاتا ہے۔ تیز ہوا اور تنہا پھول کی علامت شاید شاعر کی ذات پر حاوی ہو لیکن اس کی بہت کم نظموں پر حاوی ہے۔ چینی شعرا کی طرح چند ہی بولوں سے معنی کا

جادو جگانا اس کا بڑا وصف ہے۔ گو یہ پھلجھڑی سے زیادہ آوارہ کرنوں ہی کا جادو ہے۔ مثلاً دانت۔ موتیئے کے خوبصورت ہار، ٹھٹھرے تاروں کے جنگل سیلیٹی شامیں۔ رات کی نیلی چپ میٹھی کا مناؤں کا بھالا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعر نے گھاٹ گھاٹ سے بولیوں کے موتی رول لئے ہیں۔

سروِ چراغاں

از جمیل ملک
صفحات ۲۰۴، قیمت چار روپے
ناشر: گوشۂ ادب، لاہور

غزل میں کامیابی کی ایک ہی شرط ہے۔ یہ کہ شاعر اپنی ذات کو اس صنف کی پارہ پارہ ہیئت پر حاوی کر دے۔ اس کے لئے ذہن کو ایک خاص انداز سے سدھانا پڑتا ہے۔ وہ ٹیڑھے ترچھے کونے جو فکر یا ہیئت کی بے ربطی سے پیدا ہوتے ہیں ان کو ایک تیز دھار شعور سے خراد ا جائے۔ جمیل ملک نے اپنے مزاج اور یکرنگ تصور سے یہ کیفیت پیدا کرلی ہے۔ اس طرح اس نے خود کو بھی ایک حد تک روایت سے بچایا ہے اور غزل کو بھی۔

مینائے غزل

از بشیر فاروقی
صفحات ۱۹۲، قیمت تین روپے
ناشر: مکتبۂ لالہ زار، حبیب جون بلڈنگ
الفنسٹن سٹریٹ۔ کراچی

اگر اس پیشکش کے باطن کا اندازہ اُس ظاہر سے کیا جائے جو اس کے سرورق پر "ذرا سی باقی" کا آئینہ دار ہے تو اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے مقبولِ عام، منجھی ہوئی زمینیں اختیار کی ہیں اور بساط بھر شاعری کی داد دی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ غزل کی زبان میں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کی تصویر کھینچے۔ جذبۂ قومی نے اس کی غزل سے روایتی عشقیہ تیور چھین کر ملی و اخلاقی تیور عطا کر دیئے ہیں۔ اگر فیشن میں داخل مضامین اور زمینیں چھٹ جائیں اور حقیقی تجربہ کو وسیع تر فن سے آمیز کیا جائے تو نتائج بہتر ہوں گے۔

قیدِ فرنگ

از حسرت موہانی مرحوم
صفحات ۱۶۰، قیمت تین روپے ۸/
ناشر: نیا راہی، کراچی

یہ اس مکتبہ کی ان متعدد مطبوعات میں سے ہے جو بہت ہی کم مدت میں شائع ہو کر بے حد شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ حسرت موہانی کی زندگی تمام تر جد و جہد کے لئے وقف رہی۔ مشہور ہے کہ وہ ایک ایسے مضمون کی پاداش میں جیل گئے تھے جو ان کی کاوش قلم کا نتیجہ نہ تھا اور قید و بند کی شدید ترین سختیاں سہیں۔ "قیدِ فرنگ" اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس میں اسی قید کے ظلم و ستم کی داستان درج ہے۔ آخر میں جیل کا کلام اس دلچسپ آپ بیتی پر مستزاد ہے۔

بندیا

از سلیم پانڈے
صفحات ۲۲۰، قیمت تین روپے
ناشر: "کردار" پاکستان چوک کراچی

یہ ایک جواں سال افسانہ نگار کے افسانوں کا اولیں مجموعہ ہے۔ اے حمید نے پیش لفظ میں اس کے عیب اور اوگن تلاش کرنے کا کام نقادوں کے سپرد کر دیا ہے اور شاید بعض اس دعوت کو بڑے شوق سے قبول کریں۔ لیکن ذوقِ سلیم شاید اسے گوارا نہ کرے۔ نگاہِ آشنا سے دیکھا جائے تو اس میں گن بہت ہیں۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے رسم و رہِ عام کی پیروی قبول نہیں کی۔ وہ اپنا ہی منفرد تصور لئے ہوئے اپنی ہی پسند اور ذوق کی راہ پر چلا ہے۔ پہلا ہی افسانہ ترقی پسندوں کی نام نہاد آدرش بھگتی اور ادب و فن کے ڈھونگ کا پردہ چاک کرتا ہے اور بڑی جرأت سے ایک غیر رسمی رویہ کی حمایت کرتا ہے "ان ماڈرن لڑکیوں سے اچھری بہتر ہے جو اپنے خیالات اور مطلب کو چھپانا نہیں جانتی۔ اور سودا بازی کے فن سے واقف نہیں" یہ افسانہ اٹھکھیلیوں اور قہقہوں میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کئی اور افسانوں میں بھی بذلہ سنجی کی برق وش نقرئی لہر برابر موجود ہے۔ مشاہدہ و بیان میں انفرادی تیور ہیں۔ "ہیروئین کے آنسو" "خاندان کی ناک" "وہ لڑکی" "جارج کیفے کی ملاقات" شگفتہ ظرافت میں رچے ہوئے ہیں۔ اور بہت متوازن نقطۂ نظر ظاہر کرتے ہیں۔ بعض چیزیں نقوش، خاکے اور تصورات ہونے کے باوجود افسانے کی تعریف پر پوری اترتی ہیں اور ان میں شعریت کا خاصا رچاؤ ہے۔

> ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ (ادارہ)

* ابوالاثر حفیظ: بقیہ صفحہ (۲۰)

ہے یہ ترانہ تمام پاکستانیوں کے دل کو ابھارتا، گرماتا اور انتہائی گرم جوشی و اولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھنے کی تحریک دلاتا رہے گا۔

حفیظ کی ذات میں جو شاعر اور مغنی ہے وہ ابھی سویا نہیں۔ وہ برابر زندہ ہے۔ ایک طرف وہ دیہات کی ترقی کے لئے روز و شب انتہائی توجہ کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ اور اس کے نغمے اس اعلیٰ قومی مقصد کو روشناس تکمیل کرنے کے لئے وقف ہیں تو دوسری طرف اس کی توجہ تلی جذبات و احساسات کے لئے بھی وقف ہے۔ اور جب ذمہ داریوں کا وہ بوجھ جس کی تصویر اس نے کبھی یوں کھینچی تھی کہ:

اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بار دوش زندگی کوہ گران زندگی

کچھ ہلکا ہو جاتا ہے اور دل میں اس کے محبوب شغل شعر و نغمہ کی امنگ پیدا کرتا ہے تو وہ پوری قوم کا دل و دماغ اور زبان بن کر ایک ایسی شاعری تخلیق کرتا ہے جو تمام ملت کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ موجودہ انقلاب نے پھر شاعر کے دل میں ایک ولولۂ تازہ پیدا کیا ہے۔ اور اس کے درخشاں مستقبل کا نقیب، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا حدی خواں بن کر وہ ایک بار پھر وہ آواز بلند کرنے کو تیار ہے۔ جو ساری قوم کی آواز اور اس کو "تیز ترک گامزن" ہونے کا حیات افروز پیغام ہو۔ اگر شاعرِ رنگیں نوا، دیدۂ بینائے قوم کی حیثیت رکھتا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں "ستارۂ پاکستان" ثابت ہو۔

★

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ! پٹاخ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر پھٹی آستینیں!
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجیے
جی ہاں! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنیوالے
جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے
بھگوئیے، سن لائٹ صابن ملئے ذرا دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
پیٹے بغیر کپڑوں کو
سفید اور صاف اجلے
دھوتا ہے
S 14—193 UD

یہ خوف و ہراس کیوں؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایام سے نجات پایئے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
آرام پہنچاتی ہے
تازگی بخشتی ہے
Saridon
JWT VB 228

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

ماہِ نو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق | جسیم الدین | جوش ملیح آبادی

قدرت اللہ شہاب | انتظار حسین | فضل احمد کریم فضلی

شاہد احمد دہلوی | انور ممتاز | جمیل الدین عالی

ممتاز حسین | صادق حسین | شوکت تھانوی

خاص نمبر

یومِ پاکستان

مارچ ۱۹۵۹

OSTERMILK

آسٹر ملک

پاکستان میں نئی
لیبارٹریز تعمیر ہو رہی ہیں
روز افزوں ترقی کرتی ہوئی پاکستانی صنعت و حرفت کی خدمت کے لئے اے سی سی
سیمنٹ زیادہ سے زیادہ ریسرچ اور ٹیکنیکل ادارے تعمیر کرنے میں مدد دے رہی ہے۔
اے سی سی سیمنٹ کی مضبوطی اور پائداری ہمارے ۴۵ سال کے عملی تجربہ پر منحصر ہے اور
اے سی سی کا ٹیکنیکل مشورہ آپ کو کنکریٹ اسوسی ایشن کے ذریعہ مفت دیا جاتا ہے۔
A·C·C
B·B·B
CEMENT
A·C·C
CEMENT
مضبوطی اور پائداری کے لئے اے سی سی سیمنٹ استعمال کیجئے
دی اسوسی ایٹڈ سیمنٹ کمپنیز لمیٹڈ
(انکارپوریٹڈ اِن انڈیا)
نیلسنز چیمبرس، میکلیوڈ روڈ، کراچی ——— اورنیٹل بلڈنگز، دی مال، لاہور۔
JWT
ACC 431
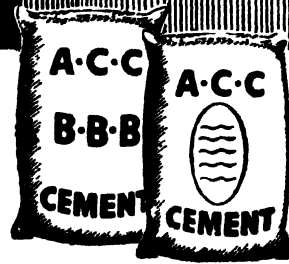
پاکستان شاہراہِ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر "ادارہ مطبوعات پاکستان" نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی اہم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جن سے ملکی صنعت کی رفتار و ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

استفادہ عام کے پیشِ نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے اب تک شائع ہو چکے ہیں:۔

پٹ سن کی صنعت	سیمنٹ کی صنعت
چائے کی کاشت اور صنعت	کپڑے کی صنعت
اشیائے صرف	ماہی گیری
کاغذ کی صنعت	ذرائع آبپاشی کی صنعت
پن بجلی کی صنعت	غذائی مصنوعات

ملنے کا پتہ

ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

THE FIELD OF EMBROIDERED QUILT

"نقشی کاتھا ماٹھ"

(بنگلہ نظم)

از

ایم جسیم الدین

انگریزی ترجمہ: مسز۔ ای۔ ایم ملفورڈ

(دوسرا ایڈیشن)

شائع کردہ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ (کراچی)

قیمت چار روپے

مشرقی پاکستان کی سحر آگیں دیہاتی زندگی کے مناظر۔ دیہی زندگی کی پرخلوص سادگی اور سچائی کی تصویرکشی

بقول ویریئر ایلون:

"میں نے اس نظم کو پڑھنا شروع کیا تو اس کی دلچسپی اور ساحرانہ دلکشی میں محو ہو گیا۔ میری وارفتگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ میں نے بار بار اسے پڑھا ہے اور اس کی سادگی، وجد آفریں کیف اور گہری انسانیت سے ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔"

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی

جلد ۱۲

خاص نمبر: یومِ پاکستان

مارچ ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

خاص نمبر: فی کاپی
ایک روپیہ چار آنے

سرورق: تین روحیں: محمد کبریا

(پاکستانی نقاشی کی دوسری قومی نمائش، کراچی، ۱۹۵۹ء، میں اس تصویر کو اوّل انعام ملا)

اپس کی باتیں

"ماہ نو" کا یہ شمارۂ خاص اُن خوشگوار حالات کا عکس ہے جو نسبتاً حال میں بروئے کار آئے ہیں اور ہماری قومی تاریخ میں ایک نئی منزل کی خبر دیتے ہیں۔ اور یہی اس کا مایۂ امتیاز ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ حالات بجائے خود ایک تقریب ہیں۔ جس میں جشنِ استقلال اور جشنِ حصولِ پاکستان دونوں مدغم ہیں اور قومی زندگی سے متعلق تمام کثرتیں ایک ہی سانچے میں ڈھل کر وحدت بن گئی ہیں۔ وحدتِ پاکستان ع

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بلاشبہ یہ وہ تقریب ہے جس میں ہمارا قومی نصب العین — حقیقی آزادی — اور اپنے وطن کو زندہ تر، پائندہ تر اور تابندہ تر دیکھنے کی تمنا پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ ہماری تاریخ کے انتہائی نقطۂ عروج کی آئینہ دار ہے اور اُس دَور کی نقیب جس میں کتابِ ملّت کی ازسرِنو شیرازہ بندی ہوئی ہے، اور حکیم ملت ہی کے الفاظ میں صبا نے پھر بوئے گل یعنی اپنے نئے پُرخلوص، صاحبِ نظر اور دُور اندیش قائدین سے ہم سفر پیدا کیا ہے جو قوم کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں اور اس کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ تقریب بہ حقیقی معنوں میں "یومِ پاکستان" کی تقریب ہے اور "ماہ نو" کا یہ شمارۂ خاص اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔

پانچ مہینے کا عرصہ جس میں نئے قائدین کو قومی معاملات کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملا ہے، بظاہر بہت ہی مختصر ہے، خصوصاً گیارہ سال کے اُس طویل عرصے کو دیکھتے ہوئے جبکہ وزارتوں پر وزارتیں آتی رہیں، جاتی رہیں لیکن زندگی کے کسی شعبے میں بھی نمایاں پیشقدمی نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پانچ مہینے کی انتہائی قلیل مدت میں جو برق رفتار ہمہ جہتی اقدامات ہوئے، وہ حقیقتاً حیرت انگیز ہیں، اور اس قدر فراواں کہ اُن کا شمار آسانی سے ممکن نہیں۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!

تاہم اس شمارہ کے مختلف مضامین میں محال کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں وہ دن خصوصیت سے یاد رہیں گے جب سالِ نو کے آغاز سے تھوڑا عرصہ بعد وفاقی پایۂ تخت گوناگوں ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا اور اس کے در و دیوار "نواسنجانِ گلشن" یعنی ادبائے پاکستان کے غلغلے سے گونج اٹھے۔ یہ پہلا موقع تھا جبکہ اس شہر میں، جو اپنے کاروباری شور و غل کے لئے ممتاز ہے، علم و ادب کی غیر کاروباری ہماہمی اور ہنگامہ پیدا ہوا جیسے کسی محفلِ موسیقی میں کسی مافوق التصور طلسمی اثر کے ماتحت سارے ساز ایک دم بج اٹھیں۔ چنانچہ جب شہر کے ایک حصے میں مشرقی و مغربی پاکستان کے گوشہ گوشہ سے بے شمار ادبی مندوبین ایک معرکہ آرا کنونشن میں شریک تھے تو دوسرے حصے میں اتنے ہی زور شور سے ایک اور عالمگیر اسلامی مذاکرہ کی کارروائی جاری تھی۔ ان کے علاوہ اسی زمانے میں "پاکستان آرٹس کونسل" کے زیرِ اہتمام پاکستانی نقاشی کی دوسری نمائش بھی منعقد ہوئی اور اراضی سے متعلق انقلاب آفریں اصلاحات کا اعلان بھی ہوا۔ علیٰ ہٰذا دوسرے اداروں میں بھی مختصر پیمانے پر یہی علمی، ادبی اور فنی کارروائیاں ظہور میں آئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کراچی مکمل طور پر بلدۂ علم و فن بن جائے گا — اور ظاہر ہے کہ حکومت کی ادب اور اہلِ ادب کے بارے میں خیر اندیشانہ پالیسی سے جو پہلے ہی کنونشن کی شکل میں نہایت دقیع نتائج پیدا کر چکی ہے، یہ مرحلہ زود تر طے ہو جائے گا — تو اس کا عالم کیا ہوگا۔ نئے دور کی بھرپور عکاسی کا حق جب ہی ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم ان تمام سرگرمیوں پر نظر ڈالیں۔ اس سلسلے میں ادبی کنونشن جو پاکستان ہی نہیں، تمام برصغیر میں اپنی قسم کا پہلا، عظیم بالشان اجتماع ہے اور حکومت کی ادب نوازی، معارف پروری پالیسی سے قطع نظر، اہلِ ادب کے لئے دور رس نتائج کی حامل ہے، خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس لئے اس شمارہ کا کافی حصہ اسی کے لئے وقف ہے۔ ارادہ تھا کہ اس پیشکش کو زیادہ سے زیادہ سیر حاصل بنایا جائے لیکن مدیر کی مسلسل ناسازیٔ طبع سدِراہ ہوئی۔ لہٰذا یہ خوانِ نعمت جیسا بھی ہے، حاضرِ خدمت ہے۔

جب پاکستان کی علمی و ادبی شمعوں سے فضائیں نورٌ علیٰ نور تھی تو ناگہاں ایک ناساز اتفاق نے ہمیں ایک ایسی شمع سے محروم کر دیا جس سے ہماری ادبی محفلوں میں غیر معمولی فروغ تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم جنہوں نے ادب اور فکر دونوں کو جِلا دینے میں نمایاں حصہ لیا، صرف ذاتی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی، جس کی خدمات محتاجِ بیان نہیں۔ مرحوم کی کوششیں آخری وقت تک علوم و معارف کی خدمت کے لئے وقف رہیں۔ وہ اسلامک سیمینار میں شرکت کے لئے کراچی تشریف لائے تھے اور عین اس وقت جبکہ اس یادگار اجتماع کی سرگرمیاں جاری تھیں، باتیں کرتے کرتے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

یومِ پاکستان

اسد ملتانی

مزدکی ہو کہ فرنگی، ہوسِ خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

صورتِ خیر و سلامت ہے تو اسلام میں ہے
حُسن کا جو بھی تصوّر ہو اسی نام میں ہے

وہ کہاں یورپ و امریکہ میں، جو حُسن و جمال
ترکی و مصر و عراق و عرب و شام میں ہے

حُسنِ باطن کا تو امکاں ہی نہیں اور کہیں
حُسنِ ظاہر بھی فقط عالمِ اسلام میں ہے

کسی منزل ہی کی جانب تو رواں ہے دنیا
کوئی مقصد تو نہاں گردشِ ایام میں ہے

کون اقطارِ سماوات سے باہر نکلا
اُڑ کے پہنچا جو کہیں بھی تو اسی دام میں ہے

عقل کو اور کہیں سے بھی نہیں مل سکتی
وہ ہدایت جو خود اللہ کے پیغام میں ہے

یوم ہر سال مناتے ہیں جو پاکستاں کا
خاص اک یوم یہ اسلام کے ایام میں ہے

ہو گئی دین کی بنیاد پہ ملت قائم
اک نیا تجربہ اس دَور کی اقوام میں ہے

ذمہ داری بھی اسی کی ہے زیادہ سب سے
ملک جو سب سے بڑا عالمِ اسلام میں ہے

رازِ عظمت ہے مقاصد کی بلندی میں اسدؔ
ہم یہ سمجھے کہ بلندی در و بام میں ہے

دورِ نَو

نظر حیدرآبادی

بنامِ روحِ آزادی وہ ساماں ہم نے دیکھا ہے
قفس اندر قفس حسنِ گلستاں ہم نے دیکھا ہے
نظر کو روح کو، دل کو ہراساں ہم نے دیکھا ہے
کہ احساسات کو بھی پابجولاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

خضر کی شکل میں رہزن امامانِ سیاست تھے
سیہ باطن اجالے رونقِ صبحِ سعادت تھے
ہمایوں بخت مجرم تخت آرائے حکومت تھے
لٹیروں کو بھی ملّت کا نگہباں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

جہاں وحشت کے جھونکوں سے لرزتی تھی فضائے دل
جہاں سینے کے داغوں سے تجلّی بار تھی محفل
جہاں بلبل کو اذنِ نغمہ پیرائی نہ تھا حاصل
وہاں زاغوں کو سرمست و غزلخواں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

نہ پوچھو کیسے غم، کیا دکھ تھے، کیسی جگ ہنسائی تھی
نہ پوچھو کس نے اور کیسی قیامت ہم پہ ڈھائی تھی
ہمارے ناخدا نے کچھ ہوا ایسی چلائی تھی
بھنور میں امن اور ساحل پہ طوفاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

تلاطم تھا امانت دار لطف و راحتِ ساحل
چمکتی برق تھی اب تک نگہدارِ غمِ حاصل
تڑپتی تیغ تھی ماتم گسارِ لاشۂ بسمل

جہنم کو ندیمِ شبنمستاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

وہ عہدِ بے یقینی اس قدر مسموم و ابتر تھا
گلوں کے لب پہ کانٹے اور ہر کانٹا گلِ تر تھا
کمال آشفتہ حال و بیقرار و زار و بے زر تھا

مگر ہر بے کمالی کو زر افشاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

سدا فن کار پر تھا بند دروازہ حکومت کا
مقدر ہو گیا تھا ان کا حصہ دُور کا جلوا
کہاں وہ بابِ عالی اور کہاں ہم سے وفا پیشہ

دعاؤں کو بھی ہوتے "نذرِ درباں" ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

خدا کا شکر اب وہ رسمِ اندازِ کہن بدلی
نئے ساقی نے بُنیادِ بساطِ انجمن بدلی
کچھ اس انداز سے تقدیرِ اہلِ علم و فن بدلی

کہ اختر ہر سخنور کا فروزاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

★

"وہ چمک اٹھا افق"

اگر اُن حالات پر نظر ڈالی جائے جو گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد رونما ہوئے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں، وہ ایک نہایت نازک اور پُر آشوب دور ہے اور اس کے ساتھ بے انتہا ہنگامہ خیز بھی۔ اس میں تمام اقوامِ عالم معرضِ امتحان میں ہیں، اور ایک مسلسل روح فرسا آزمائش کے مرحلے سے گذر رہی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے چل کر ان کا انجام کیا ہو، اور اگر وہ خوش قسمتی سے اِس پُر آشوب دور کے اُس پار امن و سلامتی کے کنارے پر پہنچ بھی جائیں تو ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ اُن قوموں کے لئے جو صفحۂ ہستی پر اُبھری ہی ہیں اور اُنہیں آزاد قوموں کے زمرے میں شامل ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری، یہ مرحلہ اور بھی صبر آزما، اور بھی جانگداز ہے۔ وہ دوہری آزمائش سے دوچار ہیں۔ آزادی تو صرف اتنا ہی کرتی ہے کہ اُنہیں وجود میں لاکر ایک کھلے میدان میں چھوڑ دے کہ وہ جئیں یا مریں۔ اور ان تمام ناتوانیوں، خطروں اور دشواریوں کے ساتھ جو کسی چیز کے جنم لینے کے بعد لازمی ہیں۔ یہ نازک مرحلہ کچھ اور بھی کٹھن ہوتا ہے کیونکہ اس میں ساری کشمکش اپنے ہی ساتھ ہوتی ہے ؎

همه از دستِ غیر می نالند سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اور پھر وہ قوموں اور ملکوں کی مسلسل باہمی کشمکش ہے جو سب کے لئے یکساں ہے اور جس سے کوئی بھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ پاکستان شروع ہی سے ان دونوں قسم کی کشمکشوں سے دوچار رہا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لئے نجی قسم کی کشمکش اور بھی بلائے جاں ثابت ہوئی اور کچھ عجب نہیں کہ جان لیوا بھی ثابت ہوتی۔ گویا ہمیں دوہری نہیں تہری کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ غیروں کے ہاتھ سے اور کچھ اپنے ہاتھ سے —— اور یہ کیفیت ہوئی کہ ؎

کار و بارِ موج با بحر ست خودداری مجو در شکستِ خویشتن بے اختیار افتادہ ام

اس طرح دس گیارہ ابتدائی نازک سال سسکتے، رینگتے، کلبلاتے، ایڑیاں رگڑتے گذر گئے۔ نہ کوئی مسئلہ حل ہوا، نہ کوئی چارۂ دردِ نہاں ہوا۔ حالات روز بروز بدتر ہوتے گئے اور یہ امید کہ کسی دن ایک دورِ خوشگوار بھی آئے گا موہوم تر ہوتی گئی ؎

مرداں روزِ بہی می طلبند از ایام مشکل اینست کہ ہر روز بتر می بینم

یہاں ان افسوسناک حالات کو دوہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ان سب سے بخوبی واقف ہیں اور سچ پوچھئے تو بار بار ان کا اعادہ ایک خفقانی ذہنیت کی نشانی ہے جو تندرست اور سنجیدہ ذہنیت کے منافی ہے۔ بہت اچھا ہے کہ ہم ایک بروقت انقلاب کی بدولت اس رنج و کرب اور سنگین آزمائش کے بھیانک دور سے باہر نکل آئے ہیں۔ اور ایک بار پھر ویسی ہی روشن اور تابناک فضا میں داخل ہو رہے ہیں جو ہمارے لئے بے انتہا صحت مند اور حوصلہ افزا ہے۔ بلکہ یہ فضا اس لحاظ سے اور بھی خوشگوار ہے کہ اس میں وہ اندیشے، وہ رکاوٹیں نہیں جو ایک سنگین دیوار بن کر ہمارے راستے میں کھڑی ہو جائیں اور ہمیں آگے بڑھنے سے روکیں۔ ہمارے لئے انقلاب آیا اور اس انداز سے آیا کہ سارا بت خانے کا بت خانہ زیر و زبر ہو گیا ع

آں سیل سبکسیرم ہر بند گسستم من

اور آج اس طوفانی، برق رفتار، عہد آفریں انقلاب کی بدولت ہمارے سامنے ایک کھلا میدان ہے جس میں ہم پوری آزادی سے گرمِ جولاں ہوں اور اُن مقامات کو طے کرنے کی کوشش کریں جن کے لئے ہم نے ایک آزاد وطن کو حاصل کرنے کی جد و جہد کی تھی۔ یہی وہ مرکزی بات ہے جو موجودہ انقلاب کو خاص اہمیت عطا کرتی ہے۔ اور باقی سب کچھ اسی نقطۂ روشن کی تفسیر ہے اور بس۔ کوئی بھی تحریک یا واقعہ ہو، اس کی روحِ رواں وہ جذبہ، شعور یا تصور ہی ہوا کرتا ہے جو اس کی تہہ میں کار فرما ہو اور جس سے باقی سب مظاہر بروئے کار آئیں۔ چنانچہ حالیہ انقلاب بھی اسی لئے اہم ہے کہ یہ صحیح معنوں میں انقلاب ہے۔ ما یغیر بقوم حتی یغیر ما بانفسھم کا مصداق۔ کیونکہ اس کی بنیاد دلی خلوص پہ ہے۔ یہ محض ایک حکومت کے بدلے دوسری حکومت نہیں اور نہ اس کی بنیاد مہم جوئی یا نشۂ اقتدار پر ہے بلکہ

یہ ملک و قوم کی حقیقی بہبود اور عوام کے مفادہی کو بہترین طور پر روبہ عمل لانے کی پرخلوص کوشش ہے۔ اور یہی درحقیقت عوام کی حکومت برائے عوام ہے، جو ریاست کے اعلیٰ ترین تصور سے پوری پوری مناسبت رکھتی ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ایسی اعلیٰ حکومت کسی ناگوار حادثے یا کسی شور و شر، کسی کشت و خون، حصولِ اقتدار کے لئے کسی رسّہ کشی اور انتخابات یا کسی اور شکل میں نہایت گراں قیمت ادا کئے بغیر ہاتھ آئی ہے۔ گویا ہمارے قدم ستاروں کی آخری منزل تک بغیر زحمتِ رفتار پہنچ گئے ہیں اور بہترین امکانات و توقعات کے ساتھ —

مولانا شبلی مرحوم نے ٹھیک کہا ہے:

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پہ ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کر دیا دم میں قوائے عملی کو بیدار

اور ہمارے انقلاب میں یہ دونوں محرکات پوری شدت سے کارفرما ہیں — اور یہ فوجی مدبّروں اور مجاہدوں کی شکل میں جذبۂ دینی ہی ہے جس نے حقیقتاً قوم کے پیکرِ افسردہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے، اور شروع سے لیکر اب تک جتنے بھی اقدامات ہوئے ہیں، وہ اسی آتشِ نہاں کے شعلے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت تھی وہ معاشرہ کی ہر اعتبار سے تطہیر تھی۔ اس کے ضمیرِ خفتہ کو بیدار کرنا تھا، اسے برائیوں کے چکر سے نجات دلانی تھی تاکہ وہ تندرست اور چست و چاق ہو کر تعمیر و ترقی کی راہ پر پوری مستعدی اور برق رفتاری کے ساتھ گامزن ہو، بالفاظِ دیگر ساری قوم کے جسم اور دل و دماغ کو زہر سے پاک کر کے ہشاش بشاش بنانا تھا تاکہ میدانِ حیات میں اس کی صلاحیتیں پوری پوری توانائی اور اثر آفرینی کا ثبوت دے سکیں۔ چنانچہ ابتدا میں ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جو اس جسمانی و دماغی قلبِ ماہیت کا باعث ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم اقدام اُن خرابیوں کا سدِّباب تھا جو سابقہ حکومتوں، مدبّروں، سیاست دانوں، ملکی جماعتوں اور قوم دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ ان پر حملہ ہائے ترکانہ ہوئے اور پے در پے ہوئے۔ اور اس طرح کہ اصلاحِ مفاسد کی کوئی صورت ناآزمودہ نہ رہی۔ خود غرض اور مفاد پرست وزارتوں اور سیاست دانوں کا قلع قمع ہوا اور نت نیا آشوب پیدا کرنے والی جماعتیں بھی مکمل طور پر ساقط ہو گئیں۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جو لازماً نئی حکومت کی استواری کا باعث ہوئی۔ ہمارے ایک جواں سال مزاح نگار کے الفاظ میں یہ سکیپ آلویب ورسس سکپر مرزا اور سکپر آلویب ورسس بیڈران ڈیڈز کا سوال تھا اور حق یہ ہے کہ ان ناموں اور اصطلاحوں سے متعلقہ عناصر کی نمائندگی کا حق پورا پورا ادا ہو جاتا ہے۔

ان بنیادی اقدامات کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک ہی معاملہ کی مختلف شقوں اور ایک ہی درخت کے شاخ و برگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بہت بڑا سوال مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا، وہ مسئلہ جو دس گیارہ سال سے مسلسل معرضِ التوا میں تھا اور بظاہر تعطل کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ اگر تھوڑا عرصہ اور گزرتا تو یہ قطعی طور پر داخل دفتر ہو جاتا۔ اور اس کے ساتھ سینکڑوں بے بس اور مصیبت زدہ پاکستانی عوام کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو جاتا اور وہ حتمی طور پر زندہ درگور ہو جاتے۔ لیکن نیا دور عوام کا دور تھا اور نئی حکومت عوام ہی کی حکومت تھی۔ اس کا مطمحِ نظر عوام ہی کی خیرخواہی تھی اور اس کے اربابِ اختیار کے ذہن میں اُنہی کا خیال مقدم تھا۔ اور دل و دماغ میں اُن ہی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ کیونکہ اگر پاکستان کے عوام آسودہ و خوش حال نہیں تو حکومتوں کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ بنیادی چیز بالآخر عوام ہی ہیں اور ان کی بہبودی۔ اگر عوام ہی نہیں ہوں گے تو ظاہر ہے حکومت کس پر کی جائے گی اور کب تک کی جائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے اسی مسئلہ سے مکمل طور پر نبٹنے کی کوشش کی گئی۔ اور حکومت کا شروع ہی سے مطمحِ نظر یہ قرار پایا کہ اس مسئلہ کو جیسے بھی ہو اس طرح حل کیا جائے کہ اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اور قوم بہمہ وجوہ مطمئن و فارغ البال ہو کر جادۂ ترقی پر گامزن ہو۔ چنانچہ اس بارہ میں بار بار ایسے قطعی اعلانات کئے گئے ہیں اور ان پر دفعتہً اس طرح عملدرآمد ہوا ہے کہ ان ارادوں کی تکمیل کے متعلق شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ حال ہی میں اعلان ہوا ہے کہ یہ مسئلہ سالِ رواں کے گذرنے سے پہلے ہی مکمل طور پر انجام پذیر ہو جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی آبادی کا دیرینہ مسئلہ بھی شامل ہے جس کو اس سے پہلے نہ تو دست گرہ کشا نے حل کرنے کا پورا ارادہ کیا اور نہ کوئی اقدامات ہی کئے۔ اگر توجہ دی بھی گئی تو بہت سرسری طور پر۔ نئی حکومت نے آتے ہی اس معاملہ کو اس طرح ہاتھ میں لیا گویا وہ اس کو طے کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اور اس طرح جیسے کسی معاملہ کو عملی طور پر

نبٹایا جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ دعادی کو مناسب حدود میں لایا جائے۔ اور اس میں مارشل لاء کے کڑے ضبط و نظم سے پورا پورا کام لیا گیا۔ جیسا کہ لازم تھا یہ حکمتِ عملی مکمل طور پر کامیاب ثابت ہوئی، اور بے شمار لوگوں نے یا تو اپنے دعادی واپس لے لئے یا مبالغہ آمیز دعاوی کی تصحیح کر دی۔ یہ مسئلہ سلجھانے کے لئے بھی مفید ہے۔ اور حکومت کا بار ہلکا کرنے کے لحاظ سے بھی کار آمد۔ اور اب اس ابتدائی کارروائی کے بعد یہ بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ حتی الوسع مارچ تک یہ معاملہ طے کر دیا جائے گا۔

ملکی اقتصاد کے لئے ایک نہایت سنگین اور تباہ کن مسئلہ ناجائز درآمد برآمد، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور اس قسم کی دیگر تخریبی کارروائیاں تھیں۔ جن کا سلسلہ علی الاعلان جاری تھا اور ستم ظریفی یہ کہ خود حکومت کے عمال و اہلکاران کے تعاون کے ساتھ جس سے ملکی معیشت کو بُری طرح گھن لگتا جا رہا تھا اس کی بنیادیں روز بروز کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اناج جو قوم کے لئے سرمایۂ حیات ہے بے تحاشا باہر بھیجا جا رہا تھا تاکہ اس پر ملک و قوم کے بیرونی دشمنوں کے مہلک جراثیم پرورش پا پا کر توانا اور دلیر ہوں۔ اس طرح وہی خطہ جو قوموں کا کھلیان کہلاتا تھا قحط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ صریحاً اگر ملک کو اس عظیم خطرے سے بچانا تھا تو اس کے لئے نہایت ہی شدید اقدام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آج اس حکمتِ عملی کا منطقی نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ حکومت کو اس محاذ پر، جو بیک وقت اندرونی بھی ہے اور بیرونی بھی، قابلِ رشک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اس کو اپنے ہی نہیں بیگانے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کو کسی چیز نے بروقت بچا لیا ہے تو وہ یہی سخت گیر اقدام ہے۔ اس نے ہماری ساکھ بھی محفوظ کر دی ہے اور دھاک بھی۔ اور آج یہ کیفیت ہے کہ ایک ذرہ کی بھی ناجائز درآمد برآمد ممکن نہیں۔ وہ تمام رخنے جن کی راہ سے ہماری قومی طاقت بہی جا رہی تھی بند ہو گئے ہیں۔ اور اناج جیسی قیمتی چیز جس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے اور جس کی اسی ناجائز برآمد کے باعث ملک میں بحرانی حالت پیدا ہو چکی تھی، اندرونِ ملک ہی محفوظ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم غذائی حیثیت سے پوری طرح مطمئن ہیں اور کسی خاص دوستانہ ہاتھ کے حاجتمند نہیں رہے۔ اس سلسلے میں جعلی راشن کارڈوں کی مہم نے بھی بہت بڑا کام کیا جس سے ہماری غذائی حالت دوہری مضبوط اور اطمینان بخش ہو گئی ہے۔

اسی محاذ کا ایک اہم پہلو دفتری نظم و نسق اور کارکردگی کو صحیح نہج پر لانا تھا یعنی دفتری نظم و ضبط کو صحیح معنوں میں موثر بنانا تھا۔ کیونکہ اسی میں رخنے ہونے کی وجہ سے قوم دشمن عناصر کو من مانی کرنے کا موقع ملتا تھا۔ بنا بریں پہلے یہ لازم تھا کہ انتظام کی کل سیدھی کی جائے۔ رشوت ستانی، بددیانتی اور نااہلی کا سدباب لوازمات سے تھا۔ یہ بات نئے دور کے لئے خصوصیت سے باعثِ افتخار ہے کہ اس نے نظم و نسق کے کل پرزے پوری طرح کس دئے ہیں اور ان میں سستی یا خرابی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

چونکہ نئی حکومت کا مدعا خود زندگی کی بنیادی اصلاح تھی اور زندگی یک جہت نہیں صد جہت ہے، اس لئے حکومت کی تدابیر اور اقدامات بھی صد جہت ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ سب جہتیں ایک ہی مرکز پر بیک وقت مجتمع ہو گئی ہیں۔ جیسے وہ خود بخود ایک پرزور بنیادی احساس اور تقاضے کے ماتحت ابھر رہی ہوں۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی اور پیچ رنگے عناصر کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ذرائع تعلیم ناکافی ہو جائیں اور نظام تعلیم بھی موجودہ ضروریات کے لئے ناکارہ ثابت ہو، کیا بلحاظ کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ تعلیم کے بغیر ذہنی بیداری کہاں تک ممکن ہے۔ پھر غلامی سے آزادی میں داخل ہونے کے بعد تعلیم کی صحیح نہج اور نوعیت کا سوال پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ یہ حالات تھے جنہوں نے تعلیم کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت عطا کر دی۔ اسی بناء پر حکومت نے پہلی بار منظم طور پر اس کو حل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا ہے۔ اور جیسا کہ لازم ہے اب اس مسئلہ کا سلجھنا تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ بعض قابلِ لحاظ اقدامات پہلے ہی ہو چکے ہیں اور تعلیم کو بہتر اور ارزاں بنانے میں کافی اثر دکھا رہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی اہمیت پریس کو بھی حاصل ہے اور موجودہ زمانہ میں اس اہم شعبہ کا جو تعلق زندگی سے ہے، اس کی بنا پر یہ اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ چنانچہ پریس کمیشن کے تقرر نے اس کے ہر ہر پہلو اور ہر مسئلہ کی چھان بین اور مناسب سفارشات کے لئے میدان صاف کر دیا ہے۔ عام، جلد، ارزاں اور حقیقی انصاف اور مستعد، کارگذار عدالتیں۔ یہ ہیں ایک اچھے معاشرہ کا ایک اور بنیادی لوازمہ۔ کوئی

معاشرہ درست طور پر نشو و نما نہیں کر سکتا جس کی بنیاد عدم مساوات پر ہو۔ ایک طرف بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اور دوسری طرف مفلوک الحال مزارع، ان کے ہوتے ہوئے دولت کی صحیح تقسیم کیسے ممکن ہے! ہمارے زمانہ میں جب تمام دنیا اس قدر وسیع انقلابات سے دوچار ہو چکی ہے، اس قسم کے غیر متوازن نظام کو برقرار رکھنا معاشرہ کو خلل پذیر ہونے اور اس میں افراتفری پیدا ہونے کی کھلی دعوت ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج ہمارے سامنے ظاہر ہو رہے تھے یہ نئی حکومت کی بالغ نظری کا بدیہی ثبوت ہے کہ یہ صورت خرابی کی، یہ بنیادی شر اُس کی نگاہوں سے پنہاں نہ رہ سکا۔ اور اس نے عنان کار سنبھالتے ہی اس پر توجہ دی اور آج یہ کارنامہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے عیاں ہے کہ پاکستان جس میں ایسے دور رس نتائج رکھنے والی زرعی اصلاحات کا وہم و گمان بھی نہ تھا، نہایت بنیادی قسم کی اصلاحات پر فخر کناں ہے۔ کہنے کو یہ تنہا صرف ایک اقدام ہے لیکن اس کے ساتھ اور اس کی تہہ میں اور کیا کچھ نہیں۔ لہٰذا یہ بجائے خود ایک بسیط مطالعہ کا مستحق ہے تاکہ اس کے مضمرات اور متعلقات کا بخوبی حق ادا کیا جائے۔

جب اس قسم کے وسیع اور تمام معاشرہ پر حاوی اقدامات پیش نظر ہوں تو ان کو لازماً ایک بہتر نظام ہی کی طرف پیشقدمی تصور کرنا چاہیئے۔ اور یہ امر وجہ مسرت ہے کہ نئے دل اور دماغ شروع ہی سے اسی منزل کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ بارہا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ بہی خواہان ملک، بہترین انسانیت دوست تصورات سے سرشار، قوم کے لئے ایک ایسا نظام حکومت تیار کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں جو اس کے لئے پوری طرح موزوں ہو۔ وہ خود صرف عارضی طور پر اس کے مدار المہام ہیں اور جونہی وہ اس منزل پر بخیر و خوبی پہنچ جائیں گے، عوام کی اپنی ہی پسند اور اس کی ضروریات کے لئے موزوں و مناسب حکومت خود بخود معرض اظہار میں آ جائے گی۔

اس انقلاب نے جو خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے اس سے زندگی کے سینے میں ایک بار پھر جوش و خروش اور ولولہ و اہتزاز پیدا ہونا لازم ہے۔ یہ وہ فضا ہے جس سے ایک نئی روح خود بخود ابھرتی ہے، حوصلے پھر بلند اور جد و جہد پھر تازہ ہوتی ہے۔ ایسی فضا ادب و فن کی جولانیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ جوش بہار ہے کہ نوازن ہیں سب طیور۔ اور بہار کی یہ روح خود صدر پاکستان کے دل میں بھی ادب و فن کی پرورش اور حوصلہ افزائی کا ولولہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکی۔ چنانچہ ایک بات جو نئے دور کو ممیز کرتی ہے وہ ایک سپاہی کے دل میں یہ لگن ہے کہ ادب کی اہمیت کو، جو زندگی کا بہرہ لازمی ہے اور ایک خاص قدرت رکھتا ہے، تسلیم کیا جائے۔ ساتھ ہی ادیبوں کی اہمیت بھی تسلیم کی جائے جو جیات کو متاثر اور مہمیز کرنے میں دسترس رکھتے ہیں۔

چنانچہ کچھ عرصہ پہلے صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں، نے ادیبوں کے لئے ایک خاص فنڈ کا اعلان کیا۔ اس سے فضا یکدم چمک اٹھی اور اہلِ ادب کو سرگرمیوں کے لئے ایک نئی روشنی نظر آئی، ان کا تخیل چمک اٹھا۔ اور وہ اپنے لئے نئے نئے دور رس امکانات کا تصور کرنے لگے۔ اس بحث و نظر اور پرواز تخیل کا نتیجہ پاکستانی ادیبوں کی پہلی عظیم الشان کنونشن کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں پہلی دفعہ ادبا کا ایک خاص منصب تسلیم کیا گیا۔ اور ایک گلڈ کا قیام عمل میں آیا جس سے ان کی حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے، فضا تخلیقی ماحول کے لئے زیادہ سازگار اور بار آور ہو جاتی ہے، وہ استحصال کے مضرات، ناساز حالات اور اقتصادی پریشانیوں سے آزاد ہو کر سرگرم کار ہو سکتے ہیں اور اپنی کاوشوں سے مادی طور پر متمتع ہونے کی توقع کر سکتے ہیں جو اُن کے مایحتاج کی کفیل ہو سکے۔ صدر پاکستان نے کنونشن کے آخری اجلاس میں شریک ہو کر پھر ادیبوں کے ترقی کوش عزائم اور رجحانات سے موافقت ظاہر کی اور ۱۰ ہزار کی گراں قدر اعانت سے ادب اور ادیبوں میں دلچسپی کا عملی ثبوت دیا۔

لہٰذا نئے دور کی فضا اہلِ ادب اور اہلِ فکر ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں ولولہ انگیز ہے۔ اب ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جو فی نفسہٖ متحرک ہے، اسلئے اس سے ہر فرد کے دل میں جنبش و حرکت پیدا ہونا لازم ہے۔

یہ فروغِ صبحگاہی اہلِ پاکستان کو پوری طرح ہنگامہ آرا ہونے کی دعوت ہے اور ہم اس نئی سحر کے ساتھ پھر نئے ذوق و شوق سے عبارت ہوتے ہیں۔
خدا کرے ہمارا یہ سفر زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو۔ ؎ تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست

★

اعجازِ سفر

محشر بدایونی

اِک قافلۂ صد شعلہ بسر
سورج کی طرح ہے گرمِ سفر

ہر موڑ نئی وسعت کا یقیں
ہر گام نئی منزل کی خبر

جس راہگذر کی سمت بڑھے
لَو دینے لگے وہ راہگذر

بس ایک ہی رُخ ہے اس کی جہت
بس ایک ہی پگ ہے اس کی ڈگر

آفاق میں چاہے کچھ بھی ہو
اس کو یونہی چلنا آٹھ پہر

آگاہ یہ خوب اس راز سے ہے
منزل ہے فقط چلنے کا ثمر

کھل جاتا ہے جب پائے جنوں
بن جاتی ہے دیوار ہی در

تہ تک کی خبر لے لیتا ہے
کشتی کا دباؤ دریا پر

شاموں میں اگر ہے رنگ اتنا
صبحوں میں ہے اتنا حسن اگر

یہ ایسے نزہت بخش چمن
یہ اتنے سایہ دار شجر

کیا یوں ہی میسّر آئے ہیں
یہ لالہ و گل یہ لعل و گُہر

روشن بھی ہوا ہے نقش کوئی
بے جذبِ نگہ، بے فیضِ اثر

اک تیز چمک تھی ذرّوں کی
جو بڑھ کے بنی عالم کی سحر

رہرو کسی حد پر بند نہیں
ہر راہ کے بعد اک راہِ دگر

ہاں شل ہو نہ یہ رفتارِ طلب
ہاں کم ہو نہ یہ پیکارِ سفر

اے دل یہ نشاں ہے منزل کا
منزل سے اسے تعبیر نہ کر

جلوے پئے دیدار اور بھی ہیں
عالم پئے اظہار اور بھی ہیں

کہانی میں مصنّف اور قاری کا رشتہ

وقار عظیم

انسان کی فطری خواہشِ اظہار ادب و فن کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ اس آرزو نے کہ انسان جو کچھ دیکھے، جو کچھ محسوس کرے، جو کچھ سوچے اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ جو کچھ کرے۔ اُس کا حال دوسروں کو سنائے، اظہار کے نت نئے روپ اختیار کئے ہیں اور یہی روپ ہیں جنھوں نے ادب و شعر کی اصناف کے گوناگوں نام پائے ہیں۔ ایک صنف اور دوسری صنف میں فرق کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنے تجربات کو جس میں اس کے مشاہدات، محسوسات، افکار اور تخیلات سب شامل ہیں، دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ اور دلکش بنانا چاہتا ہے۔ جو دل اسے اس بات پر اُکساتا اور مجبور کرتا ہے کہ دل کی بات دوسروں سے کہو، اُسی کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ بات اس طرح کہو کہ وہ سننے والے کے دل میں گھر کرلے۔ یہیں سے بات کہنے اور بات سننے والے میں ایک خاص طرح کے رشتے کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے اور اسے دل نشین بنانے کے لئے نئے اسالیب تلاش کرنے کی خواہش اور کوشش شروع ہوتی ہے۔

بات کہنے والا بات کہے اور اس نیت اور مقصد سے کہے کہ سننے والا اسے توجہ سے سنے اور اس میں دلچسپی محسوس کرے تو اسکے دل میں یہ معلوم کرنے کی بھی خواہش بھی بیدار ہوتی ہے کہ سننے والے پر اس کی بات کا کیا ردِّ عمل ہوا، اور یوں اظہار کی خواہش اور اس اظہار کا ردِّ عمل دیکھنے کی آرزو ایک ہی احساس کے دو لاینفک جز بن جاتے ہیں۔ اب اگر بات کہنے والا یہ اندازہ کرے کہ اس کی بات اس کے سامع یا مخاطب کے دل میں اپنی جگہ بنا رہی ہے تو اس کا اثر اس کے اسلوب اظہار پر پڑتا ہے اور اس کا یہ احساس مسرت کہ اس کی کہی ہوئی بات دوسروں کیلئے باعثِ کشش اور دلنشیں ہے اسکے اسلوب اظہار میں جھلکنے لگتا ہے۔ سامع یا مخاطب کا خوشگوار ردِّ عمل اس کے دل کے تاروں کو چھوتا! اور ان میں لرزش پیدا کرتا ہے۔ یہ لرزش اظہار کے اسلوب میں جھنکار پیدا کرتی ہے اور اس جھنکار کی گونج مخاطب کے دل میں اترتی ہے اور یوں نغموں کی کھنک اور جھنکار کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس میں بات کہنے والے کی کوشش کو بھی اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا سننے والے کے غیر محسوس ردِّ عمل کو۔ یہی وجہ ہے کہ تجربے کے ابلاغ یا COMMUNICATION کو ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں، ایک ہی سلسلے کے دو سرے اور ایک ہی عمل کے دو رُخ کہا گیا ہے، اور اس زنجیر کو مکمل کرنے، اس رشتے کو استوار بنانے اور اس عمل کو معنویت دینے میں بولنے اور سننے یا کہنے اور سننے والے کا برابر کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ابلاغ کے اس دو طرفہ یا دو رخی عمل کو اگر ادب کی دنیا میں آکر دیکھا اور سمجھا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ جو کچھ ادیب لکھتا ہے اُس کی تاثیر اور دل نشینی پر جہاں ایک طرف اس جذبے کی کارفرمائی ہوتی ہے یا اس تمنا کا عکس ہوتا ہے کہ کہی ہوئی بات دوسرے کے دل میں گھر کرے، وہاں دوسری طرف قاری کے دل کی اُس کیفیت کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے جو ادیب کی بات پڑھ کر اس کے سینے میں بیدار ہوئی ہے، اور یوں گویا ادب کی تخلیق میں ایک کا عمل اور دوسرے کا ردِّ عمل ایک دوسرے کے ہم عناں و ہم سفر رہتے ہیں۔ اور عمل اور ردِّ عمل کا یہ سلسلہ ایک ہی جگہ ٹھہر کر نہیں رہ جاتا بلکہ برابر دونوں طرف اپنا اثر ڈالتا اور دلوں کی کیفیت میں مدّ و جزر کا سماں پیدا کرتا رہتا ہے۔ ابلاغ کے عمل کی دو رخی کیفیت یوں تو ادب کی ہر صنف میں کسی نہ کسی انداز سے نظر آتی ہے لیکن افسانوی ادب یا کہانی میں بدیہی اسباب کی بنا پر یہ کیفیت زیادہ ابھرتی اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور کہانی اور اس کے فن کا تجزیہ کرنے والا بڑی شدّت سے یہ بات محسوس کرتا ہے کہ مصنف اور قاری کے رشتے کی یہ اہمیت کہانی میں جتنی واضح اور ناگزیر ہے، ادب کے دوسرے اصناف میں نہیں —— اور اس سلسلے میں جب کیوں اور کیسے کا جواب سامنے آتا ہے تو فن کے بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جن کی دل آویزی اور اثر انگیزی مسلّم ہے۔

مصنّف کے تجربے کا اظہار اور ابلاغ جیسا کہ ظاہر ہے یک طرفہ اور یک جہتی عمل نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کا نقطۂ آغاز قاری نہیں بلکہ مصنّف ہے۔ البتہ مصنّف اس رشتے کا آغاز کرتے ہوئے جس حد تک اس بات کا خیال رکھے گا کہ اُسے اپنے قاری کی توجہ کو اسیر کرنا ہے اسی حد تک یہ رشتہ استوار اور بامعنی بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کی ادبی تخلیق میں عموماً اور کہانی کی تخلیق میں خصوصاً مصنّف کو بعض آداب برتنے پڑتے ہیں۔ کہانی کے مصنّف کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ

قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے اور اس طرح متوجہ کرے کہ قاری اس توجہ کو اپنے وقت کا بہترین مصرف سمجھ کر کم از کم تھوڑی دیر کے لئے کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہونے کی طرف مائل نہ ہو۔ قاری کو اپنی کہانی کی طرف متوجہ کر لینے کے بعد افسانہ گو (اس میں ناول نگار، افسانہ نگار اور داستان سرا سب شامل ہیں) کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاری کی توجہ کو قائم رکھے اور اس کوشش میں کامیابی کے لئے وہ کہانی میں کوئی ایسی صورت پیدا کرتا ہے کہ جس سے قاری کا جذبۂ تحیّر ابھرتا ہے۔ اس جذبۂ تحیّر کو ابھار کر اسے قائم رکھنا اور اسے شوق و اشتیاق کی صورت دینا افسانہ نگار کے کام کا تیسرا مرحلہ اور اس کے آدابِ فن کا تیسرا جزو ہے۔ قاری کا یہی احساسِ تحیّر، جو شوق، انتظار، بے یقینی، تذبذب اور امید و بیم کی ملی جلی کیفیتوں کی صورت اختیار کرتا رہتا ہے، اس کی مسرت کی بنیاد اور مدار ہے۔ گویا مجموعی حیثیت سے افسانہ گو کا مقصود وسائے یا قاری کے لئے لطف و مسرت کا ایک ایسا سامان مہیا و فراہم کرنا ہے جو اسے تھوڑی دیر کے لئے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز سے بے تعلق کر کے صرف کہانی کی فضا میں گم کر دے۔ قاری کی یہی گم گشتگی افسانہ گو کی سب سے بڑی کامیابی اور اس کے آدابِ فن کی پیروی و پابندی کا انعام ہے۔

کہانی کہنے اور کہانی سننے کے اس دوگونہ اور دو رخے عمل میں ظاہر ہے کہ مصنف کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ قاری پر ایک خاص طرح کا ردِّ عمل پیدا کرنے، اس ردِّ عمل کی نوعیت ہمیشہ ایک سی نہیں ہوتی اور اس میں شبہ نہیں کہ ردِّ عمل کی نوعیت کا یہ فرق مصنف کے تخلیقی عمل کی نوعیت میں بھی فرق پیدا کرتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قاری کے ردِّ عمل میں مجموعی حیثیت سے قاری کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ اس خاموش ردِّ عمل میں اس کی حیثیت وہ فعالی حیثیت نہیں ہوتی جو افسانہ گو یا افسانہ نگار کی ہے۔ وہ متوجہ ہوتا ہے، اس میں تحیّر، استعجاب، اشتیاق، تذبذب، امید، بیم اور ان سب کے مجموعی اثر سے بہجت و مسرت کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کے لئے اسے کوئی ارادی کوشش نہیں کرنی پڑتی اور اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف اور قاری کے بدیہی، لابدی اور ناگزیر رشتے میں اُس کے وجود کی حیثیت اہم ہونے کے باوجود بظاہر ثانوی اور فرعی ہے۔ اصل حیثیت مصنف کی ہے جو ولکی کولنز (WILKIE COLLINS) کے الفاظ میں "انھیں ہنساتا، انھیں رُلاتا اور اُنھیں انتظار اور تذبذب میں رکھتا ہے"*۔

افسانہ گوئی اور داستان سرائی کی ہزاروں برس کی تاریخ شاہد ہے کہ کہانی کہنے والوں نے ہمیشہ قاری کی اس ثانوی اور غیر فعالی حیثیت کو غلط معنی پہنا کر اپنے وجود اور شخصیت کو اس کے وجود اور شخصیت پر غالب کرنے اور حاوی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے آپ کو ایک بلند تر سطح پر متمکن کر کے قاری پر غرابت، اجنبیت، بے تیاری اور تحقیر کی نظر ڈالی ہے۔ اپنے آپ کو فہم و ذکا اور ذہانت اور فطانت کا امین اور سرمایہ دار جان کر اُسے کم فہمی بلکہ نافہمی کا مقام عطا کیا ہے۔ اس سے دوستانہ اور مشفقانہ مراسم قائم کرنے کے بجائے اُس کے معاملات میں واعظ و ناصح بلکہ محتسب بننے کو اپنا منصب خاص سمجھا ہے اور بعض اوقات اپنے فن کو وہ آداب برتتے ہوئے بھی جن میں قاری کی فطرت کے بعض تقاضوں کا پیشِ نظر رکھنا لازمی ہے، توازن و اعتدال کے حدود باقی نہیں رکھے ہیں اور قاری کے دل میں پیدا ہونے والے تذبذب اور شوق سے اتنا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے کہ مصنف کا عمل قاری کے لئے مسرت کے بجائے اذیت اور فرحت و شگفتگی کے بجائے تکدر و انقباض کا سبب بن گیا ہے۔ کبھی کبھی قاری کے ان معصوم اور فطری میلانات سے مصنف اس حد تک ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی فریب کاری آشکار ہو جاتی ہے اور قاری اس مسرت و لطف سے یکسر محروم ہو جاتا ہے جس کی آرزو اور جس کے حصول کا یقین اسے کہانی کی طرف لاتا ہے۔

ہزاروں سال کی قصہ گوئی اور داستان سرائی میں مصنف کے رویّے کے ایک خاص پہلو کی یہ تصویر نہ دلکش ہے، نہ خوش آیند۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہانی کہنے والوں نے کہانی کہتے وقت اپنے اور قاری کے رشتے کو صرف اسی ایک انداز سے نہیں دیکھا۔ ان کا ایک عام انداز یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے قاری کے مزاج کی بعض خصوصیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر محض ان کی خوشنودی کو اپنا مقصودِ آخر سمجھنے کی غلطی کی ہے اور اس طرح فن کی بارگاہ میں ایک ناقابلِ معافی مجرم ٹھہرے ہیں۔ ایک نقّاد کا قول ہے کہ محض کسی روایت کی تقلید اور پیروی اور کسی خاص حلقے کے قاری کی خوشنودی کا خیال فن کا آخری مطمحِ نظر نہیں۔ جن مصنفوں نے بدنامی یا ناپسندیدگی کے خوف یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے اپنے فن کو ان کی پسند اور مرضی کے سانچوں میں ڈھالا ہے، وہ اپنے فن کے دشمن ہیں۔ انھوں نے اس کے ساتھ بے وفائی برتی اور غدّاری کی ہے۔ اور اس طرح کی بے وفائی اور غدّاری قصہ گوئی کی صنف کی تاریخ میں کسی اور صنف کی تاریخ کے مقابلے میں یقیناً زیادہ واضح اور زیادہ عام ہے۔

---

* "MAKE THEM LAUGH; MAKE THEM CRY; MAKE THEM WAIT."

مصنف اور قاری کے باہمی رشتے کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ مصنف قاری کو ایک مشترک فنی عمل اور تجربے میں برابر کا شریک سمجھے اور اسے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اپنا ہمسر سمجھ کر اسے بغیر کسی تکلّف اور حجاب کے اپنے تجربے میں شریک کرے۔ مصنف یہ نہ سمجھے کہ جو کہانی وہ سامع یا قاری کو سنا رہا ہے یا پڑھنے کو دے رہا ہے اس میں صرف سامع یا قاری کا فائدہ ہے، وہ صرف اُس کی دلچسپی، لطف اور انبساط کا سرمایہ ہے یا وہ صرف اسی کی اصلاح اور وسعتِ قلب و نظر کا سامان مہیا کرتی ہے، یہ سمجھنے کے بجائے کہ قاری اُس کا محتاج ہے، اسے یہ سوچنا چاہیئے کہ جس طرح اس نے قاری کی دلچسپی، انبساط، اصلاح، تعلیم، تربیت کی خاطر ایک فن پارے کی تخلیق کی ہے اور اس کے شوقِ خوابیدہ کو بیدار کر کے لئے تخئیل و تصوّر کے ایک جہانِ دیگر کی سیر کرائی ہے۔ اسی طرح قاری نے اُس کی کہانی شوق، دلچسپی انہماک اور توجہ سے سُن کر اس کی معنویت بڑھائی اور اس کے تجربے کو زندگی بخشی ہے ——— اور جس طرح قاری اپنے شوق کی تسکین کے لئے افسانہ گو کا محتاج ہے، اسی طرح افسانہ گو بھی قاری کا محتاج ہے کہ قاری کے وجود، اور اس کے واضح اور فعّال تعاون کے بغیر نہ اس کی فطری خواہشِ اظہار کو تسکین ملتی ہے اور نہ اظہار کے اسالیب میں رنگینی اور دل نشینی پیدا ہوتی ہے۔

کہانی کہنے، کہانی سنانے اور کہانی لکھنے کے فن میں جس طرح لکھنے والوں نے قاری کو ایک کمتر درجے کی مخلوق سمجھ کر اس کے ساتھ بزرگانہ، مربیانہ اور سرپرستانہ سلوک کیا ہے، اُسی طرح قصہ گوئی کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے لکھنے والے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے قاری کی ذہانت، اس کی خوش ذوقی اور اس کی تصوّر آفرینی کو ایک مسلمہ حقیقت جان کر انہیں پوری بے تکلفی اور خلوص سے اپنے تجربے کا شریک بنایا ہے اور اُس سے فنی تخلیق کے عمل میں یوں تعاون طلب اور حاصل کیا ہے جیسے ضرورت مند وہ ہیں، قاری نہیں، کسی فن پارے کی تخلیق اس کا نہیں خود قاری کا کارنامہ ہے۔

قاری کے متعلق افسانہ نگار کے یہ گوناگوں اور بعض حیثیتوں سے متضاد تصورات ہر زمانے میں عام رہے ہیں اور ہر زمانے میں ان تصوّرات اور ان کے پیدا کئے ہوئے رشتے کی نوعیت کہانی کے فن کو متاثر کرتی رہی ہے ——— اور یہ اثر رشتے کی نوعیت کے اعتبار سے اچھا بھی ہے اور بُرا بھی۔ انگریزی قصہ گوئیں نے اپنے قاری کو ہمسری کا مقام نہ دے کر بعض اوقات اپنے فن کو کس طرح نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں بعض بہت معروف لکھنے والوں کے یہاں ملتی ہیں۔ مشہور انگریز قصہ گو کپلنگ (KIPLING) جو ایک سفاکانہ اور غیر ہمدردانہ طبقاتی نظام کا پروردہ اور اس کے تحکمانہ انداز کا خوگر اور شیدائی تھا اپنے لہجے کو اس تحکم سے محفوظ نہیں رکھ سکا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس تصوّر کو اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ اور اس کے قاری ایک ہی سطح کے افراد ہیں۔ وہ ایک حاکمانہ بلندی پر بیٹھ کر اپنے تجربات کچھ لوگوں کو سناتا ہے اور ایسے لہجے اور انداز میں سناتا ہے جو ایک حاکم، بلکہ استبداد پسند حاکم اپنے محکوم کے سامنے کے لئے روا رکھتا ہے۔ وہ قاری سے جو کچھ کہتا ہے، چاہتا ہے کہ قاری جبراً و قہراً اسے سنے۔ کپلنگ، کہانی کسی نکتے کی وضاحت یا جس فلسفۂ حیات کے اظہار کے لئے لکھتا ہے، اور اسے اسی تحکمانہ انداز سے منوانا چاہتا ہے، جس کا استعمال اس کا سا فلسفۂ حیات رکھنے والے انسان کے لئے ناگزیر ہے۔ وہ کہانی پڑھنے والے کو نتائج اخذ کرنے کا موقع نہیں دیتا ——— وہ اس کے لئے خود نتیجے اخذ کرتا اور انہیں بار بار دُہرا کر قاری کے ذہن پر نقش کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح قاری کے ذہن پر جو چوٹ لگتی ہے اور اس کے دل میں جو زخم پڑتے ہیں، ان سے وہ قطعی بے خبر ہے اور شاید باخبر ہوتا بھی تو اسے اہمیت نہ دیتا۔ اس سے بالکل مختلف اسباب کی بنا پر، یعنی مصلحانہ جوش کی شدّت کے تاثر سے نذیر احمد بھی اپنے قاری کے ساتھ عموماً اسی طرح کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ اُن کا یقین کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ اُن کا قاری ان کی کہی ہوئی باتوں سے خود ہی موزوں نتیجے نکال سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بات بار بار دُہراتے اور ایسے انداز سے دہراتے ہیں جیسے اُن کا مخاطب کند ذہن بھی ہے اور نافہم بھی۔ چنانچہ اُن کی یہ تکرار، کپلنگ کی کہانیوں کی تکرار کی طرح پڑھنے والوں پر بار گزرتی ہے، اور اُن کا ردِّ عمل عموماً مخاصمانہ ہوتا ہے، جو ظاہر ہے کہ فن کا سراسر زیاں ہے۔

ڈی۔ ایچ۔ لارنس موجودہ عہد کے ان چند ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے جنہوں نے ان دونوں اصناف کے فن کو ہدایت دی ہے۔ لیکن اُن کی وسعت نظر، قوت، زور، جوش اور غیر فانی مصوّری کی خصوصیات پر اس کے مزاج کی بعض کیفیتیں اس طرح چھا گئی ہیں کہ نقاد کبھی کبھی اس کے ناولوں کے مستقبل کو (یہ بات افسانوں پر صادق نہیں آتی) مشتبہ نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لارنس کا ایک مخصوص فلسفۂ حیات ہے (جیسا کہ ہر فن کار کا ہوتا ہے) اور اپنے ناولوں کو اس نے اس فلسفے کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تبلیغی رویّہ اختیار کرنے سے پہلے اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جن لوگوں میں وہ اپنے اس فلسفے کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے، وہ فکری اور تخئیلی اعتبار سے اس سطح تک نہیں پہنچے جو اس کی اپنی سطح ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں ایک

مبلغ اور مصلح کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے تو مبلغوں اور مصلحوں سے زیادہ فلسفیوں کی سی باتیں کرتا ہے اور جب اُسے خود بخود شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی باتیں توجہ سے نہیں سنی جارہی ہیں اور ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھا جارہا ہے تو اسے غصہ آجاتا ہے اور اپنی بات چیخ چلا کر اور گلا پھاڑ کر کہنا شروع کرتا ہے اور اس کے باوجود اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بات تاثیر سے خالی رہی تو وہ قاری کو دھکے دیکر اپنی آنکھوں کے سامنے دور ہٹا دیتا ہے۔ اس طرح اپنے آپے سے باہر ہو جانیوالے لارنس نے کبھی کبھی اپنے قاری کے دل میں یہ یقین پیدا کیا ہے کہ دیدہ و دانستہ اُس کی اہانت کی جارہی ہے اور اس یقین کے بعد کہی ہوئی بات یا کہانی کا جو حشر ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ ایسی تخلیق کا انجام سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ بے بسی اور بے کسی اُسے ابدی نیند سُلا دے۔

اس طرح کی ایک اور نمایاں مثال ایچ۔ جی۔ ویلز کی ہے، جہاں ناول نگار نے اُس تحقیر اور خود سری کا مظاہرہ تو نہیں کیا جو کپلنگ اور لارنس کی تخلیقات میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن قاری کی ایک فطری کمزوری سے یقیناً ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی عظیم کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے زندگی کے بے شمار محالات و ناممکنات کو ممکن کی سطح پر لاکر پڑھنے والوں کے لئے قابلِ یقین اور قابلِ قبول بنایا ہے۔ اس کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے فن کا انحصار قاری کی تحیر پسند اور حیرت پرست فطرت پر ہے۔ اس کے تخیل کی بے پایاں قوت نے قاری کی اس فطرت کے ساتھ ہر طرح کے کھیل کھیلے ہیں۔ اسے ابھارا ہے، اسے دبایا ہے، اسے مہمیز دی ہے، اسے حسب دلخواہ جس مرحلے پر چاہا ہے آگے بڑھنے سے روکا ہے، اسے گدگدایا ہے، اس کے چٹکیاں لی ہیں، اسے ہنسا ہنسا کر رُلایا اور رُلا رُلا کر ہنسایا ہے، اس پر کاری ضربیں لگائی ہیں، اس پر خنک مرہم رکھے ہیں، اور جب چاہا ہے اس سے ناممکن کو ممکن بنا دینے کی خدمت لی ہے —— یہ سب کچھ اس کی عظمت کی نشانیاں ہیں لیکن جذبۂ تحیر کو اس عظیم فن کار نے کبھی کبھی اتنا عاجز اور پست کیا ہے کہ اُس کی فن کارانہ بازی گری کے سامنے اس کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہی، وہ ایک بے جان کٹھ پتلی ہے کہ اسے حسب دلخواہ تخیل کے تاروں پر ادھر سے اُدھر نچایا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی کسی نہ کسی انداز میں اپنی قوتوں کے مقابلے میں قاری کی صلاحیتوں کو بے حقیقت اور حقیر سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اب دو مثالیں اور —— چیخوف اور موپساں جس طرح اب سے ستر اسی برس پہلے کہانی کے شیدائیوں کے محبوب تھے، اُسی طرح اب بھی ہیں اور اُن کی یہ محبوبی مستقبل میں بھی یقینی ہے اس لئے کہ ان دونوں نے اپنی افسانہ گوئی کی بنیاد مصنف اور قاری کے اُس رشتے پر رکھی ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کو محبوب بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے نزدیک معزز و محترم بھی۔ چیخوف اور موپساں، دونوں نے قاری کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اُس کے ساتھ کسی طرح کی شعبدہ گری اور طلسم کاری سے کام نہیں لیا۔ ان کی کہانیوں کا موضوع زندگی اور اس کے حقائق ہیں۔ وہ حقیقت کو جس رنگ، روپ میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اسی رنگ روپ میں اس پر کسی طرح کا پردہ ڈالے بغیر یا اسے کسی سانچے میں ڈھالے بغیر فن کار کی طرح قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ چیخوف اور موپساں ایک ایسی حقیقت اور صداقت کے مصور اور مفسر ہیں جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتی، امتدادِ زمانہ سے اس میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ چیخوف اور موپساں دونوں اس صداقت کی مصوری کو اپنا مطمحِ نظر اسی لئے بناتے ہیں کہ اُن میں سے کوئی اپنے قاری کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بعض دوسرے لکھنے والوں کی طرح وہ قاری کو احمق سمجھ کر اس کی آنکھوں پر پردے نہیں ڈالنا چاہتے۔ دونوں کی نظر میں ان کے قاری میں اتنی ذہانت، ذکاوت اور تصور آفرینی ہے کہ ان کی کہی ہوئی ادھوری بات کو پورا کرکے اس سے وہی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں جو افسانہ نگاروں کا مقصود ہیں۔ گو اس معاملے میں موپساں اور چیخوف میں مدارج کا فرق ہے۔

اپنے معاشرے کے افراد کے متعلق موپساں کی رائے مجموعی حیثیت سے کچھ بلند نہیں، اس لئے وہ اپنے افسانے کے قاری کو بھی ذہانت کا بلند مقام نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں بات بلا واسطے وسیلے کے زیادہ سیدھے سادے انداز میں کہی جاتی ہے، اس کی منطق زیادہ واضح اور مربوط ہوتی ہے: اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں رنگوں کی جگہ خالی نہیں چھوڑی جاتی، اور عموماً سبب اور نتیجے کا تعلق پیچ دار نہیں ہوتا۔ چیخوف کے دل میں اپنے قاری کی طرف سے اس طرح کی کسی بدگمانی کی گنجائش نہیں۔ اسے یقین ہے کہ وہ اس کے بنائے ہوئے خاکوں میں خالی جگہوں کو پُر کرنے اور اس کی بنائی ہوئی ادھوری تصویروں میں رنگ بھر لینے کے اہل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیانیہ مصوری کی بنیاد عموماً رمز اور تصور آفرینی پر رکھی جاتی ہے۔

بعض اوقات چیخوف کے افسانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "ان میں کچھ واقع نہیں ہوتا" —— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نازک افسانوں میں جو کچھ واقع ہوتا ہے یا جو کچھ پیش آتا ہے، وہ صفحۂ قرطاس کی قیدوں یا ایک محدود منظر کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ واقعات پیش آتے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن ایک واضح اشارہ ان کے وجود کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی ختم ہو جاتی ہے اور واقعہ برابر جاری رہتا ہے۔ کسی قاری کو اگر یہ واقعہ ہوتا ہوا نظر نہ آئے،

تو حقیقت میں یہ اُس کی نظر، اس کے تصور اور اس کی بصیرت کی کوتاہی ہے جس ذہانت اور تصور آفرینی کی توقع چیخوف اپنے قاری سے رکھتا ہے، وہ اگر اس میں موجود ہو تو اس کی آنکھیں ایک ایسا منظر دیکھ سکتی ہیں جس میں وسعت بھی ہے، وہ گہرائی بھی، رنگینی بھی ہے اور تاثیر بھی۔ چیخوف اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں خطوط اور رنگوں کے جو خالی مقامات چھوڑ دیتا ہے ان میں ہر طرح کے قاری کے لئے یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے تصور، تخئیل اور ذہانت کے مطابق اس کی تکمیل کرے۔ گویا چیخوف کی نظر انسانی ذہن و ذکاوت کی بے پایاں صلاحیتوں پر ہے اور انھیں صلاحیتوں کے احترام اور تقدس نے اسے رمز و کنایہ اور تصور اور احساس کا فن سکھایا ہے چیخوف کی کہانی پڑھ کر ہمارے سامنے کردار کا جو نقش ابھرتا ہے وہ کسی ایک خاص معاشرے کے فرد کا نہیں بلکہ عالمگیر انسانی برادری کی سیرت اور شخصیت کا نقش ہوتا ہے۔ کہانی میں کرداروں کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے ہمارے دلوں میں صرف اُسی کا گداز نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی ہمارے دل اُس تصور سے پگھلتے ہیں جو کہانی ختم ہونے کے بعد کرداروں پر گزرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح چیخوف کے دل میں انسان کی صلاحیتوں کا جو احترام ہے اُس نے کہانی کے ایک ایسے فن کی تخلیق کی ہے جس میں قاری کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ غیر سنجیدہ اور سطحی قاری اس فن پر ہنسیں لیکن جن میں چیخوف کے جذباتی گداز اور روحانی عظمت کا ساتھ دینے یا اس سے تعاون کرنے کی صلاحیت ہے وہ اسے انسانیت کے مستقبل کا فن سمجھیں گے۔

دنیا کے ان چند ہمیشہ زندہ رہنے والے قصہ گویوں کی مثالیں اس حقیقت کی طرف زیادہ واضح اشارہ کر رہی ہیں کہ کہانی کے مصنّف اور قاری کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جسے نہ کبھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی طرف سے غفلت برتی جاسکتی ہے۔ اس رشتے کی نوعیت گو ہمیشہ ایک سی رہتی ہے لیکن اس کا وجود کہانی کے وجود کا ایک ناگزیر عنصر ہے اور یہ ناگزیر عنصر اپنی نوعیت کے اعتبار سے کہانی کے فن کی نوعیت میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ اور ہر زمانے میں کامیاب افسانہ نگار وہی ہوئے ہیں اور شہرت اور قبول کا اعزاز اور پائندگی و دوام کا شرف انہیں کے حصے میں آیا ہے جنھوں نے اپنے قاری کو محبوب اور محترم جانا ہے اور اسے تحقیر کی نظر سے دیکھ کر اس کے جذبات کے ساتھ شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ہے۔ قاری کو فریب میں مبتلا رکھنے والے قصہ گو، اسے الجھن اور پیچیدگی میں پھنسانے والے داستان سرا، اس کے جذبۂ تحیر اور ذوق و شوق کو اپنا کھلونا بنانے والے شعبدہ باز نہ کہانی کے فن کے صحیح مظہر ہیں اور نہ اس کی روایات کے حقیقی پاسبان۔ اُن کی راہ حلِ فن کی راہ نہیں، اس لئے کہ ان کی نظر نے اُس کہانی کہنے اور کہانی سننے والے کے اس رشتے کی طرف سے آنکھیں بند کی ہیں جو فطرت کے قوانین کا پیدا کیا ہوا ہے۔

کہانی کے مصنّف اور اس کے قاری کے رشتے کی اہمیت کی بنیاد چونکہ کہنے اور سننے والے کے فطری تقاضوں اور ان تقاضوں کے اشتراک پر ہے اس لئے اس کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے لیکن زندگی کے موجودہ دور میں کہ انسانی فطرت اور اس کی نفسیاتی نزاکتوں کا علم بہت عام ہو گیا ہے اس کی اہمیت اور اس اہمیت کے احساس میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

BATES نے افسانہ نگاری کے جدید رُجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنّف اور قاری کے رشتے کے سلسلے میں بعض نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"اب سے ایک صدی سے قاری کو کمتر اور حقیر سمجھنے کا کھیل کھیلا جاسکتا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا (خصوصیت سے مختصر افسانے میں)۔ عام قاری کی سطح اب خاصی بلند ہو گئی ہے۔ تعلیم، سفر، وسیع تر معاشری روابط، لباس، رہن سہن اور مذاق میں حد درجے کی یکسانی نے ان بے شمار چیزوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر رکھ دیا ہے، جو ایک صدی پہلے ہم سے بہت دور تھیں اور اس لئے اُن کا صحیح تصور کرنے کے لئے ہم تفصیلی بیانات کے محتاج تھے۔ مصنّف اور قاری دونوں تفصیلات کی روح فرسا محتاجی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اب صرف اشارے کنائے کافی ہیں۔"

کہانی کے مصنّف اور قاری کے رشتے کا یہ حقیقت پسندانہ تصور ان افسانوں اور ناولوں کے مطالعے کا پیدا کیا ہوا ہے جس میں مصنّف عہدِ حاضر کے علمی، استقرائی، تجربی اور نفسیاتی رجحانات سے متاثر نظر آتا ہے۔ جدید سائنٹفک نظریات اور جمہوری ماحول نے ایک طرف تو قاری کے تجربات میں وسعت پیدا کی ہے اور دوسری طرف اسے اپنے گرد و پیش کی زندگی پر غور و فکر اور تجزیئے اور تنقید کی نظر ڈالنے کا عادی بنایا اور ان پر اظہارِ خیال کی آزادی دی ہے۔ یہی ذہنی کیفیت مصنّف کی بھی ہے اور اس لئے ہمارے ناولوں اور افسانوں میں مشاہدے اور غور و فکر کی روح، تفصیلات اور جزئیات کی تلاش کا جذبہ، خارجی مشاہدات اور داخلی کیفیات کی موشگافی اور تجزیئے کا رجحان اور بے باکانہ تنقید کی جرأت کا میلان چھایا ہوا نظر آتا ہے، اور افسانوی ادب میں مصنّف اور قاری دونوں پوری طرح ہم آہنگ ہو کر زندگی کی تفسیر اور تنقید کا حق ادا کر رہے ہیں لیکن مصنّف اور قاری کے تجربات کی یکسانی، ہم آہنگی اور اشتراک نے ہمیشہ طوالت کے بجائے اختصار، اور تفصیل و تشریح کے بجائے اشارے، کنائے اور تصور آفرینی کی صورت اختیار کی ہے۔ موجودہ عہد کے ایک اور معروف ناول نگار

ہمنگوے نے ناول نگار اور قاری کے مشترک تجربات، احساسات اور افکار و تخیلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناول نگار اپنے گوناگوں تجربات کے اندوختہ سرمائے سے، اپنے علم سے، اپنے تصور اور تخیل سے اور اپنے احساس سے اور ان سب کے اجتماع اور امتزاج سے واقعات اور کردار تخلیق اور تعمیر کرتا ہے اور ان میں ایک فن کارانہ ترتیب پیدا کرتا ہے، اور قاری کا مشترک تجربہ، تخیل، احساس اور فکر ناول نگار کی تخلیق کی ہوئی زندگی کو اس تخلیق اور تعمیر کو قاری کی زندگی بنا دیتا ہے ــــــ ہمنگوے نے مصنف اور قاری کے تجربے کے اس مشترک سرمائے کی بنیاد پر اپنی ناول نگاری کے لئے جو فن وضع کیا ہے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس فن کے اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ بعض باتیں لکھے بغیر بھی قاری کے ذہن اور قلب میں جاگزیں کر دیتا ہے۔ اس کا لکھا ہوا ایک جملہ بیک وقت کئی باتیں کہتا اور بتاتا ہے، اور تفصیلات کے پیچیدہ اور طویل عمل میں اُلجھے بغیر وہ پڑھنے والے کے سامنے ایک ایسی فضا قائم کر دیتا ہے، جس میں آنکھوں کو ایک منظر کی واضح تصویر بھی نظر آتی ہے اور دل کو ایک شدید احساس اور جذبے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہمنگوے نے اپنے معتدل اور منضبط فن کے ذریعے ناول نگار کو فنی نظم و ضبط کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ عہد میں مصنف اور قاری کے تجربات کے ناگزیر اشتراک کا نتیجہ ہے۔ اپنے مشاہدات میں سے غیر ضروری تفصیلات کو خارج کرنا، جذبات کو ابھارنے کے لئے مبالغہ آرائی سے کام نہ لینا، اور محض حسنِ ذوق اور حسنِ نظر کی تسکین کے لئے ادبی اور شاعرانہ بیانات، فنی شعبدہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے استعمال سے اجتناب اور احتراز کرنا اُس کے فنی ضبطِ نفس کے لوازم ہیں۔ اپنے فن کے متعلق اُس کے مندرجہ ذیل الفاظ کو افسانوی فن کی موجودہ روش کی رُوح کہا جا سکتا ہے:-

"افسانہ نگار جس چیز کے متعلق لکھ رہا ہے اگر اسے اس کا صحیح علم اور واقفیت ہے تو وہ آسانی سے ایسی چیزوں کو ترک کر سکتا ہے جو اس کے اور قاری کے تجربات میں مشترک ہیں۔ اگر افسانہ نگار نے لکھتے وقت صداقت اور خلوص سے کام لیا ہے تو یقین ہے کہ قاری بھی انہیں اسی شدت سے محسوس کرے گا جس شدت سے مصنف محسوس کرتا ہے، خواہ مصنف انہیں بیان کرے یا نہ کرے۔"

ہمنگوے نے اپنے نظریات اور ان نظریات پر عمل کر کے جو پُر حیات اور مؤثر ناول لکھے، وہ لکھنے والوں کی نئی نسل کا صحیفۂ فنی بن گئے، اس لئے کہ انھوں نے ان اصول کی پیروی میں موجودہ عہد کے قاری کے دل کی دھڑکن بھی سنائی دی اور اس کے فکر و تخیل کا وہ عکس بھی نظر آیا جس نے مصنف اور قاری کو ایک ہی ذہن پر لا کر کھڑا کیا اور ایک مشترک فنی تجربے اور عمل کے دو ایسے عناصر بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے پابند بھی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور باہمی اثر پذیری اور اثر اندازی نے افسانے اور ناول کے فن کو ایک نیا مفہوم دیا ہے، ایک نئے معنی سے آشنا کیا ہے۔

کہانی کے اس نئے فن میں مصنف کا کام یہ ہے کہ وہ ماحول اور انسان کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کا دقت نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کرے، اپنے مواد پر پوری غور و فکر صرف کرے، غور و فکر میں تخیل کی رنگ آمیزی سے مشاہدے، مطالعے اور فکر کی پیدا کی ہوئی حقیقت سے ایک نئی حقیقت کی تخلیق کرے، اور نفسیاتی تجزیے اور فنی حسنِ انتخاب کی منزلوں سے گزر کر قاری کے سامنے زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جس کے خطوط مُبہم اور غیر واضح اور جس کے رنگ ہلکے اور غیر مرئی ہونے کے باوجود اتنے واضح اور شوخ ہوتے ہیں کہ قاری ان کی مدد سے ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے جس کا ہر نقش اُبھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر رنگ اپنے اپنے محل کے اعتبار سے موزوں، متناسب اور متوازن۔ موجودہ دور کی کہانی کا فن صرف مصنف کی ذات پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس سے بھی بہت آگے قاری کی ذات پر جا کر اُس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس فن میں مصنف کی ذات یا اس کی ادبی اور شاعرانہ موشگافی قاری کی نظر اور اُس کے موضوع کے درمیان حائل نہیں ہوتی۔ مصنف کہانی میں زندگی کی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اُس کی تصویر کشی اور تفسیر کرتا ہے اور اس مصوری اور تفسیر میں اشاروں کنایوں سے رموز و علامات سے، بالواسطہ بیان اور عمل سے کام لیتا ہے۔ اس کے واقعات کہانی کی بندشوں میں ختم ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ اس کے ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں، اُس کے کردار کہانی میں جو کچھ کرتے دکھائے گئے ہیں، اس سے بھی زیادہ وہ کہانی کی چہار دیواری سے باہر نکل کر کرتے نظر آتے ہیں، اور کہانی کی حد بندی کو توڑ کر واقعات اور کرداروں کا یوں ایک وسیع تر ماحول کی تخلیق کرنا صرف اس لئے ممکن ہے کہ قاری کی ذہانت، اس کے وسیع تر تجربات، اس کی فکری اور تخیلی صلاحیتوں، اس کی نظر کی پردہ دری اور دروں بینی نے قاری کو محض قاری نہیں رکھا۔ وہ ایک وسیع تر مفہوم میں خود کہانی کا خالق ہے اور کہانی کے فنی تخلیقی عمل میں مصنف کے ساتھ اس درجہ وابستہ ہے اور اس کے فن پر اس حیرت انگیز حد تک اثر انداز ہے کہ قاری کی حیثیت سے بڑھ کر اس نے خالق کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اور تخلیق میں مصنف اور قاری کے اس مکمل اشتراک نے افسانے کے فن کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

چند اگلی صحبتیں

جوش ملیح آبادی

لکھنؤ کی اگلی صحبتوں کی یادیں جو میرے ذہن میں ابھرتی ہیں ان میں کئی جھلکیاں دوسروں کو دکھانے کے لائق ہیں ان چند سے میں آپ کا بھی غائبانہ تعارف کراتا ہوں:-

مثلاً ایک شاعر تھے منشی واحد علی صاحب ابرؔ قدوائی۔ جو نواب صاحب رامپور کے یہاں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ بہت وجیہہ اور رئیسانہ مزاج کے بزرگ اور میرے والد کے احباب میں سے تھے۔ ابرؔ صاحب کے بھائی منشی احمد علی صاحب شوقؔ انھیں کے پاس رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار رام پور میں جبکہ میں وہاں گیا ہوا تھا۔ ابرؔ صاحب نے مجھے رات کے کھانے پر بڑی بزرگانہ شفقت کے ساتھ مدعو کیا۔ میرے ہمراہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جنھیں ہم سب "چھوٹے دادا" کہا کرتے تھے۔ چھوٹے دادا ایک خاص مزاج اور ایک خاص لہجے کے مالک تھے۔ اُن کا زیادہ وقت قہقہے مارنے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ اور وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ تکلفات کی بنا پر زندگی میں ایک لمحے کی بھی تکلیف اٹھائی جائے۔ ابرؔ صاحب کی دعوت میں رام پور کے دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ چھوٹے دادا بھی شریک تھے۔ کھانا جب رات کے آٹھ بجے ختم ہو گیا۔ تو ہم سب لوگوں کے واسطے آرام کرسیاں رکھدی گئیں۔ ہر آرام کرسی کے پاس ایک ایک اسٹول اور ہر اسٹول پر سوڈے کی ایک ایک بوتل ایک ایک گلاس اور چورن کا ایک ڈبہ رکھدیا گیا۔

میں حیران ہو گیا کہ ہر اسٹول پر یہ سوڈا، یہ گلاس اور یہ چورن کیا معنی رکھتا ہے۔ مگر تہذیباً کچھ نہیں کہا۔ اور رات گئے پتہ چلا کہ ان چیزوں کا مقصد کیا تھا۔ بہر حال جب ہم لوگ کرسیوں پر ایک ایک سوڈے، ایک ایک گلاس اور ایک ایک چورن کے ڈبے کے مالک بنکر بیٹھ گئے۔ تو ابرؔ صاحب سامنے کے تخت پر جا کر مختلف صندوقچوں سے پرچے نکال نکال کر ایک دوسرے پر چننے لگے اور ان کے بھائی نے ایک بڑا سا رجسٹر کھولکر اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے بیس پچیس یا شاید ان سے بھی زیادہ غزلیں ایک سانس میں سنا ڈالیں۔ اتنے میں گھڑی نے گیارہ بجا ڈالے اور شوقؔ صاحب نے اپنے بھائی ابرؔ صاحب کو جب کن انکھیوں سے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے تمام کارتوس لگا چکے ہیں، انھوں نے بڑی آواز کے ساتھ اپنا رجسٹر بند کر کے ابرؔ صاحب کی جانب اس طرح اشارہ کیا گویا وہ بڑی ہی شفقت کے ساتھ یہ اشارہ فرما رہے ہیں کہ میاں اب یہ مٹھائی کھاؤ۔ میں نے شوقؔ صاحب کے اشارہ پر مڑ کر جب ابرؔ صاحب کی طرف دیکھا تو یہ نظر آیا کہ ان کے داہنے ہاتھ پر غزلوں کے تلے اوپر رکھے ہوئے پرچے سات آٹھ مناروں کی صورت اختیار کئے ہوئے ہمارے کانوں میں اترنے کے واسطے ہمیں گھور رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ چھوٹے دادا ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو تکلف میں آ کر ایک لمحے کی بھی تکلیف گوارہ فرمائیں۔ جیسے ہی انھوں نے غزلوں کے ان مناروں کو دیکھا۔ اپنی داہنی مونچھ ملنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر دروازہ تک پہونچ کر انھوں نے کمرے کی چک اٹھائی۔ باہر قدم رکھ کر اور میری طرف منہ کر کے کہنے لگے۔ بھائی شبیر حسین خاں جوشؔ السلام علیکم۔ ہم سے یہ بار گراں نہیں اٹھ سکتا۔ آہا آہا یہ کہا اور قہقہے مارتے ہوئے غائب ہو گئے۔ چھوٹے دادا کے اس طرح چلے جانے سے محفل پر سناٹا چھا گیا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اور ابرؔ صاحب اپنی دو انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرنے لگے کہ شوقؔ صاحب نے بڑی دانائی کے ساتھ رنگ محفل بدل دیا۔ انھوں نے فوراً قہقہہ مارا اور کہنے لگے واہ رے پٹھان کس کی مجال تھی کہ چک اٹھا کر یوں شن سے نکل جاتا۔ واللہ مزا آ گیا مزا۔ میاں جوشؔ تم برا نہ ماننا تم ان پٹھانوں میں ولی ہو ولی۔ یہ تمہارے ہیں کون؟۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ کہہ دیا کہ وہ ملیح آباد کے افاغنہ میں سے ہیں۔ ابرؔ صاحب نے کہا تو ٹھیک ہے۔ سپاہی رزم کا آدمی ہوتا ہے بزم سے اسے کیا کام۔ اور پھر ابرؔ صاحب سے کہا۔ ارے صاحب کلام سنائیے۔ یہ سب مشتاق ہیں۔ ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابرؔ صاحب نے

کلام سنانا شروع کر دیا۔ ایک بجا، دو بجے اور جب تین بجنے والے تھے۔ ابر صاحب نے ہم سے کہا کہ ذرا چورن کھا کر سوڈا تو پی لیجئے۔ اب ہم بیچارے سوڈا اور چورن کیا معنی رکھتا تھا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے چورن زہر مار کیا۔ اور سوڈا پیا اور پھر غزلیں سننے لگے۔

دیکھئے یہ غزل میر کے رنگ میں ہے۔ یہ سودا کے رنگ میں ہے۔ یہ مومن کے رنگ میں ہے۔ یہ مصحفی کے رنگ میں ہے اور یہ آتش کے رنگ میں ہے۔

ہم سب کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ مگر ابر صاحب تھے کہ برسے ہی چلے جاتے تھے۔ اب ہم سب کو انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ ہم جمائیاں لے رہے تھے۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لیکن ابر صاحب کو کوئی پروا نہیں تھی۔ گویا کہہ رہے تھے کہ اب برس کر کبھی نہیں برسوں گا۔ گھڑی نے تین بجانے چار بجے پانچ بجے۔ ہمارے حواس بجا نہیں تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے یا اونٹ بلبلا رہا ہے۔ غرض جب ساڑھے پانچ بج گئے مرغ بولنے لگے۔ اذانیں ہونے لگیں تو ابر صاحب نے عینک اتار کر مجھ سے کہا اچھا میاں جاؤ۔ بڑی سمع خراشی کی میں نے کل رات کو پھر آنا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب رامپور سے بڑی منت و سماجت کے ساتھ رخصت طلب کر کے میں لکھنؤ بھاگ گیا۔ اور وہاں کے شعراء کو اپنی یہ بپتا سنائی۔ تو سب کا رنگ زرد ہو کر رہ گیا۔ اس واقعے کے کوئی ہفتے یا عشرے کے بعد مولانا صفی کی محفل میں دیگر اساتذۂ لکھنؤ کے ساتھ میں بھی حاضر تھا۔ یکایک ایک گاڑی رکی اور دیکھا کہ ابر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

ابر صاحب کو دیکھتے ہی سب کے منہ اُتر گئے۔ دلوں پر وحشت کی گھٹا چھا گئی۔ لیکن جب وہ کمرہ میں داخل ہوئے تو تمام شعراء سرو قد ہو کر ان سے ملے اور بڑے احترام کے ساتھ مولانا صفی نے انھیں اپنے پاس بٹھالیا۔ یہ ماہ صیام کا زمانہ تھا۔ صفی صاحب نے ابر صاحب سے کہا روزہ نہ ہو تو پان حاضر کروں۔ ابر صاحب نے کہا۔ مولانا پان وان تو ہوتا رہے گا میں تو کلام کا مشتاق ہوں کچھ ارشاد فرمائیے۔ مولانا صفی سمجھ گئے کہ یہ اپنا کلام سنانے کی تمہید ہے۔ دست بستہ فرمانے لگے۔ ابر صاحب آپ کرم فرمائیں اور میں کلام پیش نہ کروں یہ بھی کوئی بات ہے۔ لیکن کیا کروں ماہ صیام کا احترام مانع ہے۔ ابر صاحب کے چہرہ پر شدید مایوسی دوڑ گئی وہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہنے لگے تو پھر آپ تمام حضرات آج غریب خانہ پر افطار فرمائیں گے۔ مولانا صفی نے کہا ابر صاحب اس کی کیا ضرورت ہے۔ ابر صاحب نے کہا مولانا میرا لکھنؤ کا آنا ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اگر آپ اور یہ تمام حضرات تشریف نہیں لائیں گے۔ چار و ناچار صفی صاحب اور ان کے ساتھ ساتھ ہم سب نے ابر صاحب سے وعدہ کر لیا اور جب شام کے وقت ابر صاحب کی خوراک بننے کیلئے صفی صاحب کے حسب ارشاد ہم سب ان کے مکان پہونچے تو انھوں نے اپنے زنانے مکان کی ڈیوڑھی میں منہ ڈالکر کہا۔ بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ مولانا صفی کی بیگم نے گھبرائی ہوئی آوازمیں کہا ہے ہے کیا ہوا، صفی صاحب نے کہا بس ہمارا کہا سنا معاف کرنا اتنی ہی درخواست ہے۔

ان کی بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا خدا کے لئے جلدی بتائیے، نہیں تو میں سر پیٹ کر باہر نکل پڑوں گی۔ یا علی مدد۔ یا علی مدد۔

صفی صاحب نے کہا ہم ابر صاحب کا کلام سننے جا رہے ہیں بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔

"ائے نہ جائیے۔ حضرت عباس کی قسم نہ جائیے کسی کی دردناک آواز مکان سے آئی اور ہم سب ہنسی کے مارے پیٹ پکڑ کر گلی میں بیٹھ گئے اس کے بعد کیا ہوا۔ ابر صاحب نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور وہ پہاڑ سی رات، وہ شب شہادت ہم سب پر کیوں کر گذری یہ کچھ نہ پوچھئے۔

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

لگے ہاتھوں ایک قصہ اور سن لیجئے حضرت آغا شاعر۔ خدا بخشے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی اور بڑی خصوصیات کے بزرگ تھے۔ ایسے بھولے بھالے معصوم لوگ اب کا ہے کو پیدا ہوں گے۔ داغ کے شاگردوں میں ان کا جواب نہیں تھا۔ اور تحت اللفظ اس طرح پڑھتے تھے کہ شاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ آغا صاحب کی شخصیت بڑی ہی شاندار تھی انھیں اس قدر مردانہ حسن حاصل تھا کہ حسینوں میں ایک ہنگامہ سا بپا رہتا تھا اور ان کے اندر کا یہ عالم تھا ؎

رات پیتے ہی گذر جاتی ہے میخانوں میں — اٹھ کے منہ دیکھتا ہوں صبح کو پیمانوں میں

میں جب آغا صاحب سے ملا اس وقت ان کی عمر ساٹھ بلکہ پینسٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔ مذاق کا بازار سرد ہو چکا تھا مالی مشکلات کا آئے دن سامنا رہتا تھا۔ اور وہ اسی قدر افسردہ ہو کر رہ گئے تھے کہ اٹھتے بیٹھتے۔ آہ آہ آہ کیا کرتے تھے۔

فانی بدایونی اور آغا صاحب۔ دونوں اس قدر غم پرست ہو کر رہ گئے تھے کہ میں کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کے عزاخانے میں فانی اور آغا شاعر ایسے دو مستقل تعزیئے ہیں جو کبھی ٹھنڈے نہیں کئے جاتے۔ ان دونوں کو میرے سوا پورے ہندوستان میں کوئی اپنا نہیں سکتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں آغا صاحب کے وہاں دوپہر کے بعد پہنچا۔ ان کے بیٹے آفتاب سلمہٗ نے کہا آپ بیٹھیں ابا ابھی دو منٹ میں آتے ہیں۔ نیچے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں مجھے شرارت سوجھی تو ان کا لحاف سر سے پاؤں تک اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اتنے میں وہ کمرے میں آئے۔ آہ آہ کرتے ہوئے اور یہ دیکھ کر کہ شاید ان کا کوئی بیٹا ان کی چارپائی پر سو گیا ہے وہ تخت پر بیٹھ گئے۔ آہ آہ کرتے رہے میں نے بھی لحاف سے آہ آہ کی آواز بلند کی۔

آغا صاحب بھوتوں کے قائل تھے۔ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ارے یہ کیا اور پھر شاید یہ سمجھ کر کہ کہیں کان نہ بجے ہوں۔ وہ اپنے جوتے کی ڈوری کھولنے لگے۔ آہ آہ آہ کر کے میں نے بھی اسی طرح لحاف کے اندر سے آواز نکالی۔ آہ آہ آہ۔

یہ سنتے ہی آغا صاحب "ارے" کر کے کھڑے ہو گئے ایک جوتہ پاؤں میں تھا۔ ایک اتار چکے تھے۔ میں نے پھر آواز بلند کی۔ "آہ آہ آہ ——آہ"

آغا صاحب یہ سنتے ہی کمرے سے بھاگے ارے دوڑو ارے دوڑو کمرے میں بھوت بول رہا ہے۔ بھوت۔

یہ سنتے ہی میں نے بڑی زور کا قہقہہ مارا۔ اور میری آواز پہچان کر آغا صاحب بڑے مردانہ تیوروں سے کمرے میں داخل ہوئے اور میرا لحاف الٹ کر کہنے لگے۔ کیوں جی اگر ڈر کے مارے ہم مرجاتے تو۔۔۔۔

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

اسی طرح ایک روز میں آغا صاحب کے وہاں سرِ شام پہنچا۔ وہ بالاخانے پر رہتے تھے کوئی لڑکا آیا۔ اس سے میں نے کہا آغا صاحب سے کہہ دو۔ پردہ کرا کے مجھے بلا لیں۔ میں ایک شاعر ہوں۔ جو اُن سے غزل لکھانے آیا ہوں۔

لڑکے نے اوپر سے آکر جواب دیا۔ آغا صاحب کہتے ہیں میری طبیعت خراب ہے۔ میں چل نہیں سکتا۔ لڑکے سے میں نے کہا۔ اچھا ذرا کاغذ پنسل تو لا دو۔ اور جب لڑکا لے آیا تو میں نے لکھا" آغا صاحب۔ آج ہی رات کو ایک مشاعرہ ہے۔ میں آپ سے طرح پر غزل لکھوانے آیا ہوں مجھے فوراً اوپر بلا لیجئے۔ میرا نام عبدالصمد خاں ہے۔ میں بڑا بگڑے دل آدمی ہوں۔ آپ نے اگر مجھے فوراً نہیں بلایا تو میں موقع کی تاک میں رہوں گا۔ اور اندھیرے اجالے جب بھی آپ ملیں گے آپ کو گولی ماردوں گا" جیسے ہی یہ پرچہ اوپر گیا اور آغا صاحب نے پڑھا چیخ کر کہنے لگے" ارے بیگم فوراً دروازہ بند کرا لو۔ کوئی عبدالصمد نیچے کھڑا ہوا ہے جو مجھے گولی مار دینے والا ہے" دروازہ فوراً بند ہو گیا۔ آغا صاحب چھجے پر آئے۔ اور اس زاویہ سے جھانک کر کہ اگر میں گولی ماروں تو ان کے نہ لگ سکے، مجھ سے کہنے لگے۔ کیوں عبدالصمد صاحب آپ مجھے مار ڈالیں گے۔

جی ہاں مار ڈالوں گا۔ میں نے بڑی کڑی آواز سے کہا۔ آغا صاحب نے یہ سنتے ہی ایک چیخ ماردی اور کہا "سنتی ہو بیگم۔ یہ مجھے مار ڈالنے کو کہہ رہے ہیں" یہ سنکر میرا قہقہہ نکل گیا۔ اور میری آواز پہچان کر آغا صاحب وہیں چارپائی پر گر پڑے" ارے مار ڈالا۔ اس کم بخت جوش نے۔ بیگم دروازہ کھلوا دو یہ جوش کی شرارت تھی۔ جوش سے ہماری جان خطرے میں نہیں ہے!"

"دروازہ کھلوا دو"

ہائے ہائے۔ ارے مار ڈالا ظالم نے!

★

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ریختہ کی کہانی علائی کی زبانی

سید یوسف بخاری

ریختہ کی یہ کہانی حضرت مرزا نواب علاء الدین احمد خاں نشیمی و علائی، فرزند نواب مرزا امین الدین احمد خاں اوّل مرحوم مغفور والیٔ ریاست لوہارو نے خود اپنی زبانی دلی سوسائٹی کے اس جلسہ میں سنائی تھی جو ۵ مئی ۱۸۶۶ء کو دلی میں ہوا تھا۔ اس سوسائٹی کے صدر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر دلی تھے۔ ان ہی کی فرمائش اور ایما پر علائی نے یہ مقالہ وہاں پڑھا تھا۔

حضرت علائی ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی تک دلی میں رہے۔ اس کے بعد لوہارو چلے گئے۔ اس منتقلی کے بعد غالباً یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ علائی اس مقالہ کی خاطر دلی آئے۔ پھر کبھی ان کو اپنی زندگی میں دلی کی بہار یا بربادی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ ہاں ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں ان کا جسدِ خاکی، پھر دلی کی اس خاکِ پاک پر آیا اور اسی مٹی میں مل گیا جس کا وہ خمیر تھا۔ اسی طرح مرزا غالب جیسا علائی کا عاشقِ زار جس کو "دم واپسیں بر سرِ راہ" کی نوبت تک علائی کی دھن لگی ہوئی تھی اپنے سفرِ آخرت تک لوہارو نہ جاسکا ؛

یہ نادر مقالہ جو پون صدی گذر جانے کے بعد آج بھی تاریخی معلومات کے لحاظ سے ادب کا ایک بے مثل شاہکار ہے اپنی خواندگی کے بعد دلی سوسائٹی کے رسالہ میں ۱۸۶۶ء میں تمام و کمال شائع ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا کوئی نسخہ کسی کے پاس موجود نہیں۔ اس اعتبار سے راقم الحروف خوش قسمت ہے اور اس کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کے ہاتھوں پہلی بار یہ شاہکار "ماہِ نو" کے صفحات کی زینت بن رہا ہے ؛

یہ گمشدہ گنج گراں مایہ، یوسف گم گشتہ و فرومایہ تک کیونکر پہونچا۔ یہ کہانی بھی پون صدی پرانی ہے۔ جب یوسف کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں بھی نہ آیا تھا اس کے دادا حضرت سید محمد مرحوم مغفور، شاہی امام جامع مسجد دہلی اور حضرت علائی کے درمیان رشتۂ دوستی اور محبت تھا۔ میں ملاقات کے علاوہ آپس میں نامہ و پیام بھی ہوا کرتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے کی دید و شنید ہی عزیز نہ تھی، تحریر و تقریر بھی پیاری تھی۔ دونوں کے نوشتے ایک دوسرے کے پاس محفوظ رہتے تھے، ان ہی میں یہ دُرِّ شاہوار بھی شامل تھا۔ دادا کے بعد یہ سرمایہ راقم الحروف کے والد ماجد سید حامد بخاری مرحوم مغفور، امام و خطاط کو ورثہ میں ملا۔ باپ کی زندگی میں کہ ہمیں اس وقت کوئی علمی شعور حاصل نہ تھا۔ ہم نے ادب کے ان انمول موتیوں کی اپنی بے بصر آنکھوں سے زیارت کی، بعد ازاں کچھ لکھ پڑھ کر جب تھوڑا بہت شعور حاصل ہوا تو اب ہم نے اس کو ایک نگاہِ غور سے دیکھا۔ دیکھ تو لیا مگر آنکھیں ادب کی اس روشنی سے خیرہ اور حیرت زدہ ہوگئیں۔ افسوس! وہ مطبوعہ مقالہ ۱۹۴۷ء کے خونچکاں انقلاب میں ہمارے پاس سے جاتا رہا۔ صرف وہ خطوط باقی رہ گئے جو غالب کے اندازِ نگارش کا صحیح معنوں میں ایک عکسِ لطیف اور منہ بولتی تصاویر ہیں۔ ادب کے یہ تیر و نشتر کھانے میں کچھ ایسی لذت آئی اور طبیعت نے زیست کا کچھ ایسا مزا پایا کہ تیر کھانے کی ہوس اور بڑھ گئی۔ اس لئے اور بھی کہ ہم نے یہ دیکھا اور واقعی یہ محسوس کیا کہ علائی جو غالب کا "نیرِ اصغر، دل نشین، آنکھوں کا تارا پیارا اور دلارا تھا جو غالب کا خلیفۂ اوّل و آخر اور جانشینِ مسندِ ادب تھا جو غالب کے کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا امین اور علمبردار تھا جس نے ادبی دنیا کو غالب کے کلام کی دولت بخشی اور خود جیتے جی، داد کی تمنا، صلہ کی خواہش اور شہرت کی آرزو سے بے نیاز رہا۔ اس کا کلام نظم و نثر فارسی و اردو بھی اس کے عظیم الشان کتب خانۂ لوہارو میں سامانِ پریشاں کی طرح آوارہ و منتشر ہی رہا۔ نہ اس کے عہد میں کسی کو اتنی توفیق ہوئی کہ علائی کے ادبی کارناموں سے ادبی دنیا کو روشناس کراتا اور اس طرح علائی کی ادبی و تاریخی شخصیت

تذکروں اور تواریخ میں آئی، ادب کے نئے گوشے اور نئے ابواب ابھرتے۔ نہ محققین اور نقادانِ ادب نے اس طرف کوئی معقول توجہ کی۔

نظر بریں ہم کو علائیؔ کے اس مقالہ اور اس کے ساتھ ان کے کلام کی تلاش اور جستجو لاحق ہوئی۔ اس کی خاطر جب ہم دلی میں تھے تو بارہا حضرتِ سائلؔ دہلوی سے ملے۔ اسی خاندان کے ایک نامور امیر نواب منظور یار جنگ بہادر سے حیدرآباد دکن میں ملاقات کی۔ پاکستان میں آئے تو ان کے ورثا کو خطوط لکھے۔ کراچی میں محبِ مکرم سید ہاشمی فرید آبادی اور جناب جمیل الدین خاں عالیؔ سے ملاقات کی۔ انتہا تو یہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں دلی جاکر دلی کی خاکِ پاک کو سونگھا اور چوما۔ اس خاک سے جو ذرّے ملے بٹور کر لے آیا۔ پھر لاہور گیا۔ علائیؔ کے پوتے نواب مرزا صمصام الدین احمد خان فیروز سے نیاز حاصل کیا۔ بالآخر جوئندہ یابندہ ان سے۔ ان کی خاندانی اور قلمی بیاض حاصل کی جس میں ہمارا یہ مقالہ، دُرِّ مقصود، اس کے علاوہ حکامِ وقت کے نام مختلف سیاسی نامے اور سب سے بڑھ کر علائیؔ کے کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا گنج پوشیدہ، مخفی تھا۔ یہ اصل بیاض نہ تھی اس کی دوسری نقل تھی، ایسی نقل جس کو نہ کلک و قلم نصیب ہے نہ خط و رقم۔ اپنی بدقسمتی اور بداعمالی کا یہ عالم کہ ناخواندہ و جاہل۔ چنانچہ مہینوں یہ بیاض مطالعہ میں رہی۔ بڑی محنت و کاوش کے بعد بہت سے دُرِّ آبدار انتخاب میں آئے۔ اس کی اساس پر علائیؔ کے ذاتی و خاندانی سوانح حیات۔ کلام نظم و نثر فارسی و اردو کو ترتیب دیا۔ اس کا نام بھی "یادگارِ غالبؔ" کے وزن پر "یادگارِ علائیؔ" رکھا۔ یہ مقالہ اسی تعمیری یادگار کا ایک حصہ، ایک گوشہ اور ایک ٹکڑا ہے۔ "یادگارِ علائیؔ" زیرِ طبع ہے۔ اسے شائع ہونے پر دیکھئے گا۔ بقول حضرت اکبر الہ آبادی ؎

انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی	انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کا مضموں انہی کا کاغذ، قلم انہی کا دوات ان کی	فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انہی کا مطلب نکل رہا ہے

میرا تو اس میں کچھ بھی نہیں ہے، تمام تر حضرت علائیؔ ہی کا صدقۂ جاریہ ہے۔

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ علائیؔ کی نظم کے مقابلہ میں نثر کے جو نمونے ہم تک پہونچ سکے ہیں وہ صرف چند خطوط، تین پیامناموں اور ایک مقالہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے خطوط "یادگارِ علائیؔ" میں شائع ہوں گے، ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں نہ تو ہم صحیح معنوں میں ان کی نثر پر تنقید کرسکتے ہیں نہ حقیقت میں ان کی نثر کی علمی ادبی خوبیوں کا اظہار ہوسکتا ہے۔ جب تک کسی ادیب یا مصنف کے رشحاتِ قلم اپنی گوناگوں رنگینیوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے نہ آئیں اور اس کی تحریروں کے مختلف پہلو پیشِ نظر نہ ہوں اس کے طرزِ نگارش اور علمی و ادبی خصائص پر بحث خارج از بحث ہے۔ علائیؔ کی نثر پر تنقید کرتے ہوئے اس کمی کی بناء پر ہم کافی تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال زمانے کے ہاتھوں علائیؔ کے موئے قلم سے نکلے ہوئے جو نقوش ہم تک پہونچ سکے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ آئندہ چند سطور میں ہم اس مقالہ کے چند ان حقائق کا ذکر کریں گے جن کی روشنی میں زبانِ اردو کی تاریخ کے بعض نئے گوشے ابھر آئے ہیں، مطالعہ کے وقت ہمیں ذیل کی چند باتوں کو ضرور اپنے پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

اوّل یہ کہ یہ مقالہ زبان اردو کی تاریخ پر انیسویں صدی کا اولین مقالہ نہ سہی تاہم ابتدائی اور بنیادی مقالات میں سے ضرور ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تاریخ تحریر اور خواندگی ہی تک کی اس میں تاریخ قلم بند ہوئی ہے۔

دوم یہ کہ علائیؔ نے یہ مقالہ از خود نہیں لکھا فرمائش پر رقم کیا تھا اور ایسے حالات میں رقم کیا تھا جب وہ ہنگامۂ آزادی کے مصائب جھیل کر ریاستی نظم و نسق میں منہمک اور اعداء کی ستم کوشیوں کے مقابلہ میں نبرد آزما و سخت پریشان اور بدحواس تھے۔ ثبوت فراہم کرنے کے لئے اس وقت ان کے پاس ضروری کتب تواریخ بھی نہ تھیں اس لئے کہ دہلی میں ان کا عظیم الشان کتب خانہ تلف ہوچکا تھا۔ صرف اپنی قوتِ نطق اور حافظے سے کام لے کر یہ مقالہ ترتیب دیا تھا۔

سوم یہ کہ اربابِ انجمن کے اشارے کے مطابق ان کے ذہن و گفتار پر قفل لگا دیا گیا تھا۔ یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ صرف زبانِ اردو کے ذکر پیدائش، ارتقائی اور تدریجی منازل اور جدید شعرا کے حالات ہی تک محدود رہیں ایسی صورت میں علائیؔ کی علمی قابلیت اور حافظہ کی داد نہ دینا سراسر ظلم کے مترادف ہوگا۔ علائیؔ صرف حضرت خسروؒ اور کلامِ غالبؔ ہی کے حافظ نہ تھے نہ معلوم انھیں

اور کس کس کے دیوان ازبر تھے لیکن انھوں نے بخوف طوالت مقالہ میں خسرو رح کے اشعار پیش نہیں کئے یوں بھی اس وقت خسرو رح کا کلام لوگوں کے ورد زبان تھا۔ غالباً اس پابندی کے پس منظر میں انیسویں صدی کا وہ اردو تنازعہ اور سرسید اعظم کی وہ مذہبی و تعلیمی تحریکات اصلاح و ترقی بھی کارفرما ہوں گی جن کے نتیجہ میں اس وقت دنیائے ادب و صحافت ایک نئے انقلاب سے آشنا ہو رہی تھی اور علائی سرکار برطانیہ کی ایک محکوم ریاست کے والی ہونے کی وجہ سے اس چپقلش سے دور ہی رہنے کے لئے مجبور تھے۔ یہ کشمکش برابر جاری رہی یہاں تک کہ یہ موضوع بحث مقامی حیثیت سے تجاوز کر کے صوبجاتی اور بین الملکی حدود میں داخل ہوگیا اور ایک مستقل سیاسی تنازعہ بن گیا۔ آج بھی برصغیر ہند و پاکستان میں زبان اور رسم الخط کا یہی اہم مسئلہ درپیش ہے۔

الغرض اس بحث و تمحیص نے اتنا طول پکڑا کہ آخر کار ۱۹۱۱ء میں ملک کے تمام سربرآوردہ اہل قلم ہندو اور مسلمان اس مباحثہ اور مناظرہ کے میدان میں کود پڑے اور منشی سید احمد دہلوی، مصنف فرہنگ آصفیہ کو بھی اپنا مشہور و معروف مقالہ "محاکمہ اردو" باقاعدہ ایک رسالہ میں پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ بمقابلہ علائی یہ محاکمہ اپنی جگہ کافی معلومات اور اردو کے حق میں مضبوط اور ٹھوس دلائل کا ناشر اور معلن ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ منشی سید احمد کے دلائل میں بیشتر حصہ علائی کی تحقیقات کا شامل ہے۔

چہارم یہ کہ اسی ضمن میں چونکہ علائی ریاست لوہارو کے ایک محکوم حاکم تھے اس لئے حسب دستور وقت ان کے مقالہ کا آغاز و انجام خدا کی حمد و ثنا کے بعد سرکار برطانیہ اور مقامی حکومت کی تعریف اور دعا پر مشتمل ہے ورنہ فطرتاً ان کی طبیعت کا یہ تقاضا ہرگز نہ تھا۔

پنجم یہ کہ اس دور کے مروجہ دستور کے مطابق مقالۂ علائی کی عبارت مقفّٰی اور مسجّع ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کی تراکیب اور مغلق الفاظ پر مشتمل ہے لیکن ان کے خطوط میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا۔ وہاں وہ اپنی سلاست اور روانی سادگی اور شوخی، طنز اور مزاح میں غالب کے کافی ہم رنگ اور ہم طرح نظر آتے ہیں۔

ششم یہ کہ علائی کے مقالہ میں ان کی تصنیف کردہ ایک نظم اردو بھی شامل ہے اور یہ اردو ادب کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ علائی نے حسب دستور قدیم تبرکاً اس نظم کے مطلع کا ۱/۲ مصرعہ اپنے استاد مرزا غالب کی مشہور نظم "صفتِ انبہ" سے مستعار لیا ہے۔

آخری بات یہ ہے، جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ جس بیاض سے یہ مقالہ نقل کیا گیا ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ اصل بیاض کی دوسری ناقص اور نامکمل نقل ہے، ہم نے اس کی نقل کرنے اور یہاں دوہرانے میں اپنی محدود قابلیت کے مطابق جہاں تک ممکن تھا مقالہ کی نوک پلک درست کر کے پیش کیا ہے پھر بھی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک عبارت اور الفاظ کی املا کا تعلق ہے اس باب میں نہ تو ہم کو علائی پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہے اور نہ آپ کو مجھے کوسنے کا کوئی مجاز ہے۔

آئیے اب ہم علائی کے مقالہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے:

ان کے مقالہ کا نقطۂ آغاز جسے وہ مصلحتاً اور حسب ضرورت کہانی کے درمیان میں لائے ہیں لفظ "اردو" کی نئی اور اچھوتی تحقیق ہے۔ علائی فرماتے ہیں کہ لفظ "اردو" جس کے معنی "لشکر" کے ہیں فی الاصل لفظ فارسی ہے ترکی نہیں۔ اسی طرح ان کی تحقیق کے مطابق سرزمینِ ہند میں زبان اردو کی تخم ریزی امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے ہاتھوں ہوئی۔ بعد ازاں اس باغ کی آبیاری اور چمن بندی میں دوسرے متقدمین اور متاخرین کا حصہ ہے اور بالآخر حضرت شاہجہاں نے اس کو "اردوئے معلّٰی" کا نام اور لقب عطا کیا۔

علائی کے بقول ہم خود دیکھتے ہیں کہ جلال الدین اکبر کے دَور میں اس تازہ نہال میں شاخیں اور کونپلیں پھوٹنی شروع ہوئیں درحقیقت فارسی اور ہندی بھاشا یا بھاکا کا صحیح میل اور اختلاط اسی دَور میں ہوا اور یہیں سے ایک نئی زبان کا ہیولیٰ وجود میں آنا شروع ہوا، جس نے بعد میں اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔

غالب کی طرح علائی بھی ابوالفضل کی فضیلت سے ضرورت سے زائد متاثر نہ تھے، انھوں نے بھی اپنے مقالہ میں کھل کر ابوالفضل

کی مدح سرائی نہیں کی صرف "اچھا ماہر زبان ہندی تھا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اسی طرح وَلی اور جعفر کا بھی ذکر ضمنی طور پر کیا ہے منشی سید احمد دہلوی نے بھی وَلی گجراتی کو خسرو کے بعد اردو کا مخترع ہونا تسلیم کیا ہے۔ مگر اس دعوے کے ساتھ کہ وہ بھی دِلّی ہی کا تربیت اور فیض یافتہ تھا۔

علائی نے شعراء کے جو ادوار قائم کئے ہیں وہ بھی قریب قریب جدید تحقیقات اور مروجہ معلومات کے مطابق ہیں۔ بعض مشہور شعراء دہلی و لکھنؤ کا نام انھوں نے دیدہ دانستہ یا سہواً نہیں لیا، ہوسکتا ہے کہ جن شعراء سے علائی متاثر تھے۔ انہی کو انھوں نے قابل ذکر سمجھا ہو۔ بہرنوع علائی نے نہایت ہی اختصار سے ہر دَور کے مشہور و معروف شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیاتِ کلام کو بیان کیا ہے لیکن اس باب میں ان کا نظریہ اپنے استاد مرزا غالب کے برعکس ہے۔ کسی نے مرزا غالب سے حضرت ناسخ کے بارے میں دریافت کیا تو مرزا نے طنزاً یہ جواب دیا ؂

زبانِ میر اور مرزا کہاں ہے
مگر ہاں پُر بیوں میں خوش بیاں ہے

علائی شعراء لکھنؤ کے بارے میں فرماتے ہیں؛

"حق یوں ہے کہ تمام بلادِ ہندوستان سے ان کی زبان پاکیزہ تر اور ان کو اوروں پر رجحان اور تفوق حاصل ہے۔"

دراصل علائی کی شادی نواب جلال الدین نبیرہ نواب ضابطہ خان روہیلہ کی دختر نواب شمس النساء بیگم سے ۱۸۵۵ء میں بمقام نجیب آباد ہوئی تھی اس لحاظ سے ان کی آمد و رفت اور میل و ملت کا سلسلہ اہل لکھنؤ سے آخر وقت تک قائم رہا اور چونکہ گیسوئے اردو کو سنوارنے اور تابدار بنانے میں دلّی کے بعد اہلِ لکھنؤ نے بھی مشاطگی کی تھی اس لئے علائی بھی زلفوں کے اس پیچ و خم میں گم ہو گئے۔ یہ خمیدگی انھیں ایسی بھائی کہ بعض اوقات وہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں لکھنؤ کے مقلد ہو گئے۔ دلّی والے "شعریں، برسیں، چیپتیں، سانسیں نثریں وغیرہ صیغۂ جمع میں نہیں بولتے لیکن علائی نے اپنے مقالہ میں ایک جگہ ——— "اردو کی نثریں اس وقت بھی اچھی نہ تھیں" "نثر کی بجائے "نثریں" لکھی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ "لینا یا حاصل کرنا" کے معنی میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان میں صرف "پا" لکھنے پر اکتفا کی ہے۔

"مانا کہ مفہوم و مراد و مطالب مکتوب علیہ و سامع اس سے 'پا' جاتا ہے۔"

تذکیر و تانیث اور واحد جمع کی بحث میں منشی سید احمد دہلوی "محاکمہ اردو" میں فرماتے ہیں کہ اہلِ زبان وہ لوگ ہیں جن کا وطن وہی سرزمین ہو جہاں وہ زبان پیدا ہوئی اور اور زباں داں وہ لوگ ہیں جنھوں نے اہل زبان سے ان کی زبان سن کر یا پڑھ کر اس کو سیکھا ہو، مقلد زبان کو لازم ہے کہ وہ اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرہ کی تلاش و جستجو سے غافل نہ رہے ان کا عامل بنے تاکہ اس کا سخن مستند اور قابلِ اعتبار ہو۔ خود علائی اپنے مقالہ میں دلّی کو اردو کا مصدر اور مرکز تسلیم کرتے ہیں اور زبانِ اردو سے "مراد خاص زبان شاہجہاں آباد" قرار دیتے ہیں۔

علائی نے آخر میں اردو نثر سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ لوگوں نے اردو نثر کی طرف توجہ دینے میں اس لئے "تاخیر" سے کام لیا کہ ابتدا میں اکثر اہلِ علم حضرات نے اس نئی زبان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ اسے محض ایک لشکری اور بازاری زبان سمجھا اور اپنے معیار کے مطابق نہ جانا یہی وجہ تھی کہ اردو نثر نظم کے کافی مدت بعد وجود میں آئی۔ علائی نے خاص اپنے دَور کے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے مخلصانہ انداز میں اردو نثر کی کم مائیگی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ وہ ان لوگوں پر ان کی غلط روی کی مثال دے کر معترض ہوئے ہیں کہ فارسی داں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ فارسی میں نامہ نگاری کرتے تھے اور اس کا اردو ترجمہ بھی غلط کرتے تھے۔ پھر لطف یہ کہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے اپنے آپ کو اہلِ زبان سمجھتے تھے۔

ان کا یہ خیال اور تمنا بالکل بجا تھی کہ اردو نثر پر جو فارسی انشا کا غیر ضروری اور غیر فطری اثر ہے اسے حتی الامکان کم کرنے کی کوشش

کی جائے تاکہ اردو میں زیادہ سے زیادہ مقامی رنگ نمایاں ہو سکے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اس تاریخی حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ مرزا غالب نے اردو نثر نویسی کا جو ڈھنگ نکالا ہے وہ واقعی انہی کا حصہ ہے اور اولیت کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔

علائی کی نقادانہ نظر نے نئے حالات اور بدلتی ہوئی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ جدید انگریزی تہذیب اور انگریزی زبان کے اختلاط سے مستقبل قریب میں نئے نئے الفاظ اور نئی نئی تراکیب کا اضافہ ہوگا اور اس طرح موجودہ کمزوریاں اور خرابیاں دور ہونے کے بعد بہت جلد ایک نئی اور ترقی یافتہ زبان جنم لے گی۔

علائی نے اپنے مقالہ میں مسئلہ رسم الخط کو بالکل نہیں لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسم الخط ناگری اور رومن وغیرہ کی اگر کوئی تحریک تھی بھی تو شاید وہ اتنی قوی اور زور دار نہ تھی گو مستقبل میں یہ بڑی شدت کے ساتھ سامنے آئی اور ہنوز یہ مسئلہ برصغیر ہند و پاکستان میں اپنی اپنی جگہ ایک متنازعہ فیہ اور حل طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس قدر تمہید کے بعد علائی کا وہ مقالہ قارئین کی نذر ہے میرا کام تو صرف اسے آپ تک پہونچانا تھا اور علائی کی یاد کو تازہ کرنا تھا جسے ہم ایک مدت سے فراموش کئے بیٹھے ہیں۔

مقالہ علائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نستعینہ علیٰ مایکون ونحمد علیٰ ماکان الحمد للہ فاطر الارض والسماوات مفضل الانسان علیٰ سائر الخلق ثم افرد العلم والحیات ذی القدرہ والعظمۃ والکمال والکبر یا قاضی الحشر مقدر القضا فسبحان یا من ثنا دون الحصر والاحصا فہو سبحانہ وراء الوراء ثم وراء الوراء والصلوٰۃ والسلام علیٰ جمیع المرسلین والانبیا۔

رسم ہے کہ حمد و ثنائے باری کے بعد نامہ نگار اپنے عنوان صحائف کو مستجل بمدحت حاکم عہد کرتے ہیں، پس لازم ہوا کہ گزارش مدعا سے قبل اور حمد و نعت کے بعد اپنے بادشاہ وقت کی ستائش و ثنا کروں۔ مانا کہ نقشِ مطلوب دل پذیر ہے مگر یہ تنگیٔ میدانِ گفتار ادب ناطقہ کا عنان گیر ہے ؎

دل زکجا و ایں پر و بال از کجا
من کہ و تعظیم جلال از کجا

ہاں تبرکاً صرف ادائے رسم التعظیم نام مبارک اپنے شہنشاہ خورشید کلاہ مہر حیر مریم جناب بلقیس نقاب عیسیٰ دم کلیم کلام کا لیتا ہوں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

ملکہ معظمہ آسمان اورنگ آیت رحمتِ کبریا کوئن وکٹوریہ ؎

سرورِ شاہاں بتوانا تری
نامورِ دہر بدانا تری

خلد اللہ ظلالہا علیٰ مفارق الانام الیٰ یوم القیام کہ جس کا دامن عاطفت آج چتر و سائبان ساکنانِ ہندوستان ہے، مجھ کو اور تمام اہل ہند کو اپنا وجود اس عہد میں موجب شرف و افتخار اور مستوجب شکر ایزد منان ہے۔ بدیں اعتبار کہ یہ دولت جاوید طراز دُرّۃ التاج اعصار و دھور ہے اور انوار راحت کا اس میں وفور ہے اگر ہم نے اپنے زمانہ کو ماحیٔ آثار اسلاف و باعث نازش اخلاف کہیں تو بجا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ ملک ہندوستان کبھی نہ تھا لیکن باعتبار آبادی و آراستگی و امن و کثرت تجارت کے جو آج اس تعلیم کو رونق حاصل ہے فی الاصل نام اس کا ہندوستان جنت نشان نہ تھا۔ جب سے اس ملک کی وسعت و فسحت اعتبار میں ہے۔ اختلاف السنہ و مذاہب و لغات شمار میں ہے۔ گر زمانہ باقی ہیں اس اقلیم کے

لوگوں کی زبان شاستر معتبر تھی اور دفاتر حساب و نجوم و نبایات و اخلاق و انشا، و طب اس میں منضبط و مروج اکثر تھے۔ زبان سنسکرت ایک وسیع و فصیح زبان ہے وبے مشقت اس کا حاصل ہونا دشوار اور بے تعلیم اس میں تکلم و تلفظ دور از کار ہے۔ افسوس بقصور ہمم و کمی اشواق و بے اتفاقیٔ خواطر سے اکتساب و اشتغال میں وہیں واقع ہوا اور شدہ شدہ یہ زبان حاصلہ مکتب رہ گئی۔

تین فریق اس کے دانا علما اعتبار کئے جاتے ہیں واقفان علم دین سے بید خواں (وید خوان) بھاگوت سرائے پنڈت مراد ہیں۔ ماہران علم معقول و اوضاع فلکی سے جوتشی، اہل تصوف بیدانتی کہتے ہیں۔ جیسے فریق ثالث جوتشی و بیدانتی مشہور ہیں۔ اسی فریق اول کو دھرم شاستری کہنا چاہئے۔ اس کا ترجمہ بترتیب، عربی میں فقہا و منجمین و صوفیہ اور انگریزی میں ـــــ ڈاکٹر آف لاء (DOCTOR OFLAW)، ایسٹرونومر (ASTRONOMER) و میتھولجین (MYTHOLOGIAN) ہے۔ افسوس اس مملکت میں کچھ بوجہ عیش و دوستی کامرانی کے سلاطین اسلامی و رایانِ ہند میں ایسا جہل شائع ہوا کہ علم و عقل کا نقصان ہوتا گیا حتیٰ کہ اپنی زبان سے سوائے معدود خواص کے اور پھر وہ بھی شائق و مائل الی التہذیب بالطبع ہوئے، جمیع فرق و امم ہند ایسے بیگانہ ہو گئے کہ سب نے زبانِ اصلی ملکی و مادری اپنی چھوڑ دی۔ مختلف لغات موضوعی اختراعی پر تکلم و تلفظ اختیار کیا اور یہ اختلاف ایسا اثر بخش ہوا کہ ایک گروہ دوسرے کی زبان سمجھنے پر قادر نہ رہا۔ تا با اخذ مطلب و گفتار چہ رسد۔ چنانچہ زبان بنگالہ زبان اوسط ہند سے اور زبانِ مارواڑ زبانِ پنجاب سے اور زبانِ سندھ زبانِ کرناٹک سے ایسی متغائر ہیں کہ یہ اقوام باہم گفتگو میں عاجز و متحیر ہیں۔ باآنکہ تمام اضلاع ایک ہی قلمرو میں داخل ہیں مگر ایسے اختلافاتِ رسوم و مذاہب و لغات جیسے اس قلمرو میں بکثرت ہیں اور اقالیم میں کم حاصل ہیں۔

یہاں سے مجھ کو یہ گذارش کرنا لازم ہوا کہ بعد ترک سنسکرت اہل ہند کی زبان بھاکا، اس کے نام نے شہرت فی الامصار پائی کیونکہ سنسکرت معنی لغوی آراستہ و مزین کے ہیں اور اصطلاحی، زبانِ آسمانی و لسان اللہ سبحانہٗ اور بھاکا بولی کو کہتے ہیں جس کا ترجمہ فارسی سخن، اور عربی کلم ہے۔ انگریزی زبان میں سنسکرت کو اورنمنٹیڈ (ORNAMENTED) اور بھاکا کو ورڈ اسپیچ (WORD SPEEH) سمجھنا چاہئے۔ اس بھاکا میں بھی اکثر تصانیف و تالیف معتبرہ و اشعار پاکیزہ موجود و خاصۃً علم عرفان و تصوف کے، اچھے دل پسند، بیان و خیالات نازک و بلند۔ شاعرانہ و عاشقانہ ایسے ہیں کہ دل متمتع اس سے کیفیت حاصل کرے۔ چونکہ میری نظر سے کسی کتاب میں نہیں گزرا اس لئے میں یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ تخریبِ سنسکرت و تعمیر بھاکا کس راجہ و فرماں روائے ہند کے وقت سے خاص شروع ہوئی مگر قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ شیوع دین اسلام بلکہ ظہورِ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی پہلے ہند میں زبان بھاکا تھی اور وہ عہد راجہ بکر ماجیت کے زمانے سے نزدیک اور کچھ بعد تصور کرنا چاہئے، بہرحال اس زمانے میں زبان بھاکا نے وہ رواج و شیوع پایا اور ایسی اس کی تحریراً و تقریراً گرمیٔ بازار ہوئی کہ عوام و خواص اہلِ ہند میں بھی صرفِ پیام و کلام و گفتار ہوئی، ہر چند اہل ہند ہزار در ہزار بلکہ مدت بے شمار سے ہند کی آبادی اور فرمان رواں و رایانِ ہند کی سلطنتیں بتاتے ہیں مگر اوّل روایات کو ہمارے مقصود سے کم منافات ہے۔ مجھ کو اربابِ انجمن کے اسی قدر اشارات ہیں کہ زبانِ اردو کے پیدا ہونے کی حقیقت و مدت اور زبان جدید کے شعراء کی کیفیت بیان کروں۔

دانائے راز آگاہ ہے کہ مسودِ اوراق ان دنوں افکار دنیا سے سخت پریشان حال اور آلام روحانی سے از بس منکسر البال ہے، ماعدا ذلک، اس مطلب خاص کے واسطے جمعیتِ حواس و فراہمی کتب تواریخ ضرور، یہاں اس وقت نہ کامل حواس مجتمع اور نہ کتب موجود۔ صرف امتثالاً للامر الحکام قوتِ نطق اور اعانت حافظہ سے کام لیتا ہوں اور مدعا کو اس طرح گذارش کا پرداز دیتا ہوں کہ آج سے نو سو برس پہلے سوائے اہل ہند کے یہ زبان کسی اور قوم کو حاصل نہ تھی۔ نہ کوئی اسلامی لوگوں سے متکلم بہ لغت ہندی ہوا نہ اس زبان نے اسلامیان ہند میں شیوع پایا ہاں صرف اہل ہند کی ہی تالیفات و تصانیف مشتمل بر حکایات و قصص و انشاء و بیان تصوف و اشعار عاشقانہ مثل دوہا و کبت اکثر نظر سے گذرے ہیں۔

جب زوالِ سلطنت ہنود اور بربادی رایان ہند صدی ہشتم عیسوی میں شروع ہوئی اول حملہ ہائے دلیرانہ قوم اسلامی عرب سے مثل خلفائے عباسیہ اور بعد ترک تازیہائے پیہم اقوام عجم سے مثل غزنی و غور و خلجی و خاندان تغلق استیصال سلطنت ہنود ہوا تب ایسا وہن و ضعف

کامل حکومت راجہ ہائے ہند میں چار پانچ برس کے درمیان ہوگیا کہ اکثر رسوم و السنہ اہل ہند میں فتور عظیم آگیا۔ قوت و استیلائے اہل اسلام سے ملک ہند مرجع انام بنا بلکہ مسلمانوں کا امید گاہ و موطن و مقام بنا۔ مگر خاص ارتباط مزید بہم دگر سے جیسا تغیر رسوم و قیود اسلامیان ہند میں آیا ویسا ہی خاص اہل ہند کے اوضاع و السنہ میں بھی اختلاف واقع ہوا۔ ادھر فاتحان اسلامی باہمہ بیگانگی آشنا ہوکر ہندی جنم اور ہندی گو بنے اور ادھر اہل ہند کو ضرورتاً سپاہ و سپاہدار کی زبان سمجھنی اور بولنی پڑی۔ مع ہذا دفتر نے بھی ترکی و فارسی میں انضباط و انتظام پایا اور معاملات و مکتوبات نے بادشاہ وقت کی زبان میں انصرام پایا۔ پس رایان ہند کی جہانداری کا کامل زوال ہوا۔ اور راجاؤں کے راج نے اختتام و انجام پایا۔ تیرھویں و چودھویں صدی عیسوی کے درمیان جس کو ہندوستان میں عہد دولت خاندان سلطان غیاث الدین تغلق جاننا چاہئے۔ میرے نزدیک اسلامی لوگوں میں سے حضرت خسرو رح جل عظمتہٗ نے زبانِ ہندی میں مہارتِ کامل حاصل کی۔ اصل اس شاعر بے مثال کی بزرہ لاچین سے ہے۔ یہ عزیز قوم کا مغل اور خود ہندوستان زادہ تھا یہی وجہ ہے زبان فارسی و عربی و ترکی و ہندی میں اس والا دستگاہ کو مہارتِ کامل تھی، قطع نظر کمالاتِ شاعری کے جو زبان فارسی میں اس شخص نے بہم پہونچائی اور اس کا بیان میرے بیان سے ورا ہے، زبان ہندی میں وہ کمال اس عزیز نے پیدا کیا کہ شاید خاص صاحبِ زبانِ ہند اس سے محروم ہوں، اقسام نظم و نثر ہندی از قسم کہ مکرنی و پہیلی و مثال و فقرات ذو معنین ایہامی وغیرہ ایسے لطیف اور مذاق انگیز اس کے ہیں کہ سخن شناسان جوہر پسند اس کی داد دیتے ہیں اور فنِ موسیقی میں قول و گیت اور چھند اور بعض راگنی و مقامات اس عزیز کے مخترعات ایسے ہیں کہ ماہران فنِ موسیقی اس سے مزے لیتے ہیں۔ کثرتِ شہرت سے میں اس شخص کا حال لکھنا ضرورت نہیں دیکھتا ورنہ اس قسم کا کلام اس کامل کا مسوّد اوراق کے ضبط حافظہ ہے۔

بعد اس شخص کے تا عہدِ جلال الدین اکبر انار اللہ برہانہٗ (۱۶۰۰ء) میں کوئی ایسا نامور شاعر ماہر ہندی زبان اسلامی گروہ سے نظر نہیں آتا جس کا نام یہاں لوں۔ البتہ شیخ ابوالفضل فیضی فیاضی و شیخ مبارک ناگوری کا بیٹا اچھا ماہر زبانِ ہندی تھا کہ بحکم اپنے بادشاہ جوہر دوست، اکبر ماضی کی اکثر کتب معتبرہ مشہورہ سنسکرت و بھاکا زبانِ فارسی میں ترجمہ کی ہیں مگر اقسام نظم سے کلام اس کا ہندی میں نامہ نگار کے کان تک نہیں پہونچا۔ ہاں زمانِ اکبر ماضی سے تمام معاملات و رسوم رعیت و لشکر کے مخلوط ہوئے کہ زبانِ ہندی نے نئی شکل بوجہ کثرت ربط کے حاصل کی اور رفتہ رفتہ دونوں ہندی زبان میں قطعاً متروک ہوگئیں۔ جیسے شہر کے لوگ فارسی و ترکی سے بیگانہ تھے۔ اسی طرح لشکر کے لوگ ہندی سے کم آگاہ۔ نظر برآں اکابر و الا دستگاہ نے متفق الرائے ہوکر ہندی اور فارسی کو ایک لطیف ترکیب دی۔ اور اس ترکیب سے ایک زبان جدید پیدا کی۔

واضح ہو کہ "لشکر کو فارسی میں "اردو" بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ عربی میں جیش اور انگریزی میں کیمپ و آرمی —— (CAMP AND ARMY) ہے۔ ہر چند کہ بعض لوگ اردو کو بمعنی لشکر لفظ ترکی بتاتے ہیں۔ مگر یہ لفظ فارسی کا ہے۔ بایں حال جب اس زبان نے ترکیب پائی اور لشکر کے بازارگاہ میں جہاں اطراف و اکنافِ عالم کے تجار آتے جاتے تھے صرف محاورات و مکالمت ہوئے تو یوماً بعد یومٍ اس کی ترقی ہوتی گئی لہٰذا نام اس کا زبانِ اردو ہوا۔ از آنجا کہ بعد عہد اکبر زمانۂ شاہجہاں سے یہ شہر شاہجہاں آباد و معسکر قرار پایا اور خود اپنی ذات سے بادشاہ بھی اسی جا متمکن بر دوام رہا تو نام اس لشکر کا تفضیلاً "اردوئے معلّیٰ" رکھا جس کا ترجمہ انگریزی میں رائل کیمپ (ROYAL CAMP) ہو سکتا ہے۔ پس نظر زبان اردو سے مراد، خاص زبان شاہجہاں آباد ہوئی۔ نامہ نگار نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا مگر سے اکابر سے سنا ہے کہ موسوی خان معز فطرت نے بھی زبانِ اردو میں اشعار کہے ہیں۔ یہ شخص صدور و امنائے عالمگیری سے تھا چنانچہ ایک مطلع غزل اس کا جو میرے حافظہ میں ضبط ہے لکھتا ہوں تا شائقین احوال اردو پر زبان کی کیفیت جو آج سے دو سو برس پہلے تھی منکشف ہو جائے۔ شعر:

در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے

زمانہ عالمگیر سے یہ زبان اردو ترقی پذیر ہوکر قریات و بلاد ہند میں شائع ہوئی اور عقلائے ماہرین نے ترکیب میں تصرفِ شائستہ

کئے کہ فصاحت و بلاغت زبان اردو خواص کی زبانوں پر بڑھتی گئی۔ لوگوں نے تتبع شعراء ایران پر وزن بحر و تقطیع کے لحاظ سے اردو میں اشعار لکھے چنانچہ ولی و جعفر و صادق زمانہ عالمگیر اور بعد عالمگیر مشہور شعرا گزرے ہیں اور یہ صاحب دیوان لوگ ہیں، ان کے دیوان بہ تلاش ہاتھ آ سکتے ہیں۔ جعفر زٹلی مشہور ہے اور اس کا کلام اکثر بے ربط ہجو ہائے رکیک و مزاح پر مشتمل ہے اور اس قسم کے کلام کو "زٹل" کہتے ہیں۔ تا زمانہ شاہ عالم از عہد عالمگیر اول کہ لااقل مدت ایک صدی کی سمجھنی چاہیئے زبان اردو کے اشعار میں اکثر اسقام تھے کہ وہ شاہ عالم کے عہد کے بعد شعراء اردو گو نے نکال دیئے اور بعض الفاظ ہندی کو غیر فصیح جان کر از روئے تصرف فی التراکیب معیوب اور متروک رکھا۔ چنانچہ ولی و جعفر وغیرہم کے کلام میں سجن و سوہا نا و نپٹ ڈنگ ڈھنگ و تلک اکثر باندھا جاتا تھا کہ بعض اس میں سے یک قلم نکال دیئے گئے۔ اس عہد یعنی ۱۰۰۰ء و ۱۰۸۰ء کے درمیان شعرائے نامور، قائم و سودا و میر و مصحفی و سوز و فدوی وغیرہم معتبر ہیں اور ان کا کلام اکثر مرتب و موجود ہے، ہر وقت بہ تلاش مل سکتا ہے۔ علی الخصوص میر تقی میر کہ از فصحائے نامور اور دیوان موجود و مکمل، زبان اردو، معتبر ہے۔ بایں ہمہ زبان اردو کو جو شستگی و رفتگی چاہیئے میرے نزدیک اس وقت میں بھی حاصل نہ تھی۔

۱۷۸۰ء کے بعد سے آوازۂ جہانداری برٹش گورنمنٹ اطراف ہند پر پہونچا اور اقتدار روز افزوں دولت و سلطنت انگریزی ہندوستان میں انتظام کامل ہوا۔ وہ خطرات و آفات وہ شدائد و مصائب جو لوجہ نہ ہونے خداوند صاحب دادگر کے اہل ہند پر ہر روز حادث تھے، دفعتاً رفع ہوئے، ملک رونق و عمارات اور خلق کو ایمنی و جمعیت نصیب ہوئی۔ فارغ البال لوگوں نے اپنی اصلاح احوال کی، بعد اصلاح، گفتار و مقال میں صرف ہمت کیا، زبان اردو کی ترکیب میں اور فصاحت و بلاغت میں جب جب مبذول ہوا تو یہ زبان ایک فصیح و لطیف و شیرین زبان بن گئی اور ۱۸۱۳ء گورنری مارکوئس آف ہیسٹنگز بہشتم گورنر جنرل ہند سے لے کر آج تک یہ زبان ایسی مانجھی گئی۔ کہ ہم پایہ زبان فارسی ہوئی۔ شرفائے شہر شاہجہاں آباد ایسے طبع آزمایان خوش فکر اور ایسے سخنوران کامل گزرے ہیں۔ کہ ان کا کلام پاکیزہ موجود و مرتب اور ہم پلہ اساتذۂ ایران معتبر ہے۔ اکثر ان حضرات میں سے رہگرائے عالم بقا ہوئے اور بعض اس وقت بھی موجود ہیں، ادام اللہ زمان کمالہم ہیں، یہاں ان کے اسماء درج صحیفہ کرتا ہوں۔

جرات و انشاء و رنگین و نصیر و معروف و ناسخ و شہید و منیر، و احسان یہ لوگ کچھ پہلے شمار کئے گئے ہیں۔ افضل المتاخرین و اکمل المتقدمین اوستادی عمی مرزا اسد اللہ غالب اور حضرت عمی محمد بی و مطاعی نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر و رخشاں اور عزیزی اخی ثاقب سخنور و سالک و رضوان سلمہم اللہ صہبائی و آزردہ و مومن و شیفتہ و سوز و عارف و ذوق و اشکی و حسرت و محو و حیا و کوکب وغیرہم یہ بڑے نامی سخن سنجان زبان اردو اور شیریں کلامان ریختہ ہیں۔ مسودۂ اوراق نے ان حضرات کے کلام بھی دیکھے اور خود شریک صحبت مشاعرہ رہا ہے۔ بعض ان میں وہ لوگ ہیں کہ ان کا کلام سند اور ان کی فصاحت و بلاغت معتمد ہے، انھیں حضرات نے مکروہ ہندی و اسقام زبان اردو دور کئے اور اس زبان کو زبان ریختہ بھی کہا۔ اس شہر میں بعض مستورات زن بھی شاعرہ گذری ہیں کہ تذکرۂ "گلشن بے خار" و "بہارستان ناز" میں مشروحاً ان احوال و اشعار مذکور ہیں۔

نظم علائی

ہاں دل نغمہ سنج زمزمہ ساز	کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز
مارے اردو کا کچھ بیاں ہو جائے	خامہ طوطیٔ خوش زباں ہو جائے
ہے درود حلب بیان اردو	زیور شاہد زبان اردو
ہے زباں ایک اور چار مزے	اس کی ہر بات میں ہزار مزے
یوں تو ہر قوم کی زبان ہے خوب	اس کا اس رنگ میں بیان ہے خوب
پر یہ ترکیب دل پسند کہاں	لفظ و معنیٰ ارجمند کہاں
دلربا اس کے بذلہ ہائے عجیب	جاں فزا اس کے نکتہ ہائے غریب

معنی و لفظ اس کے جاں پرور — حُسنِ ترکیب خود جہاں پرور

میں کہوں کیا کہ یہ زباں کیا ہے — لطف کیا وسعتِ بیاں کیا ہے

آسمانی زباں سے ملتی ہے — دلّی میں آسماں سے ملتی ہے

لیک مانے نہ دیدہ ور اس کو — آسمانی کہوں اگر اس کو

خاص یہ اردوئے جہاں آباد — مستمع کی ہو جس سے جاں آباد

آسماں پر اگر فرشتہ جائے — یہ زباں کے مزے کہاں سے لائے

لاکھ عالی ہو ہم سے شانِ ملک — ایسی ستھری کہاں زبانِ ملک

ہم بنے خاص اس زباں کے لئے — نہ بنی یہ زبان جہاں کے لئے

یا خدا تا رہے زمین و زماں — تا رہے ہند کا زمیں پہ نشاں

اہلِ دہلی کی یہ زبان رہے — حسنِ تقریر اور بیان رہے

لطفِ حکام عہد سے یہ زباں — رونقِ تازہ پائے اے مُنّاں

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ صرف اسی شہر میں چرچا شعر و سخن کا ہوا بلکہ اطرافِ ہند میں بھی زبان اردو نے رواج پایا۔ اسی ۱۸۰۰ء کے درمیان عرصہ ۶۰ برس میں شعرگوئی کے فن نے ترقی پکڑی مگر انصاف یوں ہے کہ اور سب میں لکھنؤ نے بیشتر فصاحت و شستگی و سلاست زبانی و حسنِ ترکیب کو ملحوظ رکھا۔ اور اس دیار میں قدما میں ناسخ و آتش و آباد و خلیق اور متاخرینِ حال میں انیس و دبیر و عشق و مونس و انس و امیر اچھے شاعر ہیں، ہرچند کہ والا نظرانِ نکتہ سنج باعتبار فصاحت و بلاغت پورب کے شعرا کو سخنورانِ شاہجہان آباد پر فضل و برتری نہیں دیتے اِلّا حق یوں ہے کہ اور تمام بلادِ ہند سے ان کی زبان پاکیزہ تر اور ان کو اوروں پر رجحان اور تفوق حاصل ہے و ہو ہٰذا الہو دالحق اقول یہاں سے لازم ہے کہ مسودۂ اوراق نثر اردو کے رواج کی حقیقت جس سے اصل رواج اردو مراد ہے لکھیے۔

مخفی نہ رہے کہ شرفائے شاہجہان آباد کو باہمہ آرائش زبان و تصرفِ ترکیب و باہمہ نظر بیان و استحسان فن شاعری بزبان ریختہ و باہمہ اختیار شعرگوئی و قافیہ سنجی و باہمہ اعزاز و تکریم شعرائے ریختہ کو اردو نثر لکھنے سے اجتناب رہا بلکہ بعض پابندانِ قیود جو خوش وضعانِ اہل ہند، اعتبار کئے جاتے ہیں یہاں تک اس سے نفرت رہی کہ انشا و کتابت و ارقام صحائف و مطالب کو اپنا ننگ و عار جانتے تھے۔ شاید وجہ یہ کہ یہ زبان مادری ان کی بے مشقت تعلیم حاصل شدہ مرکب از زبانِ دیسی بھاکا و الفاظ لشکری بازاری تھے کہ وہ لوگ اس سے محترز ہوئے۔ ایسی پابندی بعض امور میں اہل ہند کو اکثر ہوتی ہے اور مجھ کو اس کی تشریح اطناب محل ہے۔ نامہ نگار نے دو چار برس پہلے دیکھا ہے کہ باہمہ کمی سرمایہ و نقصانِ علمی گذارش مطالب پر فارسی میں قادر نہوں مگر جب لکھیں تو فارسی ہی لکھیں اور اپنی زبانِ اردو میں کبھی دقتِ انشا و املا میں کتنی ہی اغلاط واقع ہوں تو اس سے شرم نہ کریں بلکہ کچھ اعتذار بیہودہ فرما کر اپنا حسن وضع اس کو جانیں۔

نظر بر ایں رسوم و عادات آج سے تیس برس پہلے رسم اردو نثر کی نہ تھی، لا محالہ سرکار ابد مدار کو بھی ہندوستان میں دفاتر کا انضباط فارسی مرعی رہا۔ پایانِ کار اس سے مشکلات عدیدہ پیش آئیں۔ اوّل تو یہ کہ حکام از ولایت تازہ رسیدہ کو اس قدر جلد حاصل کرنا زبان کا کہ ما علیہ مقدمہ پر آگہی تمام پائیں دشوار رہا۔ دوسرے یہ کہ عوامِ ہند کو افہام و تفہیم معاملات فارسی میں جو ان کی نہ زبان تھی نہ انھوں نے حاصل کی تھی سخت محال۔ سوائے اس کے کہ حاکم عہد نے بہ اندیشۂ صواب گرامی دادخواہ کا داد کو پہونچنا اور اپنا انصاف بواجب مراد کو نہ پہونچنا تصور فرما کر دفتر بدل و باقی الواقع رائے سنجیدہ اور اندیشۂ معدلت رائے اندریں معاملہ حکامِ عہد نے فرمایا۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ معاملہ زمانۂ گورنری جناب لارڈ ولیم بینٹک صاحب بہادر ہشتم گورنر جنرل ہند سے ۱۸۲۷ء میں بروئے کار آیا۔ لیکن اردو کی نثریں اس وقت بھی اچھی نہ تھیں۔ کیوں کہ دل اور زبان خلق پر ایسے محاورات فارسی چڑھے ہوئے تھے کہ گذارشِ مطلب اسی رنگ و محاورات میں اردو زبان میں کرتے اور وہ ایسا بے مزا و بے لطف ہوتا

کہ طبع مذاق انگیز کو اس سے نفور ہو، چنانچہ اب بھی بعض حضرات بے توجہ و ناشائق جو متصدیانِ ہندی تعلیم و تربیت پا چکے ہیں پہلے فارسی ایسی لکھتے تھے جس کے ایک خط کی عبارت میں لکھتا ہوں وہو ہذا اسی رنگ کی ہیں۔

"برخوردارِ من! از ایں روزیکہ آں برخوردار رہگرائے آں صوب شدہ اند بہ ترقیم احوال خود نہ پرداختند، دل و خاطر ازانجا کہ متعلق است، لازم کہ زود خیر و عافیت خود بنویسند۔"

اور اس کا ترجمہ بعینہٖ حرف بحرف یوں فرماتے ہیں اور وقتِ ضرورت یوں اردو میں اس کے مطلب کو لاتے ہیں۔

"برخوردار میرے اس دن سے کہ وہ برخوردار رہگراہ اس طرف کے ہو گئے ہیں ساتھ لکھنے احوال اپنے کے نہ مشغول ہوئے ہیں، دل و خاطر کہ اس جگہ سے کہ متعلق ہے لازم کہ جلد خیر و عافیت اپنی لکھتے رہیں۔"

ما نا کہ مفہوم و مراد و مطلب مکتوب الیہ و سامع اس سے پا جاتا ہے مگر لطفِ محاورات اور زبان کا مزا کب ایسی تحریر میں آتا ہے۔ اصل پوچھئے تو گذارش مدعا اس رنگ پر بامزا و بامحاورہ یہ ہے۔

"کہ میاں جس روز سے گئے ہو اپنی خیر و عافیت نہیں لکھی لازم کہ جلد اپنا احوال لکھو۔"

مگر میں امید کرتا ہوں کہ جو اسقام بدایتِ حال میں تھے وہ اب بہت دور ہو گئے ہیں اسی طرح جواب ہیں۔ وہ کچھ عرصہ قلیل میں کلام سے اور ان کے محاورات کلام سے نکل جائیں گے کہ حکامِ ہندوستان ہنر نواز کو تربیت و تعلیم و ہدایت واماندگانِ جاہل کی جانب اور احداثِ مدارس و ترقی تعلیم زبان اردو و ازدیاد تالیفات حاوی مطالبِ مشکلہ مختلفہ کی طرف، توجہ و التفات کثیر ہے، یقین ہے کہ سعی موفور حکامِ عہد مشکور ہو اور باقی ماندہ عیوب اس زبان سے دور۔

اگرچہ اہلِ لکھنؤ نے اپنی زبان کی آراستگی کی کوشش اچھی کی اور بہت پاکیزہ شیوہ و رنگ پر نثر ہائے اردو لطیف لکھے ہیں مگر اس شہر میں اب بھی اچھے لوگ باقی اور ان کی عبارت اردو پاکیزہ و دلچسپ ہے۔ بایں ہمہ یہ ایک شیوہ خاص مذاق انگیز جو حضرت اوستادی و مخمی مولانا غالب نے نکالا ہے یہ کسی کو نصیب نہیں۔ حق یوں ہے کہ طرح بنائے ریختہ حضرت ہی نے ڈالی اور خود ہی موجد اور خود ہی مکمل اس کے ہیں۔

بالجملہ جیسے یہ اردو پہلے چار لغات یعنی عربی و فارسی و ترکی و ہندی سے مرکب تھی اب پانچ زبان پر مشتمل ہوئی یعنی زبانِ انگریزی بھی اکثر اس میں داخل ہوئی اور ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً عدالت گاہوں میں الفاظ سررشتہ مثل اپیل و ڈگری و اپیلانٹ و ریسپانڈنٹ و وارنٹ و سمن وغیرہ اور روزمرہ بیع و شراء کے معاملات میں مثل ریل و بوگی و بوتل و گلاس و کوچ و لمپ و چرٹ و لالٹین اور اسمائے غریبہ ولایت جو یہاں پیدا نہیں مل گئے ہیں اور مستعمل ہو کر اردو کا ایک جزو سمجھے جاتے ہیں۔ بدیں امر اس زبان کی ترقی یوماً فیوماً متصور ہے۔ واللہ و اعلم بحقیقۃ الحال۔

اب میں اس مختصر نامہ کو دعائے عافیتِ حاضرینِ دہلی سوسائٹی اور دعائے ازدیادِ عمر و حشمت صاحب کمشنر بہادر دہلی پر ختم کرتا ہوں اور ناظرینِ حق گزیں سے اپنی سہو و خطا پر عفو اور مکرمت کا امیدوار اور مبدار فیاض سے بہر فیض دہلی سوسائٹی کا طلب گار ہوں۔

الٰہی مملکتِ ہند کو زیرلوائے جہاں کشائے حضرت ملکۂ معظمہ انگلستان رونق و آبادی تازہ حاصل اور رعایا کو توفیق شکر نعمت و فرماں بری بادشاہ عہد بدل اور حکام عادل کا دل جانب عوام و خواص بہ مہر و لطف مائل رہے۔

نظم

برتست پاس خاطر بیچارگاں و شکر | بر ما و بر خدائے جہاں آفریں جزا
یارب زبادِ فتنہ نگہدار خاک ہند | چندانکہ خاک رابود و باد را بقا

والسلام وھو آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔

اب آپ ہی انصاف سے کہئے اور گوش ہوش سے سنئے کیا حضرت علائی کی روح غالب کی زبان میں ہم سے یہ فریاد نہیں کر رہی ہے کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو | مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

★

پاکستانی ادیبوں کا

کنونشن

کراچی : ۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء

•

* منشور
* سفارشات اور تجاویز

•

- شاہد احمد دہلوی
- جسیم الدین
- ڈاکٹر مولوی عبدالحق
- ممتاز حسین
- قدرت اللہ شہاب
- جمیل الدین عالی

پاکستانی ادیبوں کا

منشور

- ہم پاکستانی ادیب اپنے وطن کی ترقی اور عظمت، امنِ عالم اور بنی نوعِ انسان کے ارتقا کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا عہد کرتے ہیں۔
- ہم اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق انسانی حقوق میں اپنے ایقان کا اعادہ کرتے ہیں۔ بحیثیتِ ادیب ہمارا بنیادی حق آزادیٔ اظہار و تبلیغِ نظریات ہے جس کے بغیر ادبی تخلیق بے معنی ہے۔
- ہمیں اپنی عظیم تمدنی روایات پر فخر ہے اور ہم ان کی حفاظت اور ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔
- ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ ہم سچائی کا اظہار کرنے والے جذبۂ وطن پرستی کو ابھارنے والے، عالمی یکجہتی اور تعاون کے لئے راہ ہموار کرنے والے اور انسانی رشتہ کو استوار کرنے والے ہیں۔ ہم ایسے حالات کے خالق ہیں جن میں بنی نوعِ انسان آسائش اور عزت سے زندہ رہ سکے۔
- بحیثیت ادیب انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم نے اپنے ذمہ ایک خوش آیند اور صحتمند معاشرہ پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں ہر فرد کے لئے آگے بڑھنے کی راہیں کھلی ہوں جہاں دولت اور طاقت انسانی اقدار اور روحانی آدرشوں کی پابند ہو، اسی لئے ہم سائنس کی ترقی پر ایمان رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ دنیاوی امن اور خوشحالی کی ضامن ہو۔

—•—

سفارشات اور تجاویز

سماجی اور اقتصادی مسائل

(۱) — ادیبوں کو اظہار اور تبلیغِ خیالات کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔

(۲) — کسی ادبی، فنی یا ثقافتی انجمن پر کوئی قید نہیں ہونی چاہیئے۔ سوائے اس کے کہ کسی عدالتی فیصلہ کے مطابق پابندی لگائی جائے۔

(۳) — رائٹرس گلڈ کے اراکین کو سفر کی سہولتیں اور رعایتیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ پاکستان کے ہر حصہ میں جاکر سماجی تحریکوں میں معاون ہوں یا ان کی ابتدا کریں۔

(۴) — ایک ایسا نظام مرتب کیا جائے جس کے تحت مردہ یا اپاہج ادیبوں کے خاندان اور بچوں کی سماجی اور اقتصادی بہتری یقینی ہو۔

(۵) — اگر کسی ادیب کے خلاف فحش نگاری کا الزام لگایا جائے تو چارہ جوئی سے پہلے رائٹرس گلڈ کی رائے مانگی جائے۔

(۶) — ریڈیو اور حکومت کے اشاعتی ادارے انتخاب کرتے وقت سوائے ادبی اقدار کے کسی اور تمیز کو بروئے کار نہ لائیں۔

(۷) — ادیبوں اور کتابوں کے دوسرے ملکوں سے تبادلے زیادہ اور جلد ہوں۔

(۸) — حکومت سماجی اور اقتصادی منصوبے بناتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں تحریر ذریعۂ معاش اور باعزت پیشہ بن سکے۔

(۹) — سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ادیبوں کو فوراً رہا کر دیا جائے یا اُن پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

(۱۰) — حکومت جب ادیبوں کو دوسرے ملکوں کی دعوتوں پر بھیجے تو اسے چاہیئے کہ وہ رائٹرس گلڈ سے ناموں کے بارے میں مشورہ لے۔

(۱۱) — کتابوں کی درآمد برآمد پر سے مروجہ پابندیاں اٹھالی جائیں۔

(۱۲) — سرکاری ملازم ادیبوں پر سے مندرجہ ذیل پابندیاں اٹھالی جائیں:

(الف) ریڈیو اور حکومت کے اشاعتی اداروں سے انہیں کسی تخلیق کے پچیس روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ یہ تفریق ختم ہونی چاہیئے۔

(ب) مروجہ قوانینِ ملازمت کے تحت انہیں اپنی کتابوں کی آمدنی کا ایک تہائی حکومت کے خزانہ میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ یہ پابندی دور ہونی چاہیئے۔

حقوقِ مصنفین

مروجہ کاپی رائٹ ایکٹ میں چند تبدیلیوں اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) — حقِ طباعت بحقِ مصنف محفوظ ہونا چاہیئے۔ فروختگیٔ حقوق کی صورت میں ناشر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک حقدار رہ سکتا ہے۔

(۲) — مروجہ ایکٹ میں تعیّنِ مدّت کی شق میں تبدیلی کرکے ورثا کو پچاس کی بجائے سو سال تک حقوقِ طباعت دیئے جائیں۔

(۳) — موسیقار کی مرتّب کردہ دھنوں کو بغیر اجازت استعمال کرنے پر پابندی لگائی جائے۔

(۴) — مروجہ ایکٹ میں مناسب دفعہ کا اضافہ کیا جائے جس کی رُو سے نصابی کتب کے جملہ حقوق بحقِ مصنف یا ورثا محفوظ ہونے چاہئیں اور اس کا معاوضہ بصورت رائلٹی ادا کیا جائے بجز اسکے کہ مصنف کو یہ بات منظور نہ ہو۔

(۵) — حکومت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس تجویز پر غور کرے کہ مصنف اپنی کتاب کی طباعت کا معاوضہ دوسرے ملکوں سے بھی وصول کر سکے۔ خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس نوعیت کا معاہدہ۔

(۶) — مصنفوں کی کتابوں کی آمدنی پر انکم ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔

(۷) — ایک ایسا قومی کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں ہر مصنف کی ہر کتاب کی دو جلدیں کتاب کا ناشر لازمی داخل کرے۔

★ رائٹرس گلڈ ایک دار الاشاعت قائم کرے جسکے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں:-

(۱) — دار الاشاعت ادیبوں کے فائدے کے لئے ہو۔

(۲) — اراکین انجمن اور اساتذۂ قدیم کی تخلیقات کی اشاعت۔ اسکے علاوہ انجمن کا کوئی اور مجوزہ کام۔

(۳) — پاکستان کی قومی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے ادب کی ترویج اور فروغ۔

(۴) — مشرقی اور مغربی پاکستان میں ثقافتی ہم آہنگی کیلئے کتابوں کا تبادلہ اور ترجمے۔

(۵) — بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کی نمائندگی۔

(۶) — دوسری زبانوں کی کلاسکی اور شہرۂ آفاق تخلیقات کے ترجمے۔

خطبۂ استقبالیہ :

شاھد احمد دھلوی :

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

میں اس کنونیشن کی مجلسِ عمل کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں مندوبین کا شکریہ ادا کرنا واجب نہیں سمجھتا کیونکہ جس کام کے لئے وہ زحمت فرما کر یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ان کا اپنا کام ہے البتہ میں اس امر پر اظہارِ مسرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سب نے مجلسِ عمل کی آواز پر لبیک کہا اور مکمل تعاون کا ثبوت دیا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قومی پیمانہ پر ادیبوں کا اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس اجتماع میں ہر مکتبِ خیال اور ہر پیشہ کے ادیب موجود ہیں۔ یہ واقعی ایک تاریخی اور عظیم اجتماع ہے۔

اس وقت میرا مقصد کوئی ادبی قسم کا خطبہ پیش کرنا نہیں ہے ادبی موضوعات پر مقالے ہماری آخری نشست میں پڑھے جائیں گے جو ساجھان مقالات کے ذاتی خیالات ہوں گے۔ میری حیثیت میزبان اور میرے موجودہ فرائض کی ذمہ داریاں اس کی متقاضی بھی نہیں تھیں۔ کنونیشن کے انتظام میں جو دشواریاں تھیں، میں ان کی تفصیل بتا کر بھی آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اتنا عرض کر دوں کہ نو آدمیوں کی ایک مختصر سی تنظیم سے جس کے پاس نہ دفتر ہو نہ ملازمین نہ روپیہ ہو اور نہ فرصت اور جس کے سب رکن دن بھر فکرِ معاش میں مبتلا رہتے ہوں اتنے بڑے کام کی تکمیل کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر جب نیت ثابت ہوتی ہے تو منزل آسان ہو جاتی ہے اس شہر سے چند مخلص ادیب اٹھے اور انہوں نے سر جوڑ کر پاکستانی ادب اور ادیبوں کی بہتری کے لئے ایک تجویز سوچی ان کی ہمت اور اللہ کی مدد سے وہ تجویز اس بڑے اجتماع میں تبدیل ہو گئی۔

خواتین و حضرات!

۴ ردسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے آٹھ ادیبوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں اس کنونیشن کی تجویز پیش کی، یہ ادیب کسی ایک مجلس کے رکن نہیں تھے بلکہ کسی ایک شہر کے رہنے والے بھی نہیں تھے اس اعلان نامے کے بعد انہوں نے اپنے حلقۂ عمل کو وسیع کیا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی میری دلی آرزو بھی یہی تھی اس لئے باوجود خرابیٔ صحت کے میں ان کے ساتھ ہو گیا اس کے بعد انہوں نے ہر مکتبِ فکر کے کارکن ملائے اور یہ سب اُن کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب ایک جگہ جمع ہیں۔

کنونیشن کے بارے میں جو پہلا اعلان ہوا تھا اسے ملک بھر میں انفرادی اور جماعتی طور پر پسند کیا گیا، پریس نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور بہت سے اخباروں نے تفصیلی اور تعمیری اداریئے بھی لکھے لیکن اس اعلان سے چند در چند غلط فہمیاں بھی پھیلیں۔ کوئی نئی بات نہیں تھی خلوص کو اکثر شبہ کی نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ کام حکومت کے اشارے پر کیا جا رہا ہے یہ گمان انہیں یوں ہوا کہ اس اعلان پر جن ادیبوں کے دستخط تھے ان میں سرکاری ملازم بھی شامل تھے یہ بھی سمجھا گیا کہ اس کام کے لئے حکومت نے خفیہ طور پر روپیہ دیا ہے ورنہ پاکستان کے ادیبوں میں یہ بات کہاں کہ اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھائیں یہ بھی کہا گیا کہ لوگ ذاتی مفاد اور ادبی مقاصد حاصل کرنے کے لئے یہ کنونشن کر رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، ظاہر ہے کہ ایسے شبہات فوری اور اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھے لیکن ان سے مجھے اور میرے رفقائے کار کو بے حد اذیت ہوتی رہی کیونکہ پچھلے ۳۵ - ۴۰ سال سے ادب کی بُری بھلی خدمت کر رہا ہوں اور مجلسِ عمل کے اراکین بھی اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ ادبی حیثیت اور ذاتی کردار رکھتے ہیں ان میں جو سرکاری ملازم ہیں اس بات پر کڑھتے تھے کہ آخر ان کا سرکاری ملازم ہونا کون سا جرم ہے آخر وہ پہلے بھی تو سرکاری ملازم تھے اس لئے جب ہم ان ہی سے برابر اس قسم کی باتیں سنتے رہے تو ہماری بہت دل شکنی ہوتی رہی اور ہم سوچنے لگے تھے کہ شاید ہم نے یہ ساری بات ہی غلط شروع کی ہے ہم میں آپس میں بھی اکثر اختلافات پیدا ہو جاتے تھے اور اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ہماری تجویز دم توڑ دے گی مگر نیت کی صداقت اور کام کی لگن نے اس نوبت کو نہیں آنے دیا۔

قیامِ پاکستان کو ساڑھے گیارہ سال ہوئے قومی زندگی کے ہر شعبہ کی طرح ادب اور ادیبوں میں بھی افراتفری کا دور رہا۔ سیاست دانوں اور اہلِ اقتدار نے اول تو ہماری

گذارشات کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اور اگر کی بھی تو یہ کی کہ کچھ ادیبوں پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو فیشن کے طور پر اختیار کرنے والے چند افسروں کے ہاتھ میں پورے ملک کی ادبی تحریکوں اور تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی اجارہ داری آ گئی۔ سرپرستی کی تو یہ کہ چند شعرا اور ادبا کو ذاتی وظیفوں سے نواز دیا ہمیں ان وظائف اور افسروں کی ان بالادستیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پچھلی حکومتوں نے اتنا بھی کیا تو بہت کیا۔ مگر ہم اپنی اپنی شکایت میں حق بجانب ہیں کہ انہوں نے اتنے بڑے ملک کے اس سرمایہ کو جسے ادب کہتے ہیں، اور ترقی دینے کی مطلق کوشش نہیں کی شاید وہ ادیبوں کو بدقماش، بے کار، اور تماش بینوں کی ایک تفریحی جماعت اور کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرہ اور ایک آدھ تقریر کرا دینا یا ایک آدھ سرکاری رسالے کے اجرا کو پورے ملک کی تہذیبی اور ثقافتی مطالبات کا جواز سمجھتے رہے، انہوں نے مصوری، رقص اور موسیقی پر تو کبھی کبھار توجہ دی بھی کیونکہ ایسی نمائشوں اور محفلوں میں انہیں کچھ مزا بھی آجاتا تھا اور ان کی ذہنی پس ماندگی کا پول بھی نہیں کھل پاتا تھا مگر ادب اور ادیب کی بنیادی حیثیت سے وہ کبھی آگاہ نہ ہو سکے۔ اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تازگی، جوش اور عمل ہمارے ادیبوں میں ۱۹۴۷ء میں تھا وہ ۱۹۵۸ء تک یکسر معدوم ہو گیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حکومتیں اچھا ادب پیدا کرا سکتی ہیں۔ جی نہیں ہرگز نہیں، ادب تو اچھے ادیب ہی پیدا کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں ان پر پابندی لگائی جائے یا ہدایات کا پابند کیا جائے تو وہ لکھنا بند کر دیتے ہیں لیکن حکومتیں ملک میں اچھے اور بُرے ادیب پیدا کرنے کے حالات ضرور پیدا کر سکتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں کہ نئی حکومت ہمارے لئے نئی امیدیں لے کر آئی ہے اب وہ کہاں تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس کا جواب وقت دے گا یہ ضرور ہے کہ اس حکومت کے تعمیری پروگرام کو دیکھتے ہوئے ہمیں بھی اس کوشش کا خیال پیدا ہوا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ حکومت ادب اور ادیبوں کے معاملے میں ہمدردی اور روشن خیالی کا ثبوت دے گی لیکن اس کے علاوہ حکومت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور سرکاری ملازم کارکنوں نے جو بھی کام کیا ہے وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے ویسے ہم حکومت سے امداد لینا جرم نہیں سمجھتے۔ حکومت ہمارے ہی محاصل کی ضامن ہے اور ہمارے اپنے ملک کے شہریوں پر مشتمل ہے لیکن ہم نے اس اجتماع کے لئے ہر قسم کے معاملات میں آزاد اور خود کفیل رہنے کی کوشش کی ہے ہم تو آدمی کوئی منظور شدہ جماعت بھی نہیں تھے کہ دفتروں کے دروازے کھٹکھٹاتے، ہم نے ریلوے کے محکمے سے مندوبین کے لئے اس رعایت کی درخواست کی جو وہ صحافیوں اور طالب علموں کو دیتا ہے مگر پہلی بار ہماری درخواست رد کر دی گئی اور جب ہم نے مالی مجبوریوں سے متاثر ہو کر وہاں کے اعلیٰ افسروں کو کنونیشن کی اہمیت جتائی تو انہوں نے اتنی رعایت منظور فرمائی کہ نچلے درجے کے ٹکٹ پر اس سے اونچے درجہ میں سفر کیا جا سکتا ہے یہ حکم بھی اتنی دیر سے جاری ہوا کہ ہم اب تک اپنے کئی مندوبین کے بارے میں پریشان ہیں کہ انہیں اس رعایت کا فائدہ حاصل ہو سکا یا نہیں۔

ہم نے پی۔ آئی۔ اے سے بھی درخواست کی تھی اور ان کے پاس اپنے نمائندے بھی یہ عرض کرنے بھیجے کہ وہ مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے کرایہ میں کمی کریں مگر وہاں سے صاف انکار ہو گیا حالانکہ یہ ادارہ بڑے افسروں اور امرا کو لندن کی سیر بارہا کرا چکا ہے۔ ع

ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

مرکزی حکومتی اداروں سے ان دو درخواستوں کے علاوہ ہم نے نہ کوئی اور درخواست کی اور نہ ادھر سے کوئی پیشکش قبول ہوئی، ہاں ابھی ۲۳ فروری کو جب ہمارے مشرقی پاکستان کے مندوبین کی تعداد بڑھ گئی اور ان کے مالی مسائل جواب دے گئے تو البتہ، ویسٹ پاکستان یونٹی فنڈ سے کچھ روپیہ صرف مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے لیا گیا وہاں کے مندوبین کے کرایہ کا انتظام ان ہی کی کوشش اور ان ہی کے روپیہ سے ہوا ہے۔

لاہور کے مندوبین کا کرایہ وہیں کے ایک مخیر علم دوست نے دیا ہے مگر ان کے قیام کا انتظام چند دیگر مقامات سے آنے والے مندوبین کے کرایہ اور ان کے قیام کا انتظام اور کراچی کے اخراجات کراچی کے چند دیگر علم دوست حضرات نے کیا ہے، وہ سب عطیات جو اس سلسلہ میں وصول ہوئے ان کی فہرست اسی خطبے کے آخر میں دے دی گئی ہے ہم نے کوئی مہم، چندے کی نہیں چلائی بلکہ رضاکارانہ امداد پر اکتفا کیا جو ان علم دوستوں نے ہمارے مقاصد کو دیکھتے ہوئے خود پیش کی یہ سب اپنے ناموں کا اعلان نہیں چاہتے مگر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے نام پردۂ خفا میں، نہ رکھے جائیں۔

اچھا اب خو گرِ جور سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجئے ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ کنونیشن پاکستانی ادیبوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہو، اس لئے دعوت نامے جاری کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے کہ کسی آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ عددی حساب سے پاکستانی ادیبوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں پہ ہے ظاہر ہے کہ ہم سب کو نہیں بلا سکتے تھے لہٰذا ایک خاصی تعداد کو شکوہ ہے کہ ہم نے انہیں نظر انداز کر دیا ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگرچہ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن وہ ہمارے

پاکستانی ادیبوں کا کنونشن

(کراچی)

شاہد احمد دہلوی، صدر مجلس عمل، کا خطبۂ استقبالیہ

۔ ۔ ی دا ڈیمی کے جوائی ا ڈر ۔ حسیم الل
۔ ۔ ول ے صدارت کے وزائص انعام دئیے

ررا محمد ۔ عد ے کنونشن کا افتاح ورںا ا

مہمان اور ۔ ندو ں
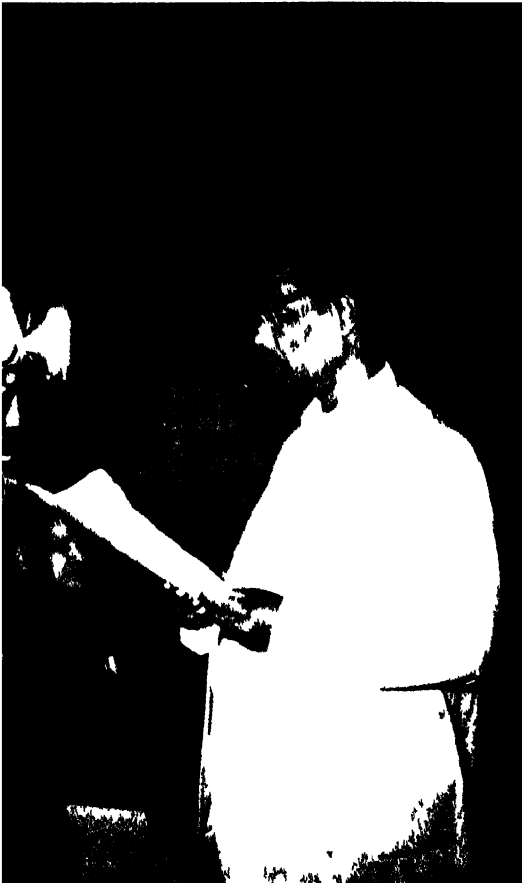
دل سے بہت قریب ہیں اور اگر مالی وسائل اجازت دیتے تو یہ اجتماع شاید دوگنا ہوتا۔ انہیں یقین کرنا چاہئے کہ کنونشن میں جو قراردادیں منظور ہوں گی وہ تمام ادیبوں کی ترجمانی کریں گی اور اس کنونشن سے فائدہ پہنچے گا تو سبھی کو پہنچے گا یہ بات ہمارے جاننے کی نہیں بلکہ خود ادیبوں کے سمجھنے کی تھی یہاں تو کوشش ہوئی کہ اجتماعی طور پر سوچ بچار کیا جائے مگر ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے معاملات کو ذاتی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی شہر کراچی میں چند اہلِ قلم نے ہمارے دعوت ناموں اور تحریری یاد دہانیوں کو شاید اس لئے قابلِ جواب بھی نہیں سمجھا کہ سرکاری یا سماجی طور پر ان کی حیثیت عام مندوبین سے بہتر ہے۔ افسوس کہ ہماری برادری کے بعض غلط اندیش افراد نے ہم پر بہتان باندھے اور بعض نے دھمکیاں تک دے ڈالیں۔ ایک اچھے خاصے ادیب نے اس بنا پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ معمر ادیبوں کو کنونشن میں کیوں بلوایا گیا ہے۔ یعنی وہ فرماتے ہیں کہ بھیڑوں میں اونٹ کیوں بلائے جاتے ہیں۔ ع

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

چند حضرات کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ادب کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے کچھ لوگوں نے بڑے بڑے کرنے اور اخراجات مانگے کچھ نے اس کنونشن کو مشاعرہ سمجھ کر بولنا شروع کر دیا کچھ کو یہ اعتراض رہا کہ یہ کام نو آدمیوں نے کیوں شروع کیا اور گھر گھر پھر کر ہر شہر میں دستخطوں کی مہم کیوں نہیں چلائی۔

یہ چند مثالیں اس لئے پیش کی گئیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہماری برادری میں اس ذہنیت کے لوگ بھی موجود ہیں۔ اس ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے باہمی اختلافات کو مٹانے کی ضرورت ہے، ادب ایثار چاہتا ہے ادب رواداری چاہتا ہے خشونت و منافقت کا شکار سب کچھ ہو سکتا ہے ادیب نہیں ہو سکتا۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اگر اس اندھیرے میں کچھ درخشاں کرنیں نہ ہوتیں تو شاید یہ اجتماع ہی نہ ہونے پاتا شکر ہے کہ دور دراز سے آنے والے اپنے انتظامات سے بھی آئے ہیں پھر بہتوں نے ہمیں حوصلہ افزا خطوط لکھے ہمیں مکمل تعاون کا یقین دلایا اور جہاں تک ہو سکا ہمارے لئے۔ بڑے فخر کی بات ہے ان رضاکاروں کی بدولت ہمیں اپنے بے حد مشہور دفتر کے لئے کوئی تنخواہ دار کارکن نہیں رکھنا پڑا۔

خواتین و حضرات!

ہمارا کام آپ سب کو ایک جگہ جمع کرنا تھا بحمد اللہ آپ سب یکجا ہو گئے۔ آپ کے سامنے مجوزہ طریقہ کار ہے اور پروگرام کی تفصیل و وضاحت بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو پروگرام کو قبول کر لیں آپ چاہیں تو اس میں من سب تبدیلی کر لیں یا اسے بالکل ہی ساقط کر دیں اور نیا پروگرام بنا لیں آپ چاہیں تو اس اجتماع ہی کو ختم کر دیں ہمارا پہلا اور آخری مقصد تو یہ تھا کہ آپ سب ایک بار جمع ہو جائیں تاکہ ہم ادب کے لئے اپنے لئے اور اپنے ملک کے لئے مضبوط اور ٹھوس تجاویز پر عمل کریں اور ہماری درخواست ہے کہ اس اجتماع میں نزاعی ادبی مسائل زیرِ بحث نہ لائے جائیں یہ اجتماع عددی حساب سے اتنا بڑا ہے کہ انفرادی قراردادیں پیش کرنے یا ان پر انفرادی تقریروں اور مباحثوں کی گنجائش نہیں اس لئے ہم نے موصول شدہ قراردادیں موضوعات پر تقسیم کر دیں جو آپ کے منتخب کردہ نمائندہ سنبھالیں گے قراردادیں پیش کرنے والے مختلف کمیٹیوں سے اپنے طور پر رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ اگلے اجلاس میں سکریٹری صاحب خود اعلان کر دیں گے کہ کن صاحب کی قرارداد کس کمیٹی کے پاس گئی ہے کمیٹیوں کی سفارشات آپ کے سامنے اجلاس میں پیش ہوں گی۔

ہمارے پاس صرف تین دن ہیں اور کام بہت ہے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں کتنے نظم و ضبط اور کتنی محنت کی ضرورت ہے یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے مگر یاد رکھئے کہ یہ ہماری تاریخ میں پہلا اور قیمتی موقع ہے اس میں بہت روپیہ خرچ ہوا ہے اور بہت سے کارکنوں نے بڑی قربانیاں کی ہیں یہ بھی نہ بھولئے کہ اس وقت نہ جانے کس کس کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں اور وقت ہم سے کیا تقاضے کر رہا ہے اگر ہم ادبی مباحثوں میں الجھ گئے یا ذاتی بنیادوں پر سوچنے لگے تو وقت بڑے افادی نتائج کے بغیر گزر جائے گا اور ہمیں امید نہیں کہ کوئی ادارہ یا فرد اس کنونشن کے ناکام ہو جانے کے بعد مستقبل قریب میں اتنے بڑے کام کو دوبارہ شروع کرنے کی ذمہ داری لے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارا یہ اجتماع ایک منظم مجلس کی شکل میں بدل جائے تو حکومت مدد کرے یا نہ کرے، ہم اسے ایک خود کفیل ادارہ بنا سکتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

مجلسِ عمل کے اراکین نے طے کر لیا ہے کہ اس خطبے کے بعد ہم اپنی جماعتی حیثیت کو ختم کر دیں گے اور عام مندوبین کی حیثیت اختیار کر لیں گے اور ان کے جماعتی

فرائض صرف اس کنونشن کے انتظامات تک محدود رہیں گے۔ مثلاً مہمانوں کے انتظامات اور اجتماع کی کارروائی۔ اب اس پورے اجتماع کو جاری رکھنے کی ذمہ داری آپ کی ہے اور آپ سب اپنے قانونی اور ادبی فرائض سے واقف ہیں ہم نے داعی بن کر جو زحمت اٹھائی ہے وہ اب ختم ہو جانی چاہیئے۔

چنانچہ اب ۲۸ دسمبر کے اعلان پر دستخط کرنے والے آٹھ افراد اور میں اپنی جماعتی حیثیت ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اب یہ پورا اجتماع اس امتِ مرحومہ کا جانشین ہے اس لمحہ کے بعد آپ کیا کرتے ہیں اور تاریخ آپ کو کس طرح یاد کرتی ہے یہ سب آپ کی ذمہ داری ہے

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خطبۂ صدارت :

جسیم الدین :

معزز خواتین و حضرات

ادیبوں کے اس جلسے کی صدارت کی عزت بخشے جانے پر میں اپنے کو بڑی الجھنوں میں مبتلا پاتا ہوں۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مجھ سے کہیں زیادہ دیرینہ سال قابل اور ممتاز شخصیتیں موجود ہیں۔ ایسی شخصیتیں جنہوں نے زندگی بھر ادب کی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ہم وطنوں کے لئے جنت سے آبِ حیات مہیا کیا ہے۔ اگر ان ہی میں سے کسی صاحب نے مسندِ صدارت کو رونق بخشی ہوتی تو یہ فرض بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ انجام پاتا۔ ان کی خدمات کی قدر دانی بھی ہو جاتی اور آپ حضرات بھی ایک خاص قسم کی خوشی اور فخر محسوس کرتے۔ مجھے اب اپنی نااہلی اور کمزوریوں کا شدید احساس ہو رہا ہے اور یہ احساس مجھے نڈھال کئے دیتا ہے۔ مجھے اپنے چاروں طرف ادب کے پھولوں کا جو چمن دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے رنگ و بو سے ساری فضا مہکتی اور دمکتی دکھائی دے رہی ہے۔

اس وقت مجھے مشرقی پاکستان کے دریائے پدما۔ جمنا۔ میگھنا۔ دھلے شوری مدھومتی۔ کمار۔ سیتا لکھا کے خوشگوار تموج سے تخلیق شدہ بھٹیالی گیتوں کے ساتھ ساتھ جہلم۔ بیاس اور سندھ کے کنارے بسنے والے کاشتکاروں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے گیتوں کی گنگناہٹوں کا ایک حسین امتزاج نظر آ رہا ہے۔

اس دیس کی دوشیزاؤں کے نرم و نازک گلے سے جکی پیستے وقت جو سریلے نغموں کا آبشار پھوٹ بہتا ہے وہ دور دراز مشرقی پاکستان کی اوکھلیوں کے ترنم کے ساتھ ہم آغوش ہو کر جا مدانی آنچلوں کا روپ دھار رہا ہے، اور آج اس جگہ کیسے کیسے چابک دست باغبانوں کا اجتماع ہے۔ ایرانی بلبل ہزار داستاں کے نغموں کے موقلم اور گلاب کے خونِ جگر کے رنگ سے کتنی حسین و جمیل تصویریں بنتے رہتے ہیں کشمیری شالوں کے رنگ برنگ شامیانوں کے سائے میں تربوزی قاشوں کے رنگ میں جو غزلیں ڈھلتی ہیں ان کی شیریں لہریں دور مشرقی پاکستان سے جا جا کر ٹکرا رہی ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے گل بوٹوں سے مزین سوزن کاری کے شاہکاروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی ہریالی کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ آم اور کٹہل کے گھنیرے سایوں میں کسانوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے والی سادہ اور بے لوث محبت اور سرسوں کے کھیتوں میں ارغوانی مٹر کے پھولوں سے سجی ہوئی رنگین کہانیوں کا روپ ملا لائے ہیں۔ سندھ پنجاب۔ بلوچستان اور سرحد کے خرمہ۔ اخروٹ۔ بادام۔ کھجور و انار کے درختوں کے سایہ میں آپ حضرات جو خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ہماری کہانیوں کے ساتھ مل ملا کر ایک نئی دوستی کا رشتہ استوار کر رہے ہیں۔ اگر میں اس دوستی کے سنگم کا باعث ہو سکا تو یہ بات میرے لئے بڑے فخر کی ہوگی۔ آج پاکستان کو وجود میں آئے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ وطن کے سیاسی اور اقتصادی بہت سے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ وطن کے دونوں بازوؤں سے سیاسی اور صحافتی اور تعلیمی جماعتوں نے مختلف ممالک کے سفر اختیار کئے۔ مگر بدنصیب ادیبوں کی خاطر کسی کو بھی سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ملک کے لکھنے والوں کے متحدہ اجتماع کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ آپ میں سے جن حضرات نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس اجتماع کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کی خدمت میں میں ہدیۂ تبرک پیش کرتا ہوں۔ اس عظیم اجتماع میں ادیبوں کے مسائل سمجھنے کا جو موقع آپ نے فراہم کیا ہے اس سلسلے میں آپ کی کوششوں کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملک کا صرف ایک طبقہ ہی بلندیوں پر گامزن ہونے لگا، ملازمت کا میدان ہو، صنعتی ادارے ہوں یا تجارت سب ہی پر اسی ایک طبقہ

۔کے لوگوں نے قبضہ جما لیا مگر ایک اور طبقہ تھا جو کہ رفتہ رفتہ تحت الثریٰ میں دھنستا چلا گیا اور یہ طبقہ دیس کے عوام پر مشتمل تھا اور ہم لکھنے والے اسی طبقہ سے متعلق ہیں اور ہم ہی یہ داستان بیان کریں گے کہ ہم کس طرح نیچے گرتے چلے گئے۔ آئیے آج آپ مشرقی پاکستان کے المناک حادثہ کی بابت سنئے۔

صورت خواہ کچھ مختلف ہی کیوں نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان کے ادیبوں کی بھی ان ہی جیسی درگت ہوئی ہوگی۔ آزادی سے قبل کے زمانے میں ہم کو اپنی تخلیقات کی طباعت و اشاعت کے لئے جدید ترین مواقع میسر تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کی راجدھانی ڈھاکہ میں آنے کے بعد ان تمام ذریعوں سے ہم محروم ہو گئے۔ آزادی سے قبل مشرقی پاکستان میں گنتی کے چند ہی اسلامی کتابوں کے ادارے موجود تھے اور انہوں نے سرمایہ دار ناشروں کے ساتھ مقابلہ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی ہستیاں برقرار رکھی تھیں۔ اس زمانے میں ہندوؤں کے اثر سے متاثر تعلیمی اداروں میں ان کی شائع کی ہوئی کتابیں شاذ ہی پڑھائی جاتیں لیکن آزادی کے فوراً بعد ہندو ہمارے تعلیمی اداروں کو خیرباد کہہ کر سرحد پار چلے گئے، جب کتابوں کی تجارت کی اجارہ داری مسلمان ناشروں کے ہاتھ میں آئی تو وہ راتوں رات بڑے آدمی بن جانے کے خواب دیکھنے لگے اور حکومت سے کتابوں کی اشاعت کے نام پر کاغذ کے پرمٹ حاصل کر کے چور بازار میں فروخت کرنے لگے۔ نظموں، ڈراموں ناول وغیرہ جیسی غیر درسی کتابیں جو اسکول میں نہیں پڑھائی جاتیں، چھاپنی بند کر دیں، اور جو غریب مصنّف پانی کے مول اپنی کتابوں کے حق طباعت دینے پر آمادہ ہو جاتے صرف ان ہی کی دو چار کتابوں کو نہایت بھدّے انداز میں چھاپ کر ناشر حضرات گویا ان پر احسان فرماتے۔ کتابوں کی طباعت، اشاعت، کتابت، جلد، گرد پوش غرض ہر چیز نہایت گھٹیا ہوتی اسلئے لازمی طور پر خریدار کے لئے ان میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں ہوتی غرض ہم ناشروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے رہے اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔

ڈھاکہ پہنچ کر میں نے ناشروں سے اپنی کتاب نقیش کا تھا رماٹ (FIELD OF THE EMBROIDERED QUILT) کی بابت بات چیت شروع کی۔ ایک ناشر صاحب نے مستقل ۶ مہینے تک مجھے دوڑایا۔ آخر ایک دن انہوں نے فرمایا:

"اگر آپ اپنی کتاب کا حق فروخت کر دیں تو میں اسے شائع کر سکتا ہوں"۔ میں انہیں تسلیم کر کے چلا آیا اور اس لئے چلا آیا کہ میرے والد صاحب نے مجھے ایم۔ اے پڑھانے میں خاصہ روپیہ صرف کیا تھا اور میں گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ اگر میری گزر اوقات صرف کتاب پر منحصر ہوتی تو مجھے ناشر صاحب کی خدمت میں پانی کے مول اپنی کتاب فروخت کرنی پڑتی اور اس طرح مستقبل میں میری اولاد اس کتاب کی آمدنی سے محروم ہو جاتی۔ مظہر الحق مشرقی پاکستان کے ایک ادیب ہیں جنہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھی ہیں ان کی بعض بعض کتابوں کے تیس تیس اڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک بھکاری کی زندگی گزار رہے ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں کا حق بہت ہی سستے داموں میں فروخت کر دیا ہے۔ اس قسم کی مثالیں مشرقی پاکستان میں اور بھی ملیں گی ناشروں کی چیرہ دستیوں کا اب سدّباب ہونا چاہیئے وہ ادیب جو غربت اور افلاس سے تنگ آ کر اپنی کتابوں کے حقوق کوڑیوں کے مول بیچ دیتے ہیں وہ ان کو واپس ملنا چاہیئے۔ اب ہمیں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کی رو سے کوئی بھی ناشر کسی ادیب کی کتاب کا حق خریدنے سے قاصر ہو۔ مجھے امید ہے کہ حکومت اس سلسلے میں جلد از جلد مناسب قدم اٹھائے گی۔ برصغیر ہند و پاکستان کا مشہور افسانہ نگار فضل الحق آزادی کے بعد امیدوں اور تمناؤں سے لبریز دل لے کر ڈھاکہ آیا۔ نوکری اور روزگار کی تلاش میں۔ لیڈروں اور وزیروں کے دروازوں کی خاک چھانتا رہا مگر پیہم فاقہ کشی نے اسے ایک دن ریل گاڑی کے پہیوں کے نیچے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ ایک گرانقدر زندگی جو ابھی پوری طرح نکھرنے بھی نہ پائی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی تاریکی میں کھو گئی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج اس کی لکھی ہوئی کہانیوں سے ہمارا وطن اور ہمارا سماج یقیناً فیضیاب ہوتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو غربت سے دوچار ہونا ہی چاہیئے غریبی میں جذبات کی تربیت ہوتی ہے لیکن زمانہ حال میں یہ مقولہ نہیں چل سکتا۔ غیر ممالک کے ادیبوں کے متعلق مجھے جہاں تک معلوم ہے ان کی آمدنی اچھی خاصی ہے غربت اگر اچھی تخلیق کے لئے ضروری ہوتی تو پھر ہمارے یہاں برنارڈ شا، ابسن اور ہارڈی جیسے ادیب کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ اس کے برعکس افلاس اور غربت کی وجہ سے ہمارے بہت سے ہونہار ادیب لکھنے ہی سے باز آ جاتے ہیں۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ناشر صاحب میری کتاب چھاپنے پر رضامند نہیں تھے اور چھپوانے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا ضروری تھا۔ عام طور پر پڑھنے والوں کے لئے کتاب کو جاذبِ نظر بنانے میں عمدہ کاغذ نفیس چھپائی اچھے بلاک میکر اور ایک اچھے آرٹسٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔

کرنا فلی مل کی وجہ سے کافی کاغذ تو مل جاتا ہے۔ مگر جس کاغذ سے جاذبِ نظر کتاب تیار ہو سکتی ہے وہ کاغذ نہیں ملتا۔ مزید برآں کرنافلی کاغذ کے دام بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ آزادی کے بعد مطبع کے مالکوں نے چھپائی کی اجرت بھی بڑھا دی ہے۔ چھاپہ خانوں کی تعداد محدود ہے۔ مگر چھپائی کا کام زیادہ ہے لہٰذا اجرت کے لئے مقابلہ نہیں ہے۔ ڈھاکہ میں بلاک کے کارخانے من مانے دام وصولتے ہیں۔ اس پر بھی اچھے بلاک تیار نہیں ہو پاتے۔ میرے دوست زین العابدین کے زیر ہدایت

نوجوان فنکاروں کی ایک جماعت تیار ہو گئی ہے۔ مگر بلاک کے کارخانوں کی کمیابی اُن کی تخلیقات کو بروئے کار لانے میں حائل ہو رہی ہے۔

ان حالات میں ہماری جو کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ وہ دیکھنے میں بھی خراب اور نسبتاً ان کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ غیر ممالک سے درآمد کی ہوئی دیدہ زیب کتابیں ہماری کتابوں کے مقابلہ میں قیمتاً نصف سے بھی کم پڑتی ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ان حسین جاذب نظر کتابوں کے سامنے ہماری کتابیں بھدی اور بدنما ہوتی ہیں۔ اس صورت احوال میں اگر قارئین ہماری کتابوں کو پسند نہ کریں۔ تو انہیں مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بیرونی کتابوں کی درآمد بند کرنے سے مقصد برآری نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیں ان سے صحت مند مقابلہ کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنے قارئین کا دل جیتنا چاہئے۔

کیونکہ ان کے لئے غالب اور نذرالاسلام کے کلام میں جو لطف حاصل ہوگا، وہ شیلی اور ملٹن میں عنقا ہوگا اگر ایسا ہی ہو سکتا تو ہمارے موجودہ بڑے بڑے سی۔ ایس پی افسران مشاعروں میں رات رات بھر کوئی لطف نہ حاصل کرتے۔ ہمارا ملکی ادب ہمارے تحت الشعور کو ماں کا دودھ پلا کر توانائی بخشتا ہے ہم اپنی کتابوں کو خوبصورت اور دیدہ زیب طریقہ پر پیش کرنا چاہتے ہیں بالکل ٹھیک اسی طرح جیسے دلہن کو سجا کر سسرال بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ وہ وہاں اور بھی زیادہ حسین معلوم ہو۔ لہٰذا میری یہ تجویز ہے کہ:

(۱) کرنافلی پیپر ملز میں اچھے سے اچھے کاغذ تیار کئے جائیں اور وہ بآسانی کم قیمت پر فراہم ہو سکیں۔ کاغذ ہی تو علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہمارے جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں تعلیم ایک زبردست مسئلہ ہے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ دوسرے ممالک کے لوگ چاند پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ کاغذ کی آسانیاں مہیا کر کے تعلیم کو سارے ملک میں پھیلانا ہوگا۔

(۲) چھاپہ خانے تعلیم کا ایک اور ذریعہ ہیں، پریس کے مالکوں کو فیاضانہ لائسنس ملنے چاہئیں۔ بعض چھاپے خانے والے بڑے ہو کر اپنے چھاپے خانوں کو اور بھی بڑھانا چاہتے ہیں۔ جب چھاپے خانوں کی تعداد بڑھے گی تو چھپائی کا مقابلہ ہوگا اور اعلیٰ سے اعلیٰ چھپائی ہونے لگے گی۔ اُجرت بھی کم ہو جائے گی۔ ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ جس سے بلاک بنانے والے کارخانے بڑی آسانی سے سامان حاصل کر سکیں۔ اگر ضرورت ہو تو بلاک بنانے کی قیمتیں مقرر ہو جانی چاہئیں۔ مزید لائسنس دئے جائیں تاکہ بلاک بنانے کے لئے نئی مشینیں خریدی جا سکیں۔ جب کتاب شائع ہو جائے تو اس کی وسیع پیمانہ پر پبلسٹی کی جائے، اور اچھی پبلسٹی اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ پبلشر بھی اچھا ہو۔ غیر درسی کتابوں کے سلسلہ میں ناشر کو انکم ٹیکس کی ادائیگی سے آزاد کر دینا چاہئے۔ ناشروں کو زیادہ سے زیادہ مواقع دئے جائیں تاکہ وہ ادبی فنی اور غیر درسی کتابوں کے چھاپنے میں نئے ذوق وشوق اور ہمت سے کام لیں۔

مشرقی پاکستان میں اچھے معیاری ماہنامہ کا فقدان ہے اور جو دو چار ماہنامے ہیں ان کے خریدار بھی بہت کم ہیں۔ ماہنامے نہ صرف نئے نئے لکھنے والے پیدا کرتے ہیں بلکہ ان میں جو اشتہارات ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر وہ کتابوں کے خریدنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اچھے ماہناموں کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ناشروں کو کتابوں کے اشتہار بڑی اجرت پر روزناموں میں دینا پڑتے ہیں۔ روزنامے کا اشتہار صرف ایک دن کے لئے ہوتا ہے اگر بھر روز اشتہار دئے جائیں تو اخراجات زیادہ پڑتے ہیں اس طرح کتابوں سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ماہناموں کی اشاعت کی توسیع کرنے کے انتظامات کرنے ہوں گے، ہم اپنے دوستوں سے ماہناموں کے خریدار بننے کی درخواست کر سکتے ہیں۔ حکومت بھی ایسے ماہنامے زیادہ تعداد میں خرید سکتی ہے، اور ان کو مختلف اسکول اور کالجوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔

سستا کاغذ ڈاک کی شرح میں کمی اور دوسری سہولتیں مہیا کر کے حکومت ماہناموں کو دوبارہ زندگی بخش سکتی ہے۔ جو رسالے حکومت کی طرف سے نکلیں ان میں اشتہار کی شرح ½ اور دوسرے روزناموں میں ½ اور ڈاک کے ذریعے کتابوں کا محصول ½ کے حساب سے کم کر کے حکومت کتابوں کی اشاعت میں کافی مدد دے سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے حکومت کا خرچ زیادہ نہ ہوگا کیونکہ ڈاک ریل اور اسٹیمر کے محکمہ میں جو ملازمین ہیں وہی یہ کام انجام دے سکتے ہیں، میری ایک اور تجویز ہے اور وہ یہ کہ ادیب اپنی تخلیقوں کے ذریعے جو آمدنی کریں وہ انکم ٹیکس سے آزاد ہو۔

کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا سارے ملک میں کتابیں پڑھنے کی تحریک چلانی ہوگی۔ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں کتب خانے کھولنے پڑیں گے اور ملک کے طول و عرض میں کتابوں کی مانگ بڑھانی ہوگی۔ دو چار ادیبوں کو انعام دینے اور مشاہرہ پیش کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ایک ایسی فضا پیدا کرنی ہوگی جس سے ادیب اپنی تخلیقوں کے ذریعے اپنی روزی کا انتظام کر سکیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں فرانس نے اپنی ½ آمدنی ادب اور فن کے لئے

مخصوص کر دی تھی۔ اس ملک کی میں نے سیر کی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ رسالوں کی دوکان کے سامنے خریدنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ فرانسیسیوں نے جو دنیا کے ادب و فن میں اتنا بیش بہا اضافہ کیا ہے اس میں حکومت کا بڑا ہاتھ ہے۔

حصولِ پاکستان کے بعد بہت سی حکومتیں آئیں اور ختم ہوگئیں، ان کے بہت سے بیانات اخباروں میں شائع ہوئے مگر ان میں کہیں بھی ادیبوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ہماری موجودہ حکومت نے مختلف وقتوں میں جو بیانات دئے ہیں ان سے ہماری امید بندھتی ہے لیکن جب تک عوام ہمارے متعلق سوچنا شروع نہ کردیں گے اس وقت تک حکومت کی مدد بھی محض بیکار ثابت ہوگی۔ ہمارے ملک کو ادیبوں سے غفلت اور حقارت نہ کرنا چاہئے ہم ہی ملک کی چلتی پھرتی یونیورسٹیاں ہیں، ہمارا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر تعلیمی اداروں کا کام ختم ہوجاتا ہے ہم لوگوں کو ڈراموں، ناولوں نظموں اور اپنے دیگر فن پاروں کے تاج محلوں سے مسحور کرتے ہیں اگر ہم نہ ہوں تو پڑھے لکھے لوگ جاہل ہی رہ جائیں، ہم صرف محنت کے وقت ہی سرور و نشاط مہیا نہیں کرتے ہم سکون بخشتے ہیں۔

قضیہ مٹاتے ہیں گھروں میں آشتی فراہم کرتے ہیں ہم فراق زدوں کے لئے خیالوں کا فردوس بہم پہنچاتے ہیں اور دو افتادوں کے زخم دل پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہیں۔ ہم سے غفلت نہ برتنا چاہئے ہم چھوٹے ہوں یا بڑے لیکن ہماری بھی ضرورت ہے۔ ہماری ہی تحریروں کے ذریعے سے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوسکتے ہیں۔ اگر بہاری لال اور مائکل مدھوسدن نہ ہوتے تو روبندرناتھ ٹیگور بھی وجود میں نہ آتے ہم ادیب مختلف زبانوں اور مختلف ممالک میں اپنی تخلیقات سے آپ کے لئے سرور و نشاط فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اپنے قلم کی طاقت سے مختلف زمانوں میں ہم نے کتنی ہی حکومتیں بنائی ہیں کتنی حکومتیں بگاڑی ہیں کتنے آدرش پھیلائے ہیں کتنے آدرشوں کے ساتھ ٹکرائے ہیں اور اس طرح انسان کے لئے ایک رستہ تیار کیا ہے جس وقت آپ خواب میں مدہوش ہوتے ہیں اس وقت ہم مٹی کے دئے جلا کر آپ کی خاطر کہانیاں لکھتے ہیں، راتیں جاگ کر بتا دیتے ہیں اور وہ کہانیاں آپ کے سکھ دکھ میں رفاقت کرتی ہیں۔ آپ ہم سے غفلت نہ برتیں ہم کو اعزاز بخشنا وطن کو اعزاز بخشنے کے مرادف ہے بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہوجاتی ہیں سیاسی لیڈر تاریخ کے اوراق میں محبوس ہوجاتے ہیں۔ لیکن ہم ادیب ہر دور میں زندہ رہتے ہیں، اگر کالی داس اس کی حمایت نہ کرتا تو آج راجہ وکرمادتیا زندہ نہ رہتا کیونکہ آج کالی داس ہی کے کارناموں میں راجہ وکرمادتیا اور اس کے زمانے کا ذکر ملتا ہے۔

بادشاہوں، نوابوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ وطن کے عوام ہی کو اب ہماری سرپرستی کرنی ہوگی ماضی میں جو دو ایک رہنما ادب کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے ان سے عالم و فاضل حضرات فن کاروں کے نمائندے بن کر تمام تر فیض حاصل کر لیا کرتے تھے مگر اب وہ دور آگیا ہے کہ علماء و فضلاء کو یونیورسٹیوں میں تحقیقات کے کام میں مصروف رہنے دیا جائے تاکہ ادیبوں کے اجتماع میں صرف "اہل ذوق" اور "اہلِ احساس" کی آوازیں سنی جاسکیں۔ کنول کے حسین جھیل میں بگلے اور بطوں کا کام تو صرف گھونگے اور سیپیاں ہی تلاش کرنا ہے۔

مشرقی پاکستان کے ادب کا مقابلہ اکثر ہندوستانی ادب اور خاص طور پر مغربی بنگال کے ادب سے کیا جاتا ہے۔ ان کی حسین اور دیدہ زیب کتابیں دیکھ کر ہمارے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہاں کی حال کی شائع شدہ کتابوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کی کتابوں سے صحیح مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ نہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا صرف ٹیگور کو مستثنیٰ کرکے مغربی بنگال یا ہندوستان میں کوئی ایسا نہیں جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہو۔ ترجمہ میں نظم سے زیادہ ناول کی اصلیت برقرار رہتی ہے ہندوستان کے بہت سے ناولوں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے مگر ان میں سے ایک نے بھی تو تھامس ہارڈی یا مان کے ناولوں کی طرح بین الاقوامی شہرت نہیں حاصل کی۔ ٹیگور کے ناول ملک کی سرحدوں کے پار نہیں پہنچ سکے۔ ٹیگور کے نوبل پرائز حاصل کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ایک پیر صاحب کے خاندان کی طرح وہاں کے تمام ادیبوں کی شان میں خراج عقیدت پیش کرتے رہیں۔ وہ اور ہم بین الاقوامی ادب میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کیا بات ہے کہ بھارت کے ادیبوں کی کتابیں ہمیں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ وطن کے لوگ ہماری کتابیں کیوں نہیں پڑھتے۔ اس "کیوں" کا جواب دینے کے لئے ہمیں ماضی کی سمت دیکھنا ہوگا۔

انیسویں صدی میں مغربی ثقافت بنگالہ میں داخل ہوئی۔ حکومت اور دولت کھوئے ہوئے مسلمانوں کو اس ثقافت سے علیحدہ رکھنے کے لئے طرح طرح کے جال بچھادئے گئے تاکہ وہ اس سے فیض نہ حاصل کرسکیں۔ زندگی کی مختلف راہوں میں کامیابی حاصل کرکے ہندو معاشرہ اپنی ذات سے مرکوز ہوگیا۔ ہندو سیاست، ثقافت، اقتصادیات میں ترقی کرتے کرتے بہت ہی بلند مقام پر پہنچ گئے اور ہم مسلمان ان کی زندگیوں کو پریوں کی کہانی کی طرح سمجھنے لگے اور جوں جوں ہم ان کی عزت کرتے گئے وہ اور بھی اونچے ہوتے چلے گئے اور ان کی نگاہوں سے ہماری ثقافت اور ہمارا ادب گر گیا خود ہمارے ادیب ان کی نقالی کرنے لگے اور بعض اپنی تخلیقوں میں

ہندو کردار پیش کرنے لگے۔ غرض اس طرح ہمارے اندر ایک احساس کمتری سرایت کر گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بھولے بھالے کسانوں کے دل میں راجکماروں اور راجکماریوں کی کہانیاں ایک سنسنی سی پیدا کر دیتی ہیں۔

مغربی ثقافت کو اپنا کر ہندو اتنے آگے بڑھ گئے کہ تمام ہندوستان میں یہ جملہ تسلیم کیا جانے لگا کہ بنگال جو آج سوچتا ہے ہندوستان اس پر کل غور کرتا ہے۔ لیکن نقل کی چمک زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہتی آج زندگی کی جدوجہد میں بنگالی پیچھے رہ گئے ہیں اس کا سبب شاید یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب و روایت کو نظر انداز کر کے غیر ملکی تصورات کی مدد سے اپنے کو بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنے ادب کی روایتوں کو چھوڑ کر جو غیر ملکی اثرات انہوں نے لئے تھے اور اس کی وجہ سے جو ادب وجود میں آیا اُسے باہر والوں نے بین الاقوامی مرتبہ نہیں دیا اور اپنے ملک کے لوگوں نے بھی اسے اپنا نہ سمجھا۔ پریس کی سہولتوں کے باوجود جدید لکھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جو چنڈی داس ودیا پتی گوبند داس اور مکند رام کی طرح مقبول ہو سکے ہیں۔

ادب کے میدان میں ہمارا ادب اطمینان بخش نہیں پھر بھی پاکستان کی ادبی پیشکش ایک دم معمولی اور ادنیٰ بھی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کے کاشتکاروں کے لوک گیت انگریزی، فرانسیسی اور چیک زبانوں میں ترجمہ کئے گئے ہیں اور ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ہم سندھ، پنجاب اور سرحد کے لوک گیت اور جمع کریں اور ترجمہ کریں تو ہماری اور بھی عزت بڑھے گی۔ ہمارے لوک گیت کا فن دنیا میں حیرت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم انہیں جمع کر کے دنیا کو نہ دکھائیں تو ہم آنے والی نسلوں کی نظروں میں غدارِ وطن ٹھہریں گے۔ تعلیمی و اقتصادی معیار جس طرح بدل رہے ہیں ان سے لوک گیت کے نشان تک غائب ہو جائیں گے۔ آج چین اور جاپان بھی اپنی قدیم ثقافت کو دنیا کے سامنے پیش کر کے تخلیقی فنکاروں اور ادیبوں کو اپنے معیار بلند کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ مشہور مغربی ادیبوں اور فنکاروں نے ان دونوں ممالک کے سامنے اپنے استفادہ کا اقرار کیا ہے۔

مشرقی پاکستان کا 'پوتھی ادب' دنیا کے عجائبات میں سے ہے الف لیلیٰ، قصص الانبیا جیسی بڑی کتابوں کو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی ہیں۔ یہ پوتھی ادب رفتہ رفتہ مرتا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ جس مخصوص ٹائپ اور کاغذ میں وہ چھاپا جاتا تھا وہ اب تیار نہیں ہوتا۔ اس پوتھی ادب کو اگر نہ بچایا گیا تو وہ لوگ جو اس سے سرور حاصل کرتے ہیں وہ ہم کو بد دعا دیں گے۔

میرے چاروں طرف بیشمار حضرات تشریف فرما ہیں۔ آپ کے درمیان مجھے بہت سے ممکنات کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ میں سے کوئی کسی سے نہ بڑا ہے نہ چھوٹا۔ ملک کو پروان چڑھانے اور ترقی کی منزلوں کی طرف لیجانا ہم سب کا فرض ہے، ہمارے قلموں ہی کے ذریعے سے تاریخ بنانے والے بڑے بڑے ادیب و شاعر اُبھریں گے۔ خدا ہم سب کو کامیاب کرے۔

کنونشن سے خطاب :

ڈاکٹر مولوی عبد الحق :

محترم صدر پاکستان و معزز حاضرین !

میں آپ صاحبوں کو، سارے ملک کے اہلِ قلم کو ایک مرکز پر جمع دیکھ کر جو مسرت محسوس کرتا ہوں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان باہمت دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں جن کی کوششوں سے یہ مبارک موقع آیا۔ اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو جدید عہد کے تقاضوں، ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت، گہرائی اور دقتِ نظر سے بحث کر سکتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڈھے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوسی خیالات کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں انہوں نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بُری سے بُری چیز میں بھی خوبی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے۔ طوالت عمر جسے میں اس زمانہ میں ایک عذاب سمجھتا ہوں اور جس سے میں سخت بیزار ہوں آج آخر یہی عیب میرے حق میں ہنر ثابت ہوا، اور مجھے

اس کی بدولت اپنے اہلِ قلم دوستوں سے ملنے، باتیں کرنے اور ان سے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا، اس کے لئے مجھ پر آپ کا شکر واجب ہے یہ شکر رسمی نہیں صدق دل سے ہے۔

جب ہم حسن اتفاق سے ایک جا جمع ہیں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنے ادب کا سرسری جائزہ لیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ادب شعر و سخن، غزل سرائی، فسانہ گوئی، مشاعرہ بازی، معمولی کتابوں کی تالیف و ترجمہ تک محدود کر رکھا ہے۔ ہم نے قیام پاکستان کے بعد سے کسی ایسی تالیف یا تصنیف کا اضافہ نہیں کیا جسے دنیا کے سامنے نہ سہی پاکستان ہی کے اہلِ فکر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ یہ ہمارے ادب کی قابلِ قدر تخلیق ہے جب تک ہم علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اعلیٰ پایہ کی کتابیں تالیف و تصنیف نہیں کریں گے، ہمارے ادب کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی اور نہ وہ کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ہمیں بہت سے کھانچے بھرنے ہوں گے، بہت سی خامیاں رفع کرنی ہوں گی اور بہت سی کمیوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہمیں مستند جامع لغات اور اِن سائیکلو پیڈیائیں لکھنی ہوں گی۔ استناد کی کتابیں تالیف کرنی ہوں گی، فلسفہ، سائنس، تاریخ و معاشیات وغیرہ کی تالیفات کے انبار لگانے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں دنیا کی امہاتِ کتب کے ترجمے کرنے ہوں گے۔ یہ انقلابی اور عہد آفریں کتابیں ہمارے خیالات میں روشنی پیدا کریں گی اور رہنمائی کا کام دیں گی، انجمن ترقی اردو نے یہ کام شروع کیا تھا اور بہت کچھ کیا بھی لیکن پاکستان میں آ کر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ میں بڑی خوشی سے اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ حال میں سید محمد تقی صاحب نے بعض ایسی امہاتِ کتب کا ترجمہ شروع کیا ہے جو نہایت مشکل اور دقیق علمی مسائل پر مبنی ہیں یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور اگر ہمیں اپنے ادب کی ترقی مدنظر ہے تو یہ چنے چبانے ہی پڑیں گے۔ یہ کام ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسروں کا تھا جو ان مضامین میں اعلیٰ ڈگریاں رکھتے ہیں مگر وہ اس سے قاصر رہے اس میں ان کا اتنا قصور نہیں جتنا ہمارے نظامِ تعلیم کا ہے، پروفیسر صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا انگریزی زبان کے ذریعہ سے پڑھا تھا۔ اب جو انہیں پڑھانے کا منصب ملا تو اپنے شاگردوں کو بھی انگریزی کے ذریعہ پڑھایا۔ معلم اور متعلم دونوں اس علم کو جو انہوں نے حاصل کیا ہے اپنے اہلِ وطن تک پہنچانے سے قاصر ہیں۔ ان کا علم گونگے کا گڑ ہے۔ اگر یہ نظامِ تعلیم نہ بدلا تو صدیوں تک ہم انگریزی کے محتاج رہیں گے۔ اور علم کی اشاعت ملک میں عام نہ ہونے پائے گی۔ آج کل صدیوں کی منزلیں برسوں بلکہ مہینوں میں طے ہونے لگی ہیں جو نظامِ حکومت تین مہینے میں انقلابی قسم کی زرعی اصلاحات نافذ کر سکتا ہے وہ ایک مہینے میں اپنی زبانوں کو ان کا چھنا ہوا مقام بھی واپس دلا سکتا ہے۔ انگریزی زبان ایک علمی زبان کے طور پر باقی رہنی چاہئے اور رہے گی۔ لیکن ہماری درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے فوراً ختم ہونی چاہئے۔ اور آج ہی ابھی غروبِ آفتاب سے قبل ختم ہونی چاہئے۔ اگر یہ مشکل ہے تو زرعی اصلاحات بھی مشکل تھیں اور آج سے چند روز قبل کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ایسی انقلاب انگیز اصلاحیں جن کا نام سنتے ہی ہمارے مصلحین اور سیاست داں کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اس طرح آناً فاناً عمل میں آ جائیں گی مشکل اسی وقت تک مشکل ہے جب تک ہم اسے مشکل سمجھتے ہیں انسان دل پر رکھ لے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے وہ بہت غور طلب ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس موضوع اور اس کے اسباب پر ہمارے ادیبوں نے بہت کچھ بحث کی ہے لیکن اصل سبب کی تلاش کے لئے ہمیں کسی قدر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی ملک یا قوم میں سیاست کاری مسلط ہو جاتی ہے اور اس کا تسلط جس قدر قوت کے ساتھ ہوتا ہے اسی قدر اس ملک کی ثقافتی زندگی مفلوج ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی قوتیں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔ اقتدار کی ہوس اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ توجہ مفادِ عامہ سے ہٹ کر اپنی ذات اپنے عزیز و اقارب اور اپنی پارٹی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ سیاست میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ زندہ بنیادی اصولوں کی جگہ مردہ وقتی ضابطے کارفرما ہو جاتے ہیں سیاست کار حکومت کی مشین کو اپنی ہوس کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور اس ہوس کے زیرِ سایہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں پھلنے پھولنے لگتی ہیں، خیانت، بددیانتی، جعلسازی، رشوت، مکر و فریب، غارت گری اور ہر قسم کی بداخلاقیاں عام ہو جاتی ہیں۔ ہماری حکومت کے پچھلے چند سال اسی لعنت میں مبتلا تھے اگر کچھ دن اور یہی حال رہتا تو حکومت کی کل پاش پاش ہو جاتی، ایسی حالت میں انقلاب کا آنا لازم تھا انقلاب آیا بروقت آیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس طرح آیا کہ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔

اب سیاست کاری کی لعنت اٹھ گئی ہے اور وہ ماحول جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں جمود پیدا کر دیا تھا۔ باقی نہیں رہا آپ نے صحیح وقت پر اپنی انجمن قائم کی ہے کیونکہ انفرادی کوششیں زیادہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اجتماعی قوت بہت بڑی قوت ہے اسی کے بل پر آپ اپنے مقاصد پورا کر سکتے ہیں۔

اس وقت جو فضا ملک میں پیدا ہوگئی ہے اسے غنیمت سمجھنا چاہئے اور اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لئے وہی کرنا ہوگا جو اٹھارہویں صدی میں فرانس میں "اِن سائیکلو پیڈسٹ" (ENCYCLOPAEDIST) نے کیا تھا۔ اس عالی ہمت، جرأت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قمع کرنا شروع کیا، سائنس اور فلسفہ کے مسائل اور موضوعات کو نئے پیرائے اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ کائنات اور انسان، ریاست (سٹیٹ) اور معاشرہ، مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرأت اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا اور جملہ علوم انسانی کو از سرِ نو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسائیکلو پیڈیا نے خیالات میں تغیرِ عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی نئی لہر دوڑا دی۔ مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں درپئے آزار ہوگئیں، طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مطبع میں چھپتے وقت مضامین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی لیکن باوجود ان تمام موانعات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا۔ آخر پولیس کی مسلسل ایذا رسانی بے آبروئی اور تعذیب سے تنگ آکر بعض رفیق رفاقت ترک کر کے الگ ہو گئے مگر ان کے بہادر سرخیل اور رہنما دِڈرو باوجود ان عقوبتوں کے اپنے عزم پر قائم رہا اور شب و روز جن کی طرح کام کرتا رہا، راتوں کو پروف پڑھتے پڑھتے اور مضامین نگاروں کے مسودوں کی اصلاح کرتے کرتے اس کی بصارت میں فرق آگیا۔ مگر اس نے اپنا کام پورا کر کے چھوڑا۔

اس انسائیکلو پیڈیا کی مجلدات اب آپ کو اپنے کسی کتب خانے میں نظر نہ آئیں گی اور شاید ہی اب کسی نے اس کی کوئی کتاب یا اس کے مضامین پڑھے ہوں لیکن ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو "انقلابِ فرانس" کے نام سے مشہور ہے، جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جس کا اثر دور دور تک پہنچا۔ اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور اب بھی ہر زبان میں اس کی داستان دہرائی جاتی ہے۔

ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب سر سید احمد خان کی پُر خلوص سرفروشانہ مساعی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلحِ اعظم کو قریب سے دیکھنے اور کام کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے ایک شکستہ دل افسردہ اور مایوس قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جمود توڑا، جدید مغربی تعلیم کا ڈول ڈالا، توہمات، تعصبات، اوہام باطلہ کی بیخ کنی کی اور عقلیت کی طرف مائل کیا اپنی تحریروں اور مقالوں سے اردو ادب کا درجہ بلند کر دیا اور سنجیدہ اور حکیمانہ مضامین لکھنے کا ڈھنگ ڈالا۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ ہم اس وقت ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو سر سید کو پیش آئیں۔ سر سید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ لعن طعن سب و شتم کی بوچھار ہونے لگی کفر کے فتوے صادر ہوئے اور ملحد، دجال، کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے اس نے سب کچھ سہا اور اپنے عزم پر قائم رہا اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور قوم کو ورطۂ غفلت و محرومی سے نکال کر ساحلِ مراد پر پہنچا دیا۔

میں نے ذہنی جمود توڑنے کی دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک فرانس کے انسائیکلو پیڈسٹوں کی، دوسری سر سید احمد خاں کی۔ آپ نے دیکھا ان عالی ہمت مجاہدوں نے کیسی کیسی سخت مصیبتیں اور عقوبتیں، رسوائیاں اور ایذائیں برداشت کیں مگر اپنے مقصد سے منہ نہ موڑا یہ بنی نوعِ انسان کے محسن ہیں اور زندۂ جاوید ہیں۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے، صرف انجمن بنا دینا، قراردادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا، ہمیں کام کرنا ہوگا، کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ ۹ بجے آئے اور ۴ بجے چلتے بنے۔ یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن رات، گرمی سردی، بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بیگار ہے۔

جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص اور صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پروا نہیں کرتے وہ کبھی نہیں مرتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو اپنی جان عزیز رکھ کر محنت سے جی چراتے ہیں وہ مردہ ہیں۔

سلطنتوں کے تخت اُلٹ جاتے ہیں، قومیں فنا ہو جاتی ہیں، تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے ادیبوں اور مفکروں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں۔ قدیم یونان کو ایران کی جرار فوجوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا مگر ان کے حکما ادبا اور مفکرین زندہ ہیں ان کا کلام بڑے احترام سے پڑھا جاتا ہے اور اس کا ذہنی اور روحانی فیض بدستور قائم ہے۔ اب بھی جب کبھی سائنس یا فلسفہ میں کوئی نیا نظریہ یا ایجاد ہوتی ہے تو اس کا سراغ کسی نہ کسی صورت سے قدیم یونان میں لگتا ہے اس کے فلسفیوں، صناعوں اور ادیبوں کے نام ہر ملک اور ہر زبان میں زبان زدِ خاص و عام ہیں حتّٰی کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتیں

بچے، افلاطون، ارسطو، سقراط و بقراط کا نام اس طرح لیتے ہیں گویا وہ ہم ہی میں سے تھے۔

ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے۔ ہمارے ادیبوں کا طبقہ کس مپرسی کی حالت میں ہے، ان کی محنت رائیگاں جاتی ہے اس کی جیسی چاہیئے قدر نہیں ہوتی۔ بہت سے ایسے نوخیز ادیب ہیں کہ ان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا بعض ایسی تصانیف گمنامی کی نذر ہو جاتی ہیں جو قابلِ قدر ہوتی ہیں۔ ایک ادیب شب و روز کی محنت اور دماغ سوزی سے اور بعض اوقات فاقے کر کے اپنی بساط کے مطابق کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اور بہزار دقت اس کی اشاعت کی سبیل نکالتا ہے یہ دیکھ کر اسے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرا شخص یا ناشر بغیر اجازت اسے چھاپ کر فائدہ اٹھا رہا ہے۔ غریب ادیب کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عدالت سے رجوع کرے۔ لیکن انصاف اتنا مہنگا ہے کہ اس کے مصارف اس کی استطاعت سے باہر ہیں پھر عدالت کا چکر بے ڈھب ہوتا ہے۔ کئی کئی مہینے بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات بھی بہت تکلیف دہ ہیں بھارت والے پاکستانیوں کی اور پاکستانیوں کی کتابیں بھارتی بلا تکلف شائع کرتے ہیں۔ یہاں قانونی چارہ جوئی بھی نہیں ہو سکتی۔ غرض ادیبوں کا حال بے ادبوں کی نذر ہو جاتا ہے اور اس قسم کی بہت سی خرابیاں اور بدعنوانیاں ہیں جن کی اصلاح صرف آپ ہی کی انجمن کر سکتی ہے۔

اب آپ نے جب انجمن بنائی ہے تو اس کے ذریعہ ادب کی ترقی کے مختلف منصوبے عمل میں لا سکتے ہیں ادب اور ادیبوں کے حقوق، ادیبوں اور ناشروں کے تعلقات سے متعلق تجویزوں پر غور کر کے ضروری اور مناسب انتظام کر سکتے ہیں غرض ادب اور ادیبوں سے متعلق اس قسم کے تمام معاملات اسی انجمن کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں۔

ادب ایک شریف پیشہ ہے، اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجیئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہیئے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے، روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جائیے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو!

مل کر کام کرنے میں بڑی برکت ہوتی ہے خدا کرے آپ کی یہ انجمن ادیبوں کے لئے بابرکت اور قوم کے حق میں مفید ثابت ہو ؛

★

تعمیرِ وطن کے باب میں ادباء کو ایک نہایت اہم خدمت انجام دینا ہے۔ انہیں روحِ اسلام کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے تاکہ وہ اپنی منزلِ مقصود کو جلد از جلد پا سکیں ؛

جنرل محمد ایوب خاں

(پاکستانی ادیبوں کا کنونیشن کراچی
۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء)

ہماری تہذیبی جدّوجہد

ممتاز حسین

پاکستانی ادیبوں کا یہ اجتماع ایک ایسے سال میں ہو رہا ہے جو انسان کی سائنسی فتوحات کا ایک عہد آفریں سال ہے۔ مژدہ ہو کہ انسان۔ نقیودِ مکاں کو توڑ ڈالا ہے۔ اور کائنات کی وہ حیرت فزا وسعتیں جو کبھی اس کے تخیّل کو بھی بہ مشکل راستہ دیتیں، آج اس کے برق پا رہوار کی گرد راہ بنی ہوئی ہیں اور کیا عجب جو عالمِ افلاک میں اب یہ فکر ہو کہ اور ستارے بنیں اس کی رہ گزر کے لئے۔ یہ عروجِ آدمِ خاکی کہ انجم سہمے جاتے ہیں اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اس کی تخلیقی قوتیں لامحدود ہیں اور اس کا یہ غرور کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ آج شرمندۂ تعبیر نہیں۔ تبھی تو میر نے یہ آواز دی ہے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا   خدائی صدقے کی انسان پر سے

اور اس آدمی کی نمود کا خیر مقدم علامہ اقبال نے اس جگرداری سے کیا ہے

برخیز کہ آدم را، ہنگامِ نمود آمد   ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود   از شوخئ آب و گل، در گفت و شنود آمد

انسان کی عظمت میں اس کا یہ اعتماد ہی اس کے کلچر کا سنگِ بنیاد ہے کہ اسی اعتماد سے اس کی تہذیبی کوششیں حقیقی اور با معنی ہوتی ہیں۔ ورنہ وہ مایا اور چھایا بن کر رہ جاتی ہیں۔ انسان کے اس کلچر کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب سے کہ اس نے اپنے کو فطرت کے جبر سے آزاد کرنا شروع کیا، اپنی تخلیقات کے سلسلے کا آغاز کیا ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور اس سلسلۂ تخلیقات میں اپنی اس انسانی فطرت یا انسانیت کا خالق بنا جس کا دائرہ چند انسانی اور اخلاقی اقدار ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی نفسیات کی پوری پہنائی پر حاوی ہے۔ کیا عشق و محبت کی فسوں سازیاں، وفا شعاریاں، خُلق و مروّت کی دلربائیاں اور کیا ہوشِ گوش نغمہ، چشم نگاہِ حسن، دماغِ رنگ و بو، جنونِ جستجو اور آشوبِ آگہی۔ یہ سب اس کی اپنی تخلیقات ہیں کہ غیر متمدن اور غیر مہذب اقوام ان جذبات، احساسات اور ادراکات سے بے بہرہ ہوتی ہیں لیکن یہ عظیم انسان، جو مادی اور ذہنی تخلیقات کے جلو میں اپنی نفسیات کو نئی سے نئی کیفیتوں اور آرزوؤں سے مالا مال کرتا رہا ہے اور اپنے حواس و عقل پر نئے سے نئے آئینے باندھتا رہا ہے اپنی انسانیت میں اس قدر تہی مایہ اور اپنی ذات سے اس قدر بیگانہ ہو گیا کہ علامہ اقبال کو یہ بھی کہنا پڑا ہے

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس کے اس اُجالے میں اس اندھیرے کا سبب کیا رہا ہے اور کیا ہے اس کا جواب بھی اسی شاعر نے دیا ہے ع آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدہ است

لیکن اس قاتل سے آزادی حاصل کرنے کا راستہ یہ نہیں کہ آپ ماضی کی طرف لوٹ جائیں کہ قاتلِ آدمیت یعنی استحصال ماضی میں بھی رہا ہے، غلامی اور جاگیرداری اسی استحصال کی دو صورتیں تھیں اور نہ اس کا ردعمل یہی ہونا چاہئے کہ ہم اس دورِ سرمایہ داری کی سائنس، اس کی صنعت و حرفت، اس کی معقولات اس کی طاقتِ برق و باد، اس کی خودکار دھڑکتی ہوئی مشینوں اور اس کے اس طریقِ پیداوار کو ٹھکرا دیں جس میں لاکھوں دست و بازو ایک گھنٹے میں اتنا پیدا کرتے ہیں کہ اگلی صدیوں میں ایک جگ میں بھی ممکن نہ تھا۔ ہم نے قلت پیداوار کے دور سے بہتات کے دور میں اسی طریقِ پیداوار، انہی مشینوں اور انہیں سائنسوں کی مدد سے قدم رکھا ہے۔ یہ انسان کی ترقی کا ایک بہت بڑا قدم تھا، اور ہم اس سے پیچھے جانا نہیں چاہتے۔ ہم تو صرف استحصال کو ختم کرنا چاہتے ہیں

کہ اب انسان اپنے فولادی پیکر، دست و بازو، اور قوت برق کے باعث انسانی محنت کے اُس استحصال کی ضرورت سے درگذر ا ہے جس نے سرمایہ دارانہ نظام میں اپنے منتہا کو پہنچ کر، چند نفس پرست اور مشکوک انسانوں کی خاطر، ابن آدم سے اس کی قبائے انسانیت چھین لی، اسے تکمیل شخصیت سے محروم کر رکھا، کہ آج اب وہ اپنی ذات سے مقصد نہیں، بلکہ کسی اور کے حصول مقصد کا ذریعہ ہے، اور اسے اپنی ذات سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ اس کا وقت اور کام اپنا وقت اور کام نہیں بلکہ غیر کا وقت اور کام ہو گیا ہے۔ اس نظام میں عدم انسانیت کے ساتھ ساتھ میکانکیت اور تخلیقی جوہر کا فقدان بھی اسی باعث بڑھا ہے۔

لیکن یہاں اس کے اظہار سے یہ مقصود نہیں کہ میں اس کے درم نزع، اس کو ستمگر کہوں، یہاں تو صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کلچر صرف اخلاقیات کا نام نہیں اور نہ یہ صرف چند مجموعہ ہائے کلام، چند عماراتِ قدیم، چند تصویر بتاں اور کچھ پردہ ہائے ساز اور گلہائے نغمہ ہی ہے کہ یہ کہنے کو ہو کہ بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔ کلچر انسان کی اس مجموعی طاقت کا نام ہے جس سے وہ وسعت اور گہرائی دونوں اختیار کرتا ہے، کلچر سائنس کو جمالِ انسانیت کے تابع کرنے اور آرٹس کو سائنس کی قوت دینے میں ہے کہ انسان اپنی انسانیت کو خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے پاتا ہے۔ اس کی آزادی اور اس کی خود مختاری اس کی انسانیت کے ساتھ متحد ہے، اور اس اتحاد میں نفاق سائنس سے نہیں بلکہ استحصال سے پڑا ہے۔ اس لئے ہمیں سرمایہ داری کو رد کرتے وقت سائنس کو نہیں، اس کی برکات کو نہیں، اس کی عقل اور دماغ کو نہیں بلکہ اس کے استحصال کو ختم کرنا ہے جو کہ بیگانۂ دل و جذبہ انسانیت رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا اپنا کلچر کیا ہے؟

میں اس کی طرف فوراً آ رہا ہوں، لیکن اس سے پہلے اس کے ایک بین الاقوامی رشتے کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج رسل و رسائل کی سہولتوں اور ایک عالمی بازار کے ثقافتی لین دین کے باعث ایک عالمی کلچر بھی پیدا ہو گیا ہے۔ آج نہ صرف سائنس، ٹکنالوجی اور مشینیں پیدا وار ہر ملک میں یکساں ہے بلکہ اخلاقیات کے بنیادی اصول اور آزادیوں کا منشور بھی یکساں ہے۔ انسان کی یہ مرکزیت روز بروز زبردستی جا رہی ہے لابدی ہے کہ انسان اپنی بولیوں اور ٹولیوں میں بٹنے سے پہلے اور بعد میں بھی ایک دل اور دماغ رہا ہے۔ ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔

کرۂ ارض کے سمٹنے اور بنی آدم کی مرکزیت کے اس دائرے کے بڑھنے سے ہمارے قدیم کلچر کی بہت سی شقوں پر پابندیاں بھی عائد ہو گئی ہیں، ہم غلاموں اور کنیزوں کے خریدنے سے محروم ہو گئے ہیں اور کیا عجب جو چند سالوں کے بعد کسی عالمی منشور آزادی پر دستخط کرنے کے باعث تعدادِ ازدواج کے عیش سے بھی محروم ہو جائیں۔

ان حالات میں نہ تو ہم اپنے قومی کلچر کو عالمی کلچر اور بین الاقوامی قیود کے رشتوں سے جدا کر کے پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے کلچر کی کسی ایسی تاویل پر ایمان لا سکتے ہیں جو دورِ حاضر کی آگہی، امن پسندی اور آزادیوں سے بہرہ رکھتی ہو۔

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ یہ ایک قانون فطرت ہے۔ اسی طرح اس چمن عالم میں ہماری اپنی قومی شخصیت کی بھی ایک مخصوص نفسیات ہے جو پاکستان کے بنتے ہی عدم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اپنی ایک لمبی تاریخ رکھتی ہے۔ اس نفسیات نے برِ اعظم ہند و پاک کی سرزمین میں گذشتہ چھ سات سو سالوں میں نشو و نما پائی ہے اور وہ ہیں کے مخصوص تاریخی حالات اور قوتوں سے وہ متعین ہوئی ہے تبھی تو ہمارا کلچر اور ہماری زبانیں، عرب، ایران اور ترکستان کے کلچر اور زبانوں سے مختلف ہیں ہر چند کہ ہمارے ان کے درمیان اسلام کا رشتہ قدرِ مشترک رکھتا ہے۔ کتنے مسلمان کن کن زمانوں میں ان ملکوں سے ہندوستان میں آئے اور کیا کیا چیزیں اپنے ساتھ لائے یہ سب جاننا بہت ضروری اور اہم ہے کیونکہ وہ چیزیں اب ہمارے کلچر کا جزو ہیں، لیکن یہ جاننا اس سے کم اہم اور مفید نہیں ہے کہ کیا پاکستان اور کیا ہندوستان ان دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ان مقامی لوگوں کی آبادی پر مشتمل ہے جنہوں نے تصوف کی اس عظیم تحریک کے زیر اثر اسلام قبول کیا جس نے ہندوستان کی کایا پلٹ دی۔ اس تحریک نے نہ صرف دیر و حرم کے پردے اٹھائے بلکہ غلامی، ذات پات اور وراثتِ پیشہ کے بندھنوں کو توڑ کر، انسان اور خدا کے درمیان عشق محبت اور وحدت الوجود اور انسان اور انسان کے درمیان مہر و وفا، احترام نفس، احترام آدمیت، اخوت و مساوات، صلح و آشتی اور نفسِ واحدہ کے رشتوں کی بنیاد ڈالی۔ ~~ع~~

نیازارم زخود ہرگز دلے را ‎ ‎ ‎ ‎ که می ترسم درآں جائے تو باشد

یہ تھا اس کا احترام آدمیت ع کہ اصلِ تہذیب احترامِ آدمی است۔

ہم نے اپنا اسلام تصوف کی اسی لا اکراہ فی الدین کی ٹھنڈی چھاؤں میں سیکھا، اور اسی کے مبلغ صوفیوں کے ہاتوں بیعت کی۔ ہمارا سارا کلاسیکی ادب اور نغمۂ محبت، عہدِ خسرو سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک اردو کا ہو کہ بنگالی، سندھی، پنجابی یا پشتو کا اسی تصوف کے عرفان ذات وصفات اور اخلاقی اقدار میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ایک اس کمزوری سے کہ ہم نے اپنے نفس پر تو قابو حاصل کیا، لیکن نوامیس فطرت پر اپنی کمند تسخیر نہ پھینکی، جب مغرب کے صنعتی انقلاب کا طوفان تاجروں کے لاؤ لشکر اور دخانی کشتیوں کے ساتھ آیا تو ہم اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ہم اس جنگ میں اپنے ضعفِ عقل فرسودگی علم وفن اور جاگیر دارانہ نظام کی بوسیدگی سے ہارے نہ کہ کسی اور سبب سے۔ اور جب اس کا احساس ہوا تو ایک نئے ذہن اور ایک نئے طریق فکر کی بنیاد پڑی جس کا سمبل سر سید احمد خاں تھے۔ انہیں نے ہمیں قانون سببیت (LAW OF CASUALTY) کا پہلا سبق دیا اور یہ بتلایا کہ فطرت، قانون سلسلۂ علت ومعلول کی پابند ہے۔ اس میں کوئی معجزہ اور سحر نہیں، اور سر سید ہی نے ہمیں تاریخ کے تنقیدی شعور سے بھی باخبر کیا کہ جس سے زوال منقولات اور عروج معقولات ہوا، اور امیر علی اور شبلی کے ایسے مؤرخ اور سوانح نگار پیدا ہوئے۔ اور یہ انہیں کی تحریک کا اثر تھا کہ حالی نے بزمِ ادب میں نیچرلزم کی لے اٹھائی، جس سے پیاں کانپیں۔ احتیٰ رخصت ہوئے اور غلو نے ہمارا دامن چھوڑا۔

لیکن سر سید کی یہ نیچری تحریک تمام تر عقلی تھی اس میں نہ تو آزادئ وطن کا جنوں تھا، اور نہ حکایت جذبہ دل کا ذکر تھا۔ چنانچہ اس کا رومانوی ردعمل بھی فطری تھا، اور یہ اس وقت ظاہر ہوا جبکہ بیسویں صدی کے ابتدا میں ہم نے پیمان وفا سے تنگ آ کر اپنے دشمنِ جان و دل سے رقابت مول لی، کہ اس کی دراز دستی مشرقِ وسطیٰ میں بڑھ چلی تھی۔ ہماری اس رومانیت میں نہ صرف مغرب کی غلامی سے آزاد ہونے کا جذبہ تھا بلکہ انسان کی مکمل آزادی کا جذبہ تھا۔ ہم نے استحصال کی ہر زنجیر پر حملہ کیا، اور اگر اس دور میں محبت کے گیت بھی گائے ہیں تو وہ گیت آزاد محبت کے رہتے ہیں۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ میں ان لشاؤں کو پھیلاؤں حسنِ تصور شرط ہے، کڑیاں خود بخود ملتی چلتی جائیں گی لیکن اس موقع پر میں علامہ اقبال کی خدمات کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اپنا تصور پاکستان انہیں کا دیا ہوا ہے۔

کسی شاعر کے کلام کی تاویلیں آسان ہوتی ہیں کہ رمز وکنائے میں لچک ہوتی ہے لیکن محرکات شعری تک پہونچنا مشکل ہوتا ہے تاوقتیکہ شاعر کی شخصیت کے بنیادی تنازعہ کو گرفت میں نہ لایا جائے۔ علامہ اقبال کی تمام تر جدوجہد مغرب کی سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف تھی۔ نہ صرف اس لئے کہ اس نے ان کے ملک کو غلام بنا رکھا بلکہ اس لئے بھی کہ وہ قاتل آدمیت اور انسانیت سوز تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا ایک جھگڑا رد وقبول کا اپنے ماضی کے ساتھ بھی تھا۔ اس تب وتاب رازی ورومی اور غزالی وبوعلی سینا میں وہ اپنے ماضی کا ایک ایسا تنقیدی انتخاب چاہتے تھے جو دورِ حاضر کی آگہی اور مزاج سے میل کھا سکے اور مغرب کی ملوکیت کے خلاف لوگوں کو حرکت میں لا سکے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک حرکی اور ارتقائی تصور کی صورت میں پیش کیا۔ اور یہ آواز اٹھائی ع قاہری در عصرِ ما سوداگری است۔ اور اپنے ہموطنوں سے کہا: ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز دلعل ناب   از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب

اور یہی آوازِ انقلاب ان کی تاویلِ مذہب میں بھی ہے ؎

چیست قرآں! خواجہ را پیغام مرگ   دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

کس کو دعوئ جگر ہے کہ اس آواز کو دبائے۔ اسی آواز نے آزادی کے کتنے آفتاب مشرق میں طلوع کئے ہیں کہ یہ آواز عصرِ حاضر کی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور فنکار، ہمارے شاعر اور افسانہ نگار، جن کی دیدہ وری اور جگرداری سے ہمیں یہ صلابت روحانی ملتی ہے، اس تہذیبی جدوجہد میں کیونکر شریک ہیں اور ان کی ذمہ داریاں اپنے وطن، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے عوام، اور اپنے فن اور انسانیت کے ساتھ کیا ہیں۔
انسان کی زندگی اتنی گوناگوں کیفیات کی حامل ہے کہ کسی ایک کیفیت کو لے کر یہ کہنا کہ یہی زندگی ہے بڑا مشکل ہے یہی حال ادب کا ہے وہ اس قدر متنوع ہے کہ کسی ایک ہی رنگ کے ادب کو سامنے رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بس یہی ادب ہے۔ لیکن جس طرح کہ انسانیت ہماری زندگی کی بنیادی قدر ہے

(باقی صفحہ ۹۷ پر)

ادیب اور آزادئ تحریر

قدرت اللہ شہاب

اس سے پہلے کہ ادیب اور اس کے حقوق پر گفتگو کی جائے یہ بہتر ہے کہ ہم اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دیں وہ یہ ہیں:
پہلی یہ کہ ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں۔ دوسری یہ کہ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے شاعری کی آڑ لیکر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

یہ حدود تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں لیکن ادیب پر یہ زیادہ واضح اور شدت سے عائد ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہر وقت عوام کی نظروں میں رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے بلکہ اس کے برعکس اس کے الفاظ پھیلتے اور چکر لگاتے رہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتی صدیوں تک انکی آواز گونجتی رہے۔ جتنا مقبول اور جتنا جاندار ادیب ہوگا اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھاری ہوگا۔ وہ اتنی آسانی سے ہر بات نہیں کہہ سکے گا جتنی آسانی سے دوسرے کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کیونکہ اتفاق سے اس کے سننے والے ہیں۔ اسے بڑے اطمینان سے غلط سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اثر انداز ہونے کی اہلیت ان کے لئے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسا غیر معمولی ذہن بھی عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی نقص نظر آئے تو ہو سکتا ہے کہ یہ نہ ادیب کا قصور ہو نہ آپ کی ترازو کا بلکہ یہ آپ کی اپنی نظر کی محدودیت اور اندازہ کا قصور ہو۔ ادیب آپ سے برداشت کا نہیں فہم کا طلبگار رہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں بلکہ ایک اچھے اور برے ادب میں تمیز کرنے والے کا فہم، ایک اعلیٰ اقدار کو نظر میں رکھنے والے کا فہم۔ ایک صداقت کے پجاری کا فہم۔ آپ چور کو پکڑنے کے لئے چور کی خدمت حاصل کر سکتے ہیں لیکن لکھنے والے کے لئے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنی پڑے گی۔ نوکر شاہی جو ادیب کے حقوق پر فیصلے کرتی ہے اگر اس کا مطالعہ صرف دفتری مسلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور کتابوں کی قسمت کا اس کی زندگی میں کوئی لمحہ نہیں تو یہ ہمیشہ ادیب کو غلط سمجھے گی اور اس کا مذاق اڑائیگی ایسی نوکر شاہی کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ جسم کا صعوبتیں ضروری نہیں کہ روح کے لئے بھی عذاب ہوں۔ اور یہ کہ خیالات کی موت واقع نہیں ہوتی اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر دریافت کرنے سے معذور ہیں جو علم اور سچائی کو گرفتار کر سکے۔ پاکستان میں بالخصوص دفتریں لوگ من حیث الجماعت کائناتِ ذہن سے زیادہ مادی دنیا میں زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں میں یہ اسلئے کہہ سکتا ہوں کہ بدقسمتی سے میں یہ جانتا ہوں۔ پاکستان میں افسروں کی تنخواہوں کا کچھ حصہ انہیں کتابوں کی صورت میں دیا جائے۔

ادیب کے لئے دوسرا بڑا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ وقت اور فاصلے کے تعینات سے آزاد ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ اَن دیکھی اور انجانی حقیقتوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ہو سکتا ہے کہ آج کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار ہاں یہ ہے کہ اس کی نگاہ آپکی نگاہ سے زیادہ گہری ہے اور اس کے جذبات آپ کے جذبات سے زیادہ شدید ہیں۔ جب تک آپ اپنے ذہن کو اس بلندی تک لیجانے میں کامیاب نہیں ہوتے آپ ادیب کو ہمیشہ غلط سمجھیں گے۔

ادیب کے لئے تیسرا خطرہ اس کی اقتصادی پسپائی ہے۔ ہمارے ہاں کتابیں اسلئے نہیں بکتیں کہ وہ سستی نہیں ہیں جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ جو پڑھنا چاہتے ہیں خرید نہیں سکتے، اس تمام تضاد میں جو شخص فائدہ اٹھا جاتا ہے وہ ناشر ہے۔ وہ ادیب کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتا ہے اور پھر بھی

اسے گلہ رہتا ہے کہ خون میں مناسب گرمی نہیں تھی، وہ ادیب کو اپنی تجارت کے فروغ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی لئے اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک اَن پڑھ حریص ناشر پر ہمارے ادب کا انحصار ہے وہ جو چاہتا ہے ادیب لکھتا ہے اور عوام پڑھتے ہیں۔ اگر ادیب اپنی کاوشوں کے سہارے اقتصادی طور پر آزاد نہ ہوئے تو ناشران کے ذہنوں کی چور بازاری کرتا رہے گا اور ہمارے ادب کا معیار گرتا جائیگا۔

یہ چند خطرات ہیں جن سے ہمارے ادیب دوچار ہیں لیکن یہ تمام خطرات اندرونی ہیں ان سے بڑا بھی ایک خطرہ ہے جو اس کے ذہن کو پروان نہیں چڑھنے دیتا ہے۔ یہ خطرہ بیرونی ہے۔

ہمارا چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں ہم نے اپنے معاملات میں خود الجھنیں ڈالدی ہیں۔ ان الجھنوں کی وجہ سے دنیا میں ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں امداد دینے والے، مذاق اڑانے والے اور ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے۔ چلئے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن جو سب سے زیادہ خطرہ کی بات ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی ابتری نے ہمارے آدرش دھندلا دئے ہیں۔ ہم کچھ امیدیں اور تمنائیں لے کر چلے تھے۔ پاکستان کسی منفی نعرہ کی پیداوار نہیں یہ ایک مثبت نظریہ کا نتیجہ ہے۔ مگر جب خود ہم نے اپنے نظریات کو پسِ پشت ڈالدیا تو ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ہر قسم کے لوگ دنیا کے ہر حصّہ کے بسنے والے طرح طرح سے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم مختلف او متضاد نظریات کی آماجگہ بن گئے ہیں۔ ہمارے ذہنی مکّہ بنانے کی فکر ہو رہی ہے۔ کوئی اسے ماسکو میں تعمیر کرنا چاہتا ہے کوئی واشنگٹن میں اور کوئی کلکتہ میں۔ ارادے ہر ایک کے مختلف ہیں۔ ماسکو اور کلکتہ والے بیخ کنی کے قائل ہیں۔ واشنگٹن والے خیال کو دوسری راہ پر لگانا چاہتے ہیں لیکن یاد رکھئے ہمارا ذہنی کعبہ کہیں نہیں صرف پاکستان میں ہے۔ پاکستان کے ادیب عالمی سیاست کی بساط پر مہرے نہیں بننا چاہتے۔ ہم غریب ہیں، ہم جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ہمارا اپنا ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ ہمیں کچھ دیر اپنے چمن کی بھی سیر کرنے دیجئے۔

اس بین الاقوامی سیاسی بازیگری کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں پر پچھلے چند سالوں میں بہت زنگ لگ چکا ہے۔ غیر زبانوں کی منوں معمولی کتابیں ہمارے ادیبوں پر ترجمے کے لئے ڈالدی گئی ہیں اور ہمارے ادیبوں نے یہ سودا خوشی سے منظور کر لیا ہے۔ ہمارا اگر کوئی بہترین ادیب اپنی کاوش اور محنت سے کوئی تخلیق پیش کرتا ہے تو بازار میں اس کے مشکل سے دس آنے ملتے ہیں لیکن اگر وہ کسی دوسرے درجہ کے مصنّف کی کسی گھٹیا کتاب کا ایک صفحہ ترجمہ کرتا ہے تو اسے دس روپے ملجاتے ہیں آخر ہمارے ادیب بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں اسلئے ان میں سے اکثر سائبیریا کے جنگلوں اور کیلیفورنیا کے باغوں کی خوشہ چینی میں مشغول ہیں اور کھلنا کے دھان کے کھیت اور لاہور کی عظمتوں کے کوئی گیت نہیں گاتا اس "قومی لامرکزیت" سے ہمارے تخلیقی سوتے سوکھتے جا رہے ہیں اور ہمارے اظہار اور خیال کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔

آخر میں میں حکومت اور ادیب کی آزادی کے تعلق پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تین مہینے پہلے تک سیاستدانوں نے ہر قسم کی آزادی کو ترقی دی تھی۔ خصوصاً لوٹنے کھسوٹنے کی آزادی ایک فن کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ غیر محدود آزادی کے زمانہ میں مجھ میں یہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی مگر آج جب کہ مارشل لا کی ۷۹ دفعات میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میرے سامنے بیٹھے ہیں، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزادی سے وہ ساری باتیں کہہ سکتا ہوں جو میں نے کہی ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔

★

رپورتاژ:

ادیبوں کا کنونشن

جمیل الدین عالی

"ہم پاکستانی ادیب اپنے آپ کو اپنے ملک کی عظمت، عالمی امن اور انسانی ارتقا کے لئے وقف کرتے ہیں۔"

یہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی سہ پہر تھی۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ جس میں ابھی تمازت باقی تھی۔ کراچی کے (کے جی اے) ہال میں الٹے ہاتھ کے سیدھے روزنے سے گذرتی ہوئی صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ انھیں ۱۰۲ درجے بخار تھا اور ہم منتظمین نے ان کے لئے نشست مخصوص کرتے وقت یہ بات سوچی ہی نہیں تھی۔ کہ اس طرف دھوپ پڑے گی جس سے بچنے کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔

میں اسٹیج سکریٹری تھا۔ وہ پہلی صف میں بالکل میرے سامنے بیٹھے تھے۔ اور میں انھیں بائیں ہاتھ سے دھوپ کی تمازت کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں ان کی نشست تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان سے معذرت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بیمار اور بے چین تھے۔ مگر ہمہ اشتیاق، ہمہ گوش اور ہمہ توجہ بنے بیٹھے تھے۔

ابن الحسن پاکستانی ادیبوں کا منشور پڑھ رہا تھا۔

"ہم ان انسانی حقوق میں اپنے ایقان کا اعادہ کرتے ہیں۔ جو اقوام متحدہ کے منشور میں بیان کئے گئے ہیں۔ ادیبوں کی حیثیت سے ہم اپنے حق آزادی کے اظہار پر فخر کرتے ہیں کیونکہ آزادیٔ اظہار کے بغیر تخلیقی ادب بے معنی ہے۔"

ابن الحسن ایک دبلا پتلا بتیس۳۲ سال کا نوجوان ہے۔ وہ کنونشن کے آٹھ کارکنوں میں سے ایک تھا۔ وہ کوئی اتنا بڑا ادیب بھی نہیں تھا جسے منشور پڑھنے کا اعزاز بطور استحقاق دیا جاتا۔ وہ اتنا با اثر افسر بھی نہیں ہے۔ بلکہ فوج میں ایک معمولی میجر ہے اس نے سولہ سترہ افسانے لکھے ہوں گے اور اسے بہت سے لوگ نیا ادیب کہتے ہیں۔ مگر یہ منشور اس کا حق تھا۔ اس نے اس منشور پر اپنی راتیں صرف کی تھیں۔ اس پر مشرقی پاکستانیوں اور مغربی پاکستانیوں سے گھنٹوں بحثیں کی تھیں۔ اس نے منشور کو اپنی زندگی بنا لیا تھا۔ وہ اسے ایک نوزائیدہ اور ناتواں بچے کی طرح محفوظ رکھے پھرتا تھا۔ اور جب اس کے مسودے کو منشور کمیٹی نے منظور کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اور اب یہ منشور پڑھ رہا تھا۔ پاکستانی ادیبوں کا پہلا منشور۔ میں اسٹیج پر مولوی عبدالحق کے برابر بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب اس اجلاس کے صدر تھے ان کی بوڑھی آنکھوں نے بڑے بڑے معرکے دیکھے ہیں۔ وہ سرسیدؒ کے ہم عصر ہیں۔ اور صرف بڑے ادیب ہی نہیں بلکہ بڑے کارکن بھی ہیں۔ مولوی صاحب اس منشور کو ایک بے نیاز صدر کی سی بے پروائی کے ساتھ نہیں سن رہے تھے۔ جس کا کام صرف صدارت کرنا ہوتا ہے۔ وہ ابن الحسن کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہے تھے۔ منشور انگریزی میں پڑھا جا رہا تھا۔ اور یہ بات مولوی صاحب کو ضرور ناپسند ہوگی۔ مگر منشور تین بجے منظور ہوا تھا۔ اور قومی زبانوں میں ترجموں کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے بمجبوری اور غیر ملکی مہمانوں اور پریس کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے انگریزی ہی میں پڑھا جا رہا تھا۔ اور مولوی عبدالحق۔ بابائے اردو اسے بڑے غور سے سن رہے تھے اور میں اسے رشک سے دیکھ رہا تھا۔ خواہ وہ کوئی بڑا کام کرے یا نہ کرے وہ امر ہو گیا ہے۔

میں نے ابن الحسن کا چہرہ صرف ایک بار دیکھا جب اس نے ایک لمحہ کے لئے صحافیوں کی طرف رخ کیا۔ اس کا چہرہ عام طور پر کسی کو متاثر نہیں کرتا۔ بالکل معمولی سا چہرہ ہے۔ مگر اس وقت اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ اس کی آواز میں ان ڈھائی سو ادیبوں کے دل و دماغ شامل تھے۔ جو سامنے بیٹھے تھے۔

پاکستان کے ڈھائی سو ادیب بڑے اور چھوٹے ادیب۔ افسانہ نگار، شاعر، ناول نویس، نقاد، اور محققین۔ وہ سب لوگ جو اس سہ پہر سے پہلے اپنی اپنی عظمتوں کے بوجھ اٹھائے، الگ الگ، ادھر سے ادھر گھومتے تھے اس وقت چپ چاپ مطمئن اور کچھ مغرور سے معلوم ہوتے تھے جیسے انھوں نے اپنی منزل کا تعین کرلیا ہو۔ اور اب کوچ کے لئے تیار ہوں۔ اس تیاری میں ایک عزم، ایک وقار اور طاقت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ منشور ایک سپر تھی جو انہیں انتشار، پراگندگی، انفعالیت اور بے مقصدیت کے حملوں سے بچنے کے لئے مل رہی تھی۔ ایک مضبوط سپر جس پر شاید بڑے سے بڑے حملے بھی کارگر نہ ہوسکیں۔

مندوبین کے دوسری طرف مہمان بیٹھے تھے سفراء اور عمائد۔ سفراء چونکے اور متوجہ تھے۔ عمائد بیزار اور کبیدہ معلوم ہوتے تھے۔ اس ملک میں ایک نئی جماعت پیدا ہو رہی تھی۔ ادیبوں کی جماعت۔ ان لوگوں کی جماعت جنکا سماج میں بحیثیتِ جماعت کوئی مقام نہیں تھا۔ جو دعوتوں کے بعد خشک میووں کا کام دیتے تھے! اور جو افسروں، تاجروں اور ناشروں سے سرپرستی کی بھیک مانگنے پر مجبور تھے۔ یہ لوگ جو آوارہ، بدقماش اور بے مقصد لوگ کہلاتے تھے، اب ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ اور انھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی سہ پہر سے پہلے پہلے ایک انجمن بنالی تھی۔ ان کے سینوں پر قلم کے بیج آویزاں تھے۔ ان کی نشستیں الگ تھیں، سفراء اور عمائد سے الگ اور وہ ان پر مطمئن اور خوش بیٹھے تھے۔

"پاکستان رائٹرس کنونیشن" کا آخری اجلاس تھا۔ یہ کنونیشن تین دن رہا۔ اس میں ڈھائی سو مندوب شریک ہوئے۔ ساٹھ مشرقی پاکستان کے مندوب تھے سوا سو مغربی پاکستان سے آئے تھے۔ اور باقی کراچی کے مندوب تھے۔ ان میں جذباتی ادیب تھے، سنجیدہ ادیب تھے؛ شعلہ مزاج آتش بیاں لکھنے والے تھے، نرم رو، سبک خرام سنبھلے ہوئے مصنفین تھے؛ یہ ترقی پسند، زوال پسند اور بالکل بے پسند۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ ان میں کوئی کسی کو اپنا سردار نہیں مانتا تھا ان میں نئی نسل کے لڑکے تھے۔ جو پرانی تحریکوں کی موت کے سبب تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بڈھے لکھنے والے تھے جو نوجوانوں کی تحریر و تقریر میں زبان کی غلطیاں نکال کر اداس ہوجاتے ہیں وہ لوگ تھے جو جنسی افسانے لکھتے ہیں۔ وہ لوگ تھے جو اسلامی تاریخی ناول اور نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ لوگ تھے جو اپنی تحریر کے علاوہ سب کچھ ناپسند کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی تھے جو اپنی تحریر کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔ عمر رسیدہ خواتین اور نوعمر خواتین۔ جھگڑالو بے باک لڑکیاں۔ پرانی سنجیدہ خاموش کام کرنے والی عورتیں۔

اب یہ سب لوگ ایک مرکز پر جمع ہوگئے تھے۔ انھوں نے تین دن تک سخت کام کیا تھا۔ سینکڑوں قراردادوں کی چھان بین کی تھی۔ اور بڑی محنت اور بحث کے بعد کچھ فیصلے کرلئے تھے۔ ان تین دنوں میں بڑے بڑے تماشے بھی ہوئے۔ مخصوص اجلاسوں میں طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں۔ دبی اور کھلی زبان سے پرانے صوبائی قصے بھی اٹھائے گئے اور آپس میں چھوٹی موٹی سازشیں بھی کی گئیں۔ ان ادیبوں نے کئی بار باقاعدہ اور بے قاعدہ مجلسیں بنائیں۔ اور انفرادی طور پر چپکے چپکے گفتگوئیں بھی کیں۔ یہ بھی ہوا کہ کسی نے کسی کو ڈانٹ بھی دیا اور پھر خود پھٹکارا گیا۔ ایک آدھ بار لوگوں نے سخت کلامی بھی کی چپکے چپکے پارٹیاں بنائیں اور توڑدیں!

یہ سب ہوا۔ انسانی کمزوریاں ایک ایک کرکے ظاہر ہوئیں۔ بڑے سے بڑے آدمی نے چھوٹی سی چھوٹی بات کی اور سننے والوں کو حیرت و افسوس میں مبتلا رکھا۔ مگر ——— پھر سب ٹھیک ہوگیا۔ دلوں کی نرمیاں مزاجوں کی گرمیوں پر حاوی آگئیں۔ ساڑھے گیارہ برس کا بوجھ تین دن میں اتارنا تھا جس کے لئے یہ سب عمل اور ردِ عمل ضروری تھا۔ ان جلسوں میں بہت کچھ ہوا۔ مگر یہ نہیں ہوا کہ کوئی وزارت ٹوٹ گئی ہو یا کوئی وزارت بن گئی ہو۔ یہ مفلوک الحال پس ماندہ مختلف مصائب کے شکار لوگ خواہ برے شاعر، بہت برے افسانہ نگار، بہت برے نقاد ہوں، سیاست دانوں سے بہت بہتر ثابت ہوئے اور ۳۱ جنوری کو تین بجے تک انھوں نے اپنے لئے ایک جماعتی دستور اور ایک منشور بنالیا اور جب یہ سب ہوگیا تو سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا جیسے یہ سب اس آدمی کی تلاش کررہے ہوں جو ان کو روشنی کی ایک کرن دیکر خود تاریکی میں غائب ہوگیا ہو۔

اس کنونیشن کا پورا حال تو کوئی اور لکھے گا۔ خاص طور پر وہ کارکن یا مندوب جو اس کے آغاز میں شریک نہ ہو۔ میں اس کے بنیادی کارکنوں میں سے ایک تھا اس میں میری اکسٹھ راتیں صرف ہوئی تھیں۔ اس کنونیشن میں میری روح تھی، میری زندگی تھی۔ اس میں میرے اچھے اچھے دوست چھوٹ گئے۔ اور نئے نئے دوست پیدا ہوئے میں بہت سے ملے جلے جذبات کا شکار ہوں۔ میں اس کے بارے میں اچھی طرح نہیں لکھ سکتا مجھے اس کنونیشن سے متعلق ہر چیز اور ہر فرد سے جذباتی وابستگی ہوگئی ہے۔

مجھے مولوی عبدالحق، پروفیسر سعید، جسیم الدین اور وہ طالب علم کارکن جن کے نام بھی مجھے یاد نہیں رہے۔ سب ایک نئی طاقت کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کاغذ جو ہزاروں کی تعداد میں استعمال ہوئے۔ وہ سستے بدنما فائل جو ادھر ادھر لڑھکتے پھرے۔ ہوٹلوں کے کمرے۔ کنونیشن کا دفتر جہاں ہم سرد راتوں میں ٹھٹھرتے ہوئے کٹتے تھے

یہ سب میرے جذبات کی تہوں میں جم گئے ہیں۔ یوں تو یہ ایک ہنگامہ سا ہوا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ایک بڑی تحریک کی ابتدا ہے۔ جو آہستہ آہستہ اس ملک میں اور نہ جانے کہاں کہاں پھیل جائے گی۔

ہم لوگ بغیر نظم و ضبط کے کام کرتے تھے۔ پہلے ہم آٹھ آدمی تھے۔ جنہوں نے ۴ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو ایک اعلان نامہ جاری کیا تھا۔ پھر ہمارے صدر شاہد احمد دہلوی ہو گئے یہ نویں آدمی تھے۔ اور گو ہمارے افسر تھے۔ مگر ہمیں میں سے ایک ہو کر رہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بہت مختلف لوگ تھے اور ہم نے عجیب عجیب کام اپنے اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ اور ہر کام پر آپس میں پیچیدگیاں پیدا کرتے تھے۔

ابن الحسن مجھ سے ہر وقت اصولوں اور وقت کی پابندی پر لڑتا تھا۔ وہ ہر کام کی یادداشت رکھتا تھا۔ اور ہم سب کو بھی گھڑی کی طرح چلنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ابن سعید ہر تحریر کو ٹائپ شدہ دیکھنا چاہتا تھا! وہ میری بدخطی کو انتہائی نفرت سے دیکھتا تھا۔ اور تنگ آکر گھنٹوں خود ٹائپ کیا کرتا۔ قرۃ العین حیدر دسمبر کے اعلان کے بعد ۲۹ر جنوری تک صرف دو بار نظر آئیں۔ اور ۲۸ر جنوری کی شام "کام" کرنے بھی آئیں۔ مگر اتنے دنوں ان کے عدم تعاون کے قصے پورے شہر میں وہ دوست مشہور کرتے رہے۔ جو کنونیشن کے انعقاد سے ڈرتے تھے۔ ان قصوں سے ہمارے کام میں بڑی مدد ملی۔ ضمیر الدین احمد دو ماہ میں صرف تین دن پائپ پیتے ہوئے نظر آئے اور کام کا "معائنہ" کر کے چلے گئے۔ مگر وہ ہر روز پچاس بار ٹیلیفون کرتے تھے اور ہر کام خود کرنا چاہتے تھے۔ غلام عباس کے تمام گھر والے ان دنوں بیمار رہے۔ اور وہ بے حد پریشان تھے۔ مگر انھوں نے اپنی پوری شخصیت ہمارے حوالے کر دی تھی۔ اور ہم ان کا نام لے کر معترضین کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔ عباس احمد عباسی جو فی گھنٹہ ایک لفظ بولنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ گھنٹوں چھاپے خانوں اور کارکنوں میں دماغ کھپاتے تھے۔ اور مترجمین کو سینٹ سینٹ کر رکھتے تھے کہ شاید اب کوئی خطبہ، کوئی تقریر، ڈھاکے یا لاہور سے آجائے۔ قدرت اللہ شہاب ہر آدمی کی ہر بات مان جاتے تھے اور ہمارے لئے نئی نئی مصیبتیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی اتنی خوفناک "سروس" کو جس کے اراکین بڑے سے بڑے ادیب کو اپنے کالر کی سختی پر قربان کر دیں، ہمارے سپرد کر دیا تھا۔ کہ ہم جب چاہیں جس طرح چاہیں اس کا استعمال کریں۔ اور میں تھا جو ہر کام کرتا تھا۔ اور کچھ نہ کر پاتا تھا۔ اور چیخ چیخ کر باتیں کرتا تھا۔ اور شاہد احمد دہلوی جن کی متانت ہمارے ہر شور و غوغا، جلد بازی، معاملہ نافہمی کو برداشت کرتے کرتے تھک جاتی تھی۔ مگر جو ہر وقت کمر کسے حاضر تھے۔

ہمارے پاس کوئی ملازم نہیں تھا۔ کلرک نہیں تھے۔ باقاعدہ مترجمین نہیں تھے۔ ۱۵ر جنوری تک روپیہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اعلان نامہ جاری کرنے میں خاصی جلد بازی دکھائی۔ ہم آٹھ دستخط کرنے والوں کی بجائے اٹھارہ یا آٹھ سو بھی ہو سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے اس پر سوچا بھی نہیں کہ ہم لوگ آٹھ ہی کیوں رہ جائیں بس ہم نے ایک اعلان نامہ تیار کیا اور پریس میں دے دیا۔ اس پر کچھ لوگ ہم سے چڑے اور کچھ سے ہم چڑے۔ مگر کام شروع ہو گیا۔ اسی طرح ہم نے دعوت نامے بھیجنے میں عجلت برتی۔ ہم نے ایک نشست میں ایک فہرست بنائی اور پھر اسے بھول گئے۔ اس طرح ہم کچھ ادیبوں کو چھوڑ گئے اور کچھ کو بھول گئے۔ چنانچہ وہ فہرست منتشر یادوں میں بٹ گئی۔ اور پھر جو جس کو یاد آیا اسے دعوت دی جانے لگی۔ ہاں ہم نے کوئی بڑا نام نہیں چھوڑا چند بڑے نام والے علالت، مجبوری یا کسی اور سبب سے نہ آسکے ہوں تو وہ انکی اپنی ذمہ داری ہے ہمارا قصور نہیں۔ غرض یہ کہ ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں ہم تجربہ کار منتظمین نہیں تھے نہ ہم جلسے باز لوگ تھے۔ ہاں سب میں میں ہنگامہ پرور آدمی ہوں۔ مگر میرا تجربہ سرکاری ملازموں کی جماعتوں کے الکشن تک محدود ہے۔ ادبی ہنگاموں کے معاملے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے لئے میزبانی کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنی چھوٹی موٹی ادبی حیثیت کو بالکل بھول کر ہر چھوٹے بڑے کو تعاون پر آمادہ کروں اور لڑکوں بالوں تک کے نخرے اٹھاؤں۔ اور باقی لوگ تو بالکل ہی الگ تھلگ رہنے والے انفرادیت پسند قسم کے لوگ تھے۔ انھوں نے تو کسی مشاعرے میں تقدیم و تاخیر یا پارٹی بازیوں کے جھگڑے تک نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ ایک اتنے بڑے کام کے سر پر آجانے سے ایک بدحواسی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم آپس میں خوب لڑتے تھے اور معاملہ ادیبوں سے ادب پر آجاتا تھا اچھا ادب، برا ادب عالمی ادب، عظیم ادب اور ظاہر ہے کہ ان موضوعات پر سبھی اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔

مگر شاید یہ سب ضروری تھا۔ بے تنظیم کے ادارے شاید ایسے ہی قائم ہوتے ہیں اور جب مختلف الوضع لوگ ایک دوسرے کے قریب آجائیں تب کہیں انہیں اپنے مقصد کی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے جس سے طریقۂ کار میں استواری پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کے وجود میں آنے تک ہمیں بھی انہی مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ابن سعید اور ابن الحسن کی بول چال قرۃ العین حیدر سے دنوں بند رہی گو یہ سب ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے رہے غلام عباس نے اپنے ذمہ صرف ایک کام لیا تھا اور وہ ہماری خفگی کے باوجود وہی کام ۲۹ر جنوری تک کرتے رہے۔ وہ کام یہ تھا کہ وہ ایک صاحب کو

مندوب کی حیثیت سے لانا چاہتے تھے اور وہ صاحب اس پر تیار نہ ہوتے تھے۔

افسوس کہ غلام عباس ناکام رہے۔ !

قدرت اللہ شہاب خاص طور پر اس چکر میں تھے کہ مشرقی پاکستان کے مندوبین کو PIA مفت لے آئے۔ اور دوسرے کرایوں کی شرحیں کچھ اس قدر گھٹ جائیں کہ ہزاروں مندوبین جمع ہو جائیں، اور وہ ادب اور ادیبوں کے لئے لاکھوں روپے جمع کرلیں۔

افسوس کہ وہ بھی پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔

جمیل جالبی آخر میں کارکن ہو گئے تھے۔ ۲۹ کی صبح وہ ایک بڑے شاعر کو ان کی رضامندی حاصل کر لینے کے بعد کنونشن میں لانے گئے۔ اور اکیلے واپس آئے۔

سجاد رضوی بھی ایک بڑے ادیب کے لئے گئے اور اکیلے واپس آتے۔ ہمیں اب تک معلوم نہیں کہ کون کیوں نہیں آیا۔ ایسی اور دوسری ایسی ہی باتوں کی جتنی ذمہ داری ہماری ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ اغلب ہے کہ ہم سے ابتدا ہی میں ایسی غلطیاں ہوئی ہوں جن کا ہم کو احساس تک نہیں ہوا مگر جو واقعی غلطیاں ہوں مگر دوسری طرف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ لگن والے لوگ از خود بھی چلے آتے کچھ نے ہمیں اپنے نام یاد دلائے۔ کچھ نے اپنے ظنطنوں کے باوجود کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور کام بھی کیا، اور کچھ آخر دن تک ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔

مولوی عبدالحق کا واقعہ یہ ہے۔

ابن انشاء ہیں اور ابن الحسن، مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب دھوپ کھا رہے تھے۔ ہم نے مختصراً کیفیت عرض کی۔

"اچھا" مولوی صاحب بولے۔ شاید انہیں یقین نہیں آیا۔

"اچھا تو تعلیمی کانفرنس سے تاریخیں تو نہیں ملتیں۔ نہیں ملتیں نا" ۔ انہوں نے کسی سے استفسار کیا۔

"ہاں بھئی تو میں آجاؤں گا" ۔ یہ ان کا تیسرا اور آخری فقرہ تھا۔

ہم مولوی صاحب کے پاس دوبارہ نہیں گئے۔ حالانکہ مولوی صاحب ہمارے آخری اور خاص اجلاس کے نامزد صدر رہتے۔ وہ چاہتے تو ہم کو کنوئیں جھکوا دیتے اور طرح طرح کی شرطیں سامنے رکھ دیتے جو ہمیں ماننی پڑتیں۔ مگر انھوں نے اپنا خطبہ صدارت وقت میں بھیج دیا اور خود تشریف لے آئے۔ وہ پہلے اجلاس میں بھی مندوب ہو کر آئے اور مندوبین کے رجسٹر پر دستخط کئے۔

اور مولوی عبدالحق نے ہمارا قلم والا بیج بھی لگایا یہ وہ مولوی عبدالحق ہیں جو سرسید کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور جن کی عمر ۹۳ سال ہے۔

ہمارے کارکنوں کا سرگروہ انور حمید رہی تھا۔ یہ طالب علم ہے۔ اس نے کوئی سو کارکن طالب علموں کو ENDURANCE TEST کرایا اور ان میں سے بیس انتخاب کرائے۔ یہ کارکن طالب علم لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ انھوں نے آخری پانچ دنوں میں بیس بیس گھنٹے کام کیا اور بہتوں نے شاید ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ان میں سے چند ہدایات کو دیر میں سمجھتے تھے، کچھ غلط سمجھتے تھے کچھ ایک دوسرے کی "اہم ذمہ داریوں" پر رشک بھی کرتے تھے مگر کام سب کرتے تھے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ یہ سب اتنا کام کیوں کرتے تھے۔ وہ نرم و نازک شرمیلی لڑکیاں جو برتے بین کرآتی تھیں۔ وہ دو سو کرسیاں ترتیب سے کیوں لگاتی تھیں۔ وہ آسودہ حال لڑکے جن کے سوٹوں پر سلوٹ نظر نہیں آتی تھی ہوائی اڈے اور اسٹیشن پر ٹھنڈی صبحیں اور راتیں کیوں گذار رہے تھے۔ انہیں بعض ادیبوں نے ستایا بھی۔ یہ ادیب کچھ اس چکر میں تھے کہ کنونشن میں لڈو بٹیں گے اور وظیفے مقرر ہوں گے۔ ان ادیبوں نے کارکنوں کو خوب دوڑایا بھگایا۔ کپڑے دھلوانے بھیجے، سواریاں منگوائیں، اور وقت بے وقت چائے، پان، کافی کی فرمائش کی۔ یہاں تک کہ کنونشن کا رنگ دیکھ کر ادیب خدمت لینی بھول گئے مگر کارکن مستعد رہے۔

یہ کارکن جن کے نام محفوظ نہیں ہیں ہمارے محسن ہیں ہم سب ان کے ممنون رہیں گے۔

یہ کنونشن تین دن رہا۔ اس میں پاکستان کے ہر گوشے سے مندوبین آئے۔ اچھے خوش اخلاق، اور بد مزاج، چڑچڑے مندوبین۔ کچھ

مزاجاً، کچھ اخلاقاً خوش طبع تھے۔ کچھ مشتبہ اور کچھ خالی خالی۔ جیسے بس یونہی چلے آئے ہوں۔ ان میں امیر، غریب، افسر، مدیران، ناشرین سبھی طرح کے لوگ تھے مگر جب یہ مل کر بیٹھے تو ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ رہے۔ پشاور کے مندوبین، سلہٹ والوں سے جس طرح ملے شاید وہ ہم جماعت جوائنٹ سکریٹری کبھی کبھی نہ مل سکیں ان مندوبین میں ایک برادری کا احساس پیدا ہو رہا تھا اور سب اس احساس کی اجنبیت کے باوجود خوش نظر آرہے تھے۔ ان میں بعض لوگ ایک دوسرے کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے بعض انگریزی بھی نہیں جانتے تھے مگر ان سب نے آپس میں باتیں کیں ان کی زبان میں خلوص تھا۔ سچائی تھی محبت تھی۔ لکھنے والے سبھی محبت کرتے ہیں۔

پہلا اجلاس ۲۹ کی صبح منعقد ہوا۔ پروفیسر مرزا سعید اسٹیج پر آئے، پنجاب سے آنے والے مندوبین زیادہ تر نوجوان تھے۔ وہ انھیں اتنا ہی جانتے تھے کہ یہ پطرس مرحوم کے وہ استاد ہیں جن کے نام مرحوم نے اپنی کتاب معنون کی تھی۔ مشرقی پاکستان والے شاید اتنا بھی نہیں جانتے تھے اور کراچی کے مندوبین صرف ان کے نام سے واقف تھے۔

مگر — پانچ منٹ میں سب جان گئے کہ پروفیسر سعید کون ہیں۔ پروفیسر سعید بیمار تھے۔ وہ بدقّت تمام آئے تھے۔ وہ خلوت نشیں ہیں اور جلسوں سے بالکل دور رہتے ہیں۔ ان کا کوئی ادبی حال یا مستقبل بھی نہیں ہے جو وہ اس کے چکر میں آگئے ہوں۔ ان سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا اور بولنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ بے حد خوش تھے۔ وہ کھڑے رہے اور بولتے رہے۔

"یہ اس ملک کی تاریخ میں ایک بڑی بات ہو رہی ہے" انھوں نے کہا۔ "خوشی اس امر کی ہے کہ آپ میں مختلف الخیال ادیب ایک ہی مسئلہ پر گفتگو کرنے جمع ہوئے ہیں اور مجھے آپ کے آجانے سے ہی امید ہے کہ آپ لوگ اپنے مسائل کے حل ضرور تلاش کرلیں گے"

پروفیسر سعید نے بہت کچھ پڑھا ہے اور بہت کچھ پڑھایا ہے۔ ان کے شاگردوں کے شاگرد پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ایک سبق انھوں نے ادیبوں کو بھی دیا:

"امید ہے کہ آپ حضرات اپنے معاملات پر گفتگو کرتے وقت ادب کے نزاعی معاملات زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔ اس سے کام میں ہرج ہوسکتا ہے مگر ادبی مسائل طے نہیں ہوسکتے"

مندوبین یہ سبق نہیں بھولے اور انھوں نے کام پورا کرلیا۔ پروفیسر سعید کو ایک نئی تحریک کا افتتاح کرتے وقت جو مسرت ہو رہی تھی وہ ان کے بیمار مگر روشن چہرے سے پڑھی جاسکتی تھی۔

شاہد احمد دہلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ چند فقروں میں انھوں نے رسمی باتیں کہیں پھر وہ صاف گوئی بلکہ سخت گوئی پر اتر آئے۔

"کہا گیا کہ ہمیں حکومت نے اس کام کے لئے خفیہ روپیہ دیا ہے" وہ گرجے "ہمارے دوستوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں"

دوست لوگ شرما شرما کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کچھ مسکرائے اور کچھ نے صحافیوں کی طرف دیکھا جو آپس میں باتیں کرتے کرتے متوجہ ہوگئے تھے۔

"سیاستدانوں کی نااہلی نے ادب اور ثقافت کو چند افسروں کی اجارہ داری میں دیدیا تھا" شاہد احمد بولتے رہے۔ یہ خطبہ خاصا طویل تھا۔ اس میں گیارہ برس کے دکھ کی داستان تھی۔ آزاد تخلیقی کام کرنے والوں پر جو مصائب گزرے ان کی بپتا تھی۔ حکومت نے جس کج فہمی اور کج خلقی کے مظاہرے بار بار کئے ہیں۔ اس کی تشریح تھی۔ ناچ رنگ مصوری کی سرپرستی کرنے والوں کے متعلق انھوں نے کہا کہ ان لوگوں نے ان فنونِ لطیفہ سے جو تھوڑی بہت دلچسپی دکھائی تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو ان جلسوں میں کچھ تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان "سرپرستوں" کی ذہنی پسماندگی کا پول بھی کھلنے نہیں پاتا۔

کچھ افسروں پر اوس سی پڑگئی تھی۔ چند افسر جو مندوب تھے اور مہمانوں میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ گھبرا کر مندوبین کی صفوں میں آبیٹھے۔ مندوبین ہر ہر فقرے پر تالیاں بجاتے تھے۔ ان کے برسوں کے پھوڑے پھوٹ رہے تھے ادب اور ثقافت نے اپنا مطالبہ قوم اور حکومت کے سامنے پیش کردیا تھا۔

شاہد احمد دہلوی کا خطبہ ایک جہاد کا اعلان تھا۔ ایک رزمیہ تھا۔ ایک پیشین گوئی تھی۔ یہ سیدھا سادا سا خطبہ جس میں کارکنوں کی مشکلات اور لوگوں کے شبہات کا ذکر تھا۔ اپنے اندر ایک آگ لئے ہوئے تھا۔ جو اس ملک کے بے چین ماضی نے ہر اہلِ قلم کے دل میں بھڑکا رکھی ہے اس خطبہ میں کوئی ادبی مسئلہ نہیں چھیڑا

گیا تھا۔ گویا اپنے طور پر یہ خطبہ خود ایک ادبی مسئلہ کا حل تھا۔ وہ مسئلہ جسے ادیبوں کی زندگی کہتے ہیں۔

جسیم الدین نے بنگالی زبان میں صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کا ترجمہ بے حد دلکش تھا اور اردو داں افسوس کرتے تھے کہ کاش اسے اصلی زبان میں پڑھ کر لطف اٹھاتے۔ جسیم الدین بقول کسے باؤلے کوی ہیں۔ مگر بکار ادیا۔ بڑے بیشیا ونکلے۔ انھوں نے ایک ایک کرکے ادیبوں کے مسائل گنائے اور ٹھوس تجویزیں پیش کیں۔ ان کا خطبہ ادب کی زبان میں تھا۔ اور تمام تر کاروباری معاملات پر حاوی تھا۔ ان کے خطبے سے بعد میں کئی سب کمیٹیوں نے استفادہ کیا۔ اور اس کی کئی تجاویز کو اپنی قرار دادوں میں شامل کیا۔

پہلے اجلاس کی صدارت کا اعزاز جو مغربی پاکستان والوں نے ایک مشرقی پاکستانی مندوب کو دیا تھا کوئی جھوٹی یا سیاسی رواداری کی بنا پر نہیں تھا۔ اس میں محبت تھی تعاون تھا۔ پیار تھا۔ وہ پیار جس کا تحفہ جسیم الدین بقولِ خود پدما اور میگھنا کی شاداب وادیوں میں تقسیم کرنے لے گئے ہیں۔

دوپہر کو کاروباری اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس سے ۷ر۳۱ کی دوپہر تک تمام اجلاس صرف مندوبین کے لئے تھے۔ پہلے جلسے میں حامد علی خاں اور دوسرے جلسوں میں بیگم یوسف جمال محمد حسین نے صدارت کی۔ حامد علی خاں کی صدارت میں ایک عظیم الشان معرکہ ہوا جس میں کمیٹیوں کی نشستوں کے معاملے میں صوبائیت کا زہر پھوٹ بہا۔ گیارہ برس سے یہ زہر ہمارے رگ و ریشہ میں پرورش پا تا رہا ہے۔ مندوبین جوش و خروش میں اسمبلیوں کی کارروائیوں کے طور پر بات تو شروع کر گئے مگر پھر خود ہی شرما گئے۔ آخر سب جانتے تھے کہ بات یوں نہیں بنتی۔ چنانچہ چند ہی سٹ میں سیاست کے زہر کو افہام و تفہیم کے امرت دھارے نے راکھ کرکے بہادیا۔ کمیٹیاں بن گئیں مضامین تقسیم ہوگئے اور فوراً کام شروع ہوگیا۔

۴۵ آدمیوں کی سٹیرنگ کمیٹی اور نو نو اراکین پر مشتمل سات سب کمیٹیوں نے ڈھائی دن شب و روز جس طرح کام کیا اس کا مزا وہ لے سکتے ہیں جنھوں نے یہ وقت کونفیشن ہال میں گذارا ہو۔

غزل گو شعراء، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ناول نویس اور نقاد لوگ اپنی اپنی اَنا بھول کر جماعتی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ہر کمیٹی کے لئے ایک کنونیر خاتون مقرر تھیں۔ کبھی کبھار دو جنٹس طاقت آزمائی کی کوشش کرتے تو خاتون کنونیر کی موجودگی سے شرما کر پھر کام کرنے لگتے تھے۔

یہ خواتین بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ یہ خواتین کوئی اَن پڑھ لڑکیاں نہیں تھیں بلکہ کئی کالجوں کے ادبی شعبوں سے متعلق تھیں۔ اور برسوں کی پڑھانے والیاں تھیں۔ طالب علم ان میں صرف ایک تھیں۔ یہ ایک فرانسیسی خاتون ہیں جو کراچی یونیورسٹی میں اردو پر کام کر رہی ہیں۔ ان خواتین نے بےباک، لاپروا ادیبوں کے بکھرے بکھرے ارشادات کو بڑے سلیقے سے منضبط کیا ہے۔ ادیب لوگ سینکڑوں قرار دادیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تھے اور جب بھی ادھر ادھر کی باتیں کرنی چاہتے تھے، یہ خواتین انھیں ان کے فرائض یاد دلاتی تھیں بعد میں کھلے اجلاسوں میں انھی خواتین نے اپنی کمیٹی کی منظور شدہ قرار دادیں پیش کیں۔

تین اجلاس بیگم محمد حسین کی صدارت میں ہوئے۔ یہ ایک مشرقی پاکستانی ادیبہ ہیں جو کراچی میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں۔ کونفیشن کی کامیابی کا سہرا تو نہ جانے کس کے سر بندھے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اتنے بڑے اجتماع کو جس میں اتنے اچھے اور بڑے ادیب جمع تھے۔ کامیابی سے جاری رکھنے کا کام بیگم حسین نے پورا کیا۔ ان اجلاسوں کی پیچیدگیاں۔ نت نئے اختلافی مسائل۔ بحثیں، جھگڑے۔ ان سب کے دل میں مندوبین کے خلوص نیت کے ساتھ ساتھ بڑا حصہ بیگم حسین کا رہا۔ انھوں نے فضا میں ایک نہایت سلیقہ مندی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ وہ بنگلہ، اردو، انگریزی روان بولتی تھیں اور ہر زبان کے مقرر یا معترض سے اسی زبان میں نبٹ لیتی تھیں۔ وہ بیرسٹر اعجاز بٹالوی، شاعر جسیم الدین، پروفیسر ابواللیث صدیقی اور مجھ حقیر اسٹیج سکریٹری سے تنہا چومکھی لڑتی تھیں۔ ڈھائی سو ادیبوں کی ذہانت اور محنت کو مسلسل منضبط رکھنے میں بیگم محمد حسین کی کوششیں بھلائی نہیں جائیں گی۔ ان کی شدت تنظیم کے باوجود ان کی مقبولیت

کا یہ عالم تھا کہ مندوبین نے تین اجلاسوں میں متواتر انہیں کو صدر منتخب کیا۔ میں اسٹیج سکریٹری جو پہلے دن کی افراتفری میں اسٹیج کنٹرولر بن بیٹھا تھا، ان کی صدارت میں چپ چاپ اپنے حقیر عہدے پر واپس آگیا۔ وہ واقعی صدر ثابت ہوئیں۔

ویسے مجھے اس بات کا دلی افسوس ہے کہ یہاں بھی ہم سب نے اپنے پرانے رقیب، یعنی طبقۂ نسواں، سے مات کھائی ہے!

تین دن میں مندوبین نے سینکڑوں قرار دادیں اور تجویزیں کھنگال کر آٹھ تجاویز منظور کیں۔ قرار دادیں بے شمار آئی تھیں۔ شعرا نے بیشتر تجاویز ذاتی خطوط کی شکل میں بھیجی تھیں۔ نثر نگاروں نے ذرا سلیقے سے کام لیا تھا اور ایک ایک کاغذ پر دس دس تجویزیں روانہ فرمائی تھیں جب کہ منتظمین کی پیہم درخواستوں میں الگ الگ تین تین نقلیں مانگی جاتی تھیں۔ کارکنوں نے ان تجاویز کی نقلیں عنوانات کے تحت کر دی تھیں اور ہر سب کمیٹی کے لئے الگ فائل کھول دیئے گئے تھے۔ اپنی دھن میں مست رہنے والے شعرا اور فقرے باز نثر نگاروں کو یہ سب کچھ پڑھنا پڑھا اور ہر منظور شدہ قرار داد کو سننا بھی پڑا۔ ان سب پر طویل بحثیں ہوئی۔ ترمیمات پیش ہوئیں اور ترمیمات پر ترمیمات پیش ہوئیں اور پھر آٹھ قرار دادیں، ایک دستور اور ایک منشور تیار ہوا۔ یہ سب کام ان لوگوں نے کیا جو اس ملک کا ناکارہ طبقہ کہلاتے تھے! ۔ یہ کام اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن رہنے والے ادیبوں نے کیا جن پر جوتے اور پتنگ بنانے والوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور جن کے بارے میں مجھ سے کراچی کے چند بڑے اہل قلم نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ بھائی یہ سب لڑیں گے۔ کام دام بالکل نہیں کریں گے تم یونہی روپیہ ضائع کراؤ گے۔

معلوم نہیں اس انجمن مصنفین کا انجام کیا ہو۔ اس کے پہلے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب مقرر ہوئے ہیں اور پچیس ادیبوں پر مشتمل ایک مجلس انتظامیہ بنی ہے جو ہر زبان کے ادیبوں کی نمائندگی کرے گی۔ اس انجمن کا مستقبل خدا کے بعد ان حضرات کے ہاتھ میں ہے اب تاریخ کے سامنے وہ جواب دہ ہوں گے مگر میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ایک بار تو ایسا ہوا کہ پورے پاکستان کے ادیبوں کی آوازیں ایک آواز میں بدل گئیں اور ہزار ہا نرم و گرم لہجے ایک لہجے میں سمٹ آئے۔

——— اور یہ اس ملک میں پہلی بار ہوا ہے! ۔

یہ بھی اس ملک میں پہلی بار ہوا ہے کہ ادیبوں میں انتظامی امور کے لئے عہدیدار مقرر ہوئے ہیں۔ جن ادیبوں نے یہ انتخابات کئے ان میں کوئی کسی سے کچھ کم ہو تو ہو بالکل ہی گیا گذرا کوئی نہیں تھا مگر انھوں نے انتخاب کرتے وقت ادبی عظمتوں کا چکر نہیں چلایا بلکہ انتظامی اہلیت اور ذاتی حالات سامنے رکھے۔ اس مجلس میں میں شامل نہیں ہوں مگر ہم سب شامل ہیں وہ سب جن کو اپنے لئے کام کرنے کی لگن ہے اور جن کا اس بات پر یقین ہے کہ زندگی میں کچھ نہیں تو ایک لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی ذات سے ہٹ کر کسی بلند مقصد کے لئے سوچ سکتا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۵۸ء کو جنرل محمد ایوب خاں نے ایک اعلان کیا تھا جس میں انھوں نے مستحق ادیبوں کو امداد دینے کے لئے ایک رقم مقرر کی تھی۔ یہ اعلان اس صدرِ حکومت نے کیا تھا جس کے ہاتھ میں مارشل لا کی شمشیر ہے جو اپیل اور عدالتی کارروائی سے بہت بے نیاز ہے جس نے پارلیمنٹ جیسے ادارے کو معطل کر کے رکھ دیا ہے اور جس کے پاس لاکھوں مضبوط جوانوں کی مسلح فوج ہے۔ وہ صدر ادیبوں اور کھلاڑیوں میں مقبولیت کا محتاج نہیں تھا۔ اس کے احکام کسی فرد یا جماعت کی منظوری کا انتظار نہیں کرتے۔ یہ اعلان سچائی کا اعلان تھا۔ ہمدردی کا اعلان تھا۔ اس نے ادب اور ادیب کی حیثیت مان لی تھی۔

یوں اس زمانے سے پہلے بھی صدر گذرے ہیں۔ خوش باش، خوش اوقات صدر۔ مجلس پسند صدر۔ پبلسٹی کے شائق صدر اور ایسے ہی وزرا اور وزرائے عظام بھی گذرے ہیں مگر ان میں سے کسی کو کسی بیمار شاعر، کسی مفلوک الحال افسانہ نگار، کسی بے کس نقاد کا خیال نہیں آیا تھا۔ بس اتحاد کا وزارت کبھی کبھار صوبائی حکومتوں کے اصرار پر کچھ کر دیا کرتی تھی اور پاکستانی ادب اور ثقافت کی لاش پر آدھے پونے کفن ڈھانپ دیتی تھی۔

اور اب ایک صدر نے، جو ہم ادیبوں کی رائے کا محتاج نہیں ہے، جن کو وہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے، یہ اعلان کیا تو مجھے بھی جھرجھری سی آئی۔ میں گیارہ برس سے اس ملک میں بے مقصد گھومتا رہا ہوں اور طرح طرح کی پیچیدگیوں، پریشانیوں اور لغویتوں میں خود بھی مبتلا

رہا ہوں اور کن کن اعلیٰ دماغوں کو مبتلا دیکھا ہے۔ میں آکہ میں نے کن کن لوگوں کو گروہ بندیوں کا شکار دیکھا ہے، جاگ گیا۔

اس شام نو بجے میں نے ابن الحسن سے کہا۔

"ابن۔ یار۔ یہ اعلان تو بہت زبردست چیز ہے۔"

ابن الحسن راولپنڈی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"ہاں ہے تو" ۔ اس نے ٹالا۔ "بھئی تو پھر تم کون ۔ وہ خود ہی کچھ کریں گے۔ آخر اتنی بڑی حکومت چل رہی ہے۔"

"تو پھر ہم خود بھی تو کچھ نہ کچھ کریں۔ اب بات آگے چلنی چاہیئے نا" ۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ میں ابن الحسن سے پوری بات ایکدم نہیں کرتا۔

"مثلاً" وہ چیخا۔ پھر وہ اچھلنے لگا۔ "مشاعرہ" اب وہ مزے لینے لگا۔

"ہاں بھئی مشاعرہ کرو اور اس رقم سے۔ سب شاعر بانٹ لو۔ واہ کیا بات نکالی ہے پٹھے نے۔" وہ جاری رہتا مگر میں برا مان گیا۔

"ابے بیوقوف نثر نویس" ۔ میں نے دھاڑ ماری۔ "میں یہ کہتا ہوں کہ ہم میں سے جو محتاج ہو وہ اور جو نہ ہو وہ ۔ سب مل کر بیٹھیں اور امداد باہمی پر بھی غور کریں۔"

"مطلب" ۔ وہ چپ سا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ ادیبوں کا کنونیشن بلایا جائے۔ آخر یہ آپس میں چپکے چپکے قرضے لیں اور دیں تو کب تک۔ اور حکومت کچھ کرے تو کس حد تک اور کس کس کے لئے کرے گی۔ کنونیشن بلاؤ کنونیشن ، ۔ اب میری ہی بات مجھ پر بھی واضح ہو گئی تھی۔

وہ پہلے تو چونکا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر سوچنے لگا۔

دوسرے دن ہم ابن سعید کے پاس گئے اور خوب لڑ جھگڑ کر ایک اعلان نامہ لکھوایا۔ یہ ابن سعید نے لکھا اور خود ہی ٹائپ کر کے دیا۔

تین دسمبر کو باقی پانچ نے دستخط کر دیئے۔ ان میں سب سے کم وقت قدرت اللہ شہاب اور ضمیر الدین احمد نے لیا۔

چار دسمبر کو یہ اعلان نامہ چھپ گیا۔

۸۔ دسمبر کو ہم نے ۸۰ا روپے کا باہمی چندہ کیا۔ ۱۵۔ جنوری کو ہم نے کراچی میں سولہ ہزار روپے جمع کر لئے۔ روپیہ تین آدمیوں نے دیا۔ ان کے نام شائع ہو گئے ہیں اسی طرح لاہور اور ڈھاکے کے انتظامات کی تفصیل شائع کر دی گئی ہے۔

یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہوتا رہا۔

۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری کو کنونیشن منعقد ہوا۔ ۳۱ کو اس میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں شریک ہوئے۔ ان سے شرکت کی درخواست دسمبر کے اواخر میں کی گئی تھی۔ اس وقت کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کنونیشن میں کیا کیا قرار دادیں آئیں گی اور کیا کیا فیصلے ہوں گے بلکہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کون کون آ سکے گا۔ چنانچہ ہم نے آخری اجلاس کے پانچ مقالے مقرر کئے تھے اور ان سے صرف سننے کی درخواست کی تھی ہم آٹھ آدمی نہ تو ڈھائی سو ادیبوں کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کر سکتے تھے نہ سب کی طرف سے کوئی خطبہ وغیرہ پیش کر سکتے تھے یہ معاملہ شہریوں کے جیسے جیسا نہیں تھا جس میں پہلے سے سوچی سمجھی باتیں کی جاتی ہیں۔

مگر ــــ اس شام تک پورے ملک کے بہترین اور مختلف الخیال ادیب اپنے لئے کچھ اہم فیصلے کر چکے تھے اور اب "اچھے بچوں" کی طرح مطمئن بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے بارے میں پیدا ہونیوالے ہزار ہا شبہات کا ازالہ کر دیا تھا۔ وہ متحد ہو گئے تھے۔

اور اب وہ چاہتے تھے کہ صدر پاکستان تقریر کریں۔ زرعی اصلاحات کا اعلان تازہ تازہ تھا۔ اسی زمانے میں پاکستانی دانشور پہلی بار جمع ہوئے تھے وہ صدر پاکستان سے ادب اور ادیبوں کے بارے میں سننا چاہتے تھے۔

اس وقت تک ممتاز حسین۔ قدرت اللہ شہاب اور جاوید اقبال اپنے اپنے خطبے پڑھ چکے تھے جو ۳۱ جنوری کے بعد سے محفوظ ہو گئے ہیں مشرقی

پاکستان کے دو مندوبین مقامی حالات پر بصیرت افروز مقالے پڑھ گئے تھے۔ مولوی عبدالحق صدر تھے۔ پانچ سو مندوبین اور مہمان سامنے بیٹھے تھے اور جانتے تھے کہ صدر پاکستان اس اجتماع میں تقریریں کریں۔ منتظمین خجل تھے کہ ان سے کس طرح کہیں۔

مگر یہ کنوینشن تھا ہی نئی تاریخ بنانے کے لئے۔ اسی کنونیشن میں یہ تاریخ بھی بنی کہ صدر مملکت بغیر کسی تیاری کے تقریر کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ ان کی فی البدیہہ تقریر سے ظاہر ہوگیا کہ انھیں اپنی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔

جنرل محمد ایوب خاں کی تقریر تاریخ کے حافظے پر ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس کا ماحصل وہ ضمانت ہے جو انھوں نے ادیب کو آزادیٔ اظہار کے لئے دی ہے اور جس کے ساتھ واحد شرط حبُّ الوطنی ہے۔

"انجمن مصنفین" کو دو گھنٹے کی عمر میں پہلا عطیہ صدر مملکت نے دیا اور انھوں نے اس سلسلے میں کوئی شرط نہیں لگائی۔ یہ پہلا عطیہ انجمن مصنفین کے لئے مالی امداد ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ملک بھر کے ادیبوں کے لئے ایک خوشخبری بھی پنہاں ہے۔ خوش خبری اس امر کی کہ اب کام کرنے کا موقع بھی ہے اور آزادی بھی۔ ادیب تاریخ کے آگے جوابدہی کے لئے تیار رہیں!

کام پر ہی مولوی عبدالحق صاحب نے زور دیا۔ اُن کے نہایت آسان اور وقیع خطبے میں کام اور صرف کام کا ذکر تھا۔ یہ خطبہ اپنی الگ شان رکھتا تھا۔ مولوی صاحب نے نقاہت کے باوجود اسے اپنی مضبوط آواز میں پڑھا اور سننے والوں نے شاید پہلی بار اتنے خلوص سے کوئی صدارتی خطبہ سُنا۔

کنونیشن ختم ہوگیا۔ تین دن کا اجلاس ختم ہوگیا مگر اب ادیبوں کی ایک مجلس کا آغاز ہوگیا ہے جسے اب شاید وہ خود بھی چاہیں تو ختم نہ کرسکیں گے۔ اس مجلس میں مندوبین کے علاوہ اور اہلِ قلم بھی شامل ہوتے رہیں گے۔

یہ انجمن یوں تو ایک کاروباری سا ادارہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کے ذریعے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ موسمی سوٹ اور متناسب ٹائیاں پہن کر ادب پیدا کرنے والے افسر، مفلوک الحال ادیب، مغرور نقاد، اسلامی ادب والے، جنسی ادب والے، تحلیلِ نفسی کے مشاق، مادّی جدلیت کے پرستار، اب شاید یہ ایک دوسرے کو پہلے سے بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے اور پھر پاکستان میں ایک نئی "بن لکھی تحریر" کا آغاز ہوگا ــــــ!

یہ بن لکھی تحریر صرف ادب کی زبان میں نہیں ہوگی بلکہ ایک تحریک کی شکل میں ابھرے گی، امدادِ باہمی کی تحریک، نفرتوں، عداوتوں کو بھلانے کی تحریک، رواداری کی تحریک، لکھنے کی تحریک۔

اس تحریک سے بڑے لکھنے والے چھوٹے نہیں ہو جائیں گے، چھوٹے لکھنے والے ایکدم بڑے ادیب نہیں بن جائیں گے۔ ادب کا کام اپنا اپنا ہے اپنی اپنی تخلیقی قوتیں خدا کی دین، علم، مشاہدہ، تجربات اور حالات یہ سب الگ معاملات ہیں اس کنونیشن میں کوئی غیر ادیب شریک بھی ہوگیا ہو تو وہ ادیب نہیں بن جائے گا نہ وہ جو یہاں نہیں آسکے ادیب رہنے یا کہلانے کی عزّت سے محروم ہو جائیں گے مگر یہ ضرور ہوگا کہ اگر اس نوزائیدہ انجمن مصنفین کے امین یعنی اراکین انتظامیہ نے اپنے ایمان کو بالکل ہی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی اہلیت و استعداد کو بقدر پانچ فیصدی کام پر لگایا تو اس پس ماندہ مگر بے حد زرخیز ملک میں بڑے ادب پیدا ہونے کے حالات پیدا ہو جائیں گے وہ بڑا ادب جس کے مرثیہ خواں سوائے خود ملامتی کے اور کچھ نہیں کرسکے ہیں، وہ بڑا ادب کوئی عنقا چیز نہیں ہے بلکہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ادیبوں کی مسلسل کاوشوں کے بعد آپ ہی آپ کسی ایک یا چند اہلِ قلم کی بدولت ظہور میں آنے لگتا ہے اور یہ کنونیشن جس نے انجمن مصنفین پاکستان کو جنم دیا ہے اور جو بہت سی تعریفوں اور ملامتوں کے ساتھ ختم ہوئی ہے اس بڑے ادب کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت سے یاد کی جائے گی۔

لیکن ـــــــ میری خوش فہمیوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ آئیے ہم سب اس فیصلے کا انتظار کریں جو تاریخ سنائے گی۔

پھر آئی بہارِ تازہ

عاصم حسین

اک صبح نئی چمکی ہے مشرق کے کہستانوں میں
اک سیل تجلی اُمڈا تاریک شبستانوں میں
پھر آئی بہارِ تازہ جھلسے ہوئے ویرانوں میں
گلبانگِ عنادل گونجا سنسان خیابانوں میں
ہنگامۂ نو برپا ہے پھیلے ہوئے میدانوں میں
ہنگامے ہی ہنگامے ہیں جمہور کے کاشانوں میں
شان اور ہرے کھیتوں کی بات اور ہے کھلیانوں میں
رہ رہ کر بجلیاں دوڑیں ٹھٹھری ہوئی شریانوں میں
کیا یہ کیسی دورِ نو کا اعجاز مسیحائی ہے؟

★

اٹھو کہ نئی لو آئی — اٹھو کہ نیا دور آیا
اٹھو کہ نئی پو آئی — اٹھو کہ نیا طور آیا
اٹھو کہ نئی ضو آئی — اٹھو کہ سمے اور آیا
خورشیدِ سحر کی تابش پیغام نیا لائی ہے

قصرِ دل و جاں میں پیدا اک اور ہی طوفاں کر دے
تاب و تب بے پایاں سے ہر سمت چراغاں کر دے
پیدا[ل] دلِ وارفتہ میں یا اور ہی ارماں کر دے
یا ہر طلب ناقص کا شیرازہ پریشاں کر دے
ہے عینِ فنا بے کاری، خوں زخم سے جولاں کر دے
گر ہم نہیں تیرے شایاں، اوروں کو نمایاں کر دے
وہ شان براہیمی ہو، آتش کو گلستاں کر دے
رنگین چمن شعلوں سے آراستہ یزداں کر دے
مغرب میں سہیل کی لَو سے اک طور فروزاں کر دے
مشرق میں نئے عنواں سے خورشید کو تاباں کر دے
جو پائے تن آسانی کو ہنگامۂ دوراں کر دے
طوبیٰ سے چھڑا کر دامن، کوثر پہ خراماں کر دے
قطرے کی حقیقت کیا ہے گوہر شہر افشاں کر دے
جوہر ہی کی تہ میں پنہاں سرمایۂ یکتائی ہے

لہ
یا پایۂ آرزو بیفزائے — یا خواہشِ ما ز در، درآور
بیکاریٔ ما گدازشِ ماست — زخمے بتراوشش اندر آور
رنگین چمنے ز شعلہ آرائے — ابراہیمے ز آزر آور
آثار سہیل از یمن جوئے — خورشید ز طرف خاور آور
جاں ہائے بہ راحت آشنا را — طوبیٰ بہشتان د کوثر آور
اے ساختہ غالب از نظیری
یا قطرہ رہائے گوہر آور

فریبِ خیال

طاہرہ کاظمی

اجنبی دیس سے آئے ہوئے ساتھی تم بھی
کہیں تخئیل کی اک اجنبی پرواز نہ ہو!

دُور، افق پار، تخیّل کے سمن زاروں میں
دیوتا بستے ہیں، انسان کہاں ملتے ہیں
دیوتا جن کی نگاہوں میں ہے تقدیسِ دوام
چاندنی رات میں موتی کی طرح روشن ہیں
مرمریں، سرد، حسیں، خواب نما تاج محل
دیوتا، جن کی پرستش سے تو انکار نہیں
ان کے پیکر میں مرے دوست! نہیں کیفِ حیات

خواب کے دیس میں شہزادے بہت رہتے ہیں
جو کبھی رات کو محلوں سے اُتر آتے ہیں
اپنے دامن میں بہاروں کے نئے رنگ لئے
اپنی پوشاک میں سیماب کا نیرنگ لئے
جگمگاتے ہوئے وہ نیلم و لعل و یاقوت
جھلملاتی ہوئی وہ کرنیں طلائی، سیمیں
کہکشاں، قوسِ قزح، راہگذاریں آئی
حکمراں ہیں وہ تخیّل کی حسیں وادی پر
رنگ بھی اُبھرے، چمک اُٹھی، بہاریں آئی
لیکن اے دوست! وہ نزدیک تو آتے ہی نہیں

زندگی کا کوئی نغمہ تو سناتے ہی نہیں
وہ تو بس خواب کے شہزادے ہیں اور کچھ بھی نہیں!

کتنا مانوس ہے یہ قرب کا پہلا احساس
اب تو آنکھوں میں نہاں کوئی تلاطم بھی نہیں
کون ہو، نام ہے کیا، مجھ سے یہ رشتہ کیا ہے؟
کیا تمہیں بھی ہے اندھیروں میں محبت کی تلاش؟
کسی سائے کی، کسی سانس کی قربت کی تلاش؟

تم ابھی دیکھ رہے تھے مجھے بے خود، مبہوت
اس خموشی میں نہاں کوئی تکلم بھی نہ تھا
ثبت پیشانیٔ سادہ پہ تھی اک مہرِ سکوت
اور ان ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم بھی نہ تھا

تم کہاں ہو مرے ہمراز! نگہ اٹھتے ہی
کھو گئے تم بھی اندھیروں میں اُجالوں کی طرح
تم بہاروں کی طرح نغمہ فشاں آئے تھے
چھُپ گئے ذہن میں خاموش خیالوں کی طرح

گر کبھی عرصۂ پُرخار میں چلتے چلتے
ہو گئی تم سے ملاقات سرِ راہگذار
تم ٹھٹک جاؤ گے، رُک جاؤ گے، سوچو گے ضرور:

اس گزرتے ہوئے سائے کو کہیں دیکھا تھا
یہ حقیقت تو نہیں، خواب کہیں دیکھا تھا

تیرگی سے روشنی تک

صہبا اختر

مرے دیس کی وادیاں کتنی سرسبز و شاداب تھیں
رشکِ خورشید تھیں جانِ مہتاب تھیں
خلدِ افسانہ تھیں جنتِ خواب تھیں
ریشم و اطلس و پرنیاں و سراپائے کمخواب تھیں

وہ کپاس ایسی چاندی کے پربت کھڑے کرنیوالے کہاں
ڈھونڈتا ہے جنہیں وادیوں کا دھواں
سبزہ و گل کی ویرانیاں نوحہ خواں
ہائے وہ کھیپ سونے کی اشرفیوں کا قلزم بیکراں

یہ فضا ہے جہاں کل حنا رنگ پھولوں کے انبار تھے
دُور تک خواب آسا فسوں زار تھے
پر کسان اس فضا میں بھی بیدار تھے
خونِ دل میں ڈبوئی ہوئی انگلیوں سے چمن کار تھے!

مسکرا، مسکرا، خوبصورت زمیں مسکرانے لگی
پنگھٹوں کی فضا جھلملانے لگی!
ساحرہ، ساحرہ رسمسانے لگی
ہر شگوفے کی محبوس آواز پھر گنگنانے لگی

دھان کی لہر یا چادریں فن کی عظمت کا اظہار تھیں
وادیاں ان کے رنگوں سے گلنار تھیں
نیلگوں ندیوں پر شفق بار تھیں
گیہوں کی سیمگوں بالیاں ان کی محنت کا شہکار تھیں

آج جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد ہے ہر زمیں
پھر اُگائیگی صد لعل و گوہر زمیں
کھیت سے کھیت تک مشک و عنبر زمیں
کِس مسیحا نفس کے نفس سے ہوئی پھر معطر زمیں!

گیت

تبسم نظر

دل کیوں چھوٹا ہو

دل میں سما جاتا ہے سب کچھ اس کی تھاہ نہیں ہے
اس میں سونے چاندی کے سکوں کی راہ نہیں ہے
تو خوش ہو ہر حال میں جس سے ایسا سودا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

تو خوش ہے تو دنیا خوش ہے جگ کی ریت یہی ہے
تیری خوشیاں دنیا بانٹے، تیری جیت یہی ہے
خوش ہو جب تیرا ہمسایہ، تو بھی ہنستا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

رہتا ہے جس رنگ میں کوئی رہنے دے اچھا ہے
اپنے آپ میں گر وہ خوش ہے، تیرا کیا لگتا ہے
تیرا اپنا کام بہت ہے اس کا چرچا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

بیلے کی حُور

شیر افضل جعفری

تو ٹلّی کی چھلّی شرمیلی مستور
عصمت کی خوشبو سے عمر تری مخمور
تیرا پاک تبسم تاروں میں مشہور
کانوں کی بچھیوں بُندوں کے انگور
تھر ٹیں[1] تیری گائیں طوطے، مور، تلور
چڑیاں تیری سکھیاں تو کھیتوں کی حُور
حسن لچکتی ٹہنی تو ٹہنی کا بُور
سرسوں تجھ پر وارے کُندن کُندن نُور
بھونروں کو ترسائے تیرا پھول غرور
تیری خیر منائیں تنگر[2]، برج، کلُور

میں دلگیر فرشتہ
تو اک نور سرور

---

[1] لوک گیت۔
[2] اِدھر کے تین گاؤں۔
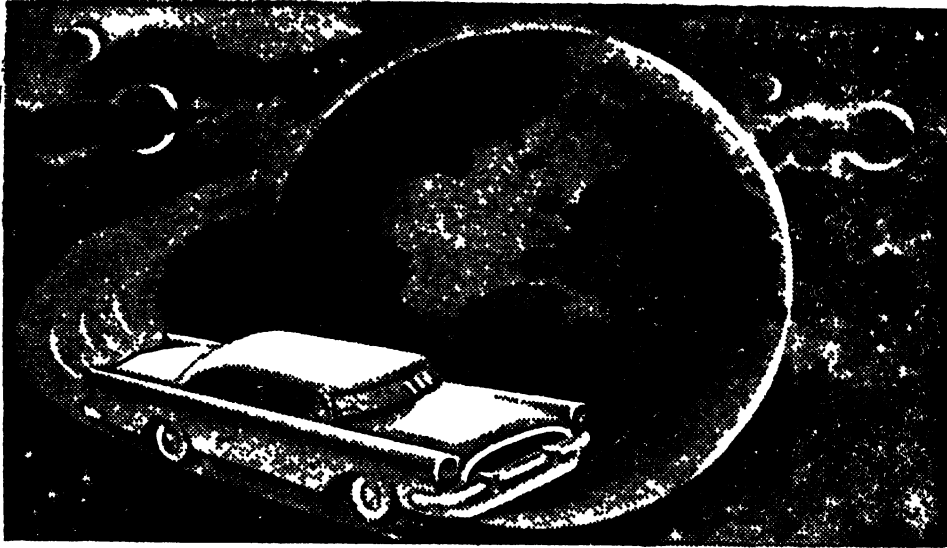
ہر دو سال میں دُنیا کا چکّر!

آپ کی موٹر کار روزانہ دفتر آنے جانے اور ہر ہفتے پک نِک کے لئے دو سال میں عموماً جتنا چلتی ہے وہ دنیا کے گِرد اگرد چکّر لگانے کے برابر ہے۔ یقیناً یہ آپ کی کار پر (اور مالی لحاظ سے خود آپ پر) بڑا بوجھ ہے۔ اس لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ آپ کی کار (اور خود آپ) کے ساتھ لطف وعنایت برتی جائے۔ چنانچہ عقلمندی یہ ہے کہ عمدہ کارکردگی اور کفایت کے لئے آپ کالٹیکس کی یہ تین اہم چیزیں استعمال کریں۔

کار والوں کے لئے کالٹیکس کی ۳ اہم چیزیں

IC-PLUS
PETROL

انجن کی طاقت کے لئے

وہ زبردست پٹرول استعمال کیجئے جسے آئی-سی-پلس پٹرول کہتے ہیں۔ یہ آپ کے انجن کو خواہ وہ نیا ہو یا پرانا جھٹکوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اُسے خوب طاقت پہنچاتا ہے۔ انجن کو گھسنے سے بچاتا ہے اور زیادہ میل چلنے میں مدد دیتا ہے۔

RPM
MOTOR OIL

انجن کی حفاظت کے لئے

دراصل اس ایک تیل میں تین تیل شامل ہیں۔ آر-پی-ایم موٹر آئیل ایسا تیل ہے جو آپ کا انجن ہر موسم اور ہر ٹمپریچر میں چکنا رکھتا ہے۔ اسے گھسنے سے بچاتا ہے اور اسے زیادہ عرصہ تک کارآمد رکھتا ہے۔ صرف یہی ایسا موٹر آئیل ہے جس کے ذریعہ پٹرول کے خرچ میں ۱۵ فیصدی تک بچت ہو سکتی ہے۔

آرام دہ ڈرائیونگ کے لئے

کالٹیکس مارفک اعلیٰ درجے کی گریس ہے۔ اس سے آپ کی موٹر کا چیسس لُبری کیشن کے ایک خاص چارٹ کے مطابق چکنا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد آپ کی ڈرائیونگ ایک ہزار میل بلکہ اس سے بھی زیادہ پُرلطف، شور سے محفوظ اور آرام دہ رہتی ہے۔
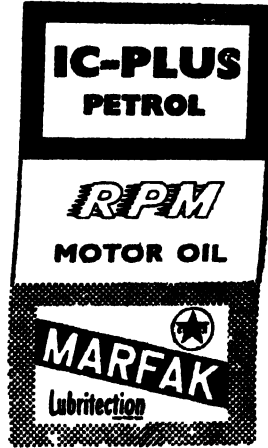
اپنے کالٹیکس ڈیلر سے آج ہی مشورہ کیجئے

STRONACHS

افسانہ:

حصار

انتظار حسین

"تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔" ہاں اسے اپنے والد یاد ہیں، پھر؟ اس قصے میں اپنے والد کا حوالہ اسے پسند نہیں آیا تھا
مگر میر صاحب کا تو طریقہ ہی یہ ہے کہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کی خاطر خود عینی شاہد بن جاتے ہیں یا کسی دوسرے کو بنا لیتے ہیں۔ وہ آخری دن تھا۔ حصار نہیں کھینچا تھا۔ آخری تسبیح پڑھتے شک ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ بس اسی میں دھیان بٹ گیا اور دانہ بھول گئے کہ کونسا ہے ...... یہ کیا بات ہوئی۔ اسے اس داستان پہ بالکل اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ سوچا کہ آج تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہاں سے اٹھ چلو۔

"میر صاحب، جلالی وظیفہ کسی کا پورا بھی ہوا ہے؟" نعیم نے سوال کیا۔

وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"سینکڑوں میں کوئی ایک نکل جاتا ہے۔" میر صاحب رکے، پھر بولے "بھائی جلالی وظیفہ تو جوا ہے۔ بس اندھا داؤں سمجھو۔ آدمی یا پیر کامل یا پاگل۔ بندے علی تو ابھی تک جیتے تھے۔ سب نے انہیں دیکھا ہے۔ بچارے اسی میں پاگل ہوئے۔ انتالیس دن خیریت سے گذار دئے۔ چالیسواں دن بھی خیریت سے گذر چلا تھا۔ آخری تسبیح کے دو دانے باقی تھے ...... لو صاحب ننانویں دانے پہ بکھر گئے۔ بس یوں لگا کہ انگلیوں میں کھنکھجورا ہے۔ ہڑبڑا کے انگلیوں کو جھٹکا۔ تسبیح جانمانہ سے پرے جا گری ...... بس اسی میں دماغ چل بچل ہو گیا۔ ہر وقت انگلیوں کو جھٹکتے تھے۔" میر صاحب چپ ہوئے، پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولے "بھائی یہ تو اندھا داؤں ہے۔ جو نکل گیا وہ پیر کامل۔ جو رہ گیا وہ پاگل۔"

اس نے پھر اٹھنے کی ہمت باندھی۔ یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔

"میر صاحب بعض عامل ہوتے ہیں کہ جس چیز کو کہو فوراً حاضر کر دیتے ہیں۔" نعیم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"سفلی عمل۔" میر صاحب بولے۔

"اچھا؟"

"ہاں آں۔ تھے ایک ایسے عامل کتے کی قبر کے پاس والی املی کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ ہم اس زمانے میں بچے تھے ہم کئی لڑکے ان کے پاس پہنچ گئے کہ شاہ جی گلگلے کھائیں گے۔ شاہ جی نے انگلی اٹھائی۔ لو صاحب گرم گرم گلگلوں سے بھری ٹوکری سامنے آ گئی۔ سب نے جی بھر کے کھائے۔ جب واپس ہونے لگے تو محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بھنگن چلاتی پھر رہی تھی کہ میں نے تیجوں کے لئے گلگلے پکائے تھے۔ ایک ننگ دھڑنگ لنگوٹ بند مردوا چوکے سے گلگلوں کی ٹوکری اٹھائے لے گیا۔ بس کیا پوچھتے ہو بہت طبیعت خراب ہوئی۔"

"حد ہو گئی۔" نعیم بولا۔

وہ انگڑائی لیکر اٹھ کھڑا ہوا۔

نعیم نے اس کی طرف دیکھا "ابھی سے؟"

"نیند آ رہی ہے۔" اس نے ہلکی سی جماہی لی۔

"یار آج میری طرف نہ سو جاؤ۔"

"کیوں؟"

"آج میں اکیلا ہوں۔ گھر سے سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔ اوپر سے میر صاحب نے یہ باتیں سنا دیں۔ اب رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ ویسے تمہارے گھر بھی کون بیٹھا ہے جو تمہارا انتظار کرے گا۔ میری طرف چلے چلو۔"

"نہیں بھئی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا اور چل پڑا۔

"سفلی عمل میں پاک نجس کی تمیز نہیں ہوتی۔ اور بھائی اب تو سفلی عمل ہی رہ گیا ہے......" میر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ پیچھے رہ گئی۔ وہ میر صاحب کی دکان سے چل کر نظیر کی دوکان پر رکا۔ سگریٹ خریدے۔ سگریٹ کی ڈبیا کھولتے ہوئے اچٹتی سی نظر سڑک پر ڈالی۔ بازار ابھی چل رہا تھا۔ گاڑی شاید آ گئی تھی کہ سواریوں سے بھرے کئی تانگے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ بازار کی بھیڑ کے باعث رفتار ان کی اک ذرا سست ہو گئی تھی۔ بھیڑ دوکانوں پر تو ایسی نہیں تھی مگر چلتے پھرتے لوگ بہت خاصے دکھائی دے رہے تھے۔ دوکانوں کے تھڑوں اور تپائیوں پر جم کر بیٹھنے والوں کی گرم گفتگو اس پر مستزاد تھی۔ اس سب کی وجہ سے بازار میں ہلکی ہلکی گرمی اور روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ سگریٹ کی ڈبیا کھول کر اس نے سگریٹ نکالا، منہ میں لگاتے ہوئے اسے لٹکی ہوئی سلگتی رسی سے سلگایا۔

موڑ مڑ کر وہ پرانی سڑک پر ہو لیا۔ جگمگ دکانیں پیچھے رہ گئی تھیں اور شور بازار کا دوسری دنیا سے آتا معلوم ہوتا تھا۔ دور دور کھڑے بجلی کے کھمبے خاموش سڑک پر اجالا ضائع کر رہے تھے۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور اس ٹھنڈی رات کی نم فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ وہ میر صاحب کی دکان کی فضا سے باہر نکل آیا تھا۔ یوں اسے میر صاحب کا فقرہ نادانستہ پھر یاد آ گیا تھا۔ مگر اب اس کے ساتھ ناخوشگواری کا احساس شامل نہیں تھا۔ "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔" بھلا یاد کیوں نہ ہوتے اور سفید ڈاڑھی والا اجلا اجلا سا چہرہ اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ گذرے دن اب خواب سے لگتے تھے عجب مفلسی کے دن تھے۔ کبھی قرض ادھار سے کبھی گھر کی چیزیں گروی رکھ کے گھر کا خرچ چلایا جاتا اور کسی طور پر پورا نہ ہوتا۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے جلالی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اوپر والے کمرے میں دن دن بھر جانماز پہ بیٹھے رہنا، نہ منہ سے نہ بولنا، خیالوں میں گم کھڑاؤں پہنے گھڑی دو گھڑی کے لئے باہر آنا اور املی دال اور روٹی کھا کر ترکِ حیوانات کے باعث گوشت گھی دودھ سے پرہیز تھا پھر اندر جا کر دروازہ بند کر لینا۔ چالیسویں دن جب تیسرا پہر جا رہا تھا اور دھوپ کم کم سب سے اوپر والی منڈیر پہ باقی تھی، سر برہنہ دونوں ہاتھوں میں کھلا قرآن لئے بغل میں عصا پیروں میں کھڑاؤں کمرے سے نکلے۔ "یہاں سے نکل چلو۔" گھر بھر کی پریشان نظریں دہشت زدہ چہرے پہ ان کے جم گئیں، مگر کسی کو کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ جیسے بیٹھے تھے ویسے کھڑے ہوئے اور گھر سے گھبرائے ہوئے مگر چپ چپ پڑوس میں نقی حسین کے گھر چلے گئے۔ نقی حسین کے گھر رات گئے تک کوئی نہیں سویا۔ جب اونچی آواز میں باتوں کا تار ٹوٹا اور ایک ایک کر کے گھر والے سوتے گئے تو پھر نقی حسین کی بیوی اور اس کی والدہ دبی دبی آواز میں باتیں کرنے لگیں "میں تو جانوں انہوں نے حصار نہیں کھینچا تھا۔" نقی حسین کی بیوی کہہ رہی تھیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسے بھی نیند آ گئی۔ رات گئے آنکھ اس کی پھر کھل گئی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ بس والد اس کے جانماز پہ بیٹھے سامنے قرآن کھولے اونچی آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ وہ ڈرا ڈرا اٹھا، نالی پہ جا کر پیشاب کیا، اور چپکے سے کچھ ڈرتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی خالی گھر میں چھت پہ صحن میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، دروازہ بند، باہر سے تالا پڑا سا پڑا ہوا۔ دل اس کا دھڑ دھڑ کرنے لگا...... وہ چونک پڑا اور جلدی جلدی چل کر پرانی سڑک سے کھڑکی والی گلی میں مڑ لیا۔

کھڑکی والی گلی میں مڑتے ہوئے قدم اس کے زیادہ تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ ضرور چوپٹ کھلا، مگر اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا۔ کیا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے؟ مگر پھر اسے مقفل ہونا چاہیئے تھا۔ نظر اس کی وہاں سے اٹھ کر قدیر کے بالائی کمرے پر گئی جس کے شیشوں سے روشنی چھن کر سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ قدیر امتحان کی خاطر یوں راتوں کو نہ جاگتا تو اس گلی میں تو بالکل ہی اندھیرا رہا کرتا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ صرف اس کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔ اور اس نے اپنی چاپ سے جھجک کر چال سست کر دی۔

کھڑکی والی گلی سے وہ اس اگلی ایسی پتلی گلی میں داخل ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک نالی چلی گئی تھی اور پرلے نکڑ پر ایک دھندلے قمقمے والا کھمبا کھڑا تھا جس کی روشنی میں اسے ایک شخص کمبل اوڑھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جب وہ شخص اس کے قریب پہنچا تو یہاں وہ اجالا نہیں تھا، پھر یوں بھی اس نے کمبل منہ تک لپیٹ رکھا تھا۔ وہ شخص سائے کی مثال پاس سے گذر گیا۔ اس کے گذر جانے پر اسے کرید سی ہوئی کہ آخر یہ کون شخص تھا۔ مڑ کر دیکھا تو گلی خالی پڑی تھی۔ اتنی جلدی وہ گلی سے گذر گیا؟ اسے کچھ تعجب ہوا سوچا کہ کیوں نہ پلٹ کر گلی کے کنارے پہ پہنچ کر اسے دیکھ لیا جائے۔ مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ یہ تو بڑی بے تکی

بات ہے اور اس نے اپنی چال تیز کر دی۔

اس تپلی اندھی اندھیری گلی سے گذر کر جب اس نے قاضیوں والی گلی میں قدم رکھا تو تھوڑی ڈھارس ہوئی۔ اس نسبتاً چوڑی گلی میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے دور تک کھمبے کھڑے تھے جن کی روشنی سے ساری گلی منور تھی۔ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ پیچھے قدموں کی چاپ اور قدموں کی چاپ کے ساتھ دو آدمیوں کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ جی میں آئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھو تو سہی کہ کون لوگ ہیں۔ مگر فوراً کے فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ ہوگا کوئی، اپنی بلا سے۔ ہاں پیچھے کان لگا کر یہ ضرور اس نے سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر جیسے وہ کوٹ یا کمبل کے اندر منہ دیکر باتیں کر رہے ہوں ایک لفظ بھی تو اس کے پلے نہیں پڑا۔ پھر وہ قدم کسی درمیان میں کٹنے والی گلی میں مڑ گئے کہ ساتھ اس کے قدموں کی چاپ بھی کم ہوگئی۔ پھر دور بہت پیچھے کسی دروازے پہ دستک ہوئی کہ وہ فوراً کھلا اور کھل کر زور سے بند ہوگیا۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ سب گھروں کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور وہ باہر گلی میں اکیلا چل رہا ہے۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ رات بہت ہوگئی ہے، جلدی گھر پہنچنا چاہیئے۔ لمبے ڈگوں کے ساتھ ہمراہ چلتی پرچھائیں بھی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ جلدی جلدی لمبی ہوتی چلی جاتی، پھر چھوٹی ہونے لگتی، چھوٹی ہوتے ہوتے اس کے قدموں سے لپٹتی اور پھر پیچھے پھیلتی چلی جاتی۔ لمبی ہوتی جاتی۔ یہ اتنی بڑی پرچھائیں میری ہے؟ ایک الٹا سا خیال پرچھائیں کی مثال ذہن میں آیا اور گذر گیا۔ آپ ہی آپ وہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے تھوڑی سردی لگنے لگی تھی اور انگلیاں تو بالکل ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ سردی ناخنوں اور پوروں سے چڑھتی ہے، آدمی کے پاس دستانے ضرور ہونے چاہئیں۔ جاڑے کی راتوں میں سکڑتے ہوئے بندے علی اسے الل ٹپ یاد آگئے کہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر، کسی سڑک کے موڑ پر اچانک نظر آجاتے۔ کبھی کوئی پھٹا ٹوٹا کمبل لپیٹے کبھی کمبل غائب، خالی کرتا پائجامہ سر پہ میلی سی ٹوپی، مگر سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ہر صورت جھٹکتے جھاڑتے ہوئے، کبھی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے کبھی گم سم اپنے آپ میں کھوئے ہوئے جیسے باقی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ رشتوں کا جہان بھی کیا تنگ ہے کہ قدم ذرا غلط پڑا اور آدمی اس سے باہر۔ پہلے وہ خود ایک جہان ہوتا ہے، بکھرے رشتوں کا خود مختار جہاں، جہاں تسبیح کھنکھجورا اور کھنکھجورا تسبیح ہوتی ہے....

"تو شہزادے کے سر میں ہر وقت درد رہے۔ حکیموں طبیبوں ویدوں نے سب علاج کر دیکھے پر کوئی علاج نہ لگے۔ تب شاہی حکیم نے کہ سب حکیموں کا استاد تھا یہ کہا کہ میں شہزادے کی کھوپڑی کھول کے دیکھوں گا۔ تو اس نے کیا کیا کہ شہزادے کو بیہوشی کی دوائی پلائی اور تیز تلوار سے اس کی کھوپڑی ٹوپی کی طرح اتار لی..........."

"کھوپڑی؟"

"ہاں بیٹا حکیم نے شہزادے کی کھوپڑی جو اتاری تو کیا دیکھے ہے کہ مغز میں کھنکھجورا پنجے گاڑے بیٹھا ہے......."

"کھنکھجورا؟"

"ہاں بیٹا کھنکھجورا۔ اب حکیم شش و پنج میں کہ نکالوں کیسے۔ اور دیر کرے تو شہزادے کی جان کا خطرہ۔ تو اس کے شاگرد نے کہا کہ یا استاد گستاخی معاف، آگ منگاؤ، آگ کے ساتھ چمٹی منگاؤ، چمٹی سے ایک دہکتا انگارہ پکڑو، انگارہ پکڑ کے کھنکھجورے کی پشت پہ رکھ دو۔ تو بھیا حکیم نے یہی کیا۔ بس کھنکھجورے نے تڑپ کے پنجے چھوڑ دیئے......." ایک لمبی جھرجھری کے ساتھ وہ چونک پڑا۔ قدم اس کے تیز تیز اٹھنے لگے۔

وہ اپنے آپ سے خفا خفا چل رہا تھا۔ آخر یہ بھولے بسرے قصے جن کا کوئی سر پیر نہیں کیوں یاد آرہے ہیں۔ کھنکھجورا کہیں دماغ کے اندر ہو سکتا ہے؟ آخر کیسے اور کیوں؟ اندر تو وہ پیدا ہو نہیں سکتا، باہر ہی سے جائے گا۔ مگر کس راستے سے؟ کان کے راستے سے؟ جیسے اس لڑکی کے دماغ میں جس کا سر ہر وقت دکھا کرتا تھا ایک ننھی کنسلائی کان کے رستے داخل ہوگئی تھی، اور پھر کنسلائی سے کنسلائی اور کنسلائی سے کنسلائی پیدا ہوئی کہ دماغ میں کنسلائیاں ہی کنسلائیاں رینگنے لگیں۔ اس نے گجگجاہٹ کے احساس کے ساتھ سر کو ذرا جھٹکا۔ لاحول ولا قوۃ، یہ کیا کم مضحکہ خیز کہانی ہے۔ اس کا بس چلتا تو اس وقت اپنے دماغ میں کنجی لگا دیتا۔ مگر دماغ میں کنجی نہیں لگائی جا سکتی اور خیال کے ہزار پیر ہوتے ہیں کہ بے آہٹ رینگتا رینگتا کبھی کان کے راستے کبھی آنکھ کے سہارے دماغ کے اندر داخل ہوتا ہے اور اندھیرے میں چھپ بیٹھتا ہے۔ اسے اپنے آپ پہ غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں پیر صاحب کی دکان پر بیٹھ کر عقل سے خارج باتیں اور فرضی قصے سنتا ہے۔ آخر یوں وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟ ــــ اندھیرے میں ایک ساتھ سپاہی کا ایک تو دا اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ ٹھٹھک گیا اور چیخ بس منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

اسے رمضانی پہ غصہ آنے لگا کہ کمبخت بیچ گلی میں بھینس کو باندھ دیتا ہے۔ شاید یہ غصے ہی کا اثر ہو کہ بدن اس کا کچھ کانپنے لگا تھا۔ یا شاید سردی کا اثر ہو؟ ویسے تھوڑا تھوڑا پسینہ بھی آگیا تھا اور دل بلا وجہ دھڑکنے لگا تھا۔ سردی تو اسے اب مطلق نہیں لگ رہی تھی، بلکہ اس کا تو یہ دل چاہ رہا تھا کہ گرم کوٹ ہی کے نہیں قمیص کے بٹن بھی کم از کم اوپر والا بٹن ضرور کھول دے تاکہ تنگ کالر جو اس گھڑی زیادہ تنگ لگ رہا تھا ڈھیلا ہو اور گلے اور گردن کو کچھ سکون ملے۔

قاضیوں والی گلی سے تیز قدم اٹھاتا ہوا گویا چل نہیں بھاگ رہا ہے وہ پتھر والے کنوئیں پہ، پتھر والے کنوئیں کے پاس سے گذر کر شیخ جی کی ٹال کے سامنے سے نکلتا ہوا وہ تیزی سے اپنی گلی میں مڑ گیا۔ مگر وہ اتنا تیز کیوں چل رہا ہے؟ اس نے اپنی چال سست کر دی۔ یوں بھی اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا جیسے گرجتے بادلوں اور گھرتی گھٹا والے آسمان سے بچ کر وہ چھت کے سائے میں آگیا ہو۔ گلی خالی اور خاموش تھی، ساتھ میں پرسکون بھی۔ روشنی جو قاضیوں والی گلی کے آدھے رستے پہنچ کر ساتھ چھوڑ گئی تھی پھر واپس آگئی تھی اور اس کے مکان کے بالکل برابر بجلی کے کھمبے کے نیچے اجالے کا ایک تھالا چھلک رہا تھا۔ قدموں کے ساتھ دل کی چال کے ساتھ سانس کی رفتار بھی معمول پر آچلی تھی۔ اطمینان سے چلتا ہوا وہ اپنے دروازے پہ پہنچا، تالا کھولا، بجلی جلائی اور کمرے میں، جو بیٹھک بھی تھا اور خوابگاہ بھی، قدم رکھا۔

کپڑے اتارتے اتارتے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر بستر پہ نظر کی۔ بستر خالی تھا۔ ہاں بستر کے پائنتی دیوار کے سوراخ میں وہی چوہا جو اس کمرے میں کبھی آزادانہ کبھی چوری چھپے گھومتا نظر آتا تھا داخل ہو رہا تھا کہ دم اس کے سوراخ میں گم ہو جانے کے بعد بھی لہراتی رہی اور جسم میں اس کے اک ہلکی جھرجھری پیدا کر کے آہستہ سے اوجھل ہو گئی۔ کپڑے اتارنا بھول کر وہ بستر صاف کرنے لگا۔ زور زور سے چادر جھاڑی، جھاڑ کر بچھائی، لحاف کو جھاڑا، تہہ کر کے رکھا، تکیے کا غلاف اتارا، اتار کر جھاڑا اور قرینے سے سرہانے جمایا۔

نیند آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے اڑتی سی نظر پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے سوراخ پہ ڈالی اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میر صاحب کی بات پھر یاد آگئی "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔" اور قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ سفید ڈاڑھی والا پریشان چہرہ تصور میں پھر ابھرنے لگا۔ اور وہ گھر بھی جس میں کئی دن تک تالا اور اندھیرا پڑا رہا تھا۔ پھر جب واپس ہوئے تو ڈرے ڈرے سے۔ ویسے بالائی کمرے میں اس کے بعد بھی تالا پڑا رہا تھا۔ باہر تالا اور اندر اندھیرا پڑا رہتا اور صحن میں کھلنے والی کھڑکی جو وظیفے کے ختم کے دن کھلی رہ گئی تھی کھلی پڑی رہتی۔ اور کسی کسی جمعرات کو شام پڑے لگتا کہ اندر کوئی چل رہا ہے اور سب کے سب سہم جاتے۔ وہ گھر جس کی چھتیں اور زینے اور کمرے کل تک مانوس تھے اب کتنا ڈراؤنا لگتا تھا۔ اور سگریٹ سلگا کر اس نے اک ذرا عجلت سے میز پہ پڑی ہوئی وہ کتاب اٹھائی جو کل پڑھتے پڑھتے درمیان سے چھوڑ دی تھی۔ اکھڑی اکھڑی طبیعت جمی نہیں۔ تیسرے صفحے پہ بالکل اکھڑ گیا اور کتاب بند کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہوئے نظر نادانستہ پھر پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے خالی سوراخ پر جا پڑی۔ اتارا ہوا کوٹ کھونٹی سے اتار جھٹ پٹ پہنا، قریب ٹنگا ہوا مفلر کھینچ گلے میں ڈال، بجلی بجھا، کمرہ بند کر باہر نکل آیا۔ بجلی گلی کی گل ہو چکی تھی۔ وہ حیران ہوا کہ ابھی تو وہ بجلی جلتی چھوڑ کر گیا تھا اور ابھی نکلا ہے تو بجلی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اچھا آج چاندنی رات ہے۔ مفلر سر سے لپیٹتا لپیٹتا وہ گلی سے باہر چلا۔ روشنی دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہاں جا بجا چاندنی اتری ہوئی تھی جس کے عکس سے کچھ اندھیرے میں بھی اجالا جھلکنے لگا تھا۔ ساتھ میں کہرے نے مل کر فضا کو دودھیا دودھیا کر دیا تھا۔ سردی اب زیادہ ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوتی انگلیاں اس نے مٹھی کی صورت میں سمیٹیں۔ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بدن میں چڑھتی ہے آدمی کے پاس دستانے ضرور ہونے چاہئیں، اس نے ہاتھوں کو کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا۔

قاضیوں کی گلی میں مڑتے ہوئے سامنے رمضانی کے دروازے پہ نظر ڈالی جہاں بھینس حسب توقع موجود تھی، مگر تھی بیٹھی ہوئی۔ برابر سے گذرنے پر بھی نہ چونک کر کھڑی ہوئی نہ گردن کو جنبش دی، پیہم جگالی کرنے والا جبڑا جیسے سلا ہوا، آنکھیں بند، دم ساکت، بس کالونس کا ایک ڈھیر سا رکھا تھا۔ بجلی کے سب کھمبے ٹھنڈے ہو چکے تھے اور گلی خالی اور خاموش تھی۔ بس چاندنی کے عکس سے دمکتا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک سفید بلی ایک بند دروازے کے برابر دہیروں پہ بیٹھی اسے دور سے گھور رہی تھی۔ نیلے کنچا سی پتلیاں ٹکٹکی باندھے اسے گھورتی رہیں یہاں تک کہ وہ اس کے برابر آگیا اور برابر سے گذر کر آگے نکل گیا۔ مگر جب پتلی اگلی ایسی گلی میں مڑ رہا تھا تو اس نے سامنے دیوار پہ جہاں چاندنی اتر چلی تھی بلی کی چلتی پرچھائیں دیکھی جو تھوڑی

میں مکھائی دی پھر اوجھل ہو گئی۔ اس گلی میں چلتے ہوئے اس شخص کا خیال اسے پھر آگیا جو پاس سے سائے کی صورت گذر گیا تھا۔ آخر کون شخص تھا وہ؟ اتنی دیر کی بات بھی ابھی کی لگنے لگی۔ وہ ذرا تیز تیز چلنے لگا اور مڑنے میں خاص طور پر عجلت برتی۔ عجلت سے مڑ کر دور تک نظر ڈالی۔ گلی یہاں بھی خالی پڑی تھی۔ ہاں آخری نکڑ پر کھلی ہوئی چاندنی میں کتا ایک کھڑی دم اور اٹھے ہوئے منھ کے ساتھ سنتری کی صورت کھڑا تھا۔ کتے رات میں آدمی کو بہت خراب کرتے ہیں، گھر سے چھڑی لیکر نکلنا چاہیئے۔ اس کی رفتار پھر آہستہ ہو گئی۔ گلی خاموش تھی۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ بند ہو چکا تھا تدیر کے بالائی کمرے کی روشنی گل تھی۔ آج شاید وہ سویرے سو گیا تھا۔

گلی کے نکڑ پہ پہنچتے پہنچتے وہ اندھیرے سے اچانک چاندنی میں آگیا۔ مگر وہ کتا کہاں گیا! اس نے ادھر ادھر بہت نظر دوڑائی، کتا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اسے تعجب، تعجب کے ساتھ اطمینان ہوا کیونکہ وہ گھر سے چھڑی لیکر نہیں چلا تھا اور کتے رات کو ہر شریف آدمی پہ جا دیجا بھونکتے ہیں۔ سائے کی طرح برابر سے گذر جانے والے نامعلوم شخص کا خیال پرچھائیں کی مانند اس کے ذہن میں آیا اور گذر گیا۔ اور چپکے سے ایک سوال اس کے اندر پیدا ہوا۔ کیا بندے علی رات کو بالکل نہیں سوتے تھے؟ لگتا تو ایسا ہی تھا...... اور سیٹی کی آواز پہ اس نے چپل اتار ہاتھ میں لئے اور دوڑنا شروع کر دیا۔ سیٹی کی آواز اب کے کہیں قریب سے آئی تھی اور وہ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب کے بھی اگر سالے ہاتھ سے نکل گئے تو بیٹا ساری رات چور بنے رہو گے اور گھر میں پٹائی ہو گی سو الگ۔ خیر دروازہ تو اب بھی بند ہو ہی چکا ہو گا اس نے ایک ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک ایک چپل کو اور مضبوطی سے جکڑا اور زیادہ تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر گلی میں مڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ پاؤں سو سو من کے ہو گئے کہ بھاگا جائے نہ ٹھہرا جائے۔ بندے علی ماسٹر صاحب کے دروازے کی طرف منھ کئے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور دروازہ بند گلی خالی تھی۔ آہٹ پہ انہوں نے مڑ کے بڑی بڑی گھبرائی آنکھوں سے اسے گھورا۔ پھر انگلیوں کو زور سے جھٹکا اور جلدی جلدی چل کر دوسری گلی میں مڑ گئے۔ اور وہ پلٹ سکتا تھا نہ بڑھ سکتا تھا۔ اونچی دیواروں والی اس گلی کی دونوں طرفیں اسے بند لگ رہی تھیں جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گر پڑا ہو۔ اس نے رفیا اور رمنے اور ردینا کو زور سے آواز دینی چاہی مگر آواز گلے میں پھنس گئی اور سینے پہ بوجھ سا رکھا ہوا...... خیال کا سلسلہ بس آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ سڑک اسی طرح خاموش تھی اور کہرملی چاندنی پوری سڑک پہ پھیلی ہوئی تھی۔ قدم اس کے تیزی سے اٹھ رہے تھے اور دل کچھ کچھ دھڑکتا ہوا۔ جاڑا اسے اس وقت بالکل نہیں لگ رہا تھا، بلکہ گرم کپڑے بدن پہ بوجھ بن گئے تھے۔ سر اور کانوں پہ لپٹا ہوا مفلر اس نے ڈھیلا کیا اور کوٹ کے دونوں بٹن کھول دیئے۔ اس کے تیز تیز اٹھے ہوئے قدموں کی چاپ اتنی اونچی تھی کہ وہ خود ہی اس سے ڈر گیا۔ وہ آہستہ چلنے لگا ہم رکاب پرچھائیں بھی آہستہ چلنے لگی۔ اس نے اپنی چاپ اور پرچھائیں سے قطع نظر کر کے سڑک کے نزدیک دور دور کا جائزہ لیا۔ سڑک خالی تھی۔ بس کنارے کنارے دودھیا کھمبے چاندنی میں نہائے ہوئے بینائی سے محروم ایک دوسرے سے بے تعلق کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے بے تعلق نابینا کھمبوں کو دیکھ کر اسے اچنبھا ہونے لگا کہ جب روشن تھے تو سڑک کے اس کنارے سے اس کنارے تک ایک رشتے میں کیسے پیوست نظر آتے تھے۔ تو روشنی رشتہ ہے؟ یا رشتوں سے روشنی پیدا ہوتی ہے؟ یعنی جسم اور پرچھائیں کا رشتہ روشنی نے پیدا کیا ہے یا روشنی کو جسم اور پرچھائیں کے رشتہ نے پیدا کیا ہے؟ اور قدموں اور چاپ کا رشتہ؟ چاپ کے قدموں کی پرچھائیں ہے یا قدم؟ ــ وہ گڑبڑا گیا جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے کتنے سر پیر ہوتے ہیں۔ بے سر پیر کے خیال سے بچنے کے لئے آدمی کو واقعی اپنے گرد حصار کھینچنا چاہئے ورنہ ہزار پیروں والے وسوسے اور روایے اس کے گرد حصار کھینچ لیں گے۔ وہ جلدی سے مڑ کر بازار والی سڑک پہ ہو لیا۔

بازار جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جاگتا چھوڑ گیا تھا اب سویا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا کہ ایک جگ کے بعد وہ اس بازار میں پلٹا ہے۔ بجلیاں ٹھنڈی تھیں اور خالی سڑک نصف نصف چاندنی اور سائے میں تقسیم تھی کہ ایک طرف کی بند دوکانیں اجالے میں اور دوسری طرف کی بند دوکانیں اندھیرے میں تھیں۔ اس نے چاندنی چھوڑ کر سائے میں چلنا شروع کر دیا گویا کسی سے چھپ کر چلنا چاہتا ہے۔ مگر چند قدم چلا تھا کہ ایک تھڑے کے نیچے سے تیزی کے ساتھ ایک سیاہ سی شے نکلی۔ وہ گھگھیا کے پیچھے ہٹا۔ پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ تو کتا تھا جو اسے دیکھ کر سڑک پہ آ کھڑا ہوا تھا اور بھونکنے لگا تھا۔ ویسے سنبھل جانے کے باوجود دل اس کا زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کچھ کچھ کانپنے لگی تھیں اور کتا تھا کہ بھونکے جا رہا تھا۔ لحاف میں لپٹی ہوئی ایک آواز نے اسے دھتکارا اور وہ بھونکنا بند کر کے آہستہ آہستہ غر غر کرنے لگا اور اسے اس وقت تک گھورتا رہا جب تک وہ دکان کے سامنے سے گذر نہیں گیا۔ اور وہ گذر بھی اس چال سے جیسے کتے پہ ثابت کر رہا ہو کہ وہ اس سے بالکل نہیں ڈرا ہے۔ ہاں دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے اس نے ایک

اچٹتی سی نظر دوکان کی طرف ضرور ڈالی۔ وہاں دوکان کے مقفل دروازے سے متصل سائبان کے نیچے ایک چارپائی بچھی تھی جس پر میلے لحاف میں لپٹا ہوا کوئی پڑا تھا۔ یہ کون شخص ہے جو اس جاڑے میں باہر سوتا ہے؟ دوکان والا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ مگر دوکان والا ہے تو اندر بھی سو سکتا تھا۔ کون شخص ہو سکتا ہے؟ مارو گولی، ہوگا کوئی۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں قیاس کے اس سلسلہ کو رد کر دیا۔ اسی فیصلہ کن انداز میں اس کے قدم بھی اٹھنے لگے۔ مگر چلتے چلتے اسے شک گذرا کہ کوئی پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اور اس شک کے ساتھ دل کی حرکت رکنے لگی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ وہی کتا ہوگا۔ کبھی کبھی کتا بھی تو اس احتیاط سے چلتا ہے کہ اس کی آہٹ آدمی کے قدموں کی آہٹ بن جاتی ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر پھر رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا اپنے خوف کا اعلان کرنا ہے۔ پھر وہ بہت تنگ کرے گا۔ اور اسے یکایک گمان ہوا کہ کیا خبر ہے وہی شخص ہو جو لحاف میں منہ دیئے پڑا تھا۔ ارے نہیں۔ اسے باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ اس جاڑے میں بستر سے اٹھ کر کسی کا پیچھا کرے گا۔ آخر کیوں؟ اور وہ اندھیرے کی سمت سے ہٹ کر چاندنی والی سمت میں آ گیا۔ چلتے چلتے ایک مرتبہ کنکھیوں سے اس نے اس لحاف والی چارپائی کو دیکھنے کی بھی کوشش کی۔ مگر وہ اب اتنا آگے نکل آیا تھا کہ اسے وہ چارپائی نظر نہ آ سکی۔

میر صاحب کی مقفل دوکان کے سامنے سے نکلتے ہوئے اسے پھر اپنے والد یاد آ گئے۔ قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ پریشان چہرہ اور وہ تلاوت کرتی ہوئی اکیلی آواز کہ رات کی خاموشی میں سارے گھر میں گونجتی رہتی۔ وہ آواز آوازوں کے جہان سے اب کتنی دور ہو گئی تھی اور وہ اپنا گھر باوجود بولنے چالنے کے کتنا خاموش ہو گیا تھا...... اس نے میر صاحب کی مقفل دوکان سے نظر ہٹا کر سامنے سڑک کو دیکھا۔ دور سڑک کے نکڑ پہ اندھی اندھی روشنی نظر آئی۔ تو مولوی ٹنٹے کی دوکان اب تک کھلی ہے؟ اداس مشاہدے کے ساتھ اسے اس بازار کے پچھلے دن یاد آ گئے جب رات گئے تک دوکانیں کھلی رہتی تھیں اور میر صاحب کی دوکان پہ چوکڑی جمی رہتی تھی۔ اور اب لے دے کے نعیم اور خود وہ ان کے سامعین میں ہیں۔ اس خیال سے اس کی طبیعت اداس اداس ہو گئی۔ رہ رہ کر اسے خیال آ رہا تھا کہ اس بازار کو کیا ہو گیا۔ وہ رجگے کیا ہوئے؟ وہ شب بیدار دوکاندار دوکانیں بڑھا کر کس کھوہ میں چلے گئے؟ اب صرف مولوی ٹنٹا.. .... مگر مولوی ٹنٹا تو........ اسے وہ داستان یاد آ رہی کہ مولوی ٹنٹا کی دوکان صبح تک کھلی رہتی ہے کیونکہ آدھی رات کے بعد جن اس کی دوکان پہ پان اور عطر اور اگربتیاں خریدنے آتے ہیں۔ اسے یہ داستان اس وقت بے سر و پا نظر آ رہی تھی۔ ایک بھلے مانس کو خواہ مخواہ باؤلا بنانا۔ اس داستان کو رد کرتے ہوئے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور جلدی جلدی چل کر مولوی ٹنٹا کی دوکان پہ جا کر دم لیا۔ خمیدہ کمر، کالی رنگت، گال پچکے ہوئے، بڑا سا دہانہ، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے، کلے میں تمباکو والا پان رکھا ہوا جس کے باعث اکثر وہ انگلیوں کے اشاروں اور آنکھوں کی نقل و حرکت کے ذریعہ سوال و جواب کرتا۔ اس کی بڑی بڑی گھورتی آنکھوں کے سے وہ ڈر سا گیا اور بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں دوڑا، کہیں مولوی ٹنٹا خود ہی تو...... ارے نہیں، کیا فضول بات ہے۔ یوں اپنا ذہنی اطمینان کر لینے کے بعد بھی وہ اس کی سوالیہ نظروں سے سٹپٹایا ہوا رہا۔ سگریٹ تو ابھی ہے، اس نے جیب ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ پان، ہاں پان کھا لینا چاہیئے۔ "پان" اس نے کہا۔ مولوی ٹنٹا کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اپنے کام پہ لگ گئیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی۔ سلگتی رسی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی نظر مولوی ٹنٹا کے جلدی جلدی حرکت کرتے ہوئے سیدھے ہاتھ پہ جا پڑی جس کی تین انگلیاں گم تھیں، انگشتِ شہادت تین چوتھائی، بس انگوٹھا سالم تھا۔ اسے یاد آیا کہ مولوی ٹنٹا جوانی میں شب برات پر پٹاخے بنایا کرتا تھا۔ گولا کسی تے کنکر نے موسل سے رگڑ کھائی اور گولا اس طرح پھٹا کہ سوا تین انگلیاں اس کی اپنے ساتھ لے گیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے سلگتی رسی انگلیوں سے چھوڑ دی جو تھوڑی دیر ہلتی رہی، پھر ساکت ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا کش لیا اور دھواں اڑاتے ہوئے پان کے لئے مولوی ٹنٹا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پان منہ میں رکھنے کے بعد اسے اپنی انگلیاں گیلی گیلی لگیں۔ اس نے روشنی کے قریب لا کر اپنی انگلیوں پر نظر کی۔ شاید کتھا بہت پتلا تھا کہ انگلیاں اس کی سب کی گیلی ہو گئی تھیں۔ کتھئی دھبوں والی پونچھن سے اس نے انگلیاں صاف کیں، پھر سگریٹ کو انگلیوں میں داب کر ایک لمبا کش لیا اور نعیم والی گہری گلی میں اتر گیا۔

اگر انگلیاں اڑ جانے کی وجہ سے اپنا مولوی، مولوی ٹنٹا ہو گیا تو جس شہزادے نے رات کے پھندے میں آنے والی پھول شہزادی کو پکڑنے کی غرض سے اپنی انگلی تراش لی تھی اسے شہزادہ ٹنٹا کیوں نہ کہا جائے؟ اور یہ پرانے زمانے کے شہزادے بھی عجیب تھے، شب بیداری کا ایک ہی طریقہ جانتے تھے کہ انگلی قلم کی اور زخم پر پسی ہوئی مرچیں چھڑک لیں۔ کیا انگلی میں زخم پیدا کئے بغیر شب بیداری ممکن نہیں؟ اور کیا پریاں اور جن شب بیداروں

ہی کو نظر آتے ہیں؟ اور کیا مولوی ٹنڈا کی دوکان پر سچ مچ جن عطار ہے۔ پان اور اگر بتیاں لینے آتے ہیں؟ اور کیا بندے علی کی انگلیوں میں جو واقعی ...... اندر سوئی ایسے پیروں والے رینگتے ہوئے سوال ایک بے سر پیر کی، بھرتی ہوئی تصویر میں تحلیل ہو گئے۔ چندی حلوائی ایک سرخ منھ والے زرد رنگ سانپ کو دم سے پکڑے دوکان سے باہر نکلا۔ دھڑ کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے اس لمبے ہاتھ کی انگلیوں نے دم کو جکڑ رکھا تھا اور اسی کی مثال لمبے سانپ کے سرخ منھ سے سوئی زبان چنگاری کی طرح بار بار نکلتی تھی۔ چندی حلوائی اس شان سے پرلے منڈیر تک گیا اور وہاں اندھے کنوئیں کی من پہ کھڑے ہو کر اس نے اپنا تانا ہوا ہاتھ کنوئیں کے بیچوں بیچ ٹھہرایا اور انگلیاں ڈھیلی کر دیں۔ وہ زرد دم انگلیوں سے پھسل کر کنوئیں کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئی ...... اس اوجھل ہوتی تصویر کے ساتھ اسے ایک پھریری آئی اور ساتھ ہی وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے ننھے کی دیکھا دیکھی چوہے دان میں مقید چوہے کی تاروں سے باہر نکلی لمبی دم پکڑ لی تھی مگر فوراً گھگیا کر چھوڑ دی اور پھر صابون سے خوب مل مل کے ہاتھ دھوئے مگر کئی دن تک اس کی انگلیاں اس گلگلے سے احساس سے اس کی طبیعت میں بدمزگی پیدا کرتی رہیں۔ اور اس یاد کے ساتھ گجگجاہٹ کی ایک کیفیت پوروں سے شروع ہوئی اور پورے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے سر کو آہستہ سے جھٹکا۔ وہ ان رینگتی یادوں اور سرسراتے وسوسوں کے جال سے نکل کر اطمینان سے چلنا چاہتا تھا۔ گردن پہ پڑا ہوا مفلر اس نے سر اور کانوں پر اچھی طرح لپیٹا۔ اسے اب سردی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹھنڈی ہوتی انگلیوں کی مٹھیاں باندھیں اور جیبوں میں ٹھونس لیں۔ پھر سوچنے لگا کہ مفلر تو موجود ہے ہی۔ کانوں کو ہوا نہ لگے تو آدمی سردی کی سو بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ بس دستانے اور خرید لینے چاہئیں کہ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بھی چڑھتی ہے۔

نعیم کا گھر اب قریب تھا اور جاڑوں کے لئے جو چیزیں اسے مطلوب تھیں اس کے منصوبوں نے اس کی توجہ کو بہت حد تک جذب کر لیا تھا مگر کوئی گمنام ہزار پا خیال شاید ابھی تک اس کے ذہن کے کسی عقبی گوشے میں چپکے چپکے رینگ رہا تھا کہ طبیعت اس کی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اوبڑ کھوبڑ خیالوں اور یادوں نے اسے بہت بے مزہ کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے ہزار پیر ہوتے ہیں۔ جو کبھی کانوں کی راہ اور کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے ذریعہ کبھی انگلیوں کی پوروں کے اندھے راستے رینگتا رینگتا دماغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے طے کیا کہ حواس لعنت ہیں، وہ کون حکیم تھا جس نے اہلِ نظر کو کچھوے کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی تھی؟ کچھوا جس کی پشت حصار ہے کہ اس کی بدولت وہ درد و الم سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی پشت حصار ہے کہ حصار کا بار اس کی پشت پر ہے؟ اور اہلِ نظر کچھوے ٹھہرے یا کچھوا اہلِ نظر ہے؟ اور آدمی؟ آدمی تو ظالم و جاہل ہوا کہ بے منتِ حصار جینا چاہتا ہے؟ — سوئی ایسے پیروں والے سوال اس کے ذہن میں پھر رینگنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے قدم تیز کئے اور نعیم کے بند دروازے پہ رکتے ہوئے زور سے دستک دی۔

نعیم نے دروازہ کھولا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا "کون؟ ارے تم؟"

"ہاں یار نیند نہیں آ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے خفقان ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ چلو نعیم ہی کی طرف چلے چلو۔"

"یار تمہارے دماغ میں بھی کیڑا ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک پڑا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا۔" نعیم کہنے لگا "جب میں نے کہا تھا تو نہیں مانے۔ اور اب جب میں سو گیا ہوں تو آ کر آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آؤ، اندر چلو۔"

نعیم کے پیچھے پیچھے وہ اندر گیا۔

"کپڑے بدلو، اور بس سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے، مفلر اتار کر الگ رکھا پھر کوٹ اتارتے اتارتے رکا۔ عین بجلی کے نیچے جا کر کھوئی کھوئی نظروں سے وہ اپنی انگلیاں دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" نعیم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ انگلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا "مولوی ٹنڈے نے آج کتھا اتنا پتلا کر رکھا تھا کہ میرا سارا ہاتھ کتھے سے خراب ہو گیا۔" ایک گجگجاہٹ کے ساتھ جیسے انگلیاں اس کی سچ مچ کتھے میں سن گئی ہوں اس نے انگلیاں مٹھی کی صورت میں سمیٹیں اور جیب میں ہاتھ ٹھونس لئے۔ اسے وہ فقرہ اڑتا اڑتا سا پھر یاد آ چلا تھا: "تمہیں اپنے والد یاد ہیں۔ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔"

اور سورج نکل آیا

صادق حسین

دفعتاً اکبر کا مضبوط ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور پھر دوسرے لمحے جیسے ایک بھاری سِل پارو کے سانولے منہ پر دھائیں دھائیں برس پڑی ہو۔ پارو کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ سر چکرا گیا۔ نرم و نازک رخسار پر پانچ انگلیوں کے نشان تیزی سے ابھرنے لگے۔ اچانک اور غیر متوقع چوٹ کھا کر پارو کو درد کا احساس کم ہوا مگر حیرت زیادہ معلوم ہوئی۔ ضرب چہرہ پر لگی تھی مگر لہو کی دھاریں دل سے پھوٹ نکلیں۔ وہ پتھر کا مجسمہ بنی چوکی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سرخ ساڑھی میں آگ لگ گئی ہو۔ چوڑے سنہرے حاشیہ والی شوخ سرخ رنگ کی ساڑھی جو اکبر چٹگاؤں سے خرید کر لایا تھا۔ وہی ساڑھی جو پارو نے چار ماہ پہلے شبِ عروسی پر پہنی تھی اور اکبر نے اس کا گھونگٹ اٹھا کر محبت بھری آواز میں کہا تھا "سبحان اللہ آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے۔" وہ بات، وہ الفاظ، وہ جیتی جاگتی بھرپور زندگی کی پکار سن کر پارو کو ایک عجیب و غریب احساس ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس کی پلکیں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس رات اکبر نے من موہ لینے والی باتیں کی تھیں۔ اور ان باتوں میں کھو کر پارو اپنا گاؤں، اپنا میکا، وہاں کے کھیت، پگڈنڈیاں، تالاب، او۔۔ وہاں کی نہ بھولنے والی ان گنت یادوں کو سچ مچ بھول سی گئی تھی۔

اس رات کے چراغوں سے چاروں طرف اجالا ہی اجالا ہو گیا تھا۔ پھر اکبر نے پہلی تین بیویوں کے عیوب، خامیاں اور کرتوت انگلیوں پر گن گن کر شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ تمام قصے سن کر پارو کو تسلی ہو گئی تھی کہ جو اڑتی اڑتی افواہیں اس نے سن رکھی تھیں وہ سب کی سب بے بنیاد ہیں۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے شوہر سے خواہ مخواہ جلتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اکبر دو سو ایکڑ زرخیز زمین اور پانچ سو ناریل اور سپاری کے پیڑوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس عمدہ بیلوں کی دس جوڑیاں تھیں اور اس کے پانچ تالابوں میں "روئی" مچھلی کی افراط تھی۔

وہ رات پلک جھپکتے بیت گئی تھی۔ پھر آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی کرنوں میں ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ ایسی زندگی جس کے وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ خواب جن میں ساون کے گیت تھے اور بوکل کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک لیکن دوسرے ہی دن خوابوں کی اس دنیا کو ایک خوفناک دھچکا سا لگا جب اس کی ایک سوکن نے نہایت رازدارانہ لہجہ میں اس سے کہا تھا "سبحان اللہ! آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے" یہ سن کر پارو اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے رک گئی تھی۔ اس کے کانوں کی لویں گرم انگارے بن گئی تھیں۔ خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے سوچا تھا "بدتمیز کہیں کی۔ رات کو کن سوئیاں لیتی رہی ہے" اور پھر اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنی سوکن کے منہ پر طمانچہ مار دے لیکن جب باقی دو سوکنوں سے بات چیت ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ یہ فقرہ تو اکبر کی پہلی تینوں بیویوں نے بھی شب عروسی پر سنا تھا۔ جذبات کی اسی شدت کے ساتھ، عہد و پیماں کی اسی گمبھیرتا کے بیچ۔

آج شادی کے چار ماہ بعد پارو طمانچے کھا کر چوکی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اکبر پلنگ پر نیم دراز ہو کر سگرٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تاڑی کی سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ چارخانہ دار لنگی اور سفید بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دونالی بندوق دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اکبر کے بھاری بھرکم جثے کا سایہ دیوار پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

"کھٹ! کھٹ!!" کسی نے صدر دروازے پر دستک دی۔

اکبر نے اٹھ کر کھڑاویں پہنیں۔ دروازہ کھولا۔ اور پھر ڈیوڑھی سے گذر کر صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"کون۔؟" اکبر نے پوچھا۔

"غنی" جواب ملا

اکبر نے دروازہ کھولا۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھر کا راستہ سنسان پڑا تھا غنی اور کبیر ہاتھ میں قلم لئے سامنے کھڑے تھے۔ غنی نے اکبر کے کان میں کچھ کہا اور پھر غنی اور کبیر دونوں آناً فاناً اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اکبر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ کھلے آنگن میں بوکل، ناریل اور سپاری کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ اس کی تیسری بیوی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہاں سے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندھیرے میں جھانک رہی تھیں۔ اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے میں مصلّے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کے کمرے میں تاریکی تھی اور وہاں سے خراٹوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اکبر نے جھٹ پٹ جوتا پہنا، کمر میں بھورے چمڑے کی چوڑی پیٹی باندھی، پیٹی کا دایاں بٹوا کھول کر سو سو کے نوٹوں کا جائزہ لیا۔ بائیں بٹوے میں کارتوس ٹھونس لئے اور پھر ٹارچ پیٹی میں اُڑس، دونالی بندوق ہاتھ میں لے، گھر سے باہر نکلا۔ اور چند لمحوں میں پیڑوں کے جھنڈ تلے جا پہنچا جہاں غنی اور کبیر قلم ہاتھ میں لئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی نے بات نہ کی۔ مشینی طور پر اکبر آگے آگے چل پڑا۔ غنی اور کبیر اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ عام راہوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر اکبر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریا کے کنارے جا پہنچا اور چپ چاپ ایک "شمپان" (کشتی) میں بیٹھ گیا۔ غنی اور کبیر نے شمپان کو گہرے پانی کی طرف دھکیلا اور پھر وہ دونوں نہایت پھرتی سے اچک کر شمپان کے دونوں سروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شمپان پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیزی سے بہنے لگا۔ چپوؤں کی شپ شپ رات کے سناٹے میں ہلچل مچانے لگی۔ اکبر نے اپنا دایاں ہاتھ پانی میں ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بھیگی ہوئی ہتھیلی پھیلا کر اپنے بائیں شانے پر آہستہ آہستہ پھیری۔ سخت اور کھردری انگلیاں زخم کے اس ترچھے نشان کو سہلانے لگیں جو اس کے مضبوط شانے کو عبور کر کے گردن کی طرف نکل گیا تھا۔ یوں تو اکبر کے بدن پر زخموں کے نشان ایک درجن کے لگ بھگ تھے مگر یہ زخم سب سے بڑا تھا جو اس نے زندگی کی جدوجہد کے ابتدائی دنوں میں کھایا تھا۔ اس وقت وہ صرف وار کرنا جانتا تھا وار سہنے اور روکنے کا ریاض نہ تھا۔ وہ اپنے دھندے کو زندگی کی جدوجہد کا نام دے کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا کرتا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ پہلے پہل دھان کی بوریاں شمپان میں لاد کر راتوں رات ایک تحصیل سے دوسری تحصیل میں لے گیا تھا تو مارے خوف کے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ خوف کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوا کرتی تھی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا دل میں کھٹکنے والا کانٹا خود بخود نکل گیا۔ اور اب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ دولت کی گرمی زندگی کو کتنی توانائی بخش سکتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اپنے گاؤں میں لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوان ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہیں ننھی ننھی جانیں بلک بلک کر ہمیشہ کے لئے چپ ہو رہی ہیں۔ خوبصورت چہروں پر موت کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ کہیں سے بانسری کی مدھر لے سنائی نہیں دیتی۔ دریا کی لہریں بھٹیالی گیتوں کی تانوں کو ترس گئی ہیں بھوک کی آگ نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنستا۔ اور پھر اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ وہ ماں جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جس نے بڑے دکھ اٹھا کر اسے پالا تھا اور جب وہ سیانا ہوا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو قحط کی بھٹی میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ منظر اس کی آنکھوں میں اکثر پھر جاتا تھا۔ جب تھوڑا سا باسی بھات اس کی ماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اسے دیا تھا اور وہ ایک بھوکے کتے کی طرح دانہ دانہ کھا کر ادھ موا ہو کر زمین پر گر پڑا تھا اور اس کی ماں نے "بھات! بھات!!" پکار پکار کر جان دے دی تھی وہ پکار اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہی پکار جس کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت دکھ پائے تھے۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی میں سکھ کی گھڑی میسر نہ آئی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "تیرا باپ ایک جلاد تھا۔ وہ مجھے بہت پیٹا کرتا تھا۔ میں اس کی چوتھی بیوی تھی۔ باقی تینوں کا تو مجھ سے بھی برا حال تھا۔"

"مالک!" غنی نے خاموشی کو توڑا۔

چپو فوراً رک گئے۔ کہیں دور سے انجن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ادھر لے چلو" اکبر نے سامنے دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کیا جہاں خمیدہ درختوں نے پانی کے کچھ حصہ کو چھپا رکھا تھا۔

چپو تیزی سے چلنے لگے۔ چند لمحوں میں شمپان ٹہنیوں اور پتوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اور انجن کی آواز قریب سے آنے لگی۔

اکبر نے بندوق سنبھالی۔

"مالک!" غنی آہستہ سے بولا "معلوم ہوتا ہے آج کسی نے مخبری کی ہے۔ دھان پکڑا گیا ہوگا۔"

"ہمارا دھان کوئی نہیں پکڑ سکتا" اکبر نے دونالی بندوق اور شبوے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

موٹر لانچ شور مچاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ پانی کی لہریں دوڑتی ہوئی دونوں کناروں سے ٹکرائیں شمپان نے دو ایک ہچکولے کھائے۔ اکبر نے لبلبی سے ہاتھ ہٹالئے۔ موٹر لانچ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو شمپان درختوں کی اوٹ سے نکل کر پھر لہروں کے ساتھ بہنے لگا۔ یکایک سمتِ مخالف سے کسی نے ٹارچ جلائی۔ چپو پھر تھم گئے۔ عین منجدھار میں شمپان رک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شمپان کچھ فاصلہ پر نظر آیا۔ وہاں سے کسی نے تین مرتبہ ٹارچ روشن کی۔ اکبر نے جواباً اوپر تلے دو مرتبہ ٹارچ جلائی۔ دوسرا شمپان قریب آگیا۔

"سب ٹھیک ہے مالک" دوسرے شمپان سے ایک شخص بولا۔ اور پھر دونوں شمپان گھوم کر بہاؤ کے خلاف چلنے لگے۔ شپ۔ شپ۔ شپ! شپ!! چپو تھامے ہوئے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ گردنوں کی رگیں تن گئیں۔ ہر جھٹکے کے ساتھ جھکولا اور ہر جھکولے کے ساتھ شمپان کی مخصوص آواز تاریک رات میں پراسرار معلوم ہونے لگی۔ اکبر نے پانی میں ہاتھ ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا اور اس دفعہ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل میں تین خیال آئے۔ پہلا خیال اس بھکاری سے وابستہ تھا جس نے کل اس کے دروازے پر صدا دی تھی۔ ہاتھ پھیلا کر چاول کی بھیک مانگی تھی اور اکبر نے بھیک دینے کے بجائے بھکاری کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ بھکاری نے ایک آہ بھری تھی اور پھر سر جھکا کر، چپ سادھے، کچے راستہ پر آنسو بہاتا کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اور شام کو اکبر نے اس بھکاری کی لاش ایک درخت کے نیچے پڑی ہوئی دیکھی تھی۔ دوسرا خیال اس کی چوتھی بیوی پارو سے متعلق تھا۔ اس نے پارو کو نہایت معمولی سی بات پر چند گھنٹے پہلے چانٹے مارے تھے۔ اس نے بھی ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔ اکبر کے دل میں ایک نامعلوم سا درد ہونے لگا۔ عین اسی لمحہ اکبر کی ماں کا شکن آلود چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس نے بھی ایک لمبی آہ کھینچی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اکبر کے دل میں ایک جوالا پھوٹ پڑی۔ اس کا بدن جلنے لگا۔ اس نے پانی میں سے ہاتھ نکال کر اپنے چہرے پر پھیرا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تراوت پہنچانے لگے۔

★

گھر پہنچ کر اکبر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر کسی نے پہلے لالٹین روشن کی اور پھر قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آنے لگی۔

"کون ہا؟" کسی عورت کی آواز تھی۔

"دروازہ کھولو"

کسی نے دروازہ کھول دیا۔

اکبر نے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھائی۔ اس کی تیسری بیوی لالٹین ہاتھ میں لئے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چھریرا بدن، چہرے پر اداس اداس زردی، سر کے چمکیلے اور سیاہ بالوں کا بھاری جوڑا، آنکھوں میں ساون کی بدلی، وہ یوں نظر آ رہی تھی جیسے کوئی تصویر لالٹین ہاتھ میں تھامے دیوار کے چوکھٹے میں کھڑی ہو۔ یکایک کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اکبر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پارو چوکی پر سو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی اس کے بائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی چمپا کی کلیوں جیسی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ اس کے سر کے لانبے بال چوکی سے نیچے لٹک کر فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اکبر نے پہلے جوتا اتارا پھر پیٹی کھول کر تکئے کے نیچے رکھی، بندوق پلنگ کی پٹی کے متوازی توشک کے نیچے جمادی اور پھر لالٹین بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا بدن تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار سر کو جھٹکا کر۔ انگلیاں چٹخائیں اور پھر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر ہر خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنگن سے رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا کے جھونکے تھکے ہوئے اعضاء کو فرحت پہنچانے لگے۔ آہستہ آہستہ اکبر کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو کر آپس میں مل گئیں۔

★

"چور!" — "چور!!"

"کون۔؟" اکبر نے لپک کر لالٹین روشن کی۔ پارو چوکی پر ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔

"چور۔ چور!!" آنگن سے پھر آوازیں آئیں۔

اکبر نے بندوق اور ٹارچ سنبھال کر دروازہ کھولا۔ اور پھر کود کر آنگن میں چلا گیا۔

اس کی پہلی بیوی بند کمرے سے شور مچا رہی تھی۔ دوسری اور تیسری بیوی کے کمروں میں روشنی تھی۔

"کہاں ہے چور۔۔؟" اکبر گرج کر بولا۔

"میں نے دروازے کی جھری میں سے کسی کو باورچی خانے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔" اکبر کی پہلی بیوی اندر سے بولی

"برتن گرنے کی آواز آئی تھی" اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کوئی دروازہ توڑ رہا تھا" اس کی تیسری بیوی نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

باورچی خانہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اکبر نے ٹارچ کی روشنی باورچی خانہ کے اندر پھینکی۔ ایک شخص کونے میں جھکا ہوا بیٹھا نظر آیا۔ اکبر نے بندوق سیدی کرلی۔ مگر دوسرے لمحہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے پھر ایک بار ٹارچ کی روشنی میں مجرم کو دیکھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ باورچی خانہ کے ایک کونے میں دیگچی پر جھکا ہوا لپ لپ بھات کھا رہا تھا۔

"ذلیل کتے" اکبر نے للکار کر کہا۔

چور کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ بے تحاشہ کھائے جا رہا تھا۔ اکبر کو حیرت ہونے لگی کہ وہ نحیف و نزار شخص دیوار پھاند کر کیسے اندر آیا۔ اس نے باورچی خانہ کا دروازہ کیسے توڑا۔ ان ہڈیوں میں اتنی ہمت، اتنی دلیری، اتنی جرأت کہاں سے آئی۔ اکبر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پارو لالٹین ہاتھ میں لئے آپہنچی اور اس کی دیکھا دیکھی اس کی تینوں سوکنیں بھی باہر نکل آئیں۔ اکبر بائیں ہاتھ میں روشن ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں بندوق تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ چور نے کوئی حرکت نہ کی۔ اکبر باورچی خانے کی دہلیز پر پہنچ کر رک گیا۔ چور نے بھات کھاتے کھاتے ایک مرتبہ اکبر کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح ہرن زخمی ہو کر آخری بار شکاری کی طرف دیکھتا ہے۔ چور کی آنکھیں دو گڑھوں کے اندر سے صرف ایک لمحے کے لئے اکبر کی طرف دیکھ کر پھر بھات پر جم گئیں۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر بھات منہ میں ڈالے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینہ میں شرابور تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، الجھے ہوئے سر کے بال جسم پر صرف ایک پھٹی پرانی لنگی، پسلیوں کی ایک ایک ہڈی نمایاں، چور مجسم بھوک بن کر، بے خوف و خطر اکبر کے باسی بھات کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

"بندوق سیدھی کیوں نہیں کرتے" اکبر کی دوسری بیوی بولی۔

"بھات! بھات!!" ماضی کے تاریک غار سے ایک خوفناک آواز آئی۔ ایک بھوکی بیوہ کی آواز۔ وہ بیوہ جس نے تھوڑا سا باسی بھات کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بچے کو کھلا کر اپنی جان دیدی تھی۔ اس آواز کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔

"ذلیل کتے" اکبر گرج کر بولا۔ اور پھر بندوق کا سرا چور کے سینے کے قریب چلا گیا۔

چور نے بھات کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا۔ اس نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر ٹانگیں پسار لیں۔ اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں نے اکبر کی طرف دیکھ کر ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کرلی۔ اور سوالیہ نشان تمام گاؤں پر پھیلتا ہوا ایک تحصیل سے دوسری تحصیل اور دوسری تحصیل سے دیس کے گوشہ گوشہ تک پھیل گیا۔

"گولی کیوں نہیں چلاتے۔ صرف عورتوں پر ہاتھ اٹھانا جانتے ہو" اکبر کی پہلی بیوی تنک کر بولی۔

یکایک اکبر کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ کھنچی ہوئی رگیں اپنی اصلی حالت پر آگئیں۔ جھنجھلاہٹ بے چارگی۔ اور پھر انجانے جذبات کا ایک ہجوم اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگا۔ چاروں بیویاں اکبر کی پلکوں پر پہلی مرتبہ تھرتھراتی ہوئی شبنم دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

★

ڈوب ڈوب کے اُبھری ناؤ

انور مسعود

اس کہانی کو کباب مچھلی شہری نے اپنے ماہنامے میں چھاپنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ کباب مچھلی شہری کا ماہنامہ "گھاس بندر" جو انہوں نے "مست قلندر" کے مقابلے میں اُس کی کامیابی سے کباب ہو کر نکالا تھا، اور جس کی تصدیق شدہ اشاعت ملک کے تمام ماہناموں کی مجموعی اشاعت سے زیادہ تھی، اس ملک کا سب سے بڑا رسالہ تھا۔ اس لئے جب "گھاس بندر" کے ایڈیٹر نے میری کہانی کو اشاعت کے قابل قرار دے دیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اُس دن میں "گھاس بندر" کے دفتر میں ایک ٹوٹی ہوئی بید والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور میرے سامنے ایک پچکے ہوئے گدے والے صوفے پر کباب مچھلی شہری تشریف فرما تھے۔ ریڈیو پر خبریں نشر ہو رہی تھیں اور وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کا افسانہ مجھے بہت پسند ہے۔ آپ نے ہماری سوسائٹی کی خرابیاں بڑی چابکدستی سے اُجاگر کی ہیں۔ میرے رسالے نے ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیا ہے۔ میں آپ کے افسانے کو رسالے میں بڑی امتیازی جگہ دوں گا۔"

میں خوش ہو کر بولا: "مجھے آپ کے رسالے سے ہمیشہ عقیدت رہی ہے۔ خصوصاً مجھے اس کا نام بہت پسند ہے۔"

ریڈیو خبریں نشر کر رہا تھا۔

کباب مچھلی شہری نے ریڈیو کی آواز سے زیادہ بلند آواز میں میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا: "مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ مجھے اپنے رسالے کی ہر بات پسند ہے لیکن اس کا نام پسند نہیں۔ کسی بلند پایہ علمی اور ادبی رسالے کا نام "گھاس بندر" بڑا غیر موزوں نام ہے۔ اس نام کو سُن کر گھوڑوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسان کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں لیکن میں اپنے رسالے کو یہ نام دینے پر مجبور تھا۔ پچھلے دنوں میں نے بڑے بڑے فلادری ناموں والے اتنے علمی اور ادبی رسالوں کو موت کے گھاٹ اترتے اور "مست قلندر" کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقیوں کے اتنے مراحل پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا کہ آخر مجھے "مست قلندر" کے ایڈیٹر کے پاس اس کی کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لئے جانا پڑا۔ اس نے مجھے بتایا: وہ ایک دن بے کاری اور بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کے ارادے سے راوی کے پُل پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے گیسوں کو زور زور سے پکڑ کے ہلایا۔ دیکھا کہ ایک مست قلندر، لمبی لمبی جٹوں والا، میلے کچیلے جسم والا، ننگ دھڑنگ اُس کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے اُسے سلگتی ہوئی ڈراؤنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا: او اُلٹے بالوں والے!..... رسالہ نکال اور مالا مال ہو جا۔ چنانچہ اس نے رسالہ نکالا۔ رسالے کا نام "مست قلندر" رکھا اور مالا مال ہو گیا۔

مجھے بھی کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے ہیں۔ میں گھاس بندر کے سامنے "گھاس بندر ریسٹورنٹ" کی سستی چائے جو کبھی کبھی مری ہوئی مکھی کی وجہ سے مفت بھی مل جاتی تھی، پینے اور گھاس بندر کا نظارہ کرنے کے لئے اکثر وہاں جاتا تھا۔ گھاس بندر کے بالکل نزدیک نیٹی جیٹی ہے۔ جہاں خودکشی کرنے والوں کا مندر ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیٹی جیٹی، گھاس بندر کے اس قدر نزدیک ہے۔ میں انسانوں سے تنگ آ چکا تھا۔ میرا خیال تھا گھاس بندر پر ہری ہری گھاس ہو گی، گدھے ہوں گے، گھوڑے ہوں گے، گائیں ہوں گی۔ دل بہلے گا لیکن گھاس بندر پر گھاس کی ایک پتی بھی نہ تھی! اس کی بجائے وہاں مچھیروں کے جالوں میں سمندر سے نکلی ہوئی مچھلیاں تڑپتی دیکھیں۔ تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر مچھلی شہر یاد آ گیا۔ اس کے بعد جب اپنے وطن کی یاد ستاتی، میں گھاس بندر کے سامنے گھاس بندر ریسٹورنٹ میں آ بیٹھتا۔ پانی کے بغیر تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتا۔ میں بھی تو ایسی ہی بے آب تھا، میں بھی تو ایک مُردہ مچھلی تھا، بلکہ میں تو مچھلی کا کباب تھا۔ بے روزگار تھا، بھوکا تھا، اور سامنے نیٹی جیٹی تھی اور چائے میں مری ہوئی مکھی پڑی تھی۔ میں اُٹھ کر نیٹی جیٹی کی طرف بھاگا اور کنارے پر پہنچ کر سمندر میں کودنے کے لئے جھکا۔ یکایک مجھے گھاس بندر نے آواز دی: او کم ہمت، بزدل انسان! واپس آ، واپس آ۔ ادب کی خدمت کر

رسالہ نکال۔ چنانچہ "گھاس بندر" وجود میں آیا۔ کباب مچھلی شہری پیدا ہوا اور "گھاس بندر" رسالے کا نام نہیں ہے۔ زندگی کا سمبل ہے۔"

میں نے کباب مچھلی شہری کی فصاحت و بلاغت کی بیحد تعریف کی اور آخر میں کہا: "میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ جانے سے پہلے صرف اتنا کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مالی لحاظ سے میں بھی آجکل گھاس بندر اور نیٹی جیٹی کے درمیان گھاس بندر ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوں۔ مجھے امید ہے مجھے میرے افسانے کا معقول معاوضہ ———"

کباب مچھلی شہری نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "آپ کا افسانہ نہایت عمدہ ہے۔ آپ نے ہمارے ملک کی شرمناک برائیوں کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ میں اس کو اپنے رسالے میں بڑی امتیازی جگہ ———"

اس کے الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔ میں دروازے کے پاس کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

ریڈیو نے اعلان کیا: "چودھری عبدالغنی بھٹن وزیر تجارت و صنعت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک معمولی حیثیت سے ترقی کر کے ملک کے وزیر کی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ان کی زندگی کامیاب انفرادی جدوجہد کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے:

کباب مچھلی شہری نے تلملا کر ریڈیو بند کر دیا۔ وہ اپنے پچکے ہوئے صوفے سے اٹھے۔ دفتر کی میز سے میرا افسانہ اٹھایا اور میرے پاس آکر مجھ سے پوچھا:

"کیا یہ عبدالغنی بھٹن وہی ہے جس کا اس افسانے میں ذکر ہے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں!؟"

اُس نے افسانہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "معاف کیجئے، یہ افسانہ نہیں چھپ سکے گا۔"

میں نے مایوسی اور طنز سے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا: "لیکن حضرت! آپ کا پرچہ تو ظلم کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ آپ تو اصول کے لئے لڑتے لڑتے مرنا بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ اور اب ———"

کباب مچھلی شہری نے میری بات کاٹ کر کہا: "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ میں اپنے اُصول کے لئے ایک دفعہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میں نے اپنے پرچے میں اُس پچاس لاکھ کے امپورٹ لائسنس کی طرف سرسری اشارہ کیا تھا۔ اسی رات کو چودھری عبدالغنی بھٹن کے آدمیوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ میں تین ماہ تک ہسپتال میں رہا۔ پھر جب چودھری عبدالغنی نے پاپولر موٹرز لمیٹڈ کو خرید لیا اور ملازمت سے الگ ہو گیا تو میں نے اُس کی طرف سے کم خطرہ محسوس کیا اور آپ کی ذمہ داری پر آپ کی کہانی چھاپنے کے لئے رضامند ہو گیا، لیکن اب چودھری عبدالغنی بھٹن پھر طاقت میں آگیا ہے۔ وہ اب موجودہ حکومت کا منسٹر ہے۔ وہ اب میرے اشتہار بند کر دے گا، میرے پرچے کو ختم کر دے گا اور آپ جانتے ہیں ایک ادیب کو اپنی تخلیق اپنی جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اپنی کہانی واپس لے لیجئے، میں مجبور ہوں۔"

میں نے اپنی کہانی کا مسودہ لیکر جیب میں ڈال لیا اور "گھاس بندر" کے دفتر سے باہر آگیا۔

اور اُس وقت سے اب تک میں اس کہانی کو لیکر ہر اخبار اور ہر رسالے کے دفتر میں گیا ہوں، لیکن کوئی اس کو چھاپنے پر رضامند نہیں ہوا۔

* * *

پھر یکایک یہ لمبی، ڈراؤنی، تاریک رات ختم ہو گئی، سورج نکلا، صبح ہوئی اور روشنی دور دور تک پھیل گئی۔

* * *

آج یہ کہانی تاریکی سے دن کی روشنی میں آتی ہے۔

آج چودھری عبدالغنی بھٹن جیل میں ہے اور اُس کی جائداد گورنمنٹ کا ۲۵ لاکھ روپیہ جرمانہ پورا کرنے کے لئے ضبط کر لی گئی ہے۔

آج کباب مچھلی شہری بلیک میلنگ کے جرم میں جیل میں چلا گیا ہے۔ اور اُس کی زندگی کا سمبل "گھاس بندر" رشوت لیکر چودھری عبدالغنی بھٹن کا غلط پراپیگنڈہ کرنے کے الزام میں بند ہو چکا ہے۔

عبدالغنی پھمن میرا ہیڈ کلرک تھا۔

میں نے عبدالغنی پھمن کی رشوت خوری، اقربا نوازی اور احباب پروری کی بے شمار رپورٹیں افسرانِ بالا تک پہنچائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سروس سے ڈسگریس کے ساتھ ڈسمس کر دیا گیا یعنی مجھے بے عزتی کے ساتھ ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

میں پرانا آئی۔سی۔ایس ہوں، ملک کے بہت سے اہم مقامات پر ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کے فرائض انجام دے چکا ہوں، کئی شہروں میں سکولوں ہسپتالوں اور سڑکوں پر میرا نام بچھا ہوا ہے۔ کامران ہائی سکول، کامران ہوسپٹل، کامران روڈ۔

اپنے ملک کے اس ماحول میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، دو افراد اپنی ایمانداری اور پرہیزگاری کے باعث بہت بدنام تھے۔ ہمارے ملک کا پرائم منسٹر اور میں۔ اس وقت ہمارے پرائم منسٹر کا عہدہ ایک ایسے مومن مرد کے ہاتھوں میں تھا جو مرغی کھانے کو رشوت کھانے سے بہتر سمجھتا تھا اور جو نماز پڑھنے کو پکنک کرنے پر ترجیح دیتا تھا جس کا چہرہ خواجہ خضر کی طرح نورانی اور گلیکسو بے بی کی طرح معصوم تھا۔

ایک دن ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا، پرائم منسٹر تھے۔ انہوں نے مجھے اُس شام کو چائے پر مدعو کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے چند بہت اہم باتیں ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔

میں وزیرِ اعظم اور اپنی ملاقات کے حالات خالص افسانوی انداز میں حقیقت سے ذراہٹ کر بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ سرکاری پروٹوکول کا وہ طریقہ جو اس ملاقات کے دوران میں استعمال کیا گیا، بہت غیر دلچسپ ہے اور بے حد بور کرنے والا۔

میں شام کو پرائم منسٹر ہاؤس گیا۔ وزیرِ اعظم گھاس پر مخمل کا مصلّٰی بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز ختم کرنے کے بعد انہوں نے میری طرح دیکھا، میری طرف دیکھ کر وہ پہلے تو زار و قطار روئے اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا: "یا حضرت! آپ مجھے دیکھ کر پہلے روئے اور پھر ہنسے، یہ کیا راز ہے؟" انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لئے کہا اور مجھے ایک اور گھاس کے قطعے میں لے آئے جہاں چائے کی تپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ تپائیوں پر چھ پلیٹیں مرغی کے تکوں کی، چھ پلیٹیں کیک پیسٹری کی اور چھ پلیٹیں پھلوں کی اور چائے کے سٹ لگے ہوئے تھے۔ ہم چائے پر بیٹھ گئے۔ وزیرِ اعظم نے کہا:

"تمہیں دیکھ کر پہلے میں رویا اور پھر ہنسا۔ تم اس کا سبب جاننا چاہتے ہو۔ میں اپنے ملک کی حالت پر دن رات روتا ہوں۔ میرے ملک میں رشوت ستانی، بے ایمانی، دغابازی، سمگلنگ، بلیک مارکٹنگ اور دنیا بھر کے عیب پھیلے ہوئے ہیں۔ میں روتا ہوں کہ میں اس ملک کا وزیرِ اعظم ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے رونا آیا کہ میں تمہارے سامنے اپنی بے چارگی کا رونا رونے والا ہوں اور پھر ساتھ ہی مجھے ہنسی بھی آئی کہ میرے ملک میں کم از کم ایک آدمی تو ایسا ہے جس کو میں ایماندار کہہ سکتا ہوں اور جس سے میں اپنے ملک کے عیوب دُور کرنے کے لئے مدد کا خواہاں ہو سکتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا: "حضور! میں دل و جان سے خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

انہوں نے فرمایا: "میں تم کو امپورٹ کمشنر مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ امپورٹ اوفس رشوت خوری میں بے حد بدنام ہو گیا ہے۔ میں نے سنا ہے وہاں کوئی ہیڈ کلرک عبدالغنی پھمن ہے۔ جس کا بینک بیلنس دو لاکھ روپے ہے اور جس کے پاس ہر سال نئے موڈل کی کار ہوتی ہے۔ تمہارے پاس کار ہے؟"

میں نے جلدی سے جواب دیا: "جی نہیں۔ مجھ میں اس تنخواہ کے اندر کار رکھنے کی استطاعت کہاں ہو سکتی ہے؟"

وزیرِ اعظم نے اپنی بات جاری رکھی: "اور میں نے سنا ہے کہ امپورٹ اوفس کے چپڑاسی نے ایک ہزار گز کے پلاٹ میں ایک عالیشان کوٹھی بنائی ہے اور ہر کہ کے سفارتخانے کو ایک ہزار روپے ماہوار کرائے پر دی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا: "حضور، اکثر افواہیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ میں وہاں جا کر حالات کا مطالعہ کروں گا۔"

وزیرِ اعظم نے یکایک موضوع کو بدلتے ہوئے کہا: "اور یہ تم نے کیا غضب کیا۔ مرغی کے تکوں کو کیوں ہاتھ نہیں لگایا۔ پیسٹری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟" مرغی کے تکوں کی پلیٹیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ پھلوں کی پلیٹوں میں چند فروٹ باقی تھے۔ پیسٹری کی پلیٹوں میں تھوڑی سی پیسٹریاں پڑی ہوئی تھیں اور میں نے پیسٹری کے دو ٹکڑے کھائے تھے۔

میں نے امپورٹ آفس کا چارج لے لیا۔

شام کو عبد الغنی بھٹن اور دوسرے عملے نے میٹروپول میں مجھے شاندار ڈنر دیا۔ ڈنر کے آخر میں میں نے عبد الغنی بھٹن اور دوسرے عملے کو رشوت خوری کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر سے بے حد مایوس کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ امپورٹ آفس اپنی رشوت ستانی کے باعث ہر جگہ بدنام ہے۔ سنا جاتا ہے کہ امپورٹ آفس کے چپڑاسیوں کے پاس بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں ہیں جو انہوں نے ہزار ہزار روپے کرائے پر دی ہوئی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس آفس کے معمولی کلرکوں کے پاس لاکھوں روپے بینک بیلنس میں ہیں اور کاریں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ افواہیں غلط ہیں۔ اور اگر یہ درست ہوئیں اور میرے آفس میں رشوت ستانی ختم نہ ہوئی تو میں آپ سب کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ جس کو میں نے رشوت لیتے ہوئے پکڑ لیا اُس کو ڈسگریس کے ساتھ ڈسمس کرا دوں گا۔

جب ڈنر ختم ہوا تو سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

عبد الغنی بھٹن مجھے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے گیا۔

دوسرے دن صبح کو عبد الغنی بھٹن مجھے دفتر لے جانے کے لئے کار لیکر میرے گھر پر آگیا۔

میں نے کہا: "مسٹر بھٹن، آپ تکلیف نہ کریں۔ میں ٹیکسی پر آجاؤں گا۔"

اس نے میرے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "جی نہیں مجھے زیادہ دیر تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ میں بہت جلد آپ کے لئے کار مہیا کر دوں گا۔"

میں چپ ہو گیا۔

دفتر پہنچ کر عبد الغنی بھٹن نے بڑے ادب سے میرے لئے دفتر کا دروازہ کھولا اور اپنے دفتر میں جانے کی بجائے میرے ساتھ ہی میرے دفتر میں آگیا۔ چپڑاسی کار میں سے میرا بیگ دفتر میں لے آیا اور پھر باہر چلا گیا۔

عبد الغنی بھٹن بڑے محتاط اور مہذب لہجے میں بولا: "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ اجازت ہو تو جرأت کروں۔"

میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا: "فرمایئے۔ تشریف رکھئے۔"

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی رات کی تقریر نے اس دفتر کے عملے میں بڑی تشویش پیدا کر دی ہے۔"

"کیوں؟"

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اور اس دفتر کا سب عملہ رشوت کو ایک نہایت مکروہ چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس دفتر میں رشوت اس مفہوم میں ہرگز موجود نہیں ہے جس میں آپ نے اپنی گذشتہ شب کی تقریر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جب کسی تاجر کو امپورٹ لائسنس مل جاتا ہے تو وہ خوش ہو کر اس دفتر کے ہر فرد کو، امپورٹ کمشنر سے چپڑاسی تک کو، کچھ نہ کچھ نذرانے کے طور پر ضرور دیتا ہے۔ میری یہ کار بھی مجھے تحفے کے طور پر ملی ہے اور آپ کو بھی بہت جلد ایک کار تحفے میں ملنے والی ہے۔"

میں جھنجھلا اٹھا اور بولا: "مسٹر بھٹن، رشوت بھیس بدل کر بھی میرے دفتر میں داخل نہ ہو سکے گی۔ تحفہ، نذرانہ، بخشش، انعام، رشوت ہر شکل میں ممنوع ہے۔"

عبد الغنی بھٹن نے نہایت لجاجت سے کہا: "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ کلرکوں کی تنخواہیں دیکھئے، اور بازار میں گرانی دیکھئے۔ اگر ان کو تنخواہوں کے علاوہ تھوڑی بہت آمدنی نہ ہوگی تو وہ سسک سسک کر مر جائیں گے۔ کلرکوں کو چھوڑیئے، اپنے آپ کو دیکھئے۔ آپ اپنی دو ہزار روپے کی تنخواہ میں کار بھی نہیں خرید سکتے اور منسٹر اپنی پانچ ہزار روپے کی تنخواہوں میں اپنے بچوں کو انگلستان یا امریکہ تعلیم کے لئے نہیں بھیج سکتے۔ تو پھر کیوں نہ بڑے بڑے تاجروں سے جو سمگلنگ اور بلیک مارکٹنگ سے ہزاروں روپے روزانہ کماتے ہیں، آپ اور ہم اپنی اہم ضروریات کے لئے کچھ قبول کر لیں۔ آخر ہم اپنی ضروریات کس طرح پوری کریں گے؟"

مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا: "مسٹر بھٹن، آپ کے خیالات بے حد نامعقول ہیں۔ آپ اس دفتر کے ہیڈ کلرک ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کو میری ہدایات کے مطابق چلائیں۔ میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر اس دفتر کی برائیاں میری مرضی کے مطابق رفع نہ ہوئیں، تو میں آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراؤں گا۔"

اور دفتر کی برائیاں رفع نہ ہوئیں۔ دفتر سے رشوت ختم نہ ہوئی۔

آخر میں تنگ آکر وزیر تجارت وصنعت کو عبدالغنی بھٹن کے خلاف ایک اسپیشل رپورٹ بھیجی اور اس میں اُس کے خلاف انکوائری کرنے کی سفارش کی۔
وزیر تجارت وصنعت نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور ہمارے درمیان یہ گفتگو ہوئی: "عبدالغنی بھٹن کے خلاف یہ اسپیشل رپورٹ آپ نے بھیجی ہے؟"
"جی ہاں"
"آپ کو معلوم ہے عبدالغنی بھٹن کون ہے؟"
"جی نہیں"
"وہ گورنر جنرل کی آیا کا بیٹا ہے۔"
"جناب گورنر جنرل کی آیا کا یہ بیٹا پرلے درجے کا رشوت خور ہے اور میرے سارے عملے کو رشوت خوری کی ترغیب دیتا ہے۔ میں اُس کے خلاف انکوائری کی سفارش کرتا ہوں۔"
"اگر وہ آپ کی سفارش پر ڈسمس ہوگیا، تو گورنر جنرل آپ کو برباد کردے گا۔"
"اگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مجھے کوئی نقصان پہنچتا ہے، تو مجھے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔"
"بہرکیف میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ میں اس رپورٹ پر کوئی ایکشن نہیں لوں گا۔"
میں وزیر تجارت وصنعت کے دفتر سے باہر آگیا۔

* * *

ایک سال ہوگیا۔ میں عبدالغنی بھٹن کے خلاف رپورٹیں کرتا رہا۔ عبدالغنی بھٹن میری آنکھوں کے سامنے رشوت کھاتا رہا۔ میرے دفتر کا سارا عملہ پہلے سے بھی زیادہ جرائم پیشہ ہوگیا۔ میری پرہیزگاری ان کو ناجائز آمدنی سے باز رکھنے کی بجائے اُن کو مالی فائدہ پہنچانے لگی۔ وہ میری رشوت کا حصہ بھی آپس میں بانٹنے لگے۔
میں رپورٹوں پر رپورٹیں کرتا رہا اور بے بسی سے اُن کو رشوت میں ہاتھ رنگتے دیکھتا رہا۔

* * *

پھر یکایک حالات نازک ہوگئے۔
اور پاپولر موٹرز لمیٹڈ کے پچاس لاکھ کے امپورٹ لائسنس کا واقعہ پیش آیا۔
پاپولر موٹرز لمیٹڈ نے پچاس لاکھ روپے کے امپورٹ لائسنس کی درخواست کی۔
اُس دن لائسنس جاری کرنے کی آخری تاریخ تھی اور سب ضروری لائسنس جاری ہوچکے تھے۔
شام کے پانچ بجے تھے۔ دفتر کے سب کلرک چلے گئے تھے۔ عبدالغنی بھٹن خلافِ معمول اور میں حسبِ معمول ابھی دفتر میں موجود تھے۔
دروازہ کھلا۔ عبدالغنی بھٹن میرے دفتر میں داخل ہوا اور فائل میرے سامنے رکھ کر بولا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ کے امپورٹ لائسنس پر آپ کے دستخط ہوں گے۔"
میں نے فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ ایک غیر ملکی فرم ہے۔ میں اس کو پچاس لاکھ کا امپورٹ لائسنس جاری کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا ہمارے ملک کے سٹرلنگ بیلنس پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔"
عبدالغنی بھٹن نے جچے تلے الفاظ میں کہا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ ایک غیر ملکی فرم ہے۔ اگر اُس کو پچاس لاکھ روپے کا امپورٹ لائسنس جاری نہ کیا گیا، تو اس سے بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔"
میں نے کہا: "تاہم میں اتنا بڑا قدم وزیر تجارت وصنعت کے مشورے کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا۔"
"وزیر تجارت وصنعت پیرس میں فلموں کے بین الاقوامی مقابلے میں اپنی فلم انڈسٹری کی نمائندگی کرنے گئے ہیں۔"
"ان کی غیر حاضری میں، میں وزیر اعظم سے مشورہ کر سکتا ہوں۔"
"وزیر اعظم بغداد میں روضوں کی زیارت کے لئے گئے ہوئے ہیں۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ گورنر جنرل سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔"

"گورنر جنرل ہاکس بے میں ہیں۔ جاپانی لڑکیوں کا وہ وفد جو دنیا کا دورہ کر رہا ہے۔ آج گورنر جنرل کے ساتھ ہاکس بے میں پکنک منا رہا ہے۔"

میں نے غصّے کو دباتے ہوئے کہا: "مسٹر بھٹن! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں؟ میں جانتا ہوں وہ تینوں دارالخلافے میں موجود نہیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کیس کو اُن کے آنے تک ملتوی رکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ اس کیس کو ملتوی نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں؟"

"آج لائسنس جاری کرنے کا آخری دن ہے۔"

میں نے فائل اُس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا: "تو پھر اس کیس کو TOO LATE کے ریمارک کے ساتھ واپس کر دیجئے۔ پاور موٹرز لمیٹڈ نے اتنا بڑا اہم معاملہ وقت پر پیش کیوں نہیں کیا؟"

"پاور موٹرز لمیٹڈ نے یہ معاملہ بالکل وقت پر پیش کیا ہے۔ اُن کو اتنا وقت اس لائسنس کی غیر سرکاری طور پر منظوری لینے میں لگا۔ گورنر جنرل اور تجارت اور صنعت کے منسٹر نے اس کو غیر سرکاری طور پر منظور کر لیا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "گورنر جنرل نے منظور کر لیا ہے، کیوں؟"

"گورنر جنرل کو منظور کرنا پڑا۔ گورنر جنرل کا لڑکا پاور موٹرز لمیٹڈ کے غیر ملکی جنرل منیجر کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اگر گورنر جنرل اس لائسنس کو منظور نہیں کرے گا تو اس کے لڑکے کی شادی پاور موٹرز لمیٹڈ کے جنرل منیجر کی لڑکی سے نہ ہو سکے گی۔"

"اور وزیر تجارت وصنعت کا کیا انٹرسٹ ہے؟"

"چار لاکھ روپے۔"

میں حیران ہو گیا: "چار لاکھ روپے؟"

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا: "اب پردہ کیا ہے۔۔۔ اس ڈیل میں وزیر تجارت وصنعت کو چار لاکھ روپے، آپ کو دو لاکھ روپے، مجھے ایک لاکھ اور ہمارے عملے کو پچاس ہزار روپے ملیں گے۔"

میں غصّے سے کانپنے لگا۔ میں نے فائل کو اٹھا کے دیوار کے ساتھ دے مارا اور چلّایا: "شٹ اَپ، یُو۔۔۔۔"

میں دفتر سے باہر آنے کے لئے اٹھا۔ عبدالغنی بھٹن نے بکھری ہوئی فائل کو اٹھاتے ہوئے کہا: "آپ اس لائسنس پر دستخط کئے بغیر باہر نہیں جا سکتے۔ شاید آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے اس لائسنس پر دستخط کرانے کے لئے وہ وقت چنا ہے۔ جب تمام کلرک جا چکے ہیں، دفتر سنسان پڑا ہے اور کوئی آپ کی مدد کو نہیں آ سکتا۔۔۔۔!"

میں نے دیکھا عبدالغنی بھٹن پستول لئے ہوئے میری طرف آ رہا ہے۔ میں کرسی پر گر گیا اور اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ میں بزدل ہوں، ذلیل ہوں، بےغیرت ہوں، کمینہ ہوں۔

عبدالغنی بھٹن نے میرے سامنے فائل رکھ دی اور میں نے دستخط کر دیئے۔

عبدالغنی نے فائل کو سنبھالتے ہوئے کہا: "پولیس کو بلانے کی غلطی نہ کیجئے۔ اس لائسنس میں پولیس کا بھی حصّہ ہے۔"

عبدالغنی بھٹن میرے دفتر سے نکل کر اپنے دفتر میں چلا گیا: "میں پاگلوں کی طرح ٹیلیفون کے ڈائل کو گھمانے لگا۔ پولیس کو چیخ چیخ کر رپورٹ کی اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں اس عالم میں بیٹھا رہا۔ آخر جب میں نے سر اٹھایا تو میرے دفتر میں پولیس کھڑی تھی۔

"ہم آپ کے دفتر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔"

میں ان کو چلّا چلّا کر یہ واقعہ بتاتا رہا، لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہ سنی۔ چپ چاپ میری درازوں کی تلاشی لیتے رہے۔

اور میرے ایک دراز سے سو سو روپے کے پچاس نوٹ برآمد ہوئے جن پر پولیس کے دستخط تھے!

پھر پولیس مجھے میرے بنگلے پر لے آئی اور میرے بنگلے کی تلاشی لینے لگی۔ میرے بنگلے سے سمگل کیا ہوا سونا برآمد ہوا۔ اور یہ سب کچھ کیسے ہوا، مجھے ابھی تک معلوم نہیں۔ اتنا ظاہر تھا کہ اس کے پیچھے عبدالغنی بھٹن کی دماغی صلاحیتیں کام کر رہی ہیں۔

مجھے گرفتار کر لیا گیا، مجھ پر مقدمہ چلایا گیا، دو سال قید سخت کی سزا ہوئی اور ملازمت سے ڈسگریس کے ساتھ ڈسمس کر دیا گیا۔

لیکن میری زندگی کی اس ٹریجڈی سے بھی بڑی ایک اور ٹریجڈی ہوئی۔

جس دن مجھے قید کی سزا ملی، اسی دن ہمارے نمازی، پرہیزگار اور معصوم وزیر اعظم کو اُن کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

میں اپنے یہ دو غم لیکر دو سال تک جیل کی کوٹھڑی میں سڑتا رہا!

جب میں رہا ہو تو جیل سے باہر آکر مجھے معلوم ہوا کہ عبدالغنی بھٹن نے پچاس لاکھ کا لائسنس جاری ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ملازمت چھوڑ دی، اور پاپولر موٹرز لمیٹڈ کو خرید لیا۔ چار مہینے بعد چھانگا مانگا کے جنگلات میں ایک ایم۔ ایل۔ اے کی لاش ملی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد عبدالغنی بھٹن بائی الیکشن میں بہت بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوا۔ اور پھر جب میں "گھاس بندر" کے ایڈیٹر کتاب پھلی شہری کے دفتر میں بیٹھا تھا تو ریڈیو نے اعلان کیا:۔

"چودھری عبدالغنی بھٹن وزیر تجارت وصنعت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک معمولی حیثیت سے ترقی کر کے ملک کے وزیر کی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ان کی زندگی کامیاب انفرادی جد و جہد کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے۔"

* * *

میں جیل سے نکل کر پوچھتا پوچھتا سیدھا وہاں گیا، جہاں ہمارے معزول شدہ وزیر اعظم تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی کوٹھی میں داخل ہو کر جب میں مرغیوں کے جالی دار ڈربوں کے پاس سے گزر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ جس شخص کے سامنے ہر قوم اور ہر ملک کے سفیر جھک کر سلام کرتے تھے، اس کے ارد گرد اب ہر ملک اور ہر نسل کی مرغیاں کڑکڑاتی پھرتی ہیں۔ اُف انقلاباتِ زمانہ!

جب میں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ ہمارے ملک کے سابقہ وزیر اعظم ایک خشک گھاس کے قطعے میں چٹاگانگ کی چٹائی پر بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب وہ نماز ختم کر چکے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر پہلے تو دونوں خوب روئے، پھر دیر تک کھلکھلا کر ہنستے رہے ٭

*

ماہِ نو ــــ میں اشاعت مضامین سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

فکاہیہ:

تشخیص مرض

شوکت تھانوی

دو تین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ایک حکیم صاحب سے بھی مشورہ لیا مگر کسی کی سمجھ میں وہ مرض نہ آسکا جس میں بیگم صاحبہ مبتلا ہیں اور یہ ماننے کو میں تیار نہ تھا کہ وہ اچھی خاصی ہیں اور محض اخلاقاً پژمردہ سی ہو رہی ہیں یا تفریحاً گھل رہی ہیں۔ نہ ان میں وہ اگلی سی شگفتگی باقی تھی نہ وہ خندہ پیشانی کچھ عجیب آدم بیزار سی چڑچڑی ہو کر رہ گئی تھیں کہ کچھ نہیں ہے تو بچوں ہی کو ڈانٹ رہی ہیں کہیں سیر سپاٹے کو چلنے کے لئے کہا جائے تو لڑنا شروع کر دیں حد یہ ہے کہ اپنی بعض عزیز از جان سہیلیوں تک سے ملنا جلنا چھوڑ رکھا تھا جن سے وہ اس حد تک ملا کرتی تھیں کہ ان کے لئے بد دعا کرنے کے لئے میں نے نماز تک شروع کر دی تھی کہ الہ العالمین یا تو اب مجھکو اٹھا لے یا ان کی ان سہیلیوں کا ناس ہو جن کی وجہ سے میری اچھی خاصی بیوی میرے لئے عنقا بن کر رہ گئی ہے۔ مگر آجکل میں ان ہی سہیلیوں کے لئے درازی عمر کے علاوہ یہ دعا بھی کرنے لگا ہوں کہ اے مقلب القلوب تو میری بیوی کا دل ان کی سہیلیوں ہی کی طرف پھیر دے تاکہ ان کی طبیعت کچھ تو بہلے۔ مجھے یقین ہے کہ میری ہی دعائیں قبول ہو گئیں اور آج ان میں سے دو تین سہیلیاں ان سے ملنے آگئیں۔ میں برابر کے کمرے میں کتابوں کی الماری کھول کر اپنی سہیلیوں سے دل بہلانے لگا اور اس کمرے میں جہاں کچھ دن سے زندگی کے تمام آثار مفقود تھے ایک عجیب گہما گہمی سی پیدا ہو گئی۔ شکوے شکایتوں کے دفتر کھلے۔ بے مروتی اور طوطا چشمی کے طعنے ایک نے دوسرے کو دئے۔ کسی نے اپنے پڑوسی کے لڑکے کی شادی کا قصہ شروع کر دیا تو کسی نے اپنی پڑوسن کے طلاق کی پوری تفصیل سنا کر رکھدی۔ اللہ جانے یہ کس کا ذکر تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کو بٹھا رکھا ہے اور سسرال بھیجنے کے بجائے داماد کو لکھ دیا ہے کہ فارغ خطی لکھ دو اور نہ جانے اس شادی اور طلاق کے ذکر پر ایک عجیب و غریب نام کے اسنو کی بات کہاں سے چھڑ گئی۔ میں تو اس وقت چونکا ہوں جب بیگم صاحبہ کی بھولی بسری کھنکتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی کہ:-

"اے ہے۔ وہ کہاں مل رہی ہے۔ میں نے تو سارے شہر کے سارے بازار چھان مارے، کہیں اس نگوڑ ماری اسنو کا پتہ نہ چلا"

مسز جمیل کی آواز میں نے پہچان لی وہ بڑی مستعدی سے بولیں "لو اور سنو بازار میں کہاں دھری ہے ایک بیچارے دکاندار نے خدا اس کا بھلا کرے اس مارشل لا کی وجہ سے کچھ چیزیں چھپا کر رکھ لی تھیں، ان ہی میں یہ اسنو بھی مجھکو مل گئی۔ مگر بہن مہنگی بہت کر دی ہے"

بیگم صاحبہ نے کہا "بلا سے مہنگی کر دی ہے مگر ہے تو سہی۔ تو اب یہ تمہارے ذمہ ہے کہ دو شیشیاں مجھے منگا کر بھیجو گی۔ اللہ جانتا ہے ترس کر رہ گئی میں تو ان چیزوں کو۔ یہ دیکھو لوڈبہ رکھا ہوا ہے پاؤڈر کا سارا شہر چھان مارا کہیں نہیں ملتا"

ایک اور بیگم صاحبہ بولیں "تو پھر آخر کہاں سے ملا"

بیگم صاحبہ نے تقریباً آہ بھرتے ہوئے کہا "ملا کہاں سے خالی ڈبہ پڑا ہوا ہے۔ میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ بلا سے کوئی دوگنے تگنے دام لے لے مگر دے تو دے یہ پاؤڈر"

مسز جمیل کی آواز کھنکی "ایسی آگ لگی ہے ان تمام ولایتی چیزوں کو کہ میں کیا کہوں۔ اے دیکھو یہ۔ یہ لپ اسٹک میں ہمیشہ استعمال کرتی ہوں مگر ایکی جو یہ ختم ہو گئی تو دکان دکان جھانکتی پھری کہیں نہ ملی آخر ایک دکاندار نے تگنے دام لے کر اللہ جانے کہاں سے نکال دی۔ میں نے تو بہن اسی وقت آن ہی داموں میں چھ خرید لیں کہ اللہ جانے پھر ملیں کہ نہ ملیں"

بیگم صاحبہ نے بڑی مرجھائی ہوئی آواز میں کہا "اب میں تم سے کیا بتاؤں کہ ایک ایک چیز کے لئے کتنا کتنا پریشان ہونا پڑتا ہے، نیل پالش ہے تو غائب روج ہے تو اس کا پتہ نہیں۔ کریم اور اسنو تو ایسی غائب ہوئی ہیں کہ دل بیٹھ کر رہ گیا ہے۔ اب یہ تو بہن ہم سے ہو نہیں سکتا کہ زندگی بھر جن چیزوں کے عادی رہے ہیں ان کو چھوڑ کر یہ دیسی قلعی شروع کر دیں"

مسز جمیل نے قہقہہ لگایا "معلوم تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اللہ قسم۔ وہ ہیں نا نجمہ اے وہی ڈاکٹر کریم کی بیوی۔ اللہ بچائے اس سے بھی نہ جانے کونسا چونا منہ پر تھوپ کر دروازوں کا روغن ہونٹوں پر لگا لیتی ہے"

بیگم صاحبہ نے کہا "ہاں بہن ہم سے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ کہ نہ کہیں آنے کے رہے ہیں نہ جانے کے بھلا بتاؤ کون اس طرح منہ جھاڑ سر پہاڑ کہیں چلا جائے بلکہ میں نے تو تمہارے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ایک تو مجھ سے اب کہیں جانے کو نہ کہا کرو۔ دوسرے اب میں شروع کرتی ہوں برقعہ"

مسز جمیل ہنس پڑیں "برقعہ؟ سچ مچ برقعہ ہی آ رہوائے گا اب ان چیزوں کا قحط۔ سچ مچ زندگی سے بیزار کر کے رکھ دیا ہے ان چیزوں کی نایابی نے۔

بیگم صاحبہ بولیں "مجھ سے زیادہ تو شاید ہی کوئی بیزار ہوا ہو قسم لے لو مجھ سے جو میں کہیں بھی نکلی ہوں، کہیں جانے کو جی ہی نہیں چاہتا اور تو اور وہ موا لونڈر واٹر تک نہیں ملتا"

مسز جمیل نے کہا "نہیں یہ نجمہ تو کہیں سے لائی تھیں"

نجمہ نے کہا "وہی تین بوتلیں جو خریدی تھیں وہی چل رہی ہیں کہو تو تمہارے لئے بھی ڈھنڈواؤں"

بیگم نے کہا "اے بہن خدا کے لئے ڈھنڈواؤ اور یہ پاؤڈر تو جتنے کا بھی ملے میں دس پانچ ڈبے لے کر رکھ لوں گی۔ کہو تو تمہارے بھائی صاحب سے کہوں موٹر نکالیں"

اور پھر خود ہی بلند آواز سے مجھ کو پکارا "اے میں نے کہا سُن رہے ہیں آپ"

میں تو ظاہر ہے کہ سن ہی رہا تھا لہٰذا جواباً عرض کیا "اس سے قبل کہ میں کچھ سنوں مسز جمیل اور نجمہ بہن کو میرا سلام کہہ دیجئے"

مسز جمیل نے اسی کمرے سے کہا "تو کیا آپ پردہ بیٹھ گئے ہیں بھائی صاحب"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "جی نہیں میں سلام کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ میں نے مخل ہونا مناسب سمجھا تھا خیال تھا کہ چائے کی میز پر تو سلام عرض کرنے کا موقع مل ہی جائے گا"

اور یہ کہتا ہوا میں بیگم صاحبہ کے کمرے میں جو آیا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب انگیز خوشی ہوئی کہ بیگم صاحبہ کے چہرے پر بحالی صحت کے پورے آثار موجود تھے یعنی آنکھوں میں بھی چمک تھی اور لبوں پر وہ موجِ تبسم بھی جس کو میں ان کے لبوں کی ساخت میں شامل سمجھا کرتا تھا۔ مسز جمیل اور نجمہ تو سنبھل کر بیٹھ ہی چکی تھیں مگر بیگم صاحبہ کی حالت بھی مجھ کو سنبھلی ہوئی نظر آئی وہ بڑی شگفتگی سے بولیں "آپ ذرا موٹر نکال کر ہم لوگوں کو بازار نہیں لے چلتے"

میں نے کہا "میرے تو پروگرام ہی میں شامل تھا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لیجانا مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی اسلئے کہ مرض کی تشخیص ہو چکی ہے"

مسز جمیل نے گھبرا کر پوچھا "مرض کی تشخیص؟ - مرض کیسا؟"

عرض کیا "دونوں امراض کی تشخیص ہو گئی - ان کا مرض بھی اور بازار کا مرض بھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان دونوں امراض میں باہمی تعلق کیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ بازار کی مریض ہیں اور بازار آپ کا۔ رہ گیا میں تو جواب نہیں ہے میری حماقت کا کہ کتنے دن سے خواہ مخواہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی نازبرداریاں کرتا پھر رہا ہوں"

بیگم صاحبہ نے بڑے غمزے سے کہا "اچھا خیر ہو گا بھی - چلئے نا ذرا بازار"

عرض کیا "ویسے تو میں خادم ہوں مگر ایک بات سُن لیجئے مجھ سے کہ اگر آپ سب کا یہی عالم ہے تو وہ تمام اصلاحی تدابیر قطعاً بیکار رہیں جو اس شدومد سے جاری ہیں۔ آپ ہی کی قسم کے لوگ ان دکانداروں کو چور بازاری اور منافع خوری سکھاتے ہیں اور آپ ہی کی قسم کے گاہکوں کی بدولت یہ لعنتیں دب دب کر ابھرتی ہیں لیکن میں آپ کو بتلائے دیتا ہوں کہ اگر اس ملک کو باقی رکھنا ہے تو یہ تمام چونچلے آپ کو ختم کرنا پڑیں گے اور جب تک آپ یہ حرکتیں نہ چھوڑیں یہ دکاندار ان لعنتوں سے تائب نہیں ہو سکتے"

شروع شروع میں تو اس بے محل بکواس سے ان خواتین نے بیزاری ظاہر کی مگر جب میں نے ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے عظیم نتائج ان کے سامنے پیش کئے اور جب یہ نقشہ ان کے سامنے لایا کہ اس طرح وہ اپنا کتنا زرمبادلہ اپنے ملک کے باہر بھیج کر اپنے میک اپ کی بدولت اپنے وطن کے لئے بصورتی خرید رہی ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں نتیجہ یہ کہ سب سے پہلے مسز جمیل ہی بولیں "پھٹکار ایسے بناؤ سنگھار پر کہ ہم ملک ہی کو نیلام پر چڑھا دیں"

بیگم نے بھی ہاں میں ہاں ملائی "بہن یہ تو سچ ہے کہ اگر ہم ہی مہنگے داموں یہ آخورنہ سمیٹیں تو یہ موئے چور بازاری آخر کس سے کریں گے"

میں نے خوش ہو کر کہا "تو پھر نکالوں موٹر"

بیگم نے کہا "اب کیا کریں گے بازار جا کر"

میں نے کہا "میں تو جاؤں گا مٹھائی لینے میری بیوی کا غسل صحت ہے آج" اور میں سب کو واقعی پکڑ کر بازار لے گیا۔

غنچے چٹکے آدھی رات

محمد عمر میمن

اس کے چہرے سے گہرے فکر کے جذبات ہویدا تھے۔ سامنے تپائی پر اخبار پڑا تھا۔ اس نے ہر لمحہ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات کی طغیانی سے نجات نہ پاکر پھر ایک اخبار اٹھا کر یونہی خالی خالی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ پڑھ کیا رہا تھا۔ یہ تو خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ بس اس کے ذہن میں تو دو گھنٹہ قبل پڑھی ہوئی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں وہ خبر بری طرح چکر لگا رہی تھی۔

حکومت نے تمام ناجائز املاک کا حساب مانگ لیا تھا اور ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ ان گذشتہ نو سال میں "بلیک" کے کام اور دیگر ناجائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کا حساب اس قدر آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ مستقل ڈیڑھ ماہ سے وہ برابر کوشش کر رہا تھا کہ اخباروں یا ریڈیو سے وہ توجہ ہٹا لے اور اعلان نہ پڑھے نہ سنے۔ مگر کبھی ایسا نہ ہو سکا۔

"اُف میں کسقدر مصیبت میں پڑ گیا ہوں، اُف میرے خدا..... اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی سے پیدا شدہ لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔ تب اچانک اسے یہ محسوس ہوا وہ اس جال میں جو خود اس نے دوسروں کو پھانسنے کیلئے ان گزشتہ نو سال میں بنایا تھا بری طرح خود ہی پھنس گیا ہے۔ لیکن یہ تو سب میری مرضی کے عین منافی ہوتا رہا ہے۔ میں نے اس ناجائز دولت کے حصول کے لئے جو کچھ ذرائع استعمال کئے ان میں کب میرے ارادے کو دخل تھا.....؟ ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی اور ضمیر تڑپ اٹھا۔

"سیٹھ محمود علی! اب اتنے بھولے بھی نہ بنو یہ تمام املاک یہ لاکھوں کا نفیس بنگلہ، یہ کاریں، عیش و طرب کے سامان، چکیلا فرنیچر ان سب کے حصول کے لئے جب تم ناجائز طریقوں کو اپنانے کے لئے بڑھے تھے۔ تو کیا اس موقع پر میں نے تمہاری راہ نہ روکی تھی۔ کیا تمہیں اس وقت میں نے تمہارے اس مکروہ اقدام سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور صرف ایک دفعہ ہی کیا۔ ان طویل نو سال میں جب بھی تم نے دولت کے حصول کے لئے کوئی بھی ناجائز ذریعہ استعمال کیا میں نے ہر بار تمہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی تنبیہہ کی۔ لیکن سیٹھ! دولت کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے کھنکھناتے روپہلے سکوں کی جھنکار انسان کی عقل پر دبیز پردہ ڈال دیتی ہے اور تم نے بھی ہر بار ان کھنکھناتے سکوں کی جھنکار کے آگے میری سرزنش کو پس پشت ڈال دیا۔ اور اب تم کتنے بھولے بن رہے ہو۔ تمہارے فعل میں تمہارے ارادے کو دخل نہ تھا تو سیٹھ محمود علی یہ بنگلہ کیسے بن گیا۔ اور چمکتی ہوئی ہزاروں کی یہ ہیکارڈ "تم کہاں سے لے آئے...؟"

"لیکن..... لیکن —— یہ سب میں نے اپنے لئے تو حاصل نہ کیا تھا —— اور جب یہ سب میرے لئے نہیں تو میں ہی کیوں اس کا تن تنہا خمیازہ بھگت رہا ہوں؟

اس سے بحث نہیں یہ تم نے اپنے لئے حاصل کیا یا طویل طنزیہ جملوں کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی یورش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے یا اپنی بیوی اور دیگر رشتہ داروں کے پیہم اصرار کے بعد —— حاصل تو کیا، تو اب پھر ان طویل پچھتاووں سے کیا حاصل! تم اپنا ضمیر تو پہلے ہی بیچ چکے ہو سیٹھ"

تب اچانک ضمیر کی اس کشمکش سے ہٹ کر اس کی آنکھیں اخبار پھیلی ہوئی ایک دوسری سرخی پر پھسل گئیں...

ایک خوفناک اسمگلر اپنی لانچوں سمیت بحری فوج کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا..... اچانک اسے کچھ شک سا گزرا روزانہ وہ اخبار میں اسمگلروں کی گرفتاریوں کی خبریں پڑھتا آیا تھا۔ لیکن کریلا والا ابھی تک آزاد تھا اور وہ کریلا والا کی پھرتی اور چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اس انقلابی دور میں جب کہ فوج نے ایک ایک اسمگلر کو پکڑ لیا تھا۔ کریلا والا ابھی آزادی سے سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا پھر رہا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ بلیک لسٹ پر کریلا والا جیسے کالے مجرم کا نام نہ ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ باوجود بڑی کوشش کے وہ خبر کی مکمل روئداد پڑھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا —— اس کا خدشہ صحیح تھا۔ کریلا والا اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ یکایک ایک ہلکی سی کراہ اس کے لبوں سے نکلی اور اسے شدت سے محسوس ہوا، اس کا دایاں بازو ٹوٹ چکا ہے۔ وہ تقریباً یتیم ہو گیا ہے۔

"اوہ ـــــ ہائے" وہ کسی اندرونی ہیجان سے کراہ اٹھا اور اس کی آہ لبوں سے نکل کر کمرے کی فضا میں پھیل گئی۔ اس نے ختم ہوتے ہوئے سگار کے دو تین لمبے لمبے کش جلد جلد لے ڈالے اور اسے ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے بکس سے دوسرا سگار نکال لیا۔ لائٹر کے مدھم سے کانپتے ہوئے ننھے شعلے میں اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگا۔ اس نے عجیب ہذیانی انداز میں جلدی سے پھونک مار کر شعلے کو گل کر دیا جیسے وہ اپنا مستقبل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسے اسے علم تھا کہ اس کا مستقبل کا روپ کس قدر گھناؤنا اور تاریک ہوگا۔ ایک بھرپور کش لیتے ہوئے اس نے سارا دھواں کمرے میں بکھیر دیا۔ دھوئیں کے پُرپیچ بادل کمرے میں بے ترتیبی سے پھیل گئے اور ان دھندلے دھندلے بادلوں کے بیچ میں اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگا جیسے وہ اپنی مرضی کے خلاف بیکس و مجبور بنا دیکھ رہا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بڑے بڑے چوکور خانوں والا لباس پہنے کھڑا ہے اس کے ہاتھوں میں آہنی چوڑیاں ہیں اور پیروں میں وزنی بیڑیاں جنہوں نے اسے اس درجہ بے بس کر دیا ہے۔ کہ وہ ایک ہلکی سی آزاد جنبش سے بھی معذور ہے۔

"اف! کیا اس تمام دولت کے عوض اس کی قسمت میں یہ سلاسل ہی آئی ہیں۔ تب پھر یہ سب کس کے لئے تھا۔ اب سے نو سال پہلے کی زندگی کیا اتنی گئی گزری تھی۔ کہ وہ اس آزاد معصوم اور پاکیزہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک نئے باب میں داخل ہوا تھا۔ وہ باب ـــــ زندگی کا وہ حصہ جو نو سال تک اس کی قسمت میں حائل رہا اور نئے انوکھے رنگ بھر کر اب اس مکروہ اور انتہائی گھناؤنے ایک اور رنگ کا اضافہ کر رہا تھا۔ اسے یہ رنگ نہیں چاہئے۔ اس نے اس رنگ کی تمنا ہی کب کی تھی۔ اسے تو نو سال قبل کی وہ معصوم پاکیزہ اور آزاد زندگی ہی پسند تھی۔ لیکن اب تو اس کی یہ سوچ بھی کتنی بعد از وقت ہے۔ وقت اس کی راہوں میں انگور کی نرم نرم خوشنما بیلوں کو بچھاتے بچھاتے اتنی دور پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ باقی ساری زندگی بھی اپنی پوری قوت سے دوڑے تب بھی وہ اس کو نہیں پا سکتا اور انگور کی ان مخملیں بیلوں پر طویل نو سال تک چلتے چلتے اب جبکہ اپنی راہوں میں خار دار جھاڑیاں آگئی ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ واپس اس راہ پر لوٹ کر اپنی وہی پرانی روش اختیار کر لے جہاں نہ پھول ہیں نہ کانٹے ـــــ اطمینان تو ہے لیکن اب تو وہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس لوٹ جانا بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ قسمت کی کبھی ان خار دار گزرگاہوں پر اب اسے طوعاً و کرہاً اپنا سفر جاری ہی رکھنا ہے۔

دھوئیں کے بادل فضا میں تحلیل ہو گئے۔ کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مینٹل پیس پر خوشنما گھڑی کے نزدیک پڑا ہوا بدھ کا لکڑی کا مجسمہ اسی روایتی انداز میں سر جھکائے کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا ـــــ یکایک اسے محسوس ہوا ـــــ بدھ بھی اپنی سوچ اور استغراق کے عالم سے جب چونکے گا۔ تو اسے اپنی اس طویل خاموشی اور سکوت کا بدلا مل جائے گا وہ بھی راہ نجات پائے گا۔ لیکن میں . . . . . ؟ اس نے پھر ایک گہرا کش لیکر فضا کو دھوئیں سے بوجھل کر دیا ـــــ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔

رات کی سنسان خاموشی میں کسی کمرے میں لگے ہوئے بڑے سے کلاک نے گزرتے ہوئے وقت کی لاش پر اپنی بھرپور قوت سے ضربیں لگانی شروع کیں۔ وہ چونک گیا صوفے پر ہلکے نیلے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس اپنے جسم کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ایک سرسری سی نظر ڈالی ـــــ "اف! ـــــ دو بج گئے اور جانے کتنے بجتے جائیں گے۔

سامنے دبیز مخملیں کمبلوں میں لپٹی ہوئی اس کی محوِ خواب بیوی نے کسمسا کر پہلو بدلا اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"ارے! آپ ابھی تک نہیں سوئے ـــــ" پھر اس نے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے دو بج گئے" کسی نے بڑی سبک خرامی سے آکر دھیمے سے اس کی سوچ کے ساکت سمندر کی خاموش سطح پر جیسے ایک چھوٹا سا کنکر دے مارا۔ وہ چونک پڑا۔

"کیا کہا روبی ـــــ سوتا کیوں نہیں"! اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ اپنے احساس میں نیم کی نبولی جیسی کڑواہٹ اور تلخی لئے ہوئے بولا "تم سو جاؤ روبی ـــــ یہ شب بیداری تمہاری ہی تو دی ہوئی ہے . . . . . سو جاؤ . . . . . میں نے جانے کتنی ہی ایسی طویل راتیں جاگ کر کاٹ دی ہیں۔

"پچھلے چند دنوں سے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ آپ کی بہکی بہکی باتیں یہ اضطراب اور یہ کھویا کھویا پن آخر کس چیز کا ردعمل ہے؟ ـــــ"

"ایک حسرتناک مستقبل کا پیش خیمہ کہو روبی" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے عجیب اضطراری انداز میں بولا۔

"کیوں ـــــ؟ کیسا مستقبل؟ کیسی حسرت؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے آخر؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے روبی . . . . . تم سو جاؤ۔ تم پریشان نہ ہو" وہ بڑے مدھم لہجہ میں بولا اور روبی دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔ اس کے جی میں آیا کہہ دے "روبی تم بہت بھولی ہو اب سے صرف نو سال پہلے تم نہ کہا کرتی تھیں۔ آخر ہمارے رشتہ دار سرحد پار کونسے ایسے رئیس تھے۔ لیکن اب . . . . . یہاں آتے ہی

ان کی قسمت جاگ اٹھی۔ گویا کوڑی کے دن پھر گئے اور اب تو زندگی خود ان پر رشک کرتی ہے۔ آخر ہم میں کیا برائی ہے، ہم کیوں ایسے نہ بنیں ...... ! اور تب پھر روبی "محمود جنرل اسٹورز" کی فٹ پاتھ سے ملی ہوئی دوکان شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر "محمود اینڈ سنز ایکسپورٹرس اینڈ امپورٹرس" کے لمبے چوڑے آفس میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن روبی اس چھوٹی سی دوکان کی سوڈیڑھ سو روپے کی ماہانہ آمدنی ہم اور ہمارے بچوں کو ایک سکون تو دے سکتی تھی۔ موٹا جھوٹا پہننے کو اور سیدھا سادا کھانے کو لیکن ..... تمہیں اس زندگی سے اور اس کے اطمینان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے تمہارے اور تمہارے رشتہ داروں کے طویل طنزیہ جملوں سے بچنے کے لئے ہر مخدوش ذریعہ کو حصول دولت کیلئے اپنا کر تمہارے زرد لٹکتے ہوئے رخساروں کو کھنکھناتے سکوں کی سرخی چرا کر بخشدی۔ لیکن اپنا سکون اور وہ مطمئن نیند میں اس پہلے ہی دن کھو آیا تھا۔ جب پہلی بار ۳۵ ہزار کا درآمدی لائسنس ۴۵ ہزار میں بیچ کر دس ہزار کے نوٹوں سے میں نے جیبیں بھاری کرلی تھیں اور جب زندگی میں سب سے پہلی بار میرے انگ انگ میں مسرت کی لہر دوڑی تھی، کھوکھلی مسرت! تب اس شب دیر تک مجھے نیند نہ آسکی تھی۔ اور میں یہ سمجھا تھا آج کی حاصل کردہ خوشی مجھے سونے نہ دے گی ..... تب میں زندگی میں پہلی بار اپنے دوستوں سمیت بار میں پہنچا تھا ——— اس دن کے بعد سے آج کی رات تک میں بہت ہی کم سو پایا ہوں"۔

اس نے چاہا وہ سب کچھ اپنی بیوی سے کہدے۔ جو مستقل اس کے ذہن میں رہ رہ کر ہجوم کر رہا تھا۔ لیکن وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا۔

اس نے نیا سگار اٹھا کر سلگایا اور فضا میں دھواں بکھیر دیا۔ نیلگوں پینٹ سے رنگی ہوئی بیڈروم کی دیواروں کو اپنے پس منظر میں لئے ہوئے دھواں ایک عجیب رنگ کو جنم دے رہا تھا۔ تب وہ اٹھا اور اپنے صدیوں سے دکھے ہوئے بدن کو اکڑا کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے میں آراستہ ریشمیں نیلگوں حریری پردے اس کے پیچھے ہوا کے مدھر دوش پر دھیمے دھیمے لہرانے لگے۔

ہلکی ہلکی خنکی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی گرم فضا سے نکل کر اب اس ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی پھیلا دی۔ چاند کی دودھیا نرم نرم روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور نچلی منزل کے سامنے خوشنما باغ کی سیمیں روشوں سے ذرا ہٹ کر ہری ہری کیاریوں میں سرخ سرخ گلابوں کی ادھ کھلی کلیوں پر چاندنی اپنی کرنوں کا حسین سا رقص پیش کر رہی تھی۔ ہر چیز میں حسن تھا اور بلاوا ——— لیکن وہ فطرت کی ان تمام رنگینیوں سے بے خبر اپنے گنجان خیالات کے لامتناہی سلسلہ میں گم تھا ...... یہاں تک کہ جب اس خنکی سے سردی کی ایک دھیمی سی لہر اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ تو جانے وہ کس خیال سے پلٹ کر کمرے میں پہنچا۔

"کہیں جاگ نہ جائے! اس نے دھیمے سے سرگوشی کی۔ ان طویل نو سالوں کی اس عیش و طرب کی زندگی نے اس کے دماغ میں بلا کی نازکی پھیلا دی ہے اس کی جلد بہت نرم اور حساس ہو گئی ہے۔ کہیں اس خنکی کا اثر نہ قبول کرلے"۔ تب کمرے میں پہنچکر اس نے اپنا گاؤن اپنے شانوں پر پھیلا دیا اور بیڈروم کے کھلے دروازے کو بند کرتا ہوا۔ ہال کوئی میں نکل آیا۔ کٹہرے کے سہارے کھڑے ہو کر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ تکی ہوئی اپنی کہنیوں پر منتقل کر دیا۔

رات کی رانی کی خوشبو میں بسا ہوا ایک معطر سا جھونکا اس کے نتھنوں سے آٹکرایا۔ اس نے ایک بھرپور سانس لیکر ساری خوشبو اپنے میں جذب کرلی۔ دور تک باغ کی روشوں پر چاندنی اپنے کو نچھاور کئے دے رہی تھی۔ اور باغ کے بیچوں بیچ سنگ مرمر سے تراشیدہ کیوپڈ کے نازک سے مجسمے سے لگے ہوئے فوارے کے نیچے سلور گرے کلر کے موزیک چپس (CHIPS) چاندنی میں اپنی پوری تابانی سے جگمگا رہے تھے۔ فوارے کے گھیرے میں پڑا ہوا پانی خاموش اور ساکت تھا۔ اچانک پانی کی پرسکون سطح پر اچھل سی ہوئی اور سوئی ہوئی خاموشی ننھی منی ہزار ہا شوخ رنگوں والی مچھلیاں اپنی سیمیں دموں کو ہلاتی ہوئی تیرنے لگیں۔ باغ کے داہنے کونے میں مہندی کی باڑھ سے ملا ہوا بچوں کا جھولا بھی خاموش تھا۔ کائنات سو رہی تھی۔ لیکن وہ تنہا فطرت کی رنگینیوں کے مابین اپنے دل کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو لئے بالکونی میں کٹہرے سے ٹکا کھڑا تھا۔ اس نے سگار کا ایک اور طویل کش لیا اور چاہا سینے سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہی اس کا سارا بوجھ اور خلش نکل جائے۔ جو ان نو سالوں سے مسلسل اس کے دل کو بھینچتی رہی ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

دھوئیں کا بادل اس کے خیالوں کو بڑے ہی پرفن انداز میں بالکل غیر محسوس طریقے پر ماضی کی ان گم گشتہ راہوں پر لے گیا۔ جو اب بالکل اجڑی پڑی تھیں۔

"ہائے! وہ زندگی کیا بری تھی۔ ہم اپنے پرانے دیس میں کونسی ایسی جاگیر چھوڑ کر آئے تھے جو یہاں آکر ہم نے دولتمند بننے کے خواب دیکھے۔ وہ زندگی جیسی کچھ بھی تھی۔ پرسکون، اطمینان بخش تو تھی۔ جب سارا دن اپنی چھوٹی سی دوکان میں گاہکوں کو راضی کرتے کرتے تھک کر جب رات گئے میں گھر لوٹتا تھا۔ تو مجھے کتنی مسرت ہوتی تھی۔ نہ مستقبل کا کوئی غم نہ کوئی فکر ——— کاش میں ان ترغیبوں میں نہ آتا ———"

یکایک یوکلپٹس کی کسی شاخ سے کوئی چمگادڑ اس کے خیالات کے پرسکون سمندر اور فضا کی ہم آہنگی ہیں اپنے پیچھے ایک بے ہنگم سی پھڑپھڑاہٹ کے شور کو جنم دیتی ہوئی سڑک کی دوسری جانب بجلی کے کھمبے کے کسی تار پر جا لٹکی ——

اس کے خیالات بہک گئے اور اب تو وہ بڑے واضح انداز میں ان تمام ترغیبات کو سن رہا تھا جو وقتاً فوقتاً کبھی اپنی بیوی اور کبھی اپنے دیگر رشتہ داروں سے اس مکروہ زندگی میں داخل ہونے کے لئے اسے ملی تھیں۔

"آپ اپنی اس معمولی زندگی سے مطمئن ہیں۔ کیا آپ کو اچھا کھانے اچھا پہننے کی تمنا نہیں؟ آپ ذرا ہاتھ پاؤں تو ماریئے۔ اب بھلا چچا اسلم کا لڑکا ایسا وہاں کون ہزار دو ہزار کما رہا تھا۔ لیکن سب آپ کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تھوڑی بیٹھے رہتے ہیں، یہاں آتے ہی اس نے اپنی قسمت چمکا لی۔ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لاکھوں کا بنگلہ ہے ہزاروں کی کار ہے، ایک اسی پر کیا موقوف۔ رفیعہ خالہ کے داماد ہی کو لیجئے! شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر سب سے جگمگاتی ہوئی دوکان اسی کی ہے ریحانہ کے شوہر ہی کو لیجئے۔ ملک کا ایک متمول ترین تاجر ہے۔ جب کہ وہاں اس کے گھر کی حالت آپ سے کچھ چھپی نہیں تھی۔ پھر آخر ہم سب یہ کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ اور وہ اکثر اپنی بیوی کی ان ترغیبات پر جھنجھلا اٹھتا —— "آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے، کیا میں دوکان پر سارا دن بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ کیا میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا سارا دن تو محنت کرتا ہوں۔ تب پھر ہاتھ پاؤں ہلانے کے کیا معنی ہوتے ہیں" اور پھر بڑی بیزاری سے پوچھتا "کیا تمہارے خیال میں میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا! تو پھر! تمہاری منشا کیا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا!"

اور روبی اپنے خاوند کی اس سادہ لوحی پر کڑھ کر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی بڑے مبہم انداز میں ہمیشہ جملہ اس طرح ختم کر دیتی:

"ہاتھ پاؤں تو آپ بھی ہلاتے ہیں۔ لیکن ذرا —— اب میں خود کیا کہوں آپ خالہ رفیعہ کے داماد سے ملئے تو سہی وہ خود آپ کو اس کا مطلب بتا دیں گے"

اور وہ جھنجھلا کر کہتا "کیا ذرا —— ؟"

عرصہ تک اپنی سادہ لوحی کے سبب وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا دوسرا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

"میاں محمود! تم بیکار اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔ کچھ کما لو اولاد کی بھلائی کے ہی کام آئے گا۔ انسان کو اپنی موجودہ زندگی سے کبھی مطمئن نہ ہونا چاہئے۔ ہر لمحہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔ بھئی ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ جانے کیسے انسان ہو تم بھی! اماں کچھ ہاتھ پیر بھی تو ہلاؤ —— میں تمہاری مدد کو تیار ہوں خالہ رفیعہ کا داماد ایک روز بولا تھا۔ اور پھر وہی ہاتھ پاؤں ہلاؤ —— وہ بھنّا گیا —— اسے ایک ضد سی ہو گئی...... وہ خاموش ہی رہا۔

اور جب ایک روز اپنی بیوی کی تنبیہہ اور رشتہ داروں کے طنزیہ فقروں سے تنگ آ کر اس نے گھنٹوں سر جوڑ کر غور کیا تو اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا۔ لعنت ہو۔ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت پر، لعنت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی...... لیکن وہ اپنے خیالات میں ثابت قدم نہ رہ سکا —— اور پھر ایک روز وہ رفیعہ خالہ کے داماد منوّر علی کے پاس پہنچا۔

"منوّر بھائی! بھئی میں تو اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، آپ صحیح کہتے تھے۔ لیکن اب آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کے سوا کون ہے۔ آپ مجھے بتائیں کونسا دھندہ سودمند ثابت ہوگا۔"

اور منوّر علی مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ایکسپورٹر امپورٹر بن جاؤ —— ایک ہی لائسنس میں قسمت بدل جائے گی۔"

"وہ کیسے منوّر بھائی؟ یہ ایکسپورٹر اور امپورٹر کیا ہوتا ہے؟"

اور تب منوّر علی نے اسے ان تمام باتوں سے باخبر کر دیا۔ اس کی امید بندھائی۔ تمام تجارتی ہتھکنڈے اور گر از بر کرا دیئے۔ مزید کہا:

یار محمود شروع شروع میں ذرا دقت کا سامنا ہوگا۔ لیکن۔ گھبرانا نہیں۔ ذرا ثابت قدمی دکھاؤ —— ایک دفعہ قسمت جاگی سو جاگی!

"اچھا ——" وہ بڑی حیرت سے بولا۔ اور چند ہی دنوں میں فٹ پاتھ سے ملی ہوئی دکان "محمود جنرل اسٹور" کا بورڈ شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر منوّر علی کی دکان کے برابر ہی ایک بڑے سے آفس میں تبدیل ہو گیا "محمود اینڈ سنز ایکسپورٹرس اینڈ امپورٹرس" یہ سب منوّر علی کے اثر و رسوخ سے ہوا تھا۔ اپنے ہی اثر سے اس نے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں محمود کی طرف سے ایک پارٹی دے ڈالی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بین الاقوامی تجارت کا "بڑا صاحب" مدعو تھا۔ اس

پارٹی میں شہر کے سب ہی بڑے تاجر موجود تھے۔ منور علی نے ان تمام مشہور تجار سے محمود کا تعارف کرایا پھر بڑا صاحب منور علی اور محمود تینوں ایک خالی میز پر آ بیٹھے جہاں باتوں باتوں میں منور علی نے بڑے صاحب سے محمود کے لئے کسی لائسنس کی منظوری کا اظہار کر دیا۔ بڑے صاحب اپنے لبوں پر ایک چمکیلی مسکراہٹ لئے ہوئے بولے:

بھئی محمود صاحب! کسی روز دفتر تشریف لائیے۔ بھلا ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے، یہ ناممکن ہے۔ بھئی دوستوں ہی کے کام نہ آسکے تو بیکار ہے۔

تو اس رات منور علی دیر تک اسے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کی بابت بتاتا رہا۔

"بھئی محمود! میں نے ایک پارٹی بھی ڈھونڈلی ہے جو لائسنس دس ہزار کی رقم زیادہ دے کر خرید لے گی۔ اور اس دس ہزار میں سے دو ہزار تم بہتر سمجھ سکتے ہو بڑے صاحب کے ہوں گے اور دو ہزار میرے اور باقی کے تنہا مالک تم ہوگے۔"

تب اچانک شدت سے اسے محسوس ہوا۔ تو گویا ہاتھ پاؤں ہلانے کا مقصد یہ تھا خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ پڑی۔ مہینوں کی عرق ریزی اور گاہکوں کی جھک جھک سے تو نجات ملی اور اگلے روز ہی وہ جانے کتنے ہی مستقبل کے خوش آیند سپنوں کا رنگ لے کے بڑے صاحب کے دفتر پہنچا —— اور پھر مستقل مقبول کی تگ و دو کے بعد اس کے ہاتھ میں منظور شدہ ۳۵ ہزار کا درآمدی لائسنس تھا جسے اس نے منور علی کے ایما پر شیخ ایاز کے ہاتھوں حاصل ہونے کے چند ہی لمحوں بعد ۴۵ ہزار میں بیچ دیا اور یوں اس کالے دھندے سے سب کا حساب بیباق کرنے کے بعد اس کی جیبیں چھ ہزار کے نوٹوں سے بوجھل ہوگئیں۔

خوشی سے بے قابو ہو کر جب وہ گھر پہنچا تو رات گئے تک اسے نیند نہ آسکی۔ ذرا سی محنت سے جب چھ ہزار مل گئے تھے۔ تب کاروبار بڑھنے پر تو وارے نیارے ہی ہو جائیں گے۔ اور شاید یہی خوشی اس کے اور اس کی نیند کے درمیان آہنی دیوار بن کر حائل ہوگئی تھی۔ لیکن خوشی کا غلبہ اسقدر شدید تھا کہ وہ بالکل غیر محسوس طریقے پر نیند اور وہ بھی گزشتہ پرسکون نیند کی اہمیت ہی کو بھلا بیٹھا۔

اچانک پام کے ننھے منے پودوں پر پھدکتی ہوئی ابابیل پھڑپھڑا کر اڑ گئی اور فضا میں ایک وسیع بیضوی دائرے کی شکل میں بڑی تیزی سے چکر لگانے لگی اس پھڑپھڑاہٹ سے اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔ لیکن چند لمحات بعد فضا میں پھر پہلے جیسی ہم آہنگی اور یکسانیت کھل گئی اور پھر وہ تھا —— اور ماضی ....

تب چاندنی میں وہاں بالکونی کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے اسے خیال آیا۔ اور اس شب جب رات اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ وہ زندگی میں سب سے پہلی بار اپنے دوستوں کی معیت میں بار پہنچا تھا تو آتشیں سیال کے چند پیگ حلق میں انڈیلنے کے باوجود بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے دوست اس کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے ہنس رہے تھے۔ اپنے ہر ہر فعل سے اپنی اندرونی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بہت دور —— مستقل یہی سوچے جا رہا تھا۔ کیا یہ سب درست ہے؟ اندر ہی اندر اسے محسوس ہوا ایک بے نام سی خلش اس کا دل اپنی پوری شدت سے مسوس رہی ہے۔ تب وہ بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے گھر چلا آیا۔ ساری خوشی یکلخت ختم ہوگئی —— اور وہ سمجھ نہ سکا آج اتنی رات گزر جانے پر اسے نیند کیوں نہیں آرہی ہے ایک بے نام سا خوف دھیمے دھیمے اس کے سینہ میں سر ابھارنے لگا۔ لیکن اس نے اپنے بڑھتے ہوئے اضطراب اور خوف کو یہ کہہ کر تسکین دے لی۔ آج زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے شاید پرانی زندگی پر اس نئی زندگی کے غلبے کی شدت اور ہزار ہا خوشیاں اسے نہیں سونے دے رہی ہیں —— لیکن یہ اندر ہی اندر کوئی اس کا دل بھینچ رہا ہے پچھلی راتوں سے یہ رات کتنی مختلف ہے! یہ کیسا احساس ہے جو اس کی روح کے گرد تیزی سے چھاتا جا رہا ہے؟

اور جب وہ اپنے مضمحل وجود کو لیکر رات کے تین بجے اپنے بستر پر دراز ہوا۔ تو اسے محسوس ہوا! وہ بہت تھک چکا ہے۔ بہت بوجھل ہو گیا ہے۔ چھ ہزار کے ان نوٹوں نے اپنی پوری قوت سے اسے اپنے نیچے بھینچ لیا ہے اور پھر وہ حقیقت جس کو وہ ہر لمحہ چھپانے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ بڑے واضح انداز میں اس کے سامنے منہ پھیلائے اکڑی ہوئی۔

"محمود —— یہ دھندہ چھوڑ دو!" اس نے اس نشتر چبھونے والے احساس سے فرار پانے کو کسمسا کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن ضمیر کی آواز صدائے بازگشت بنکر اس کے ذہن پر ہتھوڑے برساتی رہی "محمود! یہ تم سب کیا کر رہے ہو؟ یہ زندگی ملمع ہے، دولت کے اس انبار تلے تمہاری حقیقی خوشیاں مدفون ہیں، صرف آج ہی کی رات نہیں۔ تم آنے والی کئی صدیوں تک سکون سے نہ سو سکو گے! بہتر ہے اس ملمع کو اتار دو۔"

لیکن نہ جانے کیسے وہ ضمیر کی آواز کو خوش آئند مستقبل کے ہزاروں دلفریب پر شکوہ محلات کے عقب میں تھپک تھپک کر سلانے میں کامیاب ہوگیا۔

اور نئی زندگی کی دوسری صبح جو طلوع ہوئی تو اس میں اس کے لئے غم کے دبیز دھندلکے تیر رہے تھے۔ اور ہر آنے والی کل کے ساتھ اس کی سابق پرسکون زندگی

بڑھتی ہوئی دولت کی پریشانی اور فکر میں ڈھلتی گئی ــــ راتوں کو اب برائے نام نیند آتی تھی۔ . . . . . اور بڑھتے ہوئے دنوں کے ساتھ کار و بار بھی اپنے شباب کی انتہائی منزلوں کو چھونے لگا ــــ جانے کتنے لاکھوں کے بین الاقوامی تجارت کے لائسنس مان بڑے صاحب کے دفتر سے نکل کر اس کی گود میں سکّوں کی بارش کرتے ہوئے اپنی منزلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اس نے دھیمے سے ایک آہ بھری ــــ گزری ہوئی کل کے کھلے ہوئے، دو سرخ سرخ گلاب چاندنی میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اور سنگ مرمر کے دو فوارے کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ محبت اور حسن کے دیوتا کیوپڈ کے لبوں اور اس کے محبت کے تیر کی انی چاندنی کی دودھیا روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس نے ہر لمحہ ذہن میں ہجوم کرتے ہوئے ان خیالات کی رو سے بغاوت کرنا چاہی۔ وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن یہ کامیابی وقتی تھی۔

"سیٹھ ریاض کی بیوی کسی دن شام کو یہاں آئی تھیں۔ انھیں ہمارے گھر کا معمولی فرنیچر پسند نہیں آیا اور واقعی ہمارا فرنیچر ہے بھی کتنا معمولی، سیٹھ ریاض کا فرنیچر تو آپ نے دیکھا ہے نا!" ایک روز روبی اٹھلاتے ہوئے بولی تھی، لیکن ہلکے ایک ایک لفظ سے اس کی آرزو کا اظہار واضح ہو رہا تھا۔ اور ان الفاظ کے پیچھے لپٹا ہوا روبی کا اشتیاق اور آرزو اس سے مضمر و مستور نہ رہ سکی۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔

"کل ہی چلنا! جس قسم کا فرنیچر چاہو آرڈر دے دینا ــــ"

اور آنے والے ایک ہی ہفتہ میں اس کا بنگلہ چمکتے ہوئے ستھرے ۲۵ ہزار کے فرنیچر سے بھر گیا۔

کھیت کرتی ہوئی چاندنی کے درمیان پام اور یوکلپٹس کے پودوں کے سایہ میں اس نے اپنے ماضی کی ایک اور بھیانک شکل دیکھی ــــ ایک منظر!

اب سے بہت پہلے ــــ جب ایک روز وہ اپنی کمپنی کے دفتر میں بیٹھا ہوا نہ جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ خالہ رفیعہ کا داماد منور علی جو کپڑے کا بہت بڑا بیوپاری ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اپنے ساتھ ایک پستہ قد سیاہ فام اجنبی کو لئے اس کے آراستہ کیبن میں داخل ہوا۔

"اوہ منور بھائی ــــ آیئے ــــ" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس کی نظریں برابر پستہ قد اجنبی کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے اس صورت سے بڑی وحشت محسوس ہوئی ــــ وہ اس اجنبی کے بارے میں قیاس ہی کر رہا تھا کہ منور علی بولا۔

"بھئی محمود ان سے ملو ــــ یہ ہیں مسٹر کریلا والا ــــ میں نے ان کا ذکر تم سے اس دن کیا تھا نا"

اور اس کا دل اس کے پہلو میں بڑی شدت سے دھڑکا ــــ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر کریلا والا" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس تپاک کے پیچھے اس کے تصنّع اور اضطراب کو کریلا والا بھی محسوس کئے بنا نہ رہ سکا۔ چنانچہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور سفاک چہرے پر بلا کی مسرت پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں سیٹھ صاحب! کیا بات؟ آر یو ناٹ فیلنگ ویل ــــ"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں مسٹر کریلا والا ــــ" اسے اپنی بے وقت کی اس کمزوری پر شدید غصہ آیا۔ . . . . . لیکن اگلے ہی لمحہ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اب سے چند روز پہلے جب منور علی نے کریلا والا کا تعارف غائبانہ طور پر اس سے کرایا تھا اس وقت بھی اس کا دل شدت سے دھڑکا تھا۔

"بھئی محمود! یہ کریلا والا بڑا پھرتیلا شخص ہے، بلا کا ذہین اور مکار! اسمگلروں کا شہنشاہ کہلاتا ہے۔ اسقدر چالاک اور اثر و رسوخ کا آدمی ہے کہ پولیس کو بھی شاید ناک چنے چبوا دیئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے جیسے تھک ہار کر پولیس نے اس کی جستجو ہی چھوڑ دی ہے کویت، عدن، گوادر سے لیکر بمبئی کولمبو اور چٹاگانگ تک اس کا جال بچھا ہوا ہے، اس سے معاملہ پکا ہو جائے تو بس وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

اور وہ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات اور ہر لمحہ سرزنش کرتے ہوئے ضمیر کی آواز کو پس پشت ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے منور بھائی، آپ لے آیئے میں تیار ہوں، اور میری تیاری کا کیا سوال آپ نے ہی میری راہ نمائی کی ہے۔ آپ جو ٹھیک سمجھیں وہی کیجئے" اسے اپنی کمزوری کا علم تھا۔ چنانچہ وہ مزید بولا تھا۔ "آپ پہلے ہی سے سودے کی بات پکی کر کے آیئے گا۔ میرے سامنے نہ کیجئے گا"

تب اس رات بھی اسکا ضمیر تڑپا تھا۔ لیکن اب اس نے اس کمبخت ضمیر کو سلانے کا ایک اور کارگر سہارا تلاش کر لیا تھا جب بھی اس کے ضمیر نے سرزنش کی اس نے یہ کہتے ہوئے "جب ساری دنیا ہی مچار سو بیس" کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو ہمیں سچائی اور صداقت کی زندگی بسر کرنے سے کیا حاصل" دو چار پیگ تلخ شراب کے پی کر اسے سلا ڈالا۔

اور اب کریلا والا اس کے سامنے تھا، چوڑی چوڑی مونچھوں والا کریلا والا، جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بلا کی عیاری اور ذہانت ٹپکتی تھی . . . اور وہ اپنے اندرونی ہیجان پر خارجی پھیکی سی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے صرف کریلا والا سے صرف اسی قدر کہہ سکا۔

"کوئی گڑبڑ تو ـــــــ نہ ہوگی؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سیٹھ!" کریلا والا بڑی مکاری سے بولا۔

"تو گویا معاملہ پکا ہوگیا"

"بالکل ـــــ!" تب اس نے منور علی سے رقم کے بارے میں پوچھا اور دراز کھول کر سو سو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں نکال کر کریلا والا کے آگے پھیلا دیں جنہیں اسنے بڑی ہوشیاری سے سمیٹ کر بیگ میں بھر لیا اور بڑی عجلت سے اٹھتے ہوئے بولا "سیٹھ مال دو روز میں پہنچ جاتے گا۔"

اور اس روز کے بعد سے سالوں تک سو سو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں اس کی دراز سے نکل کر کریلا والا کے بیگ میں منتقل ہوتی رہیں۔ اور ان کے عوض اسمگلنگ کا مال اس کے توسط سے مارکیٹ میں پھیلتا رہا۔

ماضی کے اس بھیانک روپ کو دیکھ کر اسے ایک جھرجھری آگئی ـــــ اب تو کریلا والا بھی اپنی تمام مجرمانہ ذہانت کے باوجود اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے : وہ بڑبڑایا۔

اب تو اسے جینے کا ڈھنگ آگیا تھا۔ لیکن ہائے یہ کیسی بے نام سی خلش تھی۔ جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، خوابوں میں، ہر وقت اس کے دل میں کچوکے لگاتی رہتی جوں جوں اس کا بینک بیلنس بڑھتا گیا ایک بوجھ سا اس کے دل پر چڑھتا گیا۔ اور آج اسے پوری شدت سے محسوس ہوا۔ نو سال پہلے کی وہ زندگی کتنی مطمئن تھی جب نہ کوئی فکر تھی نہ کوئی بوجھ ـــــ نہ کوئی خلش ـــ!

"کیا آج کی رات بھی نیند نہ آئے گی!" جیسے وہ اپنے آپ سے بولا،

"سیٹھ محمود! تم نے جس روز سیٹھ کا یہ دم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگایا تھا، اس روز سے آج کی رات تک تم کب سکون سے سو سکے ہو!" اسے محسوس ہوا اسکا ضمیر بڑے طنزیہ انداز میں اسکی ہنسی اڑا رہا ہے . . . . وہ تلملا اٹھا۔

رات کی تاریکی دھیمے دھیمے چند ساعتوں بعد طلوع ہونے والے دن کی مدھم لیکن بتدریج بڑھتی ہوئی روشنی کے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے ستاروں کی سیمیں قندیلیں بجھ رہی تھیں۔ اور چاند کی دودھیا روشنی دن کے اجالے کی ہلکی ہلکی سپیدی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ بہت بوجھل تھا۔ مضمحل سا وہ دھیمے دھیمے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ اس کی بیوی بڑے اطمینان سے سو رہی تھی یکایک بیوی کے اس اطمینان سے اسے اپنے اندر حسد کا جذبہ زور پکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ اطمینان مجھے کیوں میسر نہیں! ہائے! آہ!! مقدر کی تو ریت نرالی ہے جس نے مجھے گناہ کی زندگی کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی۔ وہ خود میری بیوی کتنے اطمینان سے سو رہی ہے" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور گاؤن اتار کر اپنے تھکے ہوئے نڈھال مضمحل دکھے ہوئے وجود کو بستر پر گرا دیا۔ پھر دھیمے سے بستر سے لگی الماری سے وسکی نکالی۔ دو تین پیگ پیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

اگلی صبح جو طلوع ہوئی تو وہ دیر تک سوتا رہا دس بجے کے قریب جب مشرقی کھڑکیوں کے سرکے ہوئے ریشمین پردوں کے پیچھے شیشوں سے چھن چھن کر سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر ناچنے لگیں تو ان کی ہلکی ہلکی حدت سے اس کی آنکھ کھل گئی ـــــ اس نے اٹھ کر گھنٹی بجائی۔ دس منٹ کے اندر ہی اندر ملازم ناشتہ کی گاڑی ڈھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گول تکیئے سے اپنی پشت ٹیک کر لیٹے ہی لیٹے بیڈ ٹی پی اور تھوڑی دیر تک خمار آلود نظروں سے ادھر ادھر بالکل خالی الذہن دیکھتے رہنے کے بعد سامنے کھڑے ہوئے نوکر سے انتہائی مختصر سی بات کی:

"اخبار ـــ"

اور جب اس نے اخبار کا پہلا ہی صفحہ دیکھا تو اس کی نظروں کے سامنے دبیز دھندلکے پھیل گئے۔ اور بوجھ کی ایک ذہنی چادر اس کے سر پر جیسے دھم سے آن پڑی۔ ناجائز املاک کا ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں ایک دن اور چند ساعتیں ہی رہ گئی تھیں۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھا اور فون کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی کمپنی کے مینیجر کو گزشتہ ریکارڈ اور معتبر اسٹاف لیکر جلد سے جلد بنگلے پر پہنچنے کی تاکید کی پھر اٹھ کر پرائیویٹ روم میں گیا۔ دروازہ بند کرکے اپنی سیف کا خفیہ خانہ کھولا اور اسمگلنگ اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ تمام دولت کے ریکارڈ نکالے اور ڈرائنگ روم میں آکر انھیں تپائی پر پھیلا دیا۔

باتھ روم میں جاکر اس نے اپنے مضمحل اور جلے ہوئے جسم کو "شاور" کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کے نیچے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کے پڑتے ہی اس کے جسم میں پے درپے کئی جھرجھریاں آگئیں اور اسے محسوس ہوا۔ اس جسم کی گرمی کے لئے تو برف کی ٹھنڈک بھی ناکافی ہے ..... اب سے نو سال پہلے تو اتنے دن چڑھے تک تو وہ اپنی دکان میں ہوا کرتا تھا "کیا زندگی ہے یہ بھی! ــــ کتنی بے قاعدہ کتنی بے ربط، نہ کوئی خوشی نہ کوئی مسرت" رہ رہ کر ایک پھانس سی دل میں کھٹکنے لگی ہے ...... !" وہ بڑبڑانے لگا

*

"مینیجر!" وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے زور سے بولا اور مینیجر عجیب اضطراری انداز میں یکلخت اٹینشن ہو گیا۔

"یس سر!"

"کپڑے کی چور بازاری سے حاصل کردہ رقم کا پورا پورا اندراج ڈکلریشن فارم میں ضروری ہے" وہ ڈکلریشن فارم مینیجر کی جانب اچھالتے ہوئے بولا۔ اور مینیجر اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ رہ گیا، کپڑے کی چور بازاری اسقدر منظم اور خفیہ طریقے پر ہوئی تھی کہ قیامت تک حکومت کو اس کی خبر نہ ہو سکتی تھی، لیکن .....

"لیکن سیٹھ صاحب ...... وہ ...... وہ تو ...... اس کا سر چکرایا۔ وہ کچھ بھی تو نہ بول سکا۔

"مینیجر! ــــ ناجائز ذریعوں سے حاصل کی ہوئی ہر رقم کا پورا پورا اندراج ضروری ہے، میں تمہارا مطلب سمجھ گیا، لیکن یہ میرا حکم ہے! ناجائز و ناجائز ذریعے سے حاصل کی ہوئی ایک پائی بھی حساب سے نہ بچنے پائے ......" وہ سانس لینے کو رکا......

"مینیجر! ایسی دولت لے کر میں کیا کروں گا..... ! مجھے سکون چاہئے۔ مجھے نیند اور اطمنان چاہئے" وہ تقریباً چیخا ــــ

"لو ــــ یہ لو ــــ! یہ وہ باقی حسابات اور لین دین کے کاغذات ہیں جن کی ہوا تم لوگوں کو بھی نہ لگی ہو گی"

اس کا پورا دفتری عملہ سے یوں گھور رہا تھا۔ جیسے اسے اس کے دماغی توازن کے بارے میں شک ہو لیکا یک اس کی آواز گونجی۔

"مینیجر! جب میں یہاں آیا تھا ــــ لکھو! تو تین کپڑے سے تھا، یہ سب کچھ جو تم سب دیکھ رہے ہو، چور بازاری اور کالے دھندے کا دیا ہوا۔ لکھو کہ اب میری بیوی کے پاس ساڑھے سات سو تولے سونے کا زیور ہے، پچھتر ہزار کا فرنیچر اور ہزاروں کی کار ہے۔ ڈھائی لاکھ کا یہ بنگلہ۔ اور یہ بھی درج کرنا بھولنا کہ میرا بینک بیلنس ستر لاکھ سے کم نہیں ــــ جس پر مختلف طریقوں سے انکم ٹیکس کی ایک پائی بھی نہیں دی گئی ہے۔"

اور اس کا مینیجر اسے یوں گھور رہا تھا۔ جیسے کوئی ننھا سا بچہ کسی بڑے آدمی کو بڑی مدلل گفتگو کرتے دیکھ کر کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ اور وہ خود یوں محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ناجائز آمدنی کا ذکر جوں جوں وہ کرتا جا رہا تھا۔ ایک بوجھ کی ناقابل برداشت ذہنی چادر دھیمے دھیمے اس کے سر سے اترتی جا رہی، جیسے وہ ان طویل نو سالوں میں ضمیر کی کشمکش سے پیچھا چھڑا کر بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنے اوپر رکھے ہوئے تھا۔

*

سال کی آخری رات تھی ــــ!

اور جب اب سے چند ساعتوں بعد زمین کے پر نم کناروں کو چومتی ہوئی، افق کے قرمزی دریچوں سے جھانکتی ہوئی جو نئے سال کی پہلی سحر طلوع ہو گی تو اس کے جلو میں ــــ اس نے سوچا ــــ زندگی کے کتنے ہی نئے اور دل آویز رنگ ہوں گے!

شب کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آنے والے آدھے گھنٹے بعد ڈکلریشن فارم بھرنے کی معینہ مدت ختم ہو جائے گی، پورا شہر سکوت اور خاموشی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا، فضا میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ اور روشنیوں کے اس شہر کی تمام روشنیاں جھلملا کر ایک ایک کر کے خاموش ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انکم ٹیکس آفس کے چوراہے پر کھڑا ہوا آٹو میٹک ٹریفک کنٹرولر بھی سر جھکائے کسی سوچ میں غرق کھڑا تھا اس کے منہ سے نکلنے والی رنگ برنگی روشنیاں بھی بہت پہلے ہی سو گئی تھیں۔

ہر شئے سو رہی تھی ـــــ زندگی کے آثار مفقود تھے ـــــ لے دے کر زندگی کی جو کچھ بھی حرارت، چہل اور ہما ہمی تھی، سب کی سب کھنچ کر آج سال کی آخری رات، انکم ٹیکس کے آفس چلی آئی تھی ـــــ دور تک گہرے سناٹے اور چاند کی مدھم دودھیا روشنی میں سڑک کے کنارے دور ـــــ بہت دور ـــــ کاروں کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی۔

جانے سال کے ساتھ ہی لوگ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام آلودگیوں کو اتار پھینکنا چاہتے تھے۔

"کیو" میں کھڑے اس پر نیند کا ایک شدید غلبہ آیا، اور اس کی آنکھیں، نیند سے بوجھل آنکھیں، دھیمے دھیمے بند ہونے لگیں، اسے حیرت ہوئی، اتنی شدت سے نیند کی خواہش، اس نے آج سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں محسوس کی، اس کا دل اسے بہت ہلکا محسوس ہوا۔ وہ بڑی بے صبری سے اپنے نمبر کا منتظر تھا ـــــ اور جب اس کا نمبر آیا تو وہ ـــــ عجیب اضطراری انداز میں بجلی کی سرعت سے آگے بڑھا، اپنی تمام جائز اور ناجائز املاک کا جملہ حساب ڈکلریشن فارم کی صورت میں، کاؤنٹر پر پھینکتا ہوا۔ تیزی سے کاروں کی اس لمبی قطار کی طرف بھاگا، جلدی سے گاڑی نکالی اور تیزی سے گھر کی جانب ڈرائیو کرنے لگا۔

"آج کی رات میں سکون اور اطمنان کی نیند تو سو سکوں گا" رات کی سنسان تاریکی میں دھیمی سی مسرت سے اس کے لب ہلے۔ اور اسے محسوس ہوا ـــــ شدت سے محسوس ہوا، بوجھ کی وہ ناقابل برداشت چادر اچانک اس کے ذہن اور قلب سے اتر چکی ہے۔ . . . . وہ اپنے کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا ـــــ بہت ہلکا ـــــ روئی کے نرم نرم گالوں کی طرح ـــــ یا فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھیمے دھیمے گرتے ہوئے برف کے بے وزن گالوں کی طرح ـــــ بہت ہلکا ـــــ اتنا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے اڑائے جا سکتا ہے۔

"آج کی رات دوسری راتوں سے کتنی مختلف ہوگی ـــ"

سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے برقی کھمبوں کی روشنی کے سائے تلے وہ کار ڈرائیو کرتا رہا ـــــ اور اسے شدت سے محسوس ہوا ـــــ نوسال تک گناہ کی زندگی کے نشیب میں پستے پستے ـــــ اسے جیسے ایک بار پھر، گھناؤنی تاریکی میں بھٹکتے بھٹکتے ـــــ اچانک منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں ـــ! چمکیلے، صاف اور واضح ـــــ منزل کے نشان ـــــ!!!

فن:

پاکستانی مصوّروں کی نئی تخلیقات

جلال الدین احمد

مصوری کی دوسری قومی نمائش، جو پچھلے دنوں کراچی کے فن دوست حلقوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے، کئی اعتبار سے اہم اور دلچسپ تھی۔ یہ جنوری کے آخری ہفتے میں شروع ہوئی اور پندرہ دن کے عرصے میں کم وبیش بائیس ہزار آدمیوں نے اسے دیکھا۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچوں کی معتدبہ تعداد بھی شامل تھی، خاص طور سے اسکول اور کالج جانے والے لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی کلاسوں سے فارغ ہوتے ہی نمائش میں موجود مصوروں پر سوالات کی بوچھار کیا کرتے: آپ خود کس طرح پینٹ کرتے ہیں، آپ کے فلاں معاصر کے موضوعات اتنے مبہم کیوں ہوتے ہیں۔ یورپ کے فلاں مصور کی کیا خصوصیت ہے، آپ بجائے اس طرز کے کسی اور ٹکنیک میں طبع آزمائی کیوں نہیں کرتے۔ اور سب سے دلچسپ بلکہ نازک مرحلہ وہ ہوتا جب کسی تصویر پر آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اور اس پر جارحانہ تنقید کرتے ہوئے وہ پیچھے مڑکر دیکھتے اور اس تصویر کے ذہنی خالق کو بہ نفسِ نفیس اپنے قریب کھڑے اس تنقید سے لطف اندوز ہوتا دیکھکر گھبرا جاتے۔ اور پھر مصور کے اصرار پر اپنی بحث جاری رکھتے، اور مصور خود بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

یہ مصوری کی دوسری قومی نمائش تھی۔ سالانہ نمائشوں کا یہ سلسلہ پاکستان آرٹس کونسل، کراچی نے شروع کیا ہے، اور اس سلسلے کی پہلی نمائش اگست ۱۹۵۷ء میں کراچی کے فریئر ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس نمائش میں بھی پاکستان کے تمام فنکاروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور پورے ملک سے تقریباً سو مصوروں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ پہلا موقع تھا جب کہ کراچی میں ہمعصر پاکستانی مصوروں کے شاہکار یکجا کئے گئے تھے، اس لئے نمائش کے کارکنوں، اور عام دیکھنے والوں، دونوں کا رویہ ناقدانہ کم، اور توصیفی و مربیانہ زیادہ تھا۔ یہی بہت تھا کہ سارے ملک کے مصوروں کی تخلیقات جمع کر دی گئی تھیں اور اس سے زیادہ توقعات وابستہ کرنے کی نہ ضرورت تھی، نہ اس کا موقع تھا۔

البتہ اس سال دوسری نمائش کی بات ذرا مختلف تھی، اس دفعہ منتظمین بھی خود احتسابی پر آمادہ تھے اور طے یہ کیا گیا کہ مصوروں کا نیا کام نمائش کے لئے منتخب کیا جائے۔ پچھلی نمائش کے موقع پر تو فنکاروں کو دعوت دی گئی تھی کہ گذشتہ کئی سالوں میں انہوں نے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس میں اپنی پسند کے مطابق جو تصاویر چاہیں انتخاب کر کے پیش کریں۔ اس سال کمیٹی نے نمائش میں حصہ لینے والے مصوروں کو اشارتاً یہ واضح کر دیا تھا کہ صرف تازہ تخلیقات ہی نمائش میں شریک کی جائیں گی۔ اور اس طرح وہ تمام شاہکار جو گذشتہ نمائشوں میں پیش کئے جا چکے تھے اس دفعہ شامل نہ ہو سکتے تھے۔ اس پابندی کے باوجود بھی نوے فن کاروں نے چار سو سے زیادہ تصویریں نمائش کے لئے بھیجیں۔ یہ امر بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آرٹ کی تحریک ملک میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

ان تصاویر میں سے بیشتر نئی تھیں۔ خصوصاً مشرقی پاکستان سے جتنی تصاویر بھی نمائش میں شامل ہوئیں ان میں سے ہر ایک کے لئے بلا تخصیص یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ زین العابدین کی بعض آبی تصاویر کا تو رنگ بھی پوری طرح خشک نہ ہوا تھا۔ یہ تصاویر انہوں نے [illegible] میں شرکت کے لئے ڈھاکہ سے کراچی کے ہوائی سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پیشتر مکمل کی تھیں۔ اس طرح یہ نمائش جدید ترین رجحانات کی نمائندہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کے مطالعے سے بہت سے مصوروں کے اسٹائل، ٹکنیک اور موضوع میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر زبیدہ آغا کی نئی تصاویر کے رنگوں میں ایک خوش گوار تازگی ہے جو ان کی جدید تخلیقات کی آرائشی خصوصیت سے

پوری پوری مناسبت رکھتی ہے۔ گل بوٹوں کا سا ماحول اور خالص رنگوں کا استعمال مجموعی تاثر کی بنا پر انہیں یورپی مصور ماتیس MATISSE کے بہت قریب لے آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور تجریدی مصور شاکر علی کی تخلیق "سوسن کی کلیاں" اور "پرسکون زندگی" بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس تصویر میں سوسن کی کلیاں تجریدی پیشکش کے باوجود اپنے فطری خد و خال کے ساتھ نظر آتی ہیں اور ان میں اتنے پر اثر انداز میں رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ ان خوبصورت پھولوں کو توڑنے کے لئے آپ کا بے اختیار دل چاہنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مشہور کہانی میں ایک بلبل نے گلاب کے پھول کی ایک تصویر کو اصل سمجھ کر اس پر اپنی چونچ مار دی تھی۔

نمائش دیکھ کر ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اساتذہ فن نے اس نمائش کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مثلاً چغتائی، فیضی رحمین اور عسکری سرے سے اس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ اللہ بخش البتہ مستثنیات میں سے ہیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصویریں نمائش کے لئے پیش کیں بلکہ انہوں نے نوجوان مصوروں کی ہمت افزائی بھی کی، اور تین انعامات میں سے ایک انعام کھلے مقابلہ میں بھی حاصل کیا۔ وہ بنفس نفیس کراچی تشریف لائے اور نمائش میں ان کی موجودگی نوجوان فن کاروں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔

نوجوان مصوروں نے قدرتی طور پر بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور ان میں سے بعض کی نئی تصاویر حقیقتاً ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، چند نئے نام بھی ہیں جو پہلی دفعہ قومی نمائش میں شریک کئے گئے ہیں۔ مثلاً کراچی کے ایک سولہ سالہ فنکار عشرت علی خاں اور ڈھاکہ کے نتیا گوپال کُندو۔ جو کافی تندہی سے کام کر رہے ہیں اور ان سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرف چند خاص مقبول مصوروں مثلاً اے، ایس، ناگی - اے۔ بی۔ نذیر اور بیلی شاہزادہ نے نمائش کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تخلیقات کا بڑی جلدی میں انتخاب کیا ہے۔ خصوصاً ناگی نے اپنی ایک نسبتاً مقبول لیکن فنی اعتبار سے کافی کمزور تصویر "کپاس چننے والیاں" نمائش میں شامل کر کے اپنے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ ناگی میں اس سے کہیں زیادہ نفیس کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر وہ اپنے انتخاب میں قدرے احتیاط سے کام لیتے تو وہ ناظرین پر اس سے کہیں زیادہ خوشگوار تاثر پیدا کر سکتے تھے۔

لاہور کی مصورات میں عباسی اختر، مریم شاہ (حال مریم حبیب) اور ذکیہ ملک کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رضیہ فیروز کے اسٹائل اور پیرایۂ عمل میں ایک دلکش تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی حالیہ تصاویر تمام تر انگلستان کے مناظر پر مشتمل ہیں، جہاں حال ہی میں انہوں نے کچھ وقت گذارا ہے۔ لیکن ان کنوسوں کو دیکھ کر ان کی آئندہ تخلیقات کے بارے میں خوش آئند توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ کراچی کی ایک ہونہار خاتون طلعت قیوم نے بھی شبیہ نگاری میں ذہانت اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

دو نوجوان مصوروں یعنی محمد کبریا اور اجمل حسین کی تخلیقات دوسروں سے بالکل الگ نظر آتی ہیں۔ حالانکہ دونوں کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے لیکن ایک ڈھاکہ میں کام کرتا ہے اور دوسرا کراچی میں۔ کبریا نے گذشتہ قومی نمائش کی طرح اس سال بھی پہلا انعام حاصل کیا ہے لیکن فنی اعتبار سے ان کا کام اس حد تک مختلف ہے کہ پہلی دفعہ دیکھنے والے کے لئے اس بات کا یقین کرنا مشکل ہے کہ تصویر "تین روحیں" کا خالق۔ خالص مہندسی نقاش۔ وہی آرٹسٹ ہے جس نے گذشتہ نمائش میں ایک "مالن" کا لطیف جذباتی مطالعہ پیش کیا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سال اس کی پیشکش کسی حد تک ماخوذ ہے اور اس کی بناوٹ میں جہاں تہاں یورپین تصاویر کا عکس جھلکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے یہاں اظہار کے بنیادی خلوص کا فقدان ہے۔ اس کے برخلاف یہ خصوصیت اس کی ان تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہے ——— "مالن" کے زمانہ کی سادگی و معصومیت اس کے تازہ شاہکاروں یعنی "معشوق" اور "چھپتیہ" میں بڑی حد تک صوفیانہ انداز میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ تمام خطرات جو صوفیانہ طرز اظہار کے غلو میں مضمر ہیں کبریا کی بعض تخلیقات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی تصاویر "دریا کا گیت" اور "ہریاول میں مچھلیاں" کو ہی لے لیجئے جو بالکل رمزی ہو کر رہ گئی ہیں۔

اجمل حسین کے جو فن پارے نمائش میں پیش کئے گئے ہیں وہ یقینی طور پر اس دور یا مخصوص زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں جس پر اجمل حسین کے دورۂ جاپان کے اثرات کی گہری چھاپ ہے۔ نمائش میں بہت کم ایسی روغنی تصاویر ہیں جو اس قدر معتدل، منظم اور دلنشیں خصوصیات کی حامل ہوں جیسی کہ اجمل حسین کے سادہ مگر بھرپور مطالعوں "خزاں کے رنگ" اور "ایک شبیہ" میں پائی جاتی ہیں۔ "ترتیب اور بالنس" اور

"بیٹھی ہوئی خاتون" خطوط اور رنگوں کی ترتیب کے دو جاندار تجربے ہیں۔

اور بہت سے شاہکاروں کے ساتھ ساتھ ہم امین الاسلام کی تصاویر "عورت اور کبوتر" اور "ساکن کشتیاں" اور قاضی عبدالباسط کے خوشگوار مطالعہ "ماں اور بچہ" سے دوچار ہوتے ہیں جسے ایک خاص انعام دیا گیا ہے۔ کبریا کی طرح یہ دونوں نوجوان مصور بھی ڈھاکہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں معلم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ قمرالحسن اور عبدالرزاق بھی اسی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ اول الذکر کو ان کی آبی رنگوں سے بنی ہوئی تصویر "گھر کے راستے میں" اور ثانی الذکر کو ایک ایچنگ "ایستادہ مجسمہ" کے لئے دو خاص انعامات دیئے گئے۔ جواں سال ہونے باوجود ان کے کام میں ایک طرح کی پختگی موجود ہے، خاص طور پر کندہ کاری میں عبدالرزاق کی مہارت قابلِ رشک ہے۔

نمائش دیکھنے والوں کے ایک گروہ میں سردار محمد کی روغنی تصویر "تعزیہ" اور صادقین کی "خود شبیہ" کے متعلق بڑی دلچسپ بحث تھی۔ صادقین کی مذکورہ تصویر بھی روغنی ہی ہے لیکن اس نے بلیڈ سے کھرچ کر اپنی تصویر کی بناوٹ میں ایک دلچسپ خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ مگر سردار کی تصویر میں رنگوں سے پیوندکاری کا طریقہ بھی دلچسپ ہے۔ صادقین نے اپنی تصویر "آئندہ نسلیں" میں پٹ سن پر روغنی رنگ استعمال کئے ہیں اور اپنی ایک دوسری یک رنگی تشریحی ڈرائنگ "سپیا" میں قلم اور روشنائی سے مدد لی ہے۔

نمائش کی سب سے زیادہ جاذبِ توجہ تصویر (اس میں ذاتی پسند کو زیادہ دخل ہے) زین العابدین کی روشنائی سے بنائی ہوئی ایک لمبوتری تصویر ہے جسے انہوں نے "ترتیب" (کمپوزیشن) کا نام دیا ہے۔ زمانۂ حال کی مصوری کے ایک بالغ نظر مبصر جنہوں نے ملک کے بہت سے ابھرتے ہوئے نوجوان فن کاروں کی معاونت اور ہمت افزائی کی ہے اس نمائش میں موجود تھے اور اس تصویر کے متعلق انہوں نے گہرے ذاتی تاثر کا اظہار کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ "ملاحوں" کا یہ جاندار مطالعہ دیکھ کر وہ مبہوت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کی اس رائے سے شاید ہی کوئی اختلاف کر سکے۔

زین العابدین اپنے ہمراہ پانچ تصاویر اور خاکے لائے تھے جو انہوں نے نمائش کے لئے پیش کئے۔ ان میں سے چار آبی رنگ کے اسکیچ ہیں جو انہوں نے اپنے جانے پہچانے انداز میں تخلیق کئے ہیں لیکن یہ رنگوں اور موقلم کی مدد سے تخلیق کئے ہوئے مطالعے اس تمام سلیقے اور قوتِ حیات کے حامل ہیں جو عابدین کی ۱۹۴۳ء کے قحط والی تصاویر کی جان ہیں۔ عابدین کے بہت سے مداحوں کا یہ خیال ہے کہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کی حیثیت سے انتظامی ذمہ داریوں نے عابدین کی تخلیقی صلاحیتوں پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن اگر وہ ان کی تازہ تخلیقات کو دیکھیں تو انہیں عابدین کے فن میں ایک نئے باب کا آغاز نظر آئے گا۔

یہاں تک تو ہم نے فنکاروں اور ان کی تخلیقات کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ جہاں تک نمائش اور تصاویر کی ترتیب کا تعلق ہے ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر کچھ زیادہ وقت صرف کیا جاتا اور تصویروں کی ترتیب میں زیادہ توجہ سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ مثال کے طور پر جس ہال میں نمائش منعقد ہوئی وہ آرٹ کی نمائشوں کے لئے کوئی موزوں جگہ نہیں ہے۔ یہ اصل میں ایک لکچر ہال ہے جس کا فرش سلامی دار (ڈھلوان) اور نشستیں نیچی نیچی ہیں۔ اور اس میں ایک پلیٹ فارم بھی ہے جو دراصل اسٹیج کے کام آتا ہے۔ بایں ہمہ نمائش کے منتظمین لائقِ ستائش ہیں کہ انہوں نے سلیقہ مندی سے روشنیاں آویزاں کر کے اور بڑے انوکھے انداز میں جگہ جگہ تصاویر کے لئے بورڈ رکھ کر اس ہال کو اپنے مقصد کے مطابق بنا لیا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ کراچی میں اتنی بڑی نمائشیں ترتیب دینے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ موجود نہیں ہے۔

علاوہ ازیں تصویروں کو اسلوب یا موضوع کے لحاظ سے ترتیب دینے کی کوئی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ منظرکشی کے نمونے اور آبی رنگ کی تصاویر کے دوش بدوش روغنی اور رنگین پنسلوں سے بنی ہوئی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مجرد اور غیر معروضی تصاویر کے بالمقابل دیوار پر فطری انداز اور تقریباً فوٹوگرافک طرز کی تصاویر حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔ شاید اس اجتماعِ ضدین سے بھی اتفاقیہ طور پر تقابلی مطالعہ کا موقع فراہم ہو گیا تھا۔ لیکن نمائش دیکھنے والوں میں سے اکثر یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک نہج کی تصویریں یکجا دیکھ سکیں۔

یہ بات بہرحال عام طور پر تسلیم کی گئی کہ یہ نمائش ملک میں موجودہ آرٹ کے نمائندہ نمونوں کی ایک کثیر تعداد کو ایک ہی نظر میں دیکھنے کا نادر موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر ہمارے یہاں کے بہتر نمونوں کو مغربی ممالک کی اس قسم کی نمائشوں میں پیش ہونے والی تصاویر کے ہم پلہ تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی حالیہ نمائش میں پیش ہونے والی تصاویر کا اوسط معیار دنیا کے کسی حصہ میں بنی ہوئی تصاویر سے کسی طرح کم تر نہیں ہے۔

صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان اور جناب نثار محمد خان، صدر پاکستان آرٹس کونسل،
نمائش کے افتتاح کے بعد

قومی مصوری کی نمائش
کراچی

افتتاحی تقریب کے شرکا

نمائش گاہ میں

۱ :

۲ :

۳ :

۴ :

۱ : نیلے پھول : زبیدہ آغا

۲ : ایک برش : اجمل حسین

۳ : سوسن کی للیاں (اسٹل لائف) شاکر علی۔

۴ : معرکہ : سردار محمد

خود شبیہ : عبدالرزاق

خود شبیہ : صادقین

اسٹل لائف : عباسی احمر

عنوان : د لمہ دل

دھلی شام :
استاد الله حسن

گھر کے راستہ میں : قمرالحسن

اس : مرتضی دسر

"کہانی میں مصنف اور قاری کا رشتہ" ـــــــــــ بقیہ صفحہ: (۱۹)

افسانہ گوئی کے ہر دور میں مصنف اور قاری کے اس رشتے کی اہمیت مسلّم رہی ہے اور اثر اندازی اور اثر پذیری کا مشترک عمل مصنف اور قاری کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ممد و معاون رہا ہے۔ اس لئے کہ جب کہانی کہنے اور لکھنے والا یہ سوچتا ہے کہ قاری کو کیا چیز خوش کرتی ہے تو اپنی تخلیق سے پہلے وہ قاری کے تعاون کا طالب ہوتا ہے۔ قاری کا یہ تعاون کبھی مصنف کے لئے ایک ہمدردانہ نظر کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی قاری کو اپنے اوپر وہی ذہنی اور جذباتی کیفیت طاری کرنی پڑتی ہے جس میں ڈوب کر مصنف نے اپنی تخلیق کی ہے۔ کبھی وہ اسی مشترک جذبے کے تحت رومانیت کا پرستار بنتا ہے اور کبھی مثالیت کا دلدادہ اور کبھی اس حقیقت کا جویا جو اسے زندگی میں نہیں، صرف کہانی میں ملتی ہے۔ لیکن مصنف اور قاری کے اس مشترک عمل، مشترک جذبے اور مشترک احساس کو ہم آہنگ ہونے کا ایسا موقع شاید کبھی نہیں ملا، جتنا موجودہ زمانے کے مشترک خارجی، اور داخلی تجربات کے اشتراک اور ہم آہنگی کی بدولت ملا ہے۔

٭

"ہماری تہذیبی جد و جہد" : - - ـــــــــ بقیہ صفحہ: (۴۸)

کہ اس کے بغیر زندگی ایک بلا ہے خوبصورت ہو کہ بدصورت، اسی طرح ادب کی بنیادی قدر تخلیقِ انسانیت ہے کہ جمالِ آدم اسی سے اکتساب نور کرتا ہے اسی کو خیر و حسن کا اتحاد بھی کہتے ہیں: ؎

خدا ساز تھا آذرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

ہمارا اپنا یہی نقطۂ نظر، اپنے کو آدمی بنانے کا کہ ادب ایک آئینۂ شخصیت بھی ہے، اور جمال انسانیت کے نکھارنے کا کہ آذر کی نسبت سے اس شعر میں وہ رشتہ بھی موجود ہے، ہماری اس صحتِ فکر کا ضامن رہا ہے کہ ہم نے ادب کو ادب کے لئے نہیں بلکہ انسان کے لئے تخلیق کیا، اور اسے وہ ادب سکھلایا، جو تہذیب و شائستگی، احترامِ آدمیت، آزادیٔ فکر، تکمیل شخصیت اور آزادیٔ انسان کے اقدار کا حامل رہا ہے، لیکن چونکہ انسانیت حیوانیت کے تصادم میں اور تہذیب بربریت کے تخالف میں بڑھ رہی ہے اس لئے اس تصادم و تخالف میں جب کبھی جہاں کہیں بھی انسانیت اور تہذیب کی قوتوں نے، حیوانیت اور بربریت پر فتح پائی ہے تو ہم نے اس فتح کے گیت گائے ہیں۔ مشرق و مغرب کو اپنے سلام بھیجے ہیں، اور الجزائر کی قومی آزادی کی جد و جہد کا دن منایا ہے۔ یہی ہمارے جنوں کی وہ حکایتِ خونچکاں ہے جسے ہم اپنے خونِ جگر سے رقم کرتے رہے ہیں:

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے!

★

سِندنام کی بستیاں

(مصر، عرب، ہند اور چین میں)

ابوالجلال ندوی

ہمارے اس برصغیر کو جسے اب بھارت اور پاکستان کہا جاتا ہے تقسیم سے پہلے تک ہند، ہندوستان اور انڈیا کہا جاتا تھا۔ مدت ہوئی پنڈت لیکھ رام کا ایک مضمون یا اس کا اقتباس پڑھ چکا ہوں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو ہند، ہندی، ہندو اور ہندوستان کے نام سے گھن محسوس کرنی چاہیئے۔ فارسی لغت نویسوں کے حوالے سے لفظ ہندو کے نہایت بُرے بُرے معانی گنا کر انھوں نے بتایا تھا کہ یہ نام مسلمانوں نے ہم کو توہین کے طور پر عطا کیا ہے۔ ویدوں سے لے کر ست نارائن کی کتھا تک اسلامی دور سے پیشتر کا سارا ہندوستانی لٹریچر ہند، ہندی، ہندو اور ہندوستان سے خالی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد بھارت کے ہندو نیتاؤں نے اپنے حصہ کو "بھارت یعنی انڈیا" کا نام دیا اور ہند اور ہندوستان کے لفظ کو کتابِ آئین سے خارج کر کے پنڈت لیکھ رام کی آتما کو ایک حد تک سنتوش (تسکین) دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو اور ہندی کو زبانوں اور خیالات سے کب کنارے کیا جائے گا۔

ہندوستان اسلام سے پیشتر تاریخ کے معلوم عہد میں کبھی بھی ایک واحد ملک نہیں رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے گاؤ پرست بنو اسرئیل سے تو یہ کہا کہ توبہ کر دو اور اپنے آپ کو سزائے ارتداد کے لئے خوشی خوشی تیار کر لو۔ لیکن بہکانے والے سامری کو فرمایا کہ تیرے لئے یہ ہے کہ لوگوں سے کہا کرے گا کہ لامساس یعنی مجھے چھونا نہیں۔ معلوم نہیں یہ موسوی سراپ[1] برہمنوں پر کیسے آ چکی، برہمن اور پریا میں اتنی ہم جنسی بھی نہیں جتنی دیسی مُنّو، اور تازی گھوڑے میں خیال کی جاتی ہے۔ ہندوستانی آریوں کا تقدس اتنا نازک ہے کہ کسی پریا کا سایہ پڑا اور ساری پوترتا نشٹ ہوگئی۔ جغرافی، لسانی اور نسلی حیثیت سے ہندوستان ہمیشہ مختلف راشٹروں (قوموں) میں بٹا رہا، برہمنوں کے لامساسی مذہب نے کسی ایک بستی کے باشندوں کو بھی گھل مل کر ایک ہونے کی اجازت نہ دی، قبائل کو باہم مدغم ہونے سے روکا اور اس دیس کو کبھی ایک متحد قوم کا دیس ہونے نہیں دیا۔ مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ یہی تھا کہ بنو آدم کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کی کوشش کریں۔ اسلام نیک و بد، مومن و کافر، متقی و گناہ گار کے افتراق کو تو تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ تفرقہ ہمیشہ برقرار رہے بلکہ اصل مقصود ان تفرقوں کو مٹانا ہے۔ نیک و بد کے علاوہ کسی طبقہ وار تقسیم کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ جغرافی، نسلی، لسانی، معاشری کسی قسم کے تفرقہ کا اسلام روادار نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کوشش کی کہ تا امکان ہمالیہ سے راس کماری تک سمندر اور سمندر کے درمیان کو ایک دیس اور یہاں کے دیسیوں کو ایک متحد سماج بنا دیں۔ اس جد و جہد کے سلسلہ میں ادبی اور لسانی فریضہ انجام دیتے ہوئے سارے ملک کو ایک نام ہند عطا کیا۔ اس لئے نہیں کہ عربی تصور میں یہ نام کوئی بُرا مفہوم رکھتا تھا بلکہ اس لئے کہ ان کی زبان میں اس دیس کا یہی نام تھا۔

ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ ایک ملک والے اپنے دیس کو کسی نام سے یاد کرتے تھے اور دوسرے دیس والے اُسے کسی اور نام سے یاد کرتے تھے۔ فارموسا کا ذکر انگریزی اور امریکی خبروں میں اسی نام سے آتا ہے۔ چینی خبروں میں تیوآن کے نام سے اس کا ذکر آتا ہے۔ مصر کو وہاں کے باشندے مصر کہتے ہیں۔ یورپ میں اس ملک کا نام ایجپٹ ہے۔ کیانیوں کے دور میں ایران کا نام ایریانہ تھا۔ مگر اسی دور کے معین کتبے میں اس دیس کا ذکر ماذی کے نام سے ملا ہے۔ عرب کو یورپ والے اب تو عرب کہتے ہیں۔ پہلے مور اور سارا سین کہتے تھے۔ ایرانی لوگ عربوں کو تازی کہتے تھے۔ جناب کے۔ اے۔ نیل کنٹھ شاستری نے اپنی کتاب FOREIGN NOTES ON SOUTH INDIA میں چینی مصنف CHAU JU KUA کا قول نقل کیا ہے کہ "اس دیس[2] میں جب تاشی

---

[1] بد دعا [2] سند

(عرب) لوگ آتے تھے تو لوگ ان کو گھروں سے باہر بٹھاتے تھے۔ اور جداگانہ مکانوں میں ٹھہراتے تھے۔" جس قوم کو ایران والے تازی کہتے تھے چینی نام، اس کا تاشی TA SHI تھا۔ اسی مصنف چاؤ جوکوا کا یہ بیان بھی ہے کہ "TIENTCHU کا ملک TATSIN (عرب) کے ماتحت ہے۔ اس کے تمام حکام کو TATSIN (طاسین) مقرر کرتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ چین والے ملکِ عرب کو طاسین اور یہاں کے باشندوں کو تاشی کہتے تھے۔ عرب والوں کو اپنے بدیسی ناموں ہند، تازی، تاشی اور طاسین کی خبر تھی یا نہیں۔ اس کا ہم کو ابھی تک کوئی علم نہیں ہے۔ عدم علم کو علم عدم باور کرنے کی یورپی ریت کو ہم اپنائیں تو دلیری سے کہہ سکتے ہیں کہ عرب اپنے ان ناموں سے قطعاً واقف نہیں تھے۔ ہندوستان کے قدما اپنے عربی اور ایرانی نام ہندو اور ہند سے اگر ناواقف تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ نام اس دیس کو بغرض توہین دیا گیا تھا۔ فارسی لغت نویسوں کا حوالہ بے جا ہے۔ ہندوستان میں کرستان کا لفظ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں پر جس مطلب کا حامل ہو گیا ہے یا ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں اور یوروپینوں نے "نیٹو" کو جس برے مطلب میں استعمال کیا ہے۔ اس کی دلیل سے کوئی بھی لغت "نیٹو" اور کرستان کو اصلاً برا لفظ نہیں قرار دے سکتا۔ "صلوات" جیسے مقدس لفظ کو صلواتیں سنانے والوں نے جو برا مطلب دے دیا ہے اس کی دلیل سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو لفظ صلواۃ سے گھن کرنی چاہیئے تو اُسے ہم پنڈت لیکھ رام شرما کا ہم دماغ تو مانیں گے۔ مگر اس لفظ کو ہرگز ناپسند نہ کریں گے۔

جس دیس کو عربوں اور ایرانیوں نے ہند یا ہندوستان کا نام دیا اس کا چینی نام TIEN TCHAU تین چاو اور CHEN TOU چن تاؤ تھا۔ کے اے نیل کنٹھا شاستری نے ایک چینی مؤلف PON YONG پون یونگ (۱۲۵ء) کا ایک بیان نقل کیا ہے جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

تین چاؤ کے ملک کو چن تاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ملک HIONG NOU ہیانگ ناؤ کے جنوب مشرق میں کئی ہزار "لی" کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی رسمیں ہیانگ ناؤ کی رسموں جیسی ہیں۔ لیکن یہ دیس پست، مرطوب اور گرم ہے۔ یہ ریاست ایک بڑے دریا کے کنارے واقع ہے۔ یہ لوگ لڑائی کو نکلتے ہیں تو ہاتھیوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ لوگ یوچے YUE TCHE کی بہ نسبت کمزور ہیں۔ مہاتما بدھ کے دھرم کو مانتے ہیں۔ کسی جان کو نہ مارنا اور کسی سے جنگ نہ کرنا ان کا جزو ایمان ہے۔

KAO FOU کوفو (کابل) سے جو کہ YUE TCHE کا دیس ہے۔ ایک شخص جنوب مشرق کو روانہ ہوگا تو مغربی سمندر کے ساحل پر پہونچ جائے گا اور مشرق کو پان کی PAN-KI کے ملک میں پہنچے گا۔ یہ ساری سرزمین CHEN TOU کے ملک میں داخل ہے۔ چن تاؤ میں (پایۂ تخت کے علاوہ) اور کئی ہزار شہر ہیں۔ ہر شہر میں انھوں نے ایک گورنر مقرر کر رکھا ہے۔ (مخصوص علاقہ کے علاوہ) یہاں اور بھی کئی ریاستیں ہیں۔ ہر ریاست میں ایک بادشاہ ہے۔ اگرچہ ان ریاستوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے فرق پائے جاتے ہیں مگر ان سب کو CHEN TOU کہا جاتا ہے۔ آج کل (بظاہر ۱۲۵ء) یہ ریاستیں YUE TCHE کے ماتحت ہیں YUE TCHE نے یہاں کے راجا کو قتل کر کے ایک سردار کو ان لوگوں کا گورنر مقرر کر رکھا ہے۔

اس ملک میں ہاتھی، گینڈا، کچھوا، گھونگھا، سونا، چاندی، تانبا، لوہا، سیسہ، اور ٹین پیدا ہوتا ہے۔ مغربی ساحل سے یہ لوگ TA-TSIN (رومی صوبہ سیریا کا) کے ساتھ تجارتی رابطہ رکھتے ہیں اور یہاں TA-TSIN کی اشیاء ملتی ہیں۔ یہاں عمدہ قسم کے بافتے، اچھی قسم کے اونی قالین، ہر طرح کی خوشبوئیں، شکر، کھانڈ، مرچ، ادرک اور کالا نمک پایا جاتا ہے۔

شہنشاہ HO کے زمانے (۸۹ء تا ۱۰۵ء) میں ان لوگوں نے باج اور ہدیوں کے ساتھ کئی مواقع پر سفارتیں بھیجیں۔ بعد میں مغربی ممالک نے چونکہ بغاوت کر دی تھی اس لئے یہ روابط منقطع ہو گئے۔ پھر شہنشاہ HOUAN کی حکومت کے دوسرے (۱۵۹ء) اور چوتھے (۱۶۱ء) سال وہ دوبارہ دو مواقع پر JE-NAN کے پاس آئے۔

(FOREIGN NOTES ON SOUTH INDIA PP 10-11)

شاستری جی نے توسین میں TA-TSIN کو رومی صوبہ شام قرار دیا ہے۔ لیکن غور سے اس بیان کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد عرب ہے۔ شام ہی مراد ہو تب بھی ہندوستان کے مغربی ساحل سے شام تک کوئی جہاز عدن، مندب اور بحر احمر کے دیگر بندروں سے گزرے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ TIENTCHOU اور CHEN TOU بول کر اہلِ چین پورے ہند کو مراد لیتے تھے۔ لیکن غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ CHEN TOA

نام تھا۔ اس دیس کا جو کابل سے ملا ہوا تھا۔ کابل سے مغربی سمت کو جانے والا سندھ کے علاقہ سے گذرتا تھا۔ چن تاؤ کو ہم سن تاؤ کا لفظ دے کر خیال کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

ہند کی بابت عام خیال ہے کہ اصلی صورت اس کی سندھو تھی۔ ویدک آریوں کے وطن کا ویدک نام سپت سندھو تھا جس کا ترجمہ ہفت آب کیا جا سکتا ہے۔ اس ہفت آب کے پانچ دریا اس دیس میں ہیں جو تقسیم سے پہلے ہند کہلاتا تھا۔ ایک دریا کبھہ یا چینیوں کا کاؤفاؤ اور بہار نابل بدیسی ہو گیا۔ ایک دریا سرستی بے آب ہو کر معدوم ہو گیا۔ اس لئے ہفت آب گھٹ کر پنجاب ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد دو دریا بھارت کو ملے اور تین دریا پاکستان کو ملے۔ اس لئے اب پنجاب کا نام ہی نام رہ گیا۔ سندھو کا مفہوم سنسکرت کے مطابق دریا یا پانی ہے۔ مگر سنسکرت کے علاوہ کسی دوسری آریائی زبان میں ایسا کوئی لفظ اس معنی میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانے میں اس دریا کو جسے اب اٹک یا دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔ مہران رود کہا جاتا تھا۔ ایک دوسرے دریا کو ملتان کے قریب پانچوں دریاؤں کے مشترک سنگم سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ سند رود کہا جاتا تھا۔ اس نام کا عربی ترجمہ وادی سند دسند کو سیراب کرنے والا مختصر ہو کر وادی بنا۔ سندھو یعنے دریا اسی سند رود جیسے کسی قدیم لفظ کا مختصر ہے۔ چن تاؤ کی طرح سند ایک ملک یا ایک قوم کا نام تھا۔ ویدک آریا جب ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے دور دراز ممالک سے یہاں وارد ہوئے تو انھوں نے کسی دریا کا نام سند رود جیسا سنا اور اس دریا کو پھر ہر دریا کو سندھو کہنے لگے۔

سنسکرت ماس کی س جس طرح فارسی ماہ میں ھ بن گئی۔ اسی طرح ایرانی لب ولہجہ میں سندھو کا نام متغیر ہو کر ہندو بن گیا۔ جسے عرب ہند کہتے تھے۔ عبرانی کتاب سفر آستر میں یہی نام ھدو بن کر آیا ہے۔ E. B. HAVELL کے مؤلف THE ARYAN RULE IN INDIA نے بیان کیا ہے کہ ویدک آریا پنجاب میں بستے تھے۔ عہد ابطال میں ان لوگوں نے جمنا اور گنگا کو اپنایا اور اس دیس کو آریہ ورت اور اندو کا نام دیا۔ میرے نزدیک سندھو ہند اور اندو ایک ہی نام کے مختلف العصر اور مختلف الامکنہ تلفظ ہیں۔ ہاول نے بتایا ہے کہ "اندو کے معنی چاند کے ہیں۔ چونکہ یہ جدید آریہ ورت شیو جی کی دھنش (کمان) اور ہلال جیسا تھا۔ اس لئے اسے یہ نام دیا گیا"۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس دیس کا یہ نام اس لئے پڑا ہو کہ یہاں کے قدما خود کو چندربنسی (خاندان قمر سے) سمجھتے تھے۔ یا یہ چاند کے پجاریوں کا دیس تھا۔ اندو کا اصلی مطلب چاند ہے۔ تو سندھو کا بھی قدیم مطلب تقریباً یہی ہونا چاہیئے۔

اندو نام کی سرزمین تو صرف اس دیس میں پائی گئی۔ جو اب بھارت ہے۔ لیکن سند اور ہندو کے نام وادی مہران اور گنگ وجمن کی سرزمین کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مل سکتے ہیں بشرطیکہ ہم پاستان میں مخاہوں سے کام لینا برا نہ سمجھیں۔ ہند نام کے علاقوں سے ہم اس وقت بحث نہیں ہے۔ ذیل میں ہم قاموس اور یاقوت کی معجم البلدان سے چند اسمائے اماکن نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ سند نام کے لوگ کہاں کہاں بستے تھے۔

۱۔ سند	اندلس کے اعمال طلیرہ میں ایک ناحیہ (یاقوت)
۲۔ سند	اندلس کے اقلیم قریش کا ایک شہر (یاقوت)
۳۔ سند	مغرب کی ایک وادی (قاموس)
۴۔ سند	خراساں کے شہر نسا کے نواح میں ابیورد کے قریب ایک بستی (یاقوت)
۵۔ سندبلس	مصر میں ایک جگہ (یاقوت)
۶۔ سندفا	مصر میں ایک شہر (یاقوت)
۷۔ سندیول	مصر میں ایک شہر (قاموس)
۸۔ سندیہ	عراق میں بغداد و انبار کے درمیان ایک بستی (یاقوت)
۹۔ سندیہ	بیابان عرب میں المغیثہ کے پاس ایک پانی (یاقوت)
۱۰۔ سندان	ابو دواد الایادی کے شعر میں ایک وادی (یاقوت)
۱۱۔ سنداد	حیرہ اور الابلہ کے درمیان ایک نہر (یاقوت)
۱۲۔ سندبایا	آذربیجان میں ایک جگہ (یاقوت)

۱۳۔ سندابل　　　　چین کا ایک شہر (یاقوت)

کتابوں کو اگر کھنگالا جائے تو شاید اس فہرست میں اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ سندھ کو عربوں کے فتح کرنے کی وجہ ایک سندھی قوم زُرک نے پیدا کی۔ ایلیٹ نے "تاریخ ہند بقلم مؤرخین ہند" کے ایک ضمیمہ میں کئی کتابوں کے حوالے سے ایسے قبائل اور اماکن کے نام گنائے ہیں جن کی آبادیاں EUXINE کے سواحل پر تھیں اور ان ناموں میں لازمی طور پر کرک یا سند کا نام شریک ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک قدیم مصنف HESYCHIUS نے جو عربوں کے سندھ پر حملہ (سنہ ۷۱۲ء) سے دو سو برس پہلے (چھٹی صدی کے اوائل میں) گذرا صراحت کے ساتھ ان سندھیوں کو ہندوستانی لوگ بتایا ہے ÷

سندیوں | اندلس، مغرب اور خراساں کے سندوں کی قدامت کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بہرحال ایک زمانے میں سند کہلانے والوں کے چند قبائل ان بستیوں میں بستے تھے۔ اسی طرح سندبلس، سندفا اور سندیوں کے ناموں کی قدامت پر بھی کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ لیکن ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے قیصر کے دوسرے خانوادے کے چھوٹے بادشاہ "[illegible]" کے نام کو سندی یا سنتی پڑھا گیا ہے۔ اس بادشاہ کا ہمارے سندھ سے کیا رابطہ ہو سکتا ہے؟ اس رابطہ پر ہم بعد میں غور کریں گے۔ سند اور سندی میں لغوی رابطہ تو ہے خواہ وہی ہی رابطہ ہو اس موقع پر اتنا کہنا کافی ہے کہ ہیروڈوٹس کا قول ہے۔ زمانہ کی طوالت کے دوران میں کوئی بات بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ مصر کے سندیوں کا مصر کے سندی سے تو ضرور کوئی رشتہ ہوگا۔ مگر ہمارے سند کا مصر سے کیا رشتہ! یہی تو ہم کو اور آپ کو سوچنا ہے ÷

سنداد وسنداں | سندیہ نام کی دو جگہیں جو عربی بولنے والے علاقے میں تھیں ان کی بابت ہم نہیں جانتے کہ وہ کب آباد ہوئیں۔ لیکن سنداں کا ذکر چونکہ ابو دواد الایادی کے شعر میں آیا ہے جو حضرت رسولِ خدا کے زمانے سے پہلے گذرا اس لئے سنداں کا زمانہ ایام جاہلیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یاقوت نے کئی جگہوں پر لکھا ہے کہ عراقی عرب شخصی اسما کے آخر میں آن بڑھا کر ان کو مقامات کا نام بنا لیتے تھے۔ سنداں کا مطلب اس قاعدے کے مطابق سندیوں کی بستی ہے۔ سنداں میں جو کہ عراق سے ملے ہوئے عربی بیابان میں واقع تھا، اس جگہ کے بیاباں ہونے سے پہلے سند کہلانے والی ایک قوم کی بستی تھی، سند نام کی کوئی قوم ابو دواد الایادی کے زمانے میں نہ تھی۔ سنداد ایک نہر کا نام تھا، جو کہ حیرہ اور الآبلہ کے درمیان بہتی تھی، اس نہر کے سواحل پر بنو ایاد آباد تھے، خسرو پرویز کے زمانے میں جب بادشاہ حیرہ (نعمان ابن منذر ابن مصور کو دھوکہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور حیرہ کی حکومت پر ایرانیوں نے براہ راست قبضہ کر لیا تو بنو لخم اور بنو ایاد کے غیرت مندوں نے اس علاقے سے ہجرت کر دی اور انقرہ میں جا بسے ایک شاعر الاسود ابن یعفر نے اس پر ایک نظم کہی جس کے چند اشعار پڑھئے:۔

ومن البلیۃ لا اباک انني، 　　تیرا باپ مرے، ایک آفت یہ ہے کہ ساری زمین
ضربت علی الارض بالاسداد 　　اپنے باندھوں سمیت مجھ پر دے ماری گئی۔
لا اھتدی فیھا لمدفع تلعۃ 　　اس کے اندر عراق اور مراد کی سرزمین میں
بین العراق وبین ارض مراد 　　مجھے پانی کا ایک چشمہ نہیں دکھائی دیتا
ماذا اؤمل بعد الِ محرق 　　شاہانِ حیرہ اور بنو ایاد نے اپنی بستیاں
ترکوا منازلھم وبعد ایاد 　　چھوڑ دیں اب میں آرزو کروں تو کا ہے کی
جرت الریاح علی محل دیارھم 　　ان کی بستیوں میں اب دھول اڑتی ہے
فکانما کانوا علی میعاد 　　معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پہلے سے خبر تھی۔
ولقد غنوا فیھا بانعم عیشۃ 　　یہاں وہ بہترین راحت کے ساتھ مدتوں تک ایک
فی ظل ملک ثابت الاوتاد 　　مستحکم حکومت کے سایہ تلے بسر کرتے رہے
فاذا النعیم وکل ما یلھی بہ 　　پھر کیا ہو؟ ہر نعمت اور دلچسپی کی ہر چیز
یوما یصیر الی بلی ونفاد 　　کو ایک نہ ایک دن بوسیدہ ہونا اور چک جانا ہے

اهل الخورنق والسدير وبارق	خورنق، سدیر، بارق اور سنداد
والقصر ذی الشرفات من سنداد	کے قصر ذوالشرفات کے باشندے
حلوا بانقرة يسيل عليهم	انقرہ میں جا بسے ان کے پاس ٹیکریوں
ماء الفرات يجيء من اطواد،	سے بہ کر شیریں دریا کا پانی آتا ہے۔
ارض تخيرها لطيب عيشها	یہ ہے وہ زمین جسکی آرام دہ زندگی کی بنا،
كعب بن مامة وابن ام دؤاد،	پر اُسے کعب بن مامہ اور ابو دواد الایادی
	نے پسند کیا ہے۔

سنداد تھا تو ان دنوں ایک نہر کا نام جس کے ساحل پر ایک قصر ذوالشرفات (اونچی اٹاریوں والا) کھڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ بالکل نابود ہو گیا یا ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس قصر کے بانی اور اس نہر کے پہلے مالک یا کھدوانے والے کا نام تھا۔ چنانچہ یاقوت نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ:-

قال حمزة فی تاريخه وكان	حمزہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ پرانے
قد تملك فی القديم من الفرس	زمانے میں فارس کے بارہ مرزبانوں نے
على مواضع متفرقة من ارض	ارض عرب کے متفرق مواضع میں
العرب ستة عشر مرزبانا۔ منهم[1]	حکومت قائم کرلی تھی۔ ان میں سے
سخت تملك على ارض كندة	ایک سخت تھا اس نے ارض کندہ
وحضرموت وما صاقبها دهرا و	اور حضرموت اور اس کے آس پاس پر
لا ادری فی ای زمان وای	حکومت جمالی تھی مگر مجھے نہیں معلوم کہ
ملك كان - ثم تملك سنداد	یہ کب کا اور کس بادشاہ کے زمانے کا
على عمل سخت وطال مكثه	واقعہ ہے۔ پھر سخت کی عملداری کا
فی الريف حتى بنى فيه ابنية،	مالک سنداد ہوا۔ جس نے ریف میں
وهو صاحب القصر ذو الشرفات،	مدتوں قیام کیا اور عمارتیں تعمیر کیں۔
الذی يقول فيه الاسود بن	اور وہی اس قصر ذوالشرفات والا ہے،
يعفر: والقصر ذی الشرفات من سنداد	جس کا ذکر الاسود بن یعفر نے کیا ہے۔

حمزہ اصفہانی کو سخت اور سنداد کا زمانہ نہیں معلوم لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان دونوں کا زمانہ اس علاقہ پر بنو لخم کی حکومت قائم ہونے اور اس میں بنو ایاد کے آبسنے سے مدتوں قبل گذرا۔ بنو ایاد کے یہاں آبسنے اور بنو لخم کی حکومت کے آغاز ۳۵۰ء سے بہت پہلے سنداد گذرا ہوگا۔ ٹھیک زمانہ دونوں کا کندہ، حضرموت اور حیرہ تا ابلہ کے آثار قدیمہ کے اکتشاف کے بعد ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ سخت و سنداد کو حمزہ نے فارس کے "مرزبان" خیال کیا ہے۔ اسلام سے پیشتر کا ملک فارس بہت وسیع تھا۔ اس میں افغانستان و بلوچستان کے علاوہ کچھ حصہ پنجاب اور سندھ کا بھی شامل تھا۔ سنداد کا نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ایک تو سند ہے دوسرے لفظ کا مطلب سمجھئے:-

آدَّ الشیءُ (ن) یَئِدُّ اَدًّا وآدًا	اید اور آد (مصدر) کے معنی ہیں

---

[1] - اصل میں "وهم" چھپا ہے۔

اشتد وصلب وقوی... الآخ — کڑا ہونا - سخت ہونا - قوی ہونا -

والاَید القوی (اقرب الموارد) — قوت، آدَ قوی ہوا غالب ہوا -

سند آد کے معنی ہیں سندھ کو غلبہ اور تسلط حاصل ہوا - سنداد ایک سندھی فاتح عرب کا نام تھا - سنداد اگرچہ سندھی تھا - مگر غالباً اس کی زبان وہ تھی جسے عراقی عرب بولتے تھے +

سندابل | ۲۶۱ھ سے ۲۷۹ھ (۸۷۴ء، ۸۹۲ء) تک عباسیوں کی طرف سے خراسان میں نصر بن احمد السامانی حکومت کرتا تھا - اس زمانے میں چین میں ایک بادشاہ تھا جس کے پایہ تخت کا نام سندابل بتایا گیا ہے - بادشاہ کے نام کا چینی تلفظ معلوم نہیں عربی نام اس کا قالین ابن الشخیر تھا - اس نے نصر بن احمد کے پاس ایک پیغام بھیجا کہ ایک چینی شہزادی کا نکاح ایک خراسانی شہزادے سے اور ایک خراسانی شہزادی کا ایک چینی شہزادے سے کر دیا جائے - اس پیغام کا جواب لے کر خراسان سے ایک وفد سندابل کو گیا - اس وفد میں ابو دلف مسعر بن مہلہل بھی تھے - ان کے پورے سفرنامے کو ایک قدیم مخطوطہ سے اختصار کے ساتھ الصین کے ذکر میں یاقوت نے نقل کیا ہے - اس نام کے پہلے جزو سند کا چینی تلفظ غالباً CHEN TOU ہوگا - دوسرے لفظ بل کو سمجھنا چاہیئے -

مسعر بن مہلہل تبت ہوتے ہوئے سندابل پہونچا تھا - سندابل پہونچنے سے چند یوم پیشتر ایک مقام قلیب سے گزرا تھا - اس جگہ سے ایک بُت پرست قوم ملی جو پُرانی عربی بولتی تھی، کوئی اور زبان نہیں جانتی تھی - حمیری رسم خط میں لکھتی تھی - ہمارے رسم خط سے ناواقف تھی، اس قوم نے اپنی ایک ریاست بھی قائم کر رکھی تھی - انکا فرمانروا انھیں کے ایک مخصوص بلند خاندان میں سے ہوتا تھا - کسی دوسرے خاندان میں انکی حکومت منتقل نہیں ہوتی تھی، ان کا فرماں روا چین کے فرمانروا سے تحفوں اور ہدیوں کا تبادلہ کرتا تھا - مسعر بن مہلہل کا خیال ہے کہ یہ لوگ اس تبع کی فوج کی یادگار ہیں جس نے ایک زمانے میں چین کو فتح کیا تھا - ایک شاعر قس ابن ساعدہ الایادی مشہور عیسائی واعظ (جو حضرت رسولِ خدا صلعم کی ابتدائے جوانی تک زندہ تھا) کی طرف ایک نظم منسوب ہے - مجھے اس نظم کی بابت شبہ ہے کہ کسی اور نے اُسے اس کی طرف منسوب کر دیا ہے - مگر خیر اُس نے یا اس کی زبان سے کسی اور شاعر نے ہم کو نصیحت کی ہے، وہ ذرا پڑھیئے :-

لاتامنن مکر الزمان فانہ	زمانہ کی دغا سے ہوشیار رہا کرو -
اَوْدیٰ الزمان بشمّر الصباح،	زمانے نے شمّر صباح تک کو ہلاک کر دیا۔
من بعد ملک الصین اصبح ھالکا	حکومت چین حاصل کرنے کے بعد،
اکرم بہ من ھالک مجتاح	وہ مر گیا، یہ مرنے والا کتنا شریف تھا،

ایسے اشعار کی بدولت عرب میں مشہور تھا کہ ایک تبع نے چین تک کو فتح کیا تھا - ابن خلدون کو اس پر اعتراض ہے - وہ یہ کہ ایران سے گذرے بغیر چین تک کسی فوج کی رسائی ممکن نہیں، ایران میں مستحکم حکومتیں تھیں جن کو پامال کرنا تبابعہ کے بس کی بات نہیں تھی - لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۲۱۲ ق.م سے ۳۲۵ ق.م تک - پھر ۲۱۲ء سے ۶۳۸ء تک کی مدت کے علاوہ ایران کی باقی تاریخ افسانہ ہی ہے - پھر یہ ضروری نہیں کہ یہ قوم فاتحانہ ہی چین میں گئی ہو - جنوبی عرب کے باشندے معین، سبا، حضر موت، قتبان وغیرہ نامعلوم زمانے سے تجارت پیشہ تھے اور دور دراز ممالک میں ان کے قافلے جاتے رہتے تھے - سبا کے پرخچے اُڑ گئے - عربی کہانیاں جن کو تفسیر کا درجہ دے دیا گیا ہے - ناقابلِ یقین صورتِ حال بتاتی ہیں - لیکن قرآن پاک میں سیل عرم کے ذکر کے بعد خدا نے فرمایا :-

"اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں چند نمایاں بستیاں حائل کر دی تھیں - اور انھیں (بستیوں) میں سیر مقدر فرما دی تھی - کہ ان میں چند راتیں اور چند دن امن کے ساتھ سیر کرلیا کرو - مگر انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہمارے سفروں کو دراز تر فرما دے (اور یہ کہہ کر) انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا - اس لئے ہم نے ان کو باتیں ہی باتیں بنا دیا، اور ان کے پُرزے پرزے بکھیر دیئے - بے شک اس قصہ میں ہر سہار لینے والے شکر گزار کے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں" (ع ۲ - سورہ سبا)

تباہیٔ سبا کا ٹھیک اور آخری سبب یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کی معاشی خرابی کو سہہ کر اپنے ہی دیس میں جدو جہد کرنے پر دور دراز ممالک میں جا بسنا چاہتا تھا ممکن ہے قلیبؔ میں "پرانی عربی" بولنے اور حمیری رسم خط "لکھنے والی جس قوم سے ابو دلف مسعر بن مہلہل نے ملاقات کی تھی وہ انھیں لوگوں کی نسل سے ہوں جن کا ذکر سورۂ سبا میں آیا ہے یا اس سے بھی پہلے کے ہوں۔ سنداؔبل کو یہ نام ممکن ہے انھیں اہل قلیبؔ نے دیا ہو۔ یمنی ناموں میں سے ایک شرحبیل ہے۔ یہ اس نام کا حجازی تلفظ ہے قدیم یمنی تلفظ شرحبل ہوگا۔ بلؔ کے معنی بابلی زبان میں "آقا" کے ہیں۔ سنداؔبل کے معنی ہیں: سندھی آقا۔ یہ شہر غالباً کسی سندھی آقا نے آباد کیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سندھی آقا ہی وہ شخص ہو جسے عربی کہانی شمر صباح کا نام دیتی ہے۔

پچھلی سطروں میں آپ نے دیکھا سندؔ ایک ایسی قوم کا نام تھا جو اندلس، مغربؔ، عربؔ، ایراؔن، ہندؔ اور چیؔن میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس قوم کو اس نام کی حقیقت پر غور کرنے سے پہلے ایک بار پھر میرے مضمون (مطبوعہ "ماہ نو" استقلال نمبر ۱۹۵۶ء صـ ۲۷ پر) پروفیسر بجاٹ کی ایک عبارت کا ترجمہ دیکھ لیجئے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ:۔

(۱) مصؔر قبل فراعنہ کے مدفنوں میں (۲) فلسطین کی وادیٔ نطوف میں (۳) عراؔق کے تل العبید، (۴) سندھ کے موہن جو دڑو میں،	ایک ہم جنس قوم کی کھوپڑیاں ملی ہیں اور اس جنس کے خالص ترین نمونے عرب کے جزیرہ نما میں پائے جاتے ہیں۔

سندؔ اسی ہمجنس گروہ کا نام تھا۔ ہندؔ اور سندؔ یعنی اس نام کے دیسوں میں بسنے والے قدیم تر لوگوں کی بابت عربوں کا جو تصور تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے:۔

(۱) (الطبری باسنادہ عن ابن اسحاق)	ابن اسحاق (المتوفی ۱۵۰ھ) نے
فنکح کوش بن حام بن نوح قرنبیل	کہا کہ حاؔم بن نوؔح کے فرزند کوؔش نے
ابنۃ تاویل بن ترس بن یافث،	ترؔس بن یافث کی پوتی قرنبیل
بن نوح فولدت الحبشۃ والسند والھند	بنت تاویل سے نکاح کیا جس کی اولاد میں
فیما یزعمون۔ ونکح فوط بن	حبشہ، سندؔ اور ہندؔ ہیں، اور فوطؔ بن
حام بحت بنۃ تاویل بن ترس	حاؔم نے تاویل کی دوسری بیٹی بخت
بن یافث ولدت لہ القبط قبط مصر	سے نکاح کیا۔ جس سے مصر کے قبطی
(ج ۱ صـ ۱۰۱) ویقال ان مصرایم ولد	پیدا ہوئے۔ نیز کہا جاتا ہے، کہ
القبط والبربر وان فوطا	قبط و بربر مصؔر کی اولاد ہیں، اور
سار الی ارض السند والھند	فوطؔ نے ہندؔ و سندؔ کو جا کر آباد کیا
وان اھلھما من ولدہ (ج ۱ صـ ۱۰۲)	وہاں والے اسی کی نسل سے ہیں۔
(۲) (باسنادہ عن ابن عباس) قال	حضرت ابن عباس (المتوفی ۶۸ھ)
العرب والفرس والنبط والھند،	نے کہا عربؔ اور فارسؔ (کے قدما)
والسند والسند من ولد سام بن	اور نبطؔ اور ہندؔ اور سندؔ سب کے
نوح (ج ۱۔ صـ ۱۰۱)	سب ساؔم بن نوح کی نسل سے ہیں۔
(۳) (باسنادہ عن محمد بن السائب	(روایت ابن عباسؔ کے ایک راوی محمد بن السائب
قال الھند والسند بنو توفیر[1]	نے کہا کہ ہندؔ اور سندؔ بیٹے ہیں۔

[1] یونہی چھپا ہے توفیر پڑھیے۔

بن یقطن بن عابر بن شالح
بن ارفخشد بن سام بن
نوح - ج ۱ صفحہ ۱۰۵)

یوفیر (اوفیر) بن یقطن بن عابر
بن شالح بن ارفخشد بن سام بن
نوح کے۔

عربوں کے دو خیال تھے، ایک گروہ ہند و سند کو بنو حام یعنی اہل مصر اور ان کے ہم نسلوں کے ہم رشتہ خیال کرتا تھا۔ دوسرا گروہ ان کو عربوں خصوصاً جنوبی عرب کے باشندوں سبا بن یقطن کا ہم نسل قرار دیتا تھا۔ چونکہ دوسرے قول کی سند حضرت ابن عباس تک منتہی ہوتی ہے۔ اس لئے خالص عربی خیال اسی کو قرار دیا جاسکتا ہے +

بنو حام یعنی مصر و شام کے قدما اور بنو سام یعنی عربوں اور عبرانیوں کے اسلاف دونوں بحر شامی گروہ کی شاخیں ہیں جو یقیناً ایک زمانہ میں نسل واحد رہے ہوں گے۔ بعد میں زمانے کے نامعلوم ادوار میں یہ دونوں دو ہوئے۔ مگر عموماً باہم مدغم بھی ہوتے رہے۔ قدمائے سندھ کا بھی بڑا گروہ اسی بحر شامی نسل کا تھا۔ اب جبکہ ہم کو سند کہلانے والے مصر اور عرب میں بھی مل چکے ہیں تو ہمارے لئے جائز ہو گیا کہ سنسکرت لغت کی بجائے مصر و عرب میں لفظ سند کی حقیقت تلاش کریں +

تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کیجئے کہ ملک سند کا قدیم تر نام اس کے چینی نام CHEN TOU سے ملتا جلتا تھا TOU کو مصری لفظ TA اور TAVI سے مناسبت ہے۔ TA کے معنی ہیں "زمین"۔ مصر کا ایک قدیم نام TAMERU (ارض سیلاب) تھا۔ بحر احمر کے افریقی یا عربی ساحل کو مصر والے PUNT "پونت" اور TA NETER (ارض معبود) کہتے تھے۔ مصر کا ایک نام TAVI تھا۔ جس کا ترجمہ "دو زمینیں" کیا گیا ہے۔ یہی لفظ طویٰ بن کر اس سرزمین کے نام کی حیثیت سے قرآن میں آیا ہے۔ جس میں حضرت موسیٰ پر پہلی وحی نازل ہوئی خدا نے فرمایا "اپنی جوتیاں اُتار دو، تم مقدس وادی طویٰ میں ہو" جس پہاڑ پر یہ وحی نازل ہوئی۔ اس کا ایک قرآنی نام طور سینین (سین کہلانے والوں کا پہاڑ) ہے۔ توراۃ میں ہے کہ بنو اسرائیل "مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا درمیان ہے" پہونچے (خروج ۱۲: ۱) سین کا اصلی مفہوم چاند ہے۔ عراق میں کئی سامی النسل بادشاہ گزرے۔ جن کے ناموں میں سن یا سین کا لفظ ملتا ہے۔ مثلاً نارام سن، ابی سن، دارد سن، سن موبلت وغیرہ +

ایسے ہی ناموں والی قوم کی بدولت جو طور کے پاس وادی طویٰ میں بستی تھی، طور کو طور سینین کہا گیا۔ سرزمین طویٰ کے عبرانی نام مدبر سین کا ترجمہ فرعونی عہد کی مصری میں کیجئے۔ تا سین بن جاتا ہے۔ اور یہ نام ملک عرب کے چینی نام TA TSIN سے ملتا جلتا ہے۔ اس تا سین کا عکس، سین تا چینی زبان میں چن تا د بن کر سند کا نام بن گیا۔ تا سین اور سین تا دونوں کا مطلب ہے "سن" (چاند) کہلانے والوں کا دیس یا چاند کا ملک سین تا تغیر لہجہ کے بعد سنت، سند، ہنت، ہند، ہندو اور اندو (چاند) بنا۔ سند پہلے ملک کا نام تھا۔ پھر قوم کا نام بنا۔ ویدک آریوں نے سندھو کو سندرود، پھر ہر رود کا نام بنا دیا +

اس طویل تحریر کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ وادیٔ سندھ کے قدما جن کی یادگاریں مکتوب مہروں کی شکل میں ہم کو موہن جو دڑو اور ہڑپا وغیرہ مقامات میں ملی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے لئے ایک راہ کھولی جائے۔ سندھی مہریں اس لئے معمّہ بنی ہوئی ہیں کہ ہم نے آج تک اس بات کا خیال نہیں کیا کہ قدمائے سندھ کیا تھے، یورپی شاید دہاید پر ایشیائی روایات کو ختم نہیں کرنا چاہیئے۔ سند ایک ایسی قوم کا نام تھا۔ جو کہ ایران کے ایران ہونے اور ہندوستان کے آریہ ورت ہونے سے پہلے مصر شام، عرب، ایران و سند میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ایک شاخ چین تک میں جا گھسی تھی اور سند ابل کو اس نے آباد کیا تھا۔ یہ لوگ عربوں کے خیال کے مطابق جنوبی عرب میں بسنے والے حضر موت و سبا اور معین اور قتبان کے ہم نسل تھے۔ قدمائے سندھ کے تعلقات عراق عرب کے ساتھ ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر ہم وادیٔ سندھ کی مہروں کو اس زبان میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ جسے عرب کا سندا د بولتا تھا +

سند کی طرح ہند نام کی بستیاں بھی راوی و مہران اور گنگا جمنا کے دیس سے باہر حبش میں عرب میں اور ایران میں دکھا سکتے ہیں۔ اور کبھی موقع ملا تو دکھائیں گے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ وادیٔ سندھ کے نوشتوں کو مسند کی مدد سے سندا د کی زبان میں حل کرنے کی کوشش ناکام نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ اہل علم نے شاید دہاید اور غالباً و اغلباً کے زور سے مفروضات کی جو عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں ہم انھیں کو گھورتے نہ رہیں +

رپورتاژ

قلعہ ملتان کی ایک شام

عارف حجازی

نگار خانہ[1] میں خوب چہل پہل تھی۔ اسکول اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ لیکن ان تمام لوگوں میں جیسے میں ہی ایک اجنبی تھا جس پر اکثر لوگوں کی نگاہیں گھورنے لگتیں اور میں انجان بنا ملتانی مصنوعات اور دلکش تصویری شاہکاروں کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ کبھی کبھار کسی کی شریر نگاہیں مجھے بے چین کر دیتیں اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے دل کی سونی نگری میں ساون کی بہار آفریں گھٹائیں اُمنڈ آئی ہیں۔

بڑی دیر تک نگار خانہ میں گھومتے گھامتے جب باہر نکلا تو اس وقت میری حالت اس تماشائی کی مانند تھی جس نے اپنا سب کچھ کسی کے نذر کر دیا ہو۔ ماحول کی چہل پہل نے پچھلی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد دلا دی تھیں۔ جوانی کی مسکراتی ہوئی صبحیں اور گلابی شامیں، بہت سارے جانے پہچانے لوگ، گاؤں کی معطر فضائیں، کھیت کھلیان، سینکڑوں حسین مناظر، پُر فضا مقامات، ویرانے، وادیاں، غرضیکہ ایسی نجانے کتنی بے شمار یادیں تھیں۔ رسیلے اور شیریں گیت تھے، لوگ تھے اور سحر انگیز صبح اور شامیں تھیں جن کی تفصیل اور بیان کے لئے صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اس وقت قلعہ ملتان کے اُجڑے ہوئے ماحول میں ان تمام بیتی ہوئی باتوں کو یاد کر کے دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور ذہن میں قلعہ ملتان کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ کے رومانی واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔

قلعہ کے اس مقام کا تصور کر کے جہاں آج سے تقریباً ایک صدی قبل سورج دیوتا کے مندر کے علاوہ بہت سی خوب صورت عمارتیں اور عہد قدیم کی یادگاریں تھیں، مجھے ذرا تعجب ہوا اور ارد گرد کا ماحول کچھ عجیب پُر ہول سا معلوم ہونے لگا۔ پھر چلتے چلتے مجھے یونانی تاریخ داں "ایرین" (ARIAN) کے روزنامچے کی چند سطریں یاد آگئیں۔ ۳۲۶ ق۔م میں جب اسکندر نے حملہ کیا تھا تو اس زمانہ میں سورج دیوتا کے مندر کا پجاری قبیلہ ملوئی[2] یہاں حکمراں تھا۔ اسکندر کو اس معرکہ میں بڑی مزاحمت کرنی پڑی تھی۔ اور بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ لیکن قسمت کی یاوری نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا۔

یونانیوں کے حملے کے ایک عرصہ کے بعد کے حالات کے بارے میں کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ آگے چل کر اگر تاریخ کے کچھ حوالے ملتے ہیں تو وہ "چچ نامہ" کا معتبر تذکرہ ہے۔ لیکن قلعہ کے اصل بانی کا آج تک تاریخ میں کہیں سراغ نہ مل سکا۔ وادیٔ سندھ میں جب موئن جو دڑو اور ہڑپا کی تہذیب و تمدن پھل پھول رہا تھا، عالی شان عمارتیں اور انسانی آسائش کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔ اگر اس دور کے آثار اور طرز تعمیر سے قلعہ ملتان کا مقابلہ کیا جائے تو پھر بھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ قلعہ بھی اس دور کی یادگار ہوگا۔ "چچ نامہ" سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے وادیٔ سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت سورج دیوتا کے مندر اور قلعہ ملتان میں خوب چہل پہل تھی۔ جب عربوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو برہمن راجہ نے بھی دفاعی مقابلہ کے لئے قلعہ کی بڑی مضبوط مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ پھر اگلے روز سورج چڑھتے ہی زور شور سے جنگ چھڑ گئی۔ اسی دوران میں ایک شخص نے جان بچا کر قلعہ سے بھاگ نکلنا چاہا تھا کہ عربوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ پھر اسی شخص نے دریا کی جانب قلعہ کی شمالی فصیل کی اس جگہ کا پتہ بتایا جہاں سرنگ آسانی سے کھودی جا سکتی تھی۔ چنانچہ عربوں نے یہاں ایک بہت بڑی سرنگ کھودی اور دو تین دن میں شہر پناہ کی دیوار گر پڑی اور قلعہ پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے حملے کے بعد یہ قلعہ جیسے ہمیشہ کے لئے خونریز جنگوں کا اکھاڑا بن گیا تھا۔ ۱۰۰۵ء میں ابوالفتح داؤد اور لاہور کے راجہ انند پال متحد ہو کر سلطان محمود غزنوی کے خلاف بغاوت کرتے ہی قلعہ ملتان کی تاریخ کا پھر ایک بڑا دردناک دور شروع ہو گیا تھا۔ ابوالفتح کے اتحادی دوست انند پال کو پشاور کے مقام پر غزنوی فوجوں نے شکست دی تو ابوالفتح نے قلعہ ملتان کو اپنا دفاعی مورچہ بنایا۔ لیکن سات دن کے محاصرہ کے بعد غزنوی فوجیں قلعہ پر قابض ہو گئیں۔

۱۔ ایک جدید طرز کی "آرٹ گیلری" (ملتانی مصنوعات۔ مصور شاہکاروں کی نمائش گاہ)　　۲۔ آریہ نسل کا ایک قبیلہ۔

اور پھر تقریباً پونے دو سو سال کے بعد ۱۱۷۵ء میں سلطان معز الدین محمد بن سام (شہاب الدین غوری) نے اس قلعہ پر اپنا پرچم لہرایا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد تاتاریوں نے قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ انھیں جنگوں میں بلبن کا بیٹا محمد شہید ہوا اور اس کے پیر و مرشد حضرت امیر خسرو دہلویؒ کو تاتاریوں نے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اپنی اسیری اور قید و بند کی صعوبتوں کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے حضرت خسروؒ نے اپنے جذبات کا کتنے لطیف انداز میں اظہار کیا ہے۔

من کہ بر سر نمی نہادم گل
بار بر سر نہاد و گفتا ہل

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ہر شئے دنیا کی بے ثباتی کا جیسے ماتم کر رہی تھی۔ اور میرے قدم تنہائی کے احساس سے اور تیزی سے اٹھ رہے تھے قلعہ کے سب سے زیادہ پُر فضا، اونچے، سرسبز، قلعہ بند، ٹیلے کی جنوبی فصیل کے ساتھ ساتھ دو بالاخانے بنے ہوئے نظر آئے جنھیں قریب سے دیکھ کر قدیم طرز تعمیر کی خوبصورتیاں پھر اُجاگر ہو گئیں۔ میں نے پہلے پشتے کے ۱۵ فٹ چوڑے بالاخانے پر چڑھ کر اپنی دوربین سے چاروں طرف دیکھا تو دور دور کے مضافات اور شہر کے خوب صورت منظر کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ گئی۔ شہر سے کوئی چار میل پر دریائے چناب ایک لمبے سفید فیتے کی مانند سبزہ زاروں کے درمیان بل کھاتا ہوا دور بہت دور جیسے نیلگوں خلاؤں میں گھل مل گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس قلعہ کو یوں تو بڑے بڑے فاتحین نے پامال کیا لیکن آج سے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس پہلے تیموری لشکر کے حملہ نے جیسے اس کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا جسے بعد میں مغلوں کے ساڑھے تین سو سالہ دورِ حکومت نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی اسلامی معاشرت، تمدن نے اس گوشہ میں اتنا عروج پایا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی وہاں، بزرگانِ دین نے بھی اپنی برکتوں کے خزانے کھول دیئے تھے۔ آج بھی ان کے مزاروں کو دیکھ کر ان کے جاہ و جلال کا تصور تعظیم و ادب پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے دور سے حضرت پیر بہاء الحق اور شاہ رکنِ عالمؒ کے مزاروں کے گنبدوں کو دیکھ کر دل میں کہا۔ مگر مغل حکومت کے زوال کے بعد ہی جیسے ملتان پر بھی زوال کے بادل چھا گئے تھے۔ جنوری ۱۸۱۸ء میں سکھوں کے اٹھارہ ہزار ٹڈی دل لشکر کا خیال آتے ہی میری نگاہوں کے سامنے اس سب سے بڑی آخری خونریز جنگ کا نقشہ کھنچ گیا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ÷

میں نے بالاخانے پر بیٹھے بیٹھے ایک طائرانہ نظر ڈالی تو یوں معلوم ہوا جیسے نواب خاں مظفر خاں شہید کے دو ہزار جانباز قلعہ کی فصیلوں پر دشمن پر جوابی حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ شہر پناہ کی فصیل پر اسلامی پرچم لہرا رہا ہے۔ ضعیف العمر نواب زرہ بکتر پہنے گھوڑے پر سوار اپنے بہادر سپہ سالاروں کے ہمراہ خود ہر مورچہ کا معائنہ کرتا پھر رہا ہے۔ کہ اتنے میں دشمن کے توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور ادھر قلعہ کے مورچہ بند جانبازوں نے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ 'زمزمہ'[1] توپ کی دل ہلا دینے والی گونج گرج اور دھماکوں سے قلعہ کی دیواریں لرز رہی تھیں، گر رہی تھیں اور نواب کے وفادار بہادر سپاہی ہتھیار پھینکنے کی بجائے جامِ شہادت پی رہے تھے۔ اور نعرۂ تکبیر سے آسمان کا گنبد گونج رہا تھا کہ آناً فاناً دشمن قلعہ میں داخل ہو گیا۔ مگر نواب اور اس کے مٹھی بھر سپاہی ملبے اور دیوار کے کھنڈر کے پیچھے کھڑے ہوئے آخری دم تک لڑتے رہے۔ ان کی زبان پر خدا کا نام تھا اور چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ابھی دشمن بُری طرح گولہ باری کر رہا تھا۔ آخر بڑی دیر تک خونریز جنگ ہونے کے بعد قلعۂ ملتان کا ٹیپو، نواب مظفر خاں اپنے پانچ بیٹوں اور ایک بہادر بیٹی کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ "تاریخ عالم میں اپنی بہادری، حب الوطنی اور قومی و ملی آن بان کی ایک ایسی مثال چھوڑ گیا جسے زمانہ ہمیشہ یاد کرے گا اور خراجِ عقیدت کے پھول چڑھاتا رہے گا۔" میں نے دل میں کہا اور بالاخانہ سے اتر آیا ÷

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ خزاں رسیدہ ماحول میں جیسے بہار کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ صدیوں کے حادثات اور واقعات کی المناک پرچھائیاں کہیں ویرانوں میں کھو گئی تھیں۔ بڑی دیر تک بیسویں صدی کے قلعۂ ملتان میں گھومتے پھرتے وہاں کے چند جدید مقامات۔ کتب خانہ۔ جدید طرز کا کھیلوں کا میدان (اسٹیڈیم) جس میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت سما سکتے ہیں) تیراکی کا تالاب اور پرانے آثاروں میں قلعہ کا بہت بڑا عالی شان دروازہ دیکھنے کے بعد اس طرف نکل آیا جہاں برطانوی شہنشاہیت کی یادگار "چوکونا مینار" کھڑا تھا۔ (جہاں برطانوی سامراج کے دو شاطر ولیم اینڈرسن اور پیٹرک الگزنڈر وانز اگنیو دفن ہیں) ۱۸۴۸ء میں ولیم اینڈرسن اور اگنیو کو سکھوں نے سازش کر کے قتل کروا دیا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد سکھوں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی اور ۱۸۴۹ء میں

---

[1] ("بھنگیوں کی توپ" جو احمد شاہ ابدالی کی یادگار ہے اور آجکل لاہور کی مال روڈ پر نصب ہے)

قلعۂ ملتان پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ جان ڈنلپ نے قلعہ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ حقیقت اُجاگر ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"شہر پناہ کی فصیلوں، اور شہر کے شمال کی جانب نگاہ اُٹھاتے ہی قلعہ کے اندر حصار بند نہایت بلند گڑھی (چھوٹا قلعہ) ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے ۲۰ جنوری کو جب انگریز فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو دیوان مولراج یہیں پناہ گزیں تھا۔ یہ گڑھی بہت اونچے ٹیلے پر ہے۔ جس کے چاروں طرف چالیس اور ستر فٹ اونچی شش پہلو دیواریں حلقہ گیر ہیں۔ شمال مغربی دیوار کوئی دو سو گز لمبی ہے جہاں سے شہر کٹ گیا ہے۔ قلعہ کی بیرونی چٹان فصیل سے ملی ہوئی ایک بیس فٹ گہری اور چالیس فٹ چوڑی کھائی بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ فصیل کے چاروں طرف کوئی تیس برج نما مینار، بالا خانے، حویلیاں، مسجدیں اور ہندوؤں کا قدیم زمانے کا مندر، اور نواب کا محل ہے۔ ان عمارتوں کی خوبصورتی اور طرز تعمیر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ کی گولہ باری سے یہ عمارتیں برباد ہو چکی ہیں۔ قلعہ بندی کے اعتبار سے ہندوستان میں اس قلعہ کا جواب نہیں ملتا جس کا اعتراف ولیم اینڈرسن نے لاہور ریذیڈنٹ کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایسا قلعہ ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا جو اتنا محفوظ، مستحکم ہو اور جس کی فصیلوں پر دفاعی مورچہ بندی کیلئے آٹھ توپخانے بنے ہوئے ہوں۔ اور جہاں زندگی کی تمام ضروریات کا بکثرت ساز و سامان موجود ہو۔"

"یہ کوئی ایک صدی قبل کی کہانی ہے۔ یا محض ڈنلپ کی بڑ" میں نے چوکونے مینار پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔ اور پھر مینار سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا پھر مجھے "بمبئی ٹائمز" کے نامہ نگار اور مشہور تاریخ داں کی وہ تاریخی دستاویز بھی یاد آگئی جس نے قلعہ کی تعریف، دولت اور خوبصورتی کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈنلپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ قلعہ کا آنکھوں دیکھا ماحول پیش کرتے ہوئے "بمبئی ٹائمز" کا نامہ نگار لکھتا ہے:۔

"یہ قلعہ کیا ہے دولت اور اشیائے خورونوش و آسائش کی منڈی ہے۔ جس کے بڑے بڑے گودام اور مال خانے چھتوں تک بھرے پڑے ہیں۔ افیون نمک، گندھک اور معمولی سی معمولی چیزوں سے لیکر چاول، گھی، گندم، چمڑے کے تھیلے، ہمہ اقسام برتن، عمدہ ریشمی کپڑے، شال، قالین، اسلحہ سے بھرے ہوئے تہ خانے اور نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جن کا شمار کرنے کے لئے مہینوں چاہئیں۔ ان استعمال کی اشیا کے علاوہ مجھے سب سے زیادہ اس دولت نے محو حیرت کر دیا ہے جس کی تصویر میرا قلم بھی نہیں کھینچ سکتا۔ اور میں حیران و ششدر کھڑا ہوا سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات سے بھری ہوئی سربمہر ان گنت دیگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کثیر دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں جسے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میرے حواس میرے قابو میں نہ رہے۔"

جان ڈنلپ اور "بمبئی ٹائمز" کے نامہ نگار کے آنکھوں دیکھے تاریخی تذکروں کو سوچ کر مجھے بیٹھے بیٹھے ایک ایک جھرجھری سی آئی۔ اور میں متعجب لگا ہوں سے قلعہ کے ماحول کو دیکھ کر خود حیران و ششدر تھا کہ وہ قلعۂ ملتان جس کے بارے میں ان مشہور تاریخ دانوں نے اپنے جذبات کو تاریخ میں سمویا ہے کیا یہ حقیقت تھی یا محض کوئی قدرتی جادوگری کا تماشہ تھا جسے دیکھ کر یہ تاریخ داں بہک گئے تھے۔ مجھے جیسے ان پر یقین ہی نہیں آیا کیونکہ نہ وہاں قلعہ کی ان عالی شان یادگاروں کے نقوش اُجاگر تھے۔ اور نہ وہ دولت کی فراوانی تھی اور نہ چہل پہل۔ کیونکہ جب ۱۹۴۷ء میں انگریز سامراج اور حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ۴۸ ایکڑ رقبہ میں سوائے ویرانوں، ٹیلوں کے کوئی یہاں کچھ نہ تھا۔ قلعہ کے بچے کچے کھنڈر سنسان پڑے تھے۔ جہاں شب کو گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔[1]

ان تمام باتوں پر تن تنہا سوچ بچار کرنے کے بعد جب میں کمر سیدھی کرتے ہوئے اٹھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زمانہ کے حادثات نے مجھے بھی قلعہ کی طرح کھوکھلا کر دیا ہو۔ میں نے چوکونا مینار پر پھر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر تھکے ماندے مسافر کی طرح چل پڑا۔ قاسم باغ کے معطر ماحول میں قدم رکھتے ہی جیسے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ چاروں طرف لوگوں سے خوب چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ اور جیسے جیسے شام کی گلابی فضائیں باغ کے ہرے بھرے ماحول پر چھا رہی تھیں مستقبل کے زندہ و درخشاں لمحات کا سماں میری نگاہوں کے سامنے کھنچ گیا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر کسی جنت میں آگیا ہوں جہاں طائرانِ خوش الحان کی نغمہ سرائی سے پتہ پتہ سرشار ہے، اور ذرہ ذرہ زندگی کی گوناں گوں خوشیوں سے چمک رہا ہے اور سارا ماحول دیس کی خوشحالی، ترقی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا ہے۔ جن کی مترنم آوازوں میں میرے دل کی دھڑکنیں بھی شامل تھیں۔

---

[1] ۱۹۴۹ء میں (قلعہ کے ویران ٹیلوں اور گڑھوں کو ہموار کر کے اس باغ کی بنیاد رکھی گئی)

ملتان
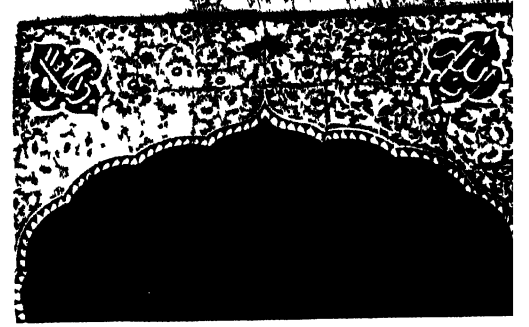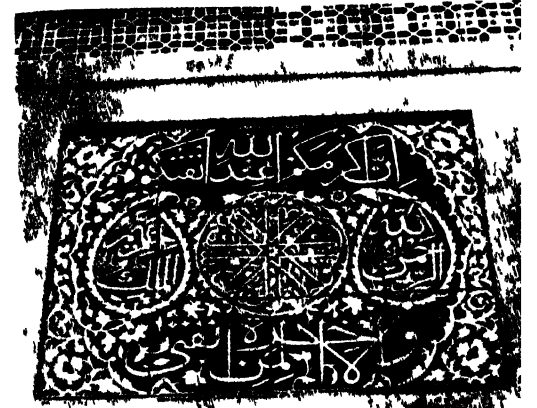
(عظمت رفتہ کی یادگار)

رواں دواں زندگی

بزرگان سلف کے آثار: درگاہ حضرت شاہ رکن عالم رح

شہر تاحد نظر

۱۷

ایک عہد کی تمثیل
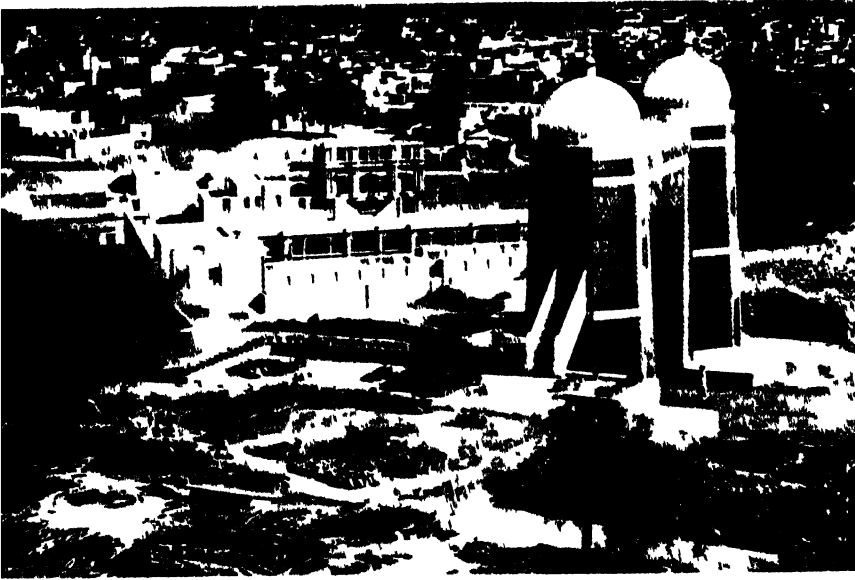
کارخانہ کاغذ سازی (درنا فلی)

پاکستان شاہراہ ترقی پر

کارخانہ کھاد سازی (داؤد خیل)
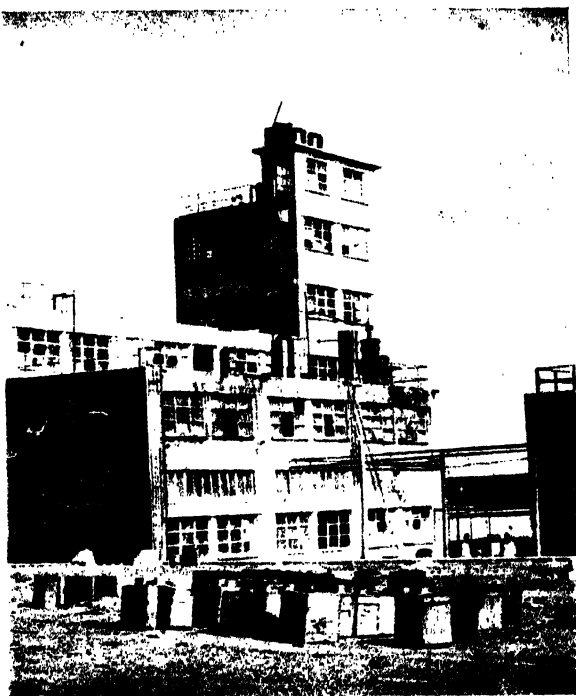
ڈی - ڈی - ٹی فیکٹری (نوشہرہ)

زندگی کی چند جھلکیاں

(ملّی انقلاب کے بعد)

سیّد ضمیر جعفری

زندہ باد اے سات اکتوبر کے ملّی انقلاب — نام ہے تیرا شباب اور کام ہے تیرا شتاب
کھول کر بیٹھے ہیں "اوراقِ طلائی" کی کتاب — "تاجرانِ بے حساب و حاجیانِ بے ثواب"

ایک کے جو چار لیتا تھا وہ اب لاچار ہے!

بھاؤ سٹے کرنے میں وہ لڑنے کی تیاری گئی — بحث گوبھی کی تھی، مولی کھینچ کر ماری گئی
وہ خریداری کہ "مشقِ جرأت پیزاری" گئی — قیمتوں کی سطحِ ناہموار ہموار ہی گئی

تول پورا، بول سچا، نرخ برخوردار ہے!

گھی میں گھبراہٹ نہیں ہے، دودھ میں پانی نہیں — تان کی اب شکل مردانی ہے نسوانی نہیں
ہم نے یہ مانا کہ انڈوں کی فراوانی نہیں — لوگ دیوانے سہی، مرغی تو دیوانی نہیں

ملّتِ بیضا کو انڈا ہی فقط درکار ہے!

تنگ گلیاں کھل گئیں، کٹڑے کا پٹڑا ہو گیا — نقش جو دھندلا تھا رگڑا کھا کے اُجلا ہو گیا
شہر کا نقشہ ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا — ایک ہی کروٹ میں سارا اونٹ سیدھا ہو گیا

ہر دکان شفاف، ہر کُبڑا تھڑا ہموار ہے!

فلم کے دل پھینک موسیقار غائب ہو گئے — وہ لچر اشعار، اونچے پیار غائب ہو گئے
ہیرا پھیری کے وہ رشتہ دار غائب ہو گئے — اس طرح کہ تین میں سے چار غائب ہو گئے

اب "سرِ تسلیم" کے اوپر مزاجِ یار ہے!

پیالیوں میں، تھالیوں میں، جالیوں میں بند ہیں — یعنی سب چیزیں اب ان "گھر والیوں" میں بند ہیں
بدزبانوں کی زبانیں گالیوں میں بند ہیں — لڑنے والے اپنی اپنی پالیوں میں بند ہیں

سنتری ہشیار ہے، فوجی جوان تیار ہے!

اپنی اپنی راہ سے آگاہ پیدل اور سوار　　خم میں خرمستی نہ شیوہ رکٹ میں نخوت کا خمار
ضبط کے پیکر ہیں "فلم و چلم" کے امیدوار　　کتنی سیدھی تیر سے وہ "ڈالڈا" گھی کی قطار
ایک ہی صف میں کلاہ و جبّہ و دستار ہے!

وہ کمیٹی گھر کے "خلوت خانے" والی گاڑیاں　　گھر کا ملبہ شہر میں پھیلانے والی گاڑیاں
خود مہکتی، راہ کو "مہکانے" والی گاڑیاں　　اَدھ موئے بیلوں کے پیچھے گلنے والی گاڑیاں
یہ تماشہ اب سرِ بازار کچھ دشوار ہے!

مغربی چم چم ہے کم کم نازنینوں کے لئے　　عاشقوں نے بھی تحائف مارکینوں کے لئے
"بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کے لئے"　　گھر میں بیٹھے ہیں نہ جانے کن مہینوں کے لئے
چھینٹ پائیدار ہے، نازک مزاجِ یار ہے!

وہ جہازی اشتہاروں میں بنامِ انقلاب　　مولوی گلشیر سے مسجد کے چندے کا حساب
جوگیوں، سنیاسیوں کے نسخہائے لاجواب　　چار آنے میں بڑھاپے سے قیامت تک شباب
اب مگر دیوار کا مقصد فقط دیوار ہے!

نر پناہوں کے جو خفیہ درہم و دینار تھے　　کچھ سمندر بیچ تھے تو کچھ سمندر پار تھے
چور بازاری میں سونے کے محل تیار تھے　　جھوٹ کی گردن میں سچے موتیوں کے ہار تھے
اب یہ سب دولت متاعِ ملّتِ بیدار ہے!

کوئی بندی اب کسی آقا کی آنندی نہیں　　کاشتکاروں کی شکر خندی، شکر قندی نہیں
اب زمینداری بس انسانوں "وَٹ بندی"[1] نہیں　　آبرومندی تو ہے لیکن خداوندی نہیں
جتنا "چورس آدمی" ہے اتنی "مورس کا" ہے!

گندمِ دربند، حجروں سے عیاں ہو جائے گا　　بحر کی ہر لہر پر سونا رواں ہو جائے گا
"کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائے گا"　　یعنی آن اور دَھن "نصیبِ دوستاں" ہو جائے گا
کھیت کیا، عزمِ جواں سے ریت بھی گلزار ہے!

[1] زراعت کی ایک پنجابی اصطلاح۔

★

غزل

فضل احمد کریم فضلی

کج ادا ہے کہ نہیں، برق تپاں ہے کہ نہیں
باوجود اس کے بھی ظالم مری جاں ہے کہ نہیں

دل سے خود پوچھ کہ تو جنسِ گراں ہے کہ نہیں
فکر کیا، کوئی خریدار یہاں ہے کہ نہیں

کیا قیامت ہے کہ ذرّے کا بھی دل ٹوٹ گیا
سوچتا یہ ہوں کہیں جائے اماں ہے کہ نہیں

دل کے اندر ہی سہی منزلِ سلمائے یقیں
بیچ میں مرحلۂ وہم و گماں ہے کہ نہیں

شرم اپنی سرِ مقتل بھی مجھے رکھنی ہے
ذرّہ ذرّہ مری جانب نگراں ہے کہ نہیں

لو مبارک ہو، گری برق، نشیمن اُجڑا
پھر گلستاں میں وہی امن واماں ہے کہ نہیں

تو نے سب کچھ تو بنایا ہے خدایا لیکن
تیری دنیا میں سکونِ دل وجاں ہے کہ نہیں

پاؤں میں کیوں نہ بھلا رقصِ سلاسل ہوتا
ہاتھ میں سلسلۂ زلفِ بُتاں ہے کہ نہیں

ہم نے مانا کہ محبّت ہے مصیبت لیکن
دیکھنا یہ ہے، طبیعت پہ گراں ہے کہ نہیں

میں کچھ اس طرح تری بزم میں چُپ بیٹھا ہوں
کوئی دیکھے تو کہے، منہ میں زباں ہے کہ نہیں

بے وفا ہی سہی لیکن یہ بتاؤ تو سہی
وہ حسیں ہو کہ نہیں، جانِ جہاں ہے کہ نہیں

کتنے ارماں ہیں کہ پامال ہوئے جاتے ہیں
کچھ خبر بھی تجھے اے عمرِ رواں ہے کہ نہیں

یہ سنا ہے کہ غمِ مرگ نہیں جنّت میں
کون جانے کہ غمِ زیست وہاں ہے کہ نہیں

تم نے دو بار کہا ہے جو "نہیں" ہنس ہنس کر
تمہیں انصاف سے کہدو کہ یہ ہاں ہے کہ نہیں

ہر سخن فہم کے دل کو یہی تڑپاتا ہے
یہ جو فضلی ترا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں

غزل

شانُ الحق حقّی

انداز ہیں موسم میں مرے رنگِ غزل کے
آتی ہے تری یاد بڑے بھیس بدل کے

ہاں دورِ زمانہ کوئی پیمانہ بدل کے
اب تک مرے پہلو میں وہی درد ہیں کل کے

خائف نہ ہوں اربابِ خرد اہلِ جنوں سے
وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

پاتے نہیں اب ساز وہ نغمے جو دمِ رقص
گونجے تھے فضا میں ترے قدموں سے نکل کے

اب اور کوئی ذکرِ دل افزا و دل افروز
بیٹھے ہیں زمانے پہ بہت زہر اُگل کے

کچھ اب بھی غنیمت ہیں خیالوں کے اُجالے
بڑھتے چلے جاتے ہیں نگاہوں کے دھندلکے

یاد آنے لگا پھر وہ سکوں تیری گلی کا
پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے

آتے ہیں جہاں سے گل و نسرین کے سندیسے
ہم ڈھونڈنے والے ہیں اسی رنگ محل کے

کچھ آب و ہوا ہی پہ نہیں دل کا گزارہ
نغمے چلے آتے ہیں پہاڑوں سے پگھل کے

مت پوچھ کہ ہستی کے وہ برباد سے لمحے
کیا چیز بنے ہیں مری تخئیل میں ڈھل کے

وہ دل کہ رہا تھا تری قربت میں بھی بے چین
رہ جاتا ہے بارے تری یادوں سے بہل کے

اے دل یہ تبا دہر کے آلام دو روزہ
ہوتے ہیں کہاں گم تری آغوش میں پل کے

ویسے تو وفا سے نہیں دل اب بھی گریزاں
پڑتے ہیں مگر آپ ہی کچھ پاؤں سنبھل کے

کھینچے ہیں قلم سے دلِ پُرخوں کے مرقعے
رکھ دے کوئی ان کاغذی پھولوں کو مسل کے

غزل

تابش دہلوی

مری فغاں نے کیا آشنا جہاں سے مجھے
زیاں ہے سوزِ الم کا مگر فغاں سے مجھے

کیا ہے اہلِ جنونِ طلب نے پس ماندہ
دکھائی کچھ نہ دیا گردِ کارواں سے مجھے

سمجھ رہا ہوں میں بیکاریٔ جنوں کو فریب
بہار کا بھی کچھ اندازہ ہے خزاں سے مجھے

بہت عزیز ہے خطروں کی زندگی صیاد
ہزار برق کی نسبت ہے آشیاں سے مجھے

بوقتِ جلوہ گریٔ بزمِ ناز میں تو نے
حجاب کہہ کے اٹھایا ہے درمیاں سے مجھے

فنائے عشق پہ جیتا ہوں، کوئی خضر نہیں
کہ زندگی نہ ملے عمرِ جاوداں سے مجھے

رہِ طلب سے کچھ اس طرح لُٹ کے آیا ہوں
کہ لوگ جان گئے اہلِ کارواں سے مجھے

یہاں نگاہِ تماشا، وہاں تجلیٔ حسن
بہت حجاب اٹھانے ہیں درمیاں سے مجھے

دل و جگر نہ ہوئے چاک آج بھی تابش
نجات، دیکھئے کب ہو غمِ نہاں سے مجھے

★

عبداللہ خاور

وقت افسانہ ہے، اندازِ بیاں ہیں لمحے
تم ہو عنوان، تغزل کی زباں ہیں لمحے

وقت کے ساز کو تنہائیٔ شب میں توڑوں
تم نہیں ہو، تو اندھیروں کا جہاں ہیں لمحے

وقت رفتار بدلتا ہے مری فکر کے ساتھ
ذہن پر گاہ سبک، گاہ گراں ہیں لمحے

ایک لمحے میں کئی دور سما جاتے ہیں!
یوں تو اک چشمکِ برقِ گذراں ہیں لمحے

شوخیٔ رم کی حسیں یادیں ڈھل جاتے ہیں
شوخ رفتاریٔ جادو نظراں ہیں لمحے

لمسِ گلبرگ کبھی، سنگِ گراں بار کبھی
صلۂ حوصلۂ سود و زیاں ہیں لمحے

یوں چمکتے ہیں مرے ذہن کے ویرانوں میں
جیسے ماضی میں ابھی شعلہ بجاں ہیں لمحے

ناچتے جاتے ہیں صحرائے ابد کو پیہم
کسی دیوانے کے قدموں کے نشاں ہیں لمحے

زمزمے سازِ رگِ جاں پہ مچلنے دو یونہی
ہم کو معلوم ہے شمشیر و سناں ہیں لمحے

غم کی صدیوں کو کیا غرقِ صبوحی، خاور
جاتے جاتے مری جانب نگراں ہیں لمحے

★

غزل

سراج الدین ظفرؔ

دمِ شوق ضبطِ ہوس کس طرح — کریں سنبل و گل سے بس کس طرح
تعاقب میں میخوار ہیں اے بہار — بچے گی تو اب کے برس کس طرح
کوئی قافلہ آرزو کا نہ ہو — نفس میں یہ شورِ جرس کس طرح
تری زلف کو چھو کے حیراں ہوں میں — یہاں تک ہوئی دسترس کس طرح
سمائے ہیں دل میں ہزاروں ختن — کریں ایک آہو پہ بس کس طرح
گھلی جا رہی ہے مری روح میں — کسی کی شمیمِ نفس کس طرح
دکھا مجھکو اے مصرِ جامِ شراب — کہ ہے روح رامیسیس کس طرح
بتا اے مری روح آوارہ خو — تجھے راس آیا قفس کس طرح
سبو کف میں ہے داد کو کھٹکھٹائیں — درِ شہریار و عسس کس طرح
ازل میں تو تھا صفر کا اک عدد — ہوا صفر سے پھر یہ دس کس طرح
کہاں میں کہاں شمع رویانِ شب — شرر سے رہ و رسمِ خس کس طرح
کہاں شیخِ شہر اور کہاں سرِ حق — سرِ عرش پہنچے مگس کس طرح
نہ ہوں زیرِ تحقیق جیتک غزال — نظر ہو کوئی ذو رس کس طرح
گل و مُل نہ ہوتے جو موضوعِ شب — تو باتوں میں آتا یہ رس کس طرح
رہے بزمِ بادہ میں ہم مستعد — کہ نیکی میں ہو پیش و پس کس طرح
ظفرؔ بھی سلامت نہیں عشق سے — یہ اژدر گیا اس کو ڈس کس طرح

ضمیر اظہر

وجد میں رقص کناں، شاد و غزل خواں دیکھا
ہم نے تاروں پہ عجب سحرِ بہاراں دیکھا
چشمِ مشتاق کو سہلاتے ہوئے سبزے میں
رنگِ شادابی و نزہت کو نمایاں دیکھا
کثرتِ لالہ و گل، سرو و سمن کے باعث
جوئے تخئیل میں اک شہرِ نگاراں دیکھا
شاخ در شاخ شگوفوں کے نگینے چمکے
خواب در خواب ستاروں کا چراغاں دیکھا
گم شدہ یاد نے پھر کروٹیں بدلیں دل میں
جھولتے لمحوں میں عکسِ رخِ جاناں دیکھا
حجلۂ ذہن میں خوشبوئے وفا لہرائی
جنسِ الفت کو برنگِ گلِ خنداں دیکھا
گیت ہی گیت تمنّا کے جزیروں سے اٹھے
کیف ہی کیف فضاؤں میں پر افشاں دیکھا
وسعتِ دید بھی کیا طرفہ عطا ہے اظہرؔ
ہم نے ہر رنگ میں سو رنگ کا طوفاں دیکھا

مشرقی پاکستان کے لوک گیت

سیّد امجد علی

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی بیشتر دیہات ہی کی دنیا ہے۔ یہاں کے شہروں تک میں ایک دیہاتی رنگ ہے، قطع نظر ان نئی نویلی بستیوں کے جو جدید ترقیات کی مظہر ہیں لیکن ابھی ماحول میں رچی بسی نہیں۔ دیہات کے ذکر سے مقصد اس ذہنی سکون اور فطرت کے قرب کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس زندگی کی خصوصیت ہے۔ مشرقی پاکستان کے رہنے والے فطرت سے بہت قریب زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرد وپیش کی فطرت بھی اور قلب و روح کی فطرت بھی۔ باوجود سطحی اور جزوی ہنگامہ آرائی کے کاروانِ حیات یہاں اپنے ازلی وقار سے خراماں خراماں گامزن ہے۔ داخلی کیفیات ایسی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ خواہ وہ کنبہ کے افراد کا باہمی لگاؤ ہو یا جوانوں کا والہانہ عشق، خواہ مذہبی جذب وکیف ہو یا رنگین رسومات کی ساحری، خواہ شاعری کا جادو ہو یا نغمہ کا سرور۔ ان داخلی کیفیات میں مشرقی پاکستانی ڈوبا ہوا ہے، ان مواقع کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ دولت یا منصب کے حصول کی کوشش کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ عام شہریوں کی سی ہوس اور خود غرضی اس میں نہیں ہے، جس کے بغیر مادی ترقی ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ وہ تو بس وقت پرستی کرنے کا قائل ہے اور پھر آرام سے محنت کا پھل کھانے کا۔

فطرت کے خارجی جلووں سے تو وہ ہر جگہ دوچار ہے۔ مثلاً وہ بے پناہ بارش جو سال میں آٹھ مہینے موسلا دھار برستی ہے، وہ ذخار دریا گنگا، میگھنا اور برہم پترا جن پر آج تک انسان پُل نہ باندھ سکا اور جن کے معاون ایک روپہلی جال کی طرح ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ انسان حیوان اور نباتات کے قافلے کا سلسلہ پیدائش، افزائش اور موت، جو چشمِ بصیرت کے لئے ہر لمحہ فطرت کے اسرار و رموز اجاگر کر رہا ہے۔ یہ ہیں مشرقی پاکستان کی زندگی کے اہم حقائق جو جزویات پر حاوی ہیں، اور یہاں کے باشندوں کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہوئے ہیں۔ باشندے بھی ایسے جو قدرتاً ذکی اور حساس ہوں۔ پھر جب یہ خیال کیا جائے کہ ان میں اکثر کا کام ہی زمین کی کاشت ہے یعنی قوائے فطرت کو قابو میں لانا یا ان سے تعاون کرنا، تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مشرقی پاکستان والے واقعی قدرت سے بہت قریب ہیں۔

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ان کی تمام زندگی بس جذب وکیف کی ترنگ میں گزرتی ہے۔ حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔ ٹھوس حقیقتوں سے ان کے خواب کی دنیا جابجا الجھ کر پارہ پارہ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ صحیح ہے کہ ان کا دل کیفیات سے لبریز ہے، خواہ وہ خوشی کی ہوں یا غم کی، سرشاری ہو یا سرگرانی، ان کے دل کی دنیا جذبات اور شدید احساسات سے رچی ہوئی ہوتی ہے۔ لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گیت کی شکل میں اظہار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اہلِ عمل جب واقعاتِ زندگی سے متاثر ہوتے ہیں تو کسی اور ہی ڈھب سے اس کا جواب دیتے ہیں، لیکن اہلِ دل کا انداز یہی ہے اور دیکھا جائے تو شدید جذبات کا پورا پورا اظہار عمل میں اتنا نہیں ہو سکتا جتنا فنی تخلیق میں، بالخصوص گیت میں۔ شاید مشرقی پاکستان میں اس مخصوص ردِعمل کی ایک وجہ یہاں کے باشندوں کی غیر معمولی قوتِ اظہار بھی ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہاں والے جس بات سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس کو گیت کی شکل دیدیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس گیتوں کا ایک ایسا خزانہ ہے جو شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔

ہر موقع کا ایک گیت ہے، ہر موسم کا، بلکہ ہر موڈ کا۔ ادبی حلقوں تک جو گیت پہنچتے ہیں وہ تو ایک عشرِ عشیر ہیں ان لاتعداد زمزموں کا جو وہاں کے وادی وکہسار میں گونجتے ہیں، جو وہاں کے کھیتوں اور جنگلوں میں مرتعش ہیں، جو وہاں کے گھروں، بستیوں اور کشتیوں میں جادو جگاتے ہیں۔ ایک آدھی صدی سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ڈاکٹر دنیش چندر اسین نے اس گنج باد آورد کو سمیٹنا شروع کیا اور ان اوراقِ پریشاں کی تدوین و تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ پھر ان کے شاگردِ رشید جناب جسیم الدین نے یہ کام جاری رکھا اور یہ خود آگے چل کر ہمارے نامور عوامی شاعر بنے۔ ان کے بعد کئی اور فاضل ادیبوں اور عالموں نے اس نیک کام میں ہاتھ بٹایا۔ منجملہ اوروں کے مولوی عبد الکریم، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، ڈاکٹر انعام الحق وغیرہ۔ کل کی بات ہے کہ پہلی دفعہ ٹیگور نے شہر والوں کی توجہ ان صوفیانہ گیتوں کی طرف دلائی جو "باول" یا "بول" کہلاتے ہیں اور جن کے گانے والے بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان انمول جواہر پاروں سے لوگ کم واقف تھے۔ جب ٹیگور

نے ان کے متعلق انکشاف کیا کہ "زبان کی سادگی اور فکر کی گہرائی اور بولوں کے رسیلے پن میں ان گیتوں کا دنیائے شعر میں جواب نہیں ہے۔ ان میں علم و عرفان بھی اسی قدر ہے جس قدر شعریت ہے" جب لوگوں کی توجہ ادھر ہوئی تو ایسے گیت کہنے والوں کو ڈھونڈ نکالا اور چند گمنام اور کم معروف لیکن باکمال استادوں کی تو خوب خوب قدر ہوئی جیسے حسن رضا اور پگلا کنائی جو اس صدی کے شروع ہی میں زندہ تھے اور جن کو اہلِ نظر نے ڈھونڈ نکالا لیکن ایسے کتنے ہوں گے۔ قریہ قریہ، دیہات دیہات اپنی دھنیں الاپتے ہوں گے اور دنیا کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے۔ گیتوں کی بہتات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ضلع کے گیت بھی اگر جمع کئے جائیں تو مشکل ایک کتاب میں سما سکیں گے، جیسے میمن سنگھ کے گیتوں کو "میمن سنگھ گیتکا" میں جمع کیا گیا ہے۔ تاہم اس سرسری جائزے میں یہ کوشش کی جائیگی کہ قارئین کو کم از کم ہر گاؤں کی ہر ایک صنف سے متعارف کرا دیا جائے۔

بھٹیالی :

لوک گیتوں میں مقبول ترین بھٹیالی ہے۔ اس کا نام بھاٹ سے مشتق ہے۔ اور یہی لفظ "جوار بھاٹا" میں بھی پایا جاتا ہے جہاں اس کے معنی ہیں پانی کا اترنا' چنانچہ یہ گیت بھی کشتی کھینے والے "مانجھی" جب گاتے ہیں جب ان کی کشتی بہاؤ پر نیچے جا رہی ہو اور وہ آرام سے بیٹھے شام کی پرسکون فضا سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ یہ گیت جب بھی گایا جاتا ہے جب کھیتی باڑی کے کام سے فارغ ہو کر، کسان شام کو سستاتا اور گانے سے دل بہلاتا ہے۔ بھٹیالی کی لمبی تانیں ایسی ہوتی ہیں کہ خواہ کہیں بھی گائی جائیں وہ وسیع مناظر، پھیلے ہوئے آسمان اور طول طویل دریاؤں کی یاد دلاتی ہیں اور ایک سماں باندھ دیتی ہیں۔ اس کے گانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے بہت اونچے سروں میں گایا جاتا ہے اور آواز کو بہت کھینچا جاتا ہے جس سے گہرے سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر بول جما کر اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے ادا کیا جاتا ہے جیسے : " او ۔ رے ۔ ماں ۔ جھی ۔ رے ۔ بھا ۔ ئی " اور ہر بول کو بڑے پیار سے "گھلا کر" ادا کیا جاتا ہے۔

آج یہاں کہیں بنگال کے لوک گیتوں کا ذکر آتا ہے تو پہلے نام بھٹیالی کا ہی لیا جاتا ہے بلکہ بعض تو اسے بنگالی لوک گیت کے مترادف ہی سمجھتے ہیں سچ بھی ہے کہ بھٹیالی نام کی ایک دھن ہے جو بہت سے بنگالی لوک گیتوں میں استعمال ہوتی ہے لیکن بھٹیالی گیتوں کے متعلق شاید آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ تیس سال پہلے بنگال کے شہروں میں بھی لوگ ان سروں سے آشنا تھے۔ پھر ایک روز ایک مشہور گراموفون کمپنی نے اس کا ایک ریکارڈ بازار میں پیش کر ہی دیا، جس میں جسیم الدین کا گایا ہوا ایک بھٹیالی گیت بھرا ہوا تھا۔ لوگ سن کر جھوم اٹھے۔ اشتیاق بڑھا، مانگ پیدا ہوئی اور یوں بھٹیالی گانوں کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ جسیم الدین اور دوسرے شہری گائکوں کے گائے ہوئے بھٹیالی ہو بہو وہ چیز نہیں جو باریسال یا میمن سنگھ کے مانجھی موج میں آکر اپنی کشتیوں پر بیٹھے الاپتے ہیں۔ بہت کچھ نوک پلک کی درستی اور سُر تال کی صحت کا خیال رکھنے کے بعد ان گانوں کو متمدن طبقوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اور اس کے بغیر شاید سامعین ان گانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو بھی نہ سکیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ بھٹیالی کی روح ان گانوں میں پوری طرح باقی رہتی ہے، مثلاً یہ گیت سنیئے :۔

(۱)

اورے مانجھی رے بھائی
شل ہو گئے اپنے ہات
کشتی کو بس اب کھینا
اپنے نہیں بس کی بات

(۲)

کھیتے تھے ہمیں اکثر
کشتی کو بصد مشکل
دریا کے مخالف بھی
پر اب نہیں اس قابل

(۳)

اب آلیا پیری نے
حسرت رہی جاتی ہے
ہیہات کہ یہ کشتی
واپس بہی جاتی ہے

(۴)

آگے سے شکستہ ہے
پامال ہے حال اس کا
کوشش رہی لاحاصل
بچنا ہے محال اس کا

سائی نسیان

مصور: امیر الاسلام

(۵)

چپّو کو اٹھا رکھ دے

او رے مانجھی رے بھائی

بے سود تھی ہر کوشش

آخر کو قضا آئی !

یا پھر اس تفکرانہ رنگ کی بجائے سیدھی سادی محبت کی باتیں ہوتی ہیں مثلاً :-

اے ملکوتی بشر، اے آسمانوں کی پری

روشنی ہے جس کے دم سے زندگانی میں مری

تیری خاطر ہو گیا ہوں میں سراپا انتظار

اور تیرا گھر ہے اس دریائے بے پایاں کے پار

بے بسی میں تیرے گھر کو یوں کھڑا ہوں تک رہا

دفعتاً آنکھوں سے میری ایک گرم آنسو بہا

مل گیا دریا کی موجوں میں یہ آنکھوں سے چھلک

کاش پہنچے موجِ دریا اس کو لیکے تم تلک

چٹکا :

جس طرح بھٹیالی میں مانجھی کی محبت کا اظہار اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے، اس طرح "چٹکا" ایک گانا ہے جس میں عورت اپنے دور گئے ہوئے مانجھی کی یاد میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ یہ گیت مرد بھی گاتے ہیں لیکن اصل میں یہ عورت کی طرف سے ایک دلسوز خطاب ہوتا ہے۔ یوں تصور کیجئے کہ مشرقی پاکستان کے شمالی علاقوں کی سرسبز پہاڑیوں میں ایک ٹیلے پر چند دیہاتی عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے ڈھلان کے آگے ایک وسیع منظر پھیلا ہوا ہے جس میں ایک پُر شور دریا دُور تک بہا چلا جا رہا ہے۔ اِدھر ٹھنڈی ہوائیں ان کے آنچل اڑ رہے ہیں، ادھر ہوا کشتی کے رنگین بادبانوں کو دھکیلتی ہوئی سطحِ آب پر لئے جا رہی ہے۔ ان کشتیوں کے چلانے والے جیسا کوئی مانجھی ان کے دلوں کے قریب لیکن نظروں سے دور ہے جس کی یاد میں یہ نغمہ سرا ہیں۔

جیسا طریقہ ہی کچھ شیریں آوازیں مل کر تیز تیز اس گانے کو گاتی ہیں۔ آس پاس کی پہاڑیوں اور وادیوں میں ان کے سُر گونجتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس گانے کو "چٹکا" یا "صدائے بازگشت" کہتے ہیں۔

گیت کا مضمون مانجھی سے التجا ہوتی ہے کہ اپنے لامتناہی سفر کو مختصر کرے۔ طرح طرح پیار سے اپنی خدمت کا یقین دلایا جاتا ہے۔ گھریلو آرام و آسائش کی دلآویز تصویر کھینچی جاتی ہے۔ پھر اپنی تنہائی اور حسرت کا المناک نقشہ کھینچا جاتا ہے ـــــ اور یہ سب اظہار ایسے دلنشیں انداز میں ہوتا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی پانی ہو جائے :

او مانجھی او خوبصورت کشتی والے

بس موڑ لے کشتی کو، اس گھاٹ لگا لے

یوں ندی کو بہتے رہنا ہے کب تک

اس کشتی کو آخر کھینا ہے کب تک

کس دھن میں چلا جاتا ہو شام سویرے

دل میں کیا راز چھپا ہے مانجھی تیرے

دریا یہ ختم بھی ہوگا، او رے مانجھی
کیا اسکا سرا نہیں ہے، کیوں رے مانجھی

گھڑیا میں جب میں پانی بھرنے آئی
رنگین کشتی نے تیری یاد دلائی

اک لہر نے گھڑیا چھین لی یوں اکدم سے
دل چھین لیا تھا جیسے تم نے ہم سے

ساری گان اور گم بھیرا:

'بھٹیالی' اور 'چٹکا' دونوں سوز و گداز کے گیت ہیں۔ ان کے مدھم اور نرم، کومل سروں میں دلدوز جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اور گیت بھی ہیں، جو انکے برعکس ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز دھوم دھام سے گائے جاتے ہیں۔ یہ سرخوشی و انبساط کے نغمے ہیں، جوش و خروش کے گیت۔ ان میں سے ایک ساری گان ہے۔ اگر بھٹیالی بہاؤ کے ساتھ کشتی چھوڑ کر گایا جاتا ہے تو ساری گان کی لچکدار اور تیز تانیں جب اٹھائی جاتی ہے جب کشتی بمشکل بہاؤ کے اوپر جا رہی ہو، یا پھر جب برسات میں دریا پانی سے بھر جاتے ہیں اور بہاؤ تیز ہوتا ہے تو جوان اپنے جوش میں ان پر خروش دریاؤں میں کشتیاں دوڑاتے ہیں اور خوب خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ جا بجا ملک بھر میں کشتی بانی کے میلے منعقد ہوتے ہیں کیونکہ یہ تو یہاں کے لوگوں کا قدرتی مشغلہ ٹھہرا۔ ان مقابلوں میں جب دو فریق ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہوتے ہیں تو مل کر "ساری گان" گاتے ہیں جس کے لفظی معنی ہی ہیں "ساروں کا گانا" یعنی گیت سُر ملا کر گایا ہوا۔ چنانچہ چپوؤں کی یکساں حرکت کے ساتھ گانے کے بول بھی ملا جلا کر گائے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ زور سے آواز کو اٹھاتے ہیں پھر آہستہ سے نیچے لے آتے ہیں۔ اس طرح جوں جوں دوڑ اختتام کو پہنچتی ہے، گانے میں بھی جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔

لوک سنگیت کے ماہر عباس الدین نے اس گانے کو یوں خوبصورتی سے بیان کیا ہے:۔

"ابر چھا رہا ہے، ہوا تیز چل رہی ہے اور دریا میں موجیں اٹھ رہی ہیں، ملاح خطرہ محسوس کرتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے اور گاتا ہے "کدھر جاؤں، کس کنارے کو چھوڑوں، کس کنارے کو پکڑوں" بادل اس کے سامنے صف بہ صف پھیل رہے ہیں۔ بجلی کوند رہی ہے اور ہیبتناک تاریک منظر کو سنہری لکیروں سے اجاگر کر رہی ہے۔ طوفانی ہوا کے اثر سے دریا میں قیامت برپا ہے۔ موجیں غصے سے بل کھا رہی ہیں اور ان کے منہ سے گویا جھاگ نکل رہے ہیں۔ ملاح اپنے ساتھیوں سمیت ان کوہ پیکر موجوں سے لڑنے کے لئے کمر باندھتا ہے۔ چپوؤں پر جھوم جھوم کر زور لگاتا ہے اور ساری کے بلند آہنگ نغمے گاتا جاتا ہے۔

"او مانجھی آ سجے جھار، طوفانے چلاؤ تاری"

طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کا دل جوش سے بھر جاتا ہے۔ بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ سیاہ لہریں اس کی طرف بڑھتی ہیں لیکن اسکے

چیونٹوں کا ڈنک کھا کر وہ اپنے پھن نیچے کر لیتی ہیں۔ جو پدما دریا کے سینے پر زندگی گزارتا ہو' وہ طوفانوں سے کب ڈرنے والا ہے۔ بجلی اور کڑک تو اس کے رات دن کے ساتھی ہیں"

گمبھیرا:

یہ بھی "ساری" کی طرح مل جل کر گایا جاتا ہے بلکہ یہ کچھ کچھ قوالی کی طرح ہے۔ ایک آدمی ایک بول گاتا ہے، پھر دوسرے مل جاتے ہیں اور ساتھ گانے لگتے ہیں۔ یہ خوشی اور سرشاری کا گانا ہے اور اس میں قوالی کی طرح خوب دھما چوکڑی ہوتی ہے اور غم دور کرنے کا اچھا طریقہ ہے ضلع رنگ پور اور مالدہ سے یہ گانا مخصوص ہے اور ڈھول اور ڈھاک سے اس کی سنگت ہوتی ہے۔

"بھوتیا":

پانی کے گیتوں کا بہت ذکر ہو چکا۔ اب ذرا ان گیتوں کو لیجئے جو کھیت اور کھلیان' وادی اور جنگلوں میں مترنم ہیں۔ شمال کے ایک وسیع میدانی علاقے کا تصور کر لیجئے۔ جہاں دور دور تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں اور بیچ میں ایک کچی سی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اس کے کنارے کہیں ناریل اور چھالیہ کے حسین درختوں کی قطاریں ہیں، کہیں کہیں آم اور کیلے کے جھنڈ۔ سڑک سے ہٹ کر ادھر اُدھر اکا دکا گاؤں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سڑک پر ایک لمبا قافلہ غبیلوں کا' ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر دیہات کی پیداوار کی مختلف چیزیں لدی ہوئی ہیں۔ جیسے پھل' ترکاریاں' اناج' گڑ وغیرہ۔ یہ قافلہ کسی منڈی کی طرف روانہ ہے' جہاں سامان فروخت کر کے غریب کسان اپنے گزارے کا انتظام کرتے ہیں۔

جیسے جیسے سفر کی تھکن بڑھتی جاتی ہے اور گھر کی یاد ستاتی ہے، گاڑی بانوں کی طبیعت انہیں گانے پر اکساتی ہے اور ایسے وقت میں وہ "بھوتیا" کی تان اٹھاتے ہیں۔ پہلی گاڑی والا ایک مصرع گاتا ہے، دوسرا اسے دہراتا ہے اور پھر تیسرا، چوتھا۔ اس طرح آن کی آن میں ساری وادی سینکڑوں آوازوں کے گانے سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کا مضمون محبت کے سیدھے سادے اظہار پر مبنی ہے، جو کسان کی طرف سے اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے حضور میں ہوتا ہے:

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں ہر جا تجھ کو میں
اے مرے محبوب' میرے جان و دل
جس کی خاطر منزلیں چھانا کئے
اپنی کٹیا سے گیا آخر کو مل

اس گانے میں بڑا سوز و گداز ہوتا ہے اور اس کے گانے کے انداز میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ گاتے گاتے یک بیک آواز سُر سے بھٹک سی جاتی ہے' جیسے ساز کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ انجان سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ گانے والا بہک گیا لیکن در اصل یہ دانستہ یا قدرتاً ہوتا ہے اور اس سے وہی یاس انگیز کیفیت کا اظہار مقصود ہے جو نفس مضمون میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر دفعتاً، گویا اسے کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اکھڑے اکھڑے بول پھر صحیح سرگم میں آ جاتے ہیں۔ یہ تھا بھوتیا جو مشرقی پاکستان کے شمال مشرقی علاقوں کا خاص گانا ہے اور تاثیر میں یکتا ہے۔

رکھالی:

جس طرح گاڑی بان سفر کی تھکن اور کوفت دور کرنے کے لئے بھوتیا گاتے ہیں' اسی طرح اکثر دوسرے پیشہ ور بھی اپنے اپنے کام کے ساتھ گانے کا مشغلہ جاری رکھتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے، نوجوان کسان اکثر وہ خوبصورت گیت گاتے ہیں' جو "رکھالی" کہلاتے ہیں۔ ان میں کرشن اور گوپیوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ ہرے بھرے کھیتوں میں جب جا بجا لوگ جھکے ہوئے کام میں مشغول ہوتے ہیں تو

ان میں سے ایک رکھوالی کی تان اٹھاتا ہے اور دوسرے اس کے بعد دہراتے ہیں حتیٰ کہ کھیت نغموں سے معمور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح کمہار بھی برتن بناتے ہوئے گاتے ہیں اور جلاہے کپڑا بنتے ہوئے، لوہار لوہا کوٹتے ہوئے اور ہر ایک اپنے اپنے کام پر، خواہ کچھ ہی ہو۔

کیرتن :

چنانچہ مچھیروں کا مقبول گانا کیرتن ہے اور بڑھئی بھی اسے بہت شوق سے گاتے ہیں اور رات رات بھر کیرتن کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہ ایک طرح کے مذہبی گیت ہوتے ہیں جن میں وشنوی عقیدے کے لوگ بڑے جوش اور عقیدت سے حصہ لیتے ہیں۔ سنگت کے لئے "کھول" ہوتا ہے جو ایک طرح کا لمبا سا ڈھول ہے جو بیچ میں سے چوڑا اور دونوں سروں پر سے پتلا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ پیتل کی تھالیاں یعنی "کرتال" اور لکڑی کے دو ٹکڑے جن پر گھنگرو بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور جو ایک ہی ہاتھ سے آپس میں بجائے جاتے ہیں، اسے "کاٹ کرتال" کہتے ہیں۔ ان گانوں میں حال اور سرشاری کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو ان محفلوں کا حاصل سمجھی جاتی ہے اور جن میں دنیا و ما فیہا کے تفکرات سے بالاتر ہو کر حصہ لینے والے ایک روحانی سرور حاصل کرتے ہیں۔

جاگ گان :

رات کے گانوں کا جب ذکر آیا ہے تو اس ایک مستقل رسم کا ذکر کرنا گویا لازم ہو گیا۔ یہ رسم "جاگ گان" کہلاتی ہے یعنی رات کو جاگنے (رتجگے) کا گانا۔ سردی میں پوس کے مہینے میں جب خریف کی فصلیں کاٹی جا رہی ہوتی ہیں، دل خوشی سے معمور ہوتے ہیں اور کھلیان اناج سے، کھانے پینے کی فراوانی ہوتی ہے اور گھر والیاں طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرتی ہیں ــــ خاص کر "پیٹھے" یعنی چاول کے آٹے کی لذیذ میٹھی ٹکیاں۔ ایک دوسرے کی دعوتیں ہوتی ہیں، حصے بھیجے جاتے ہیں اور ہر طرف مسرت کے شادیانے بج رہے ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کٹائی کے کام میں ایک گھرانہ دوسرے کی مدد لیتا ہے۔ رات کو کٹی ہوئی فصل کی رکھوالی بھی کرنی پڑتی ہے۔ سب لوگ کسی بڑے پیپل یا برگد کے نیچے بیٹھ کے آگ جلا لیتے ہیں اور یوں رات گزارتے ہیں۔ ایسے میں قدرتاً گانے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ "جاگ گان" کا مضمون عام طور سے اولیاء کی زندگی کے حالات ہوتے ہیں اور ان کے معجزات اور کمالات کا بیان۔ جاگ گان خاص طور پر راج شاہی اور پبنہ اور دوسرے ضلعوں میں رائج ہیں۔

کبھی کبھی ان رتجگوں میں کہانیاں بیان کی جاتی ہے اور یہ "پالا گان" کہلاتا ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور منظوم کہانیاں یہ ہیں: "میووا"، "مالوا"، "کاجل ریکھا"، "دیوان بھبنہ" اور "دیوان مدینہ"[1] آخر الذکر کا لکھنے والا دو صدی پہلے کا ایک دیہاتی شاعر بنام منصور بیاتی تھا۔ یہ داستان اس قدر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے کہ مشہور فرانسیسی ادیب رومان رولاں نے بھی اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ یہ داستانیں عام انسانوں سے متعلق ہوتی ہے اور روزمرہ زندگی کی آئینہ۔ دوسرے ملکوں کے لوک گیتوں کی طرح ان میں بھی مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں لیکن کم۔ کہانی کا ہیرو بادشاہ ہو یا کوئی بڑا سورما، اس کی زندگی کے معمولات وہی ہوتے ہیں جو ایک عام انسان کے۔ اس کی بھی وہی مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی۔ مثلاً کہانی میں ملکہ کو بھی دوسری عورتوں کی طرح گھاٹ پر جا کر نہانا ہوتا ہے۔ اس کو بھی صحن میں بیٹھ کر مچھلی کاٹنی پڑتی ہے وغیرہ۔ چنانچہ ان کہانیوں کا رنگ عوامی ہے اور عوامی زندگی کی عکاس ہیں۔

ان کی ایک اور خصوصیت حزن و ملال ہے۔ یہ کہانیاں اکثر و بیشتر یاس انگیز ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مقبول گیت حزنیہ ہی ہوتے ہیں۔ یا پھر اس یاس و حسرت میں بھی یہاں کی اصل زندگی کا عکس ہے۔ یہ تو صحیح نہیں کہ یہاں کے دیہات کی زندگی سراپا الم ہے حقیقت تو یہ ہے کہ باوجود زندگی کی مشکلات کے یہ لوگ خاصے مست، اور مگن رہتے ہیں۔ البتہ ہر بلائے آسمانی اور جفائے انسانی کے وہ اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کہانی گھڑتے وقت بھی واقعات کی کڑیاں قدرتاً وہ اس طرح جوڑتے ہیں کہ ٹریجڈی پر منتج ہوں۔ در اصل ایسی کہانیاں بنانے والے اور گانے والے گویا اس طرح اپنا دل ہلکا کر لیتے ہیں اور یونان میں ٹریجڈی کا مقصد یہی سمجھا جاتا تھا یعنی "کیتھارسس"۔

یہاں کے گانوں میں آہ و زاری ایک مستقل صنف کی شکل میں بھی موجود ہے جسے "زاری گان"[2] یعنی حزنیہ گانے کہتے ہیں۔ اکثر تو ان گانوں کا موضوع واقعات کربلا ہی ہوتے ہیں اور اس طرح ان کو مرثیوں کے مترادف سمجھنا چاہیئے لیکن اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے غم روزگار جن میں ان کا دکھڑا "زاری" یا

---

[1] دیوان = دیوانہ، دیوانی : مدینہ = ایک عورت کا نام تھا

[2] "جاری" یا "زاری" = رونا : "گان" = گانا۔

"جاری" کی شکل میں رویا جاتا ہے۔ طغیانی سے تباہی آگئی یا وبا پھیل گئی۔ بارش نہیں ہوئی یا قحط پڑ گیا، ہر غم کا اظہار "جاری" میں کیا جاتا ہے، مثلاً:

" دوپہر کی دھوپ میں ریت دور دور تک پھیلا ہوا ہے
دھوپ کی تپش سے بلا کی پیاس لگ رہی ہے
خدایا ابر بھیج، بارش بھیج
زمین سوکھ گئی ہے، آسمان تپ گیا ہے
بادلوں کا بادشاہ شاید سو رہا ہے
اے خدا ابر بھیج، بارش بھیج "

یا یہ لیجئے:

" دریائے سرما میں طغیانی آگئی ہے
ہفتے سے پانی چڑھنا شروع ہوا
اور اتوار تک ہر چیز تہ آب ہو گئی
جس کے پاس بڑی بڑی کشتیاں ہیں
وہ تو دوسرے گاؤں میں چلے گئے
لیکن غریب کیا کریں
ان کے لئے تو طغیانی موت کا پیغام ہے "

بارو ماشی[1]

زندگی کی عکاسی کی یہی خصوصیت ان گانوں میں بھی نمایاں ہے جو "بارو ماشی" کہلاتے ہیں۔ لفظ کا مطلب ہے "سال کے بارہ مہینے" اور اس میں بارہ مہینے کی گھریلو زندگی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بیان ایک بیوی کی زبانی ہوتا ہے جو اپنے شوہر کے فراق میں زندگی کے وہ لطف بیان کرتی ہے جو اس کے ہوتے ہوئے میسر آتے ہیں۔ بڑی حسرت سے وہ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بیان کرتی ہے جو ایک غریب لیکن بابرکت گھر میں نصیب ہوتی ہیں۔ اس بیان سے گویا بچھڑے ہوئے شوہر کو اپنے پیار اور محبت کا یقین دلانا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ اس دوری کو روا نہ رکھے اور پھر واپس آجائے ۔

" سکھی اگھن کا مہینہ شروع ہو گیا، کھیت میں دھان پک گئے ہیں
دل کا راجہ تو بدیس میں ہے، مجھے کیا سکھ ملے گا
سکھی لو پوس بھی آگیا، یہ جوانی بوجھ بن گئی ہے مجھ پر
کب تک برہ کی آگ میں جلتی رہوں گی
ماگھ آگیا، بن میں شیر چنگھاڑتے ہیں
وہ مجھ جیسی کامنی نار سے دور کیوں ہے؟
پھاگن شروع ہو گیا، پھاگ کھیلنے کے دن!
میں کس کے ساتھ کھیلوں؟
سکھی چیت کا مہینہ کیسے گزاروں

---

[1] بارو ماشی = "بارہ ماش": ماش = ماہ، مثل "بارہ ماسے"۔ یوپی کے دیہاتی گیت

سارا جسم سیاہ ہوتا جارہا ہے
بیساکھ آیا اور آندھیاں آنے لگیں
میرے دل میں بھی طوفان چلنے لگے
سکھی لو درختوں میں آم پکنے لگے
جیٹھ کا مہینہ شروع ہوگیا
کھانے میں مزہ کہاں، وہ جو مجھ سے بہت دور ہے
اساڑھ آیا اور بادل گرجنے لگے
کیا من کا میت بھیگتے بھیگتے آئے گا؟"

ایک اور خصوصیت بنگال کے لوک گیتوں کی ان کا ناصحانہ رنگ ہے۔ ہر کہانی اور ہر گانے کے آخر میں پند و نصائح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً کسی دلیر کسان کی شیر سے لڑائی کا ذکر ہوتا ہے۔ داستان گو تصور کی شدت اور بیان کی قوت سے ایک سماں باندھ دیتا ہے لیکن کہانی ختم ہوتے ہی وہ رُخ بدلتا ہے اور اس میں نصیحت کا پہلو نکلتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ اس طرح جان جوکھوں میں ڈالنا اچھی بات نہیں، کیونکہ جان خدا کی دی ہوئی نعمت ہے اور تھوڑی سی شہرت اور نفع کی خاطر اس کو ضائع کرنا گناہ ہے۔

یہ قرونِ وسطیٰ کا ناصحانہ رنگ اکثر بنگالی لوک گیتوں میں ملیگا لیکن اس سے بھی زیادہ نمایاں ان گانوں کا مذہبی رنگ ہے۔ بیشتر گانے تو ہیں ہی اِن موضوعات پر مشتمل اور دوسرے میں کوئی نہ کوئی پہلو خدا رسول کے ذکر کا نکال ہی لیا جاتا ہے۔ مذہبی گانوں میں ہندوؤں کے کیرتن کا ذکر تو آ ہی چکا۔ اسکے علاوہ مسلمانوں کے "معرفتی"۔ "مرشدی"۔ "بول" اور "دیہوتتہ" ہیں۔

لیکن اس مذہبیت کی چند خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اول تو اس میں روکھا پن اور یبوست نہیں، بلکہ مذہبی جذبے کا اظہار ان گیتوں میں بڑے جوش اور وارفتگی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے قوالی میں، بلکہ کھیل تماشے، دھوم دھڑکے کے قصوں کہانیوں کے ساتھ بھی یہ مذہبیت نبھ جاتی ہے۔

دوسرے اس مذہبیت میں اسلام برائے نام ہی ہے۔ بہت سے خیالات جو ان میں ظاہر کئے جاتے ہیں، وہ قطعی غیر اسلامی ہوتے ہیں لیکن خدا رسول کا نام بیچ میں لاکر انہیں جاہل عوام کی نظر میں قابلِ قبول بنا دیا جاتا ہے، مثلاً یہ پورا سلسلہ گیتوں کا جو مرشدی کہلاتا ہے، مرشد کی تعریف میں اس قدر غلو کا شکار ہے کہ ایک سمجھدار مسلمان ان کو سن کر حیران و ششدر رہ جائے گا بلکہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

لیکن ایک پہلو اس مذہبیت کا وہ عام خدا ترسی اور انسان دوستی ہے جس کی دوسرے مذاہب نے بھی تلقین کی ہے مگر اسلام نے خاص طور پر شرفِ آدم کو بلند کرنے اور اخوتِ بشر کو پھیلانے پر زور دیا، خصوصاً صوفیا کے مسلک نے اس کو بہت فروغ دیا۔ بہرکیف حقیقت یہ ہے کہ ان گیتوں میں ان خیالات و جذبات کا محرک تنہا اسلام کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دراصل ان کا ماخذ بھگتی مذہب خدا پرستی یا صوفیت کے وہ گیت اور گانے ہیں جن کی مثالی شکل چودھویں صدی

کے مشہور شاعر چنڈی داس کے کلام میں ملتی ہے (اور بھگتی مذہب جیساکہ ہم جانتے ہیں، اسلام کے زیر اثر نمودار ہوا) مثلاً چنڈی داس کا یہ قول لیجیے :۔

"سُن رے مانس بھائی
سب سے اوپر انسان کی بھلائی
اس سے اُوپر کچھ ناہی"

اور اسلام میں بھی یہ خیال ہمیشہ سامنے رہا ہے۔ مثلاً سعدیؒ کا شعر ہے ؎

"دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است"

اور خود ہمارے شاعر اعظم علامہ اقبال کا قول ہے ؎

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

بہرحال انسان دوستی کے یہ خیالات کچھ ہندوؤں کے فرقہ وشنو کے شعراء کے ذریعے اور بھی پھیلے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسلمان شاعر بھی ہمسلک ہیں مثلاً سید مرتضیٰ، مرزا کنگلی، فیض اللہ، ناصر محمود، علی رضا وغیرہ۔ ان کے کلام میں انسان کی طرف سے خالق، اللہ کی جستجو کو عشق مجازی کے پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی پیار محبت کی باتوں کے ذریعے خالق و مخلوق کے تعلق کو بڑے موثر اور محسوس طریقے پر پیش کیا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور لگاؤ کی باتوں میں خدا کی دوری ختم ہو جاتی ہے اور انسان کی کم مائگی کا احساس بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ پھر اس وارفتہ محبت میں مادی نعمتوں کی خواہش بھی ختم ہو جاتی ہے اور صرف لطف و عنایت پر نظر رہتی ہے۔ ان میں سے بہت سے شاعر گھر بار چھوڑ کر تلاش حق میں حیران و سرگرداں پھرتے رہے اور اس عشق الٰہی کو بڑے لطیف و دلنشیں پیرائے میں بیان کرتے رہے۔ مثلاً ایک پرانے شاعر کے شعر ہیں :

کچھ پیار کی باتیں کر، لے دوست کہ میرا دل	اکتا گیا دنیا سے۔ خوں ہو گیا الفت سے
بس عشق الٰہی کی اب پیاس کچھ ایسی ہے	دل ڈھونڈتا ہے مرہم 'اللہ کی محبت سے
اس شاہد رعنا کا، دیدار جہاں بھی ہو	ہم جائیں گے سر کے بل 'محنت سے مشقت سے
کس ہیئت پہ رکھی ہو سکھیو زادھوکا ہے	دل اسکو دو جو بخشے، کچھ عشق کی دولت سے
جو فیض کا منبع ہے، جو چین کا داتا ہے	رکھ دل کے دوارے میں، کام اسکی عبادت سے
چھوڑ اور صنم سارے، کر بند نظر اپنی	بس اس کے قدم پر رکھ، سر اپنا عقیدت سے
پھر سکھ کا زمانہ ہے، پھر شانت سے جیون ہے	غیبت کا نہ غم ہوگا، آزار نہ فرقت سے

ان صوفیانہ گیتوں کی مختلف شکلوں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق ہے۔ "باؤل" کہتے ہیں کہ "اولیاء" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے[1] اس کے گانے والے قلندر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے امام شیخ مدن باؤل تھے جو عہدِ مغلیہ کے ایک شاعر تھے۔ تفصیل نامعلوم ہے۔ ان کے صوفیانہ خیالات کا اندازہ اس گیت سے لگایا جا سکتا ہے :

کھل رہا ہے کتنی صدیوں سے مرے دل کا کنول
میں ہی کیا، تو بھی مقید ہے، نہیں رستہ، سنبھل

حیف دونوں کس قدر مجبور ہیں

---

[1] باؤل = "آول" = اولیاء۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ "باولے" یا مجذوب فقراء کے گیت ہیں، بعض اسے "بول" سے مشتق بتاتے ہیں۔

اس کا چہرہ ہے شگفتہ اور اَن مٹ اس کا نور
شہد کا اس میں خزانہ، اس سے ہو دل کا سرور
کس قدر پُرکیف، کیسا بے مثال

لالچی بھونرے اسے تو چھوڑ سکتا ہی نہیں
میں ہی دیوانہ نہیں، تو بھی تو ہے اس کے قریں
اس جہاں میں دل کو آزادی کہاں (مترجمہ: یونس احمد)

معرفتی گیت بھی کسی حد تک 'باؤل' کی طرح ہی ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا موضوع بھی خودی کی پہچان ہے۔ "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ"۔ اس ضمن میں بہت سے نادر صوفیانہ مضمون ان گیتوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لالن شاہ کا یہ نادر گیت ملاحظہ ہو:- (مترجمہ: یونس احمد وش جگتی)

اور کسی نے داب رکھی ہے میرے گھر کی کنجی
پل پل لٹتے کیسے دیکھوں اپنے گھر کی پونجی
اپنے گھر میں رکھ کر میں دھن دولت مال خزانہ
لین دین پرایوں سے کرنے کو ہوا روانہ
دام گرہ میں اور کے اور سودا کسی کے ساتھ
دھن والا اتنا جنم کا اندھا، دھویا دھن سے ہاتھ
دریا دریا کنکر رولے، من موتی کے اندر
لالن اپنا آپ نہ جانا من سی چیز کو پاکر

اس کے علاوہ مرشدی گیت ہوتے ہیں۔ جن میں اولیاء اللہ کی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور عجیب وغریب معجزات اور کمالات کے بیان کے علاوہ، نہایت مبالغہ آمیز عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے جو سادہ لوح دیہاتیوں کی نظر میں اسلامی خیالات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے لکھنے والے بھی بیشتر جاہل فقیر ہوتے ہیں۔ جن میں درگائی فقیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔

"دیہہ تتو" بھی اسی ذیل کا ایک مذہبی گیت ہے جس میں دل کو یا روح کو ایک پرندہ سمجھا جاتا ہے اور بدن کو ایک پنجرہ جس میں وہ مقید ہے۔ اس طویل استعارہ میں جلد دیوار تصوّر کی جاتی ہے اور ہڈیاں ستون، آنکھیں کھڑکیاں، منہ دروازہ اور روح کے پردہ کی کہانی بیان کی جاتی ہے آیا وہ اڑ کر خدا کی طرف جائے گا یا شیطان کی طرف!

مختصر یہ کہ ہمارے بنگال کے سیدھے سادے باشندوں کے گیت اپنی سادگی، صفائے احساس اور خوبیٔ اظہار میں یکتا ہیں۔ ان کو یقیناً عوامی شاعری کے بہت خاص نمونے سمجھنا چاہیئے۔ نغموں کا یہ بہتا ہوا دھارا صدیوں سے بہتا چلا آرہا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح دلوں کو شاداب کر رہا ہے۔ ان گیتوں میں ملک کی تصویر دکھائی دیتی ہے اور قوم کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

★

زرعی اصلاحات

اقبال نے کہا تھا کہ جس خوشۂ گندم سے دہقان کو روزی نہ ملتی ہو اس خوشۂ گندم کو جلا دینا ہی بہتر ہے۔ مراد یہ تھی کہ دہقان کی پسماندگی اور زبوں حالی کے اسباب کو جب تک آہنی پنجہ سے صاف نہیں کر دیا جائے گا، کوئی اصلاحِ احوال ممکن نہیں ہوسکتی اور خواجہ و مزدور کا فرق کبھی نہ مٹ سکے گا۔ جس آہنی پنجہ کا انتظار تھا وہ ہمارے عوام کی گلو خلاصی اور صدیوں کی پس ماندگی سے انہیں باہر نکالنے کے لئے بروقت آپہنچا۔

ملک کا نظامِ آراضی اور مسائلِ زراعت صدیوں سے ایک پرانی ڈگر پر چلے آرہے ہیں۔ بہت سے غور طلب مسائل پر سرسری توجہ اور اصلاحِ احوال کی نیم دلانہ کوششیں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں لیکن ملک کا نظامِ اراضی، خصوصاً مغربی پاکستان میں مسئلۂ زمین، حل طلب ہی رہا کیونکہ سیاسی بازیگروں اور مفاد پرستوں کے مصالح انہیں کوئی عملی جامہ پہنا ہی نہ سکے۔ وجوہ ہر ایک کے علم میں ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس مسئلہ کی ہر جانچ اور سابق کی تمام کوششیں بااثر و قوی عناصر کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی و سماجی دباؤ کے نیچے دب کر محض "تجویزیں" اور "سفارشیں" بن کر رہ جاتی تھیں اور کوئی بھی سودمند عملی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا۔ مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات کا مسئلہ سب سے پہلے جس ہماہمی اور جوش و خلوص نیت سے اس نئے دور میں مکمل، بہتر اور قوی تر مساعی کے ساتھ حل کیا گیا ہے اس کی مثال ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ صرف تین ماہ کی قلیل مدت میں "اصلاحات اراضی، مغربی پاکستان" کے کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا اور ایسے نتائج و سفارشات بروئے کار آئی ہیں کہ ان کا دوررس اثر ملک کے نظامِ معیشت و اقتصاد کو ہی نہیں بلکہ ہماری سیاست، ہمارے معاشرہ اور آئندہ نسلوں کے معیارِ حیات کو بھی نئے سانچوں میں ڈھال دے گا۔ ان اصلاحات کے نفاذ کے بعد جو دوررس نتائج برآمد ہوں گے ان کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ درمیانی طبقۂ معاشرت اب ہمارے دیہی علاقوں میں بھی پیدا ہو سکے گا۔ جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا دور ختم ہوا۔ اب ہاریوں، کسانوں، مزارعوں کا زمانہ آگیا ہے جو اپنی کوششوں سے اور حکومت کی لائی ہوئی برکتوں سے فیضیاب ہو کر بڑے قلیل عرصے میں اپنی، اور اپنے ساتھ ملک کی کایا پلٹ سکیں گے۔ اب ان مساعی کی بدولت وہ زمین کی قوتِ پیداوار میں اضافہ کر سکیں گے اور اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ بھی وہ کریں گے وہ انہیں کے کام آئے گی اور صرف بڑے زمیندار، ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ پر جب ناظمِ اعلیٰ مارشل لا کا عہدہ جنرل محمد ایوب خاں نے سنبھالا تو اپنی پہلی ہی کانفرنس میں انہوں نے اپنے اس آہنی عزم کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ جناب اختر حسین، گورنر مغربی پاکستان کی زیرِ صدارت ایک زرعی اصلاحات کا کمیشن مقرر کریں گے تاکہ نظامِ اراضی کے مسئلے کی پوری جانچ کی جاسکے۔ اور وہ ایسی سفارشات کر سکے جن پر عملدرآمد سے پیداوار میں اضافہ ہو اور دیہی علاقوں کے ان ۹۰ فیصد باشندوں کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ چنانچہ اس کمیشن کا تقرر فوراً عمل میں آیا اور جنوری کے اواخر میں اس کی سفارشات اور خلاصۂ نتائجِ تحقیق شائع کر دئے گئے ہیں۔ اس کمیشن کے سلسلے میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے حالیہ نشری تقریر میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ "ہم اس ملک میں ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کا چلانا اقتصادی طور پر ممکن ہو اور جو معاشی طور پر آزاد ہو، مستحکم ہو اور سماجی انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں"۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ عملاً سماجی انصاف کے تقاضے اور اقتصادی ترقی کے مفاد کبھی ہمیشہ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے، لیکن درمیانی راستہ یا احوال سے مفاہمت پیدا کر کے اس خلیج کو بہت کم کر دینا اور معاشری ناانصافیوں کو دور کر دینا تو قطعی ممکن ہے۔ اس بے بسی کے عالم میں رہنا ایک زندہ و فعال معاشرہ کے شایانِ شان نہیں۔ بہرکیف، کمیشن کے سامنے جو کام تھا وہ اپنی جگہ بڑا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ وقت کی کمی کے باوجود اس نے اور متعلق عملوں نے، جس تندہی، کاوش، فرض شناسی سے کام کیا وہ ان کے جذبۂ حب الوطنی کا

ثبوت ہے اور اسے آئندہ نسلیں ہمیشہ جذبۂ احسان و تشکر کے ساتھ یاد کریں گی۔ کمیشن نے سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا کہ مغربی پاکستان میں دیہی آبادی کس قدر ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا گیا۔ پھر موجودہ زمین کا حساب لگایا گیا۔ کمیشن نے دیکھا کہ ہماری زمین اقتصادی طور پر کافی مواقع بہم نہیں پہنچاتی، نیز ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زمین کی تقسیم اکثر علاقوں میں غیر منصفانہ یا غیر مساوی یا غیر اقتصادی ہے۔ ہمارے دیہی عوام کا بڑا پیشہ صرف زراعت ہے اور جو یہ نہیں کر سکتے وہ زمین کے لئے بوجھ ہیں اور وہ معاشرہ میں ایک مفید عنصر نہیں ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ زمین کی ملکیت تقسیم در تقسیم ہو کر بہت سی پریشانیاں اور اقتصادی مسائل پیدا کرتی رہتی ہے لیکن کمیشن کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ہمارے دیہی عوام میں ولولہ اور جوش پھر بھی موجود ہے بشرطیکہ انہیں اپنے زرعی مستقبل کا پکا یقین ہو۔ بہت سی زمینیں قابل کاشت ہیں مگر انہیں بویا جوتا نہیں جاتا مگر یہ بیکار زمینیں ہمیں بہت کچھ دے سکتی ہیں۔

کمیشن نے دیکھا کہ مزارع کو مزارع رہنے کا یقین نہیں ہوتا اس لئے وہ تندہی و عرق ریزی سے کام نہیں لیتا کیونکہ اسے اپنی محنت کا پورا پھل ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ محنت اور سرمایہ زمین پر لگانے سے ہچکچاتا ہے اور زمین کی پیداوار بڑھنے نہیں پاتی۔ سیاسی و سماجی دائرے میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ساری طاقت کھنچ کر چند علاقوں کے بڑے بڑے چیدہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ نتیجۃً ملک میں سیاسی ابتری اور معاشی ناہمواری پیدا کرنے میں اس چیز نے بڑا حصہ لیا۔۔۔۔ جس کے مضر اسباب کو یک قلم ختم کر دینا ازبس ضروری تھا اور خدا کا شکر ہے کہ اب یہ ناسور ہمارے جسمِ سیاست و معاشرہ سے بالکل دور کر دیا گیا ہے۔

کمیشن کی بعض اہم سفارشات یہ ہیں:

۱۔ کوئی شخص بحیثیت مالک یا بحیثیت قابض پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ نہ رکھ سکے گا۔ موجودہ مالکوں کو البتہ اس امر کی اجازت ہوگی کہ اس مقررہ حد سے زیادہ ایسا رقبۂ زمین بھی اپنے پاس رکھ سکیں گے جس کا حق ان کو اس وقت پہنچتا ہو، جبکہ ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد، بے خانماں افراد کی زمین کی طرح، ایسی ہو جس کی پیداوار ۳۶ ہزار پیداواری اکائیوں کے برابر ہو۔ ان کو اس بات کی بھی اجازت ہوگی کہ (۱۵۰) ایکڑ باغاتی رقبہ بھی اپنے پاس رکھ سکیں گے اور اپنے وارثوں کے نام ایک مقررہ حد میں ہبہ بھی کر سکیں گے۔

۲۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس آخری حدبندی کے بعد جو زمین باقی رہ جائے گی، وہ زمین حکومت اپنے قبضے میں لے لیگی اور مزارعین یا دیگر مستحقوں میں تقسیم کر دے گی۔ مزارعین کو جگہ سے بے جگہ ہونے کی پریشانی سے بچانے اور اس خیال سے کہ پیداوار میں کمی نہ واقع ہو حکومت یہ بھی کرے گی کہ پہلا حق ان مزارعین کا سمجھے گی جو اس وقت کاشت کر رہے ہوں گے تاکہ وہ یہ زمینیں خود خرید لیں اور پچیس سال میں قسطوں کے ذریعہ اس کی قیمت ادا کرتے رہیں۔

۳۔ زمین کے موجودہ مالکوں کو ان کی زمینوں کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ یہ نقد قیمت کی صورت میں ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ تمسکات یعنی بانڈ دیئے جائیں گے جو ۲۵ سال میں قابل ادائیگی ہوں گے اور ان پر ہر سال منافع بھی ملتا رہے گا۔

۴۔ موروثی کاشتکاروں کو تمام مغربی پاکستان میں زمینوں کا پکا مالک قرار دے دیا جائے گا۔

۵۔ جن علاقوں میں آبادی کا دباؤ زمین کے رقبہ کے تناسب سے زیادہ ہے، وہاں کے مزارعین کو حتی الوسع، ایسے نئے علاقوں میں بسایا جائے گا جہاں کی زمین سرکاری ملکیت میں ہیں۔

۶۔ مزارعین کو ان کی میعادِ کاشتکاری تک زمینوں سے بیدخل نہیں کیا جائے گا اور اگر ایسی نوبت آ ہی گئی تو قانون کے مطابق مزارعین کو زمین بسانے اور جگہ سے بے جگہ ہونے کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ لگان بڑھانے پر بھی پابندی لگا دی جائے گی۔ کسی قسم کا نذرانہ، بیگار اور کسی طرح کی مفت خدمت لینے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

۷۔ تمام جاگیریں بغیر کسی معاوضے کے سرکاری قبضہ میں لے لی جائیں گی اور وہ تمام مفادات و منافع جو ان جاگیروں سے جاگیرداروں کو حاصل ہوتے تھے کالعدم قرار دیئے جائیں گے۔

۸۔ اس خیال سے کہ ملکیتِ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوتے رہیں اور تقسیم در تقسیم کی خرابیاں دور کی جا سکیں، ایک خاص اقتصادی حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے کم رقبۂ زمین تقسیم نہ کیا جائے گا اور قانونی طور پر چھوٹے رقبوں کو ایک مشترکہ بندوبست کے تحت مجتمع کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

۹۔ فوری انتظام کیا جائے گا کہ تمام مغربی پاکستان میں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملکیتِ آراضی کو لازمی طور پر یکجا کر دیا جائے۔

ان اور دیگر سفارشات کو فوری عملی جامہ پہنانے کے لئے مارشل لا کا ضابطہ جاری کر دیا گیا ہے تاکہ کمیشن کے کاموں کو فوراً بروئے کار لایا جا سکے۔ اس ضابطے کے تحت مغربی پاکستان میں صوبائی زرعی کمیشن کا تقرر بھی عمل میں آ گیا ہے جو ان سفارشات کو ضابطۂ مارشل لا کے تحت عملی جامہ پہنائے گا۔

سفارشات کی اہمیت پر صدرِ پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں نے اور حالیہ وزارتی پریس کانفرنس میں حکومت کے وزراء نے ان امور پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً یہ کہ سب سے بڑی اصلاح جو روبہ عمل آئی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی حدِ ملکیت معین کر دی گئی ہے اور جو بھی زمین زاید ہو گی اسے مناسب قسطوں پر ان مزارعین میں تقسیم کر دیا جائے گا جن کی اپنی زمین نہ ہو یا جن کی اپنی زمین اقتصادی طور پر ناکافی ہو۔ مغربی پاکستان میں کوئی چھ ہزار زمیندار ہیں۔ یہ زمین اب ان زمینداروں اور دیگر مستحقین میں انصاف و مساوات کے اصول پر تقسیم کر دی جائیں گی۔ اس طرح مزارعین اور ان زمینداروں، سب کو ہی اپنی زندگی سنوارنے کا بہتر اور منصفانہ موقع مل سکے گا اور سب طبقات نے جذبۂ حب الوطنی کے تحت، اور قواعد کی روح کے مطابق، اپنا اپنا فرض ادا کیا تو ملک کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ خود حکومت کی پوری مشینری کامل خلوص و تندہی کے ساتھ ان احکام پر عمل کرانے کے لئے حرکت میں آ چکی ہے۔

اس سلسلے میں صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے وضاحت فرماتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ ان اصلاحات کے لئے انہوں نے جو اعلان کیا تھا وہ محض جذباتی نہ تھا بلکہ ایک حقیقت پسندانہ تصور پر مبنی تھا تاکہ ایسا حل نکالا جا سکے جس کو "دل کے علاوہ عقل بھی تسلیم کرے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی زاویۂ فکر نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے دور رس نتائج میں سماجی اور اقتصادی ناانصافی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا اور زرعی اقتصادی زندگی بہتر ہو جائے گی۔ مزید برآں جنرل محمد ایوب خاں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "میری حکومت کے یہ فیصلے ہماری زرعی اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے کے ضامن ہوں گے"۔ پریس کانفرنس میں بھی یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مارشل لا کا حالیہ ضابطہ ان سفارشات اور فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موجود ہے اس لئے کسی سمت میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہنی چاہیئے۔

ان سفارشات اور حکومت کے فیصلوں کا اعلان کرتے ہوئے جنرل محمد ایوب خاں نے فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ بعض فیصلے زمینداروں کو سخت دکھائی دیں لیکن انہوں نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اب زمانے بدل چکے ہیں اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ "یہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے اور ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ علاوہ اس بات کے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے سماجی انصاف کو پیش نظر رکھنا ہمارا فرض ہے مجھے یقین ہے کہ ان اصلاحات کا نفاذ اس نظام کے لئے اور ان اقدار کے لئے بھی ضروری ہے جو ہمیں اس قدر عزیز ہیں اور جن کی خاطر پاکستان کا آزاد ملک وجود میں آیا ہے"۔

ان اصلاحات کے نفاذ کا مقصد کسی سے سیاسی یا اور کسی طرح کا انتقام لینا مقصود نہیں ہے، ورنہ حکومت اس سے زیادہ سخت جامد قوانین بھی جاری کر سکتی تھی، مگر ظاہر ہے کہ حقیقت پسندانہ و عملی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر انتہائی ملائم قانون بنائے گئے ہیں اور کسی بھی طبقے کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی گئی ہے۔ اب یہ زمینداروں کا کام ہے کہ وہ اپنی زندگیاں، دوسروں کی محنت پر عیش کرنے کے بجائے خود ہاتھ پیر ہلا کر بسر کریں گے اور خود محنت و جانفشانی کر کے زمینوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے اور جو اپنی زندگی کے ڈھب کو نہ بدلیں گے زمانہ کی رفتار ان کا انتظار نہ کرے گی۔

اس مسئلہ کا ایک فریق اگر زمیندار ہیں تو دوسرا فریق مزارعین بھی ہیں۔ انہیں بھی اپنے فرائض سمجھنے چاہئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمارے

نظام زراعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مثال ہیں۔ اور اس سے پہلے کبھی یہ تسلیم نہ کیا گیا تھا کہ مغربی پاکستان کی پیداوار بڑھانے میں مزارعین کی فی الحقیقت کیا قدر و قیمت ہے اور ان کی کس قدر اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے انہیں اب بیدخلی کے خطرے سے نجات دلادی گئی ہے۔ تاکہ وہ خوب محنت اور شوق سے زمینوں کو جوت بو سکیں۔ یہ بیشک صحیح ہے کہ ہر ہر شخص کو فائدہ پہنچانا ناممکن بات ہے کیونکہ زمینیں کم ہیں، اس لئے جو لوگ مالک زمین نہ بن سکیں انہیں بددل نہ ہونا چاہیئے۔ ترقی و بہتری کے مواقع محنت کش کے لئے بہت ہیں اس لئے ان سے بجا طور پر یہ امید ہے کہ وہ زمین کے مالک کے ساتھ مل جل کر کام کریں گے اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر کریں گے تاکہ زمینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ نیز مزارع کی حیثیت سے ان پر جو عوائد و فرائض آتے ہیں ان کو وہ بدستور ادا کرتے رہیں گے اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔

امید ہے زرعی اصلاحات کے نفاذ کے بعد مغربی پاکستان کے مزارعین کے حقوق کی کماحقہٗ حفاظت ہو جائے گی اور معاشرہ کے وہ افراد جو اب تک روایتی عیش و غم کی زندگیاں بسر کر رہے تھے اب ملک کے زیادہ بہتر شہری بن جائیں گے اور اپنے دست و بازو کی قوت سے ملک کی خوشحالی و بہتری کے لئے کوشاں ہوں گے اور ہم ان سب کی مساعی سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ اور پاکستان حقیقی ترقی کی راہ پہ گامزن ہو سکے گا۔ ع

کہ خشت و سنگ سے ہوتے ہیں یوں جہاں پیدا

★

پاکستان کی صنعتی ترقی

ایم۔ ایم۔ اکرم

۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا، جو زرعی معیشت کا ملک تھا۔ صنعتی ترقی اور صنعتوں کا روشناس کرانا اور زرعی اقتصادیات کو صنعتی اقتصادیات کی منزلوں پر پہونچانا نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ سو فیصدی زرعی ملک اپنی اور دوسری تمام ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسرے ملکوں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہم مجبور تھے۔ کہ اپنی روزمرہ ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے دوسرے ملکوں کے دست نگر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ضروری اشیاء جیسے کپڑا، جوتے، شکر، کیمیاوی دواؤں وغیرہ کے لئے ہمیں دوسرے ملکوں کی طرف دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔ اور ملک کی اقتصادی زندگی میں اتنا سکت نہ تھا۔ کہ دوسرے ملکوں سے اپنی روزمرہ ضرورت کی اشیاء درآمد کر سکیں۔ زرعی اقتصادیات پر پاکستان کا دارومدار تھا اور پھر ملک میں صنعتوں کے قیام کے لئے نہ فنی ماہرین تھے، اور نہ صنعتی ترقی کے لئے ہم کوئی طریق کار جانتے ہی تھے یعنی صنعتی میدان میں تجربہ سے بھی خالی تھے۔ ہم اس زرعی اقتصادیات کے ملک کو نیم صنعتی اقتصادیات کا ملک بنانا چاہتے تھے۔ یعنی ہمیں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی بھی کرنی تھی۔ تاکہ دوسروں کی محتاجی ختم ہو۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی میں اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کی پہلی صنعتی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۸ء کا یہ اعلان گویا پاکستان کی صنعتی ترقی کی خشتِ اول یا سنگِ بنیاد تھا۔ اس صنعتی پالیسی میں چند ایک صنعتوں کے علاوہ جیسے۔ اسلحہ۔ بجلی پیدا کرنے کی صنعت اور ایسی صنعتیں جو سلسلۂ مواصلات سے متعلق تھیں جیسے ٹیلیفون اور تار کے آلات ریل کے ڈبے بنانا اور نشریاتی آلات و اوزار وغیرہ بعض قومی مصلحتوں کی بنا پر انھیں حکومت کے زیر تحویل رکھا گیا۔ مگر ان کے علاوہ دیگر ضروری اشیاء اور مصنوعات کی تیاری کے لئے نجی سرمایہ کاروں اور اداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اور اس پالیسی میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔ کہ ملک میں صنعتوں کے قیام کے لئے اگر نجی سرمایہ مناسب طور پر نہیں لگایا جا رہا ہے تو پھر حکومت اس خلا کو پُر کرے تاکہ پاکستان کی اقتصادی زندگی میں اور پاکستان کی معاشی ترقی میں کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ حکومت کی یہ صنعتی پالیسی بلاشبہ دُور اندیشی پر مبنی تھی صنعتی ترقی کے لئے حکومت نے ٹیکسوں میں مراعات بھی کیں تاکہ غیر ملکی سرمایہ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ لگایا جا سکے۔ لیکن نجی اور غیر ملکی سرمائے کا جہاں تک تعلق ہے سرمایہ خاطر خواہ طور پر صنعتوں میں نہیں لگایا گیا ——— حکومت کا یہ یقین کہ پاکستانی نجی سرمایہ صنعتوں میں خاطر خواہ لگایا جائے گا پہلا ہوا لیکن آہستہ آہستہ یہ صحیح ثابت ہوتا رہا۔ چنانچہ متعدد صنعتوں میں قابل لحاظ ترقی نمایاں ہونے لگی جیسے سوتی کپڑے کی صنعت، چمڑے کی صنعت، دیاسلائی، سگرٹ اور اسی طرح کی متعدد صنعتیں ملک میں قائم ہو گئیں ملک میں صنعتوں کا قیام ہو رہا تھا اور حکومت صنعتوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ نجی سرمایہ بڑی اور اہم تر صنعتوں میں خاطر خواہ نہیں لگایا جا رہا ہے جیسے پٹ سن کی مصنوعات، کاغذ سازی، جہاز سازی، بھاری مشینوں کی صنعت کیمیاوی کھاد وغیرہ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان صنعتوں کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی یا یہ کہ ان کا طریقہ کار فنی طور پر زیادہ پیچیدہ بھی تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سرمایہ لگانے کے بعد فوری طور پر سرمائے کی واپسی یا منافع کی توقع سرمایہ کاروں کو نہ تھی۔ اُدھر سرمایہ داروں نے یہ سوچنا بھی شروع کر دیا کہ درآمد برآمد میں رقم لگائی جائے تو اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑے ہی عرصے میں حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے راہیں ہموار کرنے اور ملک میں متوازن طور پر صنعتوں کو بڑھانے اور صنعتی اقتصادیات کا رجحان پیدا کرنے کے لئے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن یعنی پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا قیام عمل میں آیا۔

اپنے قیام کے سات برسوں میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے یہ کارخانے جاری کئے۔ پٹ سن ۱۲۔ کاغذ سازی اور گتہ بنانے کے ۳۔ اون ۳، سیمنٹ ۲۔ جہاز سازی و مرمت جہاز ۳۔ کیمیاوی اشیاء ۵۔ شکر ۵۔ کیمیاوی کھاد ۲۔ سوتی پارچہ ۱، اور سوئی سے کراچی و ملتان تک پانچ سو پینسٹھ میل لمبی پائپ لائن بچھائی ہے۔ گیس تقسیم کرنے والی دو کمپنیاں بھی قائم کی ہیں۔ کارپوریشن کا قیام ۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہوا تھا۔ جب سے اب تک اس ادارے نے ۴۱ منصوبے مکمل کئے ہیں۔ اور مزید ۱۷ منصوبوں پر کام ہو رہا ہے تکمیل شدہ منصوبوں پر چورانوے کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے

اور جو منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ ان پر مزید نوّے کروڑ کی لاگت آئیگی۔ جو منصوبے مکمل نہیں۔ ان پر ۳۲ کروڑ روپیہ نجی سرمایہ سے لگایا گیا ہے۔

پچھلے سات برس میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے قایم کردہ کارخانوں نے ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ کا مال تیار کیا جس میں سے چالیس کروڑ زرِمبادلہ کا مال برآمد کیا گیا۔ اس وقت پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے جو منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ ان میں اخباری کاغذ کا ایک کارخانہ۔ شکر کا ایک کارخانہ اور قدرتی گیس کے ذریعہ چلنے والے کیمیاوی کھاد کے دو بڑے کارخانے۔ دو کیمیاوی پلانٹ دو سیمنٹ کے کارخانوں کی توسیع ایک برقابی طاقت کا اسٹیشن ہیں۔ ملتان اور لائل پور کو سلسلہ کی لائن کے ذریعہ ملایا جارہا ہے اور اس کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی اسکیمیں زیرِ تکمیل ہیں۔ یہاں ایک بات یہ بھی واضح کر دینا بہتر ہوگا کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا ادارہ ملک میں صنعتوں کی اجارہ داری حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا اولین مقصد یہ ہے کہ ملک میں صنعتوں کی ترقی ہو۔ اسی لئے پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے منصوبوں میں نجی سرمایہ طلب کیا جاتا ہے اور پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے مکمل کردہ چھ کارخانے کلی طور پر نجی اداروں کو منتقل کئے جاچکے ہیں۔ نو کارخانے ایسے ہیں۔ جن میں پی، آئی، ڈی، سی نے اپنی شرکت باقی رکھی ہے۔ لیکن ان کا انتظام شریک صنعت کاروں کے ہاتھ میں ہے۔

بلاشبہ پی، آئی، ڈی۔ سی نے اہم صنعتوں کی ذمہ داری سنبھالی ہے جنہیں نجی صنعت کار تنہا سنبھال نہ سکتے تھے۔ اس طرح پی، آئی، ڈی، سی کا ادارہ اگرچہ اپنی قسم کا واحد ادارہ نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت نہایت مسلّم ہے کیونکہ اس ادارے نے نجی صنعت کاروں کے سرمائے اور حکومت کی نگرانی اور اس کے منصوبوں کو یکجا کر دیا ہے اس ادارے کے قیام کے بعد سے جو صنعتیں ملک میں پروان چڑھی ہیں ان کی بنا پر ہم اپنی بہت سی ضروریات میں خود کفیل ہوگئے ہیں یعنی غیر ملکوں کا دست نگر رہنے کی حالت ختم ہو چکی ہے۔

یہی نہیں بلکہ ہم نے اپنا زرِمبادلہ بچایا ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے بعد اس کی کارکردگی نے ہمیں جو کامیابیاں عطا کی ہیں۔ ان کی فہرست طویل ہے۔

۱۹۵۸ء میں پی، آئی، ڈی، سی کے کارخانوں نے ایک لاکھ اسّی ہزار ٹن پٹ سن کا سامان تیار کیا چار لاکھ ٹن سیمنٹ بنائی چھبیس ہزار ٹن کاغذ دس ہزار ٹن اعلیٰ اور معمولی قسم کا گتہ اڑتیس ہزار ٹن شکر بیس ہزار ٹن کیمیاوی کھاد دو لاکھ ٹن معدنی کوئلہ ایک کروڑ ۲۵ لاکھ مکعب فٹ قدرتی گیس ستر لاکھ پونڈ سوت سات لاکھ گز اونی کپڑا ایک لاکھ اونی کمبل اس کے علاوہ کیمیاوی اشیاء جیسے سنٹونین، "ڈی۔ ڈی۔ ٹی"۔ اور بروزہ اور تارپین کثیر مقدار میں تیار کی گئیں۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارخانہ جہاز سازی میں ملکی اور غیر ملکی جہازوں کی مرمت کی گئی اور چھوٹے جہاز تیار کئے گئے۔ ادارہ کی پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارناموں کی تفصیل یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ادارہ ملک کی پیداوار میں اور ملک کی پیداواری صلاحیت میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور ترقی پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق ملک کے لامحدود وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ایک طاقتور توانا اور خود کفیل پاکستان فروغ پاسکے۔

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے چھوٹی مدت کے منصوبے میں پانچ نئے منصوبے شامل کرنے کی حکومت سے سفارش کی ہے ان میں تین منصوبے مشرقی پاکستان کے لئے ہیں اور دو مغربی پاکستان کے لئے چٹاگانگ کے قریب ایک سیمنٹ فیکٹری کے قیام کا منصوبہ بھی ہے جس پر تقریباً تین کروڑ کی لاگت آئے گی فرید پور کے قریب دوا سازی اور دوسری اعلیٰ قسم کی کیمیائی اشیاء کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز بھی ہے۔ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کی سالانہ پیداوار تقریباً ۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔

بلوچستان میں کوئلے کی کانیں کھودنے کا کام اور فرید پور میں PEET کے کھودنے کا کام بھی ہے اور مغربی پاکستان میں ایک سیمنٹ فیکٹری کی توسیع جس سے سالانہ پیداوار تقریباً ۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔

اس طرح پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا یہ معروف اور مستعد ادارہ پاکستان کی صنعتی ترقی میں پوری تندہی سے مصروف ہے۔ آج جو منصوبہ کاغذ پر تیار ہوتا ہے۔ وہ کل ایک کارخانے اور ایک پروجیکٹ کی شکل میں اس سرزمین پر مجسم ہو جاتا ہے۔ کارخانوں کے کل پرزے مسلسل اور لگاتار حرکت کرتے ہیں۔ اور ملک کے لامحدود وسائل ملک کی معدنیات اور ملک کی نباتات سے ملک کی ضروریات کی مصنوعات شب و روز تیار ہوتی ہیں اور ایک ترقی پذیر صحت مند پاکستان کی تعمیر کی بنیاد بن جاتی ہیں ملک کی ترقی میں ہمیشہ صنعتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے اور صنعتیں تجارت اور اقتصادیات کی اقتصادی زندگی میں استحکام ہوتا ہے وہ ملک پروان چڑھتا ہے اس طرح پی، آئی، ڈی، سی ایک عظیم منصوبہ ہے، جو عظیم تر پاکستان کی تعمیر میں اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

یہ خوف و ہراس کیوں؟
سیریڈون استعمال کیجئے اور
تکلیف دہ ایّام سے نجات پائیے!
ہر ماہ آپ کی زندگی کو تلخ کر دینے والی تکلیف اور درد سے
فوری طور پر نجات پانے کے لئے سیریڈون استعمال کیجئے
تسکین دیتی ہے
سیریڈون درد سے تقریباً فوراً نجات دلاتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد نہ تو معدے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ بدحالی پیدا ہوتی ہے
آرام پہنچاتی ہے
سیریڈون اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے اور درد کے رفع ہو جانے کے بعد آپ راحت و مسرت محسوس کرتی ہیں۔
تازگی بخشتی ہے
درد کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ پر سیریڈون قابو پالیتی ہے اور اس کے استعمال کے چند ہی لمحوں بعد آپ پھر چستی و تازگی محسوس کرتی ہیں۔
Saridon
اصل سیریڈون صرف اصول صحت کے مطابق مُہر بند
کئے ہوئے ورقی پیکٹوں میں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔
JWT VB 226

گھر کی رونق
ALLADIN
ATCO
یہ تنہائی کا احساس کیوں؟ ذرا الہ دین بیٹری سے چلنے والا ریڈیو کھول کر
دیکھئے اور کھیل تماشے، موسیقی، اہم واقعات، خبریں اور تقریریں
غرض ہوا کے دوش پر جو رنگا رنگ دلچسپیاں بکھری پڑی ہیں اُن کا
پورا پورا لطف اٹھائیے۔
الہ دین بیٹری زیادہ عرصے تک کام دیتی ہے اور چونکہ طاقت ور ہے
اس لئے اس کی بدولت ریڈیو کی آواز صاف اور شیریں سنائی دیتی ہے۔
الہ دین ریڈیو بیٹری
نارمل ڈیوٹی اور ہیوی ڈیوٹی
ATCO ایٹکو انڈسٹریز کراچی

ہز رائل ہائینس۔ پرنس فلپ۔
ڈیوک آف ایڈنبرا
کراچی میں

ماہ نو

فروری ۱۹۵۹

۱

"میں
لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
ملکۂ ترنم نور جہاں - کہتی ہے
LUX
فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حُسن بخش صابن

۱۰۰۰۲ رسائل ۸۵۵ ۲ ۲ ۱۹۵۹ء

ماہِ نو

جلد ۱۲ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۹ء

مدیر رفیق خاور

نائب مدیر ظفر قریشی

سالانہ چندہ :- ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی :- آٹھ آنے ۸/

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

وہ تابانیاں جن کے ساتھ نیا دور طلوع ہوا تھا، بدستور جلوہ گر ہیں۔ بلکہ ان کا فروغ روزافزوں ہے۔ ابھی دورِ انقلاب کا آغاز ہوئے پورے چار مہینے بھی نہیں گزرے، پھر بھی اس قلیل عرصہ میں قومی زندگی کے ہر شعبے میں جو غیر معمولی اقدامات ہوئے ہیں، ان سے تاریخ کا ایک نیا باب مرتب ہو رہا ہے۔ اور ان کے نتائج جتنے دور رس ہیں اتنے ہی مہتم بالشان بھی ہیں۔ تاہم یہ اپنی قسم کی واحد مثال نہیں ہے۔ برصغیر کے اسلامی دور میں بارہا ایسے فوجی مجاہد پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے انتہائی تنزل و انحطاط کے زمانے میں قوم کو تباہی و بربادی سے نجات دلائی اور اس کے پیکرِ بے جاں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس شمارہ میں ہم اس تاریخی حقیقت کو ایک افسانوی دستاویز کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ خصوصی پیشکش قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

★

پاکستان جیسی آزاد اسلامی مملکت میں تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس پر منجملہ دیگر امور کے ہماری نوزائیدہ مملکت کے استوار، ترقی پذیر اور جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا دارومدار ہے۔ اب جبکہ ہمارا قومی شعور بیدار ہو چکا ہے اور ہمارے اربابِ حل و عقد کو جدید مسائل کی اہمیت کا احساس ہے، تعلیم کی نوعیت اور اس کے متعلقات پر بھی توجہ لازم ہے۔ اس سلسلہ میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے کراچی اور ڈھاکہ کے تعلیمی اجتماعات میں جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اجتہاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور امید ہے کہ بہت جلد اصلاح تجدید پر مبنی علمت عملی کی شکل میں نتیجہ خیز بھی ثابت ہوں گے۔ لہٰذا اس شمارہ میں ہم صدر پاکستان کی مذکورہ بالا دونوں تقریروں کا ملخص "افق تا افق" کے عنوان کے تحت پیش کر رہے ہیں۔

★

عجیب اتفاق، بلکہ حسنِ اتفاق ہے کہ مرزا غالب کے ایک فارسی قصیدہ "شمار یافت۔ روزگار یافت" کی تشبیب میں جن غیر معمولی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہمارے "نئے دور" کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں۔ اور مزید اتفاق یہ ہے کہ فروری کا مہینہ "غالب نام آور" ہی کی یادآوری کے لئے مخصوص ہے۔ بنابریں جہاں ہم اس یگانۂ روزگار شاعر کے بارہ میں چند خصوصی نگارشیں پیش کر رہے ہیں، خاص طور پر اس کی طویل ترین و اہم ترین مثنوی "ابرِ گہربار" کے ایک حصہ "بیانِ معراج" کا منظوم ترجمہ، وہاں مذکورہ قصیدہ کی تشبیب کے چند برجستہ اشعار بھی نقل کر رہے ہیں۔ "بیانِ معراج" کے سلسلہ میں یہ امر بھی خصوصیت سے قابلِ لحاظ ہے کہ معراج شریف کا واقعہ بھی اسی مہینہ میں شرفِ صدور لایا تھا۔

★

جیسا کہ ہم پچھلے شمارہ میں اعلان کر چکے ہیں "ماہ نو" کا مارچ کا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ ادارہ کی انتہائی کوشش ہوگی کہ اس کو ہر اعتبار سے ہماری قومی زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے۔ اور یہی توقع ہمیں اپنے قلمی معاونین، اربابِ فن اور دیگر کرم فرماؤں سے بھی ہے کہ وہ اس کار ایک قومی فرض اور خدمت سمجھتے ہوئے اس میں انتہائی ذوق و شوق سے شریک ہوں گے۔ سوال محض "نئے دور" کے اہم پہلوؤں کو ہی اجاگر کرنا نہیں اگرچہ موجودہ اجتہادات اس کا ایک وقیع حصہ ہوں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس "ہنگام باد آورد" کو حیلۂ کار بناتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں وہ روح دوڑائی جائے اور اصلاح و تجدید کے ایسے موثر و متحرک عوامل کی نشان دہی کی جائے جو موجودہ نشاۃ الثانیہ کو وسیع ترین معنوں میں نشاۃ الثانیہ اور قومی عروج و ترقی کے دیرینہ خوابوں کی بہترین تعبیر بنا دیں۔ بالفاظ دیگر یہ ہماری ملت کے تمام عناصر کو دعوت ہے کہ وہ اپنی بہترین فکری و عملی صلاحیتوں اور ادبی و فنی جوہروں کو اذنِ نمود دیں۔ اور ان بلندیوں کو چھولیں جو ہماری دنیوی و دینی، مادی و روحانی زندگی کی معراج ہیں۔

سرورق: شاہی مسجد لاہور کی دیواروں پر رنگین نقاشی

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

سیّد قدرت نقوی

مرزا غالب کے خطوط ان کی زندگی ہی میں وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے، چنانچہ سب سے پہلے منشی شیو نرائن نے غالب کو خطوط کی اشاعت کے متعلق لکھا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے ۱۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے مکتوب میں اشاعت کی مخالفت کی اور اس کو "زائد بات" کہہ کر ٹال دیا۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے بھی انہی ایام میں اشاعتِ خطوط کے متعلق لکھا اور کافی زور دیا۔ تفتہ کو بھی مرزا صاحب نے ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں صاف جواب دے دیا اور لکھ دیا: "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔"

دو سال بعد منشی عبدالغفور سرور مارہروی اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے غالب کو بغیر خبر کئے خطوط کی اشاعت کا ارادہ کر لیا، سرور نے اس کا نام "مہرِ غالب" رکھا اور دیباچہ بھی لکھ کر خاں صاحب کو دیدیا۔ ابھی طباعت کا کام شروع نہ ہوا تھا کہ ممتاز علی خاں کو پتہ چل گیا کہ منشی غلام غوث بیخبر بھی ایک مجموعۂ مکاتیب مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کام غالب کی اجازت اور امداد سے ہو رہا تھا، ان سے رابطہ قائم کر کے ممتاز علی خاں نے ان کے جمع کردہ خطوط بھی منگا لئے اور "عودِ ہندی" کے نام سے شائع کرنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن طباعت میں تاخیر ہوئی۔ احباب کا تقاضہ ہوا تو غالب نے خود اشاعتِ خطوط میں "اکمل المطابع" دہلی کے کارپردازان کا ہاتھ بٹایا اور خطوط کی نقول فراہم کیں۔ اس مجموعہ کا نام "اردوئے معلیٰ" قرار پایا۔

ان حضرات کے پیشِ نظر خطوطِ غالب کے وہ اہم پہلو نہیں تھے جو آج ہیں۔ اسی بنا پر "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ "اردوئے معلیٰ" میں صرف ایک نظریہ کارفرما تھا کہ سہل خطوط ابتدا اور مشکل خطوط آخر میں ہوں۔ چنانچہ یہی ترتیب ایک مدت تک قائم رہی مجیدی پریس کانپور میں جب اردوئے معلیٰ ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی تو مولوی محمد منیر صاحب نے حصہ اول و دوم کو یکجا کر کے ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے، یکجا جمع کر دیئے، لیکن "اردوئے معلیٰ" مطبوعہ لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی البتہ ضمیمہ میں کچھ خطوط کا اضافہ ہو گیا جو قدر بلگرامی اور لطیف احمد بلگرامی کے نام ہیں۔ یہ خطوط مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" سے نقل کئے گئے ہیں لیکن مرتب شیر محمد سرخوش صاحب نے کوئی حوالہ درج نہیں کیا۔

منشی مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کچھ خطوط تاریخی اعتبار سے ترتیب دیکر "خطوطِ غالب" کے نام سے طبع کرائے۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کی ترتیب بدل کر ہر مکتوب الیہ کے نام کے جملہ خطوط بلحاظ تاریخ مرتب کر کے "خطوطِ غالب" کے ہی نام سے دو جلدوں میں طبع کرائے۔ جن میں چند خطوط ایسے بھی ہیں جو "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں نہیں تھے، بلکہ مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا کوششوں کے باوجود اب تک خطوطِ غالب میں ترتیب کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ متن میں لفظی اور تاریخی غلطیاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تاریخی ترتیب اور صحت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر مکمل صحت کے ساتھ تاریخی ترتیب قائم ہو جائے تو ہمیں بعض تاریخی واقعات کا صحیح طور سے اندازہ ہو سکتا ہے مثلاً جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اور اہلِ دہلی پر جو ظلم و ستم کئے گئے، ان پر کماحقہٗ روشنی پڑ سکتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غالب کا روزنامچہ" خطوطِ غالب سے مرتب کیا تھا لیکن خطوط کی تاریخی ترتیب درست نہ تھی۔ اسی وجہ سے واقعاتی تسلسل اس میں برقرار نہ رہ سکا۔

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلحاظ تاریخ حسب ذیل نوعیت رکھتے ہیں:

(۱) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے۔

(۲) صحت تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب ۔ صحت تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

(۲) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے۔

ا ۔ تعین تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب ۔ تعین تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

خطوط کی مندرجہ بالا نوعیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند خطوط پر بطور مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔

"اردوئے معلیٰ" میں سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح دوسرے مکتوب الیہ ہیں۔ ان کے نام کل ۳۵ خط ہیں۔ صرف ایک خط کے علاوہ تمام خطوط پر تاریخ درج ہے۔ یہ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء سے ۲۵ اگست ۱۸۶۸ء تک لکھے گئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جب ان خطوط کو مرتب کیا جاتا ہے تو ہر سن کے خط الگ کر کے ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن دشواری یہ پیش آتی ہے کہ دن اور تاریخ بعض خطوط پر درج ہیں سنہ درج نہیں مثلاً خط ۳۳ "اردوئے معلیٰ" کانپور ص ۳۵ اسی قسم کا خط ہے۔ اس کی تاریخ غالب نے اس طرح تحریر کی ہے: "سہ شنبہ ۱۱ محرم، ۳۱ جولائی سال حال" سنین ہجری و عیسوی تقویم یا دیگر خطوط کی مدد سے متعین کئے جا سکتے ہیں کہ ۱۸۶۰ء اور ۱۲۷۷ھ ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور خط ۷ "اردوئے معلیٰ کانپور" ہے جس کی تاریخ "صبح سہ شنبہ ۲۰ ذی قعدہ و مئی معاً" مطبوعہ ہے لیکن "اردوئے معلیٰ لاہور" اور "خطوط غالب" لاہور میں "شنبہ ۲ ذی قعدہ و مئی معاً" طبع ہوا ہے۔ یہیں صفر اور سہ شنبہ کا لفظ 'سہ' مندرج نہیں جو ابتداءً کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے، بعد کو کسی نے غور نہ کیا اور یہ غلطی آج تک برقرار رہی۔ اگر تقویم کی مدد لی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے کہ ۱۸۶۲ء اور ۱۲۷۸ھ میں مئی و ذی قعدہ کی تاریخیں یکساں تھیں اور ۲ مئی کو ۱۸۶۲ء میں جمعہ واقع ہوتا ہے، شنبہ نہیں اور ۲۰ مئی کو سہ شنبہ واقع ہوتا ہے۔ اس لئے "اردوئے معلیٰ" کانپور میں تاریخ صحیح ہے۔

خط ۲۹ "اردوئے معلیٰ" کانپور ایسا خط ہے جس پر کوئی تاریخ طبع نہیں ہوئی ہے۔ "خطوط غالب" لاہور میں اس کا نمبر چھ ہے اور اس کو خط ۵ مؤرخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء اور خط ۷، ۲۷ فروری کے درمیان قرار دیا ہے۔ اس خط میں یہ ایک فقرہ تعین تاریخ میں مدد دیتا ہے:

"تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کر لیا کرو اور دبتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔"

فاضل مرتب "خطوط غالب" نے اسی فقرہ کو اساس قرار دیکر ۱۲ فروری کے خط کو مقدم اور اس کو مؤخر قرار دیا لیکن یہ خط ۱۲ فروری سے پہلے کا ہے کیونکہ: (۱) غالب نے ۱۲ فروری اور ۲۷ فروری کے خطوط میں رجب علی بیگ سرور کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر میں بھی مشورہ کے متعلق لکھا ہے اور مؤخر الذکر میں سیاح کی غلط فہمی دور کی ہے۔ ان تینوں خطوط کے فقرے علی الترتیب درج ذیل ہیں:-

۱۔ "تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کر لیا کرو اور دبتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔" (خط بغیر تاریخ)

۲۔ "نام تمہارا آسکتا ہے لیکن الف دبتا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔" (۱۲ فروری ۱۸۶۱ء)

۳۔ "بھائی ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ، اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ، ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو ان سے پوچھ لیا کرو۔ (۲۷ فروری)

خط ۲ کی مدد سے خط ۳ کا سن بآسانی متعین ہو سکتا ہے اور اگر فقرات پر گہری نظر ڈالی جائے تو خط ۱ کو خط ۲ سے مقدم تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ پہلے فقرہ میں صرف تاکید ہے اور دوسرے میں تاکید پر زور دیا گیا ہے۔ اسی تاکید مزید کو سیاح اشارہ شاگردی پر محمول کر بیٹھے اور غالب سے معلوم کیا کہ کیا کلام بھی ان کو دکھایا کروں جس کا جواب غالب نے خط ۳ میں دیا۔ بادی النظر میں خط ۱ خط ۳ ہی سے مقدم معلوم دیتا ہے کیونکہ دونوں میں "تذکیر و تانیث" کا ذکر ہے اور اسی سبب سے یہ سہو واقع ہوا۔ لیکن تاکید اور تاکید مزید پر غور کیا جائے تو ترتیب بالا ہی درست ہے۔ (۲) اس خط کو اول قرار دینے کے لئے ایک خارجی پہلو یہ ہے کہ غالب کے زمانہ میں ڈاک کا انتظام اتنا عمدہ نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے سورت تک سفر تین چار شبانہ روز میں طے ہوتا تھا (خط ۶ بنام غلام بابا) ڈاک کا ہفتہ بھر میں پہنچنا یقینی امر ہے۔ غالب نے خود سیاح کو ایک خط کے ملنے کی اطلاع اس طرح دی ہے: "تمہارا خط مرقومہ ۳۰ اگست سہ پہر بروز جمعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔" گویا یہ خط سورت سے دہلی دس دن میں آیا۔ اگر ہم ایک ہفتہ اوسط مقرر کر لیں تو ۱۲ فروری کا تحریر کردہ خط ۱۹ یا ۲۰ فروری تک

سیاح کے پاس پہنچا۔ اگر سیاح نے فوراً جواب لکھ دیا ہو تو غالب کے پاس ۲۶ یا ۲۷ فروری تک پہنچا ہوگا چنانچہ اسی تخمینہ کے مطابق ۱۲ فروری کے بعد ۲۷ فروری کا خط موجود ہے۔ درمیان میں خط کا بھیجنا قرینِ قیاس نہیں۔ سیاح اس زمانہ میں بنارس میں تھے، وہاں سے بھی ڈاک ایک ہفتہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ نیز ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کے خط کے بعد یہ خط ہے جو غالباً ۲۰ جنوری کو لکھا گیا ہوگا، لہٰذا یہ خط جنوری ۱۸۶۱ء کے عشرۂ ثانی کا قرار پاتا ہے اور ترتیب میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔

خط ۲۵ "خطوطِ غالب" جلد دوم ص۶۷ کی تاریخ ۱۷ جون ۱۸۶۶ء طبع ہے۔ "اردوئے معلی" کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ بھی چھپا ہے۔ "خطوطِ غالب" میں نہ معلوم کس بنا پر دن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سنہ تینوں کتابوں میں غلط چھپا ہے۔ اس خط کی صحیح تاریخ، سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء ہے۔ دو اور چھ کے ہندسے میں غلطی کا قوی امکان ہے۔ ناقل یا کاتب نے دو کو چھ سے بدل دیا اور یہ غلطی برقرار رہی۔ اس خط کی تاریخ متعین کرنے کے سلسلہ میں امورِ ذیل پر نظر رکھی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۲ء ہی کا ہے :۔

(۱) سہ شنبہ ۱۷ جون کو ۱۸۶۲ء میں واقع ہوتا ہے۔ غالب کی حیات میں اور کسی سنہ میں واقع نہیں ہوا جب سے کہ سیاح سے تعلقات قائم ہوئے، البتہ ۷ جون سمجھ لیا جائے تو ۱۸۶۳ء اور ۲۷ جون خیال کر لیں تو ۱۸۶۵ء مطابقت کی جا سکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی قرینہ موجود نہیں۔ تاریخ اور دن کے ہر امکانی اختلاف کو سامنے رکھ کر اگر کوشش کریں تو ۱۸۶۶ء سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں ہوتی۔

(۲) خطِ زیرِ بحث میں بریلی سے آموں کا آنا بیان کیا گیا ہے۔ جنوں بریلوی کے نام کے خطوط میں ۱۸۶۴ء میں ۲۸ جون کو ایکسوبیس آموں کا پہنچنا بیان کیا گیا ہے (خط ۲۲ بنام جنوں)، اور سیاح کے خط میں دو سو آم غالب نے وصول پائے جس میں کل تراسی آم اچھے اور ایک سو سترہ خراب نکلے۔ ۸ جون ۱۸۶۶ء کو (خط ۲۸ بنام جنوں بریلوی) آم ملنے کی اطلاع پھر جنوں کو دی گئی ہے: "جمعہ کے دن ۸ جون کو دوپہر کے وقت کہار پہنچا۔" ۸ جون جمعہ کے دن ۱۸۶۶ء میں واقع ہوتی ہے لیکن غالب سیاح کو لکھتے ہیں: "اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی" گویا ۱۷ جون کو آم ملے، لہٰذا یہ خط ۱۸۶۶ء کا نہیں، کیونکہ جنوں کو ۸ جون کو خط لکھا گیا آم ۸ کو وصول ہوئے ۱۷ جون کو نہیں۔

(۳) خطِ زیرِ بحث میں غالب نے سیاح کو میر غلام بابا کے متعلق لکھا ہے: "میر غلام بابا خانصاحب واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو، سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے لاریب فیہ۔" میر غلام بابا سے ۱۸۶۳ء میں غالب کی خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ (خط ۱ بنام غلام بابا) اور ۱۸۶۶ء تک میر صاحب غالب کی امداد بھی کر چکے تھے۔ (خط ۱۶ بنام غلام بابا)۔ ان حالات کی روشنی میں یہ عبارت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ غالب خود مداح تھے اور سیاح کا تین چار سال بعد مداح ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ سیاح سورت میں میر غلام بابا کے پاس مئی ۱۸۶۲ء میں پہنچے (خط ۱۱ بنام سیاح) جون کے اوائل میں سیاح نے خط لکھا جس میں غلام بابا کی توصیف لکھی۔ غالب نے اس کے جواب میں یہ خط لکھا۔ بنا بریں یہ خط سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء کا ہے ۱۸۶۶ء کا نہیں اور ترتیب میں اس کا نمبر ۱۲ ہونا چاہیئے۔

اسی طرح خط ۲۷ "خطوطِ غالب" جلد دوم کی تاریخ سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء درج ہے۔ اس خط کا سنہ بھی غلط چھپا ہے ۱۸۶۲ء ہونا چاہیئے۔ وجوہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء کے مطابق ہے، ۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء کو دن یکشنبہ واقع ہوتا ہے۔

۲۔ خط ۲۸ بنام سیاح محررہ ۳ جنوری ۱۸۶۷ء میں تحریر ہے: "ربیع الاول میں تمہارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی ۲۶ ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں، ۸ بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو۔" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط کو آئے ہوئے تقریباً پانچ ماہ گزر چکے ہیں، خط ۲۶، ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کا تحریر کردہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سیاح کے خط کا جواب دیر سے دیا ہے، فوراً نہیں۔ نیز سیاح کا خط ربیع الاول کے آخر میں آیا ہوگا۔ بہرحال ان خط کے حساب سے یہ عرصہ تقریباً درست ہے۔ نومبر کے خطِ زیرِ بحث کی موجودگی میں غالب کا یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ تمہارا اور نواب صاحب کا کوئی خط آج بھی نہیں آیا۔ حالانکہ خطِ زیرِ بحث میں غالب نے خود لکھا ہے: "پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا" یعنی اس خط سے پہلے بھی ایک خط مع قصیدہ آ چکا تھا۔ لہٰذا یہ خط ۱۸۶۶ء کا نہیں ہے۔

۳۔ خط ۲۵ بنام سیاح میں تصویر کا ذکر ہے اور جشن میں شرکت سے معذوری کا اظہار ہے۔ اس خط ۲۷ مورخہ ۱۸ دسمبر میں، ان میں سے کسی ایک کا بھی

ذکر نہیں حالانکہ ۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو میر غلام بابا کے خط ۲۲ میں شرکتِ جشن سے معذوری کا بیان بہ حسرت موجود ہے۔ نیز خط کے آخر میں سیاح کو مخاطب کر کے تصویر کے متعلق لکھا ہے: "ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبر آباد گئے ہیں، وہ آ جائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے"

وجوہ مندرجہ بالا کی بنا پر یہ خط سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء کا ہے ۱۸۶۶ء کا نہیں، اور اس کا نمبر ۱۳ ہے ۲۷ نہیں۔

خط ۲۳ "خطوطِ غالب" جلد دوم کی تاریخ، یکم مارچ ۱۸۶۶ء درج ہے لیکن "اردوئے معلیٰ" کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ یہ خط بھی ۱۸۶۶ء کا نہیں ہے بلکہ ۱۸۶۴ء کا ہے۔ یہ سن کی تبدیلی سہو کاتب کے سبب واقع ہوئی جس کی طرف بعد کو کسی نے غور نہیں کیا اور برقرار رہی۔ اس سلسلہ میں وجوہ ذیل ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ "اردوئے معلیٰ" کانپور اور لاہور میں دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ دن کی جب تاریخ سے مطابقت کی جاتی ہے تو ۱۸۶۴ء برآمد ہوتا ہے۔

۲۔ اسی خط میں غالب نے سیاح کو لکھا ہے: "بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا، کل ناگاہ تمہارا خط پہنچا۔" حالانکہ ۱۸۶۶ء میں "درفش کاویانی" کی طباعت کے سلسلہ میں غالب اور سیاح کی خط و کتابت جلد جلد ہو رہی تھی۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۶ء کو سیاح کا خط ملا اور ۲۱ فروری ۱۸۶۶ء کو غالب نے جواب دیا ہے (خط ۲۱) اور لکھا: "کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔" لیکن زیرِ بحث خط میں غالب کہتے ہیں: "تمہارا کوئی خط سوائے اس خط کے جس کا جواب لکھتا ہوں، ہرگز نہیں پہنچا۔" ۲۳ جنوری کو غالب نے خط لکھا تھا جس میں "درفش کاویانی" کی ترسیل میں جو دشواریاں تھیں ان کو لکھ کر جواب مانگا تھا۔ سیاح نے جواب دیا وہ ۲۰ فروری تک غالب کے پاس پہنچا۔ ۲۱ فروری کو غالب نے جواب دیا۔ اب یکم مارچ کو خط میں لکھنا کہ بہت دنوں سے خط نہیں آیا، چہ معنی دارد؟ خط میں گاہ گاہ خط بھیجنے کی تاکید کا کیا مطلب؟ ظاہر ہے کہ یہ خط ۱۸۶۶ء کا نہیں ہے بلکہ ۱۸۶۴ء کا ہے کیونکہ ۶ اگست ۱۸۶۳ء خط ۱۲ کے بعد یکم مارچ ۱۸۶۴ء تک ایک طویل عرصہ ہے جس میں خط و کتابت کا سلسلہ منقطع رہا۔

۳۔ اگر ترسیلِ خط کے زمانہ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بالکل واضح ہے کہ ۲۱ فروری کے بعد یکم مارچ کو خط بغیر کسی خاص وجہ کے نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ ۲۱ فروری کا لکھا ہوا خط یکم مارچ تک تو شاید سیاح کو بھی نہ ملا ہو۔ چہ جائیکہ غالب جواب لکھتے۔ پھر ۲۲ مارچ کا خط موجود ہے جو بین ثبوت ہے کہ یکم مارچ کا خط اس زمانہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے سال سے تعلق رکھتا ہے۔ دن کو اساس قرار دے کر سنہ تلاش کیا جائے تو ۱۸۶۴ء برآمد ہوتا ہے۔

۴۔ اگر خطوط ماقبل و مابعد پر گہری نظر ڈالی جائے تو ۲۳ جنوری، ۲۱ فروری، ۲۲ مارچ کے خطوط کی عبارت میں ربط و تسلسل معنوی موجود ہے۔ ۲۲ مارچ ہی کو ایک خط غلام بابا کو لکھا ہے۔ اس کے اور سیاح کے خط کے مضمون میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یکم مارچ کے خط کی عبارت خود بتا رہی ہے کہ میرا مقام یہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا شواہد کی بنا پر یہ خط یکم مارچ ۱۸۶۴ء کا ہے سہ شنبہ کی اسی سنہ میں مطابقت ہوتی ہے، ترتیب میں اس کا نمبر ۱۵ ہونا چاہیئے۔

خط ۳۵ "خطوطِ غالب" جلد دوم ص ۱۷۵ کی تاریخ ۲۵ جنوری ۱۸۶۸ء طبع ہوئی ہے۔ "احوالِ غالب" ص ۲۲۹ پر مختار الدین آرزو نے بھی ۱۸۶۸ء لکھا ہے۔ "اردوئے معلیٰ" مطبوعہ لاہور میں بھی ۱۸۶۸ء درج ہے۔ اس خط کی تاریخ کے سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ "اردوئے معلیٰ" کے پہلے نسخہ مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں اس کا سنہ ۱۸۶۷ء طبع ہوا (بشکریہ مولانا عرشی) اور "اردوئے معلیٰ" کانپور میں بھی ۱۸۶۷ء چھپا ہے، لیکن ۱۹۳۰ء میں جب شیخ مبارک علی نے "اردوئے معلیٰ" طبع کرائی تو ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء سے بدل گیا۔ "خطوطِ غالب" اور "احوالِ غالب" میں اسی نسخہ سے تاریخ نقل ہوئی۔ "اُردوئے معلیٰ" دہلی اور کانپور سے قطع نظر کرتے ہوئے خط کی عبارت پر غور کیا جائے تو بوجوہ ذیل ۱۸۶۷ء ہی کے نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

۱۔ خط مذکورہ میں سب سے پہلا فقرہ: "صاحب تمہارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔" خط ماسبق یعنی خط ۲۸، ۳ جنوری ۱۸۶۷ء کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں غالب نے لکھا تھا: "ربیع الاول میں تمہارا خط آیا تھا.......اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔"

۲۔ خط ۲۸، ۳ جنوری میں ٹوپیوں کی ترسیل مذکور ہے۔ زیرِ بحث خط میں انہی ٹوپیوں کے متعلق غالب نے لکھا: "ٹوپیاں اگرچہ تمہارے سر پہ ٹھیک نہ آئیں لیکن ضائع نہ گئیں، میرے شفیق اور تمہارے مربی کے صرف میں آئیں۔" آخر میں پھر ٹوپیوں کے متعلق لکھتے ہیں: "نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان سمجھنا، سیف الحق کی نذر تصور نہ کرنا۔" اس کے بعد خط ۲۹ ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء میں جبکہ سیاح کو یہ امر ناگوار گزرا ہوگا

کہ ٹوپیاں میں نے نذر کیں اور وہ "ارمغانِ غالب" بن گئیں تو ٹوپیوں کی حقیقت معلوم کی۔ غالب نے لکھا: "صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے لطائفِ غیبی کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیجکر منگوائیں، پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیجکر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے روپیوں کی لطائف خرید کر تم کو بھیجدیں۔ چاہو تم پہنو، چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔" ٹوپیوں سے متعلق تینوں خطوط کے فقرات میں ربط و تسلسل ہے۔ بالخصوص ۲۵ جنوری اور ۱۲ فروری کے خط سے ارمغان و نذر کا تعلق بدرجۂ اتم ظاہر ہے۔ غالب شاید اس خط کا جواب زیادہ سختی سے دیتے لیکن "چاہو تم پہنو چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو" لکھ کر معاملہ ختم کر دیا، کیونکہ اسی زمانہ میں سیاح کے نام سے ایک اعتراض قتیل پر شائع کرایا تھا۔ اس وجہ سے یہ معاملہ ختم کرنا پڑا کہ سیاح ناراض نہ ہو جائیں۔

۳۔ خط مذکورہ میں تعیّن سنہ کے لئے ایک اور قرینہ بھی پایا جاتا ہے جس نے غالباً مؤلف "احوالِ غالب" کو مغالطہ میں ڈالا یعنی تصویر کا ذکر "مصوّر سے سخت عاجز ہوں، وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں۔" سیاح نے تصویر کی فرمائش ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء سے قبل کی تھی جس کا جواب غالب نے خط ۲۶ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء میں دیا، بعد ازاں ۲ نومبر ۱۸۶۶ء کو میر غلام بابا کے خط ۲۷ میں سیاح کو سلام لکھنے کے بعد لکھا: "ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دوبارہ نقشہ اتارنے کو اکبرآباد گئے ہیں، وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔" جنوری میں پھر تقاضہ ہوا تو غالب نے مذکورہ بالا خط ۲۵ جنوری میں اسکا جواب دیا۔

اس کے بعد خط ۳۳ مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۷ء میں تصویر کے متعلق تحریر فرمایا: "تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں، عید کے دن وہ آئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لیکر آؤں گا۔ شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، یہ پانچواں مہینہ ہے آج تک نہیں آئے۔" اس تحریر سے ظاہر ہے کہ مصور تین مہینے سے اور فوٹوگرافر پانچ مہینے سے نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مصور نومبر ۱۸۶۶ء میں خاکہ اتار چکا تھا جو یقیناً دوسرا تھا۔ کیونکہ اگر پہلے مصوّر کا ذکر ہوتا تو عرصہ آٹھ ماہ کا ہوتا ہے تین ماہ کا نہیں۔ پہلے مصور نے وعدہ پورا نہ کیا جس کا ذکر ۲۵ جنوری کے خط میں ہے تو پہلے فوٹو بنوانے کی کوشش کی، اس کے بعد کسی دوسرے مصوّر سے تصویر بنوانا چاہی۔ اس نے بھی یہ کام ادھورا چھوڑا۔ اگر یہ خط ۱۸۶۸ء کا ہوتا تو اس میں بھی مصوّر کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافر کا ذکر ہوتا جبکہ غالب کی آخری تصویر فوٹوگراف ہی ہے جو سیاح کو غالباً اگست ۱۸۶۸ء میں بھیجی گئی تھی۔

۴۔ غالب نے فروری ۱۸۶۷ء میں ایک اعتذار "اکمل الاخبار" میں شائع کرایا تھا جس کے متعلق سیاح سے ۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء خط ۳۲ میں استفسار کیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے اکثر و بیشتر خطوط میں ذکرِ پیری و ضعف بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ خط ۳۴ مورخہ ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کا خط پڑھا جائے، اس کے بعد اس خط کو پڑھا جائے تو دونوں کے طرزِ تحریر میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پہلے میں حزن و یاس کا عالم ہے اور دوسرے میں غالب کی طبعی شوخی موجود ہے۔ عبارت بھی شگفتہ ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ غالب کی صحت نے جواب دیدیا تھا، وہ خود خط تک نہیں لکھ سکتے تھے، شوخیٔ طبع بالکل مفقود تھی جس کا اندازہ ۲۵ اگست کے خط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے لیکن اس ۲۵ جنوری کے خط میں شوخی نمایاں ہے۔ بنابریں یہ خط ۱۸۶۷ء کا ہے ۱۸۶۸ء کا نہیں، اور ترتیب میں اس کا نمبر ۲۹ ہونا چاہیئے۔

اس مضمون میں چند خطوط کی صحیح تاریخ متعین کر کے اربابِ علم و دانش کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ غالب کے تمام خطوط اسی طرح مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف اب تک مطبوعہ خطوط کی جو ترتیب کر سکا ہے اسکی کیفیت حسب ذیل ہے:۔

۱۔ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔

۲۔ "اردوئے معلیٰ" کانپور میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے یکجا کر دیئے گئے، اختلافِ تاریخ برقرار رہا۔

۳۔ "خطوط غالب" از مہیش پرشاد اور "خطوط غالب" از مولانا مہر میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے۔ وہ تاریخی ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ "مکاتیب غالب" از مولانا عرشی اور "نادراتِ غالب" از آفاق دہلوی کی ترتیب بھی اسی نوعیت کی ہے۔

اب تک خطوط غالب کی ترتیب کے یہ تین پہلو ظاہر ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کو ایک اور نوعیت سے بھی ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ یعنی مکتوب الیہم کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ دن، تاریخ اور سن کے اعتبار سے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ غالب کی زندگی کے متعلق واقعاتی تسلسل قائم ہو جائے گا، اور خطوط کے مطالعہ سے کتنے ہی اہم پہلو اجاگر ہو جائیں گے جو اس جداگانہ اور مختلف ترتیب میں نظروں سے اوجھل رہے ہیں:

دیوانِ غالب اُردو

(ایک نادر مخطوطہ)

خلیل الرحمٰن داؤدی

غالب کے اردو دیوان کی اوّلیں اشاعت اکتوبر ۱۸۴۱ء کو "مطبع سید الاخبار" دہلی سے ہوئی تھی اور دوسری "مطبع دار السلام" حوض قاضی دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں۔ ان کے علاوہ حال ہی میں ان کا ایک مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے جس کی تاریخ کتابت ۱۸۴۵ء ہے اور جس سے قیاساً دیوان کی کوئی ترتیب اس دوران میں بھی ہوئی ہے۔ ہم ان سب پر فرداً فرداً نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ کلام غالب کی اشاعت کے سلسلہ میں یہ مخطوطہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔

اشاعتِ اول کے متعلق مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب "غالب" میں فرماتے ہیں :-

> "دیوان اردو پہلی بار ۱۲۵۸ھ (۴۳-۱۸۴۲ء) میں چھپا۔ اس نسخے میں ۷۹۳ اشعر تھے۔ اس کی ترتیب کلیاتِ فارسی کی موجودہ ترتیب سے مشابہ تھی یعنی ابتدا میں قطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد، بعد میں غزلیں اور آخر میں رباعیات"۔

یہ تفصیلات صحیح نہیں۔ کیونکہ غالب کا دیوانِ اردو پہلی بار ۱۲۵۸ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں چھپا۔ نیز ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء کے مطابق ہے نہ کہ ۴۳-۱۸۴۲ء کے۔ دوسرے یہ کہ دیوان میں تعداد اشعار ۱۰۹۸ ہے، ۱۰۷۲ نہیں۔ تیسرے یہ کہ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) کی بجائے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں چھپا تھا۔ اور اس میں اشعار ۱۱۱۱ تھے نہ کہ ۱۰۹۳۔ درحقیقت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں دیوانِ غالب کا کوئی ایڈیشن ہی شائع نہیں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ مولانا مہر نے یہ معلومات اس وقت بہم پہنچائی تھیں جب کہ غالب کے متعلق زیادہ کام نہیں ہوا تھا اور اب اس کا سلسلہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

ڈاکٹر زور نے "روحِ غالب" میں مولانا مہر ہی کے بیانات نقل کر دیئے ہیں اور صرف ایک بات اضافہ کی ہے کہ پہلا ایڈیشن "فخر المطابع" سے شائع ہوا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے وہ ایڈیشن کہاں دیکھا۔ علاوہ بریں آپ نے ۱۲۵۸ھ اور ۱۸۴۲ء کی عدم مطابقت پر غور نہیں کیا۔ درحقیقت پہلا ایڈیشن فخر المطابع دہلی سے نہیں بلکہ مطبع سید الاخبار دہلی سے ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ زور صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے ۱۵ سال بعد ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا حالانکہ ۱۲۵۷ھ سے ۱۲۷۱ھ تک ۱۴ سال بنتے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ کی بجائے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوا تھا۔

آفاق دہلوی صاحب نے "نادراتِ غالب" میں زور ہی کی عبارت کو اپنا لیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے پہلے ایڈیشن کی طباعت "فخر المطابع" دہلی میں ظاہر کی ہے اور تاریخ ۱۲۵۷ھ کی بجائے ۱۲۴۵ھ بنا دی ہے۔ نبی بخش کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۵ء میں دیوانِ غالب اردو کے ختم ہو جانے کا ذکر ہے۔ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دیوان اس خط کی تحریر سے چند روز پیشتر ہی چھپا تھا اور فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ نبی بخش کو نہ بھیج سکے تھے۔ یہ استخراجِ نتائج اچنبھے سے خالی نہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے "ماہِ نو" بابت جولائی ۵۲ء میں اُردو دیوانِ غالب کے ایک نادر نسخہ پر جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نیا داخل ہوا ہے، ایک مبسوط مضمون تحریر فرمایا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ تو اشعار کی تعداد بظاہر مولانا امتیاز علی عرشی کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ بیان کی ہے اور دوسری جگہ ۱۰۷۰۔ اسی طرح انہوں نے دوسرے ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ایک جگہ ۱۱۰۰ لکھی ہے اور دوسری جگہ ۱۷۹۳۔ علاوہ بریں انہوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ رامپور والا نسخہ جس میں ۱۶۹۰ اشعار ہیں، طبع ثانی کے نسخہ سے اقدم ہے کیونکہ طبع ثانی کے نسخہ میں ۱۷۹۳ اشعار ہیں۔ رامپور والے نسخہ کے متعلق سید صاحب نے دیباچہ نظامی میں اس کے ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے جس کا سن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء ہے۔ ان امور کی صحت سے انکار نہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ رامپور کا نسخہ طبع ثانی پر کیونکر اقدم ہے۔ مضمون نگار کے استدلال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طبع ثانی نسخۂ رامپور (۱۲۷۱ھ) سے بعد ہوئی، جو صحیح نہیں،

کیونکہ اس کا سن طباعت ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تھا جیسا کہ اس نے خود اسی مضمون میں عرشی کے حوالے سے لکھا ہے۔ دراصل اس کی یہ عبارت ہی محلِ نظر ہے کہ:

"دیوانِ اردو طبعِ اول کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۰۷۲ اور طبعِ ثانی میں ۱۷۹۳ ہے"

کیونکہ طبعِ اول کی تقریظ میں اشعار ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ درج ہیں اور طبعِ ثانی کی تقریظ میں ۱۱۰۰ بیان کئے گئے ہیں اور خود دیوان میں ۱۱۱۱ ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے مضمون "غالب کے اردو کلام کی اشاعت" (مطبوعہ "ماہ نو" فروری ۵۴ء) میں طبعِ ثانی کی تعداد اشعار ۱۱۵۹ بیان کی ہے۔ اور امتیاز علی عرشی نے ۱۱۰۰ ("ماہ نو" جولائی ۵۴ء)۔ مسٹر مالک رام نے "ذکرِ غالب" کی تیسری اشاعت (مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء) میں غالب سے متعلق تمام تحقیقات کو سمو دیا ہے۔ بعد کو انھوں نے ۱۹۵۷ء میں غالب کا اردو دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ "آزاد کتاب گھر دہلی" سے شائع کیا اور اس کے مقدمہ میں دیوانِ غالب کی مختلف اشاعتوں کے متعلق تفصیلات بہم پہنچائیں۔ ان سے بھی بعض امور میں سہو ہوا ہے۔ چنانچہ پہلی کتاب میں وہ اشاعتِ اول کو "۱۵ سطری مسطر" اور دوسری میں "۱۳ سطری مسطر" لکھی ہوئی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک میں تعداد اشعار ۱۰۷۰ بیان کی گئی ہے تو دوسری میں تقریظ میں ۱۰۹۸ اور دیوان میں ۱۰۹۵۔ دوسرے ایڈیشن کی تعداد اشعار "ذکرِ غالب" میں ۱۱۵۹ ہے تو مقدمہ میں ۱۱۱۱ یعنی طبعِ اول سے ۱۶ زیادہ۔

دیوان کی اولین دو اشاعتوں کی اہم تفصیلات یہ ہیں:-

(۱) **اشاعتِ اول**:- اکتوبر ۱۸۴۱ء، مطبع سید الاخبار دہلی۔ تقریظ کا سن ۱۲۵۴ھ، تعداد اشعار "ہزار و نود و اند" یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر۔ [illegible] نے "اند" کے ہوتے ہوئے بھی "ہشت" بڑھا دیا ہے یعنی ۱۰۹۸۔ لیکن صحیح تعداد ۱۰۹۵ ہے کیونکہ کلکتہ والے قطعے کے آخری تین شعر غزلیات میں بالتکرار درج ہیں۔ اس دیوان میں دو قصیدے، ۳ قطعات اور دس رباعیاں ہیں۔

(۲) **اشاعتِ ثانی**:- مئی ۱۸۴۷ء۔ مطبع دار السلام۔ دہلی۔ تقریظ کا سن ۱۲۵۴ھ۔ تعداد اشعار ۱۱۰۰۔ اگرچہ دیوان میں اشعار کی صحیح تعداد ۱۱۱۱ ہے یعنی طبعِ اول سے ۱۶ زیادہ۔ ایک تو وہی بیسنی روٹی والا قطعہ جس کے ۲ شعر ہیں۔ دوسری "جاں کے لئے" والی غزل جس کے ۱۴ شعر ہیں۔

اب اس تیسرے نسخے کی طرف آیئے جس کا ہم نے شروع ہی میں ذکر کیا ہے۔ اس کے اہم خصائص حسب ذیل ہیں:-

صفحات: ۱۲۸؛ تقطیع: ۷½" × ۵"؛ سطور: ۱۱؛ نستعلیق، خوشخط؛ سن کتابت: ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) تعداد اشعار: ۱۱۰۷؛ تقریظ میں ۱۱۰۰ سے کچھ اوپر۔ غزلیات ۱۰۰۷؛ قصائد ۲ (۱۶۱ اشعار)، قطعات ۳ (۱۹ اشعار)، رباعیات ۱۰ (۲۰ اشعار)، صفحۂ اول یعنی سرورق پر مولوی کریم الدین پانی پتی کی دستخطی تحریر ہے: "مالک این کریم الدین سررشتہ دار محکمہ ڈائرکٹری پنجاب"۔ صفحہ ۲ سے غالب کا دیباچہ ہے یعنی "مشام شمیم آشنایاں را صلا..." آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرِ درخشاں کی تقریظ ہے جس کا سن ۱۲۵۴ھ ہے اور تعداد اشعار "یکہزار و یکصد و اند"۔ تقریظ کے خاتمہ پر کاتب کا ترقیمہ (ملاحظہ ہو متعلقہ تصویری صفحہ) اشاعت اول کے برعکس مخطوطے میں قطعۂ کلکتہ والے تین اشعار مکرر درج نہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ اشاعت اول ۱۸۴۱ء کے مطابق نہیں بلکہ اس کے بعد مرتب ہوا۔ دوسرے اشاعتِ اول کی تقریظ میں تعداد اشعار "یکہزار و نود و اند" یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر درج ہے لیکن اس مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار "یکہزار و یکصد و اند" ہے۔

یہ مخطوطہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے کیونکہ اس میں ۱۰۰۷ اشعار ہیں اور اشاعتِ ثانی میں ۱۱۱۱۔ اشاعتِ ثانی کے مذکورہ بالا ۱۶ زائد اشعار مخطوطے میں موجود نہیں۔ اس لئے یہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے۔ مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۱۰۰ سے اوپر تحریر ہے اور اشاعتِ اول کی تقریظ میں ۱۰۹۰۔ اس لئے مخطوطے کی تقریظ ۱۸۴۱ء کے بعد مرتب ہوئی ہوگی۔ اشاعتِ ثانی کی تقریظ میں تعداد اشعار مخطوطے کے مطابق ہے لیکن صحیح تعداد میں اختلاف ہے۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ مخطوطہ پہلے ایڈیشن کے بعد تیار کیا گیا اور بالتخصیص تیار کیا گیا کیونکہ اس کی تقریظ بھی بدلی گئی۔ اب تک تو یہی [illegible] ۱۸۴۱ء کے بعد ۱۸۴۷ء ہی میں تقریظ کی تعداد اشعار بدلی گئی تھی لیکن اس مخطوطے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے پیشتر ۱۸۴۵ء میں بھی تعداد اشعار ۱۰۹۰ سے اوپر کی بجائے ۱۱۰۰ سے اوپر لکھدی گئی تھی۔ دونوں اشاعتوں کے درمیان ۱۸۴۵ء میں تقریظ کی تبدیلی صاحبِ دیوان کے ایما پر ہی ہوئی ہوگی، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دہلی میں دیوان غالب کا ایک اور نسخہ ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو رہا ہو اور غالب کو اس کا علم تک نہ ہو جب کہ تقریظ بھی بدلی جا رہی ہو۔ دوسرے، اس مخطوطے کی کتابت مولوی کریم الدین پانی پتی کے لئے ہوئی جن کے پاس ۱۸۴۱ء کا مطبوعہ نسخہ ہونا یقینی ہے۔ پھر مطبوعہ نسخے کی موجودگی میں ایک اور نسخہ مرتب کرانا [illegible] ہے۔ جہاں تک

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

جاویدنامۂ غالب

مترجمہ: رفیق خاور

مدّتے ایں مثنوی تاخیر شد۔۔ اور مثنوی "ابرِ گہربار" کے بعض حصّوں۔۔ "شکوۂ غالب"۔ "مغنّی نامہ"۔ "ساقی نامہ" کے بعد یہ مثنوی شاید معرضِ تاخیر میں رہتی کہ "ہماری زبان" (علی گڑھ مورّخہ ۸ مارچ ۱۹۵۷ء) میں ان تراجم کے متعلق چند سطریں نظر سے گذریں جنہوں نے تحریک دلائی کہ مثنوی کے باقی حصّوں کا بھی ترجمہ پیش کیا جائے چنانچہ اس شمارہ میں اسکے ایک اور حصہ "بیانِ معراج" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس کو غالب کا "جاویدنامہ" قرار دینا بیجا نہ ہوگا (ر۔خ)

شبِ معراج۔

زمانے نے دیکھی ہیں راتیں ہزار
سوادِ رُخِ روشن سے جن کا نکھار
مگر رات اس طرح جادو بھری
زمانے کی آنکھوں نے دیکھی نہ تھی
وہ شب فردِ فہرستِ آثارِ عید
ہجومِ رقم سے ورق ناپدید
بہ مینائے اندیشۂ روزگار
وہ تھی موجِ سرجوشِ لیل و نہار
وہ شب دیدہ افروز کیا، دل فروز
تب و تاب سے سرمۂ چشمِ روز
زمانے سے سرشار فیضِ سحر
رُخِ مہر سے نصف شب بہرہ ور
سراپا فروغِ تجلّی وہ رات
تھی صرف ایک دن کیلئے ہی وہ رات
یہی دن تھا یہ یومِ مسعود جب
نہاتی رہی روزِ روشن میں شب
مسلسل اجالوں میں گھلتی رہی
شعاعوں میں سورج کی ڈھلتی رہی
جو دن ڈھل گیا لیلیٔ شب اٹھی
مثالِ عرب محمل آرا ہوئی

تب و تابِ رخ زیرِ زلفِ سیاہ
رواں جیسے پتلی سے نورِ نگاہ
بہر گام کرنیں اُجالے لُٹائیں
ہر اک ذرّہ کے آگے سورج بچھائیں
وہ کیا نور تھا جو میسّر نہ تھا؟
اسے مہرِ تاباں سے کیا واسطہ؟
کہاں شب کہ اک ماہ پیکر تھی وہ
سجائے ستاروں کا زیور تھی وہ
وہ لعل و جواہر بہشتِ نظر
کہ خورشید از انجملہ تھا اک گہر
اگر اک گہر کم ہوا بھی تو کیا
تجلّی میں کیا اس سے فرق آئے گا
چھپا جائے خفاش زیرِ زمیں
یہ دیکھا کہ جز صلح چارہ نہیں
رہ و رسم سورج سے پیدا کرے
محبّت سے راہِ سخن وا کرے
فروزاں تھے اس طرح اجزائے خاک
تجلّی فشاں روشن و تابناک

پسِ خاک صد جوہرِ آفتاب
ملے اس طرح جیسے دُردِ شراب
سحر آپ اپنے سے تھی بدگماں
کہ کیسے ہوا اس شب کے آگے عیاں
تمنّائے شب گیرمیں آفتاب
اگر ہوتا اس رات پا در رکاب
وہی بات ہوتی بہ چشمِ خیال
کہ ہو مشک کا رُخ پہ شاہد کے خال
ہر اک دیدۂ کور از جوشِ نور
تماشائیِ حالِ اہلِ قبور
ہے افسوس اس رات کو میں نہ تھا
جو ہوتا، زہے میرا بختِ رسا!
تو اس نور سے دل کو دیتا جِلا
بڑھاتا بصیرت کو میں برملا
لبوں سے برستے عجب قہقہے
وہ کاتب مری فردِ اعمال کے
نظر آتے یوں منفعل شرمسار
کہ آتی انہیں آپ اپنے سے عار
خرد بات کرتی پتے کی ذرا
تو اُن کو حقیقت یہ دیتی سجھا
سمجھتے نہ کچھ اور اس کے سوا
فقط جانتے ایک ہی ماجرا

کہ جیسے ہو خورشید زیرِ زمیں
چمکدار خاتم بہ پشتِ نگیں

کہ اک برق ہے جس میں رم ہی نہیں
کوئی کوندنا دمبدم ہی نہیں
کہیں کیا تھی کس درجہ عالم فروز
تجلّی سے وہ شب تھی مانندِ روز
گر اُس دن سے تشبیہہ دو تے حسیں
ہُوا کرتی شب سے تو حیرت نہیں
تھے آئینہ در پیش، روشن سرشت
عیاں تھا سبھوں پر خطِ سرنوشت
زمانے میں آنکھوں پہ بے سعی و رنج
عیاں دل کے راز اور گیتی کے گنج
یہ تھی ریزشِ نور بالائے نور
کہ تھا شش جہت ایک دریائے نور

جبریلِ امیں کی روانگی

چلی جو ہوا بالِ جبریل سے
تو موجِ گراں اٹھی اس نیل سے
صدائے ہمایون شہپر نہ پوچھ
ہمہ چشم تھے گوش کیونکر نہ پوچھ
کہ تھی روشنی خود پیامِ نگاہ
مے جلوہ پروازِ جامِ نگاہ
نگہبانِ خاصِ در کبریا
حریمِ تجلّی کا پردہ کشا
مبارک ہمائے سراپا پیام
پیام آوری سے ہی عالی مقام
نمو پرورِ عقل و روحِ رواں
نبی کے لئے محرمِ جاوداں
وہ روحِ امیں حاجبِ بابِ حق
کہ ہے جرعہ نوشِ مئے نابِ حق
سرکشِ ازل، قاصدِ اوّلیں
کہیں عقلِ اوّل جسے رازبیں
فروزاں بہ فرِ فروغِ یقیں
محمدؐ کا دل اور اس کی جبیں

پیامِ الٰہی

کہا یہ سرایندۂ راز نے
سماوات کے نغمہ پرواز نے
ہُوں یوں عرض پرداز بعد از درود
لبوں پر ہے رازِ نہاں کا سرود
کہ اے چشمِ ہستی ترے رخ پہ باز
ہے سرمایۂ ناز جس کا نیاز
خدا آپ تیرا خریدار ہے
کہ شب بھی تری روز آثار ہے
گراں پھر ترا لنگرِ ناز کیوں؟
نہیں طور تو پھر یہ انداز کیوں؟
دکھایا تھا سینا نے اوروں کو نور
کیا ہے تری رہ سے یہ سنگ دور
نہیں رہ میں کوئی جگہ سنگلاخ
کراں تا کراں ایک راہِ فراخ
اگر ہو گدا کوئی دیدار خواہ
میسر ہو جز راہ کب دیدِ شاہ؟
وہ جس کو ہو فرمانِ شاہی نصیب
ہے دربار میں سب سے شہ کے قریب
ترے دور میں لن ترانی کہن
کہاں انتہائے سخن پر سخن
خدا نے تجھے خود بلایا ہے آ
تجھے لن ترانی کا اندیشہ کیا؟
جو کچھ بھی تھا موسیٰؑ نے حق سے کہا
وہی تجھ سے ربِّ عُلا نے کہا
تو وہ ہے کہ جب سے بُلایا تجھے
کیا دور ہر گرد کو راہ سے
ہے آمین کا کیا ذکر، امین ہے راہ
سوارِ فرس ہو کہ روشن ہے راہ

یہ تنویرِ رُخ، اس سے تو اک دیا
ذرا طاقِ ابرو کے آگے جلا
میں کہتا نہیں حق ہے عاشق ترا
مگر جذبہ صادق ہے بے انتہا
خدا کو خور و خواب مشکل ہوا
تُو سوتا ہے کیا چین سے اُٹھ ذرا
سنوار اپنے شمشادِ بے سایہ کو
مسخّر کر اورنگِ نُہ پایہ کو

توصیفِ براق

ہوئے گوش آگاہ گفتار سے
تو رخشِ ہُما سایہ بخشا اُسے
فرشتوں کے ہاتھوں کا پالا ہُوا
تجلّائے حق کا اُجالا ہُوا
وہ خلدِ بریں کے حسیں سبزہ زار
اُنہیں پر پلا پیکرِ برق وار
وہ توسن کہ گر آئے مستی پہ وہ
ہو یکدم بلندی سے پستی پہ وہ
جو اخروٹ گنبد سے لڑھکے کہیں
یقیناً وہ آئے گا سوئے زمیں
تھی رفتار از بسکہ برق آفریں
بھڑک کر ہوا آگ دامانِ زمیں
براق اس قدر برق رفتار تھا
کہ زیرِ قدم راکھ ہر خار تھا
ادھر سے پیمبر کا اعجاز تھا
کہ دم سے دیا ماسوا اللہ جلا
جو مرکب کو اسوار ایسا ملا
دمِ تازہ نس نس میں پیدا ہُوا
روانی میں آئی عناں ناگہاں
زمیں اس کا میداں کراں تا کراں
عیاں ٹاپ سے گنجِ قارون ہوا
اُدھر دُم سے پروین کو برہم کیا

لہ ارنی

یونہی گزرا بیت المقدس سے وہ
اور اس کہنہ کاخِ مقرنس سے وہ

فلکِ اول

ہوا مضطرب بوسِ پا کے لئے
برابر لپٹتی رہی پاؤں سے
مگر بسکہ توسن تھا وحشت خرام
ہو قبل اس کے موجِ ہوا شاد کام
ہوا کرۂ نار سے دم میں پار
ہوا رہ گئی مضطر و بیقرار
جو پہنچا قدم تا بہ اورنگِ ماہ
تو جا پہنچی کیواں پہ مہ کی کلاہ
ہوا شاد اس درجہ اس قدر پر
کہ وہ ماہِ کامل بنا پھول کر
بلا منتِ پرتوِ آفتاب
بنا کیا سے کیا کرۂ سیم ناب
بڑی پُردلی سے وہ تحتِ شعاع
حریفانہ خورشید سے اجتماع
گریزاں ہو گر ماہ سے آفتاب
بجا ہے کہ خود رو تھا اس کا شباب
زبس تھا یہ حکمِ شہِ نامدار
کہ اس راہ میں ہو وہ منزل شمار
بتائے جو اس نے نشاں ہائے راہ
ہوئے پیک دانا پہ خوش اتنے شاہ
کہ بخشش سے اپنی نوازا اسے
مشرف کیا خاص الطاف سے
یہ بلطفِ شہنشاہِ کون و مکاں
کہ داغِ جبیں سے ہو صاحب نشاں
ہوا خاص محبوبِ درگاہ وہ
عزیزِ دل و دیدۂ شاہ وہ

فلکِ دوم

عطارد کو داغِ جبیں ہو چکا
تو پایہ بڑھا دوسرے پایہ کا
زہے وہ کشادِ خدنگِ نگاہ
بنا مشتری اس کی آماج گاہ
وہ شمع فروزاں کہ جو نیم شب
جلا دے نظر کو بہ صد تاب و تب
اسی شمع کی لَو میں حضرت نے تیر
جڑے مشتری پر کرامت نظیر
تھا بس مستِ آہنگ مدحِ نبی
عطارد نے بھر لی زباں آوری
زباں کھولی مستانہ گفتار میں
رہا فرق کوئی نہ اظہار میں
یہی تھی جو خود خواہشِ روزگار
کیا رازِ دل کو جہاں آشکار
تصور کیا پیکرِ کبریا
ہوا خود میں یوں گم کہ غالب بنا
خوشا ولولہ شوقِ بے تاب کا
ہوا یوں جو مستانہ محوِ نوا
رقم سنج ہوں جو بایں اہتمام
ہے مدحِ پیمبر میں بہتر کلام
کہ اے میں ترا ذرۂ گردِ راہ
بہ صد شوق وارفتۂ جلوہ گاہ
نظر محوِ حسنِ خدا داد ہے
ستم، داد سے جس کی برباد ہے
ہے رفتار میں رخشِ اختر فشاں
تو گفتار میں لعل و گوہر فشاں
ترا عزم ہے شاہوں کی پشت و پناہ
غریباں رہ جنت آرامگاہ
وہ گنجِ گراں سنگِ گلشائیاں
خراج اس پہ لازم ترا بے گماں
ادھر وہ تری بخششِ بے کراں
کہ پائیں جسے مفت مشائیاں
جہاں آفریں کو ہے پیارا تو ہی
گنہ بخشیوں کا سہارا تو ہی
مرا سر ہے اور خطِ فرماں ترا
زمانے کے دکھ اور درماں ترا
ہوں اس رہ میں تیرا ستائش نگار
پئے مغفرت تجھ سے امیدوار
جو طے کر چکے دوسرا مرحلہ
عطارد تھا روشن بہ نورِ صلہ

فلکِ سوم

سپہرِ سوم پر ہوئے گام زن
ہوئی رہ میں ناہید سجدہ فگن
وہ جلدی سے اس کا بہ صد اضطراب
چھپانا رباب اور جامِ شراب
کہ عشرت کے سامان پنہاں رہیں
مے و نغمہ کے دور عنواں رہیں
یہ جلدی سے اٹھی کہ گرما گئی
حرارت دل و جاں کو پگھلا گئی
قیامت کی گرمی جو سہنے لگا
لہو کھول کر تن سے بہنے لگا
نہ تنہا اڑا رنگ رخسار کا
یہ تھا حال زار اس چترنار کا
کہ تن من پہ طاری تھا اک اضطراب
ہوا چور ہاتھوں سے گر کر رباب
چبھا زخمہ ناخن میں یوں جیسے نے
وہ زخمہ کہ جب اس سے اٹھتی تھی لے
تو سینوں سے اٹھتی تھی اک ہوک سی
کہ ظالم نے کیا آگ سی پھونک دی
وہ ناظورہ خوش پیکر و خوش نظر
سراسیمہ تھی خوف سے اس قدر
کہ ہاتھوں سے اسکے گرا چھن سے ساز
وہ کیا ہوتی بے دف کے نغمہ طراز
ہوئی حلقۂ شرع میں منزوی
تو اس دف میں آئی پئے نغمگی

ہے روشن مثال ان کے آہنگ کی
وہ ساقی کہ ہو مستِ نغمہ وری
وہ موجِ نفس، وہ دمِ جاں فزا
ہوئی جس سے ناہید نغمہ سرا
سنا زہرہ کا نغمۂ دلستاں
ہوئے شاہ جب اور بالا رواں
تو اک چادرِ نور بخشی اُسے
تجلائے صد طور بخشی اُسے
ردائے فروزاں کہ وقتِ سحر
دمِ جلوہ پہنے وہ بالائے سر

فلکِ چہارم

جو طے ہو گیا تیسرا مرحلہ
تو آیا نظر اک نیا مرحلہ

سنہرا سنہرا محل شاندار
تجلی فشاں بقعۂ تابدار
کئی تاجدار اور کئی بادشاہ
کئی جم حشم اور کئی کجکلاہ
وہ دانا کہ شرمائیں ہوشنگ کو
دکھائیں اگر ہوش و فرہنگ کو
سلاطین ذی شان و الا مقام
تھے اس قصرِ عالی کے ادنیٰ غلام
شتاباں کئی راہرو شش جہات
نگاہیں بندھیں حلقۂ در کے ساتھ
اسی در پہ پھیلائے دستِ سوال
اور اس قلزمِ بے کراں سے نہال
تھا اس قصرِ عالی میں اک نامور
شہنشاہ تو کیا شہنشاہ گر
اسی سے جہانگیر ہر شہر یار
اسی سے گل افشاں ہر اک نوبہار
اگر روشنی کی ہے اس سے نمود
تو سائے کا بھی ہے اسی سے وجود

نظر صاف اور پاک جاں اس قدر
کرے سنگ اور خاک کو لعل و زر
نہ اس میں ہوس کا کوئی شائبہ
نہ کوئی کرشمہ طلسمات کا
شریعت کی تائید سے گرم کار
قیامت کا ہنگامۂ گیر و دار
ہوا اس قدر مستِ ذوقِ لقا
خوشی میں نہ تھا ہوش سر پاؤں کا
اٹھا پیشوائی کو دیوانہ وار
بڑھا سوئے مہماں پروانہ وار
اسے پار اُس حد سے پہنچا دیا
جہاں اس کا کاشانۂ نور تھا
ادھر آگے آگے مسیحا رواں
سلاطین ادھر پیچھے پیچھے رواں
دل و جاں پیمبر کا سودا لئے
قدمبوسیوں کی تمنا لئے
پس و پیش بوسے دئے اسقدر
ہوئی تنگ راہِ سفر پاؤں پر
محبت کے مارے ہوئے ہونٹ وا
ہر اک بوسے سے اک ستارہ اُگا
جو بکھرے ہیں تارے یہ آکاش پر
فضائے فلک ہے گہر بر گہر
تو پھلجھڑیاں ہیں یہ اسی رات کی
وہ نبیوں کے دولہا کی بارات کی
وہ شاہانِ عالم کا دار الاماں
جو پہنچے مقرر گھڑی پر وہاں
اُدھر مہرِ تاباں سے پہنچا نیاز
ادھر شاہوں کے سجدہ ہائے دراز
سلامِ مسیحا علیہ السلام
درودِ فراوانِ ربّ الانام
وہ کبکِ خراماں بلندی گرا
کیا اس نے ان سب پہ ظلِ ہما

سمندِ توانا و گردوں خرام
ہوا اور بھی کچھ پرے تیز گام

فلکِ پنجم

وہ راکب، وہ مرکب کہ شانِ خدا
پڑا پانچویں چرخ میں غلغلہ

وہ بہرام سالارِ چرخِ بریں
پروں سے کلہ پر کئے زیب و زیں
سرِ رہ گہر پارے چننے لگا
مگر یہ عمل کچھ نہ کام آسکا
کہ حد اس کے دامن کی تھی تا کمر
کہاں اس میں وہ چن کے رکھتا گہر
اگر صرف اپنی کلہ بھر سکا
نہ پھر بھی وہ موتی تھے کیا بے بہا
کہو کیسے با افسرِ گوہریں
ہو خورشید تاباں کا وہ ہمنشیں
اگر اس سے ہوتا توانگر تو کیا
کہاں اک سپہبد کہاں بادشا
وہ دم جس سے رگ رگ ہوا خون گرم
تھا بہرام کا دل مروت سے نرم
زبس اس کی فطرت میں اخلاص تھا
سپاسِ کرم میں سراپا وفا
رگِ گردن اس کی بہ آں خودسری
ثمر لائی تسلیم و افتادگی
گروہے صف آرائے بہرامیاں
حرم کے قریں جیسے احرامیاں
اب وجد مرے تا جہاں یاں پشنگ
کھڑے تھے قدم بر قدم تنگ تنگ
جو بازو کی قوت دکھاتے تو کیا
ہر اک ٹیک کر گھٹنے آگے بڑھا
رواں ہائے ترکانِ خنجر گزار
پر افشاں تھے ہر سمت پروانہ وار

فلکِ ششم

شمارِ سپہ سے فراغت ہوئی
تو شہ نے چھٹے چرخ کی راہ لی

نظر آیا اک معبدِ دلکشا
کہ جیسے کوئی گنبدِ خوشنما

سروشانِ فرخندہ اشفاسپند
کھڑے اس کے دروازے پہ دست بند

در و بام کاشانہ خورشید زا
وہاں معتکف ایک مردِ خدا

کہ سب خوبیاں ہیں اسی کی طفیل
نکو کاریاں ہیں اسی کی طفیل

جو دم دے کے تن کو توانا کرے
تو من کو خرد سے مجلّیٰ کرے

ہے تلخی بھی اس کی یونہی نوشِ جاں
کہ قہرِ طبیباں برِ اہلِ جہاں

ہیں نرمی بھری اس کی یوں سختیاں
کہ جس طرح استاد کی جھڑکیاں

جواں بخت بوڑھا ہمایوں صفات
دلِ زندہ سے رازدارِ حیات

نبی نے اسے بہرِ قلبِ صفا
محبت میں سینے سے لپٹا لیا

خداوند در بار و بر جیس سیل
ادھر سے کشش تھی ادھر سے بھی میل

اٹھا نور اس جذب اور میل سے
بہم شیر و شکر ہوں جیسے ملے

جو پیتے ہیں پانی بوقتِ سفر
تو شہ نے کیا نوش شیر و شکر

اُمڈ آیا تن من سے اک سیلِ نور
خوشا راہرو، چشم بد اس سے دور

پیا گھونٹ جو چشمۂ نوش سے
تو لہرا اٹھی اس ذوقِ سرجوش سے

اب اس لہر کی دلبری کیا کہیں
اور اس کیف کی سرخوشی کیا کہیں

فلکِ ہفتم

نگاہِ جہاں بیں میں اس پیر کی
در آیا چراغ اک بہ صد روشنی

اسی معبدِ آثار کاشانہ میں
کہ گر سامنے اس کی لَو کو رکھیں

ہمیں گوہرِ جاں بھی آئے نظر
پہ دھندلا ہٹوں کا تھا اس پر اثر

کیا جذب از بسکہ سینے میں دود
ہوا شعلہ کا روئے روشن کبود

وہ کجلایا منڈھپ، وہ دھندلی گپھا
وہاں ایک ہندو کا بسرام تھا

وہ ہندو کہ سوچ اس کی ٹیڑھی تمام
جنیو بٹنے ہی میں مگن صبح و شام

کلائی وہ چکر میں آئی ہوئی
اسی کام سے پیچ کھائی ہوئی

جو دیکھا سراسیمہ ہو کر اٹھا
ادب سے سواگت کی خاطر بڑھا

جنیو چھوٹ کر گر پڑا فرش پر
ہوا وہ کھڑا ہاتھوں کو جوڑ کر

گیا اس پہ افسوس کرتے ہوئے
پہ خفت کے مارے ٹھٹکتے ہوئے

زبس ہر قدم پر ادب نے کہا
اسے "دور باش" اور کرم نے "بیا"

جو دیکھا نگاہوں نے یہ ماجرا
تو وہ اس پہ حیران سا رہ گیا

کچھ اس طرح سے ہول طاری ہوئے
قدم اس کے چلنے میں بھاری ہوئے

پیمبر کہ تھے جادہ پیمائے حق
نظر بے قرارِ تماشائے حق

بہ صد شوق پوئندۂ راہ تھے
خدا ہی کے جوئندۂ راہ تھے

جو یوں سات قلعوں کو سر کر چکے
نئے معجزاتِ ظفر کر چکے

سپہرِ ثوابت

سپہرِ ثوابت ہوا آشکار
گہر ہی گہر بے حد و بے شمار

گہر پیکروں نے چپ و راست سے
ہزاروں ہی موتی نچھاور کئے

نہیں شک دلِ چرخ کلفت زدہ
فراقِ نبی سے تھا پُر آبلہ

کہ افلاک کے قلعۂ تار میں
نگہ نے کئے رخنے دیوار میں

زبس جذبۂ شوق و ذوقِ ظہور
بنا پردۂ چرخ غربالِ نور

نہ ہے شوق گستاخ، دیدار خواہ
نہ ہے حسن مستور، عاشق نگاہ

نہ ہے شوقِ بے حد کہ بے اختیار
بڑھے حسن اس کی طرف بے قرار

ملایک بھی شاید بڑی دیر سے
نبی کے لئے چشم بر راہ تھے

کیا رحمتِ حق کے سیلاب نے
بہ صد لطف چھڑکاؤ انوار سے

خراماں رہا یونہی با برگ و ساز
پئے شوق تھا اور گزرگاہِ ناز

اُدھر سات یارانِ ہمدم رواں
عقب میں برابر نظارہ کناں

ادھر قدسیاں خیل در خیل آئیں
اور اس کے پسینے پہ جانیں لٹائیں

اُمڈ آئیں کیا صورتیں رنگ رنگ
دل و جاں میں اس کے ہزاروں ترنگ

وہ ان کا عروج از جنوب و شمال
کئے باز بندِ نقابِ خیال

حمل عجز سے سر جھکائے ہوئے
اور اس پر تعلّی میں آئے ہوئے

کہ کیسا ہی حیوانِ بیگانہ ہو
پہ جس سے حصول آب اور دانہ ہو

وہ پاتا ہے اس سے جو خوراک بھی
تو از راہِ نرمی و افتادگی

زبس ان سبھوں کا وہ رکھوالا ہے
جو حیوان ہے اس کا متوالا ہے

اسی کی طرف دوڑ کر جائیں وہ
سرِ شوق بڑھ بڑھ کے سہلائیں وہ

بڑھے تا کہ اس کی طرف بے درنگ
یہ مشتاق تھی چرخ کی گاوِ شنگ

کہ خود سینگ پہلو میں تھی مارتی
ٹھوکوں سے کہتی کہ تیز اور بھی

نہ ہوتا اگر شیرِ نر سدِّ راہ
تو چرتی بہ تعجیل در خوش چراگاہ

یہ منظر براہِ خداوندِ دَور
یہ چرخِ بریں باثریا و ثور

یہ لگتا تھا ہندی گدا ہے کوئی
ہے خر مہروں سے جس کی گائے سجی

ذرا دیکھو اس کی گدائی کی شان
کہ چلنے میں بھی ہے عجب آن بان

وہ خیرات کے مانگنے کی ادا
نہاں جس میں گستاخی کی انتہا

کہاں راہبوں سے بھلا وان ہے
یہ تو اک زبردستی تاوان ہے

وہ علوی سرو شانِ فرخ لقا
وہ کاشانے ان دونوں کے دلکشا

انہوں نے کہا اک نئی لو لگائیں
نبی کے لئے حرز بازو بنائیں

بھلا اس سے بہتر ہے کیا حرز شاہ
کہ پیوند خوشحالی مہر و ماہ

کہ جب لوٹ کر آئیں وہ خاک کو
تو اندیشۂ چشم بدبیں نہ ہو

وہ توام کہ مستِ مئے شوق تھے
معاً خیر مقدم کو آگے بڑھے

پئے نذر مہماں بدست نیاز
وہ لے آئے اک تحفۂ دلنواز

وہ تحفہ جو تھا سالہا سال میں
بنایا کسی نادرہ کار نے

تھے از بسکہ دونوں بہ راہِ نبی
کمر بستۂ خدمتِ خسروی

شرف میں بڑھے اک سے تا دوسرا
ہوا ایکدم ایک سے اک جُدا

بکھیرے پڑوسی نے دُرہائے نور
تو سرطاں ہوا غرق دریائے نور

یہ کھل سم سم اس طرح دروازہ کی
جلو خانۂ مہ کی قسمت کھلی

درخشاں لآلی کی وہ آب و تاب
بنی زینتِ خانۂ ماہتاب

وہ نظارۂ خوشنما ہر طرف
بنا بہرِ بر جیس بیت الشرف

اسد نام اک قصرِ شاہانہ تھا
نہ پوچھو کہ کیا اس کا دروازہ تھا

یہ دو شوکتوں کی حدِ تام تھا
کہ یہ نقطۂ اوجِ بہرام تھا

نگہبانوں نے کھولا دروازے کو
کہ اعدا کا جس سے جگر چاک ہو

نگائے کی مانند قرباں ہوا
پہ وہ شیرِ نر گرسنہ خواں ہوا

مگر وہ کہاں، خوئے محنت کہاں
وہ گلّے کی صورت مشقت کہاں

نہ پنجے میں زور اور نہ سینے میں دم
یونہی رہ گیا بن کے شیرِ علم

اٹھے سرکئی دانوں کے خوشہ میں
کہ اٹھ اٹھ کے حضرت کو سجدہ کریں

اگر چرخ کے پاس کچھ توشہ تھا
تو اپنے ہی خرمن کا یہ خوشہ تھا

یہ تھا تیر کو فخر اس راہ پر
شرف گھر میں ہی بیٹھے آیا نظر

خزانوں کے در جب سے ہیں وا ہوئے
ہیں تُلتے جواہر تو میزان سے

جہاں پر کہ طومار ہو گنج کا
ترازو کا ہے کام ہی تولنا

فلک نے زراہِ شرف اک خیال
کیا پرورش دل میں حیرت مثال

کہ تولے زحل کو بڑے دھیان سے
بخاکِ رہِ خواجہ میزان کرے

جو پلہ زحل کا فلک کو چھوا
تو وہ دوسرا تا زمیں جھک گیا

جو عقرب میں پہنچے رسول امیں
تو اس جلوہ گہ کا خدا اُسے گزیں

ہوا دل سے خواہاں کہ وہ دوڑ کر
بڑھے سوئے سردارِ والا گہر

مگر بسکہ وہ تھا نگہبانِ راہ
اسے تو یہی تھا تردد کہ شاہ

پلٹ کر کب آئیں گے اس پار سے
تجلائے کامل کے دیدار سے

ذرا ہٹ کے جاتا کہیں وہ محال
نفر کو کہاں سرکشی کی مجال

خوشا قوس میں پھر ورودِ سعید
وہ بر جیس کو شبہ لگن کی نوید

اسی پر تھی اور ول میں وہ پیش پیش
زہے طالع غالب عجز کیش

بجا ہے اگر اس پہ ہو شادماں
کہ پہنچا ہے طالع کہاں سے کہاں
زہے بختِ خوش میرے طالع میں ہی
کماں ہے قدمبوس کس کی ہوئی
بجا ہے مرا چرخ کو شکر یہ
کہ ہے روشناس آشنا طالع مرا
کماں نے کیا بڑھ کے عرضِ ہنر
چلا اس کی زہ سے خدنگِ خبر
چھٹا تیر یوں قوس سے بے خطا
کہ بکرے کے دل میں ترازو ہوا
معاً سعد ذابح چمک کر اٹھا
کہ لے راہ سے صیدِ شہ کو اٹھا
کہ ہنگامِ جولاں بہر صید گہ
یہ ہے کارِ خاصِ جلو دارِ شہ
جو ذابح ہوا پیاس سے بے قرار
بڑھا جانبِ دلو سیماب وار
کہ کھینچے وہ کچھ ڈول دولاب سے
ہو جویائے تسکیں دمِ آب سے
یونہی کرنے والے کریں کار دیں
یونہی کرتے ہیں اہلِ خدمت یونہیں
زہے شوکتِ خواجۂ رہ سپار
ستارے بھی ہیں راہ میں پیش کار
وہ اربابِ گردوں کی کاریگری
کہ یکدم رسن دلو کی کاٹ دی
بڑے پیار سے اس کو ٹھنے لگے
کہ ماہی پیمبر کے ہاتھ آ سکے
جسے حق سے فرمانِ شاہی ملے
ہیں مہتابہ ماہی اسی کے لئے
جو یہ رہ ہوئی رفتہ رفتہ تمام
حمل سے کیا حوت تک پھر خرام
یہ آٹھوں فلک اس طرح طے کئے
کہ افلاک سو بار قرباں ہوئے

نواں آسماں یعنی عرشِ عظیم
وہ اطلس کی اس کی بساطِ قدیم
زہے نامور پایۂ سرفراز
سراپردۂ خلوتستانِ راز
سررشتۂ نازشِ این و آں
کہ پیوندِ ہستی تھا یاں درمیاں
اسی پایہ سے اس کی وابستگی
ازل سے یہی رشتۂ باہمی
اگرچہ ہے افلاکیوں سے فزوں
یہ دل درد اہلِ زمیں سے ہے خوں
کسی دل سے اٹھے ذرا بھی پکار
تو یہ پایۂ پاک ہو پُر غبار
صدائے شکستِ کمرگاہِ مور
یہاں کچھ نہیں، واں ہے شورِ نشور
نہ مہر اور انجم کا نام و نشاں
نہ دریا نمایاں نہ ریگِ رواں
نمودِ دو گیتی نہ پوچھو ہے کیا
بس اک دم ہے اس پائے کی صبح کا
یہ وہ صبح ہے جس کے رشحات کا
بس اک قطرہ شبنم ہے ہر اک سما
خدا کے پرستار ہر ہر دیار
اسی پر ہیں جوں خاک سجدہ گزار
بساط اس کی ہے خود بخود تابناک
ز آلائشِ کلفتِ رنگ پاک
صفا سطح وہ جس سے پھسلے خیال
تخیل کا واں تک پہنچنا محال
در آیا گراں مایہ مہمانِ حق
بہ رخ ماہتابِ شبستانِ حق
چلا واں کہ کوئی چلا ہی نہیں
نگہباں نہ ساتھی، ہُوا ہی نہیں
نہ واں راہبر ہے نہ واں راہزن
رواں تھا فقط ایک تن ایک من

وہ جا تھی کہ از روئے فرہنگ ورائے
بجا ہے جو کہئے نہ تھی کوئی جائے
جہت کو دمِ خودنمائی کہاں
زمان و مکاں کو روائی کہاں
غبارِ نظر ہو گیا ناپدید
سراپائے ناظر ہوا جملہ دید
کیا شہ نے بے کلفتِ سمت و سو
بہ نورِ السمٰوٰتِ والارض رو
تماشا ہلاکِ جمالِ بسیط
فروغِ نظر ایک موجِ محیط
سماعت شہیدِ کلامِ شگرف
منزہ ز آمیزشِ صوت و حرف
تکلم بہ بیرنگیٔ ذاتِ علم
سماعت خرد سے بہ اثباتِ علم
اگر لا تھا پہلا ہی بابِ اطاق
تو الّا ادھر صدر کا پیش طاق
جو لا سے ہوا تا بہ الّا رسا
تو جنبش ہوئی بے نیاز فضا
یہ تھی خلوت آبادِ راز و نیاز
جہاں در کے پٹ تھے دوئی پر فراز
ہوئی میمِ احمد سے گم سر بسر
کہ یہ ایک حلقہ تھی بیرونِ در
احد تھا عیاں با شیون و صفات
نبی محوِ حق یا صفت عینِ ذات
فروغ اس سے مہرِ جہاں تاب میں
ہر اک ذرہ کچھ اور ہی تاب میں
نہ تھا مہر سے اس کا پرتو جدا
محیطِ ضیا خود محیطِ ضیا
رقم ہائے اندازۂ بر شمار
شگافِ قلم سے تمام آشکار
دو عالم خروشِ نوا ہائے راز
مگر سب کے سب بند خم ہائے ساز

ورق در ورق نکتۂ دلپذیر
مگر سب اسیرِ خیالِ دبیر
نہ کہنے کو سننے سے دوری کوئی
نہ مشہود و شاہد میں بیگانگی
جو ہر نقشِ اظہار کو پا لیا
تو وحدت سے کثرت پہ مائل ہوا
بڑھا دل میں شوقِ نمو اس قدر
تنزل کا غلبہ ہوا فکر پر
احد کو ملی کسوتِ احمدی
میسر دمِ دولت سرمدی
زبس تھا وفا کا طبیعت میں جوش
اسی میم احمد سے حلقہ بگوش
ہر اک طرح کی نعمتیں بخششیں
سرافرازیوں کی حسیں جنتیں
میسر ہوئیں پھر انہیں بازگشت
پہ حق پر ہوئی منتہی بازگشت

٭

وہ آیا زمیں کی طرف بے درنگ
پلٹ آئے جس طرح چہرے پہ رنگ
نری سے نکل کر گیا آپ دور
پھر آیا پلٹ کر بہ اندازِ نور
نشانِ قدم سے نہ نکلا تھا پاؤں
برابر قدم اور قدموں کی چھاؤں
پڑے تھے جہاں نعلِ برقِ جہاں
اٹھیں سنگِ در سے تھی چنگاریاں
ابھی اڑ کے اوپر کو جانے کو تھیں
کہ وہ آ گئے پھر بہ سوئے زمیں
یونہی ہلتی کنڈی بھی دروازے کی
سرہانے میں، بستر میں گرمی رہی
وہ سر جس پہ رحمت کا سایہ ہوا
پلٹ آئے لے کر حبیبِ خدا
یہ وہ خواب تھا جس میں بختِ رسا
کہ سو آنکھ سے بڑھ کے بیدار تھا

٭

بُنے جا رہا تھا بہ تارِ نگاہ
وہ رختِ فروزاں کہ تھا زیبِ شاہ
سحرگہ بہ ہنگام نذرِ سجود
وہ ہم نامِ یزداں، وہ اس کا ورود
مبارک سلامت کا وہ غلغلہ
وصالِ علیؓ اور شادی فزا
مئے قدس کے رات ساغر پئے
صبوحی ملی کس کے دیدار سے
جمالِ علی چشمۂ نوش تھا
صبوحی کا دورِ مئے دوش تھا
دو ہمراز یا ہمدگر راز گو
نشانہائے بینش بہم باز گو
دو آنکھیں ہیں اور دونوں میں روشنی
یہ جو دکھتی ہیں وہ ہے ایک ہی
کہاں ہو دوئی در نبی و امام
علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام

٭

در روزگار ہا نتواند شمار یافت	خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز گرد فلک درمیاں ببیں	حق داد، دادِ حق کہ بمرکز قرار یافت
درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند	ہر کس ہر آنچہ جست بہر رہگزار یافت
آمد اگر بفرض زبالا بلا فرود	بر روئے خاک پیچ و خمِ زلف یار یافت
چوں حسن ماہ یکشبہ بینی بداں کہ ماہ	پاداشِ جانگدازیٔ شبہائے تار یافت
چوں رنگِ روئے گل نگری شاد شو کہ گل	اجرِ جگر خراشیٔ پیکانِ خار یافت
ہر کس بقدرِ فطرت خویش ارجمند گشت	ہر شے بہ حسن جوہر خویش اشتہار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز مہر گرفت	لیل و نہار صورت لیل و نہار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد	اندیشہ گنج ہائے نہاں آشکار یافت
جام از شراب روشنیٔ آفتاب داد	بزم از بساط تازگیٔ نوبہار یافت
روئے سخن صفائے بنا گوشِ گل گزید	بانگِ قلم نشاط نوائے ہزار یافت
برہم زند قاعدہ ہائے کہن بدہر	ہر کس نشاطِ تانہ ز ہر گونہ کار یافت

از انتظام شاہی و آئین خسروی
سود و سر و دو دانش و داد انتشار یافت

طلوع

(عید میلاد النبیؐ کے موقع پر)

اخلاق اختر حمیدی

کرنیں ہیں کہ ہیروں میں پروئی ہوئی لڑیاں
خورشید نے دہکا دیئے مشرق کے در و بام
مشاطۂ فطرت نے بکھیرے ہیں نئے رنگ
پھر سینۂ لالہ میں دہکنے لگے شعلے

چاندی کی قبا اوڑھ کے آئی ہے سحر بھی
گلپاش نظر آتی ہے ہر راہگذر بھی
ہیں نور میں نہلائے ہوئے کوہ و کمر بھی
پھر چاک ہوا نرگسِ شہلا کا جگر بھی

اے ماہ وشو بادہ کشو آنکھ تو کھولو
پھر شورشِ مے نوشیٔ رندانِ سحر ہے
ہر موج میں اک کیفیتِ نشۂ مے ہے
مطرب کی ہر اک لے سے برستی ہیں شعاعیں

میخانۂ مشرق میں اچھلنے لگے شیشے
پھر تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگے شیشے
ہر شاخِ گل و لالہ پہ ڈھلنے لگے شیشے
ساقی کے اشارے پہ مچلنے لگے شیشے

پھر سینۂ یزداں سے اٹھی موجِ طرب خیز
ہر شاخِ چمن منتظرِ لالہ تھی کب سے
مے نوشو اٹھو ساغر و پیمانہ سنبھالو
پھر آئی ہے شہنازِ سمن بر کی سواری

پھر وادیٔ صحرا سے ہوئے جلوے ہم آغوش
برسوں سے بہت پیاسے تھے رندانِ بلانوش
آئے ہیں سفیرانِ سحر میکدہ بر دوش
گل ریز و گہر خیز و گہر بیز و گہر پوش

صحرائے عرب مطلعِ انوارِ سحر ہے
خورشید، تری گود سے ٹوٹا ہوا تارا[۱]
ہم اہلِ زمیں محوِ رخِ لالہ مثال ہیں
یہ شمع تو پھونکوں سے بجھی ہے نہ بجھے گی

ظلمت سے کہو محفلِ گیتی سے نکل جائے
کہتا ہے کہ شاید مری تقدیر بدل جائے
گو تیرِ حسد زہرۂ افلاک پہ چل جائے
اے پھونکنے والے ترا دامن ہی نہ جل جائے

---

[۱] ہماری دنیا جو سورج سے ٹوٹ کے گری ہے۔

اساسِ کائنات

سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

بیخودی میں کل کسی آزاد نے کہدی یہ بات | ہے محبّت ہی سے پردہ دارئ رازِ حیات
ہیں یہ دونوں آب و رنگِ مہر سے سینچی ہوئی | سبزہ زاروں کی سحر ہو یا سمن زاروں کی رات
ہے محبّت برہمی دہر کو روکے ہوئے | ورنہ تھا اس کا اُلٹنا از قبیلِ ممکنات
ہیں اسی سے بزمِ کیف و وجد کی سرمستیاں | اور ہے قیدِ الم میں ہر نفس اس کا نجات
عشق کی گرمی اسی سے اخذ کرتی ہے سکوں | حسن کی نظروں کو یہ دیتی ہے رنگِ التفات
ہو کوئی گمنام، یا مزدور، یا صحرا نشیں | مرحمت کرتی ہے سب کی زندگی کو اک ثبات
ہے اسی سے روح پرور نغمۂ نے کی صدا | انجمن میں ہے یہ مضرابِ ربابِ حسّیات
مُوقلم میں کارفرما ہے مصوّر کے یہی | ذہنِ شاعر میں اسی سے ہے نزولِ واردات
عالمِ ہستی کی یہ مضبوط اک بنیاد ہے | یعنی قایم ہے محبّت پر اساسِ کائنات

مرحبا بر جانِ او، صد سجدہ ہا بر نامِ اُو
اُو خدائے ماست و ما بندۂ بے دامِ اُو

ماہِ نو، کراچی۔ فروری ۱۹۵۹ء

بہ یادِ رفتگاں:

اختر شیرانی

(ایک صدائے بازگشت)

منظر ایوبی

ایلیٹ کے مطابق کلاسکی ادب اس زمانے میں ظہور پذیر ہوتا ہے جب تہذیب، زبان اور اطوار میں پختگی آ چکی ہو۔ اس کے برعکس رومانی ادب اس زمانے میں معرضِ وجود میں آتا ہے جب ادارے، قدریں اور خود زندگی کا تانا بانا انقلاب سے دوچار ہوتا ہے اور ان میں کوئی ثبات نہیں پایا جاتا۔ ایلیٹ کا یہ قول اردو ادب پر بھی صادق آتا ہے۔ حالی اور ان کے رفقائے کار نے پرانی شاعری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک نئی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے دو نتائج برآمد ہوئے۔ ایک طرف اردو شاعری میں عقلی، سماجی، اخلاقی اور تبلیغی عناصر کی افراط ہوئی اور پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر نظم کا موضوع نیچر قرار پایا تو دوسری طرف شعر و ادب سے محض شاعرانہ آہنگ خارج ہو گیا۔ اس کی جگہ خشکی، بے لطفی اور سپاٹ پن نے لی۔ شاید اس لئے کہ افادیت اور مقصدیت کو اس عہد کے مخصوص ہنگامی حالات کے تحت فروغ حاصل ہوا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ آخر اس کے خلاف بھی آواز بلند ہوئی۔ ہمارے ادبا اور شعراء بھی مغربی ادب کی رومانوی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اقبال کی روایت شکنی اور انفرادیت کے بڑھتے ہوئے رجحان نے رومانی رجحان کو ترقی دی۔ انہوں نے کلاسکیت کی بنیادی قدروں (وضع پرستی۔ عقلیت اور میانہ روی) کے خلاف بغاوت کی۔ مگر دور کہن کے ساتھ ذہنی و قلبی روابط پھر بھی برقرار رہے۔ لہٰذا اقبال کی شاعری میں رومانیت کی صرف ابتدائی کرنیں ہی ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ خاصی تیز اور شوخ ہیں۔ شاعری میں مقصدیت رومانیت کی حقیقی روح پر سایہ فگن ہے۔

رومانیت کے صاف اور واضح خد و خال ہمیں اختر شیرانی کے یہاں نظر آتے ہیں جس کو اردو کی رومانی شاعری کا پیغمبر کہا جا سکتا ہے۔ رومانیت اس کے یہاں دل کی دھڑکن بن کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ رسمی یا روایتی نہیں بلکہ اس کی زندگی سے عبارت ہے۔ اس نے رومانیت کے اصولوں پر اپنی زندگی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ یہ اس کی روح میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس نے اردو شاعری کے فرسودہ اور پامال مضامین کو اپنے کلام کا موضوع نہیں بنایا بلکہ عام روش سے ہٹ کر زندگی کو تجربات کی بھٹی میں جلایا ہے تب کہیں جا کر اسے یہ مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ وہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس کے یہاں عشق ایک ہمہ گیر اور کائناتی رنگ لئے ہوئے ہے۔ مومن کی طرح اختر کا محبوب بھی پہلی مرتبہ کھل کر عورت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اختر خوش قسمت ہے کہ اس کا محبوب مومن کی طرح ہرجائی نہیں۔ مومن کا عشق تمام تر "بتانِ زمیں زاد" اور چلمن سے وابستہ رہا مگر اختر کی محبت ایک کھلی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ اس نے عشق کیا اور کھل کر کیا۔ یہ عشق ہی اس کی زندگی ہے۔

بعض نقاد اختر کو اردو کا کیٹس بھی کہتے ہیں کیونکہ کیٹس اور اختر میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے یہاں حیات کا تصور اور عشق کا انجام ایک ہے۔ دونوں حسن کے متلاشی ہیں۔ دونوں کے یہاں محبوبہ (یعنی براؤن اور سلمیٰ) کا تصور انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے۔ اس اشتراک کے باوجود اختر اور کیٹس میں فرق بھی بتایا جاتا ہے۔ اختر کے یہاں جذباتیت زیادہ ہے۔ اس لئے اس میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں جو کیٹس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اختر جذباتی سہی لیکن اس کا فنی شعور نہایت پختہ ہے۔ اسے خلا میں دور افتادہ موہوم بستیوں کی تلاش ضرور رہی مگر وہ زندگی کے حقائق اور اس کی قدروں سے کبھی بیگانہ نہیں رہا۔ اس کی شاعری اس کے دلی جذبات اور کوائف کی صحیح آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنی داخلی دنیا میں رہ کر وہ گل کھلائے ہیں کہ اس کا کلام فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں کیٹس کی سی گہرائی و گیرائی تلاش کرنا بیکار ہے۔ اس لئے کہ وہ وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ داخلی کی ترجمانی کرنے کے لئے حکیمانہ اور فلسفیانہ اندازِ بیان کا پابند نہیں ہے۔ وہ کائنات کو مفکر اور فلسفی کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ ایک شاعر کی آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے اور کائنات کے ہر ذرہ کو حسن کا دیوتا سمجھتا ہے۔ وہ بائرن کے اس قول کا

پابند نظر آتا ہے کہ "زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ مسرت کی تلاش ہے"۔ سلمیٰ اس کے لئے مسرت کا دائمی سرچشمہ نہیں ہے بلکہ ایک ذریعہ ہے جس سے اختر مسرت کی تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش میں اگر اس کے یہاں جذبات کی شدت اور انفرادیت پرستی ملتی ہے تو اس سے اس کی رومانی شاعری کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ رومانی شاعری کے لئے ہم آہنگی، توازن اور قطعیت ضروری نہیں بلکہ جذبات اور احساسات میں جسقدر شدت، تیزی، اور لامحدودیت ہوتی ہے اسی قدر شخصیت کی نشو و نما آزادانہ طور پر ہوتی ہے۔ اختر نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد جذبہ، احساس اور وجدان پر رکھی ہے۔ اور اس طرح اس نے رومانیت کے بنیادی اصولوں پر اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اس میں کتنا حسن ہے۔ کتنا جادو ہے۔ کتنی رنگینی ہے۔ کتنی بہار، کتنی ابدیت ہے، کتنی آفاقیت ہے، اس کا اندازہ اس کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع "سلمیٰ" ہے۔ اس کی اپنی زندگی ـــ سنہری خوابوں کی حسین تعبیر ـــ ایک بیکراں آرزو۔ ایک حسین خلش۔

سلمیٰ سے اختر کی محبت کا آغاز کسی ناساز حادثے یا اچانک ملاقات سے نہیں ہوتا بلکہ خط و کتابت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ کسی بے فکر اور الھڑ نوجوان کی طرح محبت کو زندگی کا کھلونا نہیں سمجھتا بلکہ اس کا عشق مستحکم ہے۔ یہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ یہ رسمی نہیں، حقیقی ہے۔ اس میں اس کی زندگی اور ذاتی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ وہ کھلم کھلا محبت کرتا ہے اور سلمیٰ کے گیت گاتا ہے۔ اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح اس کے یہاں بھی معاملہ بندی ملتی ہے مگر چھچھوراپن نہیں ملتا۔ وہ محبوبہ سے خط و کتابت کے لئے "ننھا قاصد" کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ خدشہ ضرور رہتا ہے کہ اس کا "ننھا قاصد" کم سن ہے، وہ دل میں ضرور سوچتا ہوگا کہ باجی خط میں کیا لکھتی ہیں اور لکھ کر اسے کیوں بھیجتی ہیں۔ اور یہ بھی سوچتا ہوگا کہ ؎

پھر ایسے اجنبی پر اس کی باجی مہرباں کیوں ہیں	اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں
یہ نوخیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے	جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے
عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا	جب اس سے پوچھتا ہے وہ اسے سمجھا نہیں سکتا

اور جب وہی "ننھا قاصد" جوان ہو کر اختر سے ملتا ہے تو اختر زمانے کے تغیر سے پریشان ہو جاتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے ؎

ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

"ننھے قاصد" سے ملتے وقت تو اختر کو زمانے کے تغیر کی پریشانی تھی مگر نظم "آج کی رات" میں اختر کی پریشانی کا سبب وہ تمام کیفیات اور جذبات ہیں جو کسی عاشق کے دل میں اس وقت موجزن ہوتے ہیں جب وہ پہلی مرتبہ اپنی محبوبہ کے سامنے آتا ہے۔ اختر کی یہ نظم اس کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ پہلے اختر کے ذہن میں سلمیٰ کے غائبانہ خط لکھنے اور اشعار کی داد دینے کے تصورات ابھرتے ہیں پھر اسے شرم، حیا، تذبذب اور کشمکش کے واہمے گھیر لیتے ہیں۔ کہتا ہے ؎

اے دل ایسا ہو کہ کچھ بات بنائے نہ بنے	حالِ دل جو بھی سنانا ہے سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو مگر پاس بٹھائے نہ بنے	شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

مگر اختر ان مراحل سے بڑی بے باکی سے گذر جاتا ہے۔ اس کی محبت پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب وہ سلمیٰ کا پہروں منتظر رہتا ہے۔ اس کے انتظار کی کیفیت یہ ہے ؎

بہارِ کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اختر بس دنیا کے ناخوشگوار حالات اور واقعات سے نبرد آزما ہونے کی جرأت نہیں ہے۔ وہ دنیا کے تمام ہنگاموں اور شورشوں سے دور تخیل کی ایک ایسی حسین دنیا میں آباد ہونا چاہتا ہے جو حسین ہو، خوبصورت ہو اور دلکشی کے تمام سامان سے آراستہ ہو، یہ صحیح نہیں۔ ایک دنیا سے اس کا فرار اور دوسری دنیا میں پناہ لینے کی آرزو مصنوعی نہیں بلکہ فطری ہے۔ کیونکہ دنیا والے محبت میں تڑپتے ہوئے دو دلوں کا ملاپ نہیں دیکھ سکتے۔ اختر کے لئے سماج کے مضبوط بندھن منظم اور مربوط رشتے جنہوں نے ارضِ مشرق کے انسانوں کو صدیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ توڑنا آسان نہیں لہٰذا وہ ظلموں، جفاؤں، آہوں، کراہوں اور گناہوں کی درد بھری دنیا اور سفاک نگاہوں سے دور رہ کر ہی سلمیٰ کے پیار کا طالب ہے۔ جہاں اس کی محبت برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں پروان چڑھ سکے، کہسار کے دامن کی مستانہ ہوائیں اس کے رِستے ہوئے زخموں کو سکھا سکیں، چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں سلمیٰ کا مرمریں پیکر تاج محل کا روپ دھار سکے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے ؎

اک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

جس شخص کے سینے میں محبت بھرا دل ہو، جس کی چشم حقیقت نگر ہو کیا وہ اختر کی اس حقیقت پرستی اور واقعیت نگاری سے انکار کر سکتا ہے جس کا عکس اس کی اس مذکورہ نظم میں ہے؟

یہ تو تھا اختر کی محبت کا آغاز، ہجر و وصال کے واقعات، اور درد و کرب اور یاس و ناامیدی کی دنیا سے دور کسی حسین جگمگاتی ہوئی بستی کی تلاش کا ذکر۔ شاعر پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس کی محبت کا جواب، محبت سے نہیں ملتا۔ اسے سلمیٰ پر پیار کی بجائے غصہ آتا ہے۔ سلمیٰ ایک کٹر مشرقی لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں وہ بھی دنیا کے رسمی بندھنوں میں جکڑ دی جاتی ہے۔ اب اس کا دل اختر کے لئے صرف تڑپ سکتا ہے، وجہ سکون نہیں بن سکتا۔ وہ محبت کے بے کراں آنسوؤں سے اپنی پیاس تو بجھا سکتی ہے، آب دیدہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی رعنائیاں اور بہاریں اب اختر کے دل کو باغ و بہار نہیں کر سکتیں بلکہ ان نکہتوں کا مستحق اب اس کا اپنا جیون ساتھی ہے۔ وہ اختر کی دنیا سے بہت دور جا چکی ہے۔ وہ اسی آنسوؤں، کراہوں اور درد بھری دنیا میں آ گئی ہے جس سے اختر نے فرار چاہا تھا۔ اس عہد میں اختر کا لب و لہجہ اور تیور شکوہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اب وہ سلمیٰ کو پھولوں کی طرح مہکتے ہوئے خطوں، اس کی نوازشوں، مسرتوں اور رعنائیوں کی یاد دلاتا ہے ؎

تم ہو اب اور مدارات ہے بیگانوں کی
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی

کہیں اس کی شکایت زیادہ تلخ اور تیز ہو جاتی ہے ؎

بادۂ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی — پہلے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا
گر نظر آئی تھی دشوار وفا کی منزل — پھر قدم راہِ محبت میں اٹھایا کیوں تھا

یہاں تک کہ وہ ایک جگہ صاف صاف کہہ اٹھتا ہے ؎

تمہارا جسم جھوٹا ہو چکا افکار بھی جھوٹے
تمہارے ہونٹ جھوٹے ہو چکے اور پیار بھی جھوٹے
تم اپنے ہاتھوں اپنی عفتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں

یہ تھے اختر کی رومانی شاعری کے رجائی اور قنوطی انداز جن کا آغاز اور اختتام سلمیٰ پر ہوتا ہے سلمیٰ ۔۔۔ ایک محور جس کے ارد گرد اختر کی

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

قومی تنزّل اور فوجی تدبّر

ہماری تاریخ میں

سید امجد علی

سات اکتوبر کا انقلاب غور کیا جائے تو ایک عظیم انقلاب تھا لیکن یہ ہماری تاریخ کا تنہا واقعہ نہیں۔ ہند و پاکستان کے مسلمان عروج و زوال کی بہت سی منازل سے گذرے ہیں، اور بارہا ایسے سخت مقام آئے ہیں۔ جب قوم کا شیرازہ منتشر ہوتا معلوم ہوتا تھا اور امید کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں لیکن ایسے نازک موقع پر ہر دفعہ مردے از غیب بروں آمد و کارے کرد۔ ان محسنانِ قوم کے نام تاریخ کے صفحات پر روشن ہیں۔ اور ہماری نظروں میں خاص وقعت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ کچھ ماضی کے دھندلکے نے ان کے نقوش کو ایک خاص عظمت اور صولت بخش دی ہے لیکن ظلم ہوگا۔ اگر قوم اس زمانے کے محسنوں کو محض اس وجہ سے لائقِ اعتنا نہ سمجھے کہ وہ ہمارے ہمعصر ہیں

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

ہمارے پہلے وزیر اعظم، لیاقت علی خاں کی شہادت کو سات سال گزر چکے تھے، اور (فرعون کے خواب کی طرح برا شگون لئے ہوئے) سات وزیر اعظم، یکے بعد دیگرے، ہماری سیاست کے اسٹیج پر گزر چکے تھے، کہ یہ امیدوں کی دنیا ویران ہوتی نظر آتی تھی۔ اور ہماری قوم کا کاروان دشتِ ظلمت میں ٹھوکریں کھا رہا تھا اس افراتفری کی حالت میں خصوصاً جمہوریت دم توڑتی نظر آتی تھی۔ سات اکتوبر کی معرکہ آرائیات سے پہلے دو ہفتوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کی مجلسِ قانون ساز میں دنگا فساد کے باعث اسپیکر کی ہلاکت واقع ہوئی۔ ادھر مرکز میں پارلیمانی حکومت نے یہ مضحکہ خیز صورت اختیار کرلی تھی کہ اراکین کابینہ کی تعداد چھیالیس تک پہنچ گئی تھی، اور اگر ان آٹھ وزیروں کو بھی شامل کر لیا جائے جو صوبجات میں تھے۔ تو مرکزی اسمبلی کے اسّی ممبروں میں سے چوّن منصب سنبھالے ہوئے تھے۔ گویا جمہوریت ایک مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن عین وقت پر غیب سے مدد آئی: ع

جب ناؤ ڈگمگائی پاس آگیا کنارا

جیسا کہ اس سے پہلے بھی بارہا ہوا تھا، اسی طرح قومی بحران کے اس خطرناک زمانے میں تاریخ میں بھی ایک بڑا انسان منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور اس نے آن کی آن میں ملک کی کایا پلٹ دی۔ اس عظیم انسان نے ملک کو ان سیاسی مردار خواروں اور ان بھیڑیوں کے ہاتھ سے نجات دلائی جنہوں نے بھیڑوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ ایک تربیت یافتہ اور اطاعت شعار فوج کی مدد سے جو قبل ازیں طوفانوں اور قحط کے سلسلے میں شاندار خدمات انجام دے کر خیر خواہیٔ ملت کا ثبوت دے چکی تھی۔ جنرل محمد ایوب خاں نے ایک خاموش انقلاب پیدا کیا اور اس طرح کہنہ و فرسودہ نظام کو مٹا کر نئی نئی امیدوں کی جوت جگائی اور از سرِ نو قومی جد و جہد اور نشو و ارتقا کا در باز کر دیا۔

اس بر وقت اور برحق انقلاب کا جس دلی اطمینان اور جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، وہ ملت کی بے غل و غش تعریف اور پُر خلوص تائید کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کے برعکس نئی حکومت نے جو بردباری، ضبط و تحمل اور نرمی و شفقت ظاہر کی ہے وہ اس کے اعلیٰ مقاصد اور بہی خواہیٔ ملت کی بہترین ضامن ہے کیونکہ اس کا واحد مقصد ایک اور صرف ایک ہے: اصلاح اور نشاۃ الثانیہ، نہ کہ جبر و تشدد۔

ایک حد تک ہم اس واقعہ کو مغربی طرز کی "جمہوریت" کی ناکامی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں جمہور اپنے صحیح نمائندے انتخاب کرنے میں ناکام رہے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انتخابات کے بعد جو میونسپل ادارے برسرِ کار آئے تھے، وہ بھی برطرف کئے جا چکے تھے۔ اور ان کا کام خاص مقرر کئے ہوئے عمّال چلا رہے تھے۔ اس لئے کہ ان اداروں کی بھاری اکثریت بھی اپنے معاملات کو سرانجام دینے میں ناکام رہی تھی۔

یہ سب کس کا قصور تھا؟ تمام تر ان قائدین کا جو بقول شخصے "اپنے آقاؤں کی درست طور پر تربیت" نہیں کر سکے تھے اور آئے دن پارٹیاں بدلنے اور اُدھر سے اِدھر ہو کر جنبہ داری برتنے اور دوسری اوچھی حرکات سے کام لینے کے باعث کسی اعلیٰ جذبہ سے سرشار ہو کر کوئی بلند پایہ قومی تحریک کی اُمنگ نہ پیدا کر سکے۔

ان وجوہ کی بناء پر کسی قسم کی "نمائندہ حکومت" کے جو انتخابات اور رائے عامہ کے بلا واسطہ اظہار پر مبنی ہو، وجود میں آنے کے لئے ہمیں فی الحال انتظار ہی کرنا پڑے گا۔ تا آنکہ کوئی مردِ کار ملک میں پوری طرح بحالیِ نظم و ضبط نہ کر دے اور عوام کو وہ امن و سلامتی اور ایک معقول حد تک خوشحالی و بہبودی میسر نہ ہو جائے جو ان کا حق در اصل مقصود ہے۔

جمہور ملک میں حالیہ انقلاب سے جو ولولہ و خروش پیدا ہوا ہے اس سے دوبارہ اُفقِ خیال اس امید سے جگمگا اٹھتا ہے کہ پاکستان اب بھی اپنے روشن مستقبل کو حاصل کر کے نقطۂ عروج پر پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ منزل کچھ ایسی بعید بھی نہیں۔ چنانچہ چند ہی ماہ کی فرصت قلیل میں تمام ملک ایک عظیم الشان تغیّر سے روشناس ہو گیا ہے۔ ناجائز درآمد و برآمد اور بددیانتی کا قلع قمع کیا جا رہا ہے، مہاجرین کی بحالی و آبادکاری کا سلسلہ تیزی سے جاری ہے، زرعی و اراضیاتی اصلاحات کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے، عوام میں تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے اور دفتری نظم و نسق کو مستعدی و کارگذاری کے اعلیٰ ترین پیمانوں پر پہنچانے کی انتہائی جد و جہد کی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں خداوند کریم کے فضل و کرم سے اپنے محبوب وطن پاکستان کے لئے ایک نہایت مہتم بالشان اور تابناک دور کی توقع کرنا چاہئے ؎
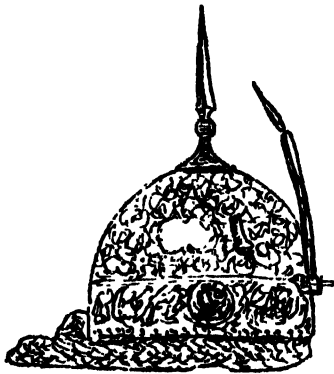
ہوائے دورِ خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

لیکن اس دورِ خزاں کو جھیل لینا بھی آسان نہ تھا۔

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمت مردم کہ ایں قدم دارد

اب ذرا قوم کے ماضی کی طرف نظر ڈالئے کہ پہلے کیسے نازک وقت اس پر آئے، اور کیسے کیسے اس کا تدارک کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ حالات کی نوعیت ہمیشہ جداگانہ ہوتی ہے، اور ایسے ہی اس کا علاج بھی۔ لیکن یہ خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ افراد کی طرح اقوام کا مزاج بھی اسی ردِعمل سے عیاں ہوتا ہے۔ جو وہ کسی نازک موقع پر ظاہر کریں۔

اس نقطۂ نظر سے مسلمانانِ برِصغیر کی تاریخ کا امعانِ نظر سے جائزہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ بخصوصاً بحران کی ان خاص مثالوں کا جب سیاسی انحطاط یا اخلاقی تنزل نے اس کو تباہی و بربادی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ قوم اس قعرِ ذلت سے کس طرح بار بار ابھری، وہ برگزیدہ عناصر کون سے تھے جو اس کی احیاءِ ثانیہ کا باعث ہوئے اس کا جاننا یقیناً دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ۔؎

بہ وصلش تا رسم صد بار برخاک افگند شوقم
کہ نوپروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

چنانچہ غور و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان مسلمانوں پر سات بار ایسی افتادیں پڑیں جب قوم کے افراد میں سے ایک اُن کی رستگاری کا باعث بنا۔ معاصرین کی زبانی ان خاص واقعات کا حال سننے کے لائق ہے، کیونکہ انہیں صرف گذارشِ احوالِ واقعی سے غرض ہے۔ نہ کہ کوئی نظریہ مرتب کرنے سے۔

با اینہمہ، اس مطالعہ سے یہ تعجب خیز نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر قومی بُحران کے بعد جو نجات دہندہ پیدا ہوا، وہ افواج ہی کی صفوں میں سے اُبھرا۔ اور اس خطّہ سے، جو اب پاکستان ہے۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق۔ بہلول لودھی اور منعم خاں، خانِ خاناں تو انقلاب کے وقت لاہور کے حاکم تھے۔ جلال الدین خلجی کا تعلق سمانہ یعنی لاہور کے اطراف میں ایک مقام سے تھا۔ فیروز تغلق ٹھٹھہ کے پاس خود موجود تھا، اور غیاث الدین تغلق اور جلال الدین خلجی کی طرح بلبن کی خاص آماجگاہ بھی پاکستان کا مغربی علاقہ رہا۔ جہاں منگولوں کے حملوں کو روکنا اور ہماری مغربی سرحدوں کو سنبھالنا اس کا خاص کارنامہ تھا۔ البتہ نجف خاں ایران سے نووارد تھا۔ ان سب نے بزم سے پہلے رزم میں اپنے جوہر دکھلائے۔ لیکن اپنی لیاقت اور تدبر کا ایسا ثبوت دیا کہ اکثر کو لوگوں نے خوشامد کر کے عنانِ حکومت کے سنبھالنے پر راضی کیا۔ جیسے غیاث الدین تغلق، فیروز تغلق، بہلول لودھی ۔

واقعات میں پوری پوری مطابقت کی تلاش بے کار ہے۔ لیکن اگر ہم سابقہ حالات کا بغور مطالعہ کریں اور پھر ہم ان کا موازنہ موجودہ صورت حال سے کریں تو ان میں کتنی ہی باتیں مشترک نظر آئیں گی۔ آئیے ہم ان انقلابات پر یکے بعد دیگرے نظر ڈالیں۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے: سلطان غیاث الدین بلبن۔ ایک معاصر مورخ منہاج السراج صاحب ”طبقاتِ ناصری“ اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

”یہ بات محسوس کی گئی کہ الغ بڑا ہونہار نوجوان ہے۔ اس لئے سلطان (شمس الدین التمش) نے اسے اپنا ذاتی مصاحب بنا لیا۔ گویا اس کے ہاتھ پر اقبال کا باز بٹھا دیا تاکہ بعد کو اس بادشاہ کی اولاد کے زمانہ میں یہ نوجوان اس کی سلطنت کو دشمنوں کی چیرہ دستی اور ریشہ دوانیوں سے بچائے اور جاہ و جلال کو درجۂ کمال تک پہنچائے۔“

۶۴۱ھ (۱۲۴۳ء) میں الغ خاں حاجب درگاہ کے عہدہ پر فائز ہوا۔ جب لشکرِ شاہی پایۂ تخت سے روانہ ہوا تو اس نے باغیوں کو شکست فاش دے کر ان کی خوب سرکوبی کی۔ اس نے کفار کے خلاف خوب لشکرکشی کی اور شاہراہوں اور گرد و پیش کے علاقوں کو باغیوں سے پاک کر دیا۔

الغ خاں نے اپنے استقلال اور پامردی سے ۱۲۴۵ء کے دوران میں ترکستان کی افواج اور منگولوں کو شجاعت اور اعلیٰ سپہ سالاری کے

ایسے جوہر دکھائے کہ انہوں نے پھر کبھی بالائی علاقوں سے سندھ کا رخ نہ کیا......

"اس سال (۶۴۷ھ ۱۲۴۹ء) اعلیحضرت ناصر الدین نے اس سپہ سالار کی زبردست قابلیت اور خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا، اس لئے ہمک مرتبہ ملک اور حاجب درگاہ سے بڑھا کر اس کو خان کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔

اور ۳ رجب ۶۴۸ھ (۱۲۵۰) کو اسے الغ کے خطاب سے ملقب کر کے سپہ سالار کے عہدے پر متعین کیا۔"

ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" مؤلفہ ۷۵۸ھ ۱۳۵۷ء میں لکھتا ہے:

"غیاث الدین بلبن ۶۶۲ھ (۶۶۴ھ مطابق ۶-۱۲۶۵ء ہونا چاہیئے) میں تخت نشین ہوا۔ وہ شمسی غلاموں میں سے تھا۔ اس کے سربرآرا ہونے سے پہلے سلطنت جاہ و جلال کے اس درجہ سے بہت ہی گر چکی تھی جہاں تک یہ سلطان شمس الدین کے عہد میں رسا ہوئی تھی۔ وہ سلطان جو کہ سلاطین مصر کا ہمسر اور شاہان عراق، خراسان اور خوارزم کا ہم پلہ تھا۔ اس کے بعد ۳۰ سال تک، اس کے بیٹوں کے زمانے میں ملکی معاملات اس کے ابتدائی جانشینوں کی سرمستیٔ شباب و عیش پرستی اور سلطان ناصر الدین کی نرمی و عاجزی کے سبب بالکل ابتر ہو چکے تھے۔ خزانہ خالی تھا اور شاہی دربار کے پاس نہ دولت تھی نہ مرکب۔ شمسی غلام خان بن چکے تھے اور ملکی دولت اور طاقت انہی میں منقسم ہو چکی تھی۔ جس کے باعث ملک پر اختیار انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ثروت و حشم اور جاہ و جلال میں وہ ایک دوسرے کے حریف تھے اور فخر و مباہات کے نشہ میں ایک دوسرے سے بآواز بلند کہتے تھے:

"تم کیا ہو جو میں نہیں ہوں اور تم کیا بن سکتے ہو جو میں نہیں بن سکتا؟" اس طرح شمس الدین کے بیٹوں کی نااہلی اور شمسی غلاموں کی رعونت نے اُس حکومت کو بالکل حقارت آمیز بنا دیا تھا جو دنیا میں اس قدر ممتاز اور برگزیدہ تھی۔

سلطان غیاث الدین معاملات ملکی میں بہت ماہر و تجربہ کار تھا ..... اس نے نظم و نسق کو بحال کیا اور اس ہر رشتہ کو خوب استوار و کارگذار بنایا جو خلل پذیر اور تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اس نے حکومت کے عزو وقار کو بحال کیا۔ اور اس کے نہایت کڑے قواعد اور عزم بالجزم نے ملک کے تمام لوگوں، ادنی و اعلیٰ کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ تمام لوگوں کے دل پر خوف و رعب طاری ہوا لیکن اس کے انصاف اور رعایا پروری نے سب کے دل کو موہ لیا.....

اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں بلبن نے اپنا اعلیٰ تدبر اور تجربہ سب سے پہلے فوج کی تنظیم پر ہی مرکوز کیا کیونکہ فوج ہی نظم حکومت کا ذریعہ و وسیلہ ہے....

اپنی ۲۲ سالہ حکومت کے دوران بلبن نے سلطنت کا عزو وقار، اس کا دبدبہ و صولت اس طرح برقرار رکھا کہ اس سے زیادہ تصور کرنا محال ہے......

عدل و انصاف میں وہ انتہائی سخت گیر تھا یہاں تک کہ اپنے خویش و اقارب، مصاحبوں، حاشیہ نشینوں اور اولاد کی بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ اور اگر ان میں سے کوئی کسی غیر منصفانہ فعل کا مرتکب ہوتا تو وہ مظلومین کی حق رسی اور تلافیٔ نقصان سے کبھی دریغ نہ کرتا۔"

کچھ وقفہ جس میں بلبن کے دو پوتے تخت نشین ہوئے

"جو تھوڑا بہت نظم حکومت قائم ہوا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔ لوگ بے روزگار تھے اور محل کے دروازوں پر انبوہ در انبوہ جمع ہو گئے۔ نظم و ضبط کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی تھی۔ اسلئے کہیں بھی امن چین نہ تھا۔ دربار کے معاملات درہم برہم ہو گئے اور کسی کام میں بھی کوئی قاعدہ دستور نہ رہا۔
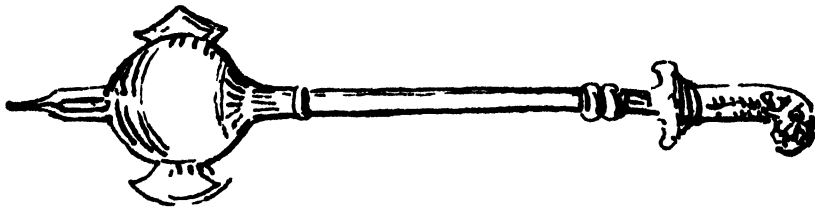
اس وقت جلال الدین، عریض ممالک کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس نے فوج کی چہرہ نویسی کی اور معائنہ کیا۔ جلال الدین کے بیٹے جو نہایت دلیر تھے، پانچ سو نفر لے کر علانیہ شاہی محل کو گئے اور خورد سال سلطان کو اپنے باپ کے پاس اٹھا لائے۔

اب یاراغیا سب نے جلال الدین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کو سواروں کے ایک بڑے دستہ کی ہمراہی میں بہارپور سے لے جا کر تخت نشین کیا۔ اس نے فوراً اپنی حیثیت مستحکم کر لی اور اس کی حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوگئی۔ اس کے اعلیٰ کردار، انصاف پسندی، شفقت و کرم اور خلوص نے عوام کی بدگمانی دور کر دی۔۔۔۔۔۔

جلال الدین ہمیشہ اپنے امرا و عمائدِ سلطنت اور رعایا کے ساتھ بڑی نرمی اور لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ ارباب کمال کا بڑا قدردان اور مربی تھا۔۔۔۔۔

●

علاء الدین کی جابرانہ مگر مضبوط حکومت، اور پھر قطب الدین اور خسرو کا دورِ آشوب

قطب الدین کی غفلت و فضول خرچی اور سابقہ نظم و ضبط کے معطل ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں بے اعتدالی پیدا ہوگئی اور ہندوؤں میں بدلی اور بغاوت کے بیج پھوٹ نکلے۔ جبر و تشدد کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ آخر جو امرا و رؤسا جمع تھے انہوں نے بیک آواز کہا کہ غاصبین نے شاہی خاندان کی کوئی نشانی بھی باقی نہیں چھوڑی اور عرض کیا کہ:

"اے غازی ملک! تمہارا ہم پر حق ہے۔ کیونکہ تم برسوں منگولوں کے خلاف ہماری سپر رہے ہو اور ان کی آمد کو روکتے رہے ہو۔ تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو تاریخ کے صفحات پر درج رہے گا۔ تم نے مسلمانوں کو ہندوؤں اور پیروانِ خسرو کے جوئے سے نجات دلائی ہے تم نے ہمارے محسنوں کا بدلہ لیا ہے اور امیر و غریب سب پر احسان کیا ہے۔۔۔۔ جتنے لوگ بھی یہاں جمع ہیں تمہارے بجز اور کسی کو بادشاہی اور حکومت کے لائق نہیں سمجھتے۔ چنانچہ تمام حاضرین نے اس کو متفقہ طور پر بادشاہ قرار دیا۔۔۔ اور وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا (۱۳۲۰ء)

سلطان ایک ہی ہفتہ میں معاملاتِ حکومت کو صحیح نہج پر لے آیا۔ اور خسرو اور اس کے ناکارہ پیروؤں نے جو بدنظمی پیدا کی تھی۔ اس کو دور کر دیا۔۔۔۔۔ تمام اہالیان ملک اس کی تخت نشینی پر بے حد خوش ہوئے، بغاوت و سرکشی ختم ہوگئی اور ہر طرف امن و اطاعت کا دور دورہ ہوا۔

اپنے جبلی جود و کرم کے باعث اس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں لگان منصفانہ طور پر، پیداوار کے مطابق لگایا جائے۔۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی احتیاط برتی جائے کہ کاشتکاری ہر سال ترقی پذیر ہو۔۔۔۔ سلطان کا دبدبہ و جلال تمام خراسان و ہندوستان پر چھا گیا اور ہند و سند کے تمام ممالک اور عمائد و سپہ سالارانِ شرق و غرب مدتوں اس سے خائف و لرزہ براندام رہے۔

سلطان کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد محمد تغلق نے حکومت کی۔ وہ ٹھٹھہ کی تسخیر کے لئے آگے بڑھ رہا تھا کہ ۱۳۵۰ء میں اسکو پیک اجل نے آن لیا۔ واپسی پر باغیان ٹھٹھہ اور منگولوں نے فوج پر حملے کئے۔

یہ آڑا وقت تھا جب اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سامنے آئی: فیروز تغلق۔ فوج دریائے سندھ کے کنارے کرب و اضطراب کے عالم میں کھڑی تھی اور اس کو جان و مال کا شدید ترین خطرہ درپیش تھا۔۔۔۔ عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔۔۔ چنانچہ سارے سردار جمع ہوئے اور فیروز شاہ کے پاس جا کر بیک آواز کہا: "تم سلطان مرحوم کے ولیعہد اور وارث ہو۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اور تم اس کے بھتیجے ہو۔ شہر یا لشکر میں کوئی ایسا شخص نہیں جس پر لوگوں کو اعتماد ہو یا وہ حکومت کا اہل ہو۔ خدا کے لئے ان بدنصیب لوگوں کو بچائیے اور تخت نشین ہو کر ہمیں اور ہزارہا دوسرے برگشتہ قسمت انسانوں کو مصیبت سے نجات دلوائیے۔۔۔۔۔ چنانچہ فیروز شاہ ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں تخت نشین ہوا۔ اور ہند و سند کے تمام ارباب ہوش نے دیکھ لیا کہ اس کے عہد مبارک میں کس طرح چنگیز خانی منگولوں کے حملے رک گئے۔"

شمس عفیف اپنی تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" (مرتبہ عہد اکبر) میں لکھتا ہے کہ:

"سابقہ سلاطین کے عہد میں غیر دانشمندانہ قوانین مرتب کئے گئے تھے جن کی وجہ سے رعیت و رعایا کو بھاری لگان ادا کرنے پڑتے تھے۔ سلطان فیروز نے احکام شریعت کو شمع راہ بنایا، ان پر بڑی تندہی سے عمل کیا اور ان کے منافی جملہ امور کی مناہی کردی۔ مقررہ سرکاری لگان سے زیادہ کچھ بھی وصول نہیں کیا جاتا تھا، اور جو افسر زیادہ وصول کرتا اس کو اس کی تلافی کرنا پڑتی۔ شاہی محل کے لئے قماش ریشم یا دیگر اشیا بازار کے نرخ پر خریدی جاتیں اور ان کی قیمت بھی ادا کردی جاتی۔ سلطان نے ایسے قوانین نافذ کئے کہ امیر غریب سب ان سے پوری طرح مطمئن تھے۔ لوگوں کے گھر اناج، مال، گھوڑوں اور دوسرے سامان سے پُر تھے۔ سب کے پاس سونا چاندی کثرت سے تھے۔ کوئی عورت ایسی نہ تھی جسکے پاس زیورات نہ ہوں۔ اور کسی گھر میں پلنگوں کی کمی نہ تھی...... سلطان فیروز نے توفیق الٰہی کے بموجب تمام محاصل ملک کو عوام میں تقسیم کردیا.... چونکہ سلطان اس قدر مہربان تھا، اسلئے سب لوگ ادنیٰ و اعلیٰ اسکے مطیع تھے۔

اور اس روشنی کے بعد پھر تاریکی! پانچ نااہل بادشاہوں کے مختصر دورِ حکومت اور پھر تیمور کا ہولناک قتل عام!! اس وقت حاکم ملتان و لاہور نے تاج شاہی سر پر رکھ کر خاندان سادات کی بنیاد ڈالی۔ جس کے چار سلاطین (۱۴۱۴ء-۱۴۵۱ء) اپنی حکومت پایۂ تخت سے باہر قائم نہ کرسکے۔ اور دہلی گوناگوں مناقشات و تنازعات کی آماجگاہ بن گئی۔ اس طوائف الملوکی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لئے ایک بار پھر لاہور ہی کا حاکم لوگوں کی رستگاری کیلئے سامنے آیا۔ یہ تھا بہلول لودھی جس نے لودھی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس اولوالعزم شخصیت کا ایک نامور مورخ نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"آخر سرکردہ امرا نے تہیہ کرلیا کہ وہ ذاتی تبختر کو خیرباد کہہ کر ایسے آدمی کو دعوتِ حکومت دیں جو ملک میں نظم و نسق قائم کرسکے...... بہلول ایک سپاہی تھا اور اس نے ارادہ کرلیا کہ ملک اپنی کھوئی ہوئی سطوت کو دوبارہ حاصل کرے.... اس کے بعد امن و سکون کے جو چار سال آئے ان میں بہلول نے سرکش سرداروں اور چھوٹے چھوٹے راجوں کو مسخر کرکے دہلی کی سابقہ طاقت کو کافی حد تک بحال کیا۔ اس کا کردار بے داغ تھا۔ وہ نمود و نمائش سے متنفر تھا۔ وہ بے حد فیاض تھا۔ غرض وہ اپنے زمانہ کے جابر بادشاہوں میں مستثنیٰ حیثیت رکھتا ہے۔"

مغلوں کے حملے سے پہلے ملک کی جو افسوسناک حالت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن ہم بابر کو ملکی نجات دہندوں میں شمار نہیں کرسکتے۔ مغلیہ دور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک کامیابی و فائز المرامی کا ایک طویل و شاندار دور تھا۔ اگرچہ اس میں بھی کئی حادثے آئے اور گذر گئے۔

مرحوم شہنشاہ نے ایک جہاندیدہ شخص منعم خاں کو کابل کا انصرام سپرد کیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے سب سے بڑے زندہ بیٹے، شاہ عالم، کی بڑی جانفشانی اور اطاعت شعاری سے خدمت کی تھی جس کے نتیجہ میں شہزادہ نے صوبۂ لاہور کی جاگیر کا انصرام اس کے سپرد کردیا تھا۔ اور اس کے لئے شہنشاہ سے صوبہ کی دیوانی کی سفارش بھی کی تھی جو شہنشاہ نے اس کو ارزانی فرمائی تھی۔ آخر کار جب منعم خاں ہی کی فراہم کردہ فوج اور دوسری امداد سے شہزادہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس کو وزارتِ اعلیٰ کے عہدہ پر فائز کرکے اس کو خانِ خاناں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ خانِ خاناں نے وزیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انتہائی خلوص، امتیاز اور دیانت داری سے سرانجام دیں۔ اس نے ہر شہر میں اپنے نام پر ایک سرائے، ایک مسجد اور ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ یہ تجویز پوری طرح عمل میں آئی۔

سنہ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کی وفات آشوب عظیم کا پیش خیمہ تھی۔ اس کے بعد پیہم و مسلسل خانہ جنگی اور مناقشات کا آغاز ہوا جس کا انجام نادر شاہ کا حملہ تھا۔ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت! پھر مرہٹوں نے اپنی بے پناہ چیرہ دستیوں سے ملک میں کہرام مچادیا۔ ہر طرف ایک قیامت صغریٰ برپا تھی جس نے ایک اور بیرونی حملہ آور ــــ احمد شاہ درانی کو دعوت یلغار دی۔ چنانچہ اس نے سنہ ۱۷۶۱ء میں وارد ہوکر مرہٹوں کا کچومر نکال دیا، لیکن اس نے ملک کی بھی اینٹ سے اینٹ

بجا دی۔ اور وہ کمزوری و ابتری کا صید زبوں بن گیا۔
شاہ عالم برائے نام تاجدار تھا۔ اُس نے الہ آباد میں پناہ لی
تھی۔ گو وہ بعد میں دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل
کرکے ۱۷۷۲ء میں پھر دہلی واپس ہوا تھا۔ اور اس سے دوام

کے ایک نئے سین کے لئے بساط بچھ گئی تھی۔

جادوناتھ سرکار اپنی تصنیف "FALL OF THE MUGHAL EMPIRE" میں لکھتا ہے:۔

"جب شاہ عالم کے بحیثیت شہنشاہ، ورودِ دہلی (۱۷۷۲ء) سے پھر پہلی بار آفتاب امید طلوع ہوا تو ہر طرف خوشی و خرمی کا منظر دکھائی دیا۔۔۔ انحطاط، بے آبادی، غریبی اور سرنگونی کے وہ بارہ سال جو پایۂ تخت نے اپنے والی کی عدم موجودگی میں بسر کئے تھے، ختم ہوگئے۔ اور اُمید بندھی کہ شاید دہلی اب پھر اپنا سر افتخار بلند کرے ۔۔۔ لیکن شہنشاہ میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ ان توقعات کو پورا کرے؟ اس کے لئے تو خود بھی گزر اوقات مشکل تھی۔ خزانہ خالی، جاگیر خالصہ قبضہ سے باہر، محلات ساز و سامان سے معرا۔۔۔۔ شاہ عالم ثانی کے سامنے جنوری ۱۷۷۲ء میں جو کام تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی پارہ پارہ سلطنت کو کس طرح دوبارہ مسخر کرے جبکہ اس کا خزانہ خالی تھا اور صوبجات میں بڑے بڑے طاقتور غاصب اپنے پاؤں مضبوطی سے گاڑے ہوئے تھے۔۔۔۔۔

اس مہتم بالشان کام کے لئے نوجوان شہنشاہ کے پاس مردانِ کار کیسے تھے؟۔۔۔۔ اس کے اردگرد جو درباری جمع تھے وہ محض سیاسی بساط کے شاطر تھے اور بس۔ ان میں سے کوئی بھی لشکری یا منتظم نہ تھا۔

شاہ عالم کی مراجعتِ دہلی کے بعد صرف ایک فرد آہستہ آہستہ مگر نہایت واضح طور پر، محض خداداد قابلیت کی بنا پر، حکومت کا مشیرِ اعلیٰ اور بساطِ سیاست کی واحد محیط کُل شخصیت بنا۔ یہ وہ آخری ممتاز مدبر و فوجی مجاہد تھا جس نے حکومت دہلی کے معاملات کی باگ ڈور سنبھالی، قبل اس کے کہ شہنشاہ دہلی محض ایک پرچھائیں، ایک کٹھ پتلی بن جائے، اور سلطنت محض ایک نام!۔۔۔۔ جب ہم نجف خاں کے کارنامۂ حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ اس کی کس بات کی سب سے زیادہ تعریف کریں ۔۔ اس کی فوجی صلاحیت، سیاسی بصیرت یا انسانیت۔ ان تمام امور میں دہلی کے تمام معاصر اعیانِ سلطنت یا ماتحت امرا میں اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ ۔۔۔ اپنے ملک کے سیدھے سادے کسانوں، تاجروں اور مفتوحہ شہروں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کا سلوک بے حد مشفقانہ تھا اور وہ اس فراخدلی کے ساتھ ان کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کرتا تھا جس کی اس زمانہ کے جنگ و جدل میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

مرزا نجف خاں ذوالفقار الدولہ، مورخین دہلی کے ذہن میں غیر معمولی جگہ رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ مغلیہ سلطنت کا آخری جلیل القدر مسلمان وزیر اعظم تھا۔ اور اس کے بعد عنان کار دو سال تک نااہل وزرا کے ہاتھوں میں رہنے کے بعد پھر عرصہ دراز کے لئے غیر ملکی حاکموں کے قبضہ میں آگئی۔ اس کے آخری ایام نے اس کے گرد یادوں کا ایک بہت ہی محبت آمیز ہالہ بنا دیا ہے، کیونکہ اس نے مغلیہ پایۂ تخت کو امن و خوشحالی کے چند لمحات عطا کئے۔ اسی لئے ۱۷۸۲ء میں اس کی وفات پر تمام ملک میں صف ماتم بچھ گئی، اور دہلی کی دنیا پر حزن و یاس کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے!

ڈاکٹر پرسیوال سپئیر اس کے متعلق ("TWILIGHT OF THE MUGHALS") میں لکھتے ہیں: "تمام اہل الرائے متفق ہیں کہ اگر حالات زیادہ سازگار ہوتے تو وہ مغلیہ حکومت کے لئے سامان نجات ثابت ہوتا۔"

یہ تھیں اس سلسلۂ عظیم کی سات جلیل القدر کڑیاں۔ اور آٹھویں؟ ۔۔ سلسلۂ مشاہیر میں اوّل بھی وہی آخر بھی وہی۔ صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان جن کے متعلق غالب کے الفاظ میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ع

از باز پسیں کارگزارانِ پیشم

★

اسلامی فنون کے علائم
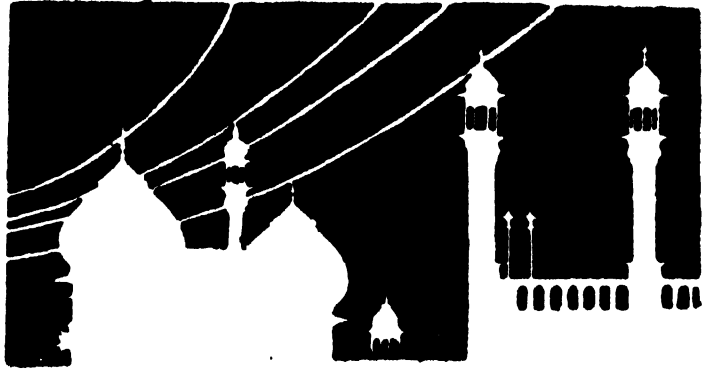
اگر اسلامی فنون کا بہ حیثیت مجموعی دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ان کی زیادہ نمایاں خصوصیات کو ٹھیک طرح متعین کرکے یہ معلوم کریں کہ انھوں نے وہ مخصوص وضع کیوں اختیار کی۔ اس طرح ہم اسلامی فنون کے ان اوصاف کو واضح کرسکیں گے جو انہیں دیگر اقوامِ عالم کے فنون سے ممیّز کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر پر بھی روشنی ڈال سکیں گے کہ اسلامی فنون کے مختلف مظاہر کس اعتبار سے مسلمانوں کی مادّی ضروریات' اور کس طرح ان کے روحانی، مذہبی اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں کونسے سیاسی و اقتصادی عوامل ہیں جنہوں نے ان کی تشکیل اور نشو و نما پر اثر ڈالا ہے۔

چونکہ اسلامی فنون کا سلسلہ پیغمبرِ اسلام کے زمانہ سے لے کر عہدِ حاضر تک جاری رہا ہے اور لتنے وسیع و عریض علاقے میں جو ہسپانیہ و مراقش سے لے کر فلپائن تک پھیلا ہوا ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ ہم ابھی ان سوالات کا کوئی قطعی جواب دینے سے بہت دور ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ابتدائی سوالات کا جواب بھی ممکن نہیں' کیونکہ اربابِ نظر نے ان میں کوئی گزشتہ پچاس سال ہی سے تو دلچسپی لینا شروع کی ہے۔ ایک اور بڑی دشواری یہ ہے کہ اسلامی فنون کو سمجھنے کے لئے اسلامی مذہب' تاریخ، ادبیات اور اقتصادی اساس اور نشو و نما کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مطالعہ اور تحقیق کے لئے کس قدر وسیع معلومات لازم ہیں۔ لہٰذا علمائے تحقیق کا رجحان یہ رہا ہے کہ یا تو وہ روایتی قسم کے "مستشرق" ہوں یا اسلامی تعمیرات و نوادر سے گہری دلچسپی رکھتے ہوں، اس قسم کے دوگونہ تبحرِ علمی کا اجتماع شاذ و نادر ہی ممکن ہوا ہے۔ اس لئے کسی معاملہ کے حقیقی وجوہ کو تلاش کرنے کی کم ہی کوششیں عمل میں آئی ہیں۔

یہ حقیقت کہ اسلامی فنون ایک مخصوص نوعیت کے حامل ہیں، اسلامی و دیگر تہذیبوں کے مظاہرِ فن میں بدیہی فرق ہے۔ اس کا احساس آج ہی نہیں' بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر ایک رباعی میں جو عمر خیام سے منسوب کی جاتی ہے' 'دود' کو جو زرتشتی عبادت کا ایک مخصوص جزو ہے' چراغ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور یہ دونوں مسجد کے بدیہی لوازمات ہیں۔ اس قسم کے اجتماع سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی فن کاروں کو مختلف قوموں کے ثقافتی مظاہر کے فرقِ باہمی کا کس قدر احساس تھا۔ اس کے علاوہ ہم اسلامی تہذیب کی مخصوص نوعیت خصوصاً اس کے مذہبی پہلو کو ایک علامت میں منعکس پاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم زندگی کے بعض عوامل کو اسلام میں کارفرما پاتے ہیں۔ کیونکہ چراغ کی یہ غیر معمولی اور اہم حیثیت ہمیشہ ہی موجود نہیں رہی اور بعض خاص معاملات ہی سے بروئے کار آئی۔ بالعموم چراغ کا صرف ایک ہی مصرف رہا ہے اور وہ لوگوں کے ذہن میں اسی طرح جاگزیں بھی... رہا ہے کہ وہ محض روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
• جس کو بڑی ہی کاریگری سے بنائے ہوئے خوش وضع، آراستہ و پیراستہ اور بعض اوقات قیمتی مسالہ سے بنے ہوئے دیوٹ یا لگن میں نصب کر دیا جاتا ہے۔

لیکن جب الغزالی نے قرآن کی ایک نہایت نکتہ آمیز آیت کی بہت ہی بلیغ و خیال افروز تفسیر کی تو اس کی حیثیت محض روشنی دینے والی آرائشی چیز سے کہیں بلند ہو گئی۔ اس عظیم مفکر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک رسالہ موسوم بہ "مشکوٰۃ الانوار" تحریر کیا جس میں سورۂ نور کی ان مشہور آیات کی تفسیر کی گئی تھی کہ " اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ"

اس کے بعد چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک یہ دستور رہا کہ محراب کی آرائش بالعموم اس طرح کی جاتی کہ اس کے کسی گوشے میں چراغ کا نقش مرتسم کر دیا جاتا۔ اور اسی طرح دوسرے گوشوں کو بھی آراستہ کیا جاتا۔ جیسا کہ خیام کی مذکورہ بالا رباعی سے ظاہر ہے کہ دنیائے اسلام میں چراغ ایک علامت کی حیثیت

اختیار کر چکا تھا یعنی ایک ہستیٔ غیب کی محسوس و مرئی علامت۔ لیکن آہستہ آہستہ اس علامت کی مقبولیت میں کمی کے باعث اس کی قوت بھی ماند پڑ گئی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ تزئین و آرائش کے بے پناہ شوق کے باعث یہ بلیغ علامت آہستہ آہستہ محض آرائشی چیز بن کر رہ گئی جس میں چراغ بلوریں، جو نورِ حق کی علامت تھا، گلدانوں میں مبدل ہو گیا۔ اور جوں جوں ہم عہد بہ عہد آرائشوں پر نظر ڈالیں، اس تغیر کا یکے بعد دیگرے مختلف حالتوں میں سراغ لگا سکتے ہیں۔ یوں تو اکثر تہذیبوں میں خالی سطح کو نقش و نگار سے آراستہ کرنے کی شدید تمنا پائی جاتی ہے، لیکن دنیائے اسلام میں یہ شوق خاص طور پر نمایاں ہے۔ گو یہ رجحان بعض نہایت عمدہ و نفیس فنی تخلیقات میں جلوہ گر ہوا ہے، پھر بھی اس کی طبعی رغبت نے ایک رُوحانی چیز کو محض مادّی و خارجی حسن کا مظہر بنا دیا، جیسا کہ خود چراغ کے سلسلہ میں ہوا تھا۔

غرض جہاں تک چراغ کا تعلق ہے یہ تو صرف کچھ عرصہ ہی کے لئے علامت کے طور پر مستعمل رہا۔ اس کے علاوہ دیگر علامات کیا تھیں؟ ایک طرح مسجد کو بھی اسلامی تہذیب کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں مسجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ خانۂ خدا ہے اور بلا شبہ اسلامی فن کے خارجی مظہر کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کے مختلف نمونے اس قدر ہم وضع اور مخصوص نوعیت کے حامل نہیں ہیں کہ ایک عمومی، عالمگیر دلالت پیدا کر سکیں۔ مثال کے طور پر مساجد کی ساخت عموماً یہ ہوتی ہے: ایک احاطہ، اس کے گرد چار دیواری، تعمیری حصہ اور اس کے سامنے صحن میں حوض یا فوارہ۔ یہی کیفیت مشرقِ اقصیٰ اور بحیرۂ قلزم کے گرد و پیش کے اسلامی علاقوں کے نجی مکانات میں بھی نظر آتی ہے۔ جن میں صرف جسامت ہی کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، باقی رہے اونچے اونچے گنبد، تو کیا وہ مسجد، مدرسہ یا کم از کم کسی بزرگ کے روضہ کے آئینہ دار نہیں ہو سکتے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ فردوسی کے "شاہنامہ" میں بھی جہاں جہاں طلوعِ سحر کا نقشہ کھینچا گیا ہے، وہاں گنبدوں کے پیچھے سے سورج کے نمودار ہونے اور ان کو سنہری بنا دینے کا ذکر ہے۔ جس کا اطلاق ظاہر ہے ایران قدیم ہی کی عمارات ہی پر ہو سکتا تھا۔ اسی طرح "مینار" بھی اپنی مخصوص نوعیت کے ساتھ دیگر اغراض و مقاصد کے لئے پہلے ہی موجود تھا۔ اور اذان کے لئے یہ متعدد صورتوں میں سے کوئی صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ جن میں سے بعض کو برجوں کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی، لہٰذا مسجد جیسی بنیادی چیزوں میں بھی جن میں دنیاوی چیزوں کی بہ نسبت مذہبی اُصولوں پر زیادہ شدت سے عملدر آمد ہوتا ہے۔ ایک طرف تاریخی نشو و نما کے قدرتی رجحانات اور دوسری طرف مقامی اثرات کے باعث — کیونکہ اسلامی فنِ تعمیر بالعموم سابقہ اسالیب ہی پر مبنی ہوتا تھا — کافی فرق پایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسجدوں میں نہ صرف جا بجا عربی وضع کی مساجد دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایران، ترکی، ہندوستان اور چین میں بھی مقامی وضع کی مساجد نظر آتی ہیں۔ ان انواع و اقسام کی مساجد کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ عبادت خانے صرف مذہب اور عبادت ہی کی مستقل اہمیت پر دلالت کرتے ہیں، یا زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس غیر معمولی کثرت کے آئینہ دار ہیں جو اسلامی تہذیب کی مجموعی وحدت کے پردہ میں پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ عالمِ اسلام میں کوئی ایسے مظاہر بروئے کار نہیں آئے جو عمومی اور اسلامی دلالت کے حامل ہوں اور اس کی حقیقی علامت قرار دیئے جا سکیں۔ اگر کوئی ایسے مظاہر تھے تو وہ یا تو ذوالفقار کی طرح بالکل محدود نوعیت کے تھے یا نجم و ہلال کی طرح نسبتاً بہت ہی قریبی زمانہ میں نمودار ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس لئے یہ چیزیں ساری اسلامی تہذیب کے لئے مجموعی طور پر ایک معنی خیز، نمائندہ حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے جدید زمانہ کے سکہ جات، پرچموں یا ڈاک کے ٹکٹوں میں بھی کوئی ایسا علاماتی مظہر بروئے کار نہیں آیا جس کو اسلامی معاشرت کی ایک مسلمہ و عالمگیر علامت تسلیم کیا گیا ہو۔ سوال اٹھتا ہے کیا کبھی ایسی کوئی علامت نمودار بھی ہو گی یا نہیں؟ یہ تمام تر اس امر پر موقوف ہے کہ دو متضاد رجحانات میں سے کونسا رجحان غالب رہتا ہے: اسلام کی عالمگیری کا مشترک احساس یا مختلف قومیتوں کا ظہور۔

با ایں ہمہ ایک چیز شروع سے آخر تک اسلامی فنون کی حقیقی علامت ضرور رہی ہے: عربی رسم الخط۔ اس کے ساتھ دلی لگاؤ، اور اس کا یادگاروں، عمارتوں، اشیاء اور سکہ جات پر بکثرت و مسلسل استعمال نہ صرف اسلامی اتحاد کا ایک نہایت مضبوط رشتہ رہا ہے بلکہ اسلامی فن کے ایک نہایت اہم، بلیغ اور مختص مظہر کا باعث بھی ہوا ہے۔ ہمارا اشارہ فنِ خطاطی کی طرف ہے۔ اس کی نشو و نما اور تہذیب و آرائش میں تمام اقوامِ مسلم نے حتی الامکان ہر دور اور ہر عہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، دینی امور کے لئے بھی اور دنیاوی امور کے لئے بھی۔ چونکہ اس کی بنیاد قرآن کی زبان پر ہے اور یہ دنیائے اسلام کی عالمگیر زبان ہے، یہ اپنے حلقہ میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو مذہبی ارتسامات یا مناظر نصاریٰ یا بودھیوں کے مذہبی موضوعات کے سلسلہ میں رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں یہ علامت

مسلمانوں کے نزدیک بے انتہا اہمیت رکھتی ہے، اس میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ یہ دار السلام سے باہر کہیں نہیں سمجھی جاتی۔

رباعی کے محدود میدان میں خیام اسلام کے صرف ایک ہی مخصوص لوازمہ کا ذکر کرسکا۔ اس قسم کے دیگر لوازمات یہ ہیں:۔

(۱) مدرسہ: تعمیر کی وہ شکل جو مساجد کے بعد ظہور میں آئی لیکن اس کی وضع وہیئت بحیثیت ایک درس گاہ کے پوری دنیائے اسلام میں یکساں رہی ہے۔ بمقابلہ یورپ کے جہاں درس گاہوں کی عمارات میں اس لحاظ سے کوئی تخصیص نظر نہیں آتی۔

(۲) باغات: عربی تحریر کے علاوہ گل بوٹے بنانے اور اقلیدسی اشکال کا ذوق وشوق جس میں شبیہی نقاشی میں کم اور سنگ تراشی میں اور بھی کم حصہ لیتی ہیں۔

(۳) ہر سطح اور شکل کو ان نقوش سے مڑھ دینے کا شوق جس میں بالاکثر اشکال کی نوعیت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پیچیدہ ڈیزائنوں اور بے اندازہ طرحوں کی طرف شدید میلان۔

(۴) نسبتاً بالکل سادہ اور معمولی سامان کا کثیر استعمال، بالخصوص وہ خام ساز و سامان جس کو صناعوں اور کاریگروں نے اول اول برتنا شروع کیا تھا۔ اور اس وجہ سے بالعموم اسراف و نمودِ دولت سے احتراز دکھائی دیتا ہے گو یہ رجحان...... کوئی عالمگیر حیثیت اختیار نہ کرسکا۔

مغربی محققین میں پروفیسر میسی نان پہلے شخص تھے جنہوں نے مذکورہ بالا خصائص کو مسلمانوں کے مذہبی میلانات سے منسوب کیا اور دیگر فضلائے مغرب نے اس سلسلہ میں ان کی پیروی کی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، بعض ایسے مظاہر جن کو بالتخصیص اسلامی قرار دیا جاتا ہے، اسلام سے پہلے بھی موجود تھے، یا بازنطین اور چین کے معاصر فنی حلقوں میں پائے جاتے تھے۔ دراصل یہ اسی قسم کا استدلال ہے جو اسلام کے دیگر منابع سے ماخوذ ہونے کی بنا پر کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ اسلام کے فلاں فلاں خصائص یہودی، عیسائی، زرتشتی یا ہندو مآخذوں سے مستعار ہیں۔ یہ کہ اس کے بعض فقہی تصورات پر رومن قانون یا دیگر سرچشموں کا پرتو ہے ممکن ہے یہ باتیں صحیح ہوں لیکن سچ پوچھئے تو ہر تہذیب کا بہت کم حصہ اپنا ہوتا ہے۔ پھر بھی سابقہ یا معاصر تہذیبوں سے بعض چیزوں کو اپنا کر انہیں نئی نئی شکلوں میں ترتیب دیا جاسکتا ہے اور اس طرح ترتیب وتشکیل کی جو نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا ان میں نئی معنویت پیدا کی جاتی ہے، وہ تخلیقات میں اپج پیدا کرسکتی ہے اور یقیناً ایسی تخلیقات کا باعث ہوتی ہے جن کو طبع زاد قرار دیا جاسکے۔ یہ بات اور بھی نمایاں ہوجاتی ہے جب کہ ہم کسی سابقہ دور سے بعض خصائص منتخب کرتے وقت اس کے اہم ترین یا عمومی عناصر کو نظرانداز کردیں۔ اگرچہ مستعار عناصر قبل ازیں بھی موجود تھے، پھر بھی وہ بعد میں بالکل نئے انداز میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کا جو مصرف پیدا کیا گیا ہے۔ وہ بالکل مختلف ہے۔

ایک اور سوال جو اس سلسلہ میں اٹھایا جاتا ہے یہ ہے کہ قدیم مآخذ اُس جدید معنویت کی تردید کرتے ہیں جو تخلیقی فن پاروں میں داخل کی گئی ہو، چونکہ یہ انکشافات مستند دستاویزی شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس بارہ میں قدیم مآخذ کی تردیدی شہادت فیصلہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اُمور میں نئے مفہوم و معانی کا ادخال صحیح نہیں، اور اس کی تعمیم لازم ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی تو ممکن ہے کہ مذکورہ مآخذ بعض حالات کی نشاندہی کرتے ہوں جن پر عمومیت کا اطلاق بجا نہیں۔ مثال کے طور پر بعض مقامات مقدسہ ــ کعبہ، روضۂ نبویؐ یا قبۃ الصخریٰ میں بعض قیمتی نوادر کا پایا جانا ان مقامات کی تقدس و تبریک کا باعث ہے لیکن اس سے اس شہر یا اس کی تحریمی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس طرح خانۂ کعبہ میں جو ہدایہ رکھے ہوتے ہیں، وہ ظاہر کرتے ہیں کہ نومسلم فرماں رواؤں نے اپنے اظہارِ طاعت کے لئے انہیں وہاں پیش کیا ہے یا کسی غیر مسلم وسیلہ سے حاصل شدہ مالِ غنیمت کو یہاں لاکر ہدیتاً رکھا گیا ہے۔ ان معین شواہد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی نشاندہی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ وہ خلافِ معمول مثالیں ہیں۔

ان تمام توجیہات بلکہ تحقیق کے سلسلہ میں مسلمان محققین سے بے حد مدد حاصل ہوسکتی ہے جو نہایت کارآمد بھی ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ لوگ ان یادگاروں کے وارث ہیں جو ہم مغربیوں کے مطالعہ کا موضوع ہیں، اور وہ قدیم سرمایۂ ادب جس سے ان معاملات پر روشنی پڑتی ہے، براہ راست ان کی دسترس میں ہیں۔ وہ ان شاندار عمارات اور نوادر کو درست طور پر اپنوں کے سامنے بھی پیش کرسکتے ہیں اور دوسروں کے سامنے بھی۔ خدا کرے اسلامی فنون کا یہ ورثہ مشرق و مغرب دونوں کے لئے ایک نیا سرچشمۂ فیضان ثابت ہو۔ (ڈاکٹر رچرڈ ایٹنگھاؤسن)
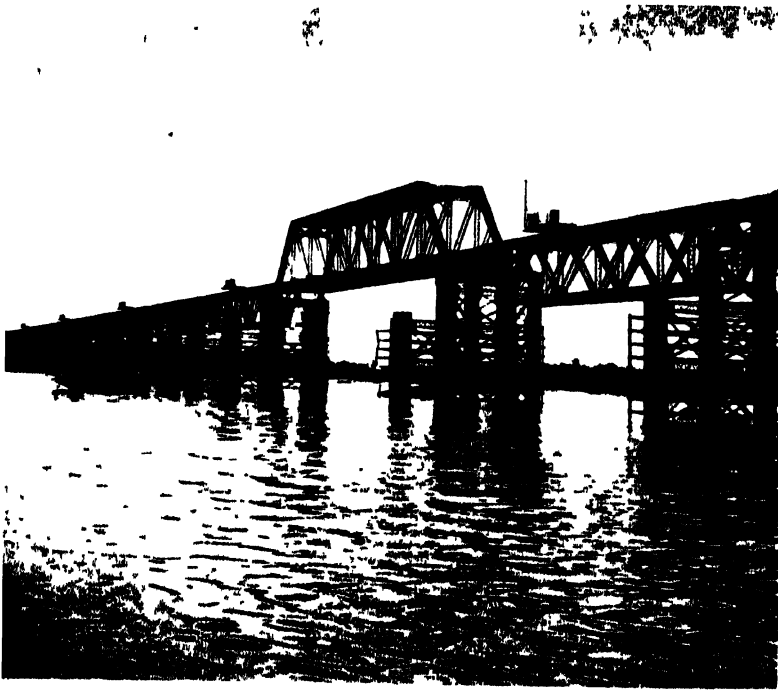
★

: جنرل محمد ایوب خان، جانسار کراچی ۔ ۔ ری
۔ ۔ ۔

: ۔ملوی ۔ کراچی ۔ ۔
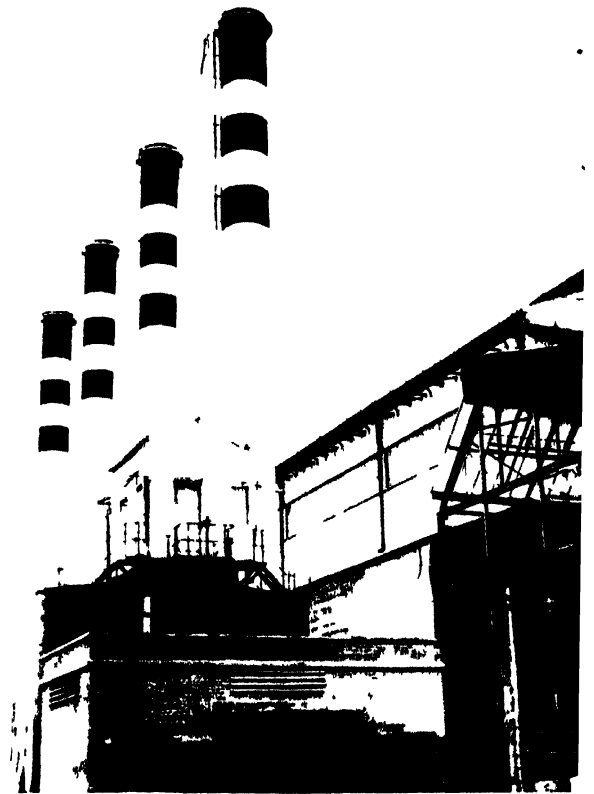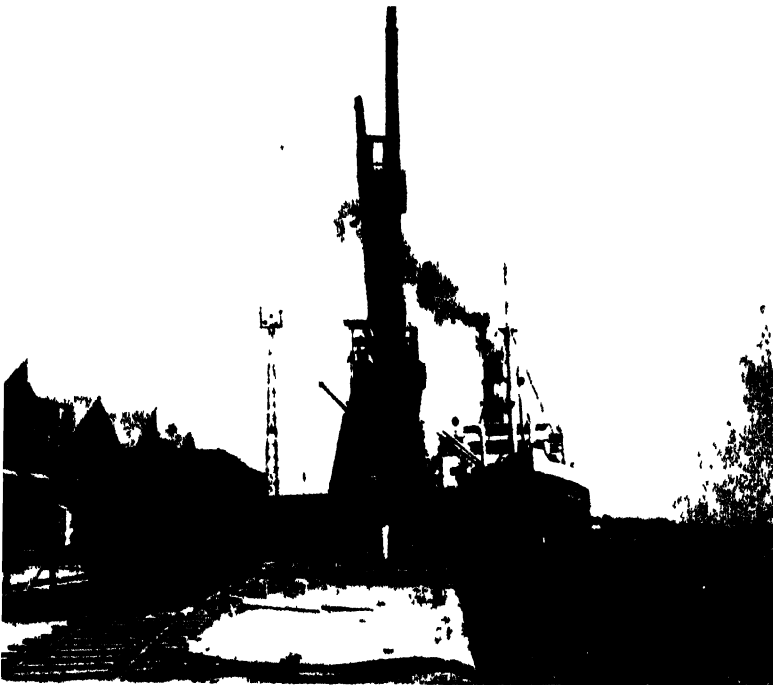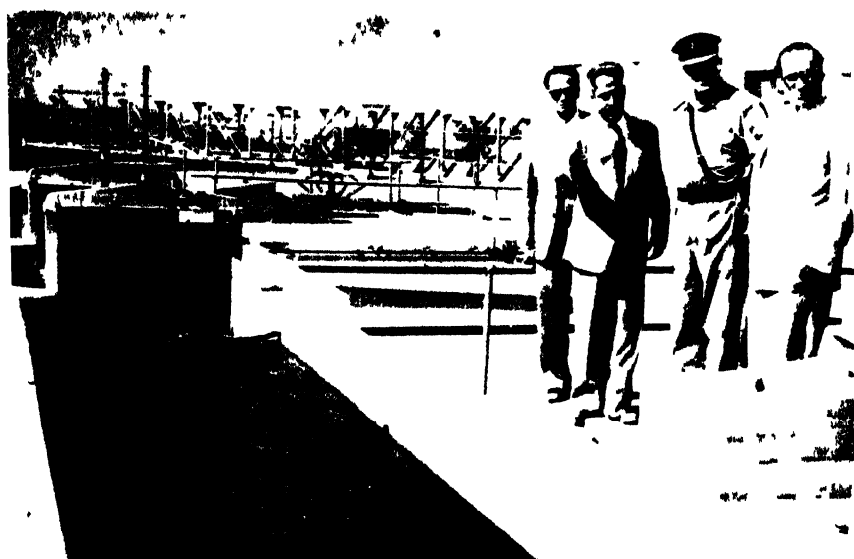
خطّاطی

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

فنونِ لطیفہ میں جو جمالیاتی شان و شوکت اور دلکشی مسلمانوں کی خطاطی کو حاصل ہے، وہ دنیا کے کسی فنِ خطاطی کو آج تک حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا مشاہدہ کرنے والا خواہ اس کی حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو، مگر اس کی موزونیت و لطافت اس پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں نے اس کے مختلف انواع اور اسالیب وضع کر کے اس فن کو ہر پہلو سے ایک اعلیٰ فن بنا دیا ہے۔ مسلمان قرآن مجید کی کتابت اسی جذبہ سے کرتے تھے گویا یہ بھی عبادت ہے۔ اور بادشاہ سے لے کر معمولی انسان تک اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

اسلام میں فنِ خطاطی کا ارتقاء نزولِ قرآن کریم کے بعد شروع ہوا۔ آنحضرت صلعم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو صحابہ اس کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے لیکن حضور قرآن مجید کو لکھ لینے کی بھی تلقین فرماتے تھے۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت عرب میں جو لوگ حلقۂ اسلام میں آئے ان میں سے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صرف سترہ تھی ان میں سے بعض ایسے تھے جو صرف پڑھ سکتے تھے، لکھ نہیں سکتے تھے۔ سب سے پہلا کاتبِ قرآن ہونے کا شرف حضرتِ زیدؓ بن ثابت کو حاصل ہے۔ آپ نے قرآن شریف کو کھال کے ٹکڑوں اور درختوں کے پتوں پر لکھا۔ اسی طرح بعض صحابہؓ کرام بھی قرآن کریم کی آیات کو لکھ لیا کرتے تھے کیونکہ کاغذ اس وقت تک عرب میں میسر نہیں تھا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو عربی خط کی ابتداء مقام حیرہ سے ہوئی جو کوفہ سے بالکل ملا ہوا تھا۔ کوفہ کو مسلمانوں نے شروع ہی میں فتح کر لیا تھا۔ یہ مقام اسلام سے پہلے ایک حد تک متمدن تھا۔ یہاں عربی طرزِ تحریر نے کسی قدر ایک صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس وجہ سے ابتداء میں طرزِ کوفی زیادہ مشہور بھی ہوا تھا۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدّیق خلیفہ ہوئے تو آپ کو حضرت عمرؓ نے قرآن شریف کو ایک جا اکٹھا کرنے اور اسے تحریر کروانے کا مشورہ دیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے یہ کام حضرت زید بن ثابت کے سپرد کیا۔ انہوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ مختلف چیزوں پر سے قرآن کریم کی لکھی ہوئی آیات بصورتِ قرطاس مدون کیں۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کی تلاوت میں اختلافِ قرأت کی بناء پر اس کو خالصتاً عربی لہجہ میں لکھے جانے کے لئے لوگوں کو مقرر کیا۔ اس طرح جو قرآن آپ نے لکھوا کر مکمل کروایا اُسے "مصحفِ عثمان" کہا جانے لگا۔ مصحفِ عثمان کی بہت سی نقلیں کی گئیں اور ان کو مختلف ممالک میں مروّج کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ عراق، شام، مصر وغیرہ میں اسی کے نسخے ارسال کئے گئے۔ یہ تھی اسلامی خط کی ابتدائی جمالیاتی کیفیت جس کے لئے اتنے مراحل قرآنِ کریم کو بصورتِ کتاب لانے کے لئے طے کئے گئے۔

جب حضرت علی کا دور آیا تو مقام خلافت کوفہ تھا۔ اس کی وجہ سے کوفہ کو مزید اہمیت حاصل ہوئی اور یہاں عربی رسم الخط کو بہت ترقی ہوئی۔ جب خلفاءِ راشدہ کے بعد بنو امیہ کا زمانہ آیا تو اسلام کا دارالخلافہ دمشق تھا اور حضرت معاویہ پہلے خلیفہ تھے۔ جو حضور صلعم کے کاتبانِ وحی میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں کے مشہور لکھنے والوں میں ایک قطبہ تھا جس نے چار طرح سے عربی رسم الخط کو رواج دیا۔ اس کے بعد ضحاک بن عجلان مشہور رہا جس کا زمانہ بنو عباس کا ابتدائی دور تھا۔ اس نے قطبہ کے طرزِ خط کے حسن و جمال میں خاصہ اضافہ کیا، اسحاق بن حمّاد کاتب خلیفہ منصور اور مہدی کے دورِ خلافت میں گزرا ہے۔ جو ضحاک پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے بے شمار تلامذہ نے عربی خط کو بہت فروغ دیا۔ ان میں سے یوسف الکاتب بہت مشہور ہے۔ جو "لِقوۃ الشاعرؔ" کے لقب سے شہرت رکھتا ہے۔ ابراہیم الحسن نے یوسف کے خط کے حسن و جمال میں مزید اضافے کئے۔ اس کے تلامذہ میں سے عبدالجبار، اوسی شعرانی، ابرش اور سلیم الکاتب بہت مشہور ہیں۔ عمرو بن مسعدہ اور احمد الکلبی، مامون کے کاتب تھے جو عباسیوں کے دورِ اول میں اصلی عربی خط کو نہایت موزونیت سے لکھتے تھے، اور یہی زمانہ تھا جبکہ عربی رسم الخط نے ایک خاص جمالیاتی

صورت اختیار کر لی تھی۔

جعفر بن یحییٰ کے دورِ وزارت میں سب سے اعلیٰ لکھنے والا عمرو بن مسعدہ تھا جو تمام فرامین و احکام لکھتا تھا۔ اس وقت تک خوشنویسی کے اصول مرتب نہیں ہوئے تھے مگر یحییٰ کی توجہ سے اس کے کاتب ابو العباس محمد بن الحسن الدینار الاحول نے علمِ خط کے قواعد مرتب کئے اور کئی قسم کے طرز ایجاد کئے چنانچہ اقلام، اشقاق اور قلم الطومار اسی کی ایجاد ہیں۔ ہارون رشید کے عہد میں جب علمِ خط پر خاص توجہ مبذول ہوئی تو سابقہ قواعد میں مزید اضافے کئے گئے آل برمک کے دربار میں احول اور عمرو بن مسعدہ سرکاری مراسلے اور احکام لکھتے تھے۔

خط کے لئے جعفر کا یہ قول مشہور رہے کہ "خط حکمت کا دھاگہ ہے جس میں بکھرے ہوئے موتی پروئے جاتے ہیں، اور ان کے ذریں دانے ممتاز رہتے ہیں"۔

تاریخِ اسلامی میں آلِ برمک اور ہارون الرشید کو جو شہرت ان کے ثقافتی اور فنی کارناموں کی وجہ سے حاصل ہے، وہ دوسروں کو حاصل نہیں اس دور میں علوم و فنون کا ایک معیار قائم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد عباسیوں کے دربار میں دو بھائی ابو علی ابن مقلہ اور ابو عبداللہ مقلہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں منصۂ شہود پر آئے۔ انہوں نے عربی رسم الخط میں گراں مایہ ترقی کی اور نام پیدا کیا۔ ان کے طرزِ خط کو "خط المنسوب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس خط کی ہندسی صفات، موزونیت اور طریقۂ تحریر کی ندرت شیخ سعدی اور کمال اصفہانی جیسے ارباب نظر نے یوں تعریف کی ہے ؎

مردمِ چشم ابن مقلۂ وقت	بندۂ آں خطِ چو عنبر شد
کاش ابن مقلہ بودی در حیات	تا بمالیدے خطش بر مقلتین

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ابن مقلہ نے عام رواجی خطِ کوفی کو خط ثلث میں تبدیل کر دیا اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے ۳۱۰ھ میں خطِ کوفی معقلی سے چھ طرزیں۔ ثلث، توقیع محقق، نسخ، ریحان اور رقاع ایجاد کیں۔ ابن مقلہ جو خلفائے عباسیہ کا چار دفعہ وزیر بھی ہوا، وہ شخص ہے جس نے کوفی رواجی خط میں ایک خاص جدت پیدا کی۔ محولہ بالا شعر میں لفظ "مقلتین" سے دونوں بھائی مراد ہیں، کیونکہ ہر دو کتابت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ابو علی مقلہ زیادہ مشہور ہوا اس کا انتقال ۳۲۸ھ میں ہوا اور ابو عبداللہ مقلہ کا ۳۳۸ھ میں ابو علی کے متعلق صاحبِ "تاریخ الفخری" نے بیان کیا ہے کہ جب خلیفہ راضی باللہ نے اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا تو وہ بائیں سے اسی طرح لکھتا تھا جس طرح دائیں سے۔ اس کے کئی تلامذہ تھے۔ اس نے خط میں اعراب ثلاثہ یعنی جزم، تشدید اور تنوین اختراع کئے جو ایک طرح خطِ کوفی سے انحراف تھا۔ اس جدت کی وجہ سے اس کی تحریر کو عام طور پر خطِ المنسوب کہتے ہیں۔ اس میں ایک خاص قسم کی جمالیاتی جھلک ہی نہیں بلکہ فنی حیثیت سے بھی ایک ارتقائی انحراف ہے۔ صاحبِ "کشف الظنون" نے ابن مقلہ کو خط "بدیع" کا موجد کہا ہے۔ دونوں بھائیوں کے بے شمار تلامذہ بھی ان کی روش پر لکھتے تھے۔ ریاست رام پور کے کتب خانہ میں ابو علی مقلہ کے ہاتھ کا قرآن کریم کا ایک نسخہ مکتوبہ ۳۲۶ھ ہے جو میری نظر سے گذرا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا یہ خط، خطِ کوفی نہیں بلکہ عرفِ عام میں اسے "نسخ" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے تلامذہ میں سے محمد بن السمانی اور محمد بن اسد نامور خطاط گزرے ہیں۔

ابن مقلہ کے تقریباً ۸۰ سال بعد ایک اور کاتب ابو الحسن علی بن ہلال المعروف بہ ابن بوّاب پیدا ہوا جس نے ابن مقلہ کی روش کو بہت عمدگی سے فروغ دیا۔ اس کا انتقال ۴۱۳ھ میں بمقام بغداد ہوا۔ یاقوت حموی نے "ارشاد الادیب" میں عجیب و غریب قصہ ابن مقلہ کے لکھے ہوئے قرآن کے متعلق لکھا ہے کہ ابن بوّاب آل بویہ کے دور میں بہاء الدولہ کے کتب خانہ واقع شیراز کا مہتمم تھا۔ اس نے قرآن مجید کا ایک جزء ابن مقلہ کا لکھا ہوا وہاں دیکھا تو اسے دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور مزید تلاش سے کل ۲۹ اجزاء برآمد کر لئے۔ جب ابن بوّاب نے بہاء الدولہ کی توجہ ان ۲۹ اجزاء کی طرف مبذول کی تو اس نے ابن بوّاب سے گمشدہ جزء اپنے ہاتھ سے لکھ کر پورا کرنے کو کہا۔ ابن بوّاب راضی ہو گیا۔ اور اس نے تقریباً ایک سال میں وہ جزء مکمل کر کے بہاء الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو وہ باوجود پوری کوشش کے ابن بوّاب کا لکھا ہوا جزء ان اجزاء میں سے

پہچان نہ سکا۔ بلکہ خود ابن بواب بھی بعد میں اپنے لکھے ہوئے جز کی نشان دہی نہ کر سکا۔ مذکورہ کتب خانہ کا یہ نسخہ ہمیشہ ابن مقلہ ہی کا لکھا ہوا شمار ہوتا رہا محققین کے نزدیک ابن بواب کے خط کو کسی خاص طرزِ خط کا نام نہیں دیا گیا۔ یاقوت نے اس خطاط کو "صاحب الخط الملیح والاذہاب الفائق" لکھا ہے۔

ابن بواب کے بعد خطِ نسخ کو کافی فروغ ہوا اور خطِ کوفی میں ایک خاص طرح کی زیبائش پیدا ہو گئی۔ بنابریں وہ بالاکثر عنوان لکھنے کے لئے استعمال ہونا شروع ہوا اور اس کی طرف مزید رجحان پیدا ہوا چنانچہ ابن بواب کے بعد جس نے خطِ منسوب یعنی خط جاریہ عمدگی سے لکھا، وہ ابوطالب المبارک تھا جس کا انتقال ۵۸۵ھ میں ہوا۔

ساتویں صدی ہجری تک فن خطاطی کے سلسلہ میں مرکزی حیثیت بغداد ہی کو حاصل رہی۔ اس صدی میں ایک اور شخص جمال الدین ابوالدر یاقوت گذرا ہے جو در اصل خلیفہ معتصم باللہ کا آزاد شدہ غلام تھا اور اس نے اس کو خطاطی کی تعلیم دلائی۔ اسی لئے وہ یاقوت مستعصمی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے نسخ، ثلث، توقیع، محقق، ریحان اور رقاع میں کمال پیدا کیا اور اپنی کتابت کو خوب مزین کرنے کا بھی سلیقہ پیدا کیا۔ ان اقسام خط کو ایک دوسرے سے الگ الگ تمیز کرنا آسان نہیں۔ اس لئے خطِ نسخ ایک عام اصطلاح ہو گئی جو بالعموم عربی رسم الخط پر منطبق کی جاتی ہے۔ یاقوت کے تلامذہ میں سے چھ نے بہت نام پیدا کیا۔ ان کو استادانِ ستہ کہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں شیخ زادہ، ارغون کامل، نصراللہ طبیب، مبارک شاہ، زرین قلم، میر یحییٰ صوفی اور یوسف مشہدی۔ بعض نے ان کے ساتھ عبداللہ صیرفی، میر حیدر اور مبارک صوفی کو بھی شامل کیا ہے۔

یاقوت کے خط نے آٹھویں صدی ہجری میں بہت فروغ پایا۔ خاص کر ایران میں اس خط نے ایک خاص صورت اختیار کی جسے عام طور پر تعلیق کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی اسے بعض نے خطِ ترسیل کے نام سے بھی تعبیر کیا ہے۔ جس میں رسائل و اخبارات لکھے جاتے ہیں۔ عثمانیوں اور مصریوں میں اسے خط دیوانی کا نام دیا گیا۔ بعض کا بیان ہے کہ حسین علی فارسی نے تعلیق، کو خطِ نسخ، رقاع اور ثلث سے استنباط کر کے ایجاد کیا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خواجہ تاج الدین سلمانی نے جو ہر شش خط میں مہارت تامہ رکھتا تھا، اس خط کو استخراج کیا ہے۔ بہرحال یہ مسلمہ امر ہے کہ خطِ تعلیق اور نسخ کے امتزاج سے طرزِ نستعلیق کا استخراج کیا گیا۔ جس کا موجد عام طور پر خواجہ میر علی تبریزی کو قرار دیا جاتا ہے۔

خطِ نستعلیق کی نشو و نما اور فروغ میں شہزادہ بایسنغر بن شاہ رخ مرزا کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا سلطان علی مشہدی نے اس خطِ نستعلیق کو مولانا اظہر سے حاصل کیا اور اس میں ایک خاص معیار پیدا کر کے اس کو چار چاند لگائے۔ اسی وجہ سے آج اسے "قبلتہ الکتاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تلامذہ میں سے مولانا میر علی ہروی سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار لکھنے والے پیدا ہوئے۔ میر علی ہروی نے اس فن میں استقدر ترقی کی کہ اس سلسلہ میں اس کا نام ضرب المثل ہے۔

ظہیر الدین بابر بادشاہ نے ۹۳۲ھ میں فتح ہند کے بعد یہاں مغل سلطنت کی بنیاد قائم کی اور نستعلیق طرز کے ماہرین کو ہمراہ لایا اس سے قبل یہاں محض خطِ نسخ کے طرز میں ہی لکھا جاتا تھا۔ مگر اس زمانے سے نستعلیق کا رواج شروع ہوا۔ اگرچہ مؤرخین نے بابر کے خط کو بھی "طرزِ خط بابری" سے یاد کیا ہے۔ جس میں بابر نے ایک قرآنِ کریم بھی لکھا۔ اور اس کو مکہ معظمہ بھجوایا تھا۔ اس وقت اس خط کے ماہر میر عبدالحئی منشی اور اس کا بھائی میر عبداللہ قانونی تھے۔ بابر کے دربار میں ملا علی الکاتب نے نستعلیق طرز میں "تزکِ بابری" کے نسخہ کو ۹۳۷ھ میں شہزادہ ہمایوں کیلئے مکمل کیا مگر ہمایوں کو چند سال حکومت کرنے کے بعد ۹۴۷ھ میں ایران جانا پڑا۔ واپسی پر وہ اپنے ہمراہ ملا خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اور سلطان بایزید بن نظام الدین جیسے ماہران کتابت لایا۔ اکبر کے دربار میں خطِ نستعلیق نے وہ ترقی کی کہ ایران کی ترقی بھی ماند پڑ گئی۔

(تلخیص) (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، لاہور)

★

افسانہ:

میرا پیارا بھتیجہ

شوکت تھانوی

جی ہاں یہ میرا وہ عزیز از جان بھتیجہ ہے جس پر میں جان چھڑکتا رہتا ہوں اور یہ مجھ پر موت چھڑکتا رہتا ہے۔ اطمینان ہے تو صرف یہ کہ اب مجھ پر عاقبت میں کوئی عذاب نازل نہ ہوگا اس لئے کہ عاقبت کے تمام عذاب اس لختِ جگر بھتیجے کے بدولت میں اس دنیا ہی میں بھگت چکا ہوں، بھگت رہا ہوں اور بھگتتا رہوں گا جب تک قسمت میں لکھا ہے۔ مگر کسقدر چاہتا ہوں میں اسے اس کا اندازہ کوئی معمولی قسم کا چچا اپنے معمولی قسم کے بھتیجے کو دیکھ کر کر ہی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں چچا بھتیجے نہایت غیر معمولی واقع ہوئے ہیں۔ خدا کی اس خدائی میں نہ آج تک ایسا بھتیجہ پیدا ہوا ہوگا نہ ایسا چچا اور لطف یہ ہے کہ نہ یہ بلند اقبال میرے کسی بھائی کے بیٹے ہیں نہ میں ان کے والد محترم کا کوئی بھائی ہوں پھر بھی آپس میں ہم دونوں نہایت شدید قسم کے چچا بھتیجے ہیں۔

یوں کام نہ چلے گا۔ آپ ہم دونوں کے اس نازک مگر اہم رشتہ کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک پورا قصہ آپ کو نہ سنا دیا جائے۔ لہٰذا میں اس قصہ کی ابتدا اس وقت سے کرتا ہوں جب میں ان نورِ نظر کا چچا نہ تھا بلکہ ایک اجنبی پردیسی کی حیثیت سے شامت کا مارا مکان ڈھونڈھتا ہوا ان کے والدِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جو ایک ایسے مکان کے مالک تھے جس کا ایک حصہ کرایہ پر اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ بزرگ محترم یعنی میرے لاڈلے بھتیجے کے والد کچھ عجیب ابوالہول نما بزرگ تھے اور اگر میں ان کے مکان پر ہزار جان سے عاشق نہ ہو چکا ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان جیسے آدمی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا۔ گھٹے ہوئے سر پر نہ جانے کتنا تیل جذب کرائے ایک بنیائن کو اپنے توند کا غلاف بنائے اور نہایت بیہودہ سی تہبند باندھے جب وہ میرے سامنے آئے تو مجھ کو خود آن ہی ان کو پوچھنا پڑا کہ "ٹھیکہ دار عبداللہ خاں صاحب تشریف رکھتے ہیں"۔ اس کے جواب میں انہوں نے نہایت کج خلقی سے کہا کہ:

"اگر تشریف رکھتے ہوتے تو آپ کیا کرتے"۔

میں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ "نیاز حاصل کرتا ان سے"۔

وہ بولے "تو کیجئے نیاز حاصل، میں موجود ہوں۔ مگر ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ اگر آپ کرایہ پر مکان لینے آئے ہیں تو دو سو روپیہ ماہوار کرایہ ہے جس میں ایک دھیلا بھی کم نہ ہوگا اور پانچ سال کا کرایہ پیشگی لونگا اور پھر ہر مہینہ آدھا کرایہ آپ نقد ادا کریں گے اور آدھا اس پیشگی رقم میں منہا ہوگا"۔

میں ابھی یہ ہزاروں کا حساب لگا ہی رہا تھا کہ خدا میرے اس ہونہار بھتیجہ کی عمر میں برکت دے یہ ہزار برس جئے اور ہر برس کے دن پچاس ہزار ہوں، کیچڑ میں لتھڑا۔ خاک دھول میں اٹا کھیاں بھنکاتا ایک طرف سے کیدتا ہوا آ کر اپنے باوا جان کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر ان کے سامنے آ کر بڑی زور سے ہنسا کہ "کہو کیسا بیوقوف بنایا۔ میں چپکے چپکے آیا اور ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر ایک دم سے ادھر آ گیا"۔

ان حضرت کی باچھیں کھل گئیں "مگر یہ تو تھا کہاں۔ میں نے منع کیا تھا کہ کیچڑ پانی میں نہ کھیلنا"۔ ان برخوردار نے والد محترم کی ٹانگوں میں لپٹ کر اس سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک نئی بات ارشاد فرمائی کہ "ہم نہیں جانتے ہم کو چرخی دو ابھی ڈور پتنگ لائیں گے"۔

ٹھیکہ دار صاحب نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا "ہرگز نہیں۔ چرخی کا بچہ۔ اب پتنگ بھی اڑائے گا"۔

صاحبزادے نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ "کلو کے ابا نے اس کو چرخی دی ہے"۔

ٹھیکہ دار صاحب نے کڑک کر کہا "کلو کا ابا تو ہے گدھا"۔

کیا ذہین بچہ ہے ترکی بہ ترکی بولا "تم بھی گدھے بنجاؤ نا"۔

اور ٹھیکہ دار صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر مجھ سے کہا "سن لیا آپ نے یہ گدھے کا بچہ مجھے گدھا بنانا چاہتا ہے"۔

میں نے فرطِ محبت سے اس گھناؤنے بچے کو گود میں اٹھا کر اپنا سوٹ خراب کرتے ہوئے کہا: "نہیں صاحب ہم دیں گے اپنے بیٹے کو چونی اور یہ ضرور خریدے گا ڈور پتنگ۔"

اس نابکار نے بھی میری گردن میں بانہیں ڈال کر میری ٹائی کو لگام کی طرح کھینچ کر کہا: "اوہو ہو ہو۔ تم بڑے اچھے ہو۔"

ٹھیکہ دار صاحب رسماً کہتے بھی رہے کہ آپ نے خواہ مخواہ اپنے کپڑے خراب کر لئے اس کو گود میں اٹھا کر۔ مگر میں نہایت منافقت سے یہی کہتا رہا کہ "کپڑے میلے ہوئے تو کیا ہوا بچے کا دل تو میلا نہیں ہوا۔ لو بیٹا یہ چونی اور لے آؤ ڈور پتنگ۔"

صاحبزادے تو چونی لیکر اچھلتے کودتے دفعان ہو گئے مگر اب ٹھیکہ دار صاحب کے تیور ہی بدل چکے تھے بڑی یگانگت سے میری طرف دیکھ رہے تھے بلکہ مجھ کو ان کی نگاہوں میں کچھ کچھ مروت بھی نظر آرہی تھی لہذا میں نے موقع غنیمت جان کر عرض کیا:

"تو جناب والا جہاں تک مکان کا تعلق ہے مجھے گویا ناامید ہو جانا چاہیئے؟"

ٹھیکہ دار صاحب نے ایک دم سے چونک کر کہا: "ناامید؟ کیوں آخر ناامیدی کی کیا بات ہے۔ میں نے آپ سے کچھ زیادہ تو کرایہ نہیں مانگا۔ ابھی جس کرایہ دار نے مکان خالی کیا ہے آپ کے سر کی قسم وہ پونے دوسو روپیٔے دے رہا تھا۔ اب میں نے اس میں دو پنکھے لگوا کر صرف پچیس ہی روپیٔے تو بڑھائے ہیں۔"

میں نے عرض کیا: "سب سے بڑا مرحلہ تو میرے لئے یہ ہے کہ پانچ سال کا پیشگی کرایہ ادا کر دوں آپ خود ہی غور فرمایئے کہ بارہ ہزار روپیہ یکمشت میں کہاں سے لاؤں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے ہنس کر کہا "بس اتنی سی بات۔ میاں یہ تمہارا گھر ہے بس رہنا شروع کردو اور پانچ سال کا پیشگی نہ سہی بس ایک سال کا دیدو۔ بس اب تو خوش ہو۔"

میں واقعی خوش تھا اور اتنی رقم آسانی سے ادا کر کے دو سال تک اس گھر میں اطمینان سے رہ سکتا تھا اس لئے اب سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ مجھے ادا کرنا تھے۔ اور باقی سو اِس پیشگی میں سے دو سال تک منہا ہو سکتے تھے لہذا میں نے اسی وقت دو ہزار چار سو کا چک لکھ کر ان کے حوالے کر دیا اور دوسرے ہی دن اپنا سامان لا کر اس گھر میں رہنا شروع کر دیا جو دراصل مجھ کو اپنے عزیز از جان بھتیجے کے طفیل میں ملا تھا جو اب مجھ کو باقاعدہ چچا کہنے لگا تھا۔

غضب ہی ہو جاتا اگر میں اس وقت اس اگھوری بھتیجے کو پیار سے گود میں نہ اٹھا لیتا اور اپنا سوٹ غارت نہ کر سکنے کے علاوہ پتنگ لانے کیلئے وہ چونی نہ دیدیتا۔ اگر میرے لئے غیب سے یہ سامان نہ ہو جاتا تو یہ مکان مجھے قیامت تک نہ مل سکتا اس لئے کہ اس گھر میں آجانے کے بعد اور ٹھیکہ دار صاحب سے تفصیلی ملاقاتوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ ٹھیکہ دار صاحب ذاتی طور پر نہایت خبیث واقع ہوئے ہیں۔ انسانیت اور مروت کا ان کے آس پاس گذر بھی نہیں ہے۔ پیسہ پر اُن کی جان جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے کنجوس بھی ہیں لے دے کر ان کی تیلادی شخصیت میں اگر کہیں لچک پیدا ہوتی ہے تو عزیزم گھسیٹے سلمہٗ کے معاملہ میں یعنی میرے اسی راحت جان بھتیجے کے سلسلہ میں جو عمر بھر میں ان کی واحد اولاد ہے۔ اولاد کے شوق میں وہ دو بیویوں کو مار چکے ہیں ایک کو چھوڑ چکے ہیں اور اس حساب سے محترمہ والدہ گھسیٹے گویا ان کی چوتھی بیوی ہیں۔ ان زوجہ پرداں نے ٹھیکہ دار صاحب سے گنڈے تعویذ کرائے درگاہوں پر حاضریاں دلوائیں، چلے کھنچوائے اور آخرکار حضرت بدھنی شاہ کے ایک گنڈے سے جب اولاد کی امید پیدا ہوئی تو حضرت شاہ صاحب نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ بچہ جیسے ہی پیدا ہو اس کو گیہوں پھٹکنے والے سوپ میں ڈالکر گھسیٹتے ہوئے باہر میرے پاس لانا اور لڑکا ہو تو نام گھسیٹے رکھنا، لڑکی ہو تو گھسیٹی چنانچہ جب یہ صاحبزادے پیدا ہوئے تو ان کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا اور شاہ صاحب قبلہ نے ان کو گھسیٹے کہکر ان کے کان میں اذان دی اور کچھ پڑھ کر ان پر دم کیا۔ اب یہ لڑکا ٹھیکہ دار صاحب کا دیوتا ہے۔ جو اسے خوش کر دے ٹھیکہ دار صاحب اس کے غلام ہیں باقی سب خود ٹھیکہ دار صاحب کے غلام۔ چنانچہ میری قسمت کا ستارہ تو نہ جانے کس عروج پر تھا کہ میں نے اس کو گود میں بھی اٹھا لیا اور اس کو چمکار کر ایک چونی بھی دیدی اللہ جانے کس حلال کی کمائی کی تھی وہ چونی جس نے یہ برکتیں دکھائیں۔

اب مصیبت میرے لئے یہ ہے کہ گھر کی بیٹھنے والی عورتیں تو یہ باتیں جانتی نہیں کہ آجکل اس شہر کراچی میں مکان کس طرح ملتا ہے اور جن کو

مکان مل گیا ہے وہ کس قدر خوش نصیب ہیں جب جا کر گھر میں دیکھئے وہ منہ پھلائے آنکھوں میں شعلے بھرے ننھے ننھے پھڑکا رہی ہیں اور یہ غصہ ہے سارا مجھ پر کہ میں نے کیوں اس عذاب کے فرشتے کو اپنا بھتیجہ بنا رکھا ہے۔ گویا ان کا خیال یہ ہے کہ مجھ کو اس کالے کلوٹے صورت حرام بجو نژاد نچے سے واقعی عشق ہے۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ خود میرے لئے اس نابکار بھتیجہ کی حیثیت ایک رستے ہوئے ناسور کی ہے اور مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میری موت کا یہ فرشتہ ہے جو ٹھیکہ دار صاحب کے یہاں حضرت بدھنی شاہ کی دعاؤں سے پیدا ہو چکا ہے۔ اب بتلائیے کہ میں کیا کروں کہ آج ہی جب میں دن بھر کا تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو ایک بجلی سی چمکی۔ ع۔ پھر اس کے بعد چپا کیا سنبھلنا سخت مشکل تھا!

بیگم صاحبہ جو بستر کے قریب انگیٹھی رکھے منجھلے بچے کے پیر کی سنکائی کر رہی تھیں برس ہی تو پڑیں مجھ پر کہ:۔

"تشریف لائیے۔ اور دیکھ لیجئے اپنے اس بھتیجے کا یہ تازہ احسان جو ہم پر کیا ہے۔ غریب کی ٹانگ توڑ کر رکھ دی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہڈی ضرور ٹوٹ گئی ہے۔ اور ایک ہڈی کیا وہ کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی بچے کی جان لیکر رہے گا۔ پتنگ اڑاتے میں کوٹھے پر سے ڈھکیلا ہے۔ وہ تو کہو جان ہی بچ گئی مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آج نہ ہی کل سہی میرے کسی نہ کسی بچے کی جان ضرور جائے گی اور یہ مردا میری گود اجاڑ کر رہے گا۔" میں نے بمشکل تمام ان کو خاموش کیا کہ کہیں ان کی آواز ٹھیکہ دار صاحب یا ان کی اہلیہ محترمہ کے کانوں تک نہ پہنچ جائے جو اور بھی آفت آئے، بھلا غضب خدا کا وہ اگر سن بھی لیں کہ ان کے دلبند کو مردا کہا جا رہا ہے تو آفت مچا دیں ابھی تو بچے کی صرف ٹانگ ٹوٹی ہے اس کے بعد تو شاید بچے کے والد کا سر بھی توڑ دیا جائے۔ ادھر یہ محترمہ اپنے قابو میں نہ تھیں لہذا میں نے دوڑ کر کمرے کے دروازے بند کر دئے تاکہ آواز باہر نہ نکلنے پائے، تو وہ اور بھی مشتعل ہو گئیں:۔

"سبھی جانتے ہیں۔ آخر ڈر کس بات کا پڑا ہے۔ ہم ان کے کرایہ دار ہی تو ہیں زرخرید تو نہیں ہیں کہ ان کے لڑکے سے اپنے بچے کا قیمہ کراتے رہیں اور اُف بھی نہ کریں۔" میں نے پوچھا "مگر ہوا کیا تھا کہ اس نے کوٹھے کے اوپر سے ڈھکیل دیا؟"

وہ بولیں۔ "اس مردے کے لئے یہ بھی کوئی ضروری بات ہے کہ کچھ ہو۔ بس ہو گئی ہو گی مزاج کے خلاف کوئی بات۔ آخر ریڈیو پر پتھر کیوں دے مارا تھا؟ گھڑی اٹھا کر کیوں پھینک دی تھی جو چکنا چور ہو کر رہ گئی؟ آپ کے کمرے کا آئینہ کیوں توڑا تھا؟ موٹر کے شیشے کیوں چکنا چور کئے تھے؟ بجلی کے بلب کیوں توڑتا رہتا ہے؟"

وہ ایک سانس میں وہ تمام نقصانات گنوا گئیں جو میرا یہ بلائے بے درماں بھتیجہ آج تک کر چکا ہے اور جن نقصانات کو میں خود نہایت کرب کے ساتھ محسوس کرتا رہتا ہوں۔ آخر میں نے بڑی بیکسی کے ساتھ کہا:۔

"سوال یہ ہے کہ آخر میں کیا کروں اگر کہیں مجھ کو کوئی اصطبل بھی مل جائے تو اس مکان پر لعنت بھیجوں۔"

وہ قصور وار مجھ ہی کو سمجھ کر بولیں۔ "آپ جھگی بھی نہیں ڈال سکتے کسی میدان میں۔ آپ جھونپڑی بھی نہیں بنا سکتے کسی جگہ۔ میں کھلے آسمان کے نیچے رہنا گوارا کر لوں گی مگر اپنے بچوں کو لیکر اس مکان میں تو اب ہرگز نہ رہوں گی۔"

وہ یہ خطبہ دے ہی رہی تھیں کہ ٹھیکہ دار صاحب کی آواز دروازہ پر گونجی اور میں ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا پہونچا دروازہ پر جہاں ٹھیکہ دار صاحب کچھ حواس باختہ سے کھڑے نظر آئے۔ میں سمجھا کہ شاید اسی حادثہ کی معذرت کے لئے آئے ہیں مگر وہ مجھے دیکھتے ہی ایک طرف لے گئے اور نہایت سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"میں نے اس لئے آپ کو تکلیف دی ہے کہ اگر کوئی آپ سے آکر پوچھے کہ آپ کرایہ کیا دیتے ہیں تو مجھ کو اپنا عزیز بتا کر کرایہ دار ہونے سے انکار کر دیجئے تاکہ پتہ نہ چلے کسی کو کہ آپ کرایہ دار ہیں۔ ارے ہاں مارشل لا کا زمانہ ہے بیٹھے بٹھائے کوئی آفت نہ آ جائے۔"

میں ابھی حیران ہی تھا کہ انہوں نے خود چھپی ہوئی یہ دولت اگل دی کہ "یہ مکان اصل میں متروکہ جائداد ہے جو شروع ہی سے میرے قبضہ میں ہے۔ اب بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت آ گئی ہے کہ اس کو ظاہر کرنا پڑ رہا ہے۔"

آنکھوں میں خون ہی تو اتر آیا یہ سنکر مگر میں چپ اس لئے رہ گیا کہ سمجھ تا تو اب ہے اس نابکار لڑکے سے جو میرا چہیتا بھتیجہ ہے۔ آئے تو سہی اپ دہ نظروں

ماہ نو، کراچی۔ فروری ۱۹۵۹ء

بنگلا کہانی:

آپا

اشرف صدیقی

مترجمہ: یونس احمر

مسلم ہال میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ ایک مختصر سا خط ملا۔ رابعہ آپا نے رنگپور سے بھیجا تھا۔ تین چار سطروں کا خط:

'امید ہے تم اچھے ہوگے۔ بہت دنوں سے ہم نے ایک دوسرے کی کھوج خبر نہیں لی۔ شاید اس طویل خاموشی سے تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ جیسے میں اس دنیا میں اب موجود نہیں۔ سچ مچ میں مرگئی ہوں۔ لیکن جسمانی موت نہیں روحانی۔ تمہاری کہانیاں برابر پڑھتی ہوں اور جی نہال ہو جاتا ہے۔ اس بار چھٹیوں میں رنگپور ضرور آنا تمہاری آپا کا حکم ہے؟'

رابعہ آپا! کیا وہی رابعہ آپا ہیں۔ تقریباً چھ سال کی طویل خاموشی کے بعد یہ خط؟ تو آپا زندہ ہیں۔ اور یہ ہے ان کا حکم۔ زندگی میں نہ جانے کتنی بار ان کے احکام کی تعمیل کی ہے اور ان کی وجہ سے نہ جانے کتنی بار مصائب سے دوچار ہوا ہوں۔ ایک بار پھر ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔

یادوں کے دبیز پردوں پر کتنی بھولی بسری باتیں تازہ ہو رہی ہیں۔ مومن شاہی شہر، برہم پتر کا کچر، مہہ گینی روڈ، آنند موہن کالج، شاہجہاں ولا، ابر آلود دن، چاندنی راتیں اور وہ سن ۱۹۴۳ء آج سے کتنے سال پہلے کی بات۔ کتنی بار برساتیں، گرمیاں، سردیاں اور بہاریں آئیں اور گذر گئیں۔ ایک زمانہ بیت گیا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود میں رابعہ آپا کو بھلا نہ سکا، بھلا بھی نہیں سکتا!

آنند موہن کالج میں پڑھتا ہوں اور شاہجہاں ولا میں رہتا ہوں۔ یکا یک ایک دن متصل کے مکان میں ایک نیا کرایہ دار آیا ۔۔ سادُتھ علاقے کا نیا ایس۔ ڈی۔ او۔ تین لڑکیاں، چار لڑکے، خود اور بیوی۔ بڑی لڑکی میرے ہی کالج میں آرٹس کلاس میں داخل ہوئی۔ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی ہی تھی۔

اس کے بعد اس مکان میں ایک نئی کہانی نے جنم لیا!

صبح سویرے ندریا۔ دوپہر کو گیتوں کی دنیا، شام کو ہارمونیم، کچھ اندھیرا ہوا تو لڑکیاں چھت پر تارے گننے یا برہم پتر کی چنچل لہروں سے جی بہلانے آجاتیں۔ ہنسی کا فوارہ چھوٹتا، گیتوں کے انار بلند ہوتے!

ایک دن کالج جاتے وقت مکان کے پچھواڑے میں بڑی لڑکی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

چہرے پر معصومیت اور گمبھیرتا کا عکس تھا۔ میں نے اس سے کچھ کہتے ہوئے کمزوری سی محسوس کی۔ اگر تھپڑ مار دے تو۔ کیا ضرورت ہے بات کرنے کی! دور ہی سے سلام کرلوں۔

اسی عرصہ میں کالج کا سالانہ انتخاب شروع ہوگیا۔ میں کالج میگزین کا سکریٹری منتخب ہوا۔ حسب دستور سبھوں کے نام مضامین لکھنے کی درخواست بھیجدی۔ جلد ہی مجھے ایک مضمون ملا ایک مسلمان لڑکی کا تحریر کیا ہوا تھا۔ نام تھا۔ رابعہ بیگم۔ مضمون پڑھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔ میگزین کمیٹی حتیٰ کہ گولڈ میڈلسٹ پروفیسر کو بھی تعجب ہوا۔

دوسرے دن ایک خط بھیجا جس میں میں نے صرف اتنا دریافت کیا تھا۔ 'یہ مضمون کیا آپ ہی نے لکھا ہے؟'

کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ ایسا خط بھیج کر میں نے کتنی حماقت اور جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ رابعہ بیگم خط پڑھ کر آپے سے باہر ہوگئیں۔ میگزین کمیٹی کے نام ان کا خط آیا۔ گالیوں سے بھر پور۔ ہم یہ خط پڑھ کر اپنا گریبان نوچنے لگے۔

اس کے مکان میں میلاد کی محفل سجی۔ گھر بھر کو دعوت دی گئی تھی۔ رابعہ بیگم کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعارف ہو چکا تھا۔ اس نے رابعہ سے بھی میرے بارے میں کہا۔ میلاد ختم ہونے کے بعد چوروں کی طرح بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے چھت کے اوپر عجیب تماشا دیکھا۔ رابعہ بیگم اور انکی

چند سہیلیاں مجھے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا" کیا میں واقعی بیوقوف ہوں؟"

تھوڑے دن کے بعد رابعہ بیگم کے گھر کے چھوٹے بڑے میرے گھر والوں سے ملنے آئے۔ ممانی جان نے سبھوں سے تعارف کرایا۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

اور اس دن تعارف کراتے وقت نہ جانے میں کیا کیا بک گیا۔ بعد میں احساس ہوا تو میں نے کہا" مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کیجئے گا"

اور انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا" اچھا جاؤ میں نے معاف کیا۔ آئندہ سے ہوشیار رہنا"

میل جول بڑھنے لگا۔ ان کا حکم تھا کہ میں انہیں آپا کہوں۔ اس کے بعد نہ جانے کتنی بار ان کے گھر گیا، ہنگامے مچائے، کھیلا کودا۔ مختلف موضوعات پر بحثیں ہوئیں۔ ادب سے لے کر سیاست تک اور سیاست سے لیکر مذہب تک۔ اسلام مذہب، اسلامی سوشلزم وغیرہ۔

کتنی پراسرار زندگی ہے رابعہ آپا کی!

صبح سویرے کبھی ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ فجر کی نماز پڑھتی نظر آتیں اور پھر اس کے بعد کتابیں لیکر بیٹھ جاتیں۔ انگریزی اور بنگلا کتابیں مختلف موضوعات پر۔ نصاب کی کتابیں شاذ ہی پڑھتے دیکھتا۔ وہ کہتیں قانون کی پابندی میرے بس کی بات نہیں۔ ایک بار وہ خوبصورت سی ٹوپی تحفہ میں دے گئیں۔

آپا جب شلوار، قمیص اور دوپٹہ میں کالج کے کوریڈور سے گذرتیں تو منچلے لڑکے آوازے کستے۔" ہر ہائی نس جا رہی ہیں"۔ مگر وہ خاموش رہتیں۔

نہ جانے کتنی جلدی آنکھ کھل جاتی تھی ان کی صبح سویرے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو ساتھ لیکر کھڑکی کے پاس آکر آواز دیتیں" ہم تک سوتے رہو گے بلبل؟" اور میں ہڑبڑا کر بچھونے سے اٹھ جاتا۔ جہینگیر روڈ بگولی پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور برہم پترا بھی لبالب بھر گیا تھا۔ گھاٹ پر کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا" کشتی کا سفر کیسا رہے گا؟" اور میں نے جواب دیا" مجھے پسند نہیں آپا۔ تیز لہروں سے ڈر لگتا ہے"۔ اور وہ کھل کھلا ہنس پڑیں۔

اس کے بعد وہ کہتیں" ادھر مجسٹریٹ صاحب کے گھر کو دیکھو۔ بجلی کی روشنی ہو رہی ہے، بجلی کا پنکھا چل رہا ہے اور ان غریب مانجھیوں کو دیکھو، پیٹ میں دانہ نہیں، تن پر کپڑے نہیں۔ جانتے ہو یہ فرق کس نے پیدا کیا ہے؟"

میں جواب دیتا" اللہ تعالیٰ نے اور کون!"

اور رابعہ آپا بڑی سنجیدگی سے جواب دیتیں" نہیں انسان نے!"

شہر میں مسلم خواتین انجمن کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ آپا ادھر سے ادھر بجلی کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی بیگم بڑی شان و شوکت سے کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئیں۔ اور پھر اس کے بعد چائے ناشتہ جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ رابعہ آپا نے ایسے موقع پر جو تقریر کی تھی اسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ انہوں نے کہا تھا" پھولوں کے گجرے سجا کر اور گلے میں لٹکا کر عورتوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہم زندگی کی قدروں کو سچ مچ بھلا چکے ہیں۔ آج ہمیں اپنی مسلمان بہنوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانی ہے"۔ اس تقریر کے بعد انہیں بے ادب اور منہ پھٹ کا خطاب دیا گیا۔

ایک دن رابعہ آپا کی شادی کا کہیں سے پیغام آیا۔ اونچا خاندان، نیک بر، اعلیٰ سرکاری ملازم!

دوپہر کا وقت تھا۔ رابعہ آپا نے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ دے کر کہا" فوراً جنرل پوسٹ آفس جا کر ایکسپریس ڈیلیوری کر دو۔ کسی کو پتہ نہ چلے"۔

پوسٹ آفس پہنچ کر میں رک گیا۔ میں نے پتہ دیکھا" مسٹر اے۔ دین۔ ڈمڈم جیل" میں سناٹے میں آگیا۔ یہ کون ہیں اور آپا کے ساتھ ان کے مراسم کیا ہیں؟

کچھ دن کے بعد آپا نے کہا۔ ایک کام اور کرنا ہے تمہیں۔ ایک آدمی ہے، نیک اور شریف، بالکل تمہاری طرح۔ وہ مجھے خط لکھتا ہے۔ اماں اور ابا کو وہ بالکل پسند نہیں۔ جیل سے اس کا خط آتا ہے۔ سبھوں کو معلوم ہو گیا ہے۔ آج سے میں تمہاری معرفت تمہارے پتے پر جواب منگواؤنگی۔ لیکن میرا اصل نام نہیں ہوگا۔ فرضی نام مثلاً یہی چمپا۔ ہاں تو تم ہوشیاری سے ایسے خطوط مجھے پہنچا دینا"

اس کے بعد دو دو دن پر خط آنے لگے۔ کتنی خوش ہوتی تھیں وہ خط پا کر۔ بھوک پیاس کو بھلا کر خط پڑھتیں اور نہال ہو جاتیں اور دن بھر خوشی سے ان کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح کھلا رہتا۔ ایک دن خط آیا تو میرا جی پڑھنے کو چاہا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے کھولا۔ تحریر بڑی خوبصورت تھی۔ "پیاری، بہت جلد میں قید سے رہا ہو رہا ہوں۔ اب تو اسی امید میں دن گذر رہے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب ہم آپس میں ملیں گے ......"
خط پڑھ کر اسے بند کیا اور پھر آپا کو دے آیا۔

آپا کے ابا اور اماں مجھے اپنے بچے کی طرح پیار کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کہیں آنے جانے میں پابندی نہ تھی۔

ایک دن سویرے سویرے آپا مجھے سیر کرانے لے گئیں۔

رکشا اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی اور میں آپا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم پہونچے ہی تھے کہ گاڑی آئی تیسرے درجے سے ایک دبلا پتلا شخص تلخ ہنسی ہنستا ہوا باہر آیا۔ آپا نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار پہنا دیا۔ کیا یہی جیل میں تھے؟ کیا یہی ہیں مسٹر اے دین؟ ویٹنگ روم میں بہت دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور اسٹیشن میں چکر کاٹتے کاٹتے میرا دم نکل گیا۔ آپا باہر آتے ہی بولیں "بہت دیر تک میں نے تمہیں انتظار کرایا۔"

آپا نے اس شخص کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ لیٹے لیٹے ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ آپا دبے پاؤں میرے کمرے میں آئیں اور بولیں۔ "جانتے ہو آج میں نے تمہارے لئے خدا سے بہت دیر تک دعائیں مانگی ہیں۔"

"کیسی دعائیں؟"

"یعنی تمہیں چاند سی بہو ملے۔"

"نہیں آپا نہیں۔"

"سونے کا بھاؤ کیا ہے جانتے ہو؟"

"کیوں؟ میری دلہن کو دیں گی کیا؟"

"مگر تم نے تو ابھی ابھی کہا کہ شادی نہیں کرو گے۔"

"جب شادی نہیں کرو گے تو میرا ایک کام کر دو۔ یہ انگشتری لو اور اسے بیچ کر جتنے روپے ملیں اس پتے پر دے آؤ۔ کچھ خیال نہ کرنا۔"

انگشتری بیچ کر میں روپے دے آیا۔ وہ شخص میس میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کے کمرے کو دیکھ کر مجھے گھن آنے لگی ایسی جگہ کوئی انسان رہ سکتا ہے۔ آپ کے روپے دیئے اور اس نے بیہوشی کے عالم میں مجھے دعائیں دیں اور بولا "انسانیت بڑی چیز ہے بھائی۔ ملک کے کام آؤ۔ ملک کی خدمت کرو۔"

اس وقت پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ میں نے مسٹر اے۔ دین (علاء الدین) کو ان ہی دنوں اسکولوں، کالجوں، چائے کے اسٹالوں، بستیوں، مزدوروں کے کارخانوں، کھیتوں اور کوچوں میں کام کرتے دیکھا تھا۔

سرکٹ ہاؤس گراؤنڈ میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ بڑے لاٹ صاحب آئے تھے۔ انگریزوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ جرمنی نے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ انہیں روپیوں کی ضرورت تھی۔ بڑے بڑے ہوائی جہاز تیار کرنے کے لئے جنگ پر فتح پانے کے لئے۔

علاء الدین صاحب کو طیش آ گیا تھا۔ مائک کے قریب آ کر انہوں نے باغیانہ تقریر کر ڈالی۔ انہیں بخشا نہیں گیا۔ قید ہو گئی۔

رابعہ آپا کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں لیکن راستے سے نہیں ہٹیں وہ خاتون کے اندر آزادی کی روح پھونکتی رہیں۔ ان کے دل کو اطمینان نصیب نہ تھا۔ علاء الدین صاحب کا خط میرے پتے پر آتا۔ ایک دن خط آیا۔ پڑھ کر بولیں "تمہیں آج ہی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

سومن شاہی جیل کا دروازہ تھا۔

علاء الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا جسم لہولہان تھا۔ آپا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ جیل کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہم واپس آ گئے۔۔
سی۔ آئی۔ ڈی نے ہمارا پیچھا کیا۔

اب علاء الدین صاحب کا خط آنا بند ہو گیا۔ وجہ کچھ نہیں معلوم۔ کئی دنوں کے بعد حقیقت کا پتہ چلا۔ یکایک ایک دن پولیس کا ایک دستہ میرے گھر آیا۔ علاء الدین صاحب کے کئی خطوط برآمد کئے۔ تابڑ توڑ کئی سوالات کئے گئے۔ علاء الدین صاحب کون ہیں؟ چمپا کون ہے؟ ان کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے؟ گرفتاری کا خوف دلایا گیا۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ ابا سے پولیس آفیسر نے نہ جانے کیا کیا کہا اور انہوں نے کئی نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ مصیبت آئی گئی رفع ہو گئی۔

شام کو آپا ملنے آئیں۔ میں نے ان سے زیادہ بات نہ کی۔ انہوں نے صرف اتنا پوچھا۔ "میرا نام تو نہیں بتایا تم نے؟"

اس کے بعد ہی سے میرے پتے پر خط آنا بالکل بند ہو گیا۔ علاء الدین صاحب اور ایک سپاہی میں بڑی دوستی تھی۔ ان ہی کی معرفت آپا کو خبریں مل جایا کرتیں۔ ایک دن خبر آئی کہ علاء الدین صاحب کی صحت بالکل گر چکی ہے۔ اس خبر کو سن کر آپا کا برا حال ہو گیا۔

اس دن شام ہو چکی تھی۔ آپا مجھے باغ کے پیچھے لے گئیں۔ انہوں نے مجھے ایک سوٹ کیس دیا اور ایک خط اور پھر سامنے کی گلی میں جانے کو کہا۔ وہاں میڈیکل کالج کا ایک طالب علم رہتا تھا۔ علاء الدین صاحب سے اس کی دوستی تھی۔ میں نے خط دیا اس نے پڑھنا شروع کیا۔ "آپ ان کے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔ ہمارے بارے میں تو آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ بکس میں تقریباً ہزار روپے کا زیور ہے۔ اسے بیچ کر جس طرح بھی ہو ان کی ضمانت کا بندوبست کیجئے۔ آپ کی، رابعہ"

ضمانت پر انہیں رہائی مل گئی۔

برہم پتر کے کنارے فوجداری پاڑہ میں ایک دوست کے گھر میں انہوں نے پناہ لی۔ روزانہ شام کو آپا مجھے اپنے ہمراہ لیکر وہاں جاتیں اور گھنٹوں نہ جانے کس کس موضوع پر آہستہ آہستہ گفتگو کرتیں۔ ایک دن مجھے بڑا غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا "یہ علاء الدین صاحب ہیں کون؟ آپا کے ساتھ ان کا کیا رشتہ ہے؟ کتنے بدشکل ہیں دیکھنے میں۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایک سال یونہی گذر گیا۔

جھما جھم بارش ہو رہی تھی۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک خبر تھی۔ کشور گنج کے چار سو مسلمان ملٹری کی گولیوں سے زخمی ہو گئے۔ ان لوگوں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ایک کھال کاٹا تھا تاکہ کاشتکار کو گرمیوں میں دھان بونے کے لئے پانی ملے۔ اس حادثہ کے بعد جگہ جگہ جلسے ہونے لگے، جلوس نکالے گئے، علاء الدین صاحب پیش پیش تھے۔ انہوں نے ایک دن پستول سے پولیس پر حملہ کر دیا۔ کئی پولیس والے مر گئے۔ وہ بھاگ رہے تھے کہ ان کے پاؤں میں گولی لگی۔ وہ گر پڑے۔ رات بھر ایک کھیت میں پڑے رہے۔ صبح گاؤں والے ان کو اپنے گھر لے گئے۔

وہی مومن شاہی ہے، وہی سرکٹ ہاؤس گراؤنڈ ہے، وہی دن رات ہیں وہی علاء الدین صاحب ہیں اور وہی رابعہ آپا۔ آج جبکہ ہم آزاد ہیں کیا آپا کی باتیں بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں۔

آپا کی شادی کا پیغام آیا۔ اونچے گھرانے کے ایک معزز سرکاری افسر کے ساتھ۔ شادی کو صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ رابعہ آپا مزے میں ہنستی بولتی رہیں، کتابیں پڑھتی رہیں۔ سب خوش تھے۔ میں بھی خوش تھا۔

شام کو چھت کے اوپر سے آپا نے مجھے بلایا۔ اور پوچھا۔ "علاء الدین صاحب کا خط آیا ہے کیا؟ وہ بہت بیمار ہیں۔ ڈھاکہ میں ہیں۔ چلو ان کو دیکھ آئیں۔"

میں نے کہا۔ "پرسوں تو آپ کی شادی ہے؟"

رات کو پھر انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ چاندنی رات تھی ان کے جسم میں زیورات جگ مگ کر رہے تھے۔ بولیں۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟" میں نے جواب دیا۔ "بالکل شہزادی جیسی۔" صندوق کھول کر انہوں نے اور گہنے نکالے اور ریشمی چادر سے جسم ڈھانکا۔ پھر بولیں۔ "تمہارے ساتھ اب تو کہیں جا نہیں سکتی۔ چلو آج آخری بار گھوم لیں اس چاندنی رات میں۔"

برہم پتر کے کنارے کنارے ہم جا رہے تھے۔ اسٹیشن نزدیک آیا تو آپا رک گئیں۔ بولیں۔ "اور آگے چلو۔" آہستہ آہستہ اسٹیشن کے گیٹ میں داخل ہو کر وہ کھڑی ہو گئیں۔ ڈھاکہ جانے والی گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ گارڈ نے وسل دی۔ آپا فوراً تیسرے درجے میں داخل ہو گئیں۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا اور بولا۔ "ٹرین روانہ ہونے والی ہے آپا۔ جلدی اتر جایئے۔" مگر وہ بولیں۔ "تمہیں بہت پریشان کیا میں نے۔ معاف کرنا بھائی میرے۔ کسی سے کہنا مت۔" اور یہ کہہ کر

وہ رو پڑیں۔ ساون کی برکھا کی طرح ان کے آنسو گرنے لگے۔ اور چاند کی شفاف روشنی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سفید پتھر سے جھرنا پھوٹ رہا ہو۔

ٹرین روانہ ہوگئی۔ ڈبے چھوٹے سے چھوٹے ہوتے گئے مگر کتنی عجیب ہے یہ دنیا اور یہ انسان!

میں گھر واپس آگیا۔ آپا کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ آپا صرف ایک خط چھوڑ گئی تھیں جس میں تحریر تھا۔

"آسمان پر اڑنے والے پنچھی کو پنجرے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے وطن کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ ڈھاکہ کی ایک غلیظ بستی میں آج میری شادی ہوئی، علاء الدین کے ساتھ۔ مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کی دعوت نہ کرسکی۔ مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ رابعہ"

اس کے بعد آپا کے گھر میں کسی دن بھی ان کا ذکر نہ آیا۔ اور اگر کبھی ذکر آتا تو ان کے ابا اماں کہتے۔ "رابعہ نامی کسی لڑکی نے میرے گھر میں جنم نہیں لیا"

میرا امتحان ختم ہوگیا۔ مومن شاہی سے اپنے وطن آگیا۔ رابعہ آپا نے کبھی خط نہیں لکھا۔ کبھی کبھی ان کی باتیں یاد آتیں تو سوچتا۔ نہ جانے وہ زندہ ہیں یا مرگئیں!

نہیں، نہیں، رابعہ آپا زندہ ہیں — رنگپور بلایا ہے انہوں نے۔ اسٹیشن سے بہت دور گلی میں بڑی تلاش کے بعد ان کا گھر ملا۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں نے ان کو دیکھا۔ مگر یہ کیا! یہ تو صرف ان کی چھایا ہے! ان کا حسین چہرہ سیاہ ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ایک بچہ مٹی میں کھیل رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "میں تو پہچان نہ سکی۔ کتنے بڑے اور کیسے خوبصورت ہوگئے ہو تم۔ میں جانتی تھی آؤ گے۔ ایک دن مسلم ہال کی ادبی انجمن کے میگزین میں تمہارا نام دیکھا۔ اور اسی پتہ پر تمہیں خط بھیج دیا"۔

انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلایا پلایا۔ میں نے پوچھا: "گھر پر اور کوئی نہیں؟" کہنے لگیں: "رات کو ایک بڈھا یہاں آکر رہتا ہے۔ اسکول کا دربان ہے وہ۔ اس سے سودا سلف منگالیتی ہوں"۔

شام کو انہوں نے اپنی کہانی بیان کی، اپنی شادی کی۔ پھر علاء الدین صاحب کے بارے میں انہوں نے کہا کہ کس طرح ان کی صحت بگڑ گئی، ایک آنکھ جاتی رہی، ایک ہاتھ مفلوج ہوگیا۔ آپا پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ چالیس روپے تنخواہ۔ بڑی تنگ دستی سے دن گذر رہے ہیں۔ اور پھر ایک دن زندگی کا سرمایہ لٹ گیا۔ تنہا رہ گئیں۔ ساتھی نے ساتھ چھوڑ دیا۔

رابعہ آپا کی کہانی سن کر میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ "آپا تم اپنی زندگی کو موم بتی کی طرح پگھلاتی رہیں۔ اپنے لئے نہیں، ملک اور قوم کی آزادی کے لئے۔ آج میں ساری باتیں لکھوں گا رابعہ آپا کی بھولی بسری باتیں"۔

غزل

سراج الدین ظفر

اُٹھ کہ مانندِ شلنگِ آہو
زندگی رقص ہے از ہُو تا ہو

امتیاز ان میں کہاں تک یارو
خیر و شر دونوں ہیں سرتا پا ہُو

سحر و شام گذرتے ہیں مرے
یا بہ گل پیرہناں یا باہُو

جام و تسبیح و رباب و زنار
ہمہ اسباب و ہمہ اشیا ہُو

رات بھر یارِ پری چہرہ و جام
صبح کو نالۂ یاہُو یاہُو

لبنیٰ و نجمہ و شیخ و واعظ
ہمہ القاب و ہمہ اسما ہُو

میری رندی کے لئے کافی ہے
یک قدح بادہ و یک صحرا ہُو

کہیں زمزم ہے کہیں جام شراب
کہیں قطرہ ہے کہیں دریا ہُو

کون آغوشِ محبت سے اٹھا
عالمِ شوق ہے سرتا پا ہُو

کہیں اسرار کے سو سو پردے
کہیں بازار میں ہے رُسوا ہُو

میرے ہاتھوں سے تری زلفِ دراز
کبھی کُھل جائے تو یاتو یا ہُو

زندگی کی کوئی تعریف نہیں
بس کہ ناپید سے ہے پیدا ہُو

عالمِ ہُو کو جو پہنچے مے خوار
کوئی بے ہُو تھا نہ کوئی باہُو

رات کو لوح ذہانت پہ مری
چھوڑ جاتا ہے نقوشِ پا ہُو

رات دیکھا جو بروئے تحقیق
جام میں کچھ بھی نہ تھا اِلّا ہُو

یہی اشعار میں ڈھل جاتے ہیں
صبح کے وقت زا سہم یا ہُو

بیخودی عشق کی لائی ہے کہاں
ہر قدم دامِ فنا ہر جا ہُو

ہر غزل ہے مری برجستہ ظفرؔ
کیا قیامت ہے نویں میں راہُو[1]

---

[1] میکو کارا ہو میرے زائچے کے خانۂ نہم میں ہے اور خانۂ نہم ادب سے متعلق ہے۔

غزلیں

(بہ رنگِ میر)

صہبا اختر

○

تم نے کہا تھا چپ رہنا سو چپ نے بھی کیا کام کیا
چپ رہنے کی عادت نے کچھ اور ہمیں بدنام کیا

کنجِ چمن میں آس لگائے چپ بیٹھے ہیں جس دن سے
ہم نے صبا کے ہاتھ روانہ ان کو اک پیغام کیا

فرزانوں کی تنگ دلی فرزانوں تک محدود رہی!
دیوانوں نے فرزانوں تک رسمِ جنوں کو عام کیا

ہم نے بتاؤ کس تپتے سورج کی دھوپ سے مانی ہار
ہم نے کس دیوارِ چمن کے سائے میں آرام کیا

صہبا کون شکاری تھے تم وحشت کیش غزالوں کے
متوالی آنکھوں کو تم نے آخر کیسے رام کیا

○

"صحرا صحرا[1] گلشن گلشن گیت ہمارے سنئے گا
یاد بہت جب آئیں گے ہم چپ بیٹھے سر دھنیے گا"

آج ہمارے اشکوں سے دامن کو بچا لیں آپ مگر
یہ وہ موتی ہیں کل جنکو شبنم شبنم چنئے گا!

ہم سے سادہ دل لوگوں پر ذوقِ اسیری ختم ہوا
ہم نہ رہے تو کس کی خاطر جال سنہرے بنیے گا!

دل کی باتیں طولانی ہیں اور یہ راتیں فانی ہیں!
میں بھی کب تک بول سکوں گا آپ بھی کب تک سنئے گا

جس صہبا کے دل دینے کے قصے سے ناراض ہیں آپ
اُس نے آخر جان بھی دے دی یہ بھی اک دن سنئیے گا

○

رات کی ظلمت کیا سمجھے کب صبح کا تارا جانے ہے
جو بھی دل پر گذرے ہے وہ دل ہی ہمارا جانے ہے

شبنم کے یہ جھلمل قطرے کس کی آنکھ کے آنسو ہیں
کوئی انہیں موتی سمجھے ہے کوئی ستارا جانے ہے

ثبت ہیں غنچے کے ہونٹوں پہ محبت کی مُہریں
اِس گلشن کا ذرّہ ذرّہ عشق ہمارا جانے ہے!

اندھی دنیا کی آنکھیں گو دیکھ نہیں سکتیں لیکن
ہم نے کتنے دیپ جلائے یہ اندھیارا جانے ہے

عمرِ رواں کی بیتابی کو کیا سمجھیں گے سست قدم
تیز ندی کے موڑوں کو بہتا ہوا دھارا جانے ہے

کس نے تمہیں صہبا کے سوا چاہا ہے پرستش کی حد تک
مانے نہ مانے آنکھ نہ مانے دل تو تمہارا جانے ہے

---

[1] اس لئے کہ یہ مطلع میر کے مطلع سے بہت قریب ہے - ص-ا

غزل

جمیل نقوی

حسن ہے عشق کا اعجاز، کوئی کیا جانے
یہ بھی اک راز ہے، اک راز، کوئی کیا جانے
فطرتِ شعلۂ آواز کوئی کیا جانے
نغمگی سوز ہے یا ساز، کوئی کیا جانے
کلفتِ دردِ اسیری بھی بری شے ہے مگر
لذتِ حسرتِ پرواز، کوئی کیا جانے
اس نے دیکھا تھا تجاہل سے مرے دل کی طرف
تھا وہ انجام کہ آغاز، کوئی کیا جانے
یک بہ یک شعلہ سا لپکا تھا مرے پہلو میں
کہہ گیا کیا دلِ غماز، کوئی کیا جانے
مجھے اس شوخ نے کل رات بھری محفل میں
کیوں کیا تھا نظر انداز، کوئی کیا جانے
عشق کس درجہ صفا فطرت و سادہ ہے جمیلؔ
عقل ہے کتنی درانداز، کوئی کیا جانے

غزل

نظر حیدرآبادی

اے ہمنشیں نہ پوچھ کہ کن خلوتوں میں ہوں
فرصت کہاں کہ وقت کو آواز دے سکوں
اس کشمکش نے زیست کو آسان کر دیا
وہ صاحبِ جمال ہیں میں صاحبِ جنوں!
مدماتی آنکھ، بوٹا سا قد، ڈولتی سی چال
آواز کی کھنک میں ہے آہنگِ ارغنوں
چہرہ، لطافتِ گلِ تازہ لئے ہوئے
لہجے کی نرم آنچ سے دمکا ہوا فسوں!
کس سادگی سے میری طرف دیکھتے ہیں آپ
اس طرفہ التفات کو کہئے کہ کیا کہوں
اُٹھنے کہ پائے ناز پہ سجدے کروں نثار
مُدّت سے آپ رہتے ہیں محزون و سرنگوں
نازک سے پھول اور حوادث کے ہوں شکار
شاخوں کے سر سے اور گذر جائے موجِ خوں
جانِ نظرؔ سکوں ہے محبت کی چھاؤں میں
دُنیائے دوں کی دھوپ کہاں اور کہاں سکوں

بے خانماں لوگوں کی آبادکاری

بے خانماں لوگوں کی آبادکاری حکومت پاکستان کا ایک مقدس فرض ہے کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جن کی سرفروشانہ جدوجہد سے پاکستان وجود میں آیا۔ اور یہی فدائیانِ ملت ہیں جو برصغیر کے دُور دراز گوشوں سے اپنے آبائی وطن اور گھربار کو تج کر ہزارہا مصائب جھیلنے اور جان و مال کی بے اندازہ قربانیاں دینے کے بعد اپنے نئے وطن میں پہنچے اور اس کے شہریوں کی حیثیت سے ان کی آسودگی و خوشحالی کا اہتمام لازم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان قائم ہوا تو قائدِ اعظمؒ نے مہاجرین کی بحالی و آبادکاری کو حکومت کی اوّلین توجہ کا مستحق گردانا اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی۔ ان کے بعد قائدِ ملت کے زمانہ میں بھی ان کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، اور اگر سرگرمیٔ عمل و خلوصِ کار کی یہی کیفیت رہتی تو یقین ہے کہ مہاجرین کی بحالی و آبادکاری کا مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔ مگر افسوس! تعمیر و ترقی کے اس روشن دور کے بعد ایک طویل دورِ تاریک کا آغاز ہوا جس سے قومی مفاد خود غرض عناصر کی سیاسی چالبازیوں اور ذاتی و جماعتی مناقشات و تنازعات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور دیگر اہم مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی مدتوں بے توجہی کا شکار رہا۔ چنانچہ پاکستان کے یہ بدنصیب شہری اپنے وطن میں بھی غریب الدیار ہی رہے اور شہر شہر، قریہ قریہ گھاس پھونس کی جھونپڑیوں اور فٹ پاتھوں پر رُلتے رہے۔ توقع تو یہ تھی کہ ان کے نئے وطن کی آزاد فضائیں ان کے لئے مسلسل آسودگی و خوشحالی کا پیغام لائیں گی، لیکن اس کے برعکس وہ برابر گرمی سردی اور آندھی برسات کے صدمے سہتے رہے۔ ہر طرف گھٹا گھٹا غلیظ ماحول اور اس کا لازمی شاخسانہ گوناگوں بیماریاں اور وبائیں یہ صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات تھے، جن سے وہ عرصۂ دراز تک دوچار رہے۔

شاید وہ بدستور ایک غیر معین مدت تک ان ہی مصائب میں مبتلا رہتے اور کوئی بھی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا لیکن دفعتہً ایک کرشمۂ غیب سے ان کی قسمت جاگ اٹھی۔ قدرت نے ان کو یکایک ایک ہمدرد اور خیر خواہ حکومت عطا کر دی جس کا مقصد افرادِ ملت کی رفاہ و بہبود کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے عنانِ کار ہاتھ میں لیتے ہی اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کی اور بے خانماں لوگوں کی مکمل آبادکاری کو اپنا مقصدِ اوّلیں قرار دیا۔ ابھی نیا انقلاب پوری طرح بروئے کار نہیں آیا تھا کہ مارشل لا کے ابتدائی زمانہ ہی میں حکومت نے اعلان کر دیا کہ وہ ان مفلوک الحال انسانوں کو تسلی بخش طور پر آباد کر کے ہی دم لے گی۔ یہ پاکستانی شہریوں کو ان کے واجبی حقوق دلانے اور ان کو آسودہ و خوشحال بنانے کے ہمہ گیر نصب العین کا جزولاینفک تھا۔ کیونکہ آبادی کے اتنے کثیر حصّہ کو یوں بے اطمینانی کی حالت میں چھوڑ دینے سے زندگی کا نظام درہم برہم رہتا ہے اور کسی معاملہ پر بھی یکسوئی و دلجمعی سے توجہ نہیں دی جا سکتی۔ چہ جائیکہ قومی عزائم و مقاصد کا مکمل طور پر اہتمام کیا جا سکے۔

یہ احساس نئے قائدین کے دل میں کس قدر شدت سے جاگزیں تھا، اس کا اندازہ اس اعلان سے لگایا جا سکتا ہے جو موجودہ صدرِ پاکستان نے انقلاب کے چار ہی دن بعد ناظمِ اعلیٰ مارشل لا کی حیثیت سے ایک پریس کانفرنس منعقدہ ۱۱ر اکتوبر میں کیا تھا یعنی نئی حکومت کے نزدیک جو مسائل سرِ فہرست ہیں' ان میں سے ایک بے خانماں لوگوں کی آبادکاری کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ دس دن کے اندر ہی اندر ایک کمیٹی قائم کر دی گئی "تاکہ مہاجرین کے مسئلہ پر غور و خوض کیا جائے' اس سے متعلق منصوبوں کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو ان کے عملی صورت اختیار کرنے میں سدِّ راہ ہیں۔ اور اس کام کی تکمیل کے لئے آخری وقت کا تعین کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف اس خدمت سے عہدہ برآ ہونے کی شدید تمنا ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ احساس بھی نمایاں ہوتا ہے جو نئے اربابِ اختیار قوم کے اس مصیبت زدہ طبقہ کے لئے اپنے دل میں لئے ہوئے ہیں۔

انہوں نے بار بار کہا ہے کہ یہ لوگ ہمیں نہایت عزیز ہیں۔ ہماری نظروں میں ان کی بے حد قدر ہے کیونکہ انہوں نے جو بھی مصیبتیں سہیں' پاکستان ہی کی خاطر سہیں۔ ہم ان کے ساتھ انصاف اور فیاضی کا سلوک روا رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری ہمدردی شفقت اور محبت کے مستحق ہیں۔ وہ ہماری قوم کا نہایت اہم سرمایہ ہیں۔ ہم انہیں مطمئن اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انہیں بددل یا مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ احساسِ مسرت سے

سرشار ہونا چاہیئے کہ ان پر ایک مہربان حکومت کا سایہ ہے جو ان کے لئے آسودگی و خوشحالی کا سامان مہیا کر رہی ہے اور ان کے باشرف زندگی بسر کرنے کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے میں کوشاں ہے۔

قبل ازیں ارباب نظم و نسق کے سامنے کوئی معین لائحہ عمل نہ تھا۔ اب صورتِ حال بدل چکی ہے اور حکومت نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ قوم کے لئے صحیح معنوں میں آیۂ رحمت ثابت ہو۔ اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ تمام ممکنہ وسائل اور متعلقہ مرکزی و صوبائی منصوبوں کو یکجا اور باہمدگر مربوط کر کے اس مسئلہ پر پوری شدت سے مرکوز کر دیا جائے۔ چنانچہ ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک انتظامی کارروائیوں کا ایک وسیع سلسلہ نظر آتا ہے۔ کارپردازوں اور ان کے کام کی کڑی سے کڑی نگرانی کی جا رہی ہے، وقتاً فوقتاً طے شدہ مراحل کا جائزہ لیا جاتا ہے، کارکردگی کے لئے بہتر سے بہتر قواعد و ضوابط مرتب کئے جا رہے ہیں۔ نئے وسائل کی تلاش اور استعمال برابر جاری ہے۔ منصوبوں کی ہر وقت شدید غور و پرداخت ہوتی ہے اور ان کو مناسب توسیع و ترقی سے مؤثر ترین بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ سارا سلسلہ ایک متحرک تجرباتی و ترقیاتی سلسلہ ہے۔ جس کا مقصد ایک ہنگامی صورت حالات سے نبرد آزما ہونا ہے۔ کیونکہ جب تک یہ بنیادی رکاوٹ ہمارے راستے سے دور نہیں ہوگی ہم کبھی قومی تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے جو طریقے اور تدبیریں اختیار کی جائیں گی وہ ایک مربوط و منظم منصوبے پر مبنی ہوں گی۔ جو گزشتہ چار مہینوں میں کافی واضح شکل اختیار کر چکا ہے۔

مہاجرین کے سلسلہ میں دو ہی اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ان کی تسلی بخش آبادکاری اور دوسرا متروکہ جائدادوں سے متعلق دعاوی کا فیصلہ۔ لہٰذا ساری توجہ انہی دو مسئلوں پر مرکوز کی جا رہی ہے۔ ۲۱ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو اعلیٰ سطح پر جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں فیصلہ کیا گیا کہ بحالیاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دریائے حب کے پاس بلدیاتی علاقہ میں فی الفور ۵۰ ہزار بے خانماں خاندانوں کو دو سال کے اندر اندر بسانے کا اہتمام کیا جائے جو وفاقی علاقہ میں بڑی مصیبت کے دن کاٹ رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پچاس ہزار کوارٹر بنائے جائیں گے جن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ آغاز سے ۶ ماہ یا حکومت کی منظوری سے ۸ ماہ بعد: دس ہزار کوارٹر

۲۔ ۱۲ ماہ بعد: بارہ ہزار کوارٹر

۳۔ ۱۸ ماہ بعد: چودہ ہزار کوارٹر

۴۔ ۲۴ ماہ بعد: چودہ ہزار کوارٹر

جہاں تک وفاقی علاقہ کا تعلق ہے آبادکاری کی ساری مہم کراچی ترقیاتی ادارہ کے سپرد کر دی گئی ہے جس نے ۳ نومبر کو کراچی کی ۵ مہاجر آبادیوں، لالوکھیت، ڈرگ روڈ ولیج، مالیر، لانڈھی اور مالیر ایکسٹینشن کا کام سنبھال لیا۔ اور ایک اعلیٰ طاقت کی کمیٹی موسوم بہ کوآرڈینیٹنگ کمیٹی اس غرض سے قائم کی گئی کہ وہ یہاں کے بے خانماں لوگوں کو جلد از جلد تسلی بخش طور پر بسا دے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ تاریخ اعلان ۹ ر نومبر سے ۶ ماہ کے اندر اندر ۱۴ ہزار کوارٹر تعمیر کئے جائیں۔ نصب العین یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بے خانماں لوگوں کو آباد کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس کام کے لئے تقریباً ۴ کروڑ روپے کا سرمایہ فوری طور پر موجود تھا اور اس کے لئے وقف کر دیا گیا۔ مزید دس کروڑ روپے دیگر ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کمیٹی کے اہم فیصلہ جات یہ تھے:

۱۔ بے خانماں لوگوں کو خاص خاص علاقوں میں ۱۲۰ مربع گز کے پلاٹ دئے جائیں گے۔ جن پر انہیں حقوق مالکانہ ہوں گے۔

۲۔ تعمیر کا کام معین منصوبوں کے مطابق ہوگا جن میں بعد کو توسیع بھی ہو سکے گی۔ اگر الاٹی ذاتی خرچ کرنے پر آمادہ ہو۔

۳۔ تمام نوآبادیوں کو پانی، بجلی، دواخانوں، سڑکوں، بدرووں، مدرسوں اور مارکیٹوں وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

۴۔ صفائی اور رفاہ و بہبود کے لئے عملہ مہیا کیا جائے گا۔

۵۔ کمیٹی تعمیر کے کام کی برابر نگرانی کرے گی۔

۶۔ سٹیرنگ کمیٹی تعاون کاروں سے رکاوٹوں کو دور کرے گی۔

۷۔ تمام معاملات جلد از جلد انجام پذیر ہوں گے۔

سب سے بڑھ کر سارا کام ایک جامع منصوبے کے تحت ہوگا جس کے مطابق یہ نو آبادیاں مضافاتی شہروں کا حصہ بن جائیں گی۔ اور پھر کام انتہائی تیزی و مستعدی سے حسب نشان دہی، عین مقررہ اوقات پر انجام پائے گا۔ یہ تمام فیصلے آخری و قطعی ہیں اور ان پر پوری طرح عملدرآمد ہوگا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مختلف علاقوں کے بے خانماں لوگوں کو مرکزی فیصلوں کے مطابق ایک ایک کر کے بسایا جائے۔ ایک اور اسکیم کے مطابق جدا جدا منصوبوں کے تحت خاص خاص علاقوں میں نو آبادیاں قائم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جن میں بنیادی ضرورتیں مہیا کی جائیں گی۔ ان علاقوں میں نجی طور پر تعمیر مکانات کی بھی گنجائش چھوڑی گئی ہے۔ جن لوگوں کے کوئی دعاوی نہیں ہیں ان کو غلام محمد بیراج میں بسلنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ان تمام نئی آبادیوں میں گھریلو دستکاریوں کو منظم طریقے سے جاری کرنے اور لوگوں کو روزی کمانے اور خود کفیل بننے کا اہتمام بھی ہے۔

متوسط طبقے کے مہاجرین کے لئے کورنگی میں ایک نو آبادی تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس میں ۵۰ ہزار مکانات ہوں گے۔ اور ان کی لاگت چھوٹی چھوٹی آسان قسطوں میں وصول کی جائے گی یا یہ مکانات تقریباً مفت بھی مہیا کئے جائیں گے۔

حکومت مغربی پاکستان نے ایک مہتم بالشان منصوبہ بنایا ہے جس کے مطابق صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو رہائش مہیا کی جائے گی۔ سارے صوبے میں چھوٹے چھوٹے مکانوں کے لئے ۸۰ ہزار پلاٹ بنائے جائیں گے جو مزدوروں کو بڑی آسان شرائط پر مہیا کئے جائیں گے۔ بڑے بڑے صنعت کاروں کو بھی ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ مزدوروں کو بسانے میں حصہ لیں۔ حکومت نے ان کے لئے ۱۰ ہزار کوارٹر بنانے کا اقرار کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ۵۰ مختلف مقامات منتخب کئے جا چکے ہیں جن کو مضافاتی شہروں کے طور پر آباد کیا جائے گا۔ اس منصوبہ کا کام تیزی سے جاری ہے۔

وزیر بحالیات، جنرل محمد اعظم خاں نے مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے ایسے ہی اہم اقدامات کئے ہیں۔ انہوں نے محمد پور کے مضافاتی شہر کا سنگِ بنیاد رکھا اور مہاجرین کو مشورہ دیا کہ یاس و ناامیدی کو خیرباد کہہ کر خوشی و خرمی کا احساس پیدا کریں اور نئے جوش و خروش کے ساتھ زندگی کا آغاز کریں۔

بحالیاتی مہم کی دوسری شق دعاوی کا جلد از جلد فیصلہ ہے۔ یہ بھی ۱۰-۱۱ سال سے معرضِ التوا میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے جلدی انجام پانے کی امید روز بروز موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر دعویداروں کے بے طور، مبالغہ آمیز اور جھوٹے مطالبوں نے معاملہ کو شدید تر اور پیچیدہ تر بنا دیا تھا۔ لہٰذا ان دعاوی کا فیصلہ سخت گیر اقدام کے بغیر ناممکن تھا۔ نئے اعیان حکومت نے شروع ہی میں مطالبوں کو درست اور غلط دعووں کو واپس لینے کی ہدایت کر دی تھی۔ مارشل لا کے ساتھ ان اقدامات نے سخت تر ہو کر تنبیہ کی صورت اختیار کر لی، اور ۳۱ دسمبر ۵۸ء تک مہلت دی گئی کہ غلط دعوے واپس لے لئے جائیں، مبالغہ آمیز دعووں کی تصحیح کر دی جائے اور جو متروکہ جائداد ناجائز قبضہ میں ہو اس کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ ہوا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا واپس اور تصحیح شدہ دعووں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ آخرکار واپس شدہ دعووں کی تعداد ۳۶۱۹ اور تصحیح شدہ دعووں کی تعداد ۴۲۲۱ تک پہنچ گئی۔ اس طرح ایک ارب سے زائد مالیت کے دعوے واپس لے لئے گئے۔ مخفی دولت۔ جائداد جو واپس کر دی گئی یا اس کا اعلان کیا گیا یا ناجائز قبضہ میں ہے، اس بازیافتہ رقم میں شامل نہیں۔ غرض یہ تمام تدبیریں تیر بہدف ثابت ہوئیں۔ اس مقصد کے لئے ۲۸ نومبر ۵۸ء کو ایک مارشل لا ریگولیشن (نمبر ۴۹) جاری کیا گیا۔ انہی ایام میں جو اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں طے پایا کہ دیہاتی علاقوں میں متروکہ زرعی اراضی کی تقسیم کے بارہ میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں نے سال نو کے تحفہ کے طور پر ۴ جنوری ۵۹ء کو بے خانماں لوگوں کی بحالی و دادا نگی مطالبات سے متعلق ترمیم شدہ آرڈی ننس جاری کیا جس کے مطابق آبادکاری کا کام تین مرحلوں میں طے ہو جائے گا۔ متروکہ جائدادوں کا انتقال مارچ کے اخیر سے شروع ہوگا۔ اور بیشتر کام سال کے آخر تک ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی رشوت ستانی کا وہ سلسلہ بھی جس کا تمام سابقہ سیاسی حکومتوں میں بازار گرم رہا۔ جہاں تک جموں اور کشمیر کے مہاجرین کا تعلق ہے انہیں جو مکانات یا دکانیں الاٹ کی گئی ہیں وہ بدستور بحال رہیں گی۔

مہاجرین کو منظم طریقے سے صحیح مقامات پر بسانے کے لئے حال ہی میں مرکزی دفتر اعداد و شمار، ادارۂ ترقی اقتصادیات اور کراچی یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے کم از کم وقت میں ۱۴ ہزار مہاجرین سے اہم کوائف بہم پہنچائے گئے۔

بحالیاتی پالیسی میں ان امور پر ترتیب وار توجہ دی جائے گی۔ تعمیرات، تعلیم اور رہائش۔ دیگر اقدامات میں ایک معلوماتی ادارہ اور منصوبوں کی نگرانی کے لئے مرکزی وزارتِ بحالیات میں ایک نئے شعبۂ موسوم بہ شعبۂ مکانات و ترقیات کا قیام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام اقدامات کی اہمیت اظہر من الشمس ہے جنہوں نے پاکستان کو حقیقی معنوں میں جنتِ ارضی بنا دیا ہے۔

افق تا افق :

ہمارا تعلیمی نصب العین

جنرل محمد ایوب خاں

"ہمارا تعلیمی نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟" یہ سوال ہماری قومی نشوونما اور عروج و ترقی کے سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور نئی حکومت کی خصوصی توجہ کا باعث۔ لہٰذا کراچی یونیورسٹی کے حالیہ جلسۂ تقسیم اسناد اور طلباء ڈھاکہ کے ایک اجتماع میں صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں کے ارشادات ہمارے تعلیمی نصب العین کی نشاندہی کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ہم ان کو ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (مدیر)

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے زمانۂ طالبعلمی کے دوران کتنے ہی لوگوں نے برابر مشورے دیئے ہوں گے۔ کبھی آپ کے والدین نے، کبھی اساتذہ نے، اور کبھی انہوں نے جن کا کام ہی محض مشورے دینا ہے۔ آج جب آپ اپنی مادرِ علمی کی آغوش سے باہر نکل رہے ہیں، میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ آپ کو اور بھی وعظ و نصیحت اور مشوروں سے گراں بار کروں لیکن چند ایک باتیں ایسی ہیں جو میرے دل و دماغ میں بھی اسی طرح موجود ہیں جیسی کہ وہ یقیناً آپ کے ذہن میں بھی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ان اُمور کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں۔

میرے عزیز لڑکو اور لڑکیو! جب آپ یونیورسٹی کی مقدس حدود سے باہر نکلو گے تو سب سے پہلے جس حقیقت کا آپ پر انکشاف ہوگا وہ یہ ہے کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں، اور نہ یہ کسی طرح ایک وسیع و عریض خارزار ہی ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات درحقیقت ایک زبردست چیلنج ہیں۔ ہم اس وقت جس بوالعجبی سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بے اندازہ مواقع موجود ہیں اور دوسری طرف ان سے بے انتہا غفلت برتی جارہی ہے یا ان کا غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارا وطن، پاکستان ایک زندہ و توانا متحرک قوم کے جذبۂ بے اختیار اور سیاسی و روحانی ولولہ کی پیداوار ہے۔ اور جب اس کا قیام عمل میں آیا تو زندگی کے تمام شعبوں ـ نظم و نسق، کاروبار، صنعت و حرفت وغیرہ میں بے پایاں امکانات کے دروازے کھُل گئے۔

اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا جب کہ مسلمانوں کو نظریاتی، علاقائی یا مادّی حیثیت سے ایسا سرو سامان اور مواقع دستیاب ہوئے ہوں جیسے کہ قیام پاکستان کے بعد میسر آئے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو صرف اعلیٰ مقصد اور پُرخلوص قیادت کی جو ہمارے ہر اُس نصب العین کو عملی شکل عطا کردے، جس کی بنا پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ اور مملکت کے بے پایاں وسائل کو قوم کی خدمت کے لئے وقف کردے۔ شومئ قسمت سے ایسا نہ ہوسکا۔ اور میں آپ جیسے نونہالانِ قوم کے دل و دماغ کو اس ناکامی کی ناگوار تفصیلات سے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

(شک) اسمیں شک نہیں کہ ہم سب غلطیاں کرتے ہیں۔ آپ کے بعض بزرگوں سے، جو آخر انسان ہی تھے، کچھ فروگذاشتیں ہوئیں لیکن اب یہ باب ختم ہوچکا ہے۔ آپ اسے ہمیشہ کے لئے بھول جائیے۔ ماضی کی یاد میں نہ کھوئے رہئے بلکہ حال پر توجہ دیجئے اور بہتر مستقبل کے لئے سرگرم عمل ہوں لیکن اس بات کا کہہ دینا آسان ہے، اس کو کر دکھانا مشکل ہے۔ جب آپ زندگی کے میدان میں عملی طور پر قدم رکھیں گے تو ممکن ہے آپ کشمکشِ حیات کو بیحد کٹھن، صبر آزما بلکہ حد درجہ نامساعد پائیں۔ مایوسیوں اور دل خوش کُن تصورات کے بادر ہوا ہونے کا احساس آپ کے دل و دماغ کو گھیرے رکھے گا۔ لیکن بعینہٖ ایسے حالات ہی ہیں جن میں تعلیم انسان کے طرزِ عمل میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ایک غیر تعلیم یافتہ شخص ذاتی دشواریوں اور آزمائشوں سے گھبرا کر بہ آسانی اپنے ملک و وطن کی طرف سے بددل اور بدگمان ہوجاتا ہے لیکن چونکہ آپ تعلیمیافتہ ہیں اسلئے آپ کو ایسی لغزشوں سے دامن بچانا چاہیئے اور اپنی ذاتی مایوسیوں کو کبھی یہ اجازت

نہیں دینی چاہیئے کہ وہ آپ کے جذبۂ حب الوطنی پر غالب آئیں۔ ہم اور آپ تو آتی جاتی پرچھائیں ہیں۔ جو چیز ہمیشہ قائم رہے گی وہ ہمارا وطن پاکستان ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ پاکستان پورے عزّ و وقار اور افتخار کے ساتھ قائم رہے۔

حصولِ آزادی سے پہلے جب میرے دور کے لوگ یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر فارغ التحصیل ہوئے تو ان کا راستہ بہت صاف اور آسان تھا۔ اس وقت تعلیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ ایک غیر ملکی مشین کے لئے کل پرزے پیدا کئے جائیں۔ اب یہ مقصد ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمیں سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کارگذار بابو اور عمّال پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں ایسے جوان مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو ایک نااہل قیادت کے خلا کو پُر کرسکیں۔ وہ قوم کی صحیح معنوں میں خدمت بجالائیں نہ کہ اس پر حکومت کریں۔ وہ ہماری شاندار مسلح افواج کو اور بھی چار چاند لگائیں۔ کاروبار اور صنعت و حرفت میں دیانت داری، انصاف اور رکھ رکھاؤ کی نئی روایات قائم کریں، موجودہ ایٹمی سائنس کے دور میں فنیاتی ترقی کا مہتم بالشان کام انجام دیں اور اس طرح بالعموم ملک کی سماجی، پیشہ ورانہ، ثقافتی اور ذہنی زندگی میں زیادہ وسعت اور تنوع پیدا کریں۔

میں خوب جانتا ہوں کہ یہ معجزہ راتوں رات رونما نہیں ہو سکتا۔ آپ بدستور ایک ایسے طریقۂ تعلیم کی خرابیوں کا شکار ہیں جو فرسودہ ہو چکا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نظام کو قومی ضروریات کی روشنی میں اچھی طرح پرکھا جائے اور اس کو ترمیم یا اصلاح سے ہمارے جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمارے نظامِ تعلیم کی جانچ پڑتال کے لئے ایک اعلیٰ اختیارات کا کمیشن مقرر کیا جا چکا ہے اور اس کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ آئندہ مئی کے وسط تک اپنی رپورٹ پیش کردے۔ اس کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں جو تبدیلیاں یا ترقیاں کی جائیں گی، ان کا اثر صرف اگلی نسل کے طلبہ ہی پر ہوگا۔

میرے عزیز نوجوان گریجویٹو! جہاں تک آپ کا تعلق ہے مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ آپ کو موجودہ صورتِ حال کو جو کچھ ایسی اچھی نہیں، زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کرنا پڑے گی مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ قائدِ اعظمؒ کے اصولوں ـــ یقین، اتحاد اور تنظیم کے ساتھ اپنی نئی عملی زندگی میں داخل ہوں گے تو آپ ہم میں سے اکثر کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے۔

اس نئے سلسلۂ حالات میں آپ کو اپنا کردار ادا کرنے میں مدد دینے کے لئے ہم نے اپنی جگہ مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آپ کو معاشرتی انصاف اور منصفانہ سلوک کا ایسا پاک و صاف ماحول مہیا کیا جائے جس میں ذاتی قابلیت کی بنیاد پر سب کو مساوی مواقع حاصل ہوں گے اور ذات، عقیدہ، معاشرتی حیثیت اور دباؤ یا اثر کے دیگر عناصر کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی۔

آپ میں سے ان لوگوں کو جو ابھی اپنے تعلیمی دور سے گذر رہے ہیں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنے دورانِ طالبعلمی سے بہترین فائدہ اٹھائیے۔ یہ ایک بڑا ہی عزیز زمانہ ہے اور زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے۔ خود کو ان اثرات کا شکار نہ ہونے دیجئے جو آپ کو سیاسی اقتدار کی کشمکش کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی تمام تر توجہ تعلیمی مشاغل ہی پر مبذول فرمائیے اور یونیورسٹی میں دورانِ مطالعہ آپ کو جو سہولتیں اور رعایات حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو لائق اور شائستہ بنانے کی کوشش کریں۔ وکیل، ڈاکٹر یا صنعت کار ہونے سے پہلے انسان، انسان ہی ہوتا ہے۔ آپ لائق اور سمجھدار آدمی بن جائیں تو آپ خود بخود لائق اور سمجھدار وکیل اور ڈاکٹر بن جائیں گے۔ یاد رکھیے، آپ کے والدین جو اس سنگین دور میں کثیر اخراجات برداشت کرکے آپ کو تعلیم دلاتے ہیں اور آپ کی قوم جو آپ کو اس مقصد کے لئے وسائل فراہم کرتی ہے۔ اُن کا آپ کے مستقبل پر یکساں حق ہے، ان کو ناامید نہ کیجئے۔ اپنے والدین کے لئے قوت کا ذریعہ اور اپنی قوم کے لئے قیمتی اثاثہ بننے کی کوشش کیجئے، یہ نہ ہو تو تعلیم بالکل بے معنی ہے۔

اب میں اساتذہ کرام کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے اُن کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قوم کے معمار حقیقی معنوں میں معلم حضرات ہی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کو کچھ بُری روایات ہی ہاتھ آئی ہیں لیکن انہوں نے بڑی حد تک اس کٹھن کام کی صعوبتوں کو بڑی کامیابی سے برداشت کیا ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایسے ذمہ دار پیشہ کے لوگ دوسروں کے مقابلے میں بہت کم اُجرت پاتے ہیں۔ یہ بات دنیا کے کتنے ہی ملکوں پر صادق آتی ہے جن میں ہمارا اپنا ملک بھی شامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہترین لیاقت و صلاحیت رکھنے والے لوگ اس پیشہ کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہمیں یہ بھی سیکھنا ہے کہ ہم اپنے وسائل کے اندر رہ کر ہی گزارہ کریں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اساتذہ کی حیثیت اور ان کی تنخواہوں کو معقول بنانے

کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ ہماری حکومت اس مسئلہ پر پوری پوری توجہ دے گی۔ بے شک اساتذہ کے معاملہ میں ہم اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کریں گے لیکن ہمیں اساتذہ سے بھی یہ توقع ہے کہ وہ قوم کے سلسلہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اساتذہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہیں انسانوں پر اثر پذیری کے بہترین زمانہ میں اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد ایسے اذہان پر صرف ہوتی ہے جو نشوونما کے مرحلہ سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ذوق وشوق، تفریح اور تجسس کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اگر اساتذہ اپنے فرضِ منصبی کو خوش اسلوبی سے ادا کریں تو ان کا کام نونہالانِ ملت کو ٹھیک سانچوں میں ڈھالنے کا خالص تخلیقی کام ہے۔

یہ ہمارے اساتذۂ کرام ہی کا کام ہے کہ وہ ہماری آئندہ نسلوں کو علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات کے زہر سے پاک کریں اور ان کو ایک متحد، ترقی کوش اور باوقار قوم کے سانچے میں ڈھالیں۔ اساتذہ یہ کام تبھی بوجہ احسن ادا کرسکتے ہیں کہ خود ان کا دل و دماغ تندرست و سنجیدہ ہو۔ بعض اوقات یونیورسٹی کے عہدہ داروں اور کالجوں کے اساتذہ میں ذاتی یا کسی فریق سے متعلق رقابتوں کو ہوا دینے والی پارٹیاں قائم کرنے کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ بات اُن کے شایانِ شان نہیں۔

آپ قوم کے نونہالوں کا ٹھیک طرح دھیان رکھیئے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قوم بھی آپ کا اسی طرح لحاظ رکھے گی۔ میں اپنی قوم کے لیے فارغ التحصیل طلبا اور طالبات دونوں کے لئے ایک نہایت شاندار اور خوش وخرم زندگی کے لئے دست بدعا ہوں۔ خدا آپ کو اپنے اعتقادات میں استقامت عطا کرے اور آپ کو یہ موقع دے کہ آپ اپنے ملک کی نہایت دیانتداری کے ساتھ پرخلوص خدمات انجام دیں۔ (تقریر۔ کراچی یونیورسٹی)

•

اہلِ پاکستان کو جو مختلف نسلوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک ہی نقطۂ نظر اور نصب العین رکھتے ہیں، ایک طاقتور اور مضبوط اور مستحکم قوم بنانے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں: وسعتِ نظر اور فراخ دلی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کتنی ہی زبانیں، کتنی ہی نسلیں پائی جاتی ہیں، علاقائی وفاداریوں کو ایک بلند تر وفاداری کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ سارے ملک کی وفاداری، بیشک ایک خاص حصۂ ملک میں آباد ہونے کی بنا پر آپ کو اس کے ساتھ ایک نسبت خاص ہے لیکن اسکے ساتھ ہی، اور اس سے بڑھ کر آپ کو وسیع تر ہیئت ——— پاکستان سے شدید تر وابستگی لازمی ہے تاکہ جس مقامی حصہ میں آپ بودوباش رکھتے ہیں اس کی کماحقہٗ حفاظت کی جاسکے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کی حیثیت بڑی مخدوش رہے گی۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو دیکھئے، جس کے باشندے یورپ کی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس برِّاعظم میں تو یہ مدتوں ایک دوسرے سے محوِ پیکار رہے، اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے لیکن جب وہ اپنے نئے ملک میں آباد ہوگئے تو وہ ہمیشہ کے لئے اتحاد و یگانگت کے رشتہ میں منسلک ہوگئے۔

ہمارے طلباء کو زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے کیونکہ ہمارے ملک کو جرأت مند اور بلند کردار لوگوں کی شدید ضرورت ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے دورانِ تعلیم میں وسیع وبسیط مطالعہ کر کے قومی زندگی کے لئے خوب تیاری کی ہو تاکہ وہ قوم کو بلند سے بلند تر مقاماتِ ترقی کی طرف لے جاسکیں۔ آپ کے ملک کی آنکھیں آپ ہی کی طرف لگی ہیں تاکہ آپ قوم کو صحیح قسم کے رہنما مہیا کریں۔ ہمارا زمانہ نعرہ بازی اور جلوسوں کا زمانہ نہیں۔ یہ زمانہ تو ہمیشہ کے لئے لد چکا ہے۔ اب تو ہمارے ملک کو از سرِنو بنانے اور سنوارنے کی ضرورت ہے ___ تعمیرِ نو کی ضرورت ہے۔ فی الحال آپ کا کام یہی ہے کہ آپ اپنا وقت مفید کاموں میں صرف کریں اور زیادہ سے زیادہ تبحرِ علمی بہم پہنچائیں تاکہ آپ کی قوم آپ پر ناز کرے۔

طلباء معاشرے کا ایک ایسا عنصر ہیں جس پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ قوم کے مستقبل کے معمار ہیں، لہٰذا انہیں پہلے ہی سے اس اہم کام کی تیاری شروع کردینی چاہیئے۔ انہیں کسی فوری فائدے کی توقع کے بغیر کام کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی بڑی بڑی قربانیوں کے لئے بھی تیار ہونا پڑے گا۔

زندگی اور اپنے وطن پاکستان کے بارے میں طلباء کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ اس سلسلہ میں آپ کو حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد اور ملک کے دونوں حصوں کی آبادی کی ہیئتِ ترکیبی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ پاکستان کے باشندے ایک ہی نسل پر مشتمل نہیں بلکہ مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں، پھر بھی ان کا نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور ان کے مقاصد اور نصب العین بھی مشترک ہیں۔ ایسے معاشرے میں کچھ کسریں بھی ہوتی ہیں اور کچھ قوتیں بھی، لہٰذا آپ کو ایسا رویہ

اختیار کرنا چاہیئے جو کسروں کو دبا دے اور قوتوں کو ابھار دے۔ یہ بات قوم کو ایسی قوت عطا کر دے گی کہ وہ ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکے گی۔
مختلف نسلوں کی طرح پاکستان میں مختلف زبانیں بھی ہیں۔ ایسے ہی جگہ جگہ علاقائی وفاداریاں بھی ہیں لیکن ان مقامی وفاداریوں کی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ ہم اعلیٰ قسم کی وفاداری یعنی پاکستان اور اس کی ملت سے پاس وفا کو زیادہ ملحوظ رکھیں۔ بالفاظ دیگر ہمیں بہترین قسم کے پاکستانی بننا چاہیئے۔
اگر ہمارے طلباء پاکستان کے بارے میں صحیح قسم کا میلان پیدا نہیں کریں گے تو وہ شکاریوں کی اصطلاح میں وہی بات کریں گے جس کو "نشانہ کی بطخ" بنکر بیٹھ جانا کہتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ کو دشمنانِ ملک کا تختۂ مشق نہیں بننے دینا چاہیئے۔ انھیں پاکستان کے سلسلہ میں اعلیٰ قسم کی وفاداری پیدا کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ ورنہ ان کے لئے اور ان کی آنے والی نسلوں کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ اگر اتفاق سے کوئی بات ٹھیک نظر نہ آئے تو ہمیں اس کی غلط تشریح نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ بہت بلند نظری اور وسیع المشربی سے کام لینا چاہیئے۔ (تلخیص) (تقریر: اجتماع طلبۂ ڈھاکہ)

★

گھر کی رونق
تنہائی کا احساس کیوں ہو نیا الہ دین بیٹری سے چلنے والا ریڈیو کھولکر
دیکھئے اور کھیل تماشے، موسیقی، اہم واقعات، خبریں اور تقریریں
غرض ہوا کے دوش پر بو قلموں رنگارنگ دلچسپیاں بکھری پڑی ہیں اُن کا
پورا پورا لطف اٹھایئے۔
الہ دین بیٹری زیادہ عرصے تک کام دیتی ہے اور چونکہ طاقت ور ہے
اس لئے اس کی بدولت ریڈیو کی آواز صاف اور شیریں سنائی دیتی ہے۔
الہ دین ریڈیو بیٹری
نارمل ڈیوٹی اور ہیوی ڈیوٹی
ATCO ایٹکو انڈسٹریز کراچی

"دیوانِ غالب اُردو": بقیہ صفحہ: (۱۳)

مجھے معلوم ہے آج دیوانِ غالب اُردو کا کوئی ایسا مجموعہ یا قلمی نسخہ موجود نہیں جو ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان مرتب ہوا ہو اور ان دونوں اشاعتوں سے مختلف ہو۔ موجودہ مخطوطے کی موجودگی سے یہ ثابت ہے کہ دیوانِ غالب ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی ایک بار مرتب ہوا جس کی تقریظ بھی بدل گئی اور اس مخطوطے کے علاوہ اس کی کوئی اور نقل بھی کہیں محفوظ نہیں، اور نہ محققینِ کلامِ غالب کو اس کا علم ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی کوئی نسخہ مرتب ہوا تھا۔ ممکن ہے ۱۸۴۵ء میں یہ نسخہ مرتب ہوا ہو اور ہمارا موجودہ مخطوطہ ہی وہ اصل نسخہ ہو۔

مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۵ء کے قریب ہی اُردو شعرائے کے تذکرے مرتب کئے تھے۔ پہلا "گلدستۂ نازنیناں" (اختتام تالیف دسمبر ۱۸۴۴ء؛ اختتام طباعت جولائی ۱۸۴۵ء) اور دوسرا گارسن دتاسی سے ماخوذ "طبقات الشعرائے ہند" (تالیف ۱۸۴۷ء۔ طباعت ۱۸۴۸ء)۔ ان دونوں تذکروں میں مولوی کریم الدین نے غالب کے اُردو دیوان کا ذکر کیا ہے جس کی نشان دہی سب سے پہلے شیخ محمد اکرام صاحب مؤلف "غالب نامہ" نے کی تھی۔ اور مولوی کریم الدین کی شہادت کو دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے سلسلے میں بطورِ اساس استعمال کیا تھا۔ موجودہ نسخہ خود مولوی کریم الدین نے تیار کرایا تھا جس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

"اختر شیرانی": بقیہ صفحہ: (۲۶)

شاعری گھومتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا آئینہ ہے مگر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ ابھی تک سلمیٰ کو محض ایک علامت سمجھتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد کے خیال میں سلمیٰ ایک نصب العین تھی جس تک اختر پہنچنا چاہتے تھے۔ منٹو کا کہنا ہے کہ سلمیٰ اگر خیالی پیکر نہ ہوتی تو اختر اس سے اس قدر والہانہ محبت نہ کرتا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ وہ (اختر) کسی خاص محبوبہ کے غمزوں کا شکار نہیں بلکہ خود اپنی سرمستی پہ عاشق ہے۔ اسے مست رہنے کے لئے جذبۂ رومان کی ضرورت ہے۔ اور لیلیٰ، سلمیٰ، اور شیریں محض اس جذبہ کے خوبصورت بہانے ہیں۔ اسے ان کی ضرورت نہیں"۔

سلمیٰ کے متعلق یہ نظریئے کہاں تک صحیح ہیں یا ان میں کتنی صداقت ہے، وہی حضرات جان سکتے ہیں جنہیں اختر کے کلام سے دلچسپی ہے اور جنہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں سلمیٰ نہ صرف ایک علامت ہے اور نہ محض نصب العین۔ بلکہ وہ ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے۔ اختر کی زندگی میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی لڑکی داخل ہوئی ہے جس کی پرورش مشرقیت کے خالص اصولوں کے تحت ہوئی اور جس نے پنجاب کی محبت خیز زمیں اختر سے والہانہ عشق کیا۔ اس کا حقیقی نام کچھ بھی ہو مگر اختر اسے سلمیٰ، ریحانہ، لیلیٰ وغیرہ کے ناموں سے پکارتا ہے۔

اختر کے کلام کا کچھ حصہ حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبہ سے بھی معمور ہے۔ مگر یہ بے جان ہے۔ کیونکہ اس میں اختر کی شخصیت کھل کر سامنے نہیں آتی۔ اس کا مزاج حسن، عشق اور رومان ہی کے ساتھ طبعی مناسبت رکھتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جمال پرستی اور عشق و محبت کی گرمجوشیوں اور خشک سیاسیات کا آپس میں کس حد تک میل ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اختر کی شاعری میں کہیں کہیں ابتذال اور سوقیانہ پن بھی ملتا ہے۔ مگر یہ نقص صرف اختر کے کلام ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا بلکہ مبتذل اور رکیک مضامین سے کلاسیکی ادب ہو یا جدید دور کا سرمایہ شعر و ادب کسی کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔ اختر کے یہاں اس قسم کی لغزشوں کا سبب جذبات کی شدت اور احساسات کی تیزی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں اس حد تک بہہ جاتا ہے کہ اسے زبان و بیان پر قابو نہیں رہتا۔ اور عرب کے آزاد منش، بے باک صحرائی شاعروں کی طرح وہ بے محابا ایسے معاملات کی عکاسی بھی کر جاتا ہے جن کی نفاست پسند طبع مہذب متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ شاعر کی خامی ہے یا ہماری، اس کا فیصلہ اخلاقیات کی بجائے جمالیات ہی کر سکتے ہیں۔

اختر کی شاعری اب ذاتی سے زیادہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اور ہم شاعر کے مزاج اور پارہ ہائے فن کا اس حیثیت سے ہی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شاعرِ رومان اختر نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دین صنفِ نازک ہے جو پہلی دفعہ اپنے حسن و جمال، قدرتی رنگ روپ اور دلی کیفیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔

کھیل میں خوشی
جسم میں تازگی
محافظِ صحت لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے
جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے
اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں یہ اطمینان کر لیجئے کہ آپ
کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
L. 18—193 UD
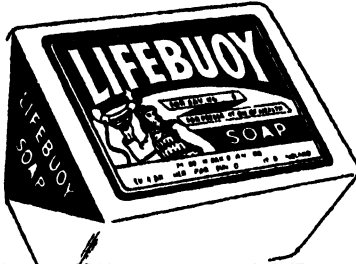
ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ، کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس - میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

یوم پیدائش قائد اعظم رح
(کراچی)

جنرل محمد ایوب خان، صدر پاکستان، کا
پولو گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان
جلسۂ عام سے خطاب

ل محمد ایوب خان، صدر کابینہ کے اراکین : مزار قائد پر فاتحہ خوانی
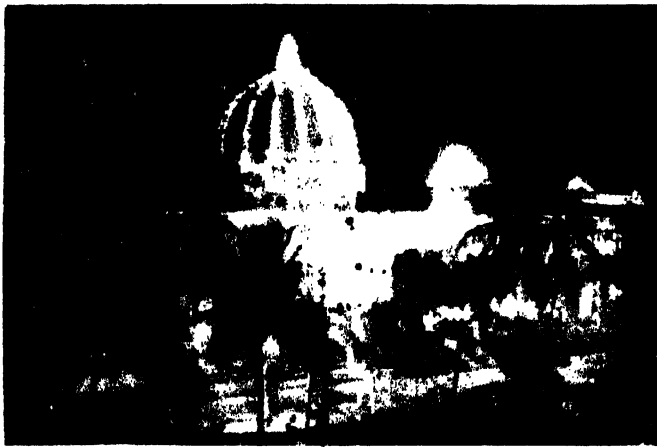
بینک دولت پاکستان کی عمارت پر چراغاں

فریئر ہال میں بچوں کے لئے کھیل تماشے

چیف کورٹ کی عمارت کی برقی آرائش

خوشحالی کی کنجیاں
قومی تعمیر کے سرٹیفکیٹ
سیونگ کے ٹکٹ
پوسٹل لائف انشورنس
پوسٹ آفس سیونگ بینک
SAVINGS OMNIBUS
بچت اور بیمے کے ذریعے خوشی اور خوشحالی حاصل کیجئے